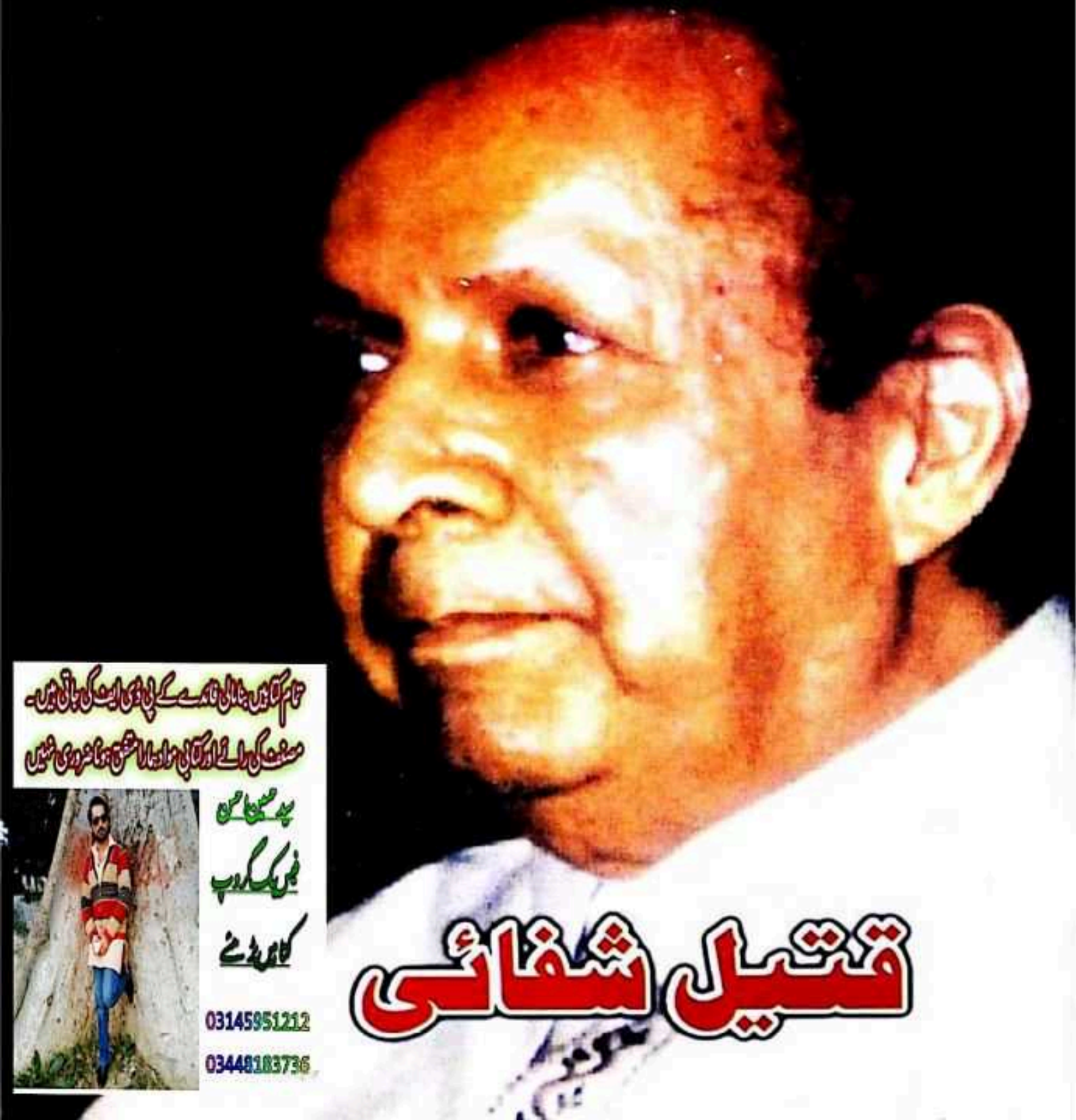
گھنگھرو ٹوٹ گئے

(آپ بیتی)



تمام کتابیں بتائی گئی فارمیٹ کے پی ڈی ایف کی جاتی ہیں۔
مصنف کی رائے اور کتابی مواد سے اتفاق ہونا ضروری نہیں

پیش کش
فیس بک گروپ
کتابیں پڑھئے

03145951212
03448183736

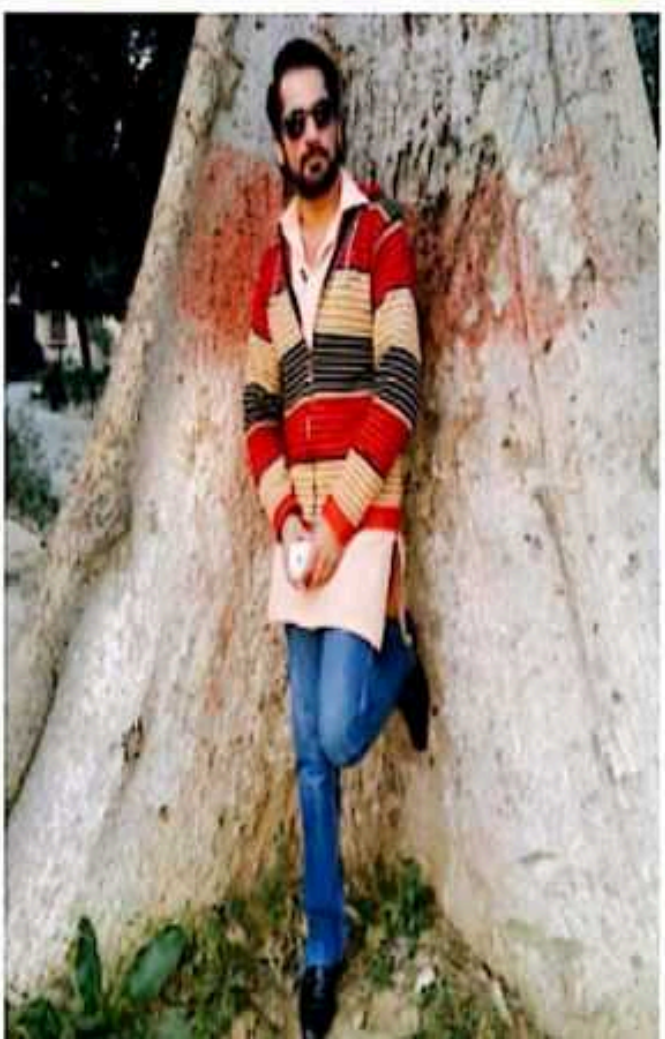
قتیل شفائی

قتیلؔ شفائی

گھنگھرو ٹوٹ گئے

(آپ بیتی)

تمام کتابیں بنا مالی فائدے کے پی ڈی ایف کی جاتی ہیں۔
مصنف کی رائے اور کتابی مواد ہمارا متفق ہونا ضروری نہیں



سید حسین احسن

فیس بک گروپ

کتابیں پڑھئے

03145951212

03448183736

گھنگھرو ٹوٹ گئے

(آپ بیتی)

مصنف:
قتیلؔ شفائی

ناشر:

تخلیق کار پبلشرز

104/B ۔ یادر منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی ۔۱۱۰۰۹۲

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب : **گھنگھرو ٹوٹ گئے** (آپ بیتی)
مصنف : قتیل شفائی
تعداد : ۴۰۰

ناشر : انیس امروہوی
○ **تخلیق کار پبلشرز**
104/B - یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی - ۱۱۰۰۹۲

سرورق : مسعود التمش
کمپوزنگ : رچنا کار پروڈکشنز، لکشمی نگر، دہلی - ۱۱۰۰۹۲
مطبع : کلاسک آرٹ پرنٹرس، چاندنی محل، دریا گنج، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲

ملنے کے پتے:

- کتابی دُنیا، ترکمان گیٹ، دہلی - ۱۱۰۰۰۲
- مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی - ۱۱۰۰۰۶
- کتب خانہ انجمن ترقی اُردو، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی - ۱۱۰۰۰۶
- بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ - ۸۰۰۰۰۴ (بہار)
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۲ (یو - پی)
- انجمن ترقی اردو ہند: اردو گھر، راؤز اوینیو، دین دیال اُپادھیائے مارگ، دہلی - ۱۱۰۰۰۲
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی - ۱۱۰۰۰۶

T.P.: 0175 ISBN: 978-81-907834-0-8
GHUNGHROO TOOT GAYE (Autobiography) 2008
By QATEEL SHEFAI Rs.440.00
TAKHLEEQKAR PUBLISHERS
104/B - YAWAR MANZIL, I-BLOCK, LAXMI NAGAR, DELHI-110092
Ph.:011-22442572, 09811612373 E-mail:qissey@rediffmail.com

○

زندگی کے نام

جس سے کوئی شکوہ نہیں

جس پر کوئی پچھتاوہ نہیں

○○

قتیلؔ کے بارے میں.....

قتیلؔ شفائی کی فنکارانہ انفرادیت اتنی واضح ہے کہ اس کا کوئی ایک شعر دوسرے شعراء کے بیس اشعار میں شامل کر دیجئے اور کسی شعر شناس سے کہیے کہ ان میں سے قتیلؔ کا شعر چن لے، تو وہ اس میں یقیناً کامیاب ہوگا۔ کیونکہ قتیلؔ سینکڑوں کے ہجوم میں بھی اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ اس کے الفاظ کھنکتے ہیں۔ اس کی تشبیہیں گنگناتی ہیں۔ اسے حسن کا شاعر بھی کہا گیا ہے اور عشق کا شاعر بھی، اور یہ دونوں باتیں درست ہیں۔ مگر میری رائے میں اس نے ایک اور کارنامہ انجام دیا ہے اور یہ شاعری اور موسیقی کے ٹوٹتے ہوئے رشتوں کا کارنامہ ہے۔ قتیلؔ کے فن میں شاعری اور موسیقی کے فنون باہم آمیخت ہو کر یکجا ہو گئے ہیں اور یہی قتیلؔ کی پہچان ہے، یہی اس کی انفرادیت ہے اور یہی اس کا منفرد اسلوب ہے۔ یوں تو وہ ایک صاحب اسلوب شاعر ہے، حسن کا شاعر، عشق کا شاعر، عدل اور توازن کا شاعر، عالمگیر امن اور آسودگی کا شاعر، البیلا مگر باشعور شاعر۔

ــــ احمد ندیمؔ قاسمی

مطرب، نغمہ گر، شگفتہ طبع، شیریں گفتار قتیلؔ شفائی ترقی پسند شعراء کے قافلے میں اہل قافلہ کے ہمسفر بھی ہیں اور ان سے جدا بھی۔ اگر جذباتی اور نظریاتی معاملات میں ان کے دل و دماغ اپنے ہمرہوں کے ہم آہنگ ہیں تو اظہار اور ترسیل کے مقامات میں قتیلؔ کی آواز منفرد بھی ہے اور ممتاز بھی۔

ــــ فیض احمد فیضؔ

مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ قتیلؔ شفائی کی یادداشتوں کو کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ قتیلؔ نے اپنی زندگی میں دوستوں سے اشارتاً بھی ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ اپنی یادداشتیں قلمبند کر رہے ہیں۔ اس نے بہت بھرپور زندگی گزاری۔ بلاشبہ اسے عہد آفریں شخصیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ شاعری بالخصوص نغمہ نگاری میں اس نے بڑا نام پیدا کیا۔ زندگی کے آخری ماہ و سال تک اس کی زندگی جوانوں سے زیادہ متحرک رہی۔ وہ بہت سلیقے اور نظم و ضبط کا آدمی تھا۔ اپنی زندگی کے بارے میں یادداشتوں پر مشتمل اس نے جو ترکہ چھوڑا ہے، پڑھنے والوں کے لیے اس میں دلچسپی کا یقیناً بہت سامان ہے۔

ــــ حمید اختر

لاہور، ۸/مارچ ۲۰۰۶ء

فہرست

۱۔	ابتدائیہ	اظہر جاوید	۱۳
۲۔	ابتدائی زندگی		۳۵
۳۔	ٹرانسپورٹ کمپنی میں ملازمت		۴۰
۴۔	مَری میں ایام روزگار		۴۴
۵۔	ہری پور کی کچھ یادیں		۵۰
۶۔	ایبٹ آباد		۵۴
۷۔	جسٹس صفدر شاہ		۵۸
۸۔	نواب امب		۶۴
۹۔	خان فقیرا خان جدون		۶۷
۱۰۔	جلال بابا		۷۱
۱۱۔	جنس کا تجربہ		۷۴
۱۲۔	دل توڑنے والے دیکھ کے چل		۷۸
۱۳۔	''ادب لطیف'' میں ملازمت		۸۳
۱۴۔	چندر کانتا		۸۸
۱۵۔	مصری شاہ والا گھر		۹۶
۱۶۔	چندر کانتا سے علیحدگی		۹۹
۱۷۔	مہربان پھوپھی		۱۰۳

۱۸۔ ریڈیو پاکستان کی زیادتی ۱۱۰
۱۹۔ رائٹرز گلڈ کی سیکرٹری شپ ۱۱۴
۲۰۔ محمد طفیل ۱۲۰
۲۱۔ سہرا پڑھنے کی مجبوری ۱۲۶
۲۲۔ سید عبدالحمید عدم ۱۳۳
۲۳۔ میرے پبلشرز ۱۳۶
۲۴۔ میرے ڈسٹری بیوٹرز ۱۴۲
۲۵۔ مسجد اور امام باڑے کا رول ۱۴۶
۲۶۔ فلم اور سکینڈل ۱۵۰
۲۷۔ فلم انڈسٹری کے نیک نام لوگ ۱۵۶
۲۸۔ آغا گل اور سلطان راہی ۱۵۹
۲۹۔ ایک مجبور عورت ۱۶۳
۳۰۔ بیس روپے کی چوری ۱۶۶
۳۱۔ ماسکو یاترا ۱۷۰
۳۲۔ عبرت کا تازیانہ ۱۷۷
۳۳۔ دو یکطرفہ معاشقے ۱۸۱
۳۴۔ شاعروں کا استحصال ۱۸۶
۳۵۔ طفیل ہوشیار پوری اور مشیر کاظمی ۱۹۶
۳۶۔ صدر ایوب ۱۹۹
۳۷۔ روس میں کچھ ایام ۲۰۳
۳۸۔ دو حماقتیں ۲۰۹
۳۹۔ ٹا منگیشکر ۲۱۱
۴۰۔ ممتاز مفتی ۲۱۴
۴۱۔ انڈیا کا سفر ۲۱۶
۴۲۔ بمبئی کا مشاعرہ ۲۲۷
۴۳۔ انڈین شاعروں کا سلوک ۲۳۱
۴۴۔ صابر دت ۲۳۸
۴۵۔ شانتا رام سے ملاقات ۲۴۵

۴۶۔ منوج کمار ۲۴۹
۴۷۔ قمر جلال آبادی ۲۵۲
۴۸۔ کمال امروہوی ۲۵۵
۴۹۔ گلزار دینوی ۲۶۰
۵۰۔ دھرمیندر ۲۶۴
۵۱۔ کے۔آصف اور نگار سلطانہ ۲۶۶
۵۲۔ حیدرآباد کا یادگار مشاعرہ ۲۷۳
۵۳۔ ابراہیم جلیس ۲۷۸
۵۴۔ بھوپال کا مشاعرہ ۲۸۳
۵۵۔ مدراس اور کلکتہ کے مشاعرے ۲۸۷
۵۶۔ پونا کا مشاعرہ ۲۹۲
۵۷۔ قتیل شفائی نمبر ۳۰۰
۵۸۔ میرٹھ میں نوچندی کا مشاعرہ ۳۰۴
۵۹۔ خوشتر گرامی ۳۰۷
۶۰۔ نظام الدین اولیاءؒ کا مزار ۳۱۳
۶۱۔ جج سنگھ ۳۱۵
۶۲۔ دو کمیونسٹ دوست ۳۲۲
۶۳۔ اچھے دنوں کے دوست ۳۲۸
۶۴۔ بڑے لوگوں کے سامنے کلام ۳۳۷
۶۵۔ میرے اساتذہ ۳۵۱
۶۶۔ روش صدیقی اور اختر رضوانی ۳۶۹
۶۷۔ تائبؔ رضوی ۳۸۲
۶۸۔ اختر شیرانی ۳۸۶
۶۹۔ ہیر پھیر کے سلسلے ۳۹۶
۷۰۔ شاعری اور شراب ۴۰۰
۷۱۔ شراب اور مولوی ۴۰۶
۷۲۔ ساحرؔ لدھیانوی ۴۱۰
۷۳۔ شوقیہ جھوٹ بولنے والے ۴۱۷

۷۴۔ شاعر سربراہ ادارہ ۴۳۱
۷۵۔ عمرہ کی سعادت ۴۳۶
۷۶۔ کلام سنانے کے رسیا ۴۴۴
۷۷۔ خواجہ احمد عباس اور راجندر سنگھ بیدی ۴۵۵
۷۸۔ نیکی کر دریا میں ڈال ۴۶۵
۷۹۔ بادہ نوشوں کی عادتیں ۴۷۰
۸۰۔ کچھ اور بادہ نوش ۴۹۷
۸۱۔ کثرت بادہ نوشی ۵۱۳
۸۲۔ رفیق غزنوی ۵۲۹
۸۳۔ فیض احمد فیض اور حفیظ صاحب ۵۳۵
۸۴۔ جوش ملیح آبادی ۵۴۶
۸۵۔ شاعری میں تجربے ۵۵۴
۸۶۔ میرزا ادیب ۵۶۹
۸۷۔ دو بڑے صدمے ۵۷۴
۸۸۔ عالمی لیڈروں سے ملاقاتیں ۵۸۳
۸۹۔ بڑی پاکستانی شخصیات سے ملاقاتیں ۵۹۴
۹۰۔ اُستاد امام دین اور ناطق دہلوی ۶۰۰
۹۱۔ ملک ٹنڈا ۶۱۰
۹۲۔ دو عظیم سربراہانِ شعبہ ۶۱۶
۹۳۔ کچھ احسان فراموش دوست ۶۲۴
۹۴۔ احمد راہی ۶۲۸
۹۵۔ میری فیملی ۶۳۸
۹۶۔ اقبال بانو ۶۴۵



آپ بیتی کا سلسلہ بھی کچھ ایسا ہی تھا جیسے ابا جان کے لئے فلمی گیتوں کا انتخاب تھا۔ فلمی گیتوں کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی تھی جبکہ آپ بیتی لکھنے کا کام ان کے شاگرد نعیم چشتی نے آسان کر دیا جو کہ اس وقت اے جی آفس میں ڈپٹی ڈائریکٹر تھے' والد محترم کے لئے یہ بھی ایک مشکل مرحلہ تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے آپ بیتی تحریر کرتے' نعیم چشتی صاحب نے ابا جان کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی یادداشتیں اپنی آواز میں ریکارڈ کرلیں انہیں میں سن کر تحریر کر دوں گا' یہ ایک مشکل کام تھا لیکن نعیم چشتی صاحب نے بہت احسن طریقے سے یہ کام سرانجام دیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ کافی دیر جاری رہا لیکن نعیم چشتی صاحب کے ملک سے باہر جانے کی وجہ سے یہ سلسلہ رُک گیا لیکن اس دوران تقریباً کافی کام ہو چکا تھا۔ یہ یادیں ظاہر ہے ساٹھ سال سے بھی زیادہ عرصے پر محیط ہیں اور ان کے لئے بہت وقت درکار تھا' اس میں کافی واقعات قلمبند ہو چکے ہیں لیکن زندگی کے آخری سالوں کے کچھ واقعات ایسے تھے جو اس میں ضروری تھے۔ اس سلسلے میں میں نے محترم اظہر جاوید کو درخواست کی تھی کہ وہ کچھ یادیں تحریر کر دیں جو کہ انہوں نے میری درخواست مانتے ہوئے تحریر کیا ہے۔

یہ تو سب جانتے ہیں محترم قتیل شفائی ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے اپنی زندگی بہت بھرپور طریقے سے گزاری۔ دوستوں سے دوستی خوب نبھائی' مہمان نواز' خوش لباس اور محفلیں سجانا یہ ان کی خصوصیات تھیں۔ ان میں ایک خاص کشش تھی دوست اب بھی انہیں یاد کرتے ہوئے افسردہ ہو جاتے ہیں اور اکثر تقریبات میں انہیں بہت شدت سے یاد کرتے ہیں اور خاص طور پر میرے لیے اپنے جذبات پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں یادوں کے بھنور میں پھنس جاتا ہوں اور وہ سب منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا

ہے جب میں ان کے ساتھ ہوا کرتا تھا' اور ان کے لطیفے' ان کی باتیں' ان کی بیباکی اور صاف گوئی' ان کا طنز و مزاح یہ تمام باتیں اب بھی یاد آتی ہیں' دوستوں نے تو اپنا ایک دوست کھویا' لیکن میں نے اپنا دوست ''باپ'' کھویا ہے۔

در و دیوار پہ حسرت سی برستی ہے قتیل
جانے کس دیس گئے پیار نبھانے والے

میری یہی کوشش ہے کہ قارئین کو کچھ نہ کچھ قتیل شفائی صاحب کے بارے میں پیش کرتا رہوں جس سے ان کا قتیل شفائی سے رابطہ قائم رہے' اُمید ہے اس آپ بیتی کو قارئین پسند فرمائیں گے۔ شکریہ

نوید قتیل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وہ ایک مکمل اور پُرعمل انسان تھا۔

عشق کرنے، دوستی نبھانے، دشمنی پالنے اور دشمنی کو آخری حدوں تک اچھالنے میں، اس نے ہر کام پوری دلجمعی سے کیا۔

قدرت کی ستم ظریفی یا اس کی اپنی بے چارگی دیکھیں، کہ وہ اپنی داستان حیات کو مکمل نہ کر سکا۔ وہ داستانوں کا مرکز و محور رہا۔ داستان سرا رہا، داستانوں کو شعروں میں پروتا رہا اور شعروں کو داستانوں میں سموتا رہا۔ ایک عزم، حوصلے اور جینے کی لگن کے ساتھ جیتا رہا۔ وہ عاشقِ وارفتہ تھا، مگر دامن صاف اور گریبان سلامت تھا، ہاں، دوسروں کی محرومیوں کے چاک سیتا رہا۔ وہ خود بھی شاعری کا محبوب رہا، اور تمام تر بانکپن کے ساتھ خوب خوب رہا۔ اس کی شاعری، اپنے وطن تو کیا، غیر ملک بھارت میں نصاب کا حصہ بنی۔ اس کی سحر انگیز شخصیت فلموں کا قصہ بنی۔ اس پر یونیورسٹیوں میں تھیسس لکھے گئے۔ رسائل نے خاص نمبر شائع کئے، مداحوں نے کتابیں تحریر کیں۔ نہایت منظم، مرتب، با اصول اور سلیقے سے زندگی کرنے والے کو کہیں تو ادھورا ہونا تھا۔ بہت کچھ پا کے، کہیں تو کچھ نہ کچھ کھونا تھا۔

سو، جب اپنی آپ بیتی کہنے اور گزرے برسوں، بیتے لمحوں اور کھٹی میٹھی یادوں کے ساتھ ساتھ بہنے کا وقت آیا، تو کہیں اور الجھ گئے۔ اور یوں یہ کتھا نامکمل رہی اور ان کی زندگی کا سفر مکمل ہو گیا۔ گویا..... ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے۔

یہ ذکر قتیل شفائی کا ہے..... جنہیں اپنے سنیئرز کا ساتھ دینے، اور اپنے جونیئرز کو ساتھ لے کر چلنے کا کمال بھی حاصل تھا۔ کمال تو ان کے بے شمار تھے لیکن، وہ فرشتہ نہیں

تھے۔ انسان اور بشری تقاضوں کے مطابق ان میں خامیاں بھی ہوں گی۔ مگر مجھ ایسے عقیدت مند اپنے ممدوح کی خوبیوں کے طور دیکھتے ہیں' خامیوں کی اور چھور تک نہیں جاتے۔

میرا قتیل شفائی سے عجیب طرح کا رشتہ تھا..... رفاقت' محبت' ہم سفری' راز داری اور دکھ سکھ کی سانجھ کا ناتا..... ان سے تعلق رکھنے والے دوستی کا دم بھرنے والے اور ہم راز ہونے کا دعویٰ کرنے والے اور بھی ہیں' اور مجھے اس سے انکار نہیں..... نہ کسی تکرار کے اصرار کا معاملہ ہے۔ لیکن قتیل شفائی کو مجھ سے جو وابستگی تھی' انہیں جو مجھ پر اعتماد تھا' اس نے ان کے پورے کنبے کے ساتھ مجھے بھروسے کی ڈوری میں باندھ دیا ہے..... کم و بیش چالیس برس کا عرصہ تو خون کے رشتوں سے بھی زیادہ مستحکم ہو جاتا ہے..... یہی سبب ہے کہ نوید قتیل نے اسی اپنائیت سے مجھے اس آپ بیتی پر نظر ثانی کرنے اور اس کے ادھورے پن کو (کسی حد تک) مکمل کرنے کی بات کی۔ ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا..... مجھ سے بہتر' بہت بہتر لوگ قتیل شفائی کے حلقۂ احباب میں ہیں' جو جانچ پرکھ کر سکتے اور نوک پلک سنوار سکتے ہیں۔

نظر ثانی کا معاملہ یہ ہے' کہ کوئی سات آٹھ برس پہلے' جب قتیل شفائی پر ان کی کتابوں کے ناشروں نے آپ بیتی کے لئے زور ڈالنا شروع کیا' تو بہت بہانوں اور حیل حجت کے بعد انہوں نے ایک راستہ تلاش کر لیا..... دراصل' قتیل شفائی نثر لکھنے سے جی چراتے تھے..... نثر لکھنے کے لئے ٹک کے بیٹھنا پڑتا ہے' اور قتیل بہت حد تک سیماب صفت تھے' جسے آپ متحرک اور فعال بھی کہہ سکتے ہیں..... دیر تک اکیلے رہنا تو ان کی فطرت ہی میں نہیں تھا..... شاعری سے وہ ایک آدھ نشست ہی میں نبٹ لیتے تھے۔ پھر انہیں بزم آرائی کی سوجھتی تھی..... نوید' کہیں آس پاس نہ ہو' تو محلے کے کسی لڑکے کو بلاتے' اس کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھتے اور کہیں نہ کہیں گپ لگانے نکل پڑتے..... جہاں کہیں بھی جاتے' ایک پھیرا دفتر تخلیق کا ضرور لگاتے..... اگر کسی وجہ سے ناغہ ہو جاتا' تو شام کو فون کرتے.....

''کیہہ کر رہے او.....؟''

میں مقصد سمجھتے ہوئے کہتا..... ''حکم کرو''..... وہ اسی لہجے میں جواب دیتے ''حکم یہ ہے کہ ادھر آ جائیں.....!''

اب ایسے محفل باز اور محفل ساز شخص کو دو گھڑیاں بیٹھ کر آپ بیتی لکھنے کی فرصت کہاں تھی..... ان دنوں ان کے چہیتے نیاز مند نعیم چشتی کا روز کا ساتھ تھا۔ نعیم چشتی' سی ایس ایس والا اعلیٰ سرکاری افسر تھا' مگر جی جان سے شاعر تھا..... اس کا ایک مجموعہ کلام بھی چھپ چکا تھا۔ قتیل صاحب سے اس کی بے غرض نیاز مندی تھی..... یہ بیڑا' اس نے اٹھایا اور قتیل صاحب کو اکسایا اور رضا مند کر لیا' کہ وہ بولتے جائیں' جیسے جیسے جو واقعہ یاد آتا جائے' وہ ریکارڈ کر لیں گے' اور بعد میں کاغذ پر اتار لیں گے۔

نعیم چشتی نے گھنٹوں کی ریاضت کے بعد' پہلے تو پکڑ دھکڑ کر قتیل صاحب کو قابو کرنا' پھر انہیں بلوانا.....!! آخر' آخر یہ سب کاغذ پر منتقل کر دیا۔ بظاہر' یہ بہت آسان کام لگتا ہے' لیکن جاننے والے سمجھ سکتے ہیں کہ اس میں دو چار ہی نہیں کئی سخت مقام آتے ہیں..... جتنے کیسٹ بھرے' وہ نعیم نے نقل کر لئے۔ درمیان میں کئی بار قتیل شفائی نے پنڈا چھڑایا اور بھارت کی اور دوڑ لگا دی..... (کیوں.....؟ یہ واردات بعد میں بیان کرتا ہوں) جتنا کام ہو گیا تھا' وہ تو نعیم چشتی نے سنوار لیا..... پھر اس کا تبادلہ کراچی ہو گیا' اور پھر سنا کہ وہ کہیں ولایت یا امریکا کو سدھار گئے ہیں۔

شاید' قتیل صاحب' اس نامکمل آپ بیتی کی طرف توجہ دیتے' مگر وہ تو ایک اور عشق کے گورکھ دھندے میں پھنس گئے تھے..... وہ جو اوپر' میں نے ان کا بھارت میں بھاگ بھاگ کر جانے کا اشارا دیا ہے' یہ اس کا شاخسانہ تھا..... عمر کے آخری دو چار برس قتیل شفائی نے نہایت مصروف' بے حد مشغول اور ایک کھلنڈرے اور بے چین نوجوان عاشق کی طرح گزارے..... پچھتر سالہ قتیل شفائی یک بہ یک سترہ اٹھارہ برس کا اورنگزیب بن گیا تھا.....

یہ سب کیفیات اور اس سے جڑے دوسرے معاملات اس آپ بیتی میں شامل نہیں بلکہ یوں کہیے رہ گئے ہیں۔ قتیل صاحب کا دھیان کسی اور طرف ہوتا من کسی اور سمت لگتا تو

کچھ کرتے نا..... کسی نہ کسی بہانے بھارت یاترا کرنا..... (یاترا ہندی زبان میں صرف سفر کے معنی میں آتا ہے اُردو میں اسے مقدس سفر سمجھ کر استعمال کیا جاتا ہے..... قتیل صاحب کے سلسلے میں دونوں طرح سے جائز ہے) ان کا معمول بن گیا تھا..... نہ جا پاتے تو طویل ترفون کے رابطے کرتے۔

میں ابھی اس عشق کو نام نہیں دے رہا..... اس نام سے پردہ نہیں اٹھا رہا' کہ اس سے پہلے آپ قتیل شفائی کی حالت زار جان لیں' ان کی قلبی و ذہنی واردات کو پہچان لیں تو پھر وہ نام سامنے لاؤں' جس نے انہیں بہت دل شاد کیا..... بہت برباد کیا..... اس نے قتیل کو جینے کا نیا ڈھنگ' زندگی کی نئی امنگ اور ان کی شاعری کو نیا رنگ دیا..... اور آخر آخر وہی عشق اور اس کے وصال و ہجر کی راحت و کلفت انہیں ہم سب سے چھین کر لے گئی۔ قتیل اپنی شاعری اور مجھ ایسے ان گنت چاہنے والوں کے دلوں میں تو زندہ رہیں گے' لیکن جسمانی طور پر ہم سے بہت دور چلے گئے۔ ان کی وفات کے بعد' ان کی اسی محبوب اور چاہنے والی کی حیثیت کا دعویٰ کرنے والی کا مجھے جو آخری فون آیا' اس میں بھی یہ دعویٰ کیا تھا' کہ میرا قتیل' میرے لئے تو مرا نہیں..... وہ میرے من میں زندہ پائندہ رہے گا۔

قتیل کی وہ قاتل' ان کی تازہ شاعری کا حاصل اور ان کی عمر کے آخری برسوں کے لمحوں کی جھلمل رشمی بادشاہ تھی..... (یا ہے) اس خاتون میں چھا جانے اور دل ہی کیا روح میں اتر جانے اور رچ بس جانے کا کمال تھا (اب بھی ہوگا)۔ وہ خوب صورت ہی نہیں' دل کش اور دل پذیر بھی تھی..... ابتدا قتیل نے نہیں کی تھی' کمند اسی نے پھینکی تھی۔ پھر کبھی کبھی وہ ایرانی بلی بن جاتی تھی..... رشمی نے قتیل کو یقین دلایا کہ اب کی نہیں' پچھلے جنم میں بھی وہ قتیل کی دیوانی اور داسی رہی ہے..... اور پھر قتیل شفائی نے نظم کہی.....

اب میں بھی جنموں کا قائل ہوتا جاتا ہوں

ملاقات پر' خطوں میں اور ٹیلی فون کے وسیلے سے وہ قتیل کو ٹوٹ کر چاہتی' اور اب

جب قتیل بے اختیار ہوتے' تو وہ ذرا سا کھسکنے لگتی۔ میں نے قتیل صاحب کے اضطراب کو دیکھ کر ایک بار کہا۔

مسئلہ یہ ہے' پہلے وہ آپ کی عاشق تھی' اب آپ نے اسے محبوبہ بنا دیا ہے..... اسی لئے یہ بل چھل دکھانے اور لکن میٹی (آنکھ مچولی) کھیلنے لگی ہے۔'

قتیل صاحب کو بہانہ چاہیے تھا لپک کر فون اٹھایا اور چند ثانیوں میں' بمبئی کا نمبر ملا کر کہا..... ''یہ دیکھیں اظہر جاوید' کیا کہہ رہے ہیں .....'' مجھے پتا تھا' کہ ادھر رشمی کھلکھلا کر ہنس دی ہوگی۔ قتیل صاحب نے چونگا میری طرف بڑھایا اور اسے کہا..... ''لو خود بات کر لو۔''

مندروں کی گھنٹیوں جیسی ہنسی اور کانچ کے برتنوں کے ٹکرانے ایسی کھنکھناہٹ میری بھی سماعت میں گھل گئی۔ میں نے رشمی کو قتیل صاحب کی خوشنودی کے لئے بہن کہا تھا اور وہ مجھے اظہر بھائی کہنے لگی تھی..... ''خوشنودی'' کا حوالہ بھی بتاتا ہوں..... مگر ان دونوں کی خواہش کے باوجود میں اسے بھابی نہ کہہ سکا..... اور اس سلسلے میں وہ قتیل کو مجھ سے تھوڑا بدظن بھی کر چکی تھی۔ میری جب تک رشمی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اس سے ایک دو خطوں کا تبادلہ ہوا تھا..... قتیل صاحب نے اس کی غزل اور تصویر ''تخلیق'' میں چھپنے کو دی تھی۔ اشاعت کے بعد تخلیق ارسال کیا تو اس کا خط آیا..... فون بھی آیا..... میں نے جوابی خط لکھا ..... رشمی نے قتیل صاحب کو خط میں اور پھر فون پر بتایا کہ اظہر جاوید کا خط آیا ہے' میں تو حیران و ششدر رہ گئی (وہ اُردو کے ثقیل لفظ بھی سہولت سے استعمال کر جاتی تھی) خط کیا ہے' نثر میں شاعری کی ہوئی ہے.....

پہلے تو قتیل صاحب نے مجھ سے استفسار کیا۔ میں نے رسمی سا جواب دیا۔ ان کی تسلی نہ ہوئی ..... انہوں نے خط میں اور فون پر بھی رشمی کو تاکید کی کہ میرے خط کی نقل یا اصل فوراً بھیجیں۔ رشمی نے میرا خط (شاید) فیکس کر کے بھجوایا تو قتیل مطمئن ہوئے۔

رشمی..... رشمی.....! آخر وہ کون تھی .....؟ سب سے پہلے' نغمہ نگار اندی ورنے اسے قتیل شفائی سے ملوایا تھا..... اس وقت تک نہ اسے شاعری کا ذوق تھا نہ خود شاعرہ بنی

تھی ..... فلموں میں کام کرتی تھی اور کسی ایک یا دو فلموں میں وہ سائیڈ ہیروئن آئی تھی بعد میں جب میری ملاقات ہوئی تو اس نے فلموں کے نام بھی بتائے تھے ..... وہ فلمیں پاکستان میں ویڈیو پر بھی دستیاب نہیں تھیں۔ اس واسطے تصدیق تو ہو نہ سکی۔ اس کے شوہر طیب بادشاہ فلموں کے ناتے سے مشہور فوٹو گرافر تھے۔ مرحوم (یا آنجہانی ..... کیونکہ سنا تھا' رشمی سے شادی کے لئے طیب بادشاہ نے ہندو مذہب قبول کیا تھا) فوٹو سیشن کے ماہر تھے ایک آدھ ملاقات تو اندیور ہی کے ساتھ ہوئی ..... پھر قتیل اور رشمی کے اپنے تعلقات بن گئے (دونوں ہی اس کام کے ماہر تھے) طیب بادشاہ نے قتیل شفائی کا فوٹو سیشن بھی کیا ..... دوستی' عشق میں بدلی تو شروع شروع میں رشمی ہی زیادہ دعوے کرتی تھی۔ مگر اِدھر اُدھر بھی اس کے تعلقات قائم تھے جن کا ذکر وہ قتیل سے بھی کر دیتی ..... عاشق' اٹھہتر سالہ عاشق کی معصومیت (یا مظلومیت دیکھیں) ..... قتیل بمبئی گئے۔ رشمی کو اپنے ٹھکانے کی خبر کی ..... دیر تک' بہت دیر تک قتیل انتظار کرتے رہے' پہروں گزر گئے' وہ آئی تو خود کو ناتواں اور بیمار ظاہر کیا ..... (اداکارہ جو تھی) قتیل صاحب کے پوچھے بغیر کہنے لگی۔

''میٹرنٹی ہوم میں' ابارشن کرواتے دیر ہو گئی۔!''

ظاہر ہے قتیل نے حیرت سے سوال کیا ہوگا ..... اس نے اسی رسان سے جواب دیا۔ وہ' اس کا بچہ تھا نا ..... میں کیا کرتی' آپ جو مجھے چھوڑ گئے تھے!'' ''اس'' ..... سے مراد درگاہ اجمیر کے سجادہ نشین تھے' جس سے اس کے قتیل سے پہلے کے اور بعد میں بھی تعلقات تھے ..... قتیل صاحب نے یہ داستان خود مجھے بمبئی ہی میں سنائی اور ٹیپ کا مصرع یہ لگا .....

''میں نے اس کے ساتھ بے وفائی کی تھی ..... وہ بیچاری اور کیا کرتی۔''

طیب بادشاہ خوش شکل بھی تھا اور جوان بھی ..... اس نے رشمی سے عشق کے بعد ہی شادی کی تھی ..... وہ بچارا بھی اسی معصومیت سے اپنی بے وفائی مان لیتا تھا' کہ رشمی فلاں فلاں سے تعلق نہ رکھے تو کیا کرے؟

کہانی لمبی ہوتی جا رہی ہے ..... مگر یہ قتیل کی زندگی کا ایک گمبھیر پہلو ہے' اس کے بغیر ان کی آپ بیتی مکمل نہیں ہوتی۔ آپ بیتی کیا' خود قتیل کی زندگی کا عکس بھی مکمل نہیں ہوتا۔

میں نے قتیل کی زندگی میں' ان کی شخصیت اور فن کے حوالے سے' اور ان کی فلم کے لئے لکھے ہوئے نغموں کو سامنے رکھ کر پانچ چھ مضمون لکھے تھے۔ قتیل شفائی چاہتے تھے اور میری خواہش بھی تھی کہ میں ان پر ایک مکمل کتاب لکھوں' ذرا مختلف انداز میں ..... یوں تو اے حمید نے قتیل کی شخصیت پر افسانوی انداز میں کتاب لکھی ہے۔ احمد عقیل روبی نے رومان اور فلسفے کی آمیزش سے کتاب لکھی ہے جس کا نام قتیل کہانی''، میں نے ہی تجویز کیا تھا..... ضیا ساجد کو میں نے راغب کیا اور اس نے ''قتیل' سب سے جمیل'' کے عنوان سے کتاب تیار کی۔ میں نے شروع میں کہیں ذکر کیا ہے کہ قتیل فلموں کا موضوع بھی بنے ..... تو یہ واقعہ منوج کمار کی فلم ''پینٹر بابو' میں پیش ہوا تھا..... فلم کی ہیروئن رقص کرتی ہے اور قتیل ہی کا گیت گاتی ہے۔

شام غم کیسے ڈھلی' یاد نہیں

ہیرو پوچھتا ہے..... یہ کس کی غزل ہے..... ہیروئن کہتی ہے۔ میرے پسندیدہ شاعر قتیل شفائی کی ..... ہیرو کا جواب تھا۔ وہ میرے بھی پسندیدہ شاعر ہیں' ہیروئن ترت جواب دیتی ہے مگر میرے جتنے نہیں۔ اور ساتھ ہی اپنے لاکٹ کا ڈھکن کھول کر قتیل شفائی کی تصویر دکھاتی ہے اور کہتی ہے۔ ''یقین آیا'' اسی طرح وہاں ایک ٹیلی فلم بنی تھی ''ممو..... اس میں ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے اور ان کے پسماندگان کی کہانی ہے..... ''ممو ..... اداکارہ فرح جلال ہے ..... جب پاکستان جانے کا ذکر ہوتا ہے تو وہ پاکستان کی کئی خوبیاں گنواتے ہوئے کہتی ہے ..... وہاں قتیل شفائی بھی ہیں جس کی غزلیں اقبال بانو نے گائی ہیں.....''

یہ سارے حوالے قتیل کی شہرت اور مقبولیت کے ہیں۔ کئی اور واقعات کا میں چشم دید گواہ ہوں ..... میں جو ان کی سوانح عمری لکھنا چاہتا تھا وہ ان کے گھر ہری پور سے شروع ہوتی تھی' اور چندر کانتا' نسیم صابری' اقبال بانو' خورشید راٹھور اور رشی بادشاہ سمیت سب کو سمیٹ لینے کی کوشش ہوتی ..... یہی وجہ ہے' جب میں دلی گیا تو قتیل اس وقت پہلے ہی

سے بمبئی میں (رشمی کی آغوش میں) موجود تھے۔ انہوں نے دلی سے بمبئی تک کا میرا کرایہ خرچ کیا۔ بمبئی میں انہیں گلوکار اور موسیقار اشوک کھوسلہ نے ایک شاندار فلیٹ دے رکھا تھا۔ رشمی کا دن وہاں گزرتا اور قتیل کی شام اس کے فلیٹ میں .....

رشمی نے بڑے چاؤ سے وہاں ایک کمرہ میرے لئے بھی تیار کیا تھا..... اسے بھی مجھ سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ لیکن پہلی طویل ملاقات ہی ایک طرح سے آخری ثابت ہوئی۔ ان دنوں میں، وہ دونوں شادی کر لینے کے منصوبے بنا رہے تھے۔

رشمی جس دن قتیل صاحب کے فلیٹ پر آئی، بھرپور ملاقات کے بعد قتیل کسی فلم ساز کی طرف چلے گئے اور رشمی وہیں رک گئی..... ان دو تین گھنٹوں میں میں نے بہت باتیں کیں ..... میں نے اسے بتایا کہ میں نے کبھی کسی خاتون کو بہن نہیں کہا ..... دوستوں کی بہنیں یا ان کے خونی رشتے میرے لئے بھی مقدس ہوتے ہیں۔ میں نے آپ کو بہن کہنا قبول کر لیا، مگر بھابی نہیں کہہ سکتا۔ کہ وہ ایک ہی ہے ..... قتیل کے بچوں کی ماں.....! رشمی جی، آپ عشق ضرور کریں ..... ڈنکے کی چوٹ پر کریں، لیکن دو گھر تباہ نہ کریں ..... آپ کی بیٹی سات آٹھ برس کی ہے ..... آپ کو اندازہ نہیں کہ اس پر کیا اثر پڑے گا؟ ..... پھر قتیل دو گھروں ہی میں نہیں، دو ملکوں میں بٹ کر رہ جائیں گے..... وغیرہ!!

میں جذباتی آدمی عشق سمندر کا شناور ہونے کے باوجود نصیحت کرنے کی حماقت کر بیٹھا..... مگر میرا مقصد صرف ''شادی'' کے عزائم کو روکنا تھا۔ مجھے قتیل صاحب کا چندر کانتا والا زمانہ تو معلوم نہیں، لیکن بعد کی ساری ''وارداتوں' کا عینی گواہ ہوں۔ اقبال بانو کے لئے قتیل صاحب نے جس طرح خود کو سماجی اور مالی طور پر برباد کیا، وہ بھی سامنے تھا۔ ٹھوکر کھا کر بظاہر سنبھل گئے تھے، مگر پھر ایک آدھ ادھوری ملاقات کے بعد یہ گنگنانے لگے تھے..... ع

بھیج رہی ہے اب تک مجھ کو چاہت کے پیغام
سانولی سی اک عورت جس کا مردوں جیسا نام

قتیل شفائی نے اس آپ بیتی میں جسے آوارگی کہا ہے، دراصل وہ ان کی مضطرب روح اور رومان پسندی کا پرتو تھا ..... یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے اور اس میں کچھ تعلق جینز

(GENES) کا بھی ہوتا ہے۔ میں اس فلسفے پر..... ''گوہر فشانی'' تو نہیں کرتا' لیکن اتنا کہوں گا کہ ایسے شخص کہیں نہ کہیں کھبے اور مشغول رہنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے شعوری اور لاشعوری طور پر کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔ بقول اقبال۔

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے

لطف کی بات یہ ہے کہ قتیل صاحب نے اپنی اس آپ بیتی میں' راجندر سنگھ بیدی کے بڑھاپے کے عشق (اور شادی) کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے اور عالم محفلوں میں بھی اس عمل کے خلاف زور بیان صرف کیا کرتے تھے۔ ایک بار ''بیسویں صدی'' دہلی کے مدیر رحمٰن نیرؔ ان کے ہاں مہمان تھے۔ ڈاکٹر سلیم اختر تھے' نوید تھا' میں تھا اور شاید کوئی اور بھی ہوگا..... سلیم اختر نے بیسویں صدی' کی معاون مدیرہ شمع زیدی کا حال پوچھا' تو رحمان نیرؔ صاحب نے جھٹ سے جواب دیا ''ہم نے ان، کے ساتھ شادی کر لی ہے.....!''

بات سیدھی سی تھی' مگر قتیل شفائی اللہ کے فضل سے اتنے ''منہ پھٹ تھے'' کہ تڑاخ سے جملہ مار دیتے تھے۔

''میرے والد کہا کرتے تھے' دوسری شادی کرنے سے بہتر ہے بندہ ''ناجائز'' کر لے (قتیل نے ایک عریاں لفظ استعمال کیا تھا)''

رحمٰن نیرؔ صاحب ہکا بکا رہ گئے اور سلیم اختر نے بھی سر نیہوڑا لیا..... قتیل نے پہلے جملے کے بعد ذرا سا وقفہ دیا اور کہا۔

''اگرچہ میرے والد نے بھی دو شادیاں کی تھیں' مگر اس کی وجہ اور تھی۔؟''

پتا نہیں' وجہ کیا تھی' ہمیں تو نہیں بتائی' لیکن انہوں نے اسے دل میں کہیں چھپا رکھا تھا اور اپنے کسی ایسے ہی موقع پر اس کا ارتکاب کر لینے کی ٹھان لیتے تھے۔

رشمی میرے ساتھ تو ہاں میں ہاں ملاتی رہی..... پھر سے میری شاعرانہ نثر کی اور میری خوش کلامی کی تعریف کرتی رہی۔ قتیل شفائی سے میرے گہرے تعلق کو بھی تسلیم کر لیا' میری مذکورہ کتاب کے منصوبے کو بھی سراہا اور بتایا کہ انہوں نے اپنے اور قتیل کے عشق پر فلمی

کہانی لکھی ہے، جس کے ہدایت کار گلزار ہوں گے' مجھے خود بھی گلزار سے ملنا تھا..... فون کیا' تو قتیل صاحب بھی ساتھ جانے کو تیار ہو گئے ..... اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد قتیل سے گلزار سے پوچھا.....

''رشمی بادشاہ نے آپ سے کسی فلم کی ہدایات کی بات کی ہے.....؟

گلزار نے حیرت سے قتیل شفائی کو دیکھا اور صاف کھرا جواب دیا کہ آج تک یہ بات تو کیا کوئی اور بات بھی نہیں ہوئی۔!''

مجھے احساس ہے کہ مضمون کے صفحے بھرتے جا رہے ہیں' بات پھسلتی اور پھیلتی ہی جا رہی ہے' مگر یہ قتیل کی آخری عمر اور اس سے جنم لینے والی شاعری کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے.....

اگلے روز' قتیل شفائی مجھ سے اکھڑے اکھڑے تھے۔..... میں بھانپ گیا کہ کیا معاملہ ہے' مگر خود بات نہیں چھیڑنا چاہتا تھا..... اس دن صابردت آ گئے ..... ہم دونوں بیٹھے رہے' قتیل چلے گئے۔ کہاں.....؟ یہ کیا بتانا.....!

میں نے صابردت سے کہا ..... دلی کا ٹکٹ دلوا دو ..... ان دنوں بمبئی میں ہفتہ بھر سے مسلسل بارش ہو رہی تھی..... صابر نے حیرت سے پوچھا اتنی جلدی کیوں.....؟ میں نے بارشوں کا بہانہ بنایا۔ اور واپسی کی ٹھان لی۔ قتیل صاحب نے بھی روکنے کی کوشش نہیں کی..... جب انہوں نے مجھے الوداع کہا تو میں نے صرف ایک جملہ کہا..... ''رشمی نے جو کچھ آپ سے کہا ہوگا ..... وہ یک طرفہ ہے ..... آپ کو کبھی موقع ملے تو اس پر بات کر لیں۔ دل میں میل نہ لائیں .....!'' قتیل صاحب نے اپنی دائمی مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا..... بات کریں گے''

یہ وہ زمانہ ہے' جب قتیل بھارتی فلم انڈسٹری پر چھانے والے تھے۔ فلم ساز گلشن کمار سے معاملہ رکا تھا' ٹوٹا نہیں تھا..... مہیش بھٹ نے خود ان سے رابطہ کیا' اور قتیل صاحب کے کسی وضع دارانہ جملے پر بے ساختگی سے کہا..... ''قتیل صاحب' آپ تو ہمیں کروڑ پتی بنانے آئے ہیں۔''

ابھی چند ماہ پہلے، جب مہیش بھٹ اور پوجا بھٹ کراچی پہنچے تو ایک ٹیلی ویژن کے انٹرویو میں انہوں نے بڑی محبت سے قتیل شفائی کو یاد کیا تھا۔ مہیش بھٹ کی فلم ''سر (SIR)'' کے گیتوں نے قتیل شفائی کی دھوم مچادی تھی۔ اس کے بعد مہیش بھٹ نے اداکارہ پروین بابی سے اپنی عشق کہانی پر ٹیلی فلم ''پھر تیری کہانی یاد آئی'' بنائی، تو اس میں بھی قتیل ہی کے گیت تھے۔ ایک اور فلم ''ناراض'' بھی قتیل ہی نے مکمل کرنا تھی، مگر ایک دو گیتوں کے بعد قتیل صاحب، عشق کی دلدل میں دھنستے گئے، اور ضروری کام ادھورے رہنے لگے۔ فلم والے تو یہاں پاکستان میں انتظار نہیں کرتے اور پھر دوسرے نغمہ نگار اور حاسدین الگ سے ''کانٹیاں'' مار رہے ہوتے ہیں، اور وہ بھی بھارت میں، کسی غیر ملکی کو کیسے برداشت کیا جا سکتا تھا۔

میں واپس آیا، تو بھابی (اصلی اور حقیقی بھابی) نے مجھ سے اپنے ٹھیٹھ پہاڑی لہجے میں پوچھا..... (جھنجھلا کر) قتیل نے وہاں شادی کر لی ہے؟

میں نے پرزور تردید کی، مگر ان کی تسلی نہ ہوئی۔

قتیل واپس آئے، مجھ سے ملنے بھی آئے، میں بھی گھر گیا، مگر وہ کھلے نہیں..... میں نے نوید سے کہا..... ''تمہاری ہونے والی امی نے ہماری پینتیس سالہ دوستی پر پہلا دھاڑا مارا ہے''..... نوید نے دکھ سے ہنستے ہوئے کہا..... ''آپ اکیلے ہی نہیں پورا گھر اتھل پتھل ہو رہا ہے.....!'' قتیل صاحب نے انہی دنوں میں کسی مشترکہ دوست سے کہا..... ''اظہر جاوید نے رشمی کو پٹانے کی کوشش کی تھی، حالانکہ وہ میرا خط بھی پڑھ چکے تھے، جس میں، میں نے رشمی کو قتیل صاحب کے حوالے سے بہن لکھا تھا اور وہ خود قتیل کی موجودگی میں مجھے اظہر بھائی کہتی رہی..... اور پھر وہ وقت بھی آیا، جب قتیل علالت مرگ میں مبتلا تھے۔ اس زمانے میں طیب بادشاہ کا انتقال ہو چکا تھا، رشمی (بقول اس کے) قلاش ہو کر اپنے والدین کے پاس کان پور آ گئی تھی اور وہاں سے قتیل صاحب کو ''بے آرام اور پریشان کرنے کے لئے اپنی پریشانیوں کو جو کتھا لکھتی تھی، اس میں یہ (ان ہونی) بھی لکھی کہ اس کے سگے بھائی نے اس سے ''ملاپ'' کی آشا کی ہے کہ دونوں ''مطمئن'' رہیں گے اور کسی کو کانوں کان خبر

بھی نہیں ہوگی۔ یہ اور ایسے ہی کئی اس حسینہ کے روپ تھے' مگر قتیل تو اسے دیوی سمان مانتے تھے.....

خیر..... چند دنوں بعد قتیل میرے ساتھ نارمل ہو گئے۔ وہی رازداری کی باتیں..... اس کی شاعری کی تعریف..... اس کے خطوں کی تفصیل اور اپنی وارداتی شاعری کا بیان..... نہ انہوں نے بمبئی کی بدگمانی کا ذکر کیا' نہ میں نے اسے چھیڑا۔

بیمار پڑنے سے پہلے' قتیل شفائی جیسے تیسے شکیل نورانی کی فلم ''بڑے دل والا'' کے گیت لکھ کر آئے اور ایک گیت اب' ان کی وفات کے دو سال بعد چاروں طرف گونج رہا ہے۔ فلم کا نام ہے..... وہ ترا نام تھا..... اور اس کا نمایاں گیت ہی یہی ہے.....

جس کی جھنکار میں' دل کا آرام تھا' وہ ترا نام تھا
میرے ہونٹوں پہ رقصاں جو اک نام تھا' وہ ترا نام تھا

قتیل کی بیماری کی طوالت میں طبی وجوہات کے علاوہ رشمی کی طرف سے لگنے والے کچوکے بھی اہم ہیں۔ میں خدانخواستہ اس محترم خاتون پر کوئی الزام نہیں دھر رہا۔ اس بات کی گواہی قتیل کے چند اور قریبی دوست اور قتیل فیملی دے سکتی ہے۔ پہلے رشمی کے خط براہ راست آتے تھے مگر جب بھابی (بیگم سکینہ قتیل) نے فیل مچایا' تو ''تخلیق'' کی معرفت آنے لگے۔ جب رشمی بمبئی سے بیوہ ہو کر کان پور پہنچی' تو کچھ دیر کے لئے ''لاپتا'' ہو گئی..... تب میں نے ہی ''تخلیق'' میں چھپنے والے کان پور کے دوستوں کی معرفت اس کا کھوج لگوایا اور پتا حاصل کیا..... مجھ سے رنجیدگی کے دنوں میں ڈاک الحمد پبلی کیشنز پر جانے لگی اور جب قتیل خود لکھنے کے قابل نہ رہے تو کسی اور سے یہ خدمت لیتے رہے.....

یہ قتیل شفائی کی زندگی کا سب سے بھرپور زمانہ ہے' بیماری اور لاچاری' یا اس سے پہلے بھارت نوردی..... اس سارے عرصے میں قتیل کبھی بالکل بچہ ہوتے' کبھی نوجوان اورنگ زیب اور پھر دانا بینا قتیل شفائی بن جاتے..... اس کی زیادہ تصدیق نوید اور ارم کر سکتے ہیں۔

بیماری کے دوران ممتاز افسانہ نگار طارق محمود نے' میری گزارش پر قتیل شفائی کا بہت

ساتھ دیا..... سیکرٹری اطلاعات کی حیثیت میں اور سیکرٹری صحت بن کر بھی..... حضرت علیؓ کا قول ہے۔

''کسی پر احسان کر کے بھول جاؤ اور کوئی احسان کرے تو اس کا ذکر ضرور کرو''۔

نیکی کا ذکر روشنی کی طرح تاریک دلوں کو بھی منور کر دیتا ہے۔

رشمی کو قتیل کی بیماری کی تشویش تو تھی..... وہ پاکستان بھی آنا چاہتی تھی' مگر جب اپنی مالی پریشانیوں اور بے گھری کی مجبوریوں کا ذکر کرتی' تو سنبھلتے سنبھلتے قتیل پھر لڑکھڑا جاتے .....شاید اس میں رشمی کا قصور نہ بھی ہو کہ وہ اور کس سے حال زار کہتی.....

اس مرض الموت سے ذرا پہلے قتیل کو ایک اور شدید جھٹکا لگا تھا..... نوید کے خلاف بے گناہی میں محکمانہ کارروائی نے بڑا سنگین رخ اختیار کر لیا..... نوید کسٹمز ہاؤس ہی میں پابند کر لئے گئے' اور کسی کو دو تین دن تک ملنے کی اجازت بھی نہیں تھی..... میری ''میں میں'' بڑھتی جا رہی ہے لیکن بھابی' ارم اور دوسرے خاندان والے (نوید سمیت) جانتے ہیں' کہ بے چارگی کے ان عجیب لمحوں میں' ہر پل قتیل کے ساتھ رہا اور جب نوید کے محکمانہ ساتھی قتیل صاحب کو ڈھارس بندھانے آتے اور نوید کو حوصلہ دیئے جاتے تو اس وقت قتیل نے نہایت بے ساختگی سے خود پر قابو پاتے ہوئے موبائل فون پر نوید کو تسلی دی.....

''بیٹے' تم تو خوش قسمت ہو' تمہارے اتنے سارے دوست ہر دم تمہارے ساتھ ہیں۔ میرے سینکڑوں دوستوں میں سے صرف اظہر جاوید صاحب ہی مجھے سہارا دیئے ہوئے ہیں.....' (وہ ہمیشہ میرے نام کے ساتھ صاحب ہی لگاتے تھے)

اپنی لاڈلی بہن کی وفات کے بعد قتیل کو یہ دوسرا بڑا صدمہ پہنچا..... المیہ دیکھیں' کہ قتیل نے جن کے ساتھ پچاس پچاس برس تک نیاز مندی رکھی' وہ نہ ان کی بہن کے جنازے میں شریک ہوئے نہ تین دن تک افسوس کرنے آئے اور بڑی معصومیت سے اپنی بے خبری کا اعلان کر دیا..... قتیل کے غم اور خوشی کی خبر تو شہر کیا' ملک بھر میں پھیل جاتی ہے..... کیا ''قریبیوں'' کو اطلاع نہیں ہوئی تھی.....؟ قتیل جب اس دکھ کا اظہار کرتے تو ان کی آنکھیں بھیگ بھیگ جاتی تھیں..... میں نے ایسے زندہ دل اور شگفتہ مزاج کو دو چار

بار ہی روتے دیکھا تھا۔ اپنی بہن کی وفات (اور متذکرہ واقعہ) پر' نوید کو ملنے والی بے جا سزا کے دنوں میں اور پھر انتہائی بے بسی میں رشمی کے ہجر میں.....

قتیل نے اپنی یہ آپ بیتی' جس کا نام میں نے ''گھنگرو ٹوٹ گئے'' سوچا ہے اور جسے نوید اور ارم نے بھی پسند کیا ہے' ادھوری ہی چھوڑی' بلکہ وہ جہاں کئی اہم واقعات چھوڑ گئے' وہیں کئی نام بھی غلط بول گئے' یا کیسٹ سے نقل کرنے میں درست نہ رہے..... میں نے حتی الوسع انہیں ٹھیک کر دیا ہے..... اس نام ''گھنگرو ٹوٹ گئے'' کی افادیت اور اہمیت کئی حوالوں سے ہے..... اس کی مقبولیت اور پھر اس کی چوری کا ذکر تو خود قتیل نے اپنے لفظوں میں کیا ہے' لیکن میں اسے قتیل کی زندگی اور موت سے بھی منطبق کر رہا ہوں۔ بھارت کے مشاعروں میں ہمیشہ قتیل صاحب سے اس گیت کی بالاصرار فرمائش ہوتی تھی..... پھر قتیل کی اپنی زندگی بھی ویسی ہی کھنکتی اور چھنکتی ہوئی تھی اور ایک موت کا گھنگرو بھی ہوتا ہے..... جب سانس اکھڑتی اور رک رک کر چلتی ہے..... ہم نے قتیل کا وہ منظر بھی دیکھا تھا۔

جب قتیل کا جنازہ اٹھا تو راولپنڈی سے آئے ہوئے سلطان رشک نے بڑا اچھا جملہ کہا..... ''لاہور کا ایک مہمان گھر ختم ہو گیا ہے!

واقعی' قتیل کے لئے شام اکیلے گزارنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا تھا وہ کسی نہ کسی کو آواز دے دیتے تھے۔ غیر ملک سے کیا پاکستان ہی کے دوسرے شہر سے کوئی شاعر ادیب آیا ہو' تو قتیل سب سے پہلے اسے دعوت پر بلاتے تھے۔ ایسے میں جب سب دوست شغل میں لگے ہوتے تو قتیل نوید کو کہتے ''یار..... اظہر جاوید صاحب کا کیا قصور ہے۔ انہیں تو بھوکا نہ ماریں''۔ پھر مجھے دیکھتے اور کہتے'' جائیں آپ اندر جا کر کھانا کھالیں.....''

یہ قتیل کی دوستوں کی مزاج شناسی اور ناز برادری کی ادا تھی۔ انہیں پتا تھا' میں دوپہر میں کھانا نہیں کھاتا' اور ان کے شام کے مشغلے میں بھی شریک نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ متفکر ہو جاتے تھے۔ یہیں پاکستان ہی میں نہیں' بھارت یا دبئی میں بھی' جہاں ان کا ساتھ ہوتا' وہ میرے کھانے پینے (چائے پینے کی) ہر عادت کا خصوصی خیال رکھتے.....

دبئی سے خیال آیا' انہوں نے تو اس جشن قتیل کا بھی ذکر نہیں کیا' جو مرحوم سلیم جعفری

نے نہایت شان سے منایا تھا..... اس میں بھارت سے شعراء کے علاوہ سنیل دت مہمان خصوصی کی حیثیت میں بلائے گئے۔ سنیل دت نے قتیل سے اپنی اور نرگس (مرحومہ) کی والہانہ عقیدت کا اظہار کیا اور نہایت سوجھ بوجھ سے ان کی شعری عظمت کو سراہا..... اس سلسلے میں مشاعرے تو خلیج کے دو تین شہروں میں ہوئے مگر دبئی ہی میں، جشن کے اگلے روز اقبال بانو نے قتیل کو سامنے بٹھا کر، یا ان کے سامنے بیٹھ کر، یوں قتیل کا کلام گایا کہ اس رات جب نوید، ارم، سلیم جعفری، شاہدہ سلیم، اور ندا وغیرہ کھانا کھا رہے تھے، تو قتیل اور اقبال بانو پرے بیٹھے اس طرح ایک دوسرے میں غرق تھے کہ لگتا تھا، بیس سال پرانا عشق کا زمانہ پھر لوٹ آیا ہے..... مجھے خاص طور پر شاہدہ سلیم نے متوجہ کر کے کہا۔

''ذرا بڑھاپے کے عشق کی بے پروائی دیکھیں.....!

اقبال بانو سے پہلے نوید قتیل نے محفل کا آغاز کیا۔ اس کی یہ پہلی بین الاقوامی اور کوئی بھی بڑی تقریب تھی۔ نوید نے یوں سماں باندھا کہ اقبال بانو نے بھی بے اختیار داد دی ..... میں نے قتیل صاحب سے آہستگی میں پوچھا..... ''پرانا رشتہ تو بیدار نہیں ہو رہا۔''

قتیل صاحب سے یہ ذکر بھی رہ گیا ہے کہ نوید کی شالیمار ریکارڈنگ کمپنی اور ای ایم آئی سے دو کیسٹ (آڈیو البم) ریلیز ہو چکی ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی گاتا رہا ہے۔ اب شاید افسر بن گیا ہے، اس لئے یہ شوق ترک کر بیٹھا ہے..... تنویر کا تذکرہ بھی چھوٹ گیا..... اس نے فلم میں باقاعدہ ہدایت کاری کی تربیت لی اور برصغیر کی پہلی ہندکو فلم ''قصہ خوانی'' ڈائریکٹ کی۔ پرویز، بہت اچھا فوٹو گرافر ہے اور ابھی تک اس شوق کو اپنائے ہوئے ہے..... دبئی کے جشن قتیل کی اس نے ویڈیو فلم بھی بنائی تھی۔ ثمینہ، شادی سے پہلے شاعری کرتی رہی اور رسائل میں چھپنے کے علاوہ ریڈیو سے بھی اس کا ایک آدھ گیت نشر ہوا تھا۔ مسرت کا ذکر تو قتیل خود کر چکے ہیں۔

میرا خیال ہے، قتیل صاحب نے یہ آپ بیتی 95ء، 96ء میں ریکارڈ کروانا شروع کی تھی۔ اس کے بعد جہت تبدیلیاں آ گئیں، اگر انہیں نظر ثانی کا وقت ملتا، یا اسے مکمل کرنے کا خیال آتا، تو بہت کچھ مختلف بھی ہوتا..... جن لوگوں کا انہوں نے زندہ ہونے کے حوالے

سے ذکر کیا ہے۔ ان میں سے کئی ان کی زندگی میں مر گئے اور کئی بعد میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ حیدر آباد دکن کے اخبار ''ریاست'' اور اس کے ایڈیٹر کا ذکر آیا ہے' ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ ابراہیم جلیس اور دہلی میں مقیم معروف طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے بھائی تھے' جنہیں نارنگ ساقی کی بیگم اپنے بھولپن اور سادگی میں مشتبہ..... کہہ جاتی ہیں۔ اوتار سنگھ جج کے نام کے ساتھ دلیپ سنگھ کا نام بھی جڑا ہونا چاہیے' وہ تو قتیل کی زندگی ہی میں مر گئے تھے۔ قیوم نظر' فارغ بخاری' رضا ہمدانی' ظہیر کاشمیری' احمد ظفر' محسن نقوی' قمر اخبالوی' حسن طاہر' موسیقار چشتی' ہدایت کار ہمایوں مرزا سب ان کے ہوتے وفات پا گئے تھے..... مسعود پرویز' احمد راہی' نور جہاں' اور قمر جلال آبادی کا بعد میں انتقال ہوا' اندی ور بھی ان کے جیتے جی آنجہانی ہو گئے تھے۔ نریش کمار شاد کے والد نے بیٹے کی اس گستاخی' جس کا ذکر قتیل نے کیا ہے' سے دکھی ہو کر خودکشی (آتما ہتیا) کی تھی..... اسی کمپلیکس اور ضمیر کے بوجھ کے تحت عرصے بعد نریش کمار شاد بھی ڈوب مرا..... یہ مجھے اوتار سنگھ جج نے بتایا تھا۔

قتیل صاحب' بہت بے باک اور منہ پھٹ ہونے کی حد تک صاف گو تھے مگر نہ جانے کس مصلحت کے تحت انہوں نے کچھ لوگوں کے نام نہیں لکھے..... جس شاعر کو کتاب کا معاوضہ بڑھانے کا تقاضا کرنے پر ناشر نے تھپڑ مارا تھا' قتیل صاحب ان کا نام یوسف ظفر اور ناشر کا نام چودھری برکت علی بتایا کرتے تھے۔ اپنے ناشر کا نام بھی وہ گول کر گئے..... مجھے معلوم ہے' لیکن میں بھی نہیں لیتا کہ وہ نوجوان آج کل مجھ سے ناراض ہے..... اور زیادہ تلملانے لگے گا۔ ان کی فلم ''اک لڑکی میرے گاؤں کی'' کے ہدایت کار ہمایوں مرزا اور ہیروئن شمیم آرا تھیں..... صرف ریکارڈ درست کرنے کے لئے میں نے یہ نام لکھ دیئے ہیں۔

احمد ظفر سے قتیل کی نوعمری کی دوستی تھی..... کوئی بیس پچیس برس کے بعد ان دونوں میں اچانک بول چال بند ہو گئی۔ قطع تعلق سے ذرا پہلے احمد ظفر لاہور آ کر قتیل شفائی کے پاس ہی ٹھہرے تھے۔ انہیں نغمہ نگاری کا شوق تھا قتیل نے ایک پارٹی سے ملوایا۔ یہ ہدایت کار ریاض احمد کی فلم تھی' جس کی ایک فلم ''سسی پنوں'' ہٹ ہو چکی تھی۔ احمد ظفر کسی وجہ سے

زیادہ نہ چل سکے' اور ایک گیت ہی لکھ کر چھوڑ آئے۔ یہ رحمان ورما کی موسیقی میں ریکارڈ ہو کر فلم میں چلا بھی تھا..... پھر قتیل نے احمد ظفر کو ''اُردو ڈائجسٹ'' میں ملازمت دلوا دی۔ احمد ظفر سیماب صفت اور نہایت تنک مزاج تھے۔ خوش گپیوں پہ آتے تو صرف وہی محفل پہ چھائے رہتے' کسی کی کوئی بات کھل جاتی تو دوبارہ اسے منہ بھی نہ لگاتے (احمد ظفر نے ''قصہ خوانی'' فلم میں اداکاری بھی کی تھی) ..... پتا نہیں کیا ہوا..... شاید قتیل اور احمد ظفر دونوں کو بھی یاد نہیں رہا تھا کہ کون سی بات کس کو بری لگی تھی کہ دونوں نے ملنا جلنا ہی کیا بولنا تک چھوڑ دیا..... اور یوں بیس پچیس سال گزر گئے..... جب قتیل کی طویل علالت کی خبر احمد ظفر کو ملی' تو ان دنوں وہ خود بھی ماندے تھے مگر قتیل سے ملنے چلے آئے۔ ان دونوں کے چہرے پر اس وقت جو رونق تھی' اسے لفظوں میں بیان کرنا' ناممکن ہے..... اتفاق سے اسی دن احمد راہی بھی آ گئے ..... نوید نے جو تصویریں بنائیں..... ان میں قتیل' احمد ظفر' احمد راہی اور میں شامل تھے اور ایک گروپ میں الحمد پبلی کیشنز والے صفدر حسین بھی موجود رہے..... یہ یادگار تصویریں نوید قتیل کے پاس (شاید) محفوظ ہوں..... قتیل کے کچھ ماہ بعد احمد ظفر اور سال بھر بعد' احمد راہی بھی انتقال کر گئے ..... ممتاز مصور بشیر موجد سے بھی قتیل شفائی کی دوستی نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ پر محیط تھی۔ ایک زمانے میں تو قتیل کا ٹھکانا ہی' موجد کا نگارخانہ ہوتا تھا..... قتیل کی فلم سازی کے دور میں بھی' ایک طرح سے یہی ان کا فلمی دفتر رہا..... تعلقات میں اپنائیت کا یہ حال تھا کہ موجد کی شادی میں قتیل اور بیگم قتیل ہی پیش پیش رہے..... پھر کوئی دس پندرہ برس پہلے ان میں بھی دوری ہو گئی..... زیادتی کس کی تھی یا بے قصور کون تھا' اس کا فیصلہ بھی مشکل ہے..... لیکن بشیر موجد بھی ایک شام قتیل کے گھر چلے گئے۔ یقیناً دونوں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو مچل گئے ہوں گے..... وہ دونوں اکیلے تھے۔ موجد نے کہا..... ''قتیل میں بہت سرمایہ دار نہ سہی' مگر اللہ کے فضل سے اب بہت خوش حال ہوں۔ مجھے کوئی بھی مدد بتاؤ.....'' قتیل نے اپنی فالج زدہ آواز میں انکار کیا..... موجد نے ایک سادہ چیک پر دستخط کئے اور کہا ''اس پر جتنی رقم بھی چاہو بھر لو..... یا مجھے بتاؤ' اس وقت ہم دونوں اکیلے ہیں' صرف خدا گواہ ہے..... یہ میری محبت اور دوستی کی

تھوڑی سے رقم قطعی نا قابل واپسی ہے..... اللہ تمہیں تندرستی اور زندگی دے' میرے لئے یہی اطمینان کافی ہے....."

قتیل کی بھی خوش ظرفی ..... انہوں نے اپنے کمزور ہاتھوں سے موجد کے ہاتھ کو تھام اور لڑکھڑاتی زبان اور بولتی آنکھوں سے جتنا تشکر کہہ سکتے تھے کہہ دیا..... اور موجد سے دوستی کی تجدید اور محبت کے سوا کچھ بھی نہ لیا۔

لاہور سے باہر قتیل صاحب کے ساتھ جہاں بھی اکٹھے رہنے کا موقع ملا میں نے دیکھا' وہ سونے سے پہلے نہایت خضوع وخشوع سے خدا کے حضور لمبی دعا کرتے تھے..... مجھے نمازیں پڑھتا دیکھ کر کہتے' میرا بھی جی چاہتا ہے کم از کم صبح ہی کی نماز ادا کر لیا کروں ..... علالت کے دنوں میں وہ نہایت رقت سے توبہ تلا کرتے رہے اور ان دنوں میں ان کی زیادہ شاعری حمدیہ اور نعتیہ ہی رہی' یا پھر فراق اور کرب والی۔

قتیل شفائی کی وفات پر بھارت سے اور دوسرے ملکوں سے بھی نوید قتیل کو بہت خط اور فون ملے..... لیکن..... کئی ایسے بھی رہے جنہوں نے برسوں کے تعلق کے باوجود تعزیت یا پرسے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی..... قتیل کے چہلم پر دہلی سے نارنگ ساقی آئے ان کی ہمت کی داد دینا پڑتی ہے کہ نصف صدی کی رفاقت ٹوٹنے کا صدمہ (وہ ٹوٹے تو ہوں گے) کمال حوصلے سے سہار گئے۔

قتیل شفائی کی زندگی میں ہری پور میں' ان کے نام پر محلہ قتیل شفائی منظور ہوا' سمن آباد میں ان کی گلی کا نام قتیل شفائی سٹریٹ تھا' اب اس ساری سڑک کو ان کے نیاز مندوں نے سرکاری طور پر قتیل شفائی روڈ کا نام دلوا دیا ہے۔

میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ قتیل شفائی فرشتہ نہیں تھے۔ عام انسان تھے مگر بیشتر انسانوں سے ارفع تھے۔ ان میں بھی بشری کمزوریاں تھیں۔ ان کی کئی چھوٹی چھوٹی ''خامیوں'' کو میں اور ان کے یار عزیز شفیع عقیل یا نوید قتیل آپس میں بانٹ ..... SHARE کر لیتے ہیں۔ مگر یہ بات میں پورے ایمان سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ منافق نہیں تھے ..... آج کے انسان کی یہ بہت بڑی ..... (نا قابل یقین) خوبی ہے۔ نوید قتیل

نے ان کی مہمان نوازی کی رسم کو زندہ رکھا ہوا ہے..... خدا اسے مزید توفیق اور ظرف دے ..... میں نے ایک بار بھری محفل میں، جس میں بیگم سکینہ قتیل بھی موجود تھیں، یہ کہا تھا، کہ قتیل شفائی کے وسیع دسترخوان کا بہت چرچا رہا ہے۔ یہ سچ ہے، مگر اس میں زیادہ کمال بھابی کا ہے کہ انہوں نے ماتھے پر شکن ڈالے بغیر، وقت بے وقت آئے ہوئے قتیل کے بیک وقت بیس بیس دوستوں کا کھانا پکایا..... قتیل شفائی اپنی زندگی ہی میں اس بات پر خوش اور مطمئن تھے کہ ان کی بہو ارم نے اسی سلیقے، مہارت اور خوش ظرفی سے اپنی ساس سے یہ خوبیاں پالی ہیں ..... زندگی کے آخری برسوں میں اور اب تک بھی قتیل شفائی کا دسترخوان اسی طرح وسیع اور فراخ ہے، اور یہ ارم کی ہمت اور بھابی کی برکت کا کرشمہ ہے۔

میں اکثر قتیل صاحب سے کہتا تھا اور وہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ قدرت ان پر ہمیشہ بہت مہربان رہی تھی۔ جب بھی انہیں تنگ دستی ہوتی (اور وہ بھی صرف چند دنوں کے لئے) کہیں نہ کہیں سے بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر انہیں معقول رقم مل جاتی۔ کسی فلم کا ایڈوانس، کسی کتاب کی رائلٹی یا کوئی اور وسیلہ..... لطف کی بات یہ ہے، ویسے انہوں نے پرائز بانڈ بھی خرید رکھے تھے، مگر ان پر کبھی کوئی انعام نہیں نکلا تھا۔

ان کی طویل علالت سے ذرا پہلے حلقہ محبانِ قتیل کی طرف سے ان کی اکیاسویں سالگرہ دھوم دھام سے منائی گئی تھی۔ الحمراء میں ہونے والی یہ تقریب ان کے شایان شان تو تھی ہی، انہیں سپاس کے طور پر اکاسی ہزار روپے کا نذرانہ بھی پیش کیا گیا۔ اس کے دوسرے ہی دن وہ گھٹنے کے درد کی وجہ سے ہسپتال گئے ..... ارم انہیں لے کر گئی تھی۔ قتیل صاحب کا خیال تھا، دوا دارو کروا کر دو ایک دن بعد بھارت روانہ ہو جائیں گے۔ بس یہی ان کی زندگی اور عمر کا موڑ تھا..... ہسپتال ایسے گئے کہ پھر ہسپتالوں ہی کے ہو رہے..... ملنے جلنے والے کہنے لگے کہ تقریب ایسی بے مثال تھی کہ انہیں نظر لگ گئی ہے.....

دو چار برس پہلے، ایک ایسی ہی اور باکمال تقریب ''تخلیق'' کی طرف سے ایک پنج تارا ہوٹل میں بھی منعقد کی گئی تھی..... قتیل صاحب کے مداح ظفر عظیم نے اس کا اہتمام کیا تھا اور ضمیر جعفری اور شبنم شکیل اسلام آباد سے خراجِ تحسین پیش کرنے آئے اس تقریب میں بھی

انہیں چند ہزار روپے کے پرائز بانڈ تحفے میں دیئے گئے تھے۔

میں سوچتا ہوں ..... آج کل جس طرح پاکستان اور بھارت کے درمیان دوستی اور راہ و رسم کی جو نئی فضا بنی ہے، قتیل ہوتے، تو ان کی خوشی کا ٹھکانا نہ ہوتا..... جس طرح فلم ساز، ہدایت کار مہیش بھٹ نے کراچی آ کر ایک انٹرویو میں قتیل شفائی کو یاد کیا ہے، ایسی تحسین بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتی ہے.....

اب میں شرمسار ہونے لگا ہوں کہ بہت دیر تک پڑھنے والوں کو اپنی ''میں میں'' میں الجھائے رکھا..... آپ قتیل شفائی کی آپ بیتی کے ساتھ ساتھ چلیں..... میں جو وعدہ قتیل سے زندگی میں نہ نبھا سکا۔ انشاء اللہ اب پورا کر دوں گا..... ایک کتاب، مکمل کتاب ضرور ان کے نام لکھ دوں گا، خدا مجھے بھی قتیل شفائی جیسا ظرف اور روشن ضمیر دے۔ ان کی زندگی ہی میں ''تخلیق'' کا قتیل شفائی نمبر چھاپنے کا ارادہ ہوا تھا..... ہم نے تھوڑا بہت ذکر کیا اور بشیر نیاز (مرحوم) اور سعید ساحلی نے مضامین لکھ کر بھی دے دیئے۔ یہ منصوبہ بھی نامکمل رہ گیا..... وجہ.....؟

اظہر جاوید

○

مجھے آئی نہ جگ سے لاج..... میں اتنے زور سے ناچی آج
کہ گھنگرو ٹوٹ گئے

کچھ مجھ پہ نیا جوبن بھی تھا
کچھ پیار کا پاگل پن بھی تھا
کبھی پلک پلک مری تیر بنی
کبھی زلف مری زنجیر بنی
لیا دل ساجن کا جیت ..... وہ چھیڑے پایلیا نے گیت
کہ گھنگرو ٹوٹ گئے

میں بسی تھی جس کے سپنوں میں
وہ رُگنے گا اب مجھے اپنوں میں
کہتی ہے مری ہر انگڑائی
میں پیا کی نیند چُرا لائی
میں بن کے گئی تھی چور ..... مگر مری پایل تھی کمزور
کہ گھنگرو ٹوٹ گئے

دھرتی پہ نہ میرے پیر لگیں
بن پیا مجھے سب غیر لگیں
مجھے رنگ ملے ارمانوں کے
مجھے پنکھ لگے پروانوں کے
جب ملا پیا کا گاؤں..... تو ایسا لچکا میرا پاؤں
کہ گھنگرو ٹوٹ گئے

ابتدائی زندگی

میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ اس لحاظ سے قطعاً غیر ادبی اور غیر علمی تھا کہ اس ماحول سے وابستہ لوگ، جن میں میرا اپنا خاندان بھی شامل تھے، پیسے کے پیچھے بھاگ رہے تھے اور انہیں اس چیز کا قطعاً احساس نہیں تھا کہ علم بھی زندگی کے لئے ضروری ہے اور علم سے آگے بڑھنے والا ایک راستہ ادب کا بھی ہوتا ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب انگریز کا پرچم اپنی پوری شان کے ساتھ فضاؤں میں لہرا رہا تھا اور لوگوں کو غیر ملکی غلامی کے ماحول میں اور فکر کم ہوتی تھی پیسہ کمانے کی فکر زیادہ ہوتی تھی یا پھر سرکاری دربار میں رسائی حاصل کرنے کے مواقع تلاش کرنا ان کا مطمح نظر ہوتا تھا۔ میرے خاندان کا المیہ یہ تھا کہ ہر شخص تقریباً لکھ پتی تھا لیکن تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ان میں سے کوئی سرکاری دربار میں اوپر تک تو نہیں پہنچ سکا مگر ان پڑھ ہونے کے باوجود مقامی میونسپلٹی کی پریذیڈنٹ شپ تک ان لوگوں میں سے گئے۔

میں جب پیدا ہوا تو اس وقت مجھ سے پہلے گھر میں کوئی اولاد نہیں تھی۔ معاملہ یہ تھا کہ میرے باپ نے جب پہلی شادی کی تو کافی عرصہ تک کوئی اولاد نہ ہوئی۔ خاندان کے اور گھریلو مشورے سے انہیں مجبوراً دوسری شادی کرنا پڑی جس سے 24 دسمبر 1919ء کو میں اپنے آبائی گاؤں ہری پور ہزارہ میں پیدا ہوا۔ چونکہ یہ میرے والد کی پہلی اولاد تھی اس لئے میری پیدائش پر بہت جشن منایا گیا۔ میری تولید کے تین سال بعد میری بہن پیدا ہوئی اور خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اسی دوران پہلی ماں سے بھی ایک بچہ ہو گیا اور وہ ہمارے گھر میں آخری بچہ تھا۔ گویا ایک ماں سے دو اولادیں ہوئیں اور دوسری ماں سے ایک جن کی کل

تعداد تین بنتی ہے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔

میرے والد کی دو شادیوں میں کوئی معاملہ معاشقے' آوارہ گردی یا عیاشی کا نہیں تھا بلکہ ایک ضرورت کے تحت میرے والد نے دو شادیاں کی تھیں' اس لئے گھریلو ماحول پُرسکون رہا اور دونوں مائیں ایک دوسرے کا احترام کرتی تھیں اور ایک دوسرے کے بچوں سے بھی پیار کرتی تھیں۔ اس کے باوجود ظاہر ہے کہ دوشادیوں کی قباحتیں اپنی جگہ ہیں۔ کبھی کبھی وہ پہلو بھی سامنے آ جاتا تھا لیکن عام طور پر حالات خوشگوار ہی رہے' سوائے اس کے میرے والد گھریلو اخراجات اور ضرورتوں کے بڑھنے کی وجہ سے کاروبار اور محنت کا سلسلہ بڑھانے پر مجبور تھے اور اس کے علاوہ انہیں ایک اور طرف جانا پڑ گیا جسے ہم شرفاء کی زبان میں ایک اچھا کام نہیں بھی کہہ سکتے اور وہ کام تھا کارنیوال۔ سیدھے لفظوں میں ہم اسے جوا کہہ سکتے ہیں۔ یہاں میں یہ وضاحت کردوں کہ ہر اچھائی اور برائی کی کچھ سطحیں ہوتی ہیں۔ ایک اچھائی کی سطح اتنی گہری ہوتی ہے کہ اچھائی ہونے کے باوجود ہم اسے پسند نہیں کرتے اور ایک برائی کی سطح اتنی بلند ہوتی ہے کہ وہ برائی زیادہ کھلتی نہیں۔

میرے والد کا حلقہ احباب متحدہ ہندوستان کے بڑے بڑے روسا کا تھا جو اپنے وقت میں بہت بڑے سرمائے کے ساتھ شغف کرتے تھے۔ ان کے ساتھ جنہوں نے کارنیوال کا کاروبار شروع کیا' اس میں میرے والد سمیت پارٹنر تھے۔ اس کاروبار میں انہیں اچھی خاصی آمدنی ہوتی تھی جو کہ پوری طرح جائز کمائی سے کہیں زیادہ ہوتی تھی۔

اس صورت میں میری پرورش ایک امیرانہ ماحول میں ہوئی اور میں ناز و نعم میں پلا لیکن یہ ساری چیزیں ہونے کے باوجود راستے میں ایک قسمت کی دیوار بھی ہوتی ہے۔ بچپن ہی میں والد رخصت ہو گئے جن کے بل بوتے پر یہ ساری عیش و عشرت کی فضا قائم تھی۔ جب تک وہ زندہ رہے۔ انہوں نے میری ہر خواہش پوری کی۔

پانچویں جماعت میں جب میں سکول میں بزم ادب کا سیکرٹری بن گیا تو انہوں نے میری پوری کلاس اور متعلقہ اساتذہ کو ایک اچھی خاصی دعوت دے ڈالی جیسے آجکل کوئی کونسلر منتخب ہو جائے۔ اسی طرح اس زمانے میں مجھے موسیقی کا شوق تھا تو انہوں نے ایک

گراموفون اور اس سے متعلقہ چیزیں مجھے فراوانی سے مہیا کر دیں۔ پھر سیاحت کا شوق ہوا تو جہاں میں نے جانا چاہا۔ انہوں نے اس ہدایت کے ساتھ کہ اچھی کلاس میں سفر کرنا مجھے دوستوں کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔

ابتدا ہی سے میرے لئے مشہور تھا کہ میں خوش لباس' خوش گفتار اور خوش خوراک ہوں۔ یہ سب چیزیں مجھے اپنے والد کی طرف سے ملی ہوئی تھیں۔ انہوں نے میری تربیت کچھ اس رنگ میں غیر محسوس طور پر کی تھی کہ انہوں نے مجھے زندگی کا قرینہ اور مجلسی آداب سکھائے۔ جب انہیں محسوس ہوا کہ میرے اندر تھوڑا سا ادب کا شائبہ بھی ہے تو انہوں نے بہت سے ادبی کتابیں بھی مجھے مہیا کر دیں حالانکہ اس دور میں ادبی کتابیں بہت کم ہوتی تھیں۔ وہ الف لیلیٰ اور حاتم طائی وغیرہ کی کہانیاں اس بہانے مجھ سے پڑھاتے تھے کہ خود بہت کم پڑھے ہوئے تھے۔ اکثر مجھے کہتے کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لئے یہ کتاب مجھے پڑھ کر سناؤ اور یوں سننے کے بہانے وہ مجھے پڑھاتے تھے۔

شاعری کی صرف وہی کتابیں میرے ہاتھ آتی تھیں جو گورنمنٹ ہائی سکول ہری پور کی لائبریری میں میسر تھیں۔ اس زمانے کے گراموفون ریکارڈوں میں آج کی طرح گھٹیا شاعری نہیں ہوتی تھی بلکہ اساتذہ کا کلام ہی ہوتا تھا۔ میرے پاس جو ریکارڈ تھے ان میں زیادہ تر غالب' امیر مینائی اور ذوق کا کلام تھا۔ زیادہ تر گانے والے اساتذہ ہی کا کلام گاتے تھے۔ میرے والد مجھے چن چن کر ایسے ریکارڈ مہیا کرتے تھے جن میں شاعری کا ایک معیار ہوتا تھا اور یوں میری ذہنی پرورش ہوتی رہی۔

جب میں چھٹی کلاس میں تھا اور بزم ادب کا سیکرٹری بھی تھا تو سکول میں مضمون نویسی اور شاعری کا مقابلہ ہوا۔ اس مقابلے میں مجھے اپنی نظم پر انعام میں ایک کتاب ''سوز بیدل'' ملی۔ بیدل پشاور کے شاعر تھے۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر خواجہ محمد اشرف تھے۔ وہ ہمارے کرایہ دار بھی تھے اور ان سے ہمارے گھریلو تعلقات بھی تھے۔ ان کی مجھ پر بڑی توجہ تھی اس لئے مجھے انعام ملنے پر وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی

میرے والد کی وفات کے وقت ہماری پوری فیملی میں پڑھے لکھے لوگ نہیں تھے اور

انہیں بالکل احساس نہیں ہوا کہ اس لڑکے کو آگے جینا بھی ہے۔ انہوں نے میری ماں کو مشورہ دیا کہ اب باپ کا سایہ سر پر نہیں ہے۔ اس لئے لڑکے کو کاروبار کروا دو۔ اس وقت میرے دو تایا موجود تھے۔ ایک تایا فاتر العقل تھے اور بڑی مدت سے پاگل چلے آ رہے تھے۔ وہ گویا ایک سرپرست کے فرائض ادا نہ کر سکتے تھے۔ دوسری تایا بھی اکثر بیمار رہتے تھے۔ یہ دونوں ایک طرح سے ہماری فیملی کی ذمہ داری بن چکے تھے اور ان کی نگہداشت بھی ہمیں کرنا پڑتی تھی۔

میری ماں بہت سادہ عورت تھی اور بالکل ان پڑھ تھی۔ وہ بھی اس سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی جس میں باقی ساری فیملی۔ اس وقت میری عمر تقریباً سولہ برس تھی۔ مجھے کہا گیا کہ کاروبار کرو۔ کاروبار کے بارے میں مجھے کوئی تجربہ یا ٹریننگ نہ تھی۔ سب سے پہلے مجھے فٹ بال یا سپورٹس کی دکان کھول کر دی گئی اس لئے کہ سپورٹس سے میرا تعلق تھا۔ اس کاروبار میں کوئی فائدہ ہوا نہ ہونا تھا کیونکہ مجھے دوکانداری کا کوئی تجربہ ہی نہیں تھا۔ تمام کاروبار پرانے کاروباریوں کے ہاتھ میں تھا۔ بلکہ سکول کے لڑکے آتے تھے اور چائے وغیرہ پی کر چلے جاتے تھے۔ جب اس کاروبار میں نقصان ہوا تو بچا ہوا مال کوڑیوں کے بھاؤ بیچ دیا گیا۔ اس کے بعد مجھے سائیکلوں کی دوکان کھول کر دی گئی۔ اس لئے کہ نئی سائیکلیں فروخت کی جاسکیں گی اور پرانی کرایہ پر دی جاسکیں گی۔ مگر اس دوکان کا بھی پہلی دوکان جیسا ہی حشر ہوا۔ اس کے بعد کچھ رشتہ داروں نے مشورہ دیا کہ ایبٹ آباد میں بزازی کی دوکان کھولنی چاہیے۔ اب اس طرح کے کام بڑی ٹریننگ چاہتے ہیں بلکہ اگر فیملی میں یہ کام پیچھے سے چلا آتا ہو تو یہ کاروبار ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ایبٹ آباد میں بزازی کی دکان صرف تیرہ دن چلی اور اس کے بعد بند کر دی گئی۔ کیونکہ اس تمام عرصے میں ایک گاہک بھی نہ آیا تھا۔

میونسپلٹی میں ہمارے ایک قریبی رشتہ دار سپرنٹنڈنٹ تھے۔ انہوں نے کہا کہ بیٹا میونسپلٹی میں محرر ہو جاؤ اور میں تمہیں بہت جلد ترقی دلوا کر بڑے عہدے تک پہنچا دوں گا۔ مزید کہا کہ تمہارا بچا ہوا روپیہ میں اپنے کاروبار میں لگا دیتا ہوں۔ تمہیں ادھر سے بھی فائدہ

ہوگا اور ادھر سے بھی۔ دراصل ان کے مقاصد کچھ اور تھے۔ میں تو میٹرک بھی پاس نہیں کر سکا تھا' وہ مجھے ترقی دلوا کر انسپکٹر کیسے بنوا دیتے۔ لیکن وہ اپنی پلاننگ میں کامیاب ہوئے اور میں ناکام۔

خیر! میں میونسپلٹی میں محرر کی حیثیت سے ملازم ہوگیا مگر میرے آفیسرز کو ایک چیز کھلتی تھی۔ بات یہ تھی کہ میرے والد کے زمانے کے بہت سارے سوٹ پڑے ہوئے تھے۔ آمدن بھی ٹھیک ہی رہی تھی۔ دو' تین مکانات بھی تھے اور جس مکان میں ہم رہتے تھے وہ اس زمانے میں ہری پور میں مسلمانوں کے مکانوں میں سب سے بڑا تھا۔ اب تو وہاں پر ماشاء اللہ بڑی ترقی ہوگئی ہے۔ کچھ ہندوؤں کے مکانات البتہ ہمارے مکان سے بڑے تھے۔ میں جب دفتر میونسپلٹی میں جاتا تو والد کے زمانے کے وہی قیمتی سوٹ پہن کر جاتا اور ننگے سر رہتا حالانکہ اس زمانے میں سب لوگ سر پر ٹوپی پہنتے تھے۔ شاعری کا جو شوق تھا اس کی وجہ سے ایک انا بھی تھی کہ میں بھی کچھ ہوں۔ کچھ لوگوں کو یہ برا لگتا تھا۔ چنانچہ اسی چھوٹی سی بات پر کہ یہ ننگے سر کیوں پھرتا ہے اور ہم سے اچھا لباس کیوں پہنتا ہے' کچھ جھگڑے بھی ہوئے اور ایکبار مجھ پر اور میرے تین ساتھیوں پر ایک ناجائز مقدمہ بھی بنا دیا گیا جس کی وجہ سے ہم ایک ماہ سے زائد عرصہ تک حوالات میں بند رہے۔ بالآخر بڑی آبرو کے ساتھ ہم حوالات سے نکلے اور وہ ایڈمنسٹریٹر جنہوں نے جھوٹا مقدمہ بنایا تھا ان کے خلاف کارروائی کی اور وہ وہاں سے ٹرانسفر ہو گئے۔

اس واقعہ کے بعد میں نے سوچا کہ اب ہری پور کو خدا حافظ کہنا چاہیے کیونکہ نوکری بھی بہت معمولی تھی اور پھر یہ بھی خدشہ تھا کہ اس سے ایک تو اپنی شخصیت مسخ ہو جائے گی۔ دوسرے آئندہ بھی اس طرح کا سلوک ہوتا رہے گا۔ اس لئے میں وہاں سے راولپنڈی چلا گیا۔

ٹرانسپورٹ کمپنی میں ملازمت

شاعری کے پودے کی آبیاری راولپنڈی میں ہوئی اور یہ درخت کی شکل اختیار کرنے لگا۔ وہاں اس زمانے میں تلوک چند محروم، عبدالعزیز فطرت، انجم رومانی، جگن ناتھ آزاد، احمد ظفر، جمیل ملک اور حسن طاہر جیسے لوگ موجود تھے۔ ان کے علاوہ وہاں میری ملاقات اپنے استاد حکیم محمد یحییٰ شفا صاحب سے بھی ہوئی جو طب اور علمیت دونوں ہی میں بہت فاضل تھے۔ شفا صاحب میرے رشتہ دار بھی تھے۔ ان سب لوگوں کی محفلیں کام آئیں۔

روزگار کا سلسلہ یوں چلا کہ میں نے پنڈی، مری ٹرانسپورٹ میں دوسری نوکری بطور بکنگ کلرک کرلی۔ میرے والد بہت سا زیور اور نقد روپیہ چھوڑ گئے تھے اور ہم تین بہن بھائیوں کے لئے وہ انتظام کر گئے تھے کہ ساری چیزیں افراط سے موجود تھیں بلکہ وہ برتن جو دعوتوں کے لئے کام آسکتے تھے وہ بھی گھر میں موجود تھے اور یہ سب کچھ تین چار برس میں میرے ہاتھوں ضائع ہوا کیونکہ میرے اوپر کوئی کنٹرول نہیں تھا اور لواحقین کی نیتیں بھی ٹھیک نہیں تھیں۔ چنانچہ وہ سب کچھ ضائع کرنے کے بعد میں راولپنڈی آ گیا۔

یہاں بھی ہمارے دو مکانات تھے۔ لیکن والد صاحب کا اثاثہ میرے ہاتھوں ضائع ہوتا رہا مگر بغیر کسی عیب کے۔ کیونکہ مجھ میں کوئی عیب نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ اگر کوئی دوست آ جاتا تو میں شاہ خرچی کرتا تھا۔ جو تین کاروبار کیے ان میں بھی کافی روپیہ ضائع ہوا۔ غرض جب پنڈی آیا تو اس وقت میرے تین بچے تھے۔ میری پھوپھی یہیں رہتی تھیں۔ دونوں مائیں ہری پور ہی میں رہ گئیں۔ یوں میں اور میرا کنبہ راولپنڈی آ کر پھوپھی کے گھر

میں مقیم ہوئے کیونکہ یہ بھی ہمارا اپنا ہی گھر تھا۔

میرے والد دس جون 1935ء کو فوت ہوئے تھے اور 1936ء کے آخر میں میری شادی ہو گئی تھی۔ شادی کا قصہ بھی عجیب ہے۔ ان پڑھ ماحول میں لوگوں کو ابتدا سے ہی صرف بچے کی شادی کی فکر ہوتی ہے۔ بچوں کی تعلیم کی یا کسی ٹریننگ کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ شادی کے وقت میں میری عمر کوئی سترہ سال ہوگی۔ یہ شادی ایسے ہوئی کہ نہ مجھے علم تھا کہ شادی کہاں ہو رہی ہے اور نہ میری بیوی کو علم تھا کہ اس کی شادی کس سے ہو رہی ہے۔ دراصل ہوا یوں کہ میرے گھر والے مجھے شادی کرانے کے لئے برادری ہی میں کسی اور گھر لے گئے تھے لیکن بیچ میں کچھ ایسے لوگ پڑ گئے جو نہیں چاہتے تھے کہ میری شادی وہاں ہو۔ اس لئے میری شادی بغیر کسی پہلے سے طے شدہ پروگرام کے ایک دوسری جگہ ہو گئی۔

اب جب میں روزگار کا مارا ہوا پنڈی گیا تو وہاں ایک حکیم صاحب کے بیٹے میرے اچھے دوست تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ آپ کوئی سروس کر لیں اور اگر کہیں تو پنڈی مری ٹرانسپورٹ میں ساٹھ روپے ماہانہ کی نوکری دلوا دوں۔ میری پہلی نوکری میں تنخواہ بائیس روپے ماہانہ تھی۔ اس لئے یہ نوکری ملنے سے کافی ریلیف ملا۔ علاوہ ازیں پنڈی میں کچھ مشاعروں وغیرہ کا بھی معاملہ ہو جاتا تھا۔ یہ زمانہ بڑی محنت کا زمانہ تھا۔ محنت تو خیر میں نے ساری زندگی کی ہے اور اپنا وقت ہمیشہ کارآمد طریقے سے خرچ کیا ہے۔

پھوپھی کے ساتھ ہم جس مکان میں رہتے تھے۔ اس میں زیادہ گنجائش نہیں تھی۔ اس لئے میں نے اپنے مکان کے ساتھ ایک بیٹھک لے رکھی تھی۔ میرے پنڈی کے ادیب دوست وہیں اکٹھے ہوتے تھے۔ ہم وہاں کم از کم رات کے بارہ بجے تک بیٹھتے تھے۔ شاعری کے دور چلتے تھے بلکہ کبھی کبھی گانے بجانے کی محفلیں بھی ہوتی تھیں۔ اس کے بعد جب میں یہاں سے فارغ ہو کر گھر جاتا تو مشق سخن کرتا تھا دو اڑھائی گھنٹے سونے کے بعد میں بس سٹینڈ پر جاتا تھا کیونکہ چھ بجے مجھے پہلی بس مری کے لئے روانہ کرنی ہوتی تھی۔ نیند کی کمی دن میں تھوڑا بہت سو کر پوری کر لیتا تھا۔

ان مصروفیات کا فائدہ یہ ہوا کہ ان ادبی محفلوں میں ارتقاء کا معاملہ پیدا ہوا اور میری

شاعری متعارف ہوئی۔ اس دوران کچھ ایسے اشعار بھی وارد ہوئے جو میری پہچان بنے۔ ان میں سے ایک شعر یہ بھی ہے:

گنگناتی ہوئی آتی ہیں فلک سے بوندیں
کوئی بدلی تری پازیب سے ٹکرائی ہے

یہ غزل میری پہچان اور شہرت کا باعث بنی۔ اس کی پیروڈی بھی ہوئی۔ دراصل اس غزل کا یہ شعر نئے لہجے کا تھا۔ کسی کی سمجھ میں آیا اور کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا کہ بدلی پازیب سے کیسے ٹکرا سکتی ہے؟ بہر حال یہ شعر ذہنوں میں اتر گیا اور اس سے میں آگے بڑھا۔

ماں باپ نے میرا نام اورنگ زیب رکھا تھا۔ جب میں نے پنڈی آ کر حکیم شفا صاحب کی شاگردی اختیار کی تو اپنا نام قتیل شفائی رکھ لیا۔ شفا صاحب میرے رشتہ دار تھے اور ہم قریب قریب رہتے تھے۔ انہوں نے مجھے بہت سکھایا اور میری ابتدائی شاعری کی تعمیر انہوں نے ہی کی۔ پیشہ کے لحاظ سے وہ طبیب تھے اور ابھی بقید حیات ہیں۔ خدا انہیں اور بھی زندگی دے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور عروض کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔ شفا صاحب کی شخصیت دو، تین خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک تو وہ مذہبی علمی شغف رکھتے تھے۔ دوسری دلچسپی شعر و شاعری میں تھی اور تیسرا طبی علمی شغف تھا۔ وہ شاعری کو اپنا فالتو شغف سمجھتے تھے اور خود مکمل طور پر اس طرف نہیں آئے لیکن انہوں نے کئی شاگردوں کی اصلاح کی۔ انہی کے نام کی مناسبت سے میں نے شفائی تخلص رکھا۔

ہری پور کے زمانے میں میں زیب تخلص کرتا تھا۔ جب پنڈی آیا تو قتیل کا تخلص رکھ لیا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ میں پنڈی میں جس محلے میں رہتا تھا وہاں ہماری پچھلی گلی میں ایک امام بارگاہ تھی۔ وہ زمانہ شیعہ سنی فساد کا زمانہ نہیں تھا اور اس محلے کے ہم سنی لوگ بھی ایک طرح سے اعزازی شیعہ بن گئے تھے۔ وہ زمانہ امام باڑوں میں بھی اچھی شاعری کا تھا قطع نظر اس کے کہ ملتانی ذاکر جو پڑھتے ہیں وہ ایک الگ چیز ہے۔ ان مجالس میں انیس اور دبیر کی رباعیاں پڑھی جاتی تھیں بلکہ مجلس کے دوران کوئی آدمی اٹھ کر ایک دو رباعیاں

پڑھتا تھا اور پھر ذاکر اپنا سلسلہ جاری رکھتا تھا۔ اس مجالس میں قتیل فرات کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ اب میں تجزیہ کرتا ہوں تو پتا چلتا ہے کہ قتیل کا لفظ مجھے امام باڑے سے ملا۔ چونکہ والد صاحب فوت ہو گئے تھے اور کچھ تکلیفیں بھی درپیش تھیں اس لئے مجھے یہ نام بڑا مناسب لگا۔ چنانچہ میں نے قتیل شفائی کا نام اختیار کیا۔

اس زمانے کا رواج تھا کہ لاہور کا رہنے والا لاہوری' جالندھر کا رہنے والا جالندھری اور اگر استاد کا نام فاضل ہے تو فاضلی کہلاتا تھا۔ اس لئے میں نے بھی فیشن کے طور پر شفائی نام رکھا۔ میرے نام کے بارے میں ایک لطیفہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ میرا ایک بیٹا انگلینڈ میں رہتا تھا ہے جس کی بیوی سکاٹ لینڈ کی ہے۔ ایک دن اس کی بیوی نے اس سے پوچھا کہ آخر اس نام قتیل شفائی کا مطلب کیا ہے تو میرے بیٹے نے وضاحت کی کہ قتیل کا مطلب ہے جسے قتل کر دیا گیا ہو اور شفائی کا مطلب ہے جو دوسروں کو شفا دے۔ اس طرح ملا جلا کر اس نام کا مطلب حضرت عیسیٰ بنتا ہے۔

مری میں ایام روزگار

راولپنڈی سے مجھے ٹرانسفر کر کے مری بھیج دیا گیا۔ میرے عزیز دوست اور نامور شاعر احمد ظفر بھی پنڈی مری ٹرانسپورٹ میں کام کرتے تھے' انہیں بھی مری بھیج دیا گیا۔ ان کے ساتھ گھریلو تعلقات تھے اور وہ میرے بھائیوں کی طرح تھے۔ اس لئے اکٹھے مری جانے کی خوشی ہوئی۔ مری کی فضا بڑی شاعرانہ تھی۔ ہندوستان کے دور دراز سے آئے ہوئے باذوق رؤسا ہر روز اپنے بنگلوں میں کوئی ادبی محفل منعقد کرواتے تھے۔ آزاد زمانہ تھا' آزاد فضائیں تھیں اور کھل کر شاعری ہوتی تھی۔ اس زمانے کی شاعرانہ محفلوں کے مطابق ناؤ نوش کا انتظام بھی ساری رات چلتا تھا۔ ان محفلوں میں میں نے اچھے اور برے پینے والے بھی دیکھے اور یہ بھی جانا کہ شراب کے مفید پہلو کیا ہیں اور نقصان دہ پہلو کیا ہیں۔ میں نے وہاں انسانوں کے ظرف بھی پرکھے اور بہت کچھ سیکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں شاعری کو بھی بڑی جلا ملی کیونکہ تنقید بڑی صحیح بنیادوں پر ہوتی تھی۔

مری کا یہ قیام اس لئے بھی یادگار ہے کہ یہاں مری کے آس پاس رہنے والے دوست بھی ملے جن میں پروفیسر کرم حیدری بھی شامل ہیں۔ وہ بزم کے بہت فعال سیکرٹری تھے اور وہاں کی ادبی سرگرمیاں انہی کے بل بوتے پر تھیں۔ فیض احمد فیض سے بھی میری پہلی ملاقات مری ہی میں ہوئی وہ وردی پہنچے ہوئے تھے اور ان دنوں کرنل کے عہدے پر فائز تھے۔ یہ جنگ کا یا جنگ سے ذرا بعد کا زمانہ تھا۔ وہاں پر کوئی تقریب تھی' وہ بھی اس سلسلے میں وہاں پر آئے ہوئے تھے۔ انہیں جب پتا چلا کہ کچھ شاعر یہاں پر آئے ہوئے

ہیں تو انہیں بلوایا۔ میں نجانے کیسے پہلے ہی سے ان کے ذہن میں تھا اس لئے جب میرا پتا چلا تو مجھے بھی بلوایا۔

مری میں ہر سال ایک بڑا آل انڈیا مشاعرہ ہوا کرتا تھا جس کے لئے سارے شاعر کھنچے ہوئے چلے آتے تھے۔ انہی دنوں ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔ ہمارے ایک دوست الطاف مشہدی تھے جو اپنے زمانے کے بڑے نامور شاعر تھے اور جوش کے بعد ان کا مقام آتا تھا۔ خدا نے فن اور جسم کی تمام خوبیاں انہیں دے رکھی تھیں۔ لیکن انہوں نے شراب کو ساری برائیوں سمیت قبول کر رکھا تھا اور ان کی ایسی مجبوری بن چکی تھی کہ وہ کردار کے مقررہ معیاروں سے کچھ نیچے آ گئے تھے۔ انہوں نے پلان کیا کہ آل انڈیا مشاعرہ کرنا ہے۔ چنانچہ انہوں نے مشاعرے کا انتظام کیا اور دس دس روپے کے ٹکٹ رکھے۔ اس زمانے میں دس روپے بہت تھے۔ وہ شام کو باہر نکل جاتے اور جو رئیس نظر آتا اس سے اپنا تعارف کرواتے اور دو' چار' پانچ ٹکٹ فروخت کر دیتے۔ اس طرح انہوں نے بہت سا روپیہ جمع کیا۔ ہم ان کے شام کے ساتھی تھے۔ وہ یوں کہ انہیں معلوم تھا کہ ہمیں کسی وقت چھٹی ہوتی ہے۔ وہ پہلے ہی سے ہمارے منتظر ہوتے تھے اور ہمیں ساتھ لے لیتے تھے۔ ہم بہت خوش تھے کہ وہ اتنے ٹھاٹھ کا مشاعرہ کر رہے ہیں کیونکہ انہوں نے ہندوستان کے تمام معروف شاعروں کو دعوت دے رکھی تھی اور جو کسی نے مطالبہ کیا کہا ٹھیک ہے۔ انہوں نے یہ مشاعرہ رمضان کے مہینے میں رکھا تھا۔ عام طور پر مشاعرہ رات کو ہوتا ہے لیکن انہوں نے مشاعرہ صبح دس بجے سینما ہال میں رکھا۔ ناشتے یا کھانے کا انتظام تو درکنار جب مشاعرہ ختم ہوا اور سب شعراء ہوٹل میں واپس پہنچے تو دیکھا کہ الطاف صاحب کا کمرہ خالی ہے۔ میں نے ہوٹل سے بسوں کے اڈے پر فون کیا اور پوچھا کہ میرے شاعر دوست الطاف صاحب کو دیکھا ہے تو پتا چلا کہ وہ ایک گھنٹہ ہوا پنڈی کی بس میں سوار ہو کر جا چکے ہیں۔ انہوں نے کسی کو کچھ نہ دیا اور سارے روپے خود سمیٹ کر چلے گئے۔

اس مشاعرے میں جو لوگ آئے ہوئے تھے ان میں سے بہت سے ایسے تھے جنہیں پہلے دیکھا ہوا بھی نہیں تھا۔ ہمارے دوست بنے اس لئے کہ میں اور احمد ظفر یہاں

برسرِ روزگار تھے۔ کچھ کو کھانا کھلایا اور کچھ کو واپسی کا کرایہ بھی دیا۔ مشاعرے کا یہ تاریک پہلو میں نے پہلی بار دیکھا۔ اس کے بعد بھی ایسے کئی واقعات دیکھے جن کا بیان آگے آئے گا۔

میونسپلٹی میں ملازمت کا جو واقعہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ میرے پاس میرے والد کے ولایتی سوٹ موجود تھے۔ لوگ زیادہ تر بھلہ کمپنی کے بنے ہوئے دیسی بوٹ پہنتے تھے لیکن میرے پاس تو باقاعدہ ولایتی بوٹ بھی ہوتے تھے۔ جب میں نے میونسپلٹی کی ملازمت کی ان دنوں تحصیل کا ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہی ایڈمنسٹریٹر بلدیہ بھی ہوا کرتا تھا۔ ہمارا ایڈمنسٹریٹر راشی اور کرپٹ تھا۔ ہمارے وہاں ڈاکٹر جیمز بنی لال کی عیسائی فیملی تھی جن کے ساتھ ہمارے گھریلو تعلقات تھے۔ ان کے دونوں بیٹے میرے بھائی تھے اور بیٹیاں بہنوں کی طرح تھیں۔ یہ ایڈمنسٹریٹر اس طرف سے گزرتا تھا اور اس نے فرض کر رکھا تھا کہ ہر عیسائی فیملی کرپٹ ہوتی ہے جبکہ ایسا نہیں ہے۔ اس نے مجھے وہاں آتے جاتے دیکھ رکھا تھا۔ ایک دن میں دفتر میں گیا تو آگے وہی بیٹھا ہوا تھا۔ میں دفتر میں جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سیٹ بھی کیا تھی' جنگلا سا بنا ہوا تھا جس کے اندر ہم پیچھے تکیہ لگا کر نیچے بیٹھے ہوتے تھے۔ اس نے ہیڈ کلرک سے پوچھا کہ یہ کون ہے تو اس نے بتایا کہ محرر ہے۔ اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا کہ یہ کپڑے کہاں سے پہنتے ہو۔ میں نے کہا جی میں گھر سے پہنتا ہوں۔ اس نے کہا بائیس روپے تنخواہ میں کپڑے بنتے ہیں۔ میں نے کہا جی اس میں بائیس روپے کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ کپڑے میرے والد کے زمانے کے ہیں۔ اس نے میری وضاحت سنی ان سنی کر دی اور حکم دیا کہ یہاں ٹھیک طرح آیا کرو اور سر پر ٹوپی رکھا کرو۔ میں نے کہا جی میرے سر میں درد ہو جاتا ہے اور میں ٹوپی نہیں پہن سکتا۔ اس نے مجھے گستاخ قرار دیتے ہوئے بہت سی لایعنی سی باتیں کہیں اور اس واقعہ کو ذہن میں رکھ لیا۔

میرے ساتھ وہاں دو اور محرر بھی تھے۔ انہی دنوں مجھے پنڈی ایک مشاعرے کے لئے جانا پڑا۔ یہ میری زندگی کا پہلا پہلا مشاعرہ تھا۔ اس سے واپس لوٹا تو پتا چلا کہ ہم تینوں

محرروں پر اسی ایڈمنسٹریٹر نے غبن کا مقدمہ بنوا دیا ہے۔ ہم اس کیس میں کوئی مہینہ اور دو دن حوالات میں رہے۔ جب بھی ہم عدالت میں پیش ہوتے تو وہ مجھے کہتا کہ دماغ ٹھیک ہوا ہے یا نہیں اور اگلے ہفتے کی پیشی ڈال دیتا۔ میں نے ہر بار جواب میں یہی کہا کہ دماغ کا اس سے کیا تعلق ہے اور جو کیس بنایا گیا ہے وہ جھوٹا ہے۔

میرے کچھ دوست اخبار نویس تھے میں نے انہیں بلایا اور کہا کہ یہ خود ہی مدعی ہے اور خود ہی منصف بھی۔ میرے ان دوستوں نے ایک وکیل سے مشورہ کیا۔ ویسے تو وکیل بھی اس کی عدالت میں جاتے ہوئے گھبراتے تھے لیکن ہمارے وکیل نے جرأت کر کے کہا کہ ہم اس کیس کو کسی اور عدالت میں تبدیل کروانا چاہتے ہیں۔ چونکہ کیس کے مدعی آپ خود ہیں اس لئے ہمیں آپ سے انصاف کی توقع نہیں۔ ساتھ ہی اس نے ایک درخواست پیش کی کہ ہمیں آج کی کارروائی اخبارات میں چھپوانے کی اجازت دی جائے۔ اس سے وہ ڈر گیا اور ہمیں ضمانت پر رہا کر دیا۔

ان دنوں چینی اور مٹی کا تیل پرمٹ پر ملتا تھا۔ اب وہ مجھ سے خوفزدہ تھا کیونکہ میں نے پیغام بھجوا دیا تھا کہ اب میں باہر آ گیا ہوں اور اب میری باری ہے کہ یہ سب اخبارات میں چھپواؤں۔ اس نے مجھے اپنے پاس بلوا کر حال دریافت کیا اور کہنے لگا وزن بڑھا ہوا لگتا ہے۔ میں نے کہا آپ کی دعا سے مجھے کوئی تکلیف نہیں تھی اور کھانا گھر سے جاتا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا کھانا گھر سے کیسے جاتا تھا۔ میں نے کہا جیسے باقیوں کا جاتا ہے وہ مجھ سے کہنے لگا بھئی یہ کیس تو الگ چلتا رہے گا۔ اگر چینی اور مٹی کے تیل وغیرہ کی ضرورت ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں نے کہا ایک بوری چینی اور ایک کنستر تیل کا ہفتہ وار پرمٹ دے دیں۔ اس زمانے میں ایک کنستر سات روپے میں آتا تھا اور بلیک میں کوئی تیس روپے کا بکتا تھا۔ اسی طرح چینی بھی بلیک میں بکتی تھی۔ میں نے وہ پرمٹ لے کر بیچ دیا لیکن اس کی تصویریں بنوا کر ریکارڈ رکھ لیا۔ اب میں نے اخبارات کو لکھنا شروع کیا کہ اس شخص نے جھوٹا مقدمہ قائم کر کے میرے ساتھ زیادتی کی ہے اور اب مجھے راضی کرنے کے لئے پرمٹ دیا ہے یوں میں نے اسے خوب بے عزت کیا۔ چونکہ کیس جھوٹا تھا' اس لئے میرے اس شور شرابے کا

فائدہ یہ ہوا کہ وہ وہاں سے ٹرانسفر ہو گیا اور ہم باعزت بری ہو کر اپنی ملازمتوں پر بحال ہو گئے چونکہ اس نے یہ کیس اس عیسائی فیملی تک رسائی حاصل کرنے کے لئے بنایا تھا۔ اس لئے اس واقعے کا مجھ پر بہت اثر ہوا اور میں نے طے کیا کہ یہ سب لوگ ذہنی اور معاشرتی سطح پر مجھ سے بہت چھوٹے ہیں اور یہاں مجھے برداشت نہیں کر سکیں گے۔ بالآخر میں ہری پور چھوڑ کر پنڈی چلا گیا۔

اوپر میں نے کیس بننے سے پہلے پنڈی کے جس مشاعرے کا ذکر کیا ہے اس کے آرگنائزر شوکت واسطی تھے جو وہاں سٹوڈنٹس یونین کے عہدیدار تھے۔ یہ پہلا مشاعرہ تھا جس میں مجھے بطور شاعر بلایا گیا تھا جیسے بڑا اعزاز دے کر بلایا جاتا ہے۔ لکھا ہوا تھا کہ اخراجات سفر ہم ادا کریں گے۔ میری سادگی کا یہ عالم تھا کہ مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم معاوضہ دیں گے۔ میں نے مشاعرہ پڑھا اور بہت ٹھیک رہا۔ سید ضمیر جعفری بھی اس مشاعرے میں شریک تھے۔ انہوں نے میرے اشعار پر نہ صرف وہاں بیٹھے ہوئے داد دی بلکہ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد بھی مجھے داد دی اور پوچھا کہ عزیز آپ کہاں رہتے ہیں؟ جب میں نے بتایا کہ میں ہری پور میں رہتا ہوں تو کہنے لگے کہ ماشاء اللہ آپ بڑی ترقی کریں گے۔

مشاعرہ ختم ہوا تو شوکت واسطی مجھے ساتھ لے گئے اور پوچھا کہ آپ کو کیا پیش کروں۔ میں نے کہا کہ سوا روپیہ آتے ہوئے لگا ہے اور سوا روپیہ واپسی پر کرایہ لگے گا اور آٹھ آنے تانگے کے ہوں گے اور یوں میرا کوئی تین روپے خرچہ آیا ہے۔ وہ مسکرائے اور مجھے پانچ روپے دے دیئے۔ اب پتا نہیں انہوں نے میرے لئے کیا معاوضہ مقرر کر رکھا تھا۔ میرے ذہن میں یہی بات تھی کہ جو واقعی خرچ آیا ہے وہ لے لینا چاہیے۔ یوں میں اپنا پہلا معاوضہ پانچ روپے لے کر خوش خوش چلا آیا۔

سید ضمیر جعفری نے میری بہت حوصلہ افزائی کی تھی اور وہ شاباش میرے بہت کام آئی۔ ابھی 3 اکتوبر 88ء کو انہوں نے ایک خط میں مجھے لکھا:

پیارے قتیل صاحب! السلام علیکم

میں ''جنگ'' راولپنڈی میں ایک کالم لکھتا ہوں۔ ایک تراشا بھیج رہا ہوں۔ محبت اپنی جگہ مگر یہ واقعہ جو میں نے لکھا ہے وہ درست ہے' مبارک ہو۔ اب واعظان کرام منبر پر آپ کے اشعار پڑھنے لگ گئے ہیں۔ اسے کہتے ہیں جادو کا سر پر چڑھ کر بولنا۔ امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

آپ کا ضمیر

جو تراشا انہوں نے ساتھ بھیجا ہے اس کا عنوان ہے ''مجلس وعظ میں قتیل شفائی کی غزل کی اثر آفرینی'' اس میں لکھا ہے کہ منبر پر وعظ کے دوران ایک واعظ نے بار بار یہ شعر پڑھا:

چلو اچھا ہوا کام آ گئی دیوانگی اپنی
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے

اس کی تشریح انہوں نے بہت دیر تک کی۔ اس کے ساتھ انہوں نے جو اور شعر پڑھے وہ مولانا روم' علامہ اقبال' حضرت میاں محمد بخش اور قتیل شفائی کے تھے۔

ہری پور کی کچھ یادیں

مجھے ابتدا ہی سے موسیقی کا بہت شوق تھا مگر مجھ سے ایک وقت میں دو کام نہیں ہوتے میں شروع میں افسانے بھی لکھتا تھا۔ لیکن جب میں نے سوچا کہ مجھے دو کشتیوں میں سوار نہیں ہونا چاہیے تو میں نے افسانہ نویسی کو خیر باد کہہ دیا۔ حالانکہ میں دوسرے درجے کا افسانہ لکھتا تھا اور دوسرے درجے کا افسانہ بھی کم لوگ لکھتے ہیں۔ تب تک ''ساقی'' اور ''سنگ میل'' میں میرے افسانے شائع ہو چکے تھے۔

اسی طرح مجھے شروع میں مجھے موسیقی کا شوق تھا اور کچھ دیر میں یہ شوق کرتا بھی رہا۔ پنڈی کا ماحول موسیقی کے لئے بھر پور تھا۔ محلے محلے میں ہارمونیم ہوتے تھے اور شریف یعنی غیر پیشہ ور لوگ بھی یہ شوق رکھتے تھے۔ چونکہ اس زمانے میں رفیق غزنوی جیسے لوگ پنڈی کے تھے اور رفیق غزنوی کا اپنے زمانے میں مہدی حسن سے بڑا نام تھا۔ اس لئے ان لوگوں کی وجہ سے اور کچھ ہندو گھرانوں کی وجہ سے موسیقی کا بڑا زور تھا۔ اس زمانے میں میں بھی راگ راگنیاں گاتا تھا جن کی سوجھ بوجھ اب بھی مجھے ہے اور پندرہ بیس ایسی راگ راگنیاں ہیں کہ میں پہچان لیتا ہوں کہ یہ کونسی راگنی ہے۔ میری آواز بھی اچھی تھی اور گا بھی لیتا تھا لیکن جب شاعری کا غلبہ ہوا تو وہ شوق بھی چھوڑ دیا۔ صرف ایک ترنم باقی رہ گیا اور میرا ترنم بھی ٹیونز نہیں ہوتی تھیں بلکہ خالص شاعرانہ ترنم ہوتا تھا۔

آواز اتنی اچھی تھی کہ میں نے اس زمانے میں ''ہز ماسٹر وائس'' کو خط لکھا تھا کہ مجھے گانے کا شوق ہے اور میرا ریکارڈ بنایا جائے۔ مجھے جواب ملا کہ آپ اپنے خرچ پر لاہور آ

جائیں اگر اس قابل ہوں گے تو ضرور موقع دیا جائے گا۔ مگر اسی دوران میں یہ شوق ترک کر کے شاعری کی طرف زیادہ توجہ دینے لگا تھا۔

ہری پور کے کریم داد خان مرحوم پشاور ریڈیو سے گاتے تھے اور ان کی ایک گراموفون کمپنی بھی تھی۔ مجھے ریڈیو پر متعارف کروانے والے وہی تھے۔ وہ چڑیا خان کے نام سے مشہور تھے اور ان کا میرے پاس آنا جانا تھا۔ ایک دن مجھے کہنے لگے مجھے کوئی گیت لکھ کر دو، میں تمہارا گیت گانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے میرا گیت گایا۔ اس طرح صوبہ سرحد کا میں پہلا آدمی تھا جس کا گیت سب سے پہلے آل انڈیا ریڈیو پشاور سے نشر ہوا۔ غزلیں وغیرہ تو اس سے پہلے بھی گائی جاتی رہی تھیں لیکن گیت سب سے پہلے میرا ہی گایا گیا۔

پھر کریم داد خان مجھے کہنے لگے کہ ریکارڈنگ کے لئے بھی مجھے گیت چاہئیں اس لئے اور بھی گیت دے دو۔ وہ لاہور میں آئے اور یہاں بھی میرے کچھ گیتوں کی ریکارڈنگ کروائی اور میرے گیت بہت پسند کیے گئے۔ یہاں سے انہیں لکھنؤ کا ایک آرڈر ملا تو وہاں چلے گئے اور وہاں بھی ریکارڈنگ کروائی۔ اتنی دیر میں میں گانے کا شوق چھوڑ کر پوری طرح شاعری کی طرف آ گیا تھا۔ البتہ شاعری میں ترنم باقی رہا جس میں بھی ٹیونز میری اپنی ہوتی تھیں اور ان میں سے کئی اب بھی چل رہی ہیں۔

ابتدائی زندگی کا ایک عجیب واقعہ اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ خواجہ محمد اشرف مرحوم سکول کے ہیڈ ماسٹر ہماری جائیداد میں کرایہ دار تھے۔ چونکہ ہمارے دونوں مکانات ملحقہ تھے اس لئے ان سے گھریلو تعلقات بھی تھے۔ میں چھوٹی عمر کا تھا اور چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ میرا ایک دوست تھا جو مجھ سے کوئی تین چار سال بڑا تھا اور غالباً نویں یا دسویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ جب میں کوئی شعر کہتا تو لوگ یقین نہیں کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ عنایت مجھے شعر لکھ کر دے رہا ہے۔ جب لوگ عنایت سے پوچھتے تو وہ ہنس کر کہتا کہ نہیں میں تو نہیں لکھ کر دیتا۔ اس کا جواب کچھ اس طرح کا ہوتا تھا کہ اس میں انکار بھی ہوتا تھا اور اقرار بھی۔ میں اس سے بہت تنگ آیا۔

ایک دن خواجہ صاحب مجھے کہنے لگے میں تمہیں مصرع طرح دوں گا، تم مجھے اس پر

شعر لکھ کر بتانا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ انہوں نے مصرع طرح دیا تو میں نے رات کو اشعار کہے اور صبح سکول جانے سے پہلے ہی انہیں تھما دیئے یہ کوئی آٹھ دس اشعار تھے۔ وہ پڑھ کر کہنے لگے کہ تم تو لکھ لیتے ہو۔ میں نے کہا میں لکھ تو لیتا ہوں لیکن لوگوں کو کیسے سمجھاؤں۔ ہر طرف یہ مشہور ہے کہ عنایت لکھ کر دیتا ہے۔

عنایت میرا دوست بنا ہوا تھا اور اس کا والد میرے والد کا دوست بنا ہوا تھا۔ ہم کھلے ہاتھ کے لوگ تھے اور میرے والد میرے دوستوں کی خوب پذیرائی کرتے تھے۔ عنایت کا کھانا پینا اکثر ہمارے ہاں ہی ہوتا تھا اس کے باوجود الزام بھی مجھ پر ہی آ رہا تھا۔ اس لئے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کی ہجو لکھی جائے۔ اس ہجو میں میں نے اسے خوب برا بھلا کہا اور لوگوں کو یہ ہجو سنائی۔ تب کہیں جا کر لوگوں کو یقین ہوا کہ میں خود اپنی نظمیں لکھتا ہوں کیونکہ کوئی اپنی ہجو لکھ کر تو نہیں دے سکتا۔ اس ہجو کا بنیادی خیال یہی تھا کہ شعر تو میں کہتا ہوں لیکن اپنے کھاتے میں تم ڈال لیتے ہو۔

اس کے علاوہ آج کا ہری پور تو نہیں' اس زمانے کا ہری پور ایک جنت تھی' یوں سمجھ لیجئے کہ اس شہر میں ایک Fantasy تھی۔ ہر گلی میں چھوٹی چھوٹی نالیاں تھیں جن میں صاف پانی بہتا تھا۔ سڑکوں پر چھوٹے چھوٹے نالے تھے جنہیں کٹھا کہتے تھے۔ ادھر بھی سڑک ہوتی تھی اور ادھر بھی اور درمیان میں ایک شفاف کٹھا بہتا تھا اور اوپر دریا سے پانی نکل کر شہر میں آتا تھا۔ ان کٹھوں پر عام طور پر ہندوؤں نے غسل خانے بنا رکھے تھے اور کچھ مسلمانوں نے ایک دو مسجدیں بھی بنا رکھی تھیں۔ شہر سے باہر نکل کر اوپر ذرا مغرب کی طرف چلے جائیں تو پانی اور صاف ہوتا چلا جاتا تھا۔ لوگ صبح سیر کے لئے وہاں جاتے تھے اور نہاتے تھے۔

نرگس کا پھول اس شہر میں گھاس کی طرح اُگتا تھا۔ جتنے قبرستان تھے وہاں تو نرگس کے پھول ہوتے تھے لیکن جہاں بھی سبزہ ہوا وہاں یہ پھول ضرور ہوتے تھے۔ جن کی وجہ سے شہر میں سر شام ایک مہک ہوتی تھی۔ جگنوؤں کی افراط تھی اور نو بجے کے بعد جدھر نظر اٹھا کر دیکھیں چھوٹے چھوٹے سے قمقمے جلتے نظر آتے تھے۔ درخت پھلدار تھے۔ ہری پور کی خوبانی تو شاید ایک مثالی خوبانی تھی۔ اس کے علاوہ دنیا بھر کا پھل ماسوائے آم اور کیلے

کے وہاں ہوتا تھا۔

ایک حساس آدمی کے لئے تو وہ اتنی متحرک فضا تھی کہ خواہ مخواہ کچھ کہنے کو جی چاہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ سارے لوگ شاعر یا مصور نہیں ہوتے لیکن جن کے اندر یہ جوہر موجود تھا ان پر اس فضا نے بہت اثر کیا۔ چنانچہ اس ماحول میں ایک چیز اندر سے ابلتی تھی اور تحریک پیدا ہوتی تھی۔ اور پھر خواجہ صاحب کی مہربانیوں اور کچھ لوگوں کی ضد میں آ کر جو میری شاعری کا انعام خود لینا چاہتے تھے' میں نے شاعری کی۔

میں نے جب سکول چھوڑ کر دوکانداری کا سلسلہ شروع کیا اور ساتھ ہی بزم ادب شروع کی جس کا سیکرٹری میں خود تھا تو میں نے 1939ء میں علاقہ اقبال کی پہلی برسی پر ہری پور کا پہلا مشاعرہ منعقد کیا۔ اس میں جن مشہور لوگوں نے شرکت کی ان میں قمر جلال آبادی' اختر رضوانی مرحوم اور سٹیج کے بادشاہ نفیس خلیلی شامل تھے۔ اس زمانے میں ہری پور کے لوگوں کو پتا ہی نہیں ہوتا تھا کہ مشاعرہ کیا ہے۔ ہم مشاعرہ کہتے تو لوگ نوشہرہ سمجھتے کیونکہ انہوں نے نوشہرہ ہی سنا ہوا تھا۔

اس ضمن میں لطیفہ یہ ہوا کہ ہم بازار میں گھومے اور ہر دوکان پر جا کر کہتے کہ ہم ڈاکٹر اقبال کی برسی منا رہے ہیں' چندہ دیجئے۔ اس زمانے میں علامہ اقبال کو ڈاکٹر اقبال ہی کہتے تھے۔ ہم نے چندہ ایک روپیہ فی دوکان رکھا ہوا تھا۔ ایک دوکان پر گئے تو دوکاندار نے حیرت سے پوچھا کہ ڈاکٹر اقبال مر گئے۔ ہم نے کہا جی ہاں ایک سال گزر چکا ہے۔ اس نے چندہ دیا اور کہنے لگا کہ بڑے اچھے آدمی تھے۔ میں نے کہا آپ نے انہیں پڑھا ہے۔ کہنے لگا جی پڑھنا کیا ہے۔ ہماری بھینس بیمار پڑ گئی تھی اور انہوں نے علاج کیا تھا۔ دراصل وہاں ایک وٹرنری ڈاکٹر تھے جنہیں لوگ ڈاکٹر اقبال ہی کہتے تھے۔

یہ واقعہ بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہاں کی فضا ایسی تھی کہ لوگوں کو شعر سے یا شاعر سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ 1939ء کی بات ہے لیکن آج جب میں وہاں جاتا ہوں تو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ ہری پور میں کئی شاعر ہیں اور اچھا کہنے والے ہیں اور یہ شکایت اب کسی کو نہیں کہ مشاعرے کا مطلب کوئی نہیں سمجھے گا۔

ایبٹ آباد

راولپنڈی سے ہم اگر پشاور روڈ پر حسن ابدال پہنچیں تو وہاں سے بائیں ہاتھ مڑتے ہوئے جو سڑک شاہراہ ریشم تک پہنچتی ہے' اسی سڑک پر حسن ابدال سے کوئی پچیس تیس میل کے فاصلے پر ہری پور تحصیل شروع ہوتی ہے۔ ہری پور تحصیل ہزارہ ڈویژن کی تحصیل ہے جس کا ضلع ایبٹ آباد ہے۔ یہ ضلع وہ ہے جو سرحد اور پنجاب کے درمیان حد فاصل ہے۔ جہاں سے پنجاب کی حد ختم ہوتی ہے وہاں سے سرحد کی نشاندہی اس ضلع کی سرزمین کرتی ہے۔ (اب ہری پور بھی ضلع بن چکا ہے۔ مرتب)

حسن ابدال سے آگے بڑھتے ہی ہریالی کا ایک مسلسل سلسلہ شروع ہوتا ہے جو بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور جب ہم پنجاب کی سرحد عبور کر کے ضلع ہزارہ کی حدود میں پہنچتے ہیں تو ہریالی اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے اور انسان محسوس کرتا ہے کہ اس کی آنکھوں اور روح کو قدرت نے تازگی پہنچانے کا انتظام فراوانی سے کر رکھا ہے۔

ہزارہ کا معاملہ یہ ہے کہ اس کے نام کی کئی وجوہ بتائی جاتی ہیں۔ بڑے بزرگ یہ کہتے تھے کہ جس زمانے میں اس کا نام ہزارہ رکھا گیا' اس زمانے میں اس علاقے میں ہزار گاؤں آباد تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہزارہ کسی خاص شہر یا گاؤں کا نام نہیں بلکہ اس علاقے کو جو اب ڈویژن بن گیا ہے ہزارہ کہتے ہیں اور اس کی تحصیل ہری پور کی عمر کچھ زیادہ نہیں بلکہ پیچھے جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہزارہ میں ایک نوزائیدہ علاقہ تھا اور اسے مشہور سکھ جرنیل ہری سنگھ نلوا نے ان فتوحات کے زمانے میں آباد کیا تھا جو اس نے سکھوں کے عروج کے

زمانے میں کی تھیں۔ ہری پور میں اب تک ہری سنگھ نلوا کا قلعہ موجود ہے جس میں تحصیلدار کی عدالت اور کچھ سرکاری دفاتر قائم ہیں۔

صدر ایوب مرحوم کے زمانے میں ایک تحریک چلی تھی کہ ایبٹ آباد اور ہری پور کے نام چونکہ غیر مسلموں سے منسوب ہیں' اس لئے انہیں تبدیل کر دیا جائے۔ بلکہ خاص طور پر کہا گیا تھا کہ ہری پور کو ایوب پور کر دیا جائے۔ صدر ایوب نے اس کی مخالفت کی تھی۔ وہ ان معاملوں میں حقیقت پسند آدمی تھے اور ان کا کہنا تھا کہ یہ سب نام تاریخ کے مختلف ادوار کی نمائندگی کرتے ہیں' لہٰذا اس طرح نام تبدیل کرنے سے تاریخ مسخ ہوتی ہے۔ چنانچہ ہری پور باقی علاقوں میں تبدیل شدہ ناموں سے دور رہ کے اب بھی ہری پور ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ایوب صاحب کا فیصلہ بہت حقیقت پسندانہ تھا۔

ایبٹ آباد کا معاملہ بھی کافی دلچسپ ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک انگریز افسر وہاں پر ڈپٹی کمشنر بن کر آیا جس کا نام ایبٹ تھا۔ اس وقت ایبٹ آباد بھی چند گاؤں پر مشتمل علاقہ تھا۔ وہ جب آیا تو اس کے نام پر ایبٹ آباد' آباد ہوا۔ ایبٹ کے بارے میں یہ بھی عام ہے کہ وہ شاعر تھا اور جب وہ اپنے عہدے کا عرصہ پورا کر کے وہاں سے گیا تو اس نے انگریزی میں ایک بہت خوبصورت نظم کہی جس میں رقت تھی اور پیار محبت کا اظہار تھا۔

یہ درست ہے کہ ایبٹ اس قوم سے تھا جو فاتح تھی اور جس نے ہندوستان کے لوگوں کو مفتوح بنا کر بے شمار استحصالی حربے استعمال کیے لیکن وہ صرف بیوروکریٹ ہی نہیں بلکہ ایک شاعر کا ذہن اور دل رکھتا تھا۔ اسے اس علاقے سے واقعی پیار تھا۔ وہ نظم جو اس نے لکھی میں نے اس کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔

وہ نظم یوں حاصل ہوئی کہ ہندوستان کے مشہور اداکار' فلم ڈائریکٹر اور پروڈیوسر منوج کمار چونکہ ایبٹ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے جب وہ یہاں مختصر قیام کے لئے آئے تو انہیں اپنا گھر دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ وہ ایبٹ آباد کے اس محلے میں گئے جہاں ان کا گھر تھا اور وہاں کے لوگوں سے ملے۔ ان میں کچھ لوگ پڑھے لکھے بھی تھے جنہوں نے ایبٹ کی لکھی ہوئی یہ نظم ان کی نذر کی۔ منوج صاحب سے میرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ انہوں

نے اس نظم کی ایک کاپی مجھے دی اور تمنا ظاہر کی کہ میں اس نظم کا ترجمہ کروں۔ چنانچہ میں نے اس نظم کا اُردو ترجمہ کیا جو مختلف پرچوں میں چھپ چکا ہے۔

آپ ہی بتایئے کہ ایک ایسا آدمی جو حکمرانی کے حربوں سے ہٹ کر ایک ذہن اور دل رکھتا ہے' اس کے نام سے منسوب شہر کا نام تبدیل کر دینا کیسے واجب ہے؟ ایسے تو ہم تاریخ کو مسخ کرتے ہیں اور دوسرا اس شخص کی روح کیا کہے گی۔ جس نے اتنے پیار سے اتنا خوبصورت علاقہ آباد کیا۔ ہم بجائے اس کے کوئی نیا شہر آباد کر کے کسی نام کے ساتھ منسوب کریں' پرانے شہروں کے نام صرف اس لئے تبدیل کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے آبادکار ہم میں سے نہیں تھے۔ اب اگر یہ سلسلہ چل نکلے تو صرف ہمارے ملک میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان میں بھی ہزاروں نام تبدیل کرنے کے لئے ایک طویل فہرست مرتب کرنی پڑے گی۔ شکر ہے کہ چند ناموں کی تبدیلی کے بعد یہ سلسلہ اب رک گیا ہے۔

میرے والد کہا کرتے تھے کہ ان کے دادا یعنی میرے پڑدادا اکوڑہ خٹک سے روزگار کے سلسلے میں نقل مکانی کر کے ہری پور میں آ کر آباد ہوئے تھے۔ ان کا پیشہ قرآن مجید کی جلد سازی تھا۔ اس زمانے میں جلد سازی بکرے کی کھال اور باریک شیشے سے کی جاتی تھی اور اس میں وہ ماہر تھے۔ ہری پور میں غالباً یہی ایک گھر تھا جس کا یہ پیشہ تھا۔ سن تو اب یاد نہیں' اس وقت پردادا فوت ہو چکے تھے اور دادا ابھی زندہ تھے۔ ان دنوں شاہ اسماعیل شہید کی تحریک مجاہدین' جسے ہم مجاہدین بالاکوٹ کی تحریک کہتے ہیں' چل رہی تھی۔ ان مجاہدین کو امداد پہنچانے کے لئے سرحد کے لوگ خفیہ طور پر ہری پور کے راستے روپیہ پیسہ اور دیگر اشیاء لے جاتے تھے۔ یہ کام میرے دادا کے سپرد یوں تھا کہ وہ سونے کی باریک پتریاں بنا کر قرآن مجید کے صفحات میں رکھ کر مجاہدین کے علاقے میں پہنچاتے تھے۔

میرے دادا' پردادا کاکازئی کہلاتے تھے۔ اب سرحد میں کاکا خیل تو موجود ہیں' کاکا زئی نام کے قبیلے وہاں موجود نہیں بلکہ پنجاب کے بہت سے علاقوں میں ککے زئی کے نام سے موجود ہیں۔ خدا جانے کاکازئی اور ککے زئی میں کیا نسبت ہے لیکن میں بھوپال ایک مشاعرے کے سلسلے میں گیا تو میری لکھی ہوئی کسی تحریر سے لوگوں کو پتا چلا کہ میں کاکازئی

ہوں جس پر بھوپال سے چند میل کے فاصلے پر واقع ایک گاؤں سے کچھ افراد آئے اور بتایا کہ وہ کاکازئی ہیں اور ان کا پورا گاؤں کاکازئیوں کا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ان کے آباؤ اجداد سرحد سے آئے تھے۔ میں نے پوچھا آپ ککے زئی تو نہیں کہلاتے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں ہم کاکازئی ہیں۔ تو عجب بات ہے کہ کہاں کا معاملہ کہاں نظر آیا۔ یعنی ایک فیملی ہماری تھی اور اس کے بعد بھوپال میں کاکازئی نظر آئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ صوبہ سرحد میں جو لفظ بولا جاتا ہے وہ یہاں آ کر تھوڑا سا بدل جاتا ہے۔ مثلاً فرنٹیئر میں نام کالا خان ہوگا تو یہاں اسے کالے خان کہیں گے۔ اس طرح اگر وہاں نام کاکازئی ہوگا تو یہاں اسے ککے زئی کہیں گے۔ خیر! میں تو ذات پات کا قائل نہیں ہوں یونہی برسرتذکرہ بات بتائی ہے کہ ہم لوگ اس سرزمین سے آئے ہوئے ہیں جو خوشحال خان خٹک کی زمین ہے۔ میں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ میرے آباؤ اجداد اس مٹی سے تعلق رکھتے ہیں، جس نے خوشحال خان خٹک جیسا صاحب سیف وقلم پیدا کیا اور شاید اسی مٹی کے کسی ذرّے کا اثر ہو کہ مجھ میں اور میرے باپ میں ادبی ذوق موجود تھا اور میں اب آ کر اپنی پہچان پیدا کر سکا ہوں۔

ہری پور میں میرے دادا کی فیملی تنہا تھی، اس لئے انہوں نے میرے دادا کی شادی مانسہرہ کے ایک سواتی گھرانے میں کی۔ لفظ شاید سواتی ہوگا مگر وہ سواتی کہلاتے ہیں یہ شادی اس طرح ہوئی کہ وہ مانسہرہ سے ہو کر بالاکوٹ وغیرہ جاتے تھے تو رابطے پیدا ہوئے۔ چنانچہ میری دادی مانسہرہ کی تھی اور اتفاق کی بات ہے کہ میری والدہ بھی مانسہرہ ہی سے تعلق رکھتی تھیں۔ تاہم میرے والد کی پہلی شادی میرے دادا نے ہری پور ہی سے کروائی تھی اور یہ شادی وہاں کھالوں کا کاروبار کرنے والی ایک امیر فیملی میں ہوئی تھی تاہم میرے والد کی دوسری بیوی یعنی میری والدہ مانسہرہ کے سواتیوں میں سے تھیں۔

جسٹس صفدر شاہ

ہری پور میں میرے ادبی ذوق کی ترویج میں سکول کے ہیڈ ماسٹر خواجہ محمد اشرف کے علاوہ اخبار پیغام سرحد کے ایڈیٹر قاضی عزیز الرحمان' اکبر خان قریشی اور غلام جان خان تارخیلی نے اہم کردار ادا کیا۔ مؤخرالذکر پہلے تو کہیں اور کام کرتے تھے لیکن جب مسلم لیگ کا زمانہ آیا تو انہوں نے اپنا پرچہ نکالنے کا ارادہ کیا۔ چونکہ یہ میرے دوست تھے اس لیے ہم نے مل کر اس پرچے کا نام ہفت روزہ ''جمہور'' رکھا۔ یہ پرچہ کوئی بیالیس سال سے چل رہا ہے۔ پہلے ہری پور سے نکلتا تھا اور اب ایبٹ آباد سے نکلتا ہے۔ ان دنوں اخبارات کے سائز ''زمیندار'' جتنے ہوتے تھے جسے جہازی سائز بھی کہا جاتا تھا۔ چھوٹے پرچے کا رواج ہم نے وہاں سے شروع کیا۔ پرچے کی ترتیب میں نے دی اور اسے اس طرح مرتب کیا کہ اداریہ اور مزاحیہ نظموں وغیرہ کے لئے الگ الگ جگہیں مختص کر دیں۔

ہری پور میں وہ زمانہ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کے عروج کا تھا۔ کانگرس کے نعروں میں بھی بڑی اپیل تھی کیونکہ وہ انگریز کے خلاف اپنا بھرپور کردار ادا کر رہی تھی اور اس کا ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ بڑا دلکش تھا۔ میں بھی اس زمانے میں یہی خیالات رکھتا تھا اور اکثر ہماری نظموں کے بھی یہی موضوعات ہوتے تھے۔ اس سلسلے کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ میں بعد میں ایکبار غالباً اہل قلم کانفرنس کے سلسلے میں اسلام آباد گیا ہوا تھا وہاں میری ملاقات وفاقی وزیر سرتاج عزیز سے ہوئی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ نے مجھے پہچانا نہیں ہوگا' میں آپ کو ہری پور کا وہ زمانہ یاد دلاتا ہوں جب آپ نے ہندو مسلم اتحاد پر ایک

نظم پڑھی تھی اور جس کا مصرع تھا:

مسجدوں کے سائے میں مندر بنائے جائیں گے

کہنے لگے کہ اس زمانے میں کچھ لوگوں کو اس سے اختلاف ہوا تھا۔ میں نے کہا پہلا مصرع آپ کو یاد ہے' کہنے لگے وہ تو یاد نہیں۔ میں نے کہا کہ اس شعر کا مضمون یہ تھا کہ مندروں کی حفاظت میں مسجدیں بنیں گی اور مسجدوں کے سائے میں مندر بنیں گے۔ کہنے لگے اس وقت پہلے مصرع کو تو لوگوں نے نظر انداز کر دیا تھا مگر دوسرے مصرع پر اعتراض کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ وہاں کس سلسلے میں تھے تو انہوں نے کہا کہ میرے والد وہاں پر تحصیلدار تھے اور میرا کوئی تین چار سال کا عرصہ وہاں پر گزرا تھا۔

اس پس منظر میں دیکھئے تو میرا ذہن ہندو مسلم اتحاد کے ماننے والوں میں تھا اور وہ اب تک ہے۔ ہندو مسلم ہی نہیں میں چاہتا ہوں کہ تمام مذاہب میں ایک ہموار سطح رہے اور سب ایک دوسرے کو تسلیم کریں اور ایک دوسرے کا احترام کریں لیکن سیاست کا ایک مرحلہ ایسا آیا جب قیام پاکستان یا مطالبہ پاکستان کے نعرے کا مجھ جیسے لوگوں کو بھی ساتھ دینا پڑا۔ ہم نئے ذہن والے جونیئر لوگ تھے' کچھ زیادہ گہرائیوں تک نہیں جاتے۔ ستر اور صرف اپنے برادران وطن کا رویہ دیکھتے تھے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ لگانے کے باوجود عملی زندگی میں مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کرتے تھے وہ مختلف ہوتا تھا۔

میں اپنے بچپن میں بہت صاف ستھرا' خوش پوش' دو وقت نہانے والا اور اچھی بود و باش کا مالک تھا۔ اس وقت کاروبار پر ہندوؤں کا کنٹرول تھا۔ میں خود جب کسی حلوائی کی دوکان پر مٹھائی لینے جاتا تو وہ میرے ہاتھ میں اس طرح مٹھائی تھماتا تھا جیسے میرا ہاتھ چھو لینے سے اس کا ہاتھ جل جائے گا۔ اس کے مقابلے میں نیچے رکھے ہوئے دودھ کے خالی برتنوں کو کتے چاٹتے تھے اور وہ انہی کو صاف کر کے استعمال کرتے تھے۔ مجھے یہ بات بہت کھلتی تھی اور مذہب سے ہٹ کر انا کے مجروح ہونے کا معاملہ بھی میرے ذہن میں تھا۔

میں ہندوؤں کے اس رویے کو ناپسند کرتا تھا اور میرے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ والد کی وفات کے بعد میں نے تین قسم کے کاروبار کیے۔ لیکن اس سارے عرصے میں ایک

ہندو گاہک بھی میری دوکان پر نہیں آیا۔ دوسروں کے ساتھ بھی ان کا رویہ یہی تھا کہ کسی مسلمان سے کسی ہندو نے کبھی کچھ نہیں خریدا تھا۔ اس کے برعکس مسلمان ہندوؤں کی دکان سے بغیر کسی تعصب کے خریداری کرتے تھے۔

حضرت قائداعظمؒ کے سامنے آجانے کی وجہ سے یہ بعد میں پتا چلا کہ پاکستان بننے کے ہمیں کیا سیاسی فوائد حاصل ہوں گے اور اگر پاکستان نہ بنا تو ہمارے کیا نقصانات ہوں گے۔ چنانچہ میں اور میرے جیسے اور نوجوان' جن میں الطاف پرواز جو بعد میں اسلام آباد میں ریڈیو پاکستان کی سروس کرتے رہے' سرحد میں ریفرنڈم کے وقت سرگرم عمل ہو گئے۔ میں نے اس ریفرنڈم کے موقع پر بہت کام کیا اور مجھے یاد ہے کہ جب مولانا شوکت علی سرحد کے دورے پر تشریف لائے تو میں ان کے ساتھ تھا۔

میں خوش آواز تھا اور مولانا حامد بدایونی اور مصطفےٰ شاہ گیلانی کے ساتھ جلسہ گاہ میں جاتا تھا اور پہلے سٹیج پر نظم پڑھا کرتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سوائے مسلم لیگ کے قیام پاکستان کا کوئی حامی نہیں تھا اس زمانے کی جماعتیں جن میں جمعیت العلمائے ہند' خاکسار تحریک' مجلس احرار' سرخ پوش' اور جماعت اسلامی شامل تھیں۔ سبھی قیام پاکستان کی مخالفت کرتی تھیں۔ البتہ پنجاب اور سرحد کے پیروں کی کچھ بڑی گدیوں نے جن کی تعداد بہت کم تھی' مطالبہ پاکستان کا ساتھ دیا تھا۔ پھر بھی تنہا مسلم لیگ اتنی بڑی طاقت بن چکی تھی کہ ان سب جماعتوں کی مخالفت کے باوجود اس نے جماعتی انتخابات میں پوری طرح کامیابی حاصل کی۔

یہ درست ہے کہ سرحد کی حد تک سرخ پوشوں نے اس الیکشن کا بائیکاٹ کر دیا تھا لیکن اگر وہ شامل ہو بھی جاتے تو کوئی فرق نہ پڑتا کیونکہ ان کے ووٹوں کی تعداد اتنی زیادہ نہ تھی۔ وہ عجیب زمانہ تھا کہ لوگ جذبے سے سرشار اپنے کام چھوڑ چھاڑ کر بعض اوقات دور دراز بھی نکل جاتے تھے اور خالی پیٹ بھی یہ خدمت انجام دیتے تھے۔ مخالف طاقتوں کا جہاں جہاں بس چلتا تھا ان کی بہت حوصلہ شکنی کرتی تھیں اور اکثر انہیں گالیاں بھی دیتی تھیں۔ قائداعظم اور مسلم لیگ کے ہم قافیہ الفاظ رکھ کر انہیں بھی ان گالیوں کا نشانہ بنایا جاتا

تھا۔ آج میں دیکھتا ہوں تو وہ لیگ اور اس میں کام کرنے والے نظر نہیں آتے اور جتنی پاکستان کی مخالف جماعتیں تھیں وہ داعی پاکستان بن کر سامنے آ گئی ہیں۔ خدا جانے یہ لوگ کیوں دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم نے پاکستان کی تعمیر میں حصہ لیا اور اس کے مطالبے میں شامل رہے۔

وہ زمانہ عجیب تضادات اور انسانی قدروں کی پامالی کا زمانہ بھی تھا۔ ہمارا ایک حلقہ جو پیچھے سے چلا آ رہا تھا' جس کی محفلیں میرے گھر پر ہوا کرتی تھیں اور جس میں ہندو عیسائی سبھی شامل تھے اس میں ڈاکٹر جیمز بنسی لال کی کرسچن فیملی بھی شامل تھی۔ اس حلقے میں سے ایک جگو ندن کپور تھے جو بعد میں دہلی چلے گئے اور وہیں دو سال پہلے ان کی وفات ہوئی ہے۔ ایک اور وشندر ناتھ جبڑا تھے جو اس زمانے میں سٹوڈنٹ تھے اور اب دہلی میں کاروبار کرتے ہیں اور کروڑ پتی ہیں۔ میں جب دہلی میں جاتا ہوں تو بڑی خوشی سے ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک گردوارے کے گرنتھی تھے جن کا نام تو اب یاد نہیں مگر ہم انہیں گیانی کہتے تھے۔ ایک اور آغا فیاض نقوی تھے جو اب بھی زندہ ہیں۔ اس زمانے میں جبکہ سبھی سیاسی لحاظ سے اپنے اپنے محاذ پر الگ الگ کارفرما تھے ہم وہاں جمع ہوتے تھے اور میرے گھر پر چائے پیتے تھے۔ گیانی صاحب کے ذمے یہ تھا کہ ان کے ہاں چڑھاوے کے طور پر جو کڑھا پرشاد آتا تھا اس میں سے بہت سا وہاں لا کر شغل کرتے تھے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک میں ہری پور چھوڑ کر پنڈی نہ چلا آیا۔

جب تقسیم ہوئی تو میں پنڈی میں تھا اور اس موقع پر لوگوں پر جو بیتی وہ ایک الگ داستان ہے۔ جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی انہوں نے مسلمانوں پر زیادتیاں کیں اور جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی جیسا کہ ہری پور میں تھا وہاں ہندوؤں اور سکھوں سے زیادتیاں ہوئیں۔

تقسیم کے کافی بعد کی بات ہے کہ مری میں ایک مشاعرہ تھا' میں مال روڈ پر گھومتے ہوئے ایک دوست سے باتیں کر رہا تھا کہ اچانک السلام علیکم کی آواز آئی۔ میں نے دائیں طرف مڑ کر دیکھا تو ایک بہت لمبا آدمی نظر آیا' میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ مشہور اور

معروف جسٹس صفدر شاہ تھے۔ لیکن میں انہیں فوری طور پر پہچان نہ سکا۔ کہنے لگے کہ ذرا ہری پور اپنے سکول کے زمانے میں جایئے۔ میں نے کہا اس کے باوجود سمجھ نہیں آ رہی۔ کہنے لگے ایک آدمی اپنے گاؤں سے موٹر سائیکل پر سوار ہو کر آیا کرتا تھا اور پھر خود ہی سسپنس توڑ کر کہا کہ میرا نام صفدر شاہ ہے۔ میں نے کہا آجکل کہاں ہوتے ہیں اور کیا کرتے ہیں کہنے لگے لاہور میں ہوتا ہوں اور ہائی کورٹ کا جج ہوں۔ میں نے مذاق سے کہا کہ اب تو میں ڈر گیا ہوں اور اب میں ادب سے بات کروں گا تو انہوں نے مجھے سینے سے لگا لیا اور کہنے لگے کہ کئی بار خیال بھی آیا کہ آپ کو اپنی اطلاع دوں مگر ایسا نہ کر سکا۔ اب لاہور جب پہنچیں تو مجھے ضرور ملیں بلکہ ملتے رہیں۔ بعد میں جب یہ صوبہ سرحد کے چیف جسٹس مقرر ہوئے تو میں انہیں پشاور میں ملا۔ مجھے خاص طور پر کہنے لگے کہ میرے گھر ٹھہرو مگر میں نے معذرت کی تو کہا کہ کبھی آ کر یہاں ایک رات ضرور رکیں۔

صفدر شاہ کا معاملہ یہ تھا کہ وہ سکول کے زمانے میں بھی اپنی رائے رکھنے والا سٹوڈنٹ تھا وہ دوسروں سے الگ تھلگ رہتا تھا اور ایسی کوئی بات نہیں مانتا تھا جو اس کے ذہن کی کسوٹی پر پوری نہ اترے۔ وہ اپنے گاؤں کی ایک ٹھیک ٹھاک متوسط طبقے کی فیملی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے سیلف سیڈ آدمی کے طور پر زندگی شروع کی اور کراچی میں پولیس کے سب انسپکٹر کی ملازمت کی۔ ساتھ ساتھ پڑھتے رہے اور وکالت کی۔ پھر موقع ملا تو انگلینڈ چلے گئے اور وہاں سے شاید بار ایٹ لاء کیا۔ وطن واپس آ کر کسی امتحان میں شامل ہو کر جج لگ گئے۔

بھٹو صاحب کا زمانہ آیا تو اچانک پتا چلا کہ جسٹس صفدر شاہ مستعفی ہو گئے ہیں، وہ چیف جسٹس کی حیثیت سے مستعفی ہوئے تھے اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیوں مستعفی ہوئے ہیں۔ پھر جب مارشل لاء کا دور آیا اور بھٹو صاحب پر مقدمہ چلا تو اربابِ حکومت نے سوچا کو جو پینل بھٹو صاحب کے مقدمے کی سماعت کر رہا ہے اس میں انہیں بھی شامل کر لیا جائے۔ کیونکہ وہ بھٹو صاحب سے ناراض ہو کر مستعفی ہوئے تھے۔ غالباً انہیں یہ نہیں پتا تھا کہ یہ تو اپنے رائے رکھنے والے آدمی ہیں۔ چنانچہ جب فیصلہ آیا تو حکومت کے خلاف اور بھٹو

صاحب کے حق میں جتنا طویل، مدلل اور روشن فیصلہ انہوں نے لکھا اور کسی نے نہیں لکھا تھا۔ اگر کوئی وقت آیا اور اس فیصلے کی اشاعت ہوئی تو لوگ دیکھیں گے کہ وہ کتنے دلیر شخص تھے اور اپنے ضمیر کے آگے اپنے آپ کو کتنا جوابدہ سمجھتے تھے۔

صفدر شاہ صاحب جانتے تھے کہ کسی برسر اقتدار حکومت سے اختلاف کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ بھٹو صاحب کے زمانے میں بھی جب وہ مستعفی ہوئے تو کچھ غیر محسوس سے انتقامی سائے ان پر پڑے لیکن بھٹو صاحب کے کیس میں جب انہوں نے اپنا اختلافی فیصلہ دیا تو انہیں بدنام کرنے اور ان کی شخصیت مسخ کرنے کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور ان پر الزام لگا کہ ان کا انٹرمیڈیٹ کا سرٹیفکیٹ جعلی تھا۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ ان کے لئے اسلام آباد میں رہنا عذاب بن گیا اور وہ جان بچا کر کابل کے راستے انگلینڈ جا پہنچے۔ وہاں ان سے پھر میری ملاقات ہوئی۔ اگرچہ حوصلے اب بھی برقرار تھے مگر کچھ تکلیف میں تھے۔ کیونکہ بیوی غیر ملکی تھی اور معیار زندگی بھی اونچا تھا جبکہ اب مالی آسودگی نہ رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنے کارنامے پر فخر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ جو اشارے مجھے جنرل ضیا کی طرف سے تھے، اگر میں بھی ساتھ دیتا تو مزے کرتا لیکن آخر ضمیر بھی کوئی چیز ہے۔ بعد میں انہیں کینسر ہو گیا اور ان کی لاش ہی وطن واپس آئی۔ بچپن کے دوست بھی تھے اور باضمیر آدمی بھی۔ پھر جو کارنامہ انہوں نے عدلیہ کے نگہدار ہونے کی حیثیت سے انجام دیا تھا اس کی وجہ سے جی چاہتا تھا کہ ان کی تدفین میں شامل ہوا جا سکے لیکن میں ان دنوں ملک سے باہر تھا، اس لئے شرکت نہ کر سکا۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے، ایسے لوگ کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔

نواب امب

ہری پور کے زمانے میں میرا تعارف نواب امب سے ہوا۔ ریاست امب ہری پور تحصیل ہی میں واقع ایک چھوٹی سی ریاست تھی جس کی آمدن محدود تھی۔ سمجھ لیجئے کہ ایک بڑی جاگیر کا نام ریاست رکھ دیا گیا تھا۔ اس ریاست کے نواب فرید خان پر انگریزوں کی نظر کرم تھی۔ نواب فرید خان ویسے ہی تھے جیسے کہ نواب ہوتے ہیں البتہ ان میں چند خوبیاں نوابوں سے ہٹ کر تھیں۔ انہوں نے عام نوابوں کی طرح بہت سی شادیاں نہیں کی ہوئی تھیں بلکہ ان کی صرف ایک ہی شادی تھی۔ یہ بڑی تعجب خیز بات تھی کیونکہ مرد مسلمان کے پاس چار پیسے آ جائیں تو وہ چار شادیوں سے ادھر نہیں رکتا۔ اس کے علاوہ عام نوابوں کی طرح ان کی زندگی میں عیاشی نہیں تھی۔ وہ نہ تو خود شراب پیتے تھے اور نہ اپنی حدود میں کسی کو شراب پینے دیتے تھے۔ پھر وہ اپنے علاقے میں مقیم ہندوؤں کی بہت سی آبادی کی حفاظت کرتے تھے اور تقسیم کے بعد جب انخلاء شروع ہوا تو انہوں نے ہندوؤں کو ضمانت دی کہ وہ آرام سے رہیں انہیں کچھ نہیں ہوگا۔ بہت سے ہندو وہاں رک بھی گئے اور کچھ اب بھی وہاں آباد ہیں ان میں ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ وہ ادب سے لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کے ایک درباری شاعر بھی ہوا کرتے تھے جن کا نام اب یاد نہیں البتہ وہ پرانے انداز کے اچھے شاعر تھے۔ دربار کیا تھا ایک چھوٹی سی محفل تھی۔

نواب صاحب سے میری ملاقات یوں ہوئی کہ ہری پور میں ایک عید گاہ کی تعمیر کے سلسلے میں انہیں بلایا گیا کیونکہ انہوں نے اس کے لئے کافی امداد دی تھی۔ انہی کی صدارت میں منعقدہ اس تقریب میں میں نے ایک خیر مقدمی نظم پڑھی اور آخر میں یہ نظم انہیں پیش

کردی۔ انہوں نے میرے کاندھے تھپتھپائے اور میرا ایڈریس نوٹ کر لیا۔ اسب جا کر انہوں نے میرے نام ایک سو روپے کا منی آرڈر بھیجا۔ یہ 1938ء یا 1939ء کی بات ہے اور اس وقت کا ایک سو روپیہ آج کے پانچ ہزار روپے کے برابر ہو گا۔ اس کے بعد ایک چوغہ مجھے ریاست چترال کے نواب کی طرف سے بھی موصول ہوا جو انہوں نے نواب اسب کے کہنے پر ہی ارسال کیا تھا۔ ان دو انعامات سے میرا حوصلہ بڑھا اور میری دھاک بیٹھ گئی۔ حالانکہ میں ایک چھوٹا سا شاعر تھا۔ یہاں میں یہ کہوں گا کہ اگر کسی تخلیق کار کو بر وقت تھوڑی سی بھی Appreciation مل جائے تو وہ برسوں کا راستہ مہینوں میں اور مہینوں کا راستہ ہفتوں میں طے کر لیتا ہے۔

اس لحاظ سے میں ان چند خوش نصیب لوگوں میں سے ہوں جن کی حوصلہ شکنی نہیں کی گئی بلکہ جنہیں ہمیشہ شاباش ملی اور حوصلہ افزائی ہوئی۔ یہ حوصلہ افزائی صرف پڑھنے اور سننے والوں کی طرف سے ہی نہیں ہوئی بلکہ برسر اقتدار لوگوں کی طرف سے بھی ہوئی۔ اور وہ یوں کہ جب سرحد میں مسلم لیگ کی حکومت قائم ہو گئی اور سردار اورنگ زیب اس کے وزیر اعلیٰ بنے تو میں مولانا شوکت علی وغیرہ کے ہمراہ جن جلسوں میں جایا کرتا تھا وہاں یہ بھی ہوتے تھے۔ ایک دن یہ ہری پور کے ڈاک بنگلہ میں بیٹھے ہوئے تھے اور اپنے کسی اہلکار سے کہنے لگے کہ قتیل شفائی کی طرف سے ایک درخواست اس جاب کے لئے لکھو جو محکمہ اطلاعات میں اسسٹنٹ آفیسر تعلقات عامہ کی خالی ہوئی ہے۔ پھر مجھے کہنے لگے کہ آپ اپنے کوائف لکھوا دیں۔ میں نے کہا جی چھوڑیں میں اس جاب کے لئے کوالیفائی نہیں کرتا کیونکہ میری تعلیم اس کے معیار سے کم ہے۔ بڑے حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ ایسے نظر تو نہیں آتے' نہ گفتگو سے اور نہ ہی شاعری سے۔

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جو بھی میرے قریب آیا اور جس سے فائدے کی توقع ہو سکتی تھی' اس نے مجھے فائدہ پہنچایا سوائے چند ایک لطیفوں کے جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہی نواب اسب جن کے تقسیم سے پہلے کے واقعات کا میں نے ذکر کیا ہے' تقسیم کے بعد بھی کبھی کبھی لاہور آتے تھے۔ ان دنوں میں فلم انڈسٹری میں آ چکا تھا اور وہ فلیٹیز ہوٹل میں آ کر قیام پذیر ہوئے تھے۔ میں ملنے کے لئے گیا تو بہت تپاک سے ملے

اور بہت دعائیں دیں۔ کہنے لگے مجھے اس بات پر فخر ہے کہ تم بچے تھے جب تم نے میرے سامنے شاعری شروع کی اور اب تمہارا نام دور دور تک گونجتا ہے۔ جب ریڈیو پر تمہارا نام سنتا ہوں تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ پھر پوچھا کہ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے یوں ہی کہا کہ ایک تمنا ہے کہ کوئی فلم پروڈیوس کروں جس کے لئے سرمایہ چاہیے۔ کہنے لگے کتنا سرمایہ' میں نے کہا تقریباً ایک لاکھ روپیہ کیونکہ اس زمانے میں اتنے میں فلم بنتی تھی۔ یہ 1950ء یا 1951ء کی بات ہے۔ کہنے لگے کہ کس مرحلے پر رقم چاہیے۔ میں نے کہا پہلے تو کہانی تلاش کرنا ہوگی۔ ان کے ایک بہت منہ چڑھے مصاحب تھے جو شاعری میں بھی غلط منہ مارتے تھے کہنے لگے وہ میں دے دوں گا۔ میں نے کہا کب؟ کہنے لگے دو چار دن میں کیونکہ وہ میرے ذہن میں ہے۔

انہوں نے ایک کہانی مرتب کر کے دی جس میں نام نہاد مجاہدانہ سپرٹ کی چیزیں بھری ہوئی تھیں اور ایک مسلمان ہیرو پچاس ہزار کافروں کو تہ تیغ کر دیتا ہے اور پھر ایک کافر کی بیٹی اس پر عاشق ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی لایعنی سی باتیں اور بھی تھیں۔ میں بہت صاف گو اور ناعاقبت اندیش یا غیر مصلحت اندیش واقع ہوا ہوں۔ اگر آج ایسی بات ہوتی تو رویہ کچھ اور ہوتا اور میں اس کا بدل تلاش کر لیتا اور کہتا کہ سبحان اللہ کیا اچھی کہانی ہے۔ کہانی بھی رکھ لیتا اور روپیہ بھی لے لیتا اور اس کے بعد مزے سے اس کہانی کو تبدیل کر کے معقول بنا لیتا۔ لیکن میں نے کہا کہ یہ کہانی تو کہانی نہیں اور آپ نے جو سنایا ہے یہ تو لمبے لمبے کوئی دس سین ہیں جبکہ فلمی کہانی سو سوا سو سین پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس شخص کا چہرہ اتر گیا اور نواب صاحب کو بھی کچھ برا لگا اور کہنے لگے اچھا پھر کل سوچیں۔ اگلے روز جب میں گیا تو کہنے لگے کہ میرا خیال ہے آپ ابھی اس پروگرام کو نہ کریں پھر جب ملاقات ہوگی تو سوچیں گے۔ سو اس مصاحب نے نواب صاحب کے کان بھرے اور میرا ایک اچھا چانس کھو گیا۔ ایسے چانس اور بھی کئی آئے جو میری صاف گوئی کی وجہ سے مجھ سے ضائع ہوئے۔ لیکن اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ میری یہ ساکھ بن گئی کہ یہ شخص صاف گو ہے اور مصلحت اندیش نہیں ہے۔ اس طرح قریبی لوگ مجھ پر اعتماد کرنے لگے اور میری رائے کا ایک وزن بن گیا۔

خان فقیرا خان جدون

میونسپلٹی ہری پور کے کیس سے بری ہونے اور راولپنڈی جانے کے درمیان میں نے ایبٹ آباد میں ایک ملازمت کی۔ وہاں سے ایک پرچہ ''انکشاف'' نکلتا تھا جس کے مالک خان فقیرا خان جدون تھے۔ وہ بڑے پراسرار شخص تھے۔ بہت وجیہہ' خوش لباس' شاہ خرچ اور اپنے پرچے کے ذریعے لوگوں کو اپنے شیشے میں اتارنے والے۔ بڑے افسروں سے ان کے قریبی تعلقات تھے جبکہ ان سے ذرا نیچے والے افسروں کو اپنے پرچے کے ذریعے بلیک میل کرتے تھے۔ وہ ایک عجیب انداز سے معمہ شائع کرتے۔ اس میں ان لوگوں کے نام لاتے' الزامات کا ذکر کرتے اور لوگوں کو یہ معمہ حل کرنے کی دعوت دیتے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ پرچے پر یہ قیمت لکھی ہوتی تھی عوام سے کچھ نہیں' خواص سے حسب خواہش مدیر۔

ان کے بارے میں مشہور تھا اور حقیقت سے قریب تھا کہ ان کی کوئی جائیداد یا زمین نہیں تھی' ایک مکان ایبٹ آباد سے آگے نواں شہر میں تھا۔ سرحد کی ایک بڑی شخصیت رائے بہادر لالہ عشرت داس بھی وہاں کے تھے تاہم ان کا نواں شہر کے قریب ایک اور گاؤں تھا جس کا نام دھموڑ ہے۔ ان کی مردان میں شوگر مل تھی جو تقسیم کے بعد کسی اور کو الاٹ ہوئی۔

خان فقیرا خان جدون سال میں ایک دو کام دکھایا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ جب حیدر آباد دکن میں آریہ سماج تحریک چلی تو اسے ہندو مسلم اختلاف کا رنگ مل گیا۔ انہوں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ یوں کہ ان کے کچھ اخبار نویس دوست تھے جن میں سول اینڈ ملٹری گزٹ والے م ش بھی شامل تھے جو انہیں خبروں میں

نمایاں کرنے کی حد تک ان کے معاون ہوتے تھے۔ انہوں نے ایجنسیوں کے ذریعے یہ خبر چھپوائی کہ خان فقیرا خان چیف آف دھموڑ آریہ سماجیوں کی مذموم حرکات کے سد باب کے لئے اپنے لاتعداد رفقاء سمیت حیدر آباد پہنچ رہے ہیں۔ پھر یہ خبر چھپوائی کہ وہ لاہور پہنچ گئے ہیں جہاں انہوں نے ایک میٹنگ کی ہے کہ آریہ سماجیوں کے ساتھ کیسے نبٹا جائے اور اب وہ دہلی روانہ ہوں گے۔ انہوں نے پہلے ہی یہ اہتمام کر رکھا تھا کہ ان کا کوئی آدمی حیدر آباد میں یہ کنگ نظام یا اس کے وزراء تک پہنچا دیتا تھا۔ اس طرح انہوں نے اپنے آپ کو ایک ہوّا بنا کر پیش کیا اور وہاں ان کا انتظار ہونے لگا۔ جب یہ وہاں پہنچے تو دس پندرہ مسلح اور خوش پوش آدمی ان کے ساتھ تھے۔ ان کا وہاں استقبال ہوا اور سرکاری مہمان بنائے گئے۔ اب یہ خدا ہی جانتا ہے کہ جب یہ وہاں سے واپس آئے تو کیا کچھ ساتھ لے کر آئے البتہ ایک سونے کا ٹی سیٹ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا جو نظام کی طرف سے انہیں Present کیا گیا تھا۔

یہ تو ایک چھوٹا سا واقعہ ہے۔ ان کا ایک دوسرا اور اس سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ ان کے گاؤں کا ایک بنیا جنگ کے دوران خوب کما کر واپس آیا' کیونکہ وہ ٹھیکیدار تھا' تو خان صاحب نے اسے ایک استقبالیہ دیا۔ جس میں سو ڈیڑھ سو آدمی بلا کر اس کی بڑی ہوا باندھی' وہ بہت خوش ہوا اور ان کا دوست بن گیا۔ پھر حضرت نے اپنی سکیم کے مطابق ایک دن اس سے کہا کہ مجھے بمبئی سے یہ ٹیلیگرام آیا ہے' میرے پاس کچھ جواہرات ہیں جو میں بیچنا چاہتا تھا جس سلسلے میں یہ شخص یہاں آ رہا ہے لیکن مجھے وائسرائے نے بلا لیا ہے اور میں دہلی جا رہا ہوں۔ آپ یہ جواہرات اپنے پاس رکھ لیں اور اسے دکھا دیں اور وہ جو قیمت بتائے ٹیلیگرام کے ذریعے مجھے بتا دیں۔ خان صاحب نے اسے کسی ہوٹل کا ایڈریس دیا جہاں جا کر انہوں نے ٹھہرنا تھا اور خود چلے گئے۔ بعد میں وہ آدمی آیا اور بات چیت کے بعد اس نے کہا کہ میں پچاس ہزار روپے دوں گا۔ سو ان صاحب نے ٹیلیگرام کے ذریعے خان صاحب کو اطلاع کر دی۔ خان صاحب نے جوابی ٹیلیگرام دیا کہ یہ کم ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہا اور بالآخر اس آدمی نے ڈیڑھ لاکھ روپے کی پیشکش کی مگر خان صاحب نے جواب بھیجا

کہ یہ کم ہیں اور اس سے زیادہ قیمت کا گاہک میرے پاس موجود ہے اس لئے رہنے دیجئے۔ خان صاحب دہلی سے واپس آئے تو انہوں نے کہا کہ وہ بیوپاری چلا گیا۔ اس نے کہا جی ہاں' کہنے لگا اچھا کیا آپ نے نہیں دیا میں تو یہ اڑھائی لاکھ روپے سے کم پر نہیں بیچوں گا اور پھر کہا لائیے وہ مجھے واپس دے دیجئے۔ انہوں نے ڈبہ کھولا تو کہنے لگے مجھے آپ سے یہ توقع نہیں تھی۔ آپ میرے اچھے دوست ہیں میں تو آپ کو جواہرات دے کر گیا تھا آپ نے یہ imitation رکھ دی ہے۔ اس بیچارے کے تو ہوش اڑ گئے کیونکہ ان کے پاس بھی ثبوت موجود تھے' قیمت کا تعین بھی ہو چکا تھا اور پھر ان کے سب افسران بالا سے تعلقات بھی تھے۔ انہوں نے اسے دھمکایا بھی اور اس سے ڈیڑھ لاکھ روپیہ وصول کر لیا اور وہ بیچارہ آخر کار اسی صدمے سے مر گیا۔

ان کے بارے میں اس طرح کی اور بھی بہت داستانیں مشہور تھیں۔ مگر اس کے باوجود وہ بڑے خدا ترس اور خرچیلے مشہور تھے۔ میں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے' جہاں نمائش کا معاملہ ہوتا تھا وہ بے دریغ پیسہ خرچ کرتے تھے اور جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہوتا وہ انتہائی خسیس تھے۔ انہوں نے ایک بہت بڑا سگریٹ کیس رکھا ہوتا تھا جس کے ایک پلڑے میں گھٹیا سگریٹ ہوتے تھے اور دوسرے میں اعلیٰ درجے کے۔ خود اعلیٰ درجے کے سگریٹ پیتے تھے اور اگر کوئی بڑا آدمی ملتا تو اسے بھی اس سائیڈ سے سگریٹ پلاتے تھے اور کوئی عام آدمی ہوتا تو اس کے سامنے دوسری سائیڈ کر دیتے تھے۔

میں نے دیکھا ہے کہ اپنے متعلقین کو جتنا Exploit کرنے والے یہ صاحب تھے اور کوئی نہیں تھا جیسا کہ م ش بھی ان سے Expliot ہوتے رہے۔ میں ان صاحب کے پرچے کا ایڈیٹر تھا۔ لیکن پرچے پر میرا نام نہیں آتا تھا حالانکہ سارا کام میں ہی کرتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ میں پورا پرچہ مرتب کرتا تھا بلکہ اسے چھپوانے کے لئے پنڈی بھی لے جاتا تھا کیونکہ ایبٹ آباد میں پریس نہیں تھا۔ علاوہ ازیں وہ ہر دفعہ مجھ سے کبھی کسی کی شان میں اور کبھی کسی کی شان میں کوئی نظم لکھواتے تھے اور نام ان کا ہوتا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ جب کوئی دعوت یا استقبالیہ ہوتا تو چونکہ میری آواز اچھی تھی اس لئے اعلان ہوتا کہ اب خان

فقیرا خان جدون کی لکھی ہوئی نظم قتیل شفائی ترنم سے سنائیں گے۔ اور یہ سب کام مجھ سے اسی تھوڑی سی تنخواہ میں لیتے تھے جو پرچہ مرتب کرنے کے سلسلے میں مجھ سے طے ہوئی تھی۔

پرچے کے دفتر میں میری اور کاتب کی چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں کیونکہ کاتب بھی باہر کا رہنے والا تھا۔ خان صاحب نے الماری میں کچھ انڈے رکھے ہوئے تھے جو وہاں پڑے پڑے اندر سے سوکھ گئے تھے۔ کاتب بیچارے نے وہ سات آٹھ انڈے خراب ہو جانے کی وجہ سے باہر پھینک دیے۔ یہ آئے تو کہنے لگے کہ میں نے یہاں انڈے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے کہا کہ میں نے وہ باہر پھینک دیئے ہیں کیونکہ وہ خراب ہو چکے تھے کہنے لگے کس طرح پھینک دیئے۔ خود کھا گئے ہو بے ایمان آدمی' میں تو تم سے ان کے پیسے وصول کروں گا اور اس کی تنخواہ میں سے ان کے پیسے کاٹ لئے۔ ظاہر ان کا کچھ تھا لیکن اندر سے ان کی یہ حالت تھی' میں نے جب یہ دیکھا تو کانوں کو ہاتھ لگایا اور وہاں سے ملازمت چھوڑ کر چلا آیا۔

جلال بابا

ایک شخصیت تو اس رخ کی میں نے آپ کو بتائی لیکن دوسرے رخ کے جو لوگ تھے ان میں سے ایک مشہور و معروف شخص جلال بابا بھی تھے جو ایک سیلف میڈ آدمی تھے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ انگریز کے زمانے میں موٹر ڈرائیور تھے اور فٹ بال کے بھی بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ ڈرائیورنگ کے ساتھ ساتھ وہ کسی ایسی ٹیم میں شامل تھے جو کاکول میں انگریزوں کے ساتھ مل کر یا ان کے بالمقابل کھیلا کرتی تھی۔ چنانچہ ان انگریزوں کی مدد سے انہیں آگے بڑھنے کا موقع ملا۔ ابتدا میں انہیں ایک چھوٹا سا ٹھیکہ ملا لیکن جلد ہی وہ صاحب حیثیت ہو گئے اور انہوں نے ایبٹ آباد میں پولیس سٹیشن کے سامنے ایک چھوٹا سا دفتر بھی قائم کر لیا۔

وہ بڑے بارعب آدمی تھے اور کھانے کے وقت ان کے دسترخوان پر دس پندرہ آدمی موجود ہوتے تھے۔ انہیں انگریز کی طرف سے خان بہادر کا خطاب بھی ملا۔ جب سرحد میں ریفرنڈم کا دور آیا تو قائداعظم نے سب مسلم لیگیوں سے کہا کہ انگریز کی طرف سے ملنے والے سب خطاب واپس کر دو۔ یہ اس وقت مسلم لیگ کی کسی ورکنگ کمیٹی میں بھی شامل ہو چکے تھے اور مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں یہ سب سے پہلے آدمی تھے جنہوں نے خان بہادر کا اعزاز واپس کیا اور کہا کہ خان بہادر جلال الدین کی بجائے میں اب جلال بابا ہی رہوں گا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان کی جارج کٹ ڈاڑھی تھی اور یہ جوانی ہی میں جلال بابا کہلواتے تھے۔

ریفرنڈم کے دوران ہم لوگوں نے جو کام کیا وہ انہی نگرانی میں کیا اور مسلم لیگ کی ہائی کمان اگر انہیں ایک ہزار روپے دیتی تھی تو یہ اپنے پلے سے چار ہزار روپے خرچ کرتے تھے۔ لہٰذا ہزارہ میں مسلم لیگ کے فروغ کے لئے جتنا کام انہوں نے کیا اور کسی نے نہیں کیا۔ جلال بابا ایوب خان کے زمانے میں مرکزی وزیر بنے لیکن یہ ان چند لوگوں میں سے ثابت ہوئے جنہوں نے وزارت سے ایک پائی کا بھی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ پاس سے خرچ کیا۔

اصل مسلم لیگ تو قیام پاکستان کے ساتھ ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ الاٹمنٹوں کا چکر چلا تھا جس سے مسلم لیگ ان پاپولر ہو گئی تھی۔ چنانچہ جو اصل مسلم لیگی تھے وزارت سے بھی ہٹ گئے تھے۔ پھر جب ان کے زوال کا زمانہ آیا تو اس وقت ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا سوائے اپنے مکان اور دفتر کے۔ میں جب کبھی ایبٹ آباد جاتا تو انہیں اپنا رہنما سمجھ کر اور مخلص لیگ کا قائد سمجھ کر سلام کرنے جاتا تھا۔ یہ ان کا غربت کا زمانہ تھا۔ ایک بار مجھے کہنے لگے کہ قتیل! خدا خوش رکھے سردار بہادر خان کو جو مجھے ہر ماہ پانچ سو روپے بھیج دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی اور کا نام بھی بتایا کہ پانچ سو روپے ماہانہ وہ بھیجتے ہیں۔ اس طرح ایک ہزار روپیہ ہو جاتا ہے جس سے گزر بسر کرتا ہوں۔ ایک بیٹا کسی دوا ساز کمپنی میں کام کر رہا ہے اور دوسرے نے کوئی چھوٹی سے دوکان بنا رکھی ہے۔ اس کے باوجود شان وہی تھی کہ جب گھر سے کھانا آتا جو صرف ایک ہی ڈش ہوتی تھی اس میں چار پانچ آدمیوں کو شامل کر لیتے تھے۔ کچھ پیسے سامنے رکھے ہوتے تھے اور جب کوئی فقیر آتا تو اسے خیرات دیتے۔

جسٹس سجاد احمد جان سے میری ملاقات انہی کے دفتر میں ہوئی تھی۔ یہ ایبٹ آباد میں مقیم تھے۔ ان سے میرا تعلق دو طرح سے تھا۔ ایک تو یہ نواب امب کے لیگل ایڈوائزر تھے اور دوسرے یہ ایبٹ آباد کی بزم ادب کے صدر تھے۔ یہ ان دنوں عام وکیل کی حیثیت سے پریکٹس کرتے تھے۔ لیکن باقی وکیلوں کو دیکھا وہ تو صرف مؤکلوں کے پیچھے پڑے رہتے تھے مگر یہ زیادہ تر وقت ان نوجوانوں کو دیتے تھے جو ادبی ذوق رکھتے تھے اور قیام پاکستان کے لئے سیاسی کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

ایوب خان کے زمانے میں یہ جسٹس بنے اور لاہور آ گئے۔ یہاں بھی ان سے ملنا رہا اور ان کے بیٹے جو آجکل وزیر ہیں ہمارے دیکھتے ہوئے جوان ہوئے اور ان میں وہ قابلیتیں اور صلاحیتیں ہیں جن کا اظہار باپ بھی نہیں کر سکا۔ یہ ٹھیک ہے کہ:

اگر کوئی شراب آئے میسر
شبانے سے کلیسی دو قدم ہے

صدر ضیاء کی ان پر نظر پڑی اور بے شک صدر ضیاء کی وجہ سے ہی سہی لیکن اس دائرے میں صدر ضیاء کے جو مقاصد تھے' انہوں نے ان کی نمائندگی بہت خوبصورتی سے کی۔

جنس کا تجربہ

میرا جنس کا تجربہ خلاف فطرت نہیں رہا اور مجھے اس کا احساس شادی کے بعد ہی ہوا۔ لیکن میری بدقسمتی کہ شادی کے ایک دو سال بعد ہی کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ میری بیوی کو بجا طور پر مجھ پر اعتراضات کرنے کا موقع ملا تاہم ان میں میرا کوئی ایماء شامل نہیں تھا۔

سب سے پہلے تو یہ ہوا کہ ہری پور میں ہماری گلی سے پچھلی گلی میں ایک سینٹری انسپکٹر رہا کرتے تھے جن کا رنگ کالا اور عمر بھی پینتالیس سے اوپر تھی۔ ان کی پہلی بیوی مر چکی تھی اور انہوں نے جس لڑکی سے دوسری شادی کی' وہ بہت خوبصورت تھی اور اس کی عمر سولہ سترہ سال تھی۔ میری عمر اٹھارہ سال تھی۔ سرخ و سفید رنگ اور خوش پوش آدمی تھا' پھر خاندانی طور پر بھی کچھ نام تھا اور امارت کا بھی کچھ رعب تھا۔ میں کبھی کبھار اس گلی سے گزرتا تھا۔ پہلے تو اس نے کسی بہانے مجھے بلایا اور بات چیت کی' بعد میں یہ ہوا کہ میں جب ادھر سے گزرتا تو وہ بازو باہر نکال کر پکڑ لیتی تھی اور فریاد کے انداز میں کہتی کہ ایک جوتشی نے مجھے بتایا ہے کہ تم جسے چاہتی ہو وہ تمہیں نہیں چاہتا۔ مجھے احساس تفاخر ہوتا تھا لیکن محلے داری کی وجہ سے جوابی کارروائی کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں شروع سے کچھ قاعدے اور اصولوں پر پابند رہا ہوں کہ جس محلے میں رہتے ہو' بڑی شرافت سے رہو' لوگوں کی عزت کرو اور کسی پر نظر نہ رکھو۔ دوسرا کسی دوست کے گھر جاؤ تو اس کی بہنوں کو اپنی بہنیں سمجھو۔

ہمارا مکان محلے میں سب سے اونچا مکان تھا' اوپر کھڑا ہو کر سب کچھ نظر آتا تھا' پھر میری بیوی کو کسی نے بتا بھی دیا تھا کہ یہ اس سے ملتا ہے تو اس نے چھت پر کھڑے ہو کر خود

دیکھ بھی لیا تھا' اس لئے اس نے مجھ سے اس بارے میں پوچھا تو میں نے بتایا کہ اس نے کسی کام کے لئے بلایا تھا۔ ایک بار اس نے مجھے کوئی انگوٹھی Present کی' میں وہ پہن کر گھر گیا تو بیوی نے پوچھا یہ کس نے دی ہے۔ میں نے کہا میرا کلاس فیلو جو سنار ہے اس نے دی ہے۔ کہنے لگی یہ تو اس نے دی ہے میں دیکھ رہی تھی۔ اس طرح شکوک کی فضا بڑھ گئی۔

میں شاعر تھا لیکن میری بیوی کو ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ شروع سے ہی انتہائی وفادار' گھر کی نگہبان' پوری فیملی سے دلی محبت کرنے والی اور دل میں پیار کا سمندر رکھنے والی خاتون ہے۔ اس میں خامی یہ ہے کہ وہ اپنی زبان سے کبھی ان جذبات کا اظہار نہیں کر سکی۔ اگر اسے کبھی کوئی شکایت بھی ہوئی تو اس کے اظہار کا طریقہ بہت غیر شاعرانہ تھا۔ مزاجوں کے اختلاف کی جو خلیج تھی' اس کی وجہ سے جب باہر سے کوئی میری طرف تھوڑا سا جال پھینکتا تو میں اس میں آ جاتا تھا۔

مجھ پر سب سے بڑا جال تو اس وقت پڑا جب میں تقسیم سے ذرا پہلے ایک فلمساز کمپنی کے سلسلہ میں یہاں لاہور پہنچا تو فلم پروڈکشن کے آفس میں میری ملاقات ہوئی۔ میں یہاں گیت نگار کے طور پر آیا تھا لیکن پبلسٹی کا کام بھی میرے ذمہ ہی تھی۔ اس وقت بھی میں بیٹھا بلٹن لکھ رہا تھا۔ وہ خاتون پہلے تو کچھ دیر مجھے دیکھتی رہیں اور پھر کہنے لگیں' کیا آپ مجھے یہ دکھائیں گے؟ میں نے دکھا دیا۔ کہنے لگیں یوں لگتا ہے جیسے ٹائپ کیا ہوا ہے یا پرنٹ کیا ہوا ہے' بڑا انوکھا خط ہے۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ اس خاتون کا نام چندر کانتا ہے۔

یہ لالہ راجپت رائے فیملی کے دور کے رشتہ داروں میں سے تھیں اور انہیں فلم ایکٹنگ کا شوق تھا۔ لدھیانہ کے قریب ایک جگہ پھلور کی رہنے والی تھیں۔ ان کے والد پولیس انسپکٹر تھے۔ جب ان سے تعارف ہوا ان دنوں میرا مکان کا مسئلہ تھا۔ یہ مجھے مکان دکھانے کے بہانے ساتھ لے گئیں اور بات اس دن ہی اتنی آگے بڑھ گئی کہ میں ان کے قابو میں آ گیا۔ یہ واقعہ تقسیم سے کوئی چھ ماہ قبل کا ہے۔ تقسیم ہوئی تو وہ میرے لئے یہیں رہ گئیں۔

مجھے اندر سے احساس ہوتا کہ جو کر رہا ہوں وہ ٹھیک نہیں ہے کیونکہ اس وقت میرے

تین بچے تھے۔ میں نے اس معاملے میں کبھی تماش بینوں والا رویہ اختیار نہیں کیا۔ انہوں نے مجھے اپنے حالات اور بے سہارگی کے بارے میں بتایا تھا اور میں نے بھی انہیں بتا دیا تھا کہ میری بیوی اور تین بچے ہیں اور میں ان پر یہ حالات اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہتا۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے مجھے تو ایک Shelter چاہئے' اس کے بعد بات شیلٹر سے آگے بڑھ گئی' پھر مطالبے شروع ہوئے کہ بیوی سے الگ ہو جاؤ اور اسے طلاق دے دو۔ دراصل وہ اپنے علاوہ اور کسی کو میرے قریب نہیں آنے دیتی تھیں اور خود مسلمان بھی ہو گئی تھیں۔ لیکن تقسیم کے کوئی ڈیڑھ سال بعد ان سے علیحدگی ہو گئی۔

چونکہ یہ زندگی کا اور رومانس کا پہلا واقعہ تھا اور اس میں شکست و ریخت بھی ہوئی اس لئے اس کا میری زندگی پر بہت اثر پڑا۔ میں ذہنی طور پر اتنا ڈسٹرب ہوا کہ بہت دیر تک سنبھل نہیں پایا لیکن مجھے بہت سے موضوعات مل گئے۔ اس زمانے کی شاعری ایک نئے رخ پر آ گئی اور یہ شعور پیدا ہوا کہ یہ محبتیں کیسے پیدا ہوتی ہیں۔

انہوں نے تقسیم سے پہلے جب مجھے دیکھا تھا تو اس وقت انہیں میرا مستقبل بڑا شاندار نظر آ رہا تھا۔ اس زمانے میں میری اس پروڈکشن کے لئے جو دو گیت ریکارڈ ہوئے تھے ان کا بہت شہرہ ہوا تھا کہ ایک شخص نیا انداز لایا ہے۔ اگر تقسیم نہ ہوتی یا تبادلہ آبادی نہ ہوتا اور وہی پروڈکشنز موجود رہتیں تو میں بہت آگے بڑھتا لیکن تقسیم کے بعد روزگار کا معاملہ آ گیا اور انہوں نے کوٹھی' گاڑی اور عیش و عشرت کے بارے میں جو سوچا تھا وہ پورا نہ ہوا' سو وہ بددل ہو گئیں۔ پھر ان کی طرف سے جو مطالبات تھے وہ میں پورے نہ کر سکا' اس طرح جو علیحدگی ہوئی اس نے میری شاعری کو ایک پس منظر دیا اور میں روایتی شاعری سے ہٹ کر جذباتی شاعری کرنے لگا۔

اس کے کافی عرصہ بعد اقبال بانو سے ملاقات ہوئی اور ملاقاتوں کا یہ سلسلہ ساڑھے تین یا چار سال چلا اور اس نے مجھے یک موضوعی نظموں پر مشتمل ایک پوری تصنیف ''مطربہ'' دی۔ اگر کوئی شخص مجھے تھوڑا سا بھی جانتا ہو تو اس تصنیف سے میری ساری پہچان ہو جاتی ہے ہر چند کہ یہ چیزیں بیانیہ نہیں ہوتیں بلکہ ادب پارے ہوتے ہیں جن میں ذاتی سچ بھی

ہوتا ہے۔

یہ تمام چیزیں میری بیوی نے اپنے اوپر جھیلیں اور اس پر میں کوئی فخر بھی نہیں کرتا۔ اور سمجھتا ہوں کہ یہ سب میرے دامن پر داغ ہیں جو آ گئے۔ میری بیوی کو اذیتیں تو ہوئیں لیکن اس نے لڑائی جھگڑے کے باوجود ایسا نباہ کیا کہ جب میں عمر کے اس حصے میں اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھتا ہوں تو بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔ اس کی عظمتیں سامنے آتی ہیں اور اپنی لغزشوں سے شرمسار ہوتا ہوں۔

ایک بات میں نے ذمہ داری سے نبھائی کہ جس حال میں بھی رہا سب سے پہلے اپنے گھر پر توجہ دی اور گھر کی سب ضرورتیں پوری کر کے ہی کوئی اور کام کیا۔ اس کے علاوہ زندگی میں کئی ایسے مواقع بھی آئے کہ میرے گھر سے دور ہونے کے امکانات تھے۔ مگر میں ثابت قدم رہا۔ بعد میں ان کرداروں سے جب اگلے لوگوں کی وابستگیاں ہوئیں اور میں نے ان کا حشر دیکھا تو مجھے ہنسی آئی کہ میری بلا ان کے گلے پڑ گئی ہے اور میں اپنے گھر میں اپنے بچوں کے ساتھ بالکل ٹھیک بیٹھا ہوں اور اس عمر میں جبکہ سکون کی ضرورت ہوتی ہے ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہا ہوں۔

دل توڑنے والے دیکھ کے چل

پاکستانی فلم انڈسٹری میں 1956ء انور کمال پاشا کے عروج کا زمانہ تھا۔ ان کی فلموں میں لکھنے والوں کا ایک اجتماع ہوا کرتا تھا اور شاعری پر خصوصیت سے توجہ دی جاتی تھی۔ ان کی کوئی فلم ایسی نہیں تھی جس میں کوئی سپرہٹ گانا نہ آئے۔ اس زمانے میں جو واقعی شاعر تھے اور جنہیں شاعر کہنا چاہئے نغمہ نگار نہیں' وہ تنویر نقوی' سیف الدین سیف اور میں تھے۔ ہم تینوں پاشا صاحب کے قریبی لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے اور کبھی ان کے لئے پوری پوری فلم اور کبھی مل کر لکھتے تھے۔ اس طرح ایک مسابقت کا سلسلہ تھا۔ اگر میرا گیت ہٹ ہو جاتا تو تنویر صاحب کوشش کرتے تھے کہ اس سے آگے بڑھیں اور اگر سیف صاحب کا کوئی گانا ہٹ ہو جاتا تو میں اس پر رشک کرتا اور کوشش کرتا کہ میں ان سے آگے نکلوں' فلم ''گمنام'' کا ایک گیت تھا:

پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے

یہ گیت سیف صاحب نے لکھا اور اقبال بانو اس کی گائیکہ تھیں' اس گیت کی شہرت بہت دور دور تک پہنچی۔ مجھے یہ Haunt کرتا تھا اور میں سوچتا تھا کہ کاش ایسا ہی ایک گیت میں بھی لکھوں اور سیف صاحب کے ہمدوش قرار دیا جاؤں اس کے بعد فلم قاتل بنی تو اس کے گانے میں لکھ رہا تھا۔ اس کے لئے ایک مشہوری سچوایشن آئی جس کے لئے میں نے عام روش سے خاصا ہٹ کر یہ گیت لکھا:

الفت کی نئی منزل کو چلا
تو ڈال کے بانہیں بانہوں میں

دل توڑنے والے دیکھ کے چل
ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

اس گیت کی ہسٹری یہ ہے کہ جب یہ لکھا گیا اور چونکہ عام روش سے ہٹ کر تھا' اس لئے پاشا صاحب اسے سن کر قدرے خاموش رہے۔ وہاں موجود پاشا صاحب کے مصاحبین ان کے تیور دیکھ کر ہی داد دیا کرتے تھے اور اگر پاشا صاحب کوئی گیت سن کر خاموش رہتے تو وہ سمجھتے کہ انہیں یہ پسند نہیں آیا اور وہ بھی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتے تھے۔ پاشا صاحب نے یہ گیت اپنے والد نامی گرامی حکیم احمد شجاع کو سنایا تو انہوں نے گیت پر اس طرح تنقید کی کہ میں دل برداشتہ ہو گیا۔ میں نے کہا کہ آپ یہ گیت مجھے واپس کر دیں اور کسی اور سے لکھوا لیں۔ چنانچہ اس سچوئیشن پر پاشا صاحب نے مختلف شاعروں سے طبع آزمائی کروائی اور بالآخر سیف الدین سیف کا ایک مکھڑا لے لیا گیا لیکن سیف صاحب نے دوسرے دن یہ کہہ کر ان سے وہ مکھڑا واپس لے لیا کہ انصاف کی بات یہ ہے کہ قتیل صاحب کا لکھا ہوا گیت مجھ سے بہتر ہے۔ انہوں نے لکھا تھا:

نہ جا اب چھوڑ کے بسمل ٹھہر جا
میں زندہ ہوں مرے قاتل ٹھہر جا

سیف صاحب اعلیٰ درجے کے شاعر ہونے کے علاوہ منصف مزاج بھی تھے اور عام شاعروں کے برخلاف انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ چیک آئے گا بلکہ انہوں نے انصاف سے کام لیا۔ اور ان لوگوں کہ آئینہ دکھا دیا۔ چنانچہ جب اس کے بعد سیف صاحب سمیت کوئی دس بارہ شاعر کوشش کر چکے اور کام نہ بن سکا تو وہ میرے گیت کی طرف متوجہ ہوئے جس کی ٹیون بھی ماسٹر عنایت حسین نے بنائی ہوئی تھی۔ یہ گیت سن کر ایک غیر محسوس چیز انہیں پکڑتی تھی اور وہ سوچتے تھے کہ اس میں کوئی بات ہے۔ چنانچہ ایک روز پاشا صاحب مجھے مل گئے اور کہنے لگے کہ میرا وہ گیت کہاں ہے میں بات سمجھ گیا لہٰذا میں نے کہا وہ گیت تو میں نے آگے بیچ دیا ہے۔ کہنے لگے وہ تو میرا گیت تھا وہ کیوں بیچ دیا۔ میں نے کہا آپ نے اور آپ کے والد نے تو اسے رد کر دیا تھا۔ میں نے یونہی انہیں ستانے کے لئے کہا کہ میں

نے ایک ہزار روپیہ لے کر وہ گیت کسی کو بیچ دیا ہے' کہنے لگے آپ مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہیں یہ لیجئے ایک ہزار روپیہ اور چیک کاٹ کر مجھے دے دیا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔

اچھے شاعروں کی فیس ان دنوں پانچ سو روپے فی نغمہ ہوتی تھی۔ لیکن وہ میرے بہت قدردان تھے اور مجھے چھ سو روپے دیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ پانچ سو روپے تو گانے کے ہیں اور ایک سو روپیہ شاعر قتیل شفائی کو میرا نذرانہ ہے۔ جب یہ گیت فائنل ہو چکا تو پاشا صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ یہ نغمہ کس گلوکارہ کو گانا چاہیے۔ میرے ذہن میں تو وہی گیت تھا: پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے۔ میوزک ڈائریکٹر بھی وہی تھے۔ شاعری بھی اسی پایہ کی تھی' اس لئے میں نے کہا کہ یہ اقبال بانو کو گانا چاہیے۔ پاشا صاحب کہنے لگے کہ بس مسئلہ حل ہو گیا' میرے ذہن میں جو نام آتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا لیکن آپ کا فیصلہ بالکل ٹھیک ہے پھر کہا کہ اب ان سے رابطہ بھی آپ ہی کریں۔ وہ ملتان میں ہیں اور شاید مصروفیت کی وجہ سے نہ آسکیں' اس لئے آپ کوشش کریں۔

اقبال بانو باقاعدہ پہلے بیک سنگر نہیں تھیں اور تقسیم سے پہلے ان کا ایک گیت آیا تھا۔ شائل اختری فیض آبادی جیسا تھا لیکن آواز منفرد اور انوکھی تھی اور وہ اپنی ایک پہچان رکھتی تھیں۔ اقبال بانو کا تعلق دراصل روہتک دہلی سے تھا اور وہیں انہوں نے گانے بجانے کا کام شروع کیا۔ تقسیم کے بعد وہاں سے منتقل ہوئیں تو ملتان میں حرم گیٹ کے پاس اپنے اڈے پر گایا کرتی تھیں۔ ان کا انداز سلجھا ہوا تھا اور اس میں چھوٹا پن نہیں تھا لیکن چونکہ یہ بیٹھ کر گانے والی تھیں جبکہ دوسری گانے والیاں ٹھمکے کے ساتھ کولہا ہلا کر گاتی تھیں اس لئے وہاں ان کا کاروبار ٹھیک طرح سے جم نہیں رہا تھا۔ اب انہوں نے جو فلم ''قاتل'' کا یہ گانا ریکارڈ کروایا تو ایکبار پھر وہ توجہ کا مرکز بنیں۔ فلم ریلیز ہوئی تو نہ صرف یہ گانا پاکستان کے کونے کونے میں مقبول ہوا بلکہ میں جب انڈیا گیا تو بمبئی کی فلم انڈسٹری میں میں نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جس کے پاس یہ ریکارڈ نہ ہو۔ اس زمانے میں یہ ریکارڈ سمگل ہو کر جاتا تھا۔ اس ریکارڈ کی قیمت یہاں پانچ سات روپے ہوتی تھی وہاں یہ ریکارڈ ستر ستر روپے میں بلیک میں بکتا تھا۔

یہ گانا گا کر اقبال بانو ملتان واپس چلی گئیں۔ اس کے بعد ایک موقع ایسا آیا کہ مجھے ان کی آواز کی ضرورت فلم عشق لیلیٰ کے لئے پڑی جس میں میری یہ غزل گائی جانے والی تھی:

پریشاں رات ساری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

منشی دل مرحوم اس فلم کے ڈائریکٹر تھے جبکہ میوزک ڈائریکٹر صفدر حسین تھے اور ہم سب مل کر باہمی مشورے سے ٹیم کے طور پر کام کرتے تھے۔ میں نے کہا کہ یہ غزل اقبال بانو کی آواز میں مناسب رہے گی اور ان سے رابطے کا ذمہ بھی لیا۔ میں شہزاد احمد کو ہمراہ لے کر وہاں گیا اور انہیں اس گانے کے لئے راضی کیا۔ چنانچہ حسب وعدہ وہ آئیں اور گیت گایا۔ یہ فلم مقابلے میں بن رہی تھی اس لئے صرف سوا مہینے میں مکمل ہو گئی جبکہ ہم نے اٹھائیس دن میں اس کے چودہ گانے ریکارڈ کیے۔ فلم ریلیز ہوتے ہی یہ گانا دھوم دھام سے باہر آیا اور اقبال بانو کا نام آگے بڑھا۔

تھوڑی سی ملاقاتوں میں اقبال بانو کے ساتھ قربتیں بڑھیں اور وہ اس لئے کہ ان کی باتوں سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ شاعری میں دلچسپی رکھتی ہیں اور اپنے کوٹھے پر گانے والے پیشے سے ناخوش ہیں۔ ان کی باتوں کا انداز کچھ ایسا تھا کہ میرا تعاون چاہتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے مناسب سمجھا کہ ملتان سے لاہور منتقل ہو آئیں۔ ملتان میں ان کی بہت بڑی کوٹھی تھی جبکہ لاہور میں گنپت روڈ پر انہوں نے پہلے ہی سے ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا جب لاہور آتیں تو یہاں قیام کرتی تھیں۔ چنانچہ ان کی ماں اور نانی تو ملتان ہی میں رہ گئیں وہ خود لاہور آ کر اس مکان میں قیام پذیر ہوئیں۔

یہاں ہمارا تعاون اس قدر بڑھا کہ میں جس فلم کے بھی گانے لکھتا' اس میں ایک دو گانے ان کی ٹائپ کے ضرور ہوتے۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ ان کی ٹائپ کا جو گانا بھی بنایا گیا وہ مقبولیت کی حد تک آگے بڑھا۔ اس طرح ان سے میری بات بڑھتے بڑھتے جذباتیت کی حد تک پہنچ گئی اور جب ہم جذبات سے آگے بڑھتے ہیں تو جنس کی شکل اختیار کرتے تھے۔

باوجودیکہ مجھے ہمیشہ گھر سے گہری دلچسپی رہی ہے اور میں شعوری طور پر ایک ذمہ دار شوہر اور باپ رہا ہوں لیکن کچھ دوستوں کے طعنوں اور کچھ آئے دن کی قربتوں سے مجبور ہو

کر میرے دوست اور مرحوم فلم ڈائریکٹر سبطین فضلی کو یہ کہنا پڑا کہ آپ لوگ اس طرح کی زندگی کیوں گزار رہے ہیں۔ میں نے کہا ان سے پوچھئے اور انہوں نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ ان سے پوچھئے۔ معاملہ یہیں نہیں رکا بلکہ شرماشرمی میں شادی کا دن بھی مقرر ہو گیا۔ مقررہ دن وہ شادی کا جوڑا پہن کر پرویز صاحب کے ہاں آ گئیں جہاں مولوی صاحب بھی بلوائے ہوئے تھے۔ فضلی صاحب نے دعوت کا انتظام کیا ہوا تھا اور Confidential دوست بھی بلوائے تھے۔ دل میں میں بھی کانپا اور وہ بھی۔ شاید دونوں نے کوئی منصوبے بنا رکھے تھے مگر دل سے دونوں میں سے کوئی بھی نہیں چاہتا تھا۔

قسمت نے میری یاوری کی کہ اقبال بانو کو کوئی بات سوجھی' انہوں نے فضلی صاحب سے کہا کہ قتیل صاحب سے کہئے کہ شادی کے بعد کم از کم دو سال تک مجھے گانے کی اجازت دیں۔ یہ بات میرے ہاتھ آ گئی اور میں نے کہا کہ لوگ یہی کہیں گے کی قتیل شفائی کی بیوی ناچ رہی ہے اور گا رہی ہے کیونکہ شادی کے بعد صرف یہی فرق پڑتا ہے ورنہ میاں بیوی تو اب بھی ہم ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جی میرے بچوں کا سوال ہے۔ فضلی صاحب نے کہا کہ اقبال بانو آپ ان سے مخلص نہیں ہیں اور قتیل صاحب آپ بڑے غیرت مند آدمی ہیں۔ اگر آپ ان کی شرط مان جاتے تو میں آپ کو بڑا بے غیرت آدمی سمجھتا۔ شادی رک گئی اور دو مہینے کی مہلت دی گئی کہ ہم دونوں سوچ لیں۔ ان دو مہینوں کے دوران شاید اقبال بانو ہی کو کوئی ترکیب سوجھی ہوگی کہ ہم دونوں میں کشیدگی بڑھ گئی اور علیحدگی ہو گئی۔

اس واقعہ سے فلم انڈسٹری کو یہ نقصان ہوا کہ تیس سال گزر چکے ہیں لیکن اقبال بانو کی آواز سے فلم انڈسٹری محروم ہو گئی ہے۔ میں تو اب تک چل رہا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس آواز کی ضرورت تھی جس سے فلم انڈسٹری خدا جانے کیوں استفادہ نہیں کر سکی لیکن ایک بات ہوئی کہ الاٹمنٹوں کے سلسلے میں ان کے حصے میں جو جائیداد یہاں آئی تھی اس کی فروخت کی وجہ سے اقبال بانو فلم انڈسٹری سے دور رہنے کے باوجود اس وقت ایک امیر کبیر عورت ہیں۔

''ادب لطیف'' میں ملازمت

پہلی مرتبہ 1946ء میں خالصتاً ادبی سلسلے میں میرا لاہور آنا ہوا۔ ان دنوں میں مری میں پنڈی مری ٹرانسپورٹ میں کام کر رہا تھا اور ''ادب لطیف'' کے ادارے سے مجھے اسسٹنٹ ایڈیٹر کے طور پر کام کرنے کی دعوت ملی تھی۔ ''ادب لطیف'' میں یہ دستور تھا کہ مالکان کا نام ادارت میں آتا تھا باقی جو لوگ کام کرتے تھے ان کا نام نہیں آتا تھا۔ مجھ سے پہلے فکر تونسوی بھی اس ادارے میں کام کر رہے تھے۔ اس تقرری پر میری خوشی کی انتہا نہیں تھی کیونکہ ایک پسماندہ علاقے سے اور ایک خشک نوکری سے میں سیدھا اپنے خوابوں کی دنیا میں آ گیا تھا اور خود کو بڑا خوش نصیب سمجھتا تھا۔

میں نے کام کرنا شروع کر دیا اور تنخواہ کوئی طے نہ کی۔ وہاں میں ڈیڑھ سو روپے لیتا تھا' سوچا کہ یہ لاہور ہے اس لئے دو سو روپے تو ملیں گے ہی۔ اپنی خوشی کی وجہ سے ساری باتیں نظر انداز کر کے میں دس بیس روپے ایڈوانس لے کر اپنا کام چلاتا رہا۔ جب تین چار ماہ گزر گئے تو فکر تونسوی نے مجھے کہا کہ ان سے تنخواہ طے کر لو کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں تمہیں پچھتانا پڑے۔ فکر مرحوم کھل کر کوئی بات کرنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ ان سے اسی زمانے میں دوستی شروع ہوئی تھی۔

مالکوں میں چودھری نذیر تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ معاملہ طے کر لیں۔ موری دروازے میں ''ادب لطیف'' کا دفتر تھا۔ انہوں نے کہا شام کو انارکلی میں نظام ہوٹل میں بات کر لیں گے۔ بات ہوئی اور وہ کہنے لگے کہ آپ کی تنخواہ چوہتر روپے ماہوار ہوگی۔ میں چکرا گیا۔ انہوں نے کہا ادبی پرچہ ہے اس میں تو یہی ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا آپ کو پتا ہونا چاہئے تھا کہ میں وہاں ڈیڑھ سو روپے تنخواہ لے رہا تھا۔ آپ زیادہ نہیں تو کم از کم اتنی تو دیتے۔ کہنے لگے یہ تو ممکن نہیں۔ میں نے کہا میں یہاں کام نہیں کروں گا اور آپ میرا حساب کر دیجئے۔ لیکن مجھے یہ بتایئے کہ یہ تنخواہ چوہتر ہی کیوں ہے۔ ستر' پچھتر یا اسی کیوں نہیں۔ وہ اس بات کو گول کر گئے۔ بعد میں فکر تونسوی نے قہقہہ لگا کر کہا کہ میں یہاں تین سال سے کام کر رہا ہوں۔ میری تنخواہ پچھتر روپے ہے' تم مجھ سے جونیئر ہو اگر تمہاری تنخواہ

پچھتر روپے ہو جاتی تو میری چھہتر کرنا پڑتی اس لئے تمہاری تنخواہ چوہتر روپے رکھی گئی۔

مجھے اس واقعہ سے دھچکا لگا اور میں راولپنڈی واپس چلا گیا جہاں کچھ عرصے کے بعد گارڈن کالج پنڈی کے ایک مشاعرے میں میری ملاقات دو اشخاص سے ہوئی جنہیں میں پہلے سے جانتا تھا۔ ان میں سے ایک مرحوم محبوب اختر تھے جن کا وہاں ایشیاٹک آپٹیکل کمپنی کے نام سے ایک ادارہ تھا اور جو ''مغل اعظم'' کے ابتدائی ورژن کے رائٹر تھے اور کے آصف کی ٹیم میں کام کر چکے تھے۔ اب وہ اپنی فلم بنانے کی پلاننگ کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے کالج فیلو امان اللہ خان نیازی تھے جو ان دنوں نئے نئے کالج سے نکل کر آزاد زندگی گزار رہے تھے اور بعد میں جب ہارٹ فیل ہونے سے فوت ہوئے تو اس وقت وفاقی سیکرٹری ڈیفنس تھے۔ ان دونوں نے مل کر ''خیالستان پروڈکشنز'' قائم کی تھی اور بمبئی میں فلم بنانا چاہتے تھے۔ اس زمانے میں دلیپ کمار اور نرگس نئے نئے ابھر رہے تھے اور میں ان کی سلیکشن کی داد دیتا ہوں کہ انہوں نے ان کو کاسٹ کیا۔ میوزک ڈائریکٹر شام سندر کو لیا اور گیت نگار کے طور پر مجھے چنا۔ میرے ذہن میں بھی یہ ایک خواب تھا اس لئے بہت خوش ہوا۔

انہوں نے میری تنخواہ پانچ سو روپے ماہوار مقرر کی اور پانچ سو روپیہ مجھے ایڈوانس دیا کہ آپ بمبئی کی تیاری کریں۔ یہ نومبر 1946ء کی بات ہے۔ میں نے شیروانی اور سوٹ سلوائے اور اپنی سیٹ بھی ریزرو کروالی مگر انہی دنوں بمبئی میں ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے تو انہوں نے تار دے کر مجھے روک دیا کہ اب تم اگلے ماہ دسمبر میں آنا۔ دسمبر میں پھر سیٹ ریزرو ہوئی جو بایں وجہ منسوخ کروانا پڑی۔ بالآخر انہوں نے کہا کہ یہ پروڈکشن اب لاہور میں شروع کریں گے۔

لاہور میں میکلورڈ روڈ پر موتی مینشن ہے جس میں کبھی راشننگ کا دفتر ہوتا تھا' یہاں اس پروڈکشن کا دفتر قائم ہوا اور ہم تینوں یکم جنوری 1947ء کی صبح راولپنڈی سے لاہور پہنچے اور نا سالی خیبر میل' جو ان دنوں فرنٹیئر میل کے نام سے چلتی تھی' میں بٹھایا جو رات کو تقریباً نو بجے وہاں سے چلی تھی۔ یہاں انہوں نے مجھے گانوں کے علاوہ پبلسٹی کا انچارج بھی بنایا تھا

اور اسی پروڈکشن کے سلسلے میں میری ملاقات اس خاتون چندر کانتا سے ہوئی تھی جس کا میری شاعری کا ٹرینڈ بدلنے میں بڑا ہاتھ تھا۔

جب خیالستان پروڈکشنز کی فلم یہاں شروع ہوئی تو اس کی کاسٹ بدل گئی اور اس میں خوبصورت ہیروئن وینا اور ان کے خوبصورت شوہر الناصر کو کاسٹ کیا گیا۔ دونوں کی شادی نئی نئی ہوئی تھی۔ ککو ڈانسر تھیں اور پلے بیک سنگر درانی تھے جو حال ہی میں فوت ہوئے ہیں۔ فلم کا نام ''ادھورے خواب'' رکھا گیا۔ اس زمانے میں فلم کے افتتاح کے موقع پر پوری انڈسٹری کو بلوایا جاتا تھا۔ جسٹس ایس اے رحمان کو افتتاح کے لئے بلایا گیا جو شاعر بھی تھے اور ادب نواز بھی اور محبوب اختر کے رشتہ دار بھی تھے۔

اس موقع پر میرے گیت کی ریکارڈنگ ہوئی۔ سُندر میوزک ڈائریکٹر تو مشہور تھے ہی لیکن اس تقریب میں شامل کچھ پروڈیوسروں نے پوچھ گچھ کی کہ یہ نغمہ کس نے لکھا ہے' جب انہیں میرے بارے میں بتایا گیا تو کچھ نے مجھ سے ہاتھ ملا کر کہا' سبحان اللہ! آپ کہاں ملتے ہیں؟ میں نے ایڈریس بتا دیا' میں ان دنوں میکلوڈ روڈ پر یونیورسل ہوٹل میں رہتا تھا جہاں فلم کے کچھ سفید پوش قسم کے لوگ رہتے تھے اور مجھ سے پہلے وہاں پران اور کلدیپ کور وغیرہ رہ چکے تھے۔ ایک ایک کمرہ اور غسلخانہ ہوتا تھا اور کرایہ نوے روپے ماہوار ہوتا تھا جو اس زمانے کے حساب سے خاصا تھا۔

اب پروڈیوسروں نے میری پوچھ گچھ شروع کی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں بہت آگے جاؤں گا۔ ایک دو جگہ سے پیسے ایڈوانس بھی مل گئے۔ اس دوران فلم کی شوٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ کچھ ادیبوں نے مجھ سے کہا کہ ہم نے فلم کی شوٹنگ دیکھنی ہے۔ میں نے کہا دیکھنی کیا ہے تمہیں اس میں شامل کرتے ہیں۔ دراصل اس روز سٹیج پر ککو کا ڈانس ہونا تھا۔ میں نے جن ادیبوں کو Audience میں شامل کیا۔ ان میں جگن ناتھ آزاد اور فکر تونسوی بھی شامل تھے۔ انہیں میک اپ کروا کے پہلی قطار میں فرنٹ پر بٹھا دیا گیا۔ انہوں نے سوچا تھا کہ تھوڑی دیر میں فارغ ہو جائیں گے لیکن وہاں تو ایک ایک سین ایک ایک گھنٹے میں ہوتا ہے اور یہ تو پھر ککو کا ڈانس تھا اس لئے ان دونوں بیچاروں کو کافی مشکل ہوئی۔

جگن ناتھ آزاد نے اپنے کسی مضمون میں اس واقعے کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس طرح اس فلم کا چرچا ادبی حلقوں میں بھی رہا لیکن فلم کے نام کی مناسبت سے سب خواب ادھورے ہی رہے۔

یہ فلم جنوری میں افتتاح ہوئی تھی اور مارچ تک صرف اس کی شوٹنگ ہی شروع ہو سکی تھی۔ اسی اثناء میں ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب اسمبلی کے سامنے پاکستان کی مخالفت میں اپنی کرپان ہوا میں لہرائی اور اسی دن سے مذہبی فضا خراب ہو گئی اور فسادات شروع ہو گئے۔

اس عرصہ میں چندر کانتا مجھ سے مل چکی تھیں اور وہ ٹمپل روڈ پر اکیلی رہتی تھیں۔ میں چونکہ ہوٹل کے کمرے میں رہتا تھا اس لئے ایک موقع پر انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ مجھے اپنے گھر لے جائیں کیونکہ بڑی جذباتی وابستگی ہو چکی تھی۔ وہ علاقہ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کا مشترکہ علاقہ تھا۔ ہندو مسلم کشیدگی کی وجہ سے لوگ جائیداد کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ اس وقت تک لاہور کے بارے میں کچھ واضح علم نہیں تھا۔ ہندوؤں کا خیال تھا کہ لاہور ہندوستان میں شامل ہوگا جبکہ مسلمانوں کا خیال تھا کہ لاہور پاکستان میں شامل ہوگا۔ اس وجہ سے امن و امان کا سلسلہ درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔

میں چندر کانتا کے مکان میں جون یا جولائی 1947ء میں منتقل ہوا تھا۔ اس زمانے میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے فلم سے ہٹ کر ادبی میدان میں مجھے شہرت دی۔ یہ ریڈیو کا ایک مشاعرہ تھا جو ریڈیو پر میرا پہلا مشاعرہ تھا اور جو مجھے حفیظ ہوشیار پوری صاحب کی مہربانی سے ملا۔ حفیظ صاحب ہمارے ساتھ نظام ہوٹل میں بیٹھا کرتے تھے اور میرے نئے لہجے کو پسند کرتے تھے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ کبھی ریڈیو کے مشاعرے پر بھی گئے ہو؟ میں نے کہا کہ مجھے کون بلاتا ہے۔ سو انہوں نے مجھے مشاعرے کا دعوت نامہ بھجوا دیا۔ مشاعرے کا دن آیا تو شہر میں کرفیو تھا۔ دن کے وقت تو کرفیو نہیں ہوتا تھا لیکن شام کو سات بجے کرفیو لگ جاتا تھا۔ رات کو مشاعرہ تھا اور دن کے وقت جگن ناتھ آزاد چندر کانتا کے اس مکان میں مجھ سے ملنے کے لئے آئے اور پوچھا کہ رات کے مشاعرے کے لئے کیا لکھا ہے۔ میں نے جو غزل کہی تھی انہیں دکھا دی جس کا مطلع تھا:

تمہاری انجمن سے اٹھ کے دیوانے کہاں جاتے
جو وابستہ ہوئے تم سے وہ افسانے کہاں جاتے

یہ نجانے کس موڈ میں تھے کہنے لگے کہ غزل کمزور ہے' یہ نہ پڑھو' کوئی اور پڑھو' تمہارا ریڈیو پر پہلا چانس ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم نمایاں ہو جاؤ۔ وہ تو کھانا کھا کر چلے گئے لیکن میں اکھڑ گیا۔ میں نے ایک اور غزل کہی جو اچھی نظر آ رہی تھی مگر جب پہلی غزل پڑھتا تو وہ زیادہ وزنی نظر آتی تھی۔ میں نے دونوں غزلیں ہی ساتھ رکھ لیں۔ کرفیو پاس آ چکے تھے اور گاڑی شاعروں کو اکٹھا کر رہی تھی۔ جب یہ گاڑی میرے گھر آئی تو چار پانچ شاعر پہلے سے اس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ دونوں میں سے کونسی غزل اچھی ہے لیکن وہ کوئی حتمی رائے نہ دے سکے۔ ریڈیو سٹیشن پہنچنے تک میں نے سوچا کہ جو پہلے کہی تھی وہی ٹھیک ہے اب جو نصیبوں میں ہوگا۔

اس رات شہر میں کرفیو لگا ہوا تھا۔ لوگ سینماؤں میں جا نہیں سکتے تھے اور گھروں میں رہ کر ریڈیو سننے پر مجبور تھے اور یہ میرے لئے خوش قسمتی کی بات تھی۔ اس روز میری یہ غزل اتنی جمی کہ حاصل مشاعرہ بن گئی۔ میں اس زمانے میں ترنم سے پڑھتا تھا لیکن ظاہر ہے صرف ترنم کی وجہ ہی نہیں تھی بلکہ غزل ہی ایسی تھی۔

یہ غزل لوگوں پر ایسی سوار ہوئی کہ اس زمین میں بہت سی غزلیں لکھی گئیں اور فلموں میں بھی اس کے بہت چربے آئے۔ اس مشاعرے سے اگلے روز میں جدھر سے بھی گزرا تو جو واقف بھی ملا اس نے کہا یار کمال کی غزل تھی' واہ واہ' اس غزل نے مجھے لاہور میں Establish کر دیا اور لوگوں میں میری پہچان شروع ہو گئی۔ رسالوں تک میں پہلے ہی پہنچ چکا تھا اور اب ریڈیو تک بھی پہنچ گیا۔

چندر کانتا

جب یہ معلوم ہو گیا کہ لاہور پاکستان کے حصے میں آیا ہے تو قدرتی طور پر مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور غیر مسلموں کو خوف و ہراس نے گھیر لیا۔ فرقہ واردیت اور تعصب کا زہر تو تھا ہی، جہاں جس کا بس چلتا تھا اپنے مخالف کو نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کرتا تھا جس سے افراتفری مچ گئی۔ آبادی کا انخلاء شروع ہو چکا تھا اور اس خوشی کے زمانے میں بھی جو لاشیں ادھر سے آ رہی تھیں اور جس بیدردی سے غیر مسلموں کو یہاں مارا جا رہا تھا اسے دیکھ کر انسان کانپ جاتا تھا۔ اب ترازو رکھ کر تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کدھر زیادہ ظلم ہوا اور کس نے زیادہ ظلم کیا لیکن انسان اس وقت درندہ بنا ہوا تھا اور آزادی کی جو نعمت اس وقت ملی تھی اس کا احساس اس چیخ و پکار میں دب کر رہ گیا تھا۔ ایک حساس آدمی کے لئے اس وقت جینا بہت دشوار تھا۔ اس سارے عرصے کے دوران ہم صرف لکھنے پڑھنے کی حد تک تھے۔ ہم لوگ جو اس سارے قصے میں شامل نہیں تھے زیادہ اذیت میں مبتلا تھے کیونکہ ہمارے کوئی سیاسی یا غیر سیاسی مقاصد بھی نہیں تھے۔ میں جس مکان میں چندر کانتا کے ساتھ رہتا تھا اس میں کچھ اور لوگ بھی رہتے تھے کیونکہ یہ ہندو پراپرٹی تھی اور چندر کانتا نے اس کا ایک حصہ کرائے پر لیا ہوا تھا۔ اب کچھ مسلمان یہ مکان خالی کروا کے اس پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس بات کی پروا کیے بغیر کہ یہاں ایک مسلمان بھی رہتا ہے، مکان خالی کرنے کے لئے چیلنج کر دیا تھا۔ ایک دن اچانک دوپہر کو بلوا ہوا اور آگ لگ گئی۔ باہر کرفیو لگا ہوا تھا اور ہم بڑی مشکل سے جان بچا کر سامنے ایک عیسائی فیملی کے گھر میں پناہ

لینے میں کامیاب ہوئے۔ بعد میں ہم ٹمپل روڈ پر کامیڈین نذر کے گھر منتقل ہو گئے جن سے کچھ راہ ورسم تھے۔

کچھ دنوں بعد جو لوگ بھارت سے آئے ان میں ساحر لدھیانوی' ابراہیم جلیس اور ابن انشا بھی شامل تھے۔ ان سب کے آنے کی خوشی ہوئی اور اس سے پہلے ملاقات نہ ہونے کے باوجود ایسے تھا جیسے برسوں سے ملے ہوئے ہیں۔ ساحر کا معاملہ یہ تھا کہ وہ بمبئی میں کمیونسٹ پارٹی اور ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں سرگرم عمل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کوشش میں تھے کہ فلم انڈسٹری میں Establish ہو جائیں لیکن ہو نہیں پا رہے تھے۔ یہ فلم میں مدھوک کے چھا جانے کا زمانہ تھا اور اس کے بعد ''انمول گھڑی'' کے گانوں سے تنویر نقوی اوپر آ چکے تھے۔ جب ساحر کے کچھ امکانات بنے تو تقسیم ہو گئی۔ ان کی ماں اور نانی لدھیانہ میں اپنے آبائی گھر میں تھیں انہیں اپنے لئے نہیں بلکہ ان کی جان بچانے کے لئے وہاں سے بھاگنا پڑا۔ جب یہ لدھیانہ پہنچے تو پتا چلا کہ وہ اس مہاجر کیمپ میں ہیں جو پاکستان جائے گا۔ انہوں نے کسی طرح ماں اور نانی کو ساتھ لیا اور لاہور چلے آئے۔ یہاں آ کر یہ پہلے کمیونسٹ پارٹی کے آفس مین ایک اوپر کے کمرے میں ٹھہرے اور ماں کے پاس جو زیورات اور نقدی تھے انہیں بیچ بیچ کر گزر بسر شروع کیا۔

سبھی جانتے ہیں کہ ساحر لدھیانوی لدھیانہ سے ایک ملحقہ گاؤں کے بڑے زمیندار کے بیٹے تھے جن کی ایک رہائش لدھیانہ میں بھی تھی اور جو شادیاں کرنے کے شائق تھے۔ ساحر کی والدہ ان کی غالباً بارہویں یا تیرھویں بیوی تھیں۔ وہ شادیاں کرتے تھے اور طلاق دے دیتے تھے۔ ان پڑھ مگر عیاش آدمی تھے۔ ان کی ماں سے شادی کی اور جب ساحر اڑھائی سال کے تھے تو اسے بھی طلاق دے دی اور بے آسرا کر دیا لیکن ان کی ماں بڑے حوصلے والی عورت تھیں۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ مقدمے بازی کرتی رہیں۔ چونکہ دوسری بیویوں سے بھی ساحر کے والد کا ان کے علاوہ اور کوئی بیٹا نہیں تھا اس لئے وہ وقتاً فوقتاً کیس جیتتی تھیں' پیسہ حاصل کرتی تھیں اور ساحر کی پرورش کرتی تھیں۔

ساحر کی شاعری میں عورت کی وجہ سے بالخصوص اس عورت کی وجہ سے جسے طوائف کا

نام دیا جاتا ہے جتنی تلخی بھی ہے وہ اپنے ماں کے باعث ہے کیونکہ ان کی ماں شروع میں اس طبقے سے تھیں۔ یہ تلخی ہمیشہ ان کی شاعری میں رہی۔ پاکستان آنے کے بعد انہوں نے دیکھا کہ ان کے والد بھی بھارت سے آ کر یہاں لائل پور میں آباد ہو گئے ہیں اور چونکہ با اثر اور صاحب ثروت آدمی تھے اس لئے یہاں بھی انہیں خوب زمینیں الاٹ ہو گئی تھیں۔ ایک دن ساحر نے مجھے اپنے باپ کا خط دکھایا' اس وقت وہ خود ہنس رہا تھا۔ خط میں لکھا تھا: پیارے بیٹے عبدالحئ! شاعری ایک اچھا شغل ہے لیکن اگر تم میرے پاس آ گئے ہوتے تو میں تمہیں کم از کم نائب تحصیلدار بھرتی کروا دیتا۔ عبدالحئ ساحر کا اصل نام تھا اور نون ان کی ذات تھی۔ ساحر یہ خط پڑھ کر خود بھی ہنسے اور کہا کہ میرے والد کی نظر میں جو میں ہوں یا جو ایک شاعر ہے یہ مذاق ہے اور ان کی نظر میں اگر میں نائب تحصیلدار بن گیا ہوتا تو بڑی بات ہوتی۔ میں نے پوچھا' تم نے کیا جواب دیا ہے تو کہنے گے کہ میں جواب دیتا ہی نہیں' میں تو اس سے بات کرنے کا روادار بھی نہیں' جس نے مجھ سے اور میری ماں سے یہ سلوک کیا میں اس کی نائب تحصیلداری کو کیا کروں۔

ساحر کا نام عبدالحئ رکھنے کی ایک وجہ لوگوں کو معلوم نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یونینسٹ دور حکومت میں سر سکندر حیات کی وزارت میں عبدالحئ نام کے ایک وزیر ہوا کرتے تھے جن کے ساتھ ساحر کے والد کی نہیں بنتی تھی۔ اس وزیر کی وجہ سے انہوں نے اپنے بیٹے کا نام عبدالحئ رکھا۔ وہ ساحر کو اپنے ساتھ رکھتے تھے اور جب وہ عبدالحئ پاس سے گزرتا تو کہتے اوہ حرامزادے عبدالحئ ادھر آ۔

ساحر پاکستان آنے کے بعد کوئی ڈیڑھ سال کا عرصہ یہاں پر رہے۔ انہوں نے میکلوڈ روڈ پر کبابوں والوں کی دوکانوں کے پاس ایک مکان بھی الاٹ کروا لیا تھا لیکن ان کا روزگار کا مسئلہ حل نہیں ہو پایا "سویرا" ایک پروگریسو پرچہ تھا لیکن وہ دو تین مہینے کے بعد نکلتا تھا۔ اس لئے وہاں سے جو پیسے ملتے تھے وہ برائے نام تھے۔ انہی دنوں "امروز" تازہ تازہ نکلا لیکن چراغ حسن حسرت کسی وجہ سے ان کے ساتھ ناراض تھے اس لئے وہاں بھی نوکری نہیں مل پائی۔ ایک مرحلہ ایسا آیا کہ انہیں مالی تکلیف ہونا شروع ہوئی کیونکہ والدہ

کے پاس جو نقدی اور زیورات تھے وہ خرچ ہو چکے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے چلو بمبئی چلتے ہیں، میں نے کہا ٹھیک ہے آپ پہلے جا کر رہائش کا انتظام کریں میں بعد میں آ جاؤں گا اور مل کر وہاں کام کریں گے۔

جب یہ یہاں سے بمبئی کے لئے روانہ ہوئے تو راستے میں دہلی میں رکے جہاں ان کی ملاقات اپنے ایک ماموں سے ہوگئی جو شروع میں آلہ آباد میں رہتے تھے۔ دہلی سے ایک پرچہ ''شاہراہ'' نکلنا شروع ہوا تھا۔ انہیں اس کے ایڈیٹر شپ کی آفر ہوئی۔ ماموں نے مشورہ دیا کہ بمبئی بعد میں چلے جانا پہلے یہ کام کر لو۔ ممکن ہے یہ بہتر رہے، یہاں ریڈیو بھی ہے اور مشاعرے بھی ہوں گے۔ چنانچہ یہ دہلی میں رک گئے اور تقریباً ایک سال وہیں رہے۔

اس دوران یہاں بھی فلم انڈسٹری کچھ ابھری اور مجھے بھی چار پیسے آنے لگے۔ اس لئے میں نے سوچا کہ گھر کی آدھی باہر کی پوری سے بہتر ہے۔ اگر وہ سیدھے بمبئی چلے گئے ہوتے تو ایک دو ماہ کے بعد میں بھی وہاں چلا جاتا مگر اب حالات بدل چکے تھے اس لئے میں یہیں رہ گیا۔

یہاں دوسرے آنے والوں میں ابراہیم جلیس تھے جو پروگریسو تھے۔ وہ ریاست حیدرآباد سے اس وقت آئے جب نظام کے خلاف تحریک چل رہی تھی۔ دراصل انڈیا ریاست حیدرآباد کو اس حال میں نہیں چھوڑنا چاہتا تھا کہ وہ کسی وقت بھی پاکستان کے ساتھ الحاق کرے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ وہ پاکستان کے ساتھ الحاق کر کے بھی کیا کر لیتے کیونکہ بیچ میں کافی فاصلہ تھا اور بڑی غیر قدرتی سی بات تھی، پھر انڈیا کی پالیسی بھی یہی تھی کہ جتنی بھی ریاستیں ہیں خواہ ہندو ہوں یا مسلم وہ انہیں ہضم کر جائے۔

حیدرآباد میں ایک رضا کار تحریک چلی ہوئی تھی جس نے ہندوؤں کے خلاف اودھم مچا رکھا تھا اس تحریک کے سربراہ نے ایک فرقہ وارانہ جماعت قائم کر رکھی تھی جس کا مقصد ہندوؤں سے مسلمانوں کو لڑانا تھا یہ صاحب ان لوگوں میں سے تھے جن کے ذہن میں تو خدمت اسلام ہوتی ہے لیکن دراصل وہ خدمت اسلام نہیں ہوتی۔ اس وقت کے بہت سے نوجوان بھی متعصب ہو کر اس تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔

ابراہیم جلیس حیدر آباد ریڈیو سے منسلک تھے اور جب انڈیا نے پولیس ایکشن کے نام پر ریاست پر حملہ کر کے مسلمانوں کا قتل عام اور رضا کار تحریک کی زیادتیوں کا بدلہ لینا شروع کیا تو وہاں سے جو لوگ بچ کر نکل آئے ان میں سے ایک یہ بھی تھے، انہوں نے جب اپنی آنکھوں سے وہاں پر تصویر کے دونوں رخ دیکھے تو یہاں آ کر انہوں نے ''دو ملک ایک کہانی'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ وہ یہاں آ کر مختلف اداروں سے منسلک ہوئے۔ اس زمانے میں کچھ باہر سے آئے ہوئے لوگوں کے لئے اور کچھ غیر شادی شدہ دوستوں کے لئے ہر اتوار کو میرے ہاں محفل ہوا کرتی تھی۔ میری بیوی ہمیشہ سے کھانا بہت اچھا پکاتی ہے اور اس میں ماہر ہے چنانچہ ہر اتوار کو ان سب کی میرے گھر پر دعوت ہوتی تھی جن کی تعداد تقریباً اٹھ دس ہوتی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو ہوٹلوں سے کھانا کھانے والے تھے اور اہتمام یہ تھا کہ یہ سب ہفتے میں کم از کم ایک دن گھر کا پکا ہوا لذیذ کھانا کھا سکیں۔

ان سب میں ابن انشا ایک ایسے آدمی تھے جو بڑی دھیمی رفتار سے چلے۔ ایک کلرک سے اٹھے اور بالآخر ایک بڑی اچھی جاب پر گئے۔ ان کا شاعری کا انداز بھی منفرد تھا۔ دوستوں کے دوست تھے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ سرکاری ملازمت میں ہوتے ہوئے بھی یہ کسی نہ کسی طرح آ کر انجمن ترقی پسند مصنفین میں شامل ہو جاتے تھے۔

میں بنیادی طور پر مسلم لیگی ہوں اور مسلم لیگ کے لئے قیام پاکستان تک کام کرتا رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کمیونسٹ پارٹی نے بھی بڑے انصاف سے کام لیتے ہوئے اس مطالبہ کو تسلیم کیا تھا اور مسلم لیگ کو تعاون دیا تھا۔ میں کمیونسٹ پارٹی کا ممبر تو نہیں تھا بلکہ سیدھا سادا لیگی تھا لیکن جب تقسیم ہوئی اور میں نے اس کے بعد مسلم لیگیوں کی اکثریت کو لوٹ مار میں مگن دیکھا تو میرا جی مسلم لیگ سے اچاٹ ہو گیا۔ اس دور میں ناجائز الاٹمنٹیں ہو رہی تھیں اور اصل مہاجرین کے علاوہ ''مقامی مہاجرین'' کی اصطلاح بھی سننے میں آئی۔ مؤخر الذکر وہ لوگ تھے جو مسلم لیگ میں شامل تھے یا ان کے ساتھ تھے۔ ان با اثر افراد نے خوب لوٹ مار کی۔ ہندوؤں کا جو مکان خالی ہوتا تھا' تالہ توڑ کر اس کا سارا سامان لے جاتے تھے۔ چنانچہ میں ذہنی طور پر مسلم لیگ سے دور ہو گیا اور میں نے کہا کہ اب یہ وہ مسلم

لیگ نہیں ہے جس کے لئے ہم نے کام کیا تھا۔

میں جس وقت مسلم لیگ بھی کام کر رہا تھا تو ذہن پر پرانی قسم کے اثرات نہیں تھے۔ مثلاً میں اس زمانے میں بھی پیر پرستی' مزار پرستی اور جاگیرداری کے خلاف تھا۔ مسلم لیگ اس وقت تک متعصب جماعت نہیں تھی اور اپنے جائز مطالبات کے باوجود کسی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتی تھی بلکہ ایک مسلم معاشرے کے قیام کے لئے جدوجہد کر رہی تھی۔ یہاں میں مسلم معاشرے کا مفہوم واضح کر دوں' قائداعظم کے تمام بیانات دیکھ لیں وہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسی ریاست قائم کرنا چاہتے تھے جس میں ان کے اقتصادی حالات کسی کے تسلط میں نہ ہوں۔ اگر صرف اسلامی یا مذہبی آزادی کی بات ہوتی تو وہ تو انگریز کے زمانے میں بھی تھی۔

جو خیالات میرے اس وقت تک تھے جسے آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہابیت کے قریب تھے وہ آگے تک چلتے آئے۔ پھر مسلم لیگیوں نے جو زیادتیاں کیں انہوں نے مجھے برگشتہ کر دیا۔ اچانک پتا چلا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی ہے جس میں بقول لوگوں کے اکثریت کمیونسٹوں کی ہے حالانکہ ایسا نہیں تھا اس میں کمیونسٹ بھی تھے مگر مجھ جیسے لوگ بھی شامل تھے جو کمیونزم کا صحیح مفہوم بھی نہیں جانتے تھے اور جنہیں ابتداء سے ہی رجعت پسندی کی چیزیں قبول نہیں تھیں۔ چنانچہ ایسے لوگ جن کے نزدیک اس ادبی جماعت کے مقاصد اچھے تھے اور جو مسلم لیگ کے رویے سے بھی دل برداشتہ تھے وہ اس میں شامل ہو گئے۔ دوسرے جو لوگ اس انجمن سے وابستہ ہوئے ان میں ابراہیم جلیس' ابن انشا اور احمد ندیم قاسمی بھی شامل تھے۔

احمد ندیم قاسمی بھی مسلم لیگی تھی اور ہمارے حالات بالکل ایک جیسے ہیں۔ یہ بھی تقسیم کے بعد لیگ سے دلبرداشتہ ہو کر پروگریسو رائٹرز میں آئے اور آخر کار اس کے سیکرٹری جنرل بھی بنے۔ اس زمانے میں شاعری کا جو ایک دھارا چلا اس نے ادب کو بہت سے نئے خیالات دیئے اور ادب برائے ادب کا جو نعرہ لگتا تھا اس سے بھی گلو خلاصی ہوئی حالانکہ اگر غور سے دیکھیں تو ادب برائے ادب میں بھی زندگی کا ایک پہلو موجود ہے۔ اب لوگ ادب برائے زندگی کی طرف آئے لیکن ایک زیادتی ہوئی کہ کچھ لوگ فوراً ادب برائے سیاست پر

پہنچ گئے۔ میں ادب برائے سیاست اسے کہتا ہوں جس میں سیدھے نعرے تھے۔ یوں نظر آتا تھا کہ ایک پارٹی نے ایک لائن دی ہے۔ انہوں نے پارٹی لائن نثر میں دی تھی۔ انہوں نے مصرعے سیدھے کر کے اسے منظوم کر دیا۔

میں ان چند ایک شاعروں میں سے تھا جنہوں نے پروگریسو رائٹرز میں رہ کر کبھی پروگریسو باتوں سے انحراف نہیں کیا لیکن شاعری وہ کی جس میں فن آگے آگے رہتا تھا اور مقصد غیر محسوس طور پر کسی پچھلی جگہ پر ہوتا تھا۔ پروگریسو رائٹرز کی طرف سے یہ غزل کی مخالفت کا زمانہ تھا اور وہ کہتے تھے کہ غزل ترقی پسند چیز نہیں ہے۔ اس زمانے میں بھی انڈیا میں مجروح سلطان پوری نے اور پاکستان میں پہلے فیض صاحب نے اور پھر میں نے بڑے پروگریسو ہونے کے باوجود نظم بھی کہی لیکن غزل کا پرچم بھی بلند کیے رکھا یہی وجہ ہے کہ فیض صاحب نے انتقال سے پہلے میری ایک کتاب کے فلیپ کے لئے لکھا کہ قتیل شفائی ہم میں سے ہے لیکن اس نے کبھی کوئی ہدایت لے کر شاعری نہیں کی۔ جو ہماری منزل ہے یہ بھی اسی منزل کا راہی ہے لیکن راستہ اس کا اپنا ہے اور اس نے اپنا راستہ اختیار کر کے جو مقبولیت حاصل کی ہے وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ قبولیت عامہ ایک سستی چیز ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اچھے برے کی تمیز مستقبل کرے گا لیکن ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ آج جو آدمی زندہ ہے اسے قبول کرنے والے کتنے ہیں اور قتیل شفائی اس معاملے میں بہت خوش قسمت ہے۔ فیض صاحب کی طرف سے یہ سند مل جانا میرے لئے ایک قابل فخر بات ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ میری نظموں میں مزدور اور کسان کا نام کبھی شاذ ہی آیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں خود کبھی مزدور نہیں رہا۔ زمیندار بھی نہیں تھا کہ اپنی زمینوں پر ہی کسانوں پر ظلم ہوتا دیکھ لوں۔ میں تو ایک رئیس باپ کا بیٹا تھا اور میرا تعلق جس طبقے سے تھا اور جو کردار میری زندگی میں آئے وہ کچھ اور تھے۔ میرا تو سٹوڈیو کا ماحول تھا جس میں بظاہر بڑی چمک دمک تھی پھر جن دو عورتوں سے جذباتی طور پر میرا واسطہ رہا ان کا پس منظر ہی کچھ اور تھا۔ اب ایک گائیکہ خواہ کتنی بڑی ہو جائے اور اسے اس کے گانے کی کتنی داد مل جائے لیکن جب یہ ذکر آتا ہے کہ وہ کوٹھے پر بیٹھنے والی ہے اور یہ اس کے کانوں تک پہنچتی ہے تو

اس کے تحت الشعور میں جو زلزلہ آتا ہے میں اس کا تصور کر سکتا ہوں۔ اسی طرح ایک عورت جو بہت بڑی لاجپت رائے فیملی سے تعلق رکھتی ہے اور جو غلط جگہ شادی ہو جانے کی وجہ سے گھر سے نکلی اور فلم کا سہارا لینے کے لئے آئی اور جب اسے تھوڑا سا سہارا ملا تو فلم کا سارا نظام ہی درہم برہم ہو گیا تو میں اس کے تصورات کا اندازہ کر سکتا ہوں۔

میرا ایک موضوع بانجھ عورت بھی تھا جس کا کوئی مستقبل نہیں۔ اسی طرح میرا ایک موضوع ایکسٹرا عورت بھی ہے جو تمام عمر سٹوڈیو میں گھومتی ہے اور جس کی نسبت ایک مزدور بھی زیادہ پیسے لیتا ہے جبکہ اس ایکسٹرا کے پیچھے گھر میں دو تین بچے بھی پڑے ہوتے ہیں جنہیں چھوڑ کر وہ کام پر آتی ہے۔ اس کے علاوہ میرا موضوع وہ عورتیں بھی ہیں جنہیں جھانسا دے کر اس لائن میں لایا جاتا ہے اور جو کماتی تو لاکھوں ہیں لیکن ان کے پاس ٹکا بھی نہیں ہوتا اور کھانے والے سب کچھ کھا جاتے ہیں۔

میری زندگی میں یہ سب کردار آئے ہیں اور میں نے یہاں وہی فرض ادا کیا ہے جو کوئی اور مزدور اور کسان کے لئے کر سکتا ہے۔ لیکن جب مجھے مزدور اور کسان کا ذاتی تجربہ ہے ہی نہیں تو اگر میں اس بارے میں کچھ لکھتا تو اس میں بناوٹ اور تصنع ہوتا' حقیقت نہ ہوتی۔ ان کرداروں کو تو میں نے دیکھا' محسوس کیا' اپنے خون میں شامل کیا' اپنے احساس و جذبات میں گوندھا اور گوندھنے کے بعد جو مٹی بنی اس سے میں نے کچھ پیکر تراشے' پھر کہیں جا کر وہ پیکر مؤثر نظر آئے۔

فیض صاحب تو کمیونسٹ تھے مگر احمد ندیم قاسمی صاحب لبرل اور پروگریسو ہیں۔ پھر بھی کچھ انتہا پسند لوگ کہتے ہیں کہ ان کی شاعری تو ایسی ہے کہ کوئی بھی لکھ سکتا ہے۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہے ہم پہلے تو یہ دیکھتے ہیں کہ اس کا مصنف کون ہے' اس کے خیالات کیا ہیں اور اس نے الفاظ کو نئے معانی کیا دیئے ہیں۔ یہ تعین کرنے کے بعد جب ہم آگے بڑھتے ہیں تو صاف پتا چل جاتا ہے کہ یہ محض روایتی چیزیں نہیں ہیں اور ادب برائے ادب کی ذیل میں نہیں آتیں۔ یہ ادب برائے زندگی میں آتی ہیں اور پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں سمیٹے ہوئے ہیں۔

مصری شاہ والا گھر

بڑے اونچے اونچے خواب لے کر میں لاہور پہنچ تو گیا تھا لیکن قیام پاکستان کے بعد فلم ''ادھورے خواب'' سے لے کر گھریلو خوابوں تک میرے جتنے بھی خواب تھے ملیا میٹ ہو گئے۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ جو لاہور میں پہنچ گیا وہ مالی لحاظ سے نسبتاً بہتر ہو گیا۔ یہ بات کچھ ٹھیک بھی ہے لیکن قیام پاکستان کے بعد جو اکھاڑ پچھاڑ ہوئی اس میں یہ بات غلط ثابت ہوئی۔ اس دوران جو نوکر پیشہ لوگ تھے وہ تو تنخواہیں لیتے رہے' جن کے کاروبار تھے ان کے بھی اور مزے ہو گئے کیونکہ انہوں نے مہنگائی بھی پیدا کی اور بلیک بھی کی' لیکن جو میری طرح کے فری لانسر لوگ تھے ان کے لئے وقت گزارنا بہت مشکل ہو گیا۔

تسلی یوں ہوتی تھی کہ پروگریسو ذہن تھا اور مستقبل پر یقین تھا۔ حالانکہ مستقبل ہمیشہ مستقبل ہی رہتا ہے۔ مستقبل میں بھی جب پہنچتے ہیں وہاں بھی خیال آتا ہے کہ مستقبل آنے والا ہے۔ لیکن اس سے انسانی ذہن کو ایک سہارا یہ ملتا ہے کہ وہ مایوس نہیں ہوتا اور اس میں غم برداشت کرنے کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ اس وقت میرے سر پر دو بوجھ تھے ایک تو بیوی بچوں کا بوجھ تھا جو ہری پور میں بیٹھے تھے اور دوسرے راہ چلتے چندر کانتا کا بار امانت سر لے لیا تھا۔

اخراجات اس طرح تھے اور آمدن بہت کم' مجبور ہو کر میں نے ''ادب لطیف'' میں تھوڑا سا کام لیا' پھر ایک فلمی پرچہ ''اداکار'' تھا کچھ اس میں کام لیا لیکن اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے۔ اس سے بہت پہلے جب امارت کھو جانے کے بعد دھچکا لگا تھا اس وقت

سے ایک بات پلے باندھ رکھی تھی کہ محنت مشقت کروں گا لیکن ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا چنانچہ یہی عہد یہاں بھی کام آیا۔

اس زمانے میں جب میں ادب لطیف کی ادارت بھی کر رہا تھا' نام بھی تھا اور مشاعروں میں بھی جاتا تھا۔ خرچ پورے نہ ہونے کی وجہ سے میں نے سائیڈ میں کچھ ایسے کام بھی کیے جن کا لوگوں کو اب تک پتا نہیں۔ اس وقت ایک عزیز دوست اقبال میر تھے جنہوں نے بعد میں کراچی میں سٹیٹ ایڈورٹائزنگ کے نام سے ادارہ بھی قائم کیا اور لاکھوں روپے کا لمبا چوڑا بزنس کیا۔ وہ میرے ساتھ "اداکار" میں اسسٹنٹ تھے یہی مجھے میکلوڈ روڈ سے اٹھا کر مصری شاہ اپنے پڑوس میں لے گئے تھے۔ یہ اس زمانے میں فیروز سنز کی کتابیں پروف ریڈنگ کے لئے لایا کرتے تھے۔ ایک دن مجھے کہنے لگے کہ آپ اگر محسوس نہ کریں تو آپ کے لیے بھی یہ لے آیا کروں' آپ کی بھی کچھ آمدن ہو جایا کرے گی۔ لکھ پتی باپ کی اولاد ہونے کے باوجود میں محنت کو عار نہیں سمجھتا تھا اس لئے میں نے کہا ٹھیک ہے۔ اب وہ ایک کی بجائے دو کتابیں لانے لگے۔ معاوضہ صرف دو پیسے فی صفحہ تھا یعنی ایک کتاب بڑھنے کے دو اڑھائی روپے بنتے تھے۔ بہر حال ساٹھ ستر روپے ماہوار کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ پھر یہاں سے ایک شام کا پرچہ نکلا تو انہوں نے کہا کہ اس کے لئے ایک قطعہ لکھ دیا کریں۔ اس کا معاوضہ ان سے اڑھائی روپے فی قطعہ طے ہوا۔ یہ بھی کوئی ساٹھ ستر روپے بن جاتے تھے۔ اس قسم کی آمدن کر کے گزارا کیا لیکن بعض ایسے اوقات بھی آئے جب پاس کچھ نہیں تھا۔ اس لئے فاقہ کیا اور خالی پیٹ سویا مگر ہنستا مسکراتا رہا۔

جب میں مصری شاہ چلا گیا تو اس وقت بیوی بچے آ چکے تھے اور آمدنی بھی واجبی سی ہو چکی تھی۔ ہم لوگ روزانہ میکلوڈ روڈ پر ایک ریسٹورنٹ پیراڈائز کیفے میں بیٹھتے تھے۔ تمام ادیب دوست جن میں پروگریسو رائٹرز بھی شامل تھے۔ یہیں آ جاتے تھے۔ چائے کا ایک سیٹ آٹھ آنے میں ملتا تھا اور آٹھ آنے میں ہی سگریٹ کا ایک پیکٹ ملتا تھا۔ سب کی نظر ہوتی تھی کہ کون خرچ کرتا ہے' میں کچھ وضعدار سا آدمی ہوں' خرچ کر دیتا تھا لیکن جب تکلیف میں ہوتا تھا تو میں نہیں آتا تھا حالانکہ کوئی دوسرا بھی پیسے خرچ کر سکتا تھا۔ بعد میں

جب یہ مجھ سے پوچھتے کہ بھئی کہاں تھے تو کہہ دیتا کہ لکھنے پڑھنے میں مصروف تھا۔

یہی حال گھر کا بھی تھا۔ گھر کو مسافر خانہ تو نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہاں مسافر نہیں بلکہ میرے دوست ٹھہرا کرتے تھے۔ اس گھر میں کئی دوست مہینوں رہے۔ انہوں نے اپنے کورسز مکمل کئے' امتحان دیئے اور بھائیوں کی طرح رہے۔ اس مکان میں چار کمرے تھے۔ ڈیوڑھی کے اوپر والا کمرہ دوستوں کے لئے ریزرو تھا' جس میں ایک چارپائی 'ایک کرسی اور ایک ڈریسنگ ٹیبل موجود ہوتی تھیں۔

جن لوگوں نے وہاں قیام کیا اور جس کا مجھے فخر ہے ان میں پروفیسر جمیل ملک جو آجکل وائس پرنسپل ہیں بھی شامل ہیں۔ انہوں نے یہیں رہ کر امتحان دیا۔ میرے دوست اور نامور شاعر احمد ظفر کا بھی وہاں قیام رہا لیکن وہ تو جہاں جہاں میں رہا میرے ساتھ رہے۔ ان کے علاوہ حبیب جالب اور منیر نیازی بھی بہت عرصہ یہاں میرے ساتھ رہے۔ یہ اصحاب وہ تھے جو کافی دیر رہے' دو' دو' چار چار دن قیام کرنے والے تو خیر لاتعداد تھے۔ یہ وہ روایت تھی جس میں مجھے راحت ہوتی تھی۔

اب تو میرے پاس گاڑی ہے لیکن اس زمانے میں میرے پاس سائیکل ہوتی تھی۔ میں اپنے گھر میں قیام کرنے والے ایک مستقل مہمان کو اور ایک عارضی طور پر آئے ہوئے مہمان کو ساتھ لیتا اور اپنی سائیکل پر سوار کر کے اور خود اسے چلاتے ہوئے پیراڈائز ہوٹل شام کے وقت لے جاتا۔ وہاں وقت گزار کر پھر انہیں اسی طرح ایک کو سائیکل کے آگے بٹھا کر اور ایک پیچھے بٹھا کر واپس لے آتا اور اس میں راحت محسوس کرتا تھا۔

چندر کانتا سے علیحدگی

میری بے اعتدالی کی وجہ سے میری بیوی اور میرے درمیان شروع سے ہی ایک رنجش کی فضا پیدا رہی ہے جس کی وجہ سے خوب لڑائی جھگڑا بھی ہوتا رہا۔ لیکن میری بیوی کو اللہ تعالیٰ نے ایک خوبی عطا کر رکھی تھی کہ اس گھر میں جو بھی مہمان آیا اس نے اس کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا اور خدمت کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ جب کبھی دوسرے ممالک سے مشاعرے کی کوئی ٹیم آ جاتی جو چودہ پندرہ افراد پر مشتمل ہوتی اور اس کے ساتھ تیس آدمی یہاں سے بھی مدعو ہوتے تو وہ تن تنہا یا بچوں کو ساتھ ملا کر سب کے کھانے کا انتظام کرتی۔ اسی طرح اگر کوئی میرے گھر میں دو ماہ کے لئے رہ رہا ہے تو اس نے کبھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ میاں بیوی میں اختلافات بھی ہیں۔ یہ سلسلہ ابھی تک دائم ہے اور اب جو بچے جوان ہیں' ان کی بھی یہی حالت ہے کہ جس دن گھر پر کوئی مہمان نہ آئے تو وہ گھر کو ویران محسوس کرتے ہیں اور کھلا پلا کر اور مہمان نوازی کر کے انہیں روحانی لذت محسوس ہوتی ہے۔

میں نے اور چندر کانتا نے جب نذر کامیڈین کے ہاں پناہ لی تو اس کے بعد اس لئے راولپنڈی چلے گئے کہ وہاں بازار تکواڑاں' جسے اب اُردو بازار کہتے ہیں' میں ایک سکھ دوست رہتے تھے۔ وہ انڈیا شفٹ ہو رہے تھے اور انہوں نے مجھے پیغام بھیجا تھا کہ میں تو جا رہا ہوں اس لئے آپ آ کر میری سٹیشنری کی دکان لے لیں۔ اس کی قیمت تمام سامان سمیت ساڑھے آٹھ سو روپے مقرر ہوئی۔ میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ وہاں میرے ایک جاننے والے صوفی صاحب تھے جن سے میرا تعارف میرے دوست احمد راہی نے کروایا تھا۔ بطے

پایا کہ یہ پیسے دے دیں تو میں بعد میں اپنے حصے کے پیسے ادا کردوں گا۔ دوکان لے لی گئی۔ میں اس پر کام کرتا تھا اور کبھی وہ بھی آ بیٹھتے تھے اور مجھ سے حساب لیتے تھے۔ وہ مجھ پر قرض چڑھا رہے تھے۔ میں شرمیلا آدمی تھا کسی سے ذکر نہیں کیا۔ وہاں عزیز رشتے دار بھی رہتے تھے لیکن میں نے کسی سے یہ نہیں کہا کہ مجھے پچاس روپے قرض دے دو۔ تین چار ماہ وہاں رہنے کے بعد انہوں نے کہا کہ اپنے حصے کے چار سو روپے لائیے اور وہ پیسے بھی ادا کیجئے جو آپ ساتھ ساتھ علی الحساب لیتے رہے ہیں۔ اگر میں وہاں ملازم بھی ہوتا تو مجھے کچھ تنخواہ ملتی لیکن جب انہوں نے میری طرف علی الحساب بہت سے پیسے نکال دیئے تو میں نے کہا کہ جناب آپ دوکان سنبھالیے میں چلتا ہوں۔ اور واپس لاہور چلا آیا۔ اب دیکھا جائے تو وہ سردار میرا دوست تھا اور اس نے دوکان بھی مجھے دی تھی' انہیں تو صرف حصہ دار بنایا تھا لیکن انہوں نے مجھے ہی نکال کر باہر کیا۔ زندگی میں اس قسم کے اور بھی بہت سے خودغرض لوگوں سے واسطہ پڑا۔

اسی طرح کا ایک کردار عنایت بھی تھا جس کا میں سکول کے واقعات کے سلسلے میں ذکر کر چکا ہوں۔ میرے والد میرے دوستوں کے ساتھ ہمیشہ وہی سلوک کرتے تھے جو میرے ساتھ کرتے تھے۔ اگر مجھے جوتوں کا ایک جوڑا لے کر دیا ہے اور ساتھ کوئی دوست ہے تو اس کو بھی ایک جوڑا لے دیا۔ جب والد فوت ہو گئے اور زوال کا زمانہ آیا تو یہ صاحب مجھ سے چاندی کا گلدان مانگ کر لے گئے۔ ماں نے پوچھا کہ وہ گلدان کہاں ہے تو میں نے کہا کہ عنایت مانگ کر لے گیا تھا' دے دے گا۔ اس عرصے میں اس نے کسی طرح مجھ پر دو چار روپے خرچ کر دیئے اور سمجھ لیا کہ گلدان اب اس کا ہو گیا ہے۔ صدمہ اس دن ہوا جب میری ماں نے ایک دن اس سے کہا کہ عنایت بیٹے! تم وہ گلدان مانگ کر لے گئے تھے تو اس نے کہا کہ وہ تو اورنگ زیب نے میرے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ ماں مجھ سے ناراض ہوئی اور کہا کہ تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا ہے۔ میں اس وقت بہت رویا' مجھے دکھ یہ تھا کہ اس نے مجھے ماں کی نظروں میں ذلیل کر دیا ہے۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے۔ ہری پور جیل میں دریاں بہت اچھی بنتی تھیں۔

چنانچہ میرے والد نے کمروں میں دریاں اور قالین بہت اہتمام سے بچھا رکھے تھے۔ مگر اب زمانہ بدل چکا تھا گھر کے زیورات بک چکے تھے اور کوئی چھوٹے موٹے مکان جو ہمارے پاس گروی تھے ان کے بھی پیسے آ چکے تھے۔ میں گھر کی کچھ چیزیں بھی بیچ رہا تھا۔ اس دوران وہاں ایک صاحب نے جو بڑے نمازی تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ دری آپ گروی رکھ لیں اور کچھ پیسے قرض دے دیں۔ انہوں نے کہا ایک شرط ہے کہ معیاد مقرر کر لیں۔ اس عرصے میں اگر آپ آ جائیں تو دری لے جائیں ورنہ یہ میری ہو جائے گی۔ چنانچہ دری گروی رکھ دی گئی۔ مجھے پتا تھا کہ معیاد جلد ختم ہونے والی ہے' میں پنڈی گیا اور وہاں سے والد کے زمانے کے کچھ پیسے لینے تھے وہ لے کر ایک دن لیٹ پہنچا تو کہنے لگے کہ معاہدہ پڑھ لیجئے آپ ایک دن لیٹ پہنچے ہیں اب یہ دری آپ کی نہیں رہی۔ میں اتنا شرمیلا تھا کہ کسی سے کہہ بھی نہیں پایا۔ اگر کہتا تو شاید دری مل جاتی۔ اس طرح ذہن پر یہ ہتھوڑا بھی پڑا۔

اسی طرح ہمارے ایک عزیز رشتہ دار تھے۔ جب میرے گھر میں دوسرا بچہ پیدا ہوا تو ہمارے مالی حالات خراب تھے۔ پہلا بچہ بھی فوت ہو چکا تھا۔ میں نے کسی کو ان کے پاس بھیجا کہ دس روپے قرض دے دیں۔ انہوں نے کہلا بھیجا کہ تمہارا جو سرمچی ہے وہ ہمیں چاہیے' ہم نے بازار سے بھی خریدنا تھا وہ ہمیں دے دو۔ میں نے وہ دے کر دس روپے لیے۔ اس زمانے میں جب کوئی ان سے میرا ذکر کرتا تھا تو یوں مانتے تھے جیسے کوئی بہت دور کا رشتہ دار ہو۔ پھر ایک زمانہ آیا جب میرا نام بہت مشہور ہوا تو بلا وجہ میرا ذکر کر کے کہتے تھے کہ ہمارا قریبی رشتہ دار ہے۔ اس زمانے میں اس قسم کے بے شمار تجربے ہوئے جنہوں نے مجھ میں سماجی شعور بیدار کیا اور آخر کار یہ تجربے میری شاعری میں شامل ہوئے۔

اس سلسلے کا ایک اور عبرتناک واقعہ یہ ہے کہ میرا دوسرا بچہ جس کی پیدائش کا میں نے ذکر کیا ہے۔ دو سال کا ہو کر فوت ہو گیا' جیسا کہ پہلا بچہ بھی دو سال کا ہو کر فوت ہو گیا تھا۔ اس وقت مالی حالات زیادہ خراب تھے۔ میں اور میرا بھائی اور دونوں مائیں ایک ساتھ رہتے تھے لیکن بیچ میں کچھ ایسے کردار بھی تھے جن کی وجہ سے صدمے جھیلنے پڑے۔ جب

بچہ فوت ہوا تو میری بڑی ماں نے ایک خوبصورت کپڑا بچے کی لاش پر ڈال دیا لیکن تھوڑی دیر بعد اسی بڑی والدہ کی ایک بہن آئیں۔ انہوں نے کپڑا پڑا ہوا دیکھا تو کہا کہ یہ تو میرا کپڑا ہے' یہ کس نے ڈالا ہے' میرے کپڑے مردوں پر ڈالنے کے لئے نہیں ہیں اور بڑی رعونت سے وہ کپڑا کھینچ کر اتار لیا۔

مہربان پھوپھی

خوبصورت ماضی کے بعد یہ جو ڈراؤنا حال میرے سامنے آ گیا تھا' اس میں دور دور تک نظر دوڑاتا تھا تو ایک بے آب و گیاہ صحرا لگتا تھا جس میں کوئی سایہ دار درخت نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن ایک شخصیت ایسی تھیں جنہیں ہمیشہ میرا خیال رہا اور وہ میری پھوپھی تھیں جو راولپنڈی میں رہتی تھیں۔ انہوں نے ہی مجھے بچپن سے پالا پوسا تھا کیونکہ ان کی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ ہوا یہ کہ وہ خود بیوہ ہو گئیں اور ان کی ایک بیٹی تھی جس کے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ یہ ماں بیٹی پنڈی میں رہتی تھیں۔ ان کے حالات ایسے نہیں تھے کہ کسی کی فراخدلی سے مدد کر سکیں۔ پھر بھی میری جو کمی انہیں نظر آئی اس میں وہ حصہ دار بن گئیں۔ اگر انہوں نے کبھی محسوس کیا کہ میرے پاس کپڑے کم ہیں تو وہ کسی بہانے مجھے اور میری بیوی کو کپڑے خرید دیتیں۔ اسی طرح کسی نہ کسی شکل میں میری مدد کرتیں۔

ان کے پاس پنڈی کے امام باڑہ محلہ میں ایک مکان تھا جس کا کچھ حصہ انہوں نے کرایہ پر دے رکھا تھا۔ ان کی بیٹی بچوں کو پڑھا کر اور خواتین کا کچھ دوسرا کام کاج کر کے گھر کا خرچ چلاتی تھیں۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی اور کمانے والا نہیں تھا اور اگر ہو بھی تو کون کسی کی مدد کرتا ہے۔ مجھ پر فرض تھا کہ ان کی مدد کروں لیکن میں اپنے حالات سے مجبور تھا۔ میری پھوپھی کو بیوہ ہوئے کوئی پچاس سال گزر چکے تھے جب وہ فوت ہو گئیں۔ اب اس مکان میں پھوپھی کی بیٹی رہنے لگی۔ میں جب ہری پور سے پنڈی گیا تو اسی مکان میں ہم رہنے لگے جہاں انہوں نے ہمیں ایک کمرہ دے دیا تھا۔ جب پھوپھی کی بیٹی بیمار

پڑی تو اس نے مجھے بلایا اور کہا کہ تمہاری پھوپھی نے مجھے یہ راز دارانہ طور پر بتایا تھا کہ یہ مکان تمہیں منتقل ہونا ہے اور انہوں نے مجھے کہا تھا کہ جب تمہیں یہ مکان کسی کے سپرد کرنے کی ضرورت پیش آئے تو اس کا مالک میرا بھتیجا ہے۔ اس لئے میں اپنی ماں کی وصیت کے مطابق چاہتی ہوں کہ تم یہ مکان میرے سامنے منتقل کروالو۔ میں ان کی باتیں سن کر آبدیدہ ہوگیا اور میں نے سوچا کہ یہ کتنے دیانتدار لوگ ہیں اور پھوپھی نے کس طرح ''حق بہ حق دار رسید'' کے قول کے مطابق یہ وصیت کر دی تھی۔ انہوں نے یہ بات راز میں رکھی تھی اور پہلے اس لئے نہیں بتایا تھا کہ پیسے کا معاملہ ہے' اور بیٹی بھی اکیلی ہے۔ اس لئے کسی کی نیت میں فتور نہ آ جائے۔ آخر انہوں نے پنڈی کی یہ جائیداد میرے نام تبدیل کر دی اور خود تھوڑے عرصے کے بعد فوت ہوگئیں۔

جب تقسیم ہوئی تو اس وقت ہندوؤں کی مسلمانوں کے ساتھ چھوت چھات کے سلسلے میں نفرت عروج پر تھی۔ ہری پور میں ایک فیملی تھی جو مہتا فیملی کہلاتی تھی۔ اس کا سربراہ مہتا ہیمبراج تھا۔ جوانی کی عمر سے آگے نکلا ہوا شخص تھا لیکن جب کبھی ہندو مسلم فساد ہوتا جس میں میری فیملی اس کے مدمقابل ہوتی تھی' تو اقلیت میں ہوتے ہوئے بھی اور مسلمانوں کی نظر میں جسمانی طور پر کمتر ہونے کے باوجود وہ سب سے پہلے سر پر پگڑی باندھ کر اور لاٹھی ہاتھ میں لے کر لڑائی کے نکلتا تھا اور یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی ہندو کو چوٹ آئی ہے لیکن کسی مسلمان کو نہیں آئی۔ یہ سلسلہ قیام پاکستان تک رہا لیکن اب خیالات کی تبدیلی دیکھئے۔

اس عروج پر مخالفت ہونے کے باوجود جب میں قیام پاکستان کے بعد 1952ء میں پہلی بار دہلی گیا تو چاندنی چوک میں ایک شخص ملا میں اس کے لباس اور چہرے سے پہچان گیا کہ یہ شخص ہری پور کا رہنے والا ہے۔ میرا لباس تو خیر شاعرانہ تھا یعنی کرتا اور پاجامہ' اس نے مجھے اصلی نام لے کر پوچھا کہ مجھے پہچانا ہے۔ میں نے کہا جی اتنا پہچانا ہے کہ آپ ہری پور کے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ میں مہتا ہیمبراج فیملی سے ہوں اور آپ ہمارے گھر آیئے۔ میں پریشان تو ہوا کہ ان کے ساتھ اتنے لڑائی اور جھگڑے تھے مگر دعوت قبول کر لی۔ انہوں نے میرا ایڈریس لیا اور اگلے روز ان میں سے کوئی آیا اور مجھے لے گیا۔ میں نے

وہاں جا کر دیکھا کہ ہری پور کے رہنے والے کچھ لوگوں نے وہاں پر بھی مکانات ایک ساتھ الاٹ کروائے تھے اور ان کا رہن سہن بھی ہری پور والا ہی تھا۔ عورتیں مرد جمع تھے اور مجھے دیکھنے کے لئے یوں آئے جیسے پیر کو دیکھنے آئے ہوں اور مجھ سے نام لے لے کر ایک ایک شخص کے بارے میں پوچھتے رہے۔ پھر یہ پوچھا کہ اس مندر کا کیا حال ہے۔ اس مکان میں کون رہ رہا ہے۔ اور ہمارا باغ کس کو الاٹ ہوا ہے وغیرہ۔ ہر شخص نے جب اپنی حیثیت کے مطابق مجھے تحفہ بھی پیش کیا تو میں جذباتی ہوا۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ اتنی عداوتوں کے باوجود جب بیچ میں ہجرت کا تجربہ پیش آیا تو اپنے دشمن کے دشمن بھی انہیں اچھے نظر آنے لگے اور ہو سکتا ہے کہ انہیں اپنے یہاں کے ہم وطن اچھے نہ لگ رہے ہوں کیونکہ جب تضادات کا ٹکراؤ آ جاتا ہے تو پھر کچھ تلخیاں پیدا ہوتی ہیں اور کچھ محبتیں۔

قیام پاکستان سے پہلے جب میں مری سے ٹرانسپورٹ کی نوکری چھوڑ کر لاہور آیا اور یہاں ''ادب لطیف'' کی ملازمت کی تو یہاں فکر تونسوی میرے ادارے کے ساتھی اور دوست بنے۔ بہت کم لوگوں کو پتا ہے کہ وہ ہندو تھے۔ ان کا اصل نام رام لال بھاٹیہ تھا۔ اسی طرح فکر تونسوی کی بیوی کو نہیں پتا تھا کہ قتیل شفائی مسلمان ہے۔ وہ مجھے ہندو سمجھتی تھی۔ ایک دن فکر نے مجھے کہا کہ تم کھانا میرے گھر پر کھاؤ۔ چنانچہ میں ان کے گھر چلا گیا۔ یہ 1946ء کی بات ہے۔ فکر بیوی کو پیار سے میم کہتے تھے لیکن اس نام میں جتنی جدت تھی اس خاتون میں اتنی ہی قدامت تھی۔ بالکل دیہاتن تھی۔ فکر تونسوی ایک تھال میں کھانا رکھ کر میرے لئے لایا۔ وہ بڑا آزاد خیال آدمی تھا اور ہندو اس طرح سے تھا کہ ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوا تھا بالکل اسی طرح جیسے ہم مسلمان گھر میں پیدا ہوتے ہیں۔

فکر نے اپنی بیوی سے کہا: ''میم یہ بتاؤ کہ قتیل شفائی کون ہیں؟'' وہ نہیں سمجھی اور کہا کہ آپ کے دوست ہیں۔ اس نے کہا نہیں میرا مطلب ہے کہ یہ ہندو ہے یا مسلمان۔ کہنے لگی کہ ہندو ہیں۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور کہنے لگا کہ بھول گئیں نا یہ تو مسلمان ہے۔ اور اس نے چونک کر کہا نہیں۔ جیسے اسے بہت حیرت ہوئی ہو اور اس کا چہرہ اتر گیا۔ مجھے سمجھ نہ آئی کہ مسلمان کہنے سے وہ پریشان کیوں ہو گئی ہے۔ خیر جب وہاں سے کھانا کھا کر نکلے تو

فکر نے مجھے کہا کہ دیکھا میری بیوی کا کیا حال ہوا؟ تو یہ حال ہے آجکل ہندو مسلم نفرت کا۔

پھر جب 1952ء میں دہلی گیا تو فکر نے مجھ سے کہا کہ چلو گھر چل کر میری میم سے ملو۔ ہمارے بہت قریبی تعلقات تھے اس لئے میں ان کے گھر گیا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ میم کی شکل وصورت ہی کچھ اور ہے۔ مجھ سے کہنے لگی کہ قتیل صاحب آپ کھانا ہمارے ہاں کھائیں گے میں آپ کو (MEAT) پکا کر کھلاؤں گی۔ میں نے کہا بھابی میم تمہیں کیا ہو گیا ہے تم تو دال ساگ سے آگے نہیں جاتی تھیں اور اب تم میٹ بناؤ گی۔ کہنے لگی ہاں میں بناؤں گی۔ خیر گوشت پکانے کا طریقہ تو اسے کیا آتا تھا بس اس میں خلوص ہی تھا۔ خیر اس نے میٹ بنایا بھی اور ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھایا بھی۔ اس میں بہت تبدیلی آچکی تھی اور میرے خیال میں یہ تبدیلی بھی ہجرت کے تجربے کے باعث ہی تھی۔

جب تقسیم ہوئی تو فکر تونسوی لاہور میں تھے اور ان کی بیوی تونسہ گئی ہوئی تھیں۔ یہ بیوی بچوں سمیت لاہور ہی میں رہنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے مجھ سے کہا کہ کسی طرح تونسہ جا کر میری بیوی کو لے آؤ۔ میں نے اپنے ساتھ اپنے دوست احمد راہی کو تیار کیا۔ فکر تونسوی پہلے ہی بیوی کے نام خط ارسال کر چکے تھے جس میں لکھا تھا کہ قتیل شفائی اور احمد راہی آرہے ہیں ان کے ساتھ آجانا۔ انہوں نے ایک اور خط اپنے سسرال کے نام دستی لے جانے کے لئے بھی ہمیں دیا جس میں بھی یہی لکھا تھا کہ میری بیوی کو ان کے ساتھ بھیج دینا اور فکر کی کوئی بات نہیں۔

ہم بڑے دشوار گزار راستوں سے ہوتے ہوئے اور سہمے ہوئے لوگوں کے مناظر دیکھتے ہوئے ملتان سے کشتیوں والا دریا عبور کر کے تونسہ پہنچے۔ سب سے پہلے ہم وہاں کے پیر صاحب جن کا نام غالباً خواجہ سلیمان تھا' کے پاس گئے۔ اس وحشت ناک دور میں بھی اس شخصیت کو ہم نے منارۂ نور پایا۔ انہوں نے وہاں کے تمام غیر مسلم لوگوں کو اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا اور اعلان کر رکھا تھا کہ جو لوگ یہاں رہنا چاہتے ہیں امن اور حفاظت میں رہیں اور جو جانا چاہتے ہیں انہیں بحفاظت کیمپوں میں پہنچا دیا جائے۔ انہوں نے اپنا ایک آدمی ہمارے ساتھ کیا اور ہم فکر تونسوی کے سسرال کے گھر جا پہنچے۔

ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا تو فکر کی ساس دروازے پر آئیں ہم نے پوچھا کہ فکر تونسوی کا خط آپ کو ملا ہے کہنے لگیں کہ ملا ہے۔ میں نے دوسرا خط انہیں دیتے ہوئے کہا کہ فکر صاحب نے کہا ہے کہ بھابی کو ہمارے ساتھ بھیج دیں کیونکہ وہ لاہور ہی میں رہنا چاہتے ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ ہم اس کی بیوی کو کیمپ بھیج چکے ہیں اور وہاں سے انڈیا جا چکی ہو گی۔ دراصل وہاں پر یقین اور بے اعتمادی کا زمانہ ایسا تھا کہ کسی کو کسی پر یقین ہی نہیں تھا۔ جب ہم 1952ء میں فکر تونسوی کے گھر گئے تھے تو انہوں نے بتایا کہ میں اس وقت گھر ہی میں تھی۔ میں جانتی تھی کہ آپ فکر صاحب کے دوست ہیں اور میں ان کے ساتھ ہی رہنا چاہتی تھی۔ میں اس وقت دروازے کے پیچھے کھڑی تھی اور بولنا چاہتی تھی لیکن انہوں نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولنے نہیں دیا۔

ان دنوں جبکہ انسان وحشی بن چکا تھا' ہم نے دیکھا کہ جس طرح یہاں کچھ مسلمانوں نے انسان بن کر غیر مسلموں کی مدد کی' اسی طرح انڈیا میں بھی کچھ ہندوؤں' سکھوں نے انسان کی حیثیت سے مسلمانوں کی مدد کی۔ ایسے ہی انسانوں میں سے ایک کنور مہندر سنگھ بیدی تھے۔ تقسیم کے زمانے میں وہ دہلی میں سٹی مجسٹریٹ تھے۔ وہ شاعر تھے اور میرا ایمان ہے کہ جس شخص کا شعر و ادب کے ساتھ ذرا سا بھی تعلق ہوگا وہ گداز طبعیت کا مالک ہوگا اور منصف مزاج ہوگا۔ اس کی نظر میں مذہب اور ملت بعد میں آئیں گے' انسانیت پہلے آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بغیر تمام ادبی محفلیں نامکمل سمجھی جاتی تھیں۔ سنا ہے کہ تقسیم سے پہلے خواجہ شفیع کے ہاں جو ہفتہ وار یا ماہوار محفلیں ہوتی تھیں یہ ان میں باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے اور شعراء سے ان کے دوستانہ مراسم تھے جبکہ شاعروں میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ تقسیم کے وقت جب افتاد پڑی تو ان کے شاعر دوست اور دیگر اقارب بھاگ بھاگ کر ان کے پاس مدد کے لئے آئے اور انہوں نے ان کی زیادہ سے زیادہ مدد کی۔ نتیجتاً یہ ایک درد دل رکھنے والے انسان مشہور ہو گئے۔

جب آبادی کا انخلاء شروع ہوا تو کہا جاتا ہے کہ پنڈت نہرو خود مسلمانوں کے محلے میں گئے اور ان سے اپیل کی کہ وہ انڈیا چھوڑ کر نہ جائیں تو اس وقت لوگوں نے کہا کہ ہم

یہاں رہنے کے لئے تیار ہیں شرط یہ ہے کہ آپ کنور مہندر سنگھ بیدی کو یہیں رکھیں کیونکہ پھر ہمیں اعتماد ہو گا کہ ہم سے کوئی زیادتی نہیں ہو گی۔ چنانچہ کنور صاحب کے بقول انہیں اسی وجہ سے وہیں رہنے دیا گیا۔

کنور صاحب نے ایک بڑی دلچسپ بات بتائی کہ میں نے ان حالات میں کنٹرول اس طرح کیا کہ میں نے اعلان کروا دیا کہ کل سے سفید وردی میں ملبوس پولیس کے پانچ سو مسلح سپاہی گشت کریں گے اور جہاں کہیں کسی نے کسی سے زیادتی کی اسی وقت اسے گولی سے اڑا دیں گے۔ لوگ ہر دوسرے شخص کو سمجھتے تھے کہ وہ پولیس کا آدمی ہے حالانکہ میں نے سفید وردی میں پولیس کا کوئی آدمی نہیں بھیجا تھا۔ بہر حال یہ نسخہ کارگر ثابت ہوا۔ کنور صاحب اب جب کبھی پاکستان آتے ہیں تو دوستوں کے علاوہ دہلی سے آئے ہوئے لوگ ان کا پیروں کی طرح استقبال کرتے ہیں اور انہیں احساس نہیں ہونے دیتے کہ وہ کسی دوسرے شہر میں ہیں۔

کنور مہندر سنگھ بیدی اصل میں چک بیدیاں ضلع ساہیوال کے رہنے والے ہیں۔ ہم نے افسانوں اور داستانوں میں سن رکھا تھا کہ اگلے وقتوں میں بعض رئیسوں کے دروازوں پر ہاتھی جھولتے تھے لیکن کنور صاحب کے دروازے پر واقعی ہاتھی جھولتا تھا جو ان کے یہاں سے جانے کے بعد چڑیا گھر بھیج دیا گیا۔ یہ مادہ ہتھنی تھی اور اس کا نام بے نظیر تھا۔ بیدی اس کے سلسلے میں سناتے ہیں کہ کافی عرصہ بعد جب میں پاکستان آیا اور لاہور کے چڑیا گھر گیا تو اس کے کھانے کے لئے بہت سی چیزیں ساتھ لے گیا۔ جب میں وہاں پہنچا تو یہ دوسری طرف دیکھ رہی تھی میں نے آواز دی بے نظیر تو اس نے چاروں طرف دیکھا۔ ہتھنی کی یادداشت کافی تیز ہوتی ہے۔ میں نے دوبارہ آواز دی تو فوراً سیدھی میرے پاس آئی اور میں نے اسے چیزیں کھلائیں۔ پھر جب میں رخصت ہوا تو یہ بہت چنگھاڑی۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب انسان اور جانور قریب آ جائیں اور ایک ساتھ رہیں تو ان میں یگانگت بڑھتی ہے اور یہ ایک دوسرے کو بھول نہیں پاتے۔ اور انسان تو پھر انسان ہے۔ آپس میں اختلافات کتنے ہی کیوں نہ بڑھ جائیں، انسانیت اور ضمیر کی بیداری کا ایک

مرحلہ ایسا آتا ہے جب دونوں کی یادداشتیں ایک مرکز پر آ جاتی ہیں اور انسان پھر انسان کو بطور انسان پہچاننے لگتا ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں فسادات کے بعد اور فسادات کے زمانے میں ملتا رہا اور آج بھی ملتا ہے۔ ہم لوگ تو اس عہد کے انتظار میں ہیں جب کبھی لوگ اپنے مذہب پر رہتے ہوئے انسان بن جائیں گے اور ایک دوسرے کو انسان کی نظر سے دیکھیں گے۔

میں جب لاہور آیا تو وہ لباس پہنتا تھا جسے آجکل عوامی سوٹ کہتے ہیں۔ اس زمانے میں اس قسم کا لباس صوبہ سندھ کے دیہات میں اور خاص طور پر صوبہ سرحد میں موجود تھا۔ ادب لطیف کے سلسلے میں جب میں یہاں پہنچا تو میں نے یہ عوامی سوٹ قسم کا لباس پہنا ہوا تھا۔ یہ ہلکے رنگ کی شلوار اور قمیص تھی۔ اس زمانے میں مرد کی شلوار کا رنگ ہونا عجیب سی چیز نظر آتی تھی۔ کچھ دوستوں نے مذاق کیا اور کچھ نے ''دغا روڑا'' کہا۔ میں نے سوچا کہ جیسا دیس ویسا بھیس کے مصداق لباس کو تبدیل کرنا چاہیے چنانچہ اس جانب توجہ کی۔

میرا دوسرا مسئلہ زبان کا تھا کیونکہ میرا لہجہ ہندکو تھا جو اگرچہ پنجابی زبان سے بہت مماثلت رکھتی تھی لیکن اس کا لہجہ مختلف اور الگ تھا۔ چنانچہ میں نے شعوری طور پر ایک لباس بدلا اور شلوار قمیص کی بجائے پاجامہ اور کرتا پہننا شروع کیا اور دوسرے یہ سوچا کہ چھ مہینے کے اندر اپنا پنجابی لہجہ ٹھیک کر لوں چنانچہ وہ بھی ٹھیک ہو گیا۔ جب بھٹو صاحب کا دور آیا تو انہوں نے اسی عوامی سوٹ کو رواج دیا جو پہننے پر میرا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ اس پر میں بہت ہنستا تھا اور کہتا تھا کہ فرنٹیئر کا جو تحفہ میں لے کر آیا تھا اسے اس وقت رد کر دیا گیا اور مجھے مذاق کا نشانہ بنایا گیا مگر آجکل معزز آدمی وہی ہے جو یہ عوامی سوٹ پہنے یعنی:

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

جب میں نے شرمندہ ہو کر وہ لباس چھوڑا تو لوگ اس کی زد میں آ گئے اور اب پھر تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا ہے اور ان لوگوں سمیت میں بھی یہ لباس پہننے لگا ہوں۔

ریڈیو پاکستان کی زیادتی

تقسیم کے فوراً بعد لاہور میں میری فلم پروڈکشن بند ہو گئی اور مجھے روزگار کے لئے چھوٹی چھوٹی ملازمتوں کا سہارا لینا پڑا۔ انہی دنوں میں میری ملاقات ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل زیڈ اے بخاری سے ہو گئی۔ انہوں نے مجھے ریڈیو میں سٹاف آرٹسٹ کی جاب پیشکش کی لیکن ساتھ ہی یہ شرط رکھی کہ مجھے کراچی جانا پڑے گا۔ یہ باقاعدہ سروس نہیں تھی بلکہ کنٹریکٹ پر رکھا جاتا تھا۔ مگر میں لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں؟ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا بالکل اسی طرح سے جیسے جب کوئی غیر لاہوری پوچھتا ہے کہ "لاہور، لاہور ہے" کا کیا مطلب ہے تو اس کا جواب نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ لاہور کا اپنا ایک مزاج ہے جو انسان کے ساتھ چپک کر رہ جاتا ہے اور پھر جسے لاہور کی آب و ہوا کا چسکا پڑ جائے تو وہ کہیں اور جانا پسند نہیں کرتا۔ یہی میرے ساتھ ہوا۔

ریڈیو میں سٹاف آرٹسٹ کے لئے بخاری صاحب نے مجھے تین سو روپے ماہانہ تنخواہ کی پیشکش کی تھی لیکن میں نے کہا کہ بخاری صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ دو سو روپے دے دیں لیکن لاہور میں رکھ لیں۔ کہنے لگے کہ بھائی یہاں جاب نہیں ہے اور پھر وہاں جاؤ گے تو ترقی کے مواقع بھی ہوں گے۔ وہاں کا ادبی ماحول بھی آجکل اچھا ہے، کوئی اور کام ساتھ کر لو گے تو مالی پریشانی بھی دور ہو جائے گی۔ میں نے کہا یہ ساری چیزیں بجا لیکن میں لاہور نہیں چھوڑوں گا۔ چنانچہ لاہور نہیں چھوڑا اور یہیں جما رہا اور جیسے تیسے گزر ہوئی کرتا رہا۔

ریڈیو ہی کے ریفرنس سے ایک اور واقعہ ہے جب میں انجمن ترقی پسند مصنفین میں

شامل تھا تو اس میں شامل نامور لوگوں کو ریڈیو پر بین کر دیا گیا۔ عجیب بات ہے کہ جب ریڈیو والے کسی شاعر کو بین کرتے ہیں اور خوش قسمتی یا بد قسمتی سے اس کا فلم کے ساتھ بھی تعلق ہو تو اس کے فلم کے گانے بھی بین کر دیتے ہیں جبکہ ظاہر ہے کہ فلم میں کوئی انقلاب برپا نہیں ہوتا اور فلم سنسر سے گزر کر آئی ہوتی ہے۔ لیکن انہیں اس کی پروا نہیں ہوتی کہ وہ شاعر اور اس کے ساتھ ساتھ اور کس کس کو بین کر دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ میوزک ڈائریکٹر، سنگر اور پروڈیوسر بھی بین ہو جاتے ہیں۔ سیدھا طریقہ تو یہ ہے کہ اگر آپ شاعر کو گمنام رکھنا چاہتے ہیں تو اس کا نام نہ لیں لیکن گانے کو چلنے دیں۔ مگر یہ کسی حکومت کے ساتھ مخصوص نہیں جو بھی حکومت آتی ہے یہی کچھ کرتی ہے۔

اس زمانے میں جب میرے گانے بین ہوئے تو فلم میں میری مانگ بھی کم ہوگئی۔ کیونکہ فلم والوں نے پیسے لگائے ہوتے ہیں اور جو پیسہ لگاتا ہے اسے پبلسٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ریڈیو کی بندش کے ساتھ فلم کا کام بھی بہت کم ہو گیا۔ پروگریسو رائٹرز کے کچھ رہنماؤں نے مجھے کہا کہ بخاری صاحب سے تمہارے تعلقات اچھے ہیں، ان سے مل ملا کر کوئی معاملہ کر لو ورنہ تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ میں بخاری صاحب سے ملا تو کہنے لگے کہ اس کا تو بس ایک ہی طریقہ ہے کہ تم لکھ کر دے دو کہ تم ترقی پسند تحریک سے قطع تعلق کر چکے ہو۔ میں نے کہا بخاری صاحب جھوٹ کیوں بلواتے ہیں، قطع تعلق تو میں نہیں کر رہا، میرا پوائنٹ تو یہ ہے کہ آپ مجھے مشاعروں میں نہ بلوائیں لیکن گانوں کے ریکارڈ بند کرنا تو بہت بری بات ہے۔ کہنے لگے اچھا کچھ کریں گے۔ میں اس وقت تو ان کی بات بالکل نہیں سمجھ سکا لیکن بعد میں مجھے پتا چلا کہ جناب بخاری صاحب نے کیا یہ کہ اپنی طرف سے ایک نوٹ لکھ دیا کہ قتیل شفائی کا ترقی پسند تحریک سے کوئی تعلق نہیں رہا اس لئے میں اسے واگزار کرتا ہوں۔

مجھ میں ہمیشہ اپنی برادری کے لئے جدوجہد کرنے کا حوصلہ رہا ہے۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ شاعروں کے ساتھ کسی جگہ زیادتی ہوئی ہے تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ اچھائی کی صورت میں کوئی مبارکباد نہیں ملے گی اور زیادتی کی صورت میں میرے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں کرے گا، میں ان کے لئے جدوجہد میں مست رہتا ہوں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے

جب ریڈیو پاکستان سے فرمائشی پروگرام چلتے تھے اور لوگ بڑے شوق سے یہ پروگرام سنتے تھے۔ آج تو صورت یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس سے کوئی حظ اٹھا سکتا ہے ریڈیو پر بند کر دی گئی ہے اور سامعین کو انہوں نے جان بوجھ کر آل انڈیا ریڈیو کی طرف منتقل کر دیا ہے۔ یہ لوگ یہ نہیں سوچتے کے دانستہ یا غیر دانستہ طور پر ملک کا اس طرح کتنا نقصان کر رہے ہیں۔

ایک اور ستم یہ بھی ہوتا تھا کہ ایک گانے کے ساتھ فرمائش کرنے والوں کے پچیس تیس نام تو ہوتے تھے لیکن شاعر کا نام نہیں ہوتا تھا البتہ سنگر کا نام ہوتا تھا جبکہ لوگ گانے والے کی آواز سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ مجھے اس سے بہت غصہ آتا تھا۔ میں نے کچھ شاعروں سے کہا کہ ریڈیو کے اس رویہ کے خلاف کچھ کرنا چاہیے۔ لیکن ایک آدھ میٹنگ کے بعد کوئی بھی نہیں آیا۔ میں نے ہمت نہیں ہاری اور کراچی میں ہیڈ آفس سے خط و کتابت شروع کی۔ یہ سلسلہ دو سال تک چلتا رہا۔ مجھے یاد نہیں اس وقت ڈائریکٹر جنرل کون تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ مجھے وقت دیجئے میں صرف پانچ منٹ بات کروں گا اگر آپ قائل ہو گئے تو ٹھیک ہے ورنہ اس باب کو یہیں ختم کر دیں گے۔

اس معاملے میں میں نے تین مرتبہ اپنے خرچ پر کراچی کا چکر بھی لگایا۔ جب تیسری مرتبہ میں وہاں گیا تو ڈائریکٹر جنرل صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ متعلقہ دو چار آدمیوں کو بلوالیں تا کہ میں جو سوالات کروں وہ جواب دے سکیں اور اگر وہ چاہیں تو وہ بھی مجھ سے سوال کر لیں۔ اور پھر آپ فیصلہ کر دیجئے۔ چنانچہ انہوں نے متعلقہ آدمیوں کو بلا لیا۔ میں نے کہا جی ان سے پوچھئے کہ شاعر کا نام کیوں نہیں دیتے تو انہوں نے کہا کہ دراصل ٹائم کا مسئلہ ہے۔ میں نے کہا کہ یہ جو ایرے غیرے نام لیے جاتے ہیں ان کا گانے کے ساتھ کیا تعلق ہے سوائے اس کے کہ یہ فرمائش کرتے ہیں ان میں سے ایک نام کم کر دیں اور شاعر کا نام رکھ دیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ ڈائریکٹر جنرل صاحب بھلے آدمی تھے۔ انہوں نے کہا کہ قتیل صاحب آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اور پھر انہوں نے تمام ریڈیو سٹیشنوں کو لکھا کہ آئندہ پالیسی میٹر کے طور پر گانے کے ساتھ شاعر کا نام آیا کرے گا۔ چنانچہ نام آنا شروع ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ اب بھی ریڈیو میں کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں تخلیق کار کا نام دیتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے۔

انڈیا میں ساحر لدھیانوی میرے دماغ کا آدمی تھا اور وہ بھی ادھر یہی کوشش کر رہا تھا۔ جب میں نے یہ کام کروا لیا اور نیوز چھپی تو شمع دہلی نے بھی یہ خبر چھاپی اور اپنے ایڈیٹوریل میں بھی لکھا کہ اگر پاکستان میں ایسا ہو سکتا ہے تو یہاں کیوں نہیں ہو سکتا اس طرح ساحر کو ثبوت مل گیا اور ادھر اس کی کوششیں بھی رنگ لائیں۔ بعد میں ''شمع'' نے میرے حوالے سے لکھا کہ اس کام کا کریڈٹ قتیل شفائی کو جاتا ہے۔

اس کے بعد ٹی وی کا معاملہ آیا تو اس سے بھی جنگ رہی۔ اس کے ایک سربراہ ضیاء جالندھری صاحب تھے جو شاعر بھی تھے۔ میرا تجربہ ہے کہ جس ادارے کا سربراہ شاعر آ جائے گا وہ شاعروں کی ایسی تیسی پھیر دے گا۔ جب ان کا کوئی نغمہ نشر ہوتا تھا تو اس کے آگے پیچھے اپنا نام دیتے تھے لیکن باقی شاعروں کے نام نہیں دیتے تھے۔ میں نے احتجاج کیا تو مجھے بین کر دیا۔ میں نے پریس کانفرنس کر کے لوگوں کو بتایا کہ میں بین ہو گیا ہوں کیونکہ ضیا صاحب نے ذاتی مسئلہ بنا لیا ہے جس پر انہوں نے بین اٹھا لیا اور کہا کہ ہم نے کوئی بین لگایا ہی نہیں۔ یہ سلسلہ کوئی ڈھائی سال تک چلتا رہا۔ پھر ایک اور ضیا صاحب آ گئے' یہ بھی جالندھر ہی کے تھے۔ انہوں نے پچاس سے زائد آدمیوں کو بین کر دیا جن میں سے ایک میں بھی تھا۔ بہر حال اس تگ ودو میں زمانہ گزرتا گیا۔ آج بھی برادری کے لئے لڑنے کا شوق جاری ہے جس کی شرط یہ ہے کہ:

شوقِ فضول جرأت رندانہ چاہئے

یہ شوق فضول اب بھی پورا کر رہا ہوں لیکن صاحب آفرین ہے ان سرکاری اداروں پر کہ خدا جانے شاعر بیزاری میں انہیں کیا ملتا ہے۔ ان اداروں میں ذاتی حیثیت میں اچھے لوگ موجود ہیں لیکن نجانے کبھی انہیں کیا ہو جاتا ہے کہ تخلیق کاروں کی حق تلفی کر دیتے ہیں۔ ایک نغمہ ہو گا تو شاعر اور موسیقار کا نام نہیں دیں گے لیکن اپنا نام ضرور دیں گے پیشکش فلاں کی ہے۔ حالانکہ یہ تو ملازم ہوتے ہیں اور تنخواہیں لے رہے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی تنخواہوں اور الاؤنسز کے لئے تو لڑتے ہیں لیکن جب شاعر یا فنکار کا معاملہ آتا ہے تو وہ ہڑتال کر کے یا کسی اور طرح اپنا معاوضہ بڑھا لیں تو بڑھا لیں' ان لوگوں کا تعاون حاصل نہیں ہوتا۔

رائٹرز گلڈ کی سیکرٹری شپ

لاہور آنے کے بعد جدوجہد کا خاصا زمانہ گزرا۔ پھر میں نے اپنی برادری کی خدمت کرنے کے جذبے کے تحت مختلف سوسائٹیوں اور انجمنوں میں چھوٹے چھوٹے عہدے قبول کیے۔ اس کے بعد ایک ایسا وقت آیا جب صدر ایوب کے زمانے میں قدرت اللہ شہاب نے پاکستان رائٹرز گلڈ کی بنیاد رکھی اور ان کے ساتھ جمیل الدین عالی ان کے معاون ہوئے۔ گلڈ کا بڑا غلغلہ مچا' کراچی میں اس کا کنونشن ہوا تو پاکستان بھر کے لوگ اس میں جمع ہوئے اور صدر ایوب نے اس کا افتتاح کیا۔ اس میں مولوی عبدالحق اور اُردو اور دیگر زبانوں کے عمائدین بھی شامل ہوئے۔

گلڈ کے بارے میں افواہ یہ تھی کہ یہ ادارہ صدر ایوب نے اپنی حکومت کو استحکام دینے کے لئے قائم کیا ہے اور اس کے مقاصد وہی ہیں جو جابر حکومتوں کے اپنے جواز کے لئے ہوتے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ ٹھیک ہے ایسا ہوگا۔ لیکن ہم تو اس لئے اس میں شامل ہوں گے کہ اگر ایسے کوئی مقاصد ہیں بھی تو انہیں پورے نہ ہونے دیا جائے۔ ون یونٹ کا زمانہ تھا اس لئے اس ادارے کے دو ریجن بنے یعنی مشرقی پاکستان ریجن اور مغربی پاکستان ریجن۔

ایک دن ہم ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے کہ ہمارے منیر نیازی صاحب کہنے لگے کہ تمہیں پتا ہے کہ میں رائٹرز گلڈ مغربی پاکستان ریجن کے سیکرٹری کے انتخاب کے لئے کھڑا ہو رہا ہوں۔ میں نے ازراہ مذاق کہا کہ اچھا یار وہ تو میں کھڑا ہو رہا تھا۔ کہنے لگے اچھا تو چلو

مقابلہ کر لیتے ہیں۔ میں بھی سیریس ہو گیا۔ اس کے بعد پتا چلا کہ وہ حسب معمول تصوف میں ڈوبے ہوئے تھے اور ایک بات کر کے الگ ہو گئے اور میں امیدوار کے طور پر کھڑا ہو گیا۔ لیکن میں نے ارادہ کیا کہ اس ادارے میں جا کر ہم اچھے کام کریں گے اور اسے نہ تو حکومت کا اور نہ کسی سیاسی جماعت کا آلہ کار بننے دیں گے۔ ہر چند کہ میں ایک خاص نقطہ نظر رکھنے والا آدمی تھا لیکن میں نے تہیہ کیا کہ میں اپنا نقطہ نظر بھی اس پر لاگو نہیں ہونے دوں گا اور اسے ٹریڈ یونین کے طور پر چلاؤں گا۔

اس سے پہلے سید وقار عظیم سیکرٹری تھے اور یہ شاید ان کی دوسری ٹرن تھی۔ جب کمپین چلی تو میرے مقابلے میں صوفی صاحب کو کھڑا کر دیا گیا۔ وہ میرے بھی بزرگ تھے۔ مجھے سمجھ نہ آئی کہ وہ کیوں سیکرٹری بننا چاہتے ہیں۔ اسی دوران اِدھر اُدھر سے مجھ پر پریشر ڈالنا شروع کر دیا گیا کہ وہ بزرگ ہیں آپ بیٹھ جایئے۔ میں نے کہا یار کس دستور میں لکھا ہوا ہے کہ ہم کسی بزرگ ہی کو لائیں گے۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ بزرگوں کو چاہیے کہ نوجوانوں کے لئے جگہ خالی کریں جبکہ آپ کہہ رہے ہیں کہ نوجوانو بیٹھو اور بزرگوں کے لئے جگہ خالی کر دو۔ یہ تو بالکل ٹھیک نہیں۔ ویسے بھی جن لوگوں نے مجھے کھڑا کیا ہے وہ مجھے بیٹھنے نہیں دیں گے۔ بعد میں ایک دن سیکرٹری صاحب کا بھی مجھے فون آیا کہ جب صوفی صاحب کھڑے ہوئے ہیں تو آپ نے کیوں سوچا ہے۔ میں نے کہا سوچا ہے کہ مقابلہ کریں گے۔ کہنے لگے کوئی دوسری صورت نہیں ہو سکتی۔ میں نے کہا کہ آپ کے دستور نے صرف ایک ہی صورت رکھی ہوئی ہے کہ الیکشن ہوں گے اس لئے الیکشن لڑیں گے۔ کہنے لگے میں سمجھ گیا لیکن میں آپ سے اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ صوفی صاحب سے کسی موقع پر Misbehave نہ ہو۔ میں نے کہا کہ وہ ہمارے بھی بزرگ ہیں' اختلاف تو الیکشن کی حد تک ہے اس لئے احترام کے ساتھ الیکشن لڑیں گے۔ اگر وہ ہار گئے تو حالات ذمہ دار ہوں گے اور اگر جیت گئے تو میں انہیں مبارکباد دوں گا۔

عالی صاحب کو یہ غلط فہمی تھی کہ ہلم اس سٹیج پر قبضہ کرنے آئے ہیں اور اگر الیکشن ہو جائے گا تو پروگریسوز اس پر قبضہ کر لیں گے اور ان کی جو بالا دستی ہے وہ ختم ہو جائے گی۔

اس لئے ان کی کوشش تھی کہ میں ہار جاؤں یا بیٹھ جاؤں۔ چنانچہ الیکشن والے دن سب لوگ جمع تھے اور کراچی سے عالی صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ میں آج مصروف ہوں' آ نہیں سکتا اس لئے الیکشن ملتوی کر دیئے جائیں۔ ہم نے کہا کہ آپ آئیں یا نہ آئیں الیکشن ضرور ہو گا۔ ویسے بھی آپ بذریعہ جہاز آ سکتے ہیں ہم الیکشن شام کو کر دیتے ہیں۔ معاملہ دو گروپوں میں تقسیم ہو گیا کچھ کہہ رہے تھے کہ الیکشن ملتوی ہونا چاہیے اور کچھ کہہ رہے تھے کہ ملتوی نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے کہا کہ آپ اس مسئلے پر ابھی ووٹنگ کروالیں جب ہاتھ کھڑے کروائے گئے تو جن لوگوں نے الیکشن ملتوی کروانے کے حق میں ہاتھ کھڑا کیا وہ صرف دو تھے ایک صوفی صاحب خود اور ایک کوئی اور صاحب۔ صوفی صاحب نے نتیجہ دیکھ لیا تھا اس لئے انہوں نے فوراً لکھ کر دے دیا کہ میں الیکشن سے دستبردار ہوتا ہوں۔ اس طرح میں بلا مقابلہ منتخب ہو گیا۔

اس الیکشن کے بعد کراچی میں گلڈ کا اجلاس ہوا جس میں شرکت کے لئے مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں ہی سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ عالی صاحب مجھے اپنا حریف سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح محفل میں میری سبکی ہو جائے۔ چنانچہ اچانک اعلان ہوا کہ اب مغربی پاکستان ریجن کے سیکرٹری قتیل شفائی اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ میں کبھی سٹیج پر گیا ہی نہیں تھا اور مجھے تقریر کا طریقہ نہیں آتا تھا۔ جب یہ اعلان ہوا تو مجھے چکر آ گیا کیونکہ وہاں بڑے بڑے علماء اور مقرر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں سے سٹیج تک پہنچنے میں میں نے ذہن میں دو پوائنٹ بنا لیے جن میں سے ایک یہ تھا کہ گلڈ کی وجہ سے مشرقی اور مغربی پاکستان ایک سٹیج پر ہیں اور جن لوگوں کا پہلے درشن نہیں ہوا تھا آج ہو گیا اور یہ کہ آگے چل کر دونوں تہذیبوں اور کلچر کا ایک سنگم بنے گا۔

پھر بھی جب میں جا کر سٹیج پر کھڑا ہوا تو صاحب صدر اور خواتین و حضرات کہتے ہوئے کانوں میں سیٹیاں بجنے لگیں اور آنکھوں کے آگے تارے چمکنے لگے اور لگتا تھا کہ میں کہیں گر نہ جاؤں لیکن میں نے الفاظ سمیٹے اور کہا کہ باقی باتیں تو میں بعد میں کروں گا' ایک بات پہلے عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ حکومت کی نظر میں گلڈ کے قیام کا مقصد شاید کوئی

اور تھا لیکن میری نظر میں اس کی افادیت یہ ہے کہ آج نذر الاسلام کی سرزمین کے لوگ اقبال کی سرزمین کے ادیبوں کے سامنے بیٹھے ہیں اور وہ اقبال کو سمجھ رہے ہیں اور ہم نذر الاسلام کو سمجھ رہے ہیں۔ میری اس بات پر تالیاں بجنے لگیں۔ اجلاس میں ایک طرف جسیم الدین بیٹھے ہوئے تھے جبکہ دوسری طرف حفیظ جالندھری بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے آگے چل کر کہا کہ یہ گلڈ ہی ہے جس کی وجہ سے آج یہاں جسیم الدین بھی بیٹھے ہیں اور حفیظ جالندھری بھی۔ پھر تالیاں بجنے لگیں اور میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ چنانچہ میں نے تقریباً دس بارہ منٹ تک روانی سے بچے تلے الفاظ میں تقریر کی۔ مجھے پسینہ آ گیا تھا لیکن میں نے عالی صاحب سے کہا کہ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے یا آپ کے کسی ساتھی نے مجھے وہاں سولی پر چڑھایا تھا کہ منصور لٹک کر مر جائے گا مگر منصور اس سے امر ہو گیا۔ میں نے آج سے تقریر کا فن سیکھ لیا ہے اور اگر یہی تقریر ہے تو مجھ سے روز تقریر کرواتے رہیے۔

گلڈ میں اس کامیابی کے بعد ہم نے اسے ایسے راستوں پر ڈالا کہ اوپر والے لوگ حیران ہوتے تھے کہ ہم نے تو اس کے لئے کچھ اور ہی سوچا تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں مغربی پاکستان ریجن کا رائٹرز گلڈ جتنا فعال رہا پھر کبھی نہیں رہا۔ گلڈ کے دستور کے مطابق کوئی شخص ایک عہدے پر دو سے زیادہ بار منتخب نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ دوسری ٹرم کے لئے بھی میں منتخب ہوا اگرچہ اس دوران میرے خلاف بڑی سازشیں بھی ہوئیں۔ پہلی ٹرم میں جب میں سیکرٹری تھا تو ایوان صدر میں آدم جی پرائز کی تقریب منعقد ہوئی۔ جس میں گلڈ کے سیکرٹری جنرل شہاب الدین' دونوں صوبوں کے سیکرٹری جمیل الدین عالی اور دیگر انعام یافتگان مدعو تھے۔ صدر ایوب وہاں مدعو ہر شخص سے دو منٹ کے لئے ذاتی حیثیت میں بھی بات کرتے تھے۔ جس وقت میری باری آئی اور صدر صاحب نے مجھے اپنے پاس بٹھایا تو شہاب صاحب نے کہا کہ سر قتیل صاحب تو آپ کے ''گرائیں'' ہیں۔ تو صدر صاحب نے مجھ سے کہا کہ کہاں کہ ہو بھئی۔ میں نے کہا ہری پور کا۔ انہوں نے مجھ سے ہندکو میں پوچھا تھا جس پر مجھے چکر سا آ گیا تھا کیونکہ مجھے تو لاہور میں آئے ہوئے مدت ہو چکی تھی اور میں ہندکو کو تقریباً بھول چکا تھا لیکن میں نے الفاظ سمیٹ کر پہلا جواب ہندکو میں دے دیا۔ پھر

انہوں نے ایک دو اور سوالات ہندکو میں پوچھے جن کے جوابات بھی میں نے بہر حال دے دیئے۔ پھر انہوں نے اُردو میں بات چیت شروع کی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ بڑے خوش تھے اور کہنے لگے کہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم ہری پور کے ہو لیکن تم نے پہلے کیوں نہ بتایا میں نے کہا جی ہری پور کا ہونا میرے لئے کوئی فخر کی بات نہیں' ہری پور میں تو اور پچیس ہزار آدمی بھی رہتے ہیں' مجھے تو اس بات پر فخر ہے کہ آپ صدر ہیں اور مجھے بطور شاعر جانتے ہیں اس سے وہ بہت خوش ہوئے۔

اگر چہ صدر ایوب مارشل لاء کے بانی تھے اور آج ہم جو کچھ بھگت رہے ہیں انہی کی مہربانیاں ہیں لیکن ذاتی حیثیت میں وہ بہت اچھے تھے اور ان میں کچھ خوبیاں بھی تھیں اور وہ یہ کہ وہ سچے آدمی تھے' جھوٹ نہیں بولتے تھے' اور اس کے علاوہ سچے دل سے محبِ وطن تھے۔ انہیں طریق حکومت کا جو ڈھانچہ ملا ہوا تھا' اب ظاہر ہے کہ انہوں نے اس کے اندر رہ کر ہی کام کرنا تھا۔ ان کی ایک اور خوبی یہ تھی کہ وہ منتقم نہیں تھے۔

اسی ملاقات کے دوران انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ بھئی کوئی کام ہو تو بتاؤ۔ کسی شخص سے صدر صاحب کے اس سوال کا مطلب یہ تھا کہ یہ شخص مالا مال ہو جائے۔ لیکن میں نے کہا کہ ہمیں ایک رائٹرز کالونی چاہیے۔ انہوں نے مجھ سے درخواست لے کر شہاب صاحب کو دے دی۔ میں نے درخواست میں جگہ کی نشاندہی کی ہوئی تھی جو کہ وہ جگہ تھی جہاں آجکل ریواز گارڈن ہے کیونکہ ان دنوں یہ زمین خالی پڑی ہوئی تھی۔ ویسے بھی ادیبوں کے لئے یہ بڑی آئیڈیل جگہ تھی۔ لیکن اس کے بعد پتا نہیں چلا کہ یہ درخواست کہاں گئی۔ حالانکہ طریقہ یہ تھا کہ شہاب صاحب یہ درخواست اسی وقت ملٹری سیکرٹری کے حوالے کرتے اور اس پر آرڈر لکھا جاتا مگر انہوں نے نجانے درخواست کدھر کر دی تھی۔ بعد میں جب میں نے شہاب صاحب سے پوچھا تو کہنے لگے کہ پتا نہیں وہ درخواست کہاں گئی میں نے تو وہ گورنر کو بھیج دی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس طرح کام نہیں ہوگا۔

یہاں سے رائٹرز کالونی کے لئے مُیری جدوجہد کا آغاز ہوا۔ چنانچہ میں اور میرے ساتھیوں نے جن میں رؤف شیخ اور مرحوم عبدالرشید تبسم تھے مل کر کوآپریٹو سوسائٹی بنائی۔ یہ

سوسائٹی ہم نے اپنے خرچ پر بنائی اور رائٹرز گلڈ پر کوئی بوجھ نہیں ڈالا۔ سوسائٹی کی انکوائری کے لئے جب کوئی اہلکاران آتے تھے تو میں انہیں اپنے خرچ سے Entertain کرتا تھا۔ خداخدا کر کے ہم نے بہت تھوڑے عرصے میں یہ سوسائٹی منظور کروالی۔ ہم نے اس کی ممبرشپ میں صاف لکھ دیا کہ یہ لاہور کے صرف بے گھر ادیبوں کے لئے ہے جن کے پاس پہلے سے کوئی پلاٹ' مکان یا جائیداد نہیں ہے۔ اس سوسائٹی کے بہت سے ممبر بن گئے۔ ہم نے رائٹرز کے لئے اصولی طور پر ایک سو پلاٹ منظور کروالیے۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ نقوش والے مرحوم طفیل صاحب مجھ سے دو ووٹ زیادہ لے کر گلڈ کے سیکرٹری منتخب ہو گئے۔ مرحوم شروع سے ہمارے دوست اور ساتھی تھے لیکن انہوں نے یہ الیکشن بالکل سیاسی انداز میں لڑا اور اس پر ان کے کم از کم پچاس ہزار روپے خرچ ہوئے۔ وہ ووٹوں کے لئے جہاز میں بیٹھ کر پشاور' کراچی اور کوئٹہ بھی جاتے تھے اور گورنر سے سفارش بھی کرواتے تھے۔ اس طرح وہ اپنے زمانے کے بالکل نواز شریف تھے۔ میں تو دو ووٹوں سے ہار گیا لیکن وہ اپنے ٹھیک ٹھاک کام دکھا گئے۔

رائٹرز کالونی کی کوآپریٹو سوسائٹی کی باڈی گلڈ سے الگ تھی لیکن میں اصولی آدمی تھا اس لئے میں نے کہا کہ میں ایک محاذ پر ہار گیا ہوں تو اب مجھے یہ باڈی بھی ان کے سپرد کر دینی چاہیے۔ مرحوم طفیل صاحب کی تمنا تھی کہ یہ سوسائٹی میرے پاس ہی رہے یا پھر ہم آدھے آدھے عہدیدار رکھ کر کام چلائیں۔ لیکن میں نے ان سے کہا کہ میں الیکشن میں ہار گیا ہوں اس لئے اب یہ سوسائٹی بھی آپ ہی چلائیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ بعد میں اس کا کیا حشر ہوگا۔

اس سوسائٹی کا بعد میں حشر یہ ہوا کہ وہ کالونی جو لاہور کے صرف بے گھر ادیبوں کے لئے تھی اس میں الاٹمنٹ ایسے ایسے لوگوں کو دی گئی جن کے دو دو مکانات پہلے سے موجود تھے۔ ان میں طفیل صاحب کے دوست' رشتہ دار' پریس مین' مشین مین' پبلشر اور جلد ساز بھی شامل تھے جن کا ادب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔

محمد طفیل

''نقوش'' کے مالک و مدیر طفیل صاحب سے میرے تعلقات تقسیم ملک سے کوئی دو سال پہلے کے تھے وہ اور ان کے دوست لطیف فاروقی ایک بار ہری پور آئے تھے تو ایک ایسے موقع پر مجھ سے ملنے کے لئے آئے جب میرے چھوٹے بھائی کی شادی تھی اور دعوت ولیمہ کا دن تھا۔ یہاں سے ان سے علیک سلیک شروع ہوئی۔ پھر جب میں لاہور آ کر سیٹل ہوا تو ان سے پرانی دوستی پھر سے چلی۔ انہوں نے ادارہ فروغ اُردو کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا اور لطیف فاروقی کے ساتھ مل کر کتابیں شائع کرنا شروع کیں۔ بعد میں لطیف فاروقی پراسرار حالات میں اس ادارہ سے علیحدہ ہو گئے اور طفیل صاحب تنہا اسے چلانے لگے اور ادارے کی طرف سے پہلی کتاب احمد ندیم قاسمی صاحب کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''کیسر کیاری'' کے نام سے شائع کیا۔ بعد میں انہوں نے قاسمی صاحب اور ہاجرہ مسرور کے تعاون سے ''نقوش'' شروع کیا اور خود محض ایک پبلشر کے طور پر اس میں نظر آئے۔

پرچہ ''نقوش'' ترقی پسند بنیادوں پر قائم کیا گیا تھا اور اس زمانے کا ایک اچھا خاصا ترقی پسند گروپ اس کے ساتھ تھا۔ اس لئے پرچہ کچھ اچانک آگے بڑھا مگر اسی دوران ہم نے سنا کہ پرچہ بند کر دیا گیا ہے۔ کچھ عرصہ پرچہ بند رہنے کے بعد دوبارہ شروع ہوا تو یہ ترقی پسندی کا لیبل لگائے ہوئے نہیں تھا بلکہ کچھ اور لائنوں پر چلنے لگا تھا۔ چنانچہ اس کے مدیر بھی کچھ اور لوگ ہی وقتاً فوقتاً مقرر ہوتے رہے۔

پھر ایک دھماکہ خیز خبر سنی کہ طفیل صاحب خود اس کے مدیر بن گئے ہیں اور اب وہی یہ

پرچہ ایڈٹ کیا کریں گے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ نام تو طفیل صاحب کا چلے گا لیکن کام کوئی اور شخص کرے گا کیونکہ بعض دوسرے پرچوں میں یہی رسم چل رہی تھی۔ یہ تاثر ایک عرصے تک چلتا رہا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس عرصے میں طفیل صاحب کے اندر ایک تخلیقی قوت بیدار ہو چکی تھی اور وہ خاص طور پر خاکہ نگاری کی صف میں بہت آگے نکل چکے تھے۔ چنانچہ جب ان کے خاکے منظر عام پر آئے تو انہوں نے لوگوں کو چونکا دیا۔

انہوں نے پرچے کی عام روش سے ہٹ کر کام شروع کیا۔ عام روش تو یہ تھی کہ پرچہ ہر ماہ باقاعدگی سے نکالا جائے مگر انہوں نے خاص نمبر نکالنے شروع کیے اور ایسے ایسے نمبر نکالے کہ دنیا دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ اس بارے میں بھی ان پر الزامات آئے اور کچھ لوگوں نے کہا کہ پس منظر میں تو کوئی اور کام کرتا ہے لیکن سامنے نام طفیل صاحب کا آتا ہے۔ مگر میری ذاتی رائے ہے کہ ایسا نہیں تھا۔ اگر کچھ تھا بھی تو وہ لوگ طفیل صاحب کی ہدایات پر کام کرتے رہے ہوں گے اور یہ کوئی کم بات نہیں کہ کوئی آدمی ایک ہزار صفحات کا نمبر نکال رہا ہے اور اس کا پورا خاکہ اس کے ذہن میں ہے پھر وہ پرانے لکھنے والے لوگوں سے اپنی سوچ کے مطابق کام لے رہا ہے۔ انہی سوچوں کا نتیجہ تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ''نقوش'' کے درجنوں نمبر سامنے آ گئے اور یہ پرچہ ایک عام پرچے سے ہٹ کر ضخیم نمبروں کا سلسلہ بن کر رہ گیا اور کوئی لائبریری ایسی نہ تھی جہاں یہ موجود نہ ہو بلکہ کسی پڑھے لکھے گھر میں نقوش کا نہ ہونا اس لائبریری اور گھر والے کی کم ذوقی کی دلیل سمجھا جانے لگا۔

یہ ٹھیک ہے کہ طفیل صاحب کاروباری ذہن رکھنے والے تھے مگر اس دور میں جو شخص بھی کام کرتا ہے اسے سب سے پہلے اپنے باورچی خانے اور اولاد کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ اس معاشرے میں گزر بسر کرنے کے لئے اور اچھا مقام پیدا کرنے کے لئے اس کے پاس دولت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ طفیل صاحب نے بھی انہی لائنوں پر سوچا اور یوں وہ ادب کو بھی بہت کچھ دے گئے اور اولاد کو بھی۔ علاوہ ازیں جائیداد اور پریس بھی بنا لیا۔ پھر رائٹرز گلڈ کا سیکرٹری منتخب ہونے کے بعد ایک اچھے ادارے سے جو فوائد حاصل ہو سکتے تھے وہ بھی حاصل کیے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے ادارے نے ادب کے لئے جو کام

کیا ہے وہ کام بہت سے ادارے مل کر بھی نہیں کر سکتے۔

طفیل صاحب سے میرے تعلقات ہمیشہ اچھے رہے بلکہ ''نقوش'' کے بنیادی معاونین میں سے ایک میں بھی تھا۔ ہم زندگی کے بہت شعبوں میں ایک ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ انہوں نے میری کتاب ''روزن'' بھی چھاپی۔ مگر اس کتاب کے سلسلے میں بھی ایک عجیب واقعہ ہوا وہ یہ کہ قیام پاکستان سے پہلے مکتبہ اُردو نے میرے ساتھ ایک کتاب کا معاہدہ کیا چنانچہ میں نے اپنی کتاب ''جلترنگ'' کا مسودہ مکتبہ اُردو والے چودھری رشید صاحب کے بڑے بھائی چودھری نذیر صاحب کو دے دیا۔ بعد میں یہ مسودہ چودھری نذیر صاحب کے ہاں سے گم ہو گیا۔ پھر تقسیم کے بعد میں نے ایک اور مجموعہ طفیل صاحب کو دینے کے لئے مرتب کیا اور اس کا نام ''روزن'' رکھا جس کا دیباچہ سعادت حسن منٹو کو لکھنا تھا جو نیا ادارہ میں بیٹھتے تھے۔ یہ ادارہ مکتبہ جدید والوں کے بھائی چودھری نذیر صاحب کا تھا۔ سعادت حسن منٹو وہیں بیٹھ کر لکھتے پڑھتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے یہ مسودہ لے کر وہیں اپنے دراز میں رکھ لیا۔ میں نے مکتبہ جدید والوں کو ''جلترنگ'' کا جو مسودہ دیا تھا وہ تو کھو چکا تھا اور میرے پاس اس کی کاپی بھی نہیں تھی۔ اس لئے جب انہیں پتا چلا کہ میرا ایک اور مسودہ منٹو صاحب کے پاس پڑا ہے تو انہوں نے پراسرار طور پر اسے وہاں سے غائب کروا دیا۔ منٹو صاحب بھی حیران تھے اور میں بھی کہ یہ مسودہ کہاں چلا گیا ہے کہ اچانک پتا چلا کہ وہ مسودہ ''جلترنگ'' کے نام سے مکتبہ جدید والوں کی طرف سے چھپ کر مارکیٹ میں آ گیا ہے۔ مسودے کو یوں بدلنا ایک بھونڈا طریقہ تھا' پھر بھی میں چپ ہو گیا لیکن مجھے طفیل صاحب سے بہت شرمندگی ہو رہی تھی کیونکہ میں ان سے قیمت وصول کر چکا تھا۔ اب میں انہیں وہ مسودہ کہاں سے دیتا اور وہ بھی سوچ سکتے تھے کہ شاید میں نے جھوٹ بول کر ان سے پیسے وصول کیے ہیں لیکن بدگمانی کی فضا اس لئے پیدا نہ ہوئی کہ میرے پاس کافی مواد پڑا تھا اور پھر میں اچھی رفتار سے لکھنے والا آدمی ہوں اس لئے میں نے اِدھر اُدھر سے کوشش کر کے انہیں ایک مجموعہ مکمل کر کے دیا۔ پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں میرا سب سے کمزور مجموعہ یہی تھا۔ اس میں بہت کمزور کلام تھا کیونکہ میں نے محض ایک فرض نبھانے کے لئے اور اپنی ساکھ رکھنے کے لئے انہیں یہ بندوبست کر کے دیا تھا۔ اس کے بعد بھی

طفیل صاحب سے میرے تعلقات چلتے رہے۔

میں پاکستان رائٹرز گلڈ کے مغربی ریجن کا دو بار سیکرٹری چنا گیا۔ ہم ایک ہی ٹیم بنا کر چل رہے تھے کہ دوسرے الیکشن کے دوران مجھے پتا چلا کہ وہ در پردہ میرے مقابل آنا چاہتے ہیں۔ نجانے ان کے ذہن میں یہ بات کیسے آ گئی تھی کہ وہ گلڈ پر قبضہ کر لیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کھڑا ہونا چاہتے ہیں تو کہنے لگے کہ بالکل نہیں اور یہ بالکل غلط بات ہے۔ یہ بات کہنے والے مرتضیٰ برلاس تھے اور وہ بڑے معتبر آدمی تھے۔ مرتضیٰ برلاس ان دنوں گجرات میں اسسٹنٹ کمشنر لگے ہوئے تھے۔ طفیل صاحب کی عادت تھی کہ وہ جو کام بھی کرنا چاہتے تھے اس میں آخری حد تک جو حربہ بھی استعمال ہو سکتا تھا استعمال کر لیتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے سوچا کہ احسان دانش کا مرتضیٰ برلاس پر بہت اثر ہے اس لئے انہیں گجرات مرتضیٰ برلاس صاحب کے پاس بھیجا کہ وہ انہیں ووٹ دیں۔ برلاس صاحب بڑے اصول کے آدمی ہیں اور اگرچہ وہ احسان دانش کا بہت احترام کرتے تھے مگر وہ مجھ سے وعدہ کر چکے تھے اس لئے انہوں نے صاف کہہ دیا کہ میں قتیل صاحب سے ووٹ دینے کا وعدہ کر چکا ہوں۔

جب مجھے اس واقعہ کا برلاس صاحب کے ذریعے علم ہوا تو میں چوکنا ہو گیا کہ درون پردہ کچھ سازش ہو رہی ہے۔ تاہم ان سب باتوں کے باوجود میں ریجنل سیکرٹری کا الیکشن جیت گیا۔ الیکشن جیتنے کے بعد میں نے رضا کارانہ طور پر کہا کہ طفیل صاحب میرے پرانے ساتھی ہیں میں انہیں خازن تجویز کرتا ہوں چنانچہ یہ خازن بن گئے۔

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ میرے مقابلے میں کیوں کھڑا ہونا چاہتے تھے۔ حالانکہ ہمارے دوستانہ تعلقات تھے اگر وہ مجھے کہتے کہ میں سیکرٹری بننا چاہتا ہوں تو میں پیچھے ہٹ جاتا کیونکہ اس کام کی کون سی مجھے تنخواہ ملتی تھی جبکہ وقت بھی دینا پڑتا تھا۔ میرا تو یہ حال تھا کہ میرا کاروبار متاثر ہو رہا تھا۔ پھر گلڈ میں میں آتے ہی میں نے کچھ ایسی اصلاحات کر دی تھیں کہ اگر کوئی سیکرٹری بد دیانتی کرنا بھی چاہے تو نہ کر سکے۔ میں نے سگریٹ قطعاً بند کر دیئے تھے کیونکہ اگر گلڈ کے کھاتے سے دو پیکٹ بھی نکالے جاتے تو اچھے خاصے پیسے بنتے تھے۔ اسی طرح میں نے کھانے کا بھی منع کر دیا ہوا تھا۔ صرف چائے کی اجازت تھی۔ اب

باہر سے جو لوگ آتے تھے ان سے میرے دوستانہ تعلقات ہوتے تھے جس وجہ سے کھانے وغیرہ کے اخراجات مجھے اپنی جیب سے ادا کرنا پڑتے تھے۔ اس لئے مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ الیکشن کے چکر میں کیوں پڑنا چاہتے ہیں۔

خیر جب اگلے الیکشن آئے تو دستور کے مطابق صورتحال یہ تھی کہ کوئی شخص دو ٹرم کے بعد اسی عہدے کے لئے الیکشن نہیں لڑ سکتا البتہ وہ سیکرٹری جنرل کے لئے الیکشن لڑ سکتا تھا۔ چنانچہ میں سیکرٹری جنرل کے الیکشن کے لئے امیدوار کھڑا ہو گیا۔ اس بار طفیل صاحب بھی کھل کر سامنے آ گئے اور کہنے لگے کہ یار دوستانہ مشغلہ ہے اس لئے چلو الیکشن لڑتے ہیں ویسے بھی مجھے کون ووٹ دے گا۔ ان کا اندازِ کلام ایسا ہی تھا لیکن میں نے اور دوسرے دوستوں نے دیکھا کہ انہوں نے یہ الیکشن پارلیمنٹ کا الیکشن سمجھ کر لڑا وہ اور ان کے آدمی ہر جگہ بذریعہ ہوائی جہاز پہنچے اور وہاں کے ہر بڑے آدمی سے سفارشیں کروائیں۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے اس وقت کے گورنر' ایم این اے صاحبان اور لوگوں کے لواحقین کے ذریعے انہیں کہلوایا۔ کراچی کا ایک گروپ میرے حلیفوں میں سے تھا' آخری دن دیکھا کہ وہ تین چار آدمی بھی ٹوٹے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ مجھے اور سلطان رشک کو پتا چل گیا تھا کہ ہم ہار جائیں گے اور میں نے سلطان رشک کو کہا بھی کہ آپ ووٹ دینے کے لئے نہ آئیں کیونکہ ان کی لابی بہت مضبوط ہو چکی ہے اور ہم ہار جائیں گے مگر انہوں نے کہا کہ میں آ کر ووٹ تو ضرور دوں گا باقی بعد میں دیکھا جائے گا۔ چنانچہ وہ پنڈی سے آئے اور ووٹ دے کر کراچی رخصت ہو گئے۔ اس طرح میرے دیگر ساتھیوں نے بھی میرا ساتھ دیا اور ان میں سے کسی نے بھی مجھے دھوکا نہیں دیا۔ باقی سودے بازی میں کر نہیں سکتا تھا جبکہ طفیل صاحب کے ہاتھ میں سودے بازی آ گئی تھی جو کہ پلاٹوں کی الاٹمنٹ تھی۔ یہاں ایک صاحبہ ہیں مس صدیقی جو ''تحریریں'' رسالہ نکالتی ہیں۔ ان کا محض ایک ووٹ لینے کے لئے یہ سودے بازی ہوئی کہ ان کو اور ان کے بھائیوں کو چھ پلاٹ دیئے گئے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ صرف دو ووٹوں سے مجھ سے جیت گئے لیکن میں نے سپورٹس مین سپرٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ طفیل صاحب اگرچہ میں ہار گیا ہوں لیکن میرا پورا تعاون آپ کے ساتھ ہوگا۔ اگر آپ کوئی اچھا کام کریں گے تو داد لیں گے اور اگر برا کام کریں گے تو

لوگ آپ کے گریبان میں ہاتھ ڈالیں گے۔

بعد میں آ کر جب ہماری رنجش دور ہوئی تو میری ایک کتاب کے دیباچے میں انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ الیکشن ہارنے کے باوجود قتیل صاحب نے میرے ساتھ وہ کچھ نہیں کیا جو ہارے ہوئے لوگ کرتے ہیں بلکہ مجھے کام کرنے دیا۔ اس طرح وہ پوری طرح کام کرتے رہے اور انہوں نے جو کام کیے ان میں کچھ اچھے کاموں کے علاوہ کچھ کمزور کام بھی تھے۔ جن میں سب سے برا کام یہ تھا کہ وہ گلڈ اور گلڈ ٹرسٹ کی جائیداد اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے تھے' اور یہ بھی چاہتے تھے کہ ان کے بعد ایک ایسا نیا آدمی سیکرٹری جنرل کے عہدے پر آئے جو ان کے بس کا ہو۔

دستور کے مطابق طریق کار یہ تھا کہ ہر بار ایک دوسرے صوبے سے سیکرٹری جنرل لینا ہوتا تھا اور اس کے بار صوبہ سرحد کی باری تھی۔ وہاں فارغ بخاری جیسا نامور آدمی کھڑا ہوا تو طفیل صاحب نے پشتو کے ایک ادیب میاں سید رسول رسا کو کھڑا کر دیا اور پوری سرکاری مدد دلوا کر انہیں کامیاب کروا دیا۔ دراصل انہوں نے دائیں اور بائیں بازو کا چکر بنا لیا تھا اور موجودہ حالات میں جسے بھی گرانا ہو اسے کمیونسٹ اور سرخا کہہ دیا جائے اور مد مقابل کو عاشق رسول کہہ دیا جائے تو کام بن جاتا ہے یہی یہاں ہوا چنانچہ وہ عاشق رسولؐ جیت گئے اور جیتنے کے بعد تلاش کرنے کے باوجود چار سال سے زائد کا عرصہ گزر گیا ہے مگر وہ نظر نہیں آئے۔ اس طرح ایک تو گلڈ کے الیکشن نہیں ہو رہے اور یہ ایک مردہ گھوڑا بن کر رہ گئی ہے دوسرے لوگوں نے ڈھنڈورے پیٹے کہ سیکرٹری جنرل کہاں ہیں؟ پشاور والوں کو بھی آج تک ان کی شکل نظر نہیں آئی۔

وہ رائٹرز گلڈ جسے قدرت اللہ شہاب' جمیل الدین عالی' سید وقار عظیم اور میں نے اپنا خون دے کر ان لائنوں پر چلایا تھا کہ یہ ہر قسم کے ازم اور دائیں بائیں بازو کے جھگڑوں سے ہٹ کر ایک ٹریڈ یونین کی حیثیت اختیار کر رہی تھی۔ وہ آخر کار ذاتی مفادات کی بھینٹ چڑھ گئی اور آج یہ پتا نہیں چلتا ہے کہ گلڈ یہاں کہاں ہے۔ جب لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اس کی کوئی ضرورت ہے بھی یا نہیں تو میں کہتا ہوں کہ ان سے جا کر پوچھیے جنہوں نے اس کا حشر کیا۔

سہرا پڑھنے کی مجبوری

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ لوگ شاعروں کے پیچھے بہت بھاگتے ہیں اور ان کی منت سماجت کرتے ہیں کہ آپ کے بغیر مشاعرہ نہیں ہوگا اور جب تک آپ ہاں نہیں کریں گے ہم تاریخ مقرر نہیں کریں گے' ہر شاعر کے ساتھ یہی ہوتا ہے اور بعض اوقات وہی چیز جب دوسرے روپ میں سامنے آتی ہے تو بڑے مزے کی چیز بن جاتی ہے۔ یہ 1950-51ء بات ہے کہ مکتبہ جدید والے پبلشر کا میرے گھر میں فون آیا کہ چنیوٹ میں شیخ برادری نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اصلاح رسوم کی مہم چلائیں گے اور اپنی غمی اور خوشی میں کوئی ایسا کام نہیں کریں گے جو بدعت' عیاشی یا لہو ولعب کی ذیل میں آتا ہے ہو۔ چنانچہ ان کی اصلاح رسوم کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کام کا آغاز ایک شادی سے کریں گے جس میں بجائے اس کے کہ کوئی اور برے کام کیے جائیں انہوں نے ایک مشاعرہ رکھا ہے۔ اس میں یہاں سے تین شاعر شامل ہونے چاہئیں اور اگر آپ یہ انتظام کر دیں تو وہاں سے کچھ لوکل شعرا بھی شریک ہو جائیں گے اور یوں مشاعرہ ہو جائے گا۔ میں نے کہا اچھی بات ہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ پیسے کی فکر نہ کریں۔ کل ان کی گاڑی آ جائے گی۔ ساتھ ان کا آدمی بھی ہوگا۔ آپ مجھے پیسے بتا دیجئے۔ اس زمانے میں سینئر شاعروں کے لئے زیادہ سے زیادہ دو سو روپے اور دیگر شعراء کے لئے سو ڈیڑھ سو روپے معاوضہ ہوتا ہے۔ میں نے سوچا کہ اتنے بڑے لوگ ہیں اس لئے کہا کہ آپ شاعروں کے تین تین سو روپے رکھ دیجئے۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے وہ آدمی ایک ہزار روپے لے کر آ جائے گا۔ تین تین سو روپے

ان دو شاعروں کے ہوں گے اور چار سو روپیہ آپ کا ہوگا۔

اب مجھے شاعروں کو تلاش کرنا تھا۔ یہ شام کا وقت تھا اور ہمیں اگلے دن وہاں جانا تھا۔ رات تو خیر میں بندوبست نہ کر سکا۔ اگلے دن میں جس شاعر کے گھر بھی گیا وہ نہ ملا۔ آخر کار ہمارے ایک دوست نظر امروہوی جو آجکل کراچی میں ہیں' وہ مل گئے۔ میں نے انہیں ساری بات بتائی وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ تو بڑی خوشخبری لے کر آئے ہیں۔ نظر امروہوی سے وعدہ لینے کے بعد ایک اور کسی شاعر کو لینا چاہا تو وہ نہ مل سکا میں نے مزید تلاش چھوڑ کر گھر آ گیا کیونکہ ان صاحب کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد دیکھا کہ ایک لمبی گاڑی آئی ہے جس میں شربت کی بوتلیں' برف' سگریٹ کے پیکٹ اور پان وغیرہ رکھے ہوئے ہیں۔ ترکی ٹوپی اور شیروانی پہنے ہوئے ایک شخص جو منشی لگتا تھا' بڑے مؤدبانہ انداز سے ملا اور کہنے لگا آیئے شاعر صاحبان تشریف رکھئے' ہم بیٹھ گئے اس نے ہمیں شربت کا ایک ایک گلاس پلایا اور پھر ہم سفر پر روانہ ہو گئے۔ راستے میں اس نے کہیں سے پھل بھی خرید لیا اور ہماری خوب خاطر مدارات کی۔

جب ہم چنیوٹ پہنچے تو اس وقت شام کے تقریباً پانچ بجے تھے۔ انہوں نے ہمیں ایک ٹھنڈے کمرے میں بٹھایا اور اتنے میں لوگ آنے شروع ہو گئے۔ بہت سے لوگ جمع ہو گئے تو پتا چلا کہ شادی کا سلسلہ ہے۔ اب وہی ٹوپی والے صاحب تشریف لائے اور کہنے لگے چلیے شاعر صاحبان آپ بھی ساتھ شریک ہوں۔ ہم ان کے ساتھ ہو لئے۔ اسی دوران وہ تین شاعروں کے پیسے دے چکے تھے جبکہ ہم تو دو صاحبان جا رہے تھے۔ بہر حال انہیں اس چیز کا قطعاً خیال نہیں تھا کہ ہم دو افراد جا رہے ہیں۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ کچھ شیخ صاحبان بھی بیٹھے ہیں جن کے درمیان لاکھوں کی باتیں ہو رہی تھیں۔

ہم یہ باتیں سن ہی رہے تھے کہ اتنے میں وہی ٹوپی والے صاحب وہاں آئے۔ جونہی نکاح کی رسم ہوئی اور مولوی صاحب نکاح پڑھا چکے تو وہ ٹوپی والے صاحب ہمیں کہنے لگے شاعر صاحبان اپنا کام شروع کریں۔ میں نے کہا جی کونسا کام؟ کہنے لگے کہ آپ کو جو سہرے پڑھنے ہیں وہ شروع کیجئے۔ مجھے تو چکر آ گیا اور سمجھ نہ آئی کہ کیا

کروں۔ میرے کان یکدم گرم ہو گئے جیسے بلڈ پریشر ہو گیا ہو۔ میں نے نظر امروہوی کی طرف دیکھا اور کہا کہ ہے کوئی۔ اس نے جواباً کہا: ہاں بھیا اور کان پر ہاتھ رکھ کر پڑھنا شروع کر دیا ''مالی نے بنایا سہرا'' میں نے نیچے سے کہا کہ میری طرف سے بھی ایک پڑھ دو اور کہہ دو کہ میرے ساتھی کو بخار ہو گیا ہے۔ اس نے کہا کہ میرے ساتھی قتیل شفائی صاحب کو بخار ہو گیا ہے لیکن اس کی طرف تو کوئی متوجہ تھا ہی نہیں چنانچہ اس نے میری طرف سے دوسرا سہرا بھی پڑھ دیا۔ اسے کسی نے سنا نہ پروا کی۔

اسی دوران مجھے بخار ہو گیا۔ چھوہارے سامنے پڑے تھے اور کھسیانی بلی چھوہارا نوچے والا حال تھا۔ اس کے بعد کچھ لڑکے وہاں آئے تو انہوں نے مجھے پہچان لیا اور پوچھنے لگے کہ آپ کیسے شادی میں آئے۔ پھر پوچھا کہ سہرا پڑھنے کے لئے آئے ہیں؟ تو میں نے کہا نہیں یار ہمیں تو کہا گیا تھا کہ یہاں کوئی مشاعرہ ہے اور ہمیں یہاں آ کر پتا چلا کہ ہمیں تو سہرے پڑھنے کے لئے بلایا گیا ہے۔ بہر حال سہرے بھی پڑھے گئے ہیں وہ بہت ہنسے اور انہیں ہم پر بہت ترس آیا۔ انہوں نے وہاں کے ایک مقامی سکول میں میری صدارت میں رات کو ایک مشاعرے کا انتظام کیا جس میں بیس پچیس طلباء شریک ہوئے۔

اسپرین کی گولیاں کھا کر بخار کو کم کیا لیکن رات کو مجھے نیند نہ آئی۔ صبح ہوئی تو ایک اور صاحب آئے اور ہاتھ باندھ کر کہنے لگے شاعر صاحبان لائل پور میں بھی ایک شادی ہے' اس میں بھی آپ تشریف لے جایئے۔ بڑی مہربانی ہوگی۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ نظر بولا ضرور چلیں گے بھیا۔ آپ ہمیں ایک ہزار روپے دے دیں گے۔ ان صاحب نے کہ جی آپ ڈیڑھ ہزار روپے لے لیں۔ میں پھر بولنے ہی والا تھا کہ نظر نے مجھے روک دیا۔ اس آدمی نے جیب سے ایک ہزار روپیہ نکال کر ادا کیا اور کہا کہ تھوڑی دیر کے بعد ہم یہاں سے رخصت ہوں گے اور کھانا وہیں چل کر کھائیں گے۔ وہ چلا گیا تو میں نے کہا: ''نظر صاحب یہ آپ نے کیا کیا ہے میں تو اس صدمے سے پہلے ہی رات سے بیمار پڑا ہوں اور آپ نے ایک اور وعدہ کر لیا ہے''۔ وہ کہنے لگے۔ گھبرایئے نہیں وہاں بھی وہی کام کریں گے جو یہاں کیا ہے۔ آپ کو کیا ہے آپ اس میں سے پیسے لیجئے۔ چنانچہ ہم اس

بارات کے ساتھ جب لائل پور پہنچے تو میں نے نظر سے کہا کہ بھائی میں تو یہاں آ کر غریب اخبار کے دفتر جا رہا ہوں جس کے مالک ریاست علی آزاد میرے دوست ہیں۔ وہاں سے میں شاید اخبار عوام کے ایڈیٹر خلیق قریشی صاحب کے پاس جاؤں۔ تم مجھے دونوں جگہ چیک کر لینا۔ چنانچہ میں اپنے دوستوں کی طرف چلا گیا۔ دو تین گھنٹے کے بعد نظر صاحب واپس آئے تو بہت خوش تھے میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ میں سہرے پڑھ آیا ہوں۔ میں نے کہا کسی نے میرا تو نہیں پوچھا۔ کہنے لگے کہ کسی کو پتا ہی نہیں۔ مجھے جب سہرے پڑھنے کے لئے کہا گیا تو میں نے کہا کہ میرے دوسرے ساتھی کو بخار ہے اور کھڑے ہو کر دو سہرے پڑھ دیئے۔

شاعروں کے ساتھ جو سلوک ہو جاتے ہیں ان سے متعلق ایک واقعہ ملتان کا ہے۔ ایک بار ایک صاحب جن کا نام غالباً گل حمید تھا لاہور میں آئے۔ وہ یہاں آنے سے پہلے خط و کتابت بھی کر چکے تھے۔ کہنے لگے کہ ملتان میں ایک کل پاکستان مشاعرہ ہے۔ جس نے جو مطالبہ کیا انہوں نے تسلیم کر لیا۔ چنانچہ ٹھاٹھ کا مشاعرہ ہوا اور اس میں پاکستان بھر کے سرکردہ شعراء شامل ہوئے۔ دوسرے شعراء تو دیگر مختلف جگہوں پر ٹھہرے ہوئے تھے البتہ فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز اور میں اپنے دوست اور مشہور لیڈر قصور گردیزی کے ہاں مقیم تھے۔ عام طریقہ تو یہ ہے کہ مشاعرہ ختم ہوتے ہی شعرائے کرام کو فارغ کر دیا جاتا ہے تا کہ اگر کسی کو واپس جانا ہے تو وہ چلا جائے لیکن اس مشاعرے کے منتظمین نے کہا کہ ہم صبح ناشتے کے بعد سلام کے لئے آئیں گے اور آپ کو رخصت کریں گے۔ دوسرے دن ناشتے کے بعد سورج سر پر آنے لگا تو سب کو تشویش ہوئی۔ پتا چلا کہ منتظمین اپنا پیسہ سمیٹ کر روپوش ہو چکے ہیں۔ قصور گردیزی صاحب نے کہا کہ یہ میرا شہر ہے اور میں انہیں تلاش کرواتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آدمی بھیجے جو اس شخص کو ڈھونڈ کر لے آئے۔ وہ بظاہر بڑا نادم تھا اور ایک پوٹلی جس میں سونے چاندی کے زیورات تھے وہ ہمارے سامنے رکھ کر کہنے لگا۔ یہ میری بیوی کے زیورات ہیں آپ نہیں بیچ کر اپنے پیسے پورے کر لیں کیونکہ مجھے تو سخت نقصان ہو گیا ہے۔ گیٹ منی میں بھی کچھ نہیں ملا اور پتہ نہیں اب ہوٹل کا

خرچ بھی کیسے دوں گا۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ بناوٹ کر رہا ہے لیکن جب وہ اخلاقیات میں اتنا نیچے آ گیا تو ہم نے اس پر زیادہ دباؤ ڈالنا بھی مناسب نہیں سمجھا اور کہا کہ چھوڑیئے ہم خود ہی کچھ اہتمام کر لیں گے اور اسے بھیج دیا۔ اب اپنی جیبیں ٹٹولیں تو کرائے کے لئے تو پیسے تھے لیکن بیویوں نے ملتان سے مجنوں کھیس اور اسی طرح کی دوسری چیزیں لانے کی جو فرمائشیں کر رکھی تھیں وہ ہم قصور صاحب سے قرض لے کر خرید کر لائے۔ جب ہم باہر نکلے تو اس طرف سے بھی گزرے جہاں رات مشاعرہ تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ شامیانے اکٹھے ہوئے پڑے ہیں اور ان پر بابا عالم سیاہ پوش بیٹھے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ رہے ہیں۔ ہم رکے اور پوچھا کہ بابا جی کیا کر رہے ہیں۔ بابا عالم پنجابی کے شاعر تھے اور فلموں میں بھی ان کے طنزیہ اور مزاحیہ انداز کے کلام کی وجہ سے اچھا خاصا نام تھا۔ رات بہت چھک رہے تھے اور منتظمین سے کہہ رہے تھے کہ ہمارے لئے بستر لگاؤ' ہم پرہیز کا کھانا کھاتے ہیں اس لئے ہمارے لئے فلاں چیز لاؤ وغیرہ۔ مگر اس وقت وہ شامیانوں کے ڈھیر کے اوپر عبرت کا ساماں بنے بیٹھے تھے۔ جب ہم نے پوچھا کہ یہاں کیوں بیٹھے ہیں تو کہنے لگے کہ وہ شامیانے واپس کرنے آئے گا تو میں اسے پکڑ لوں گا۔ میں نے کہا کہ وہ جیسے ہم سے بھاگا ہوا ہے اسی طرح شامیانے والوں سے بھی بھاگا ہوا ہو گا۔ اس لئے آپ یہاں سے اٹھ کر چلے جائیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ٹینٹ والے آپ کو منتظمین مشاعرہ میں سے سمجھ کر پکڑ کر نہ لے جائیں۔ یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی اور وہ وہاں سے اٹھ گئے۔ تو شاعروں کے ساتھ کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔

لوگ مشاعرے والوں کو کس کس طرح دھوکا دیتے ہیں اس کا ایک واقعہ آپ کو سناتا ہوں۔ ایک مشاعرے میں کوئی شخص مجھ سے آٹوگراف لینے کے لئے آیا' جگہ تو اب یاد نہیں۔ میں نے جلدی میں شعر بھی نہیں لکھا اور سادے کاغذ پر دستخط کر دیئے۔ انہوں نے بعد میں اس سادہ کاغذ کے اوپر منتظمین کے نام یہ عبارت لکھی کہ یہ میرے دوست ہیں انہیں آٹھ پاس دے دیجئے۔ اس طرح انہوں نے آٹھ پاس حاصل کر لیے۔ آٹوگراف ہی کے سلسلے کا ایک لطیفہ یہ بھی ہے کہ ہمارے جھنگ کے ایک شاعر محکمہ راشننگ میں کام کرتے

تھے۔ ایک دفعہ کسی مشاعرے میں ہجوم میں کوئی شخص ان کے پاس آیا اور آٹو گراف مانگا انہوں نے جلدی سے سفید کاغذ پر دستخط کر دیئے اور ساتھ یہ بھی کہا کہ آپ بڑے باذوق آدمی نظر آ رہے ہیں جو آٹو گراف لینے کے لئے آئے ہیں۔ بعد میں پتا چلا کہ اس شخص نے اوپر درخواست لکھ کر دو من چینی نکلوالی۔

شاعروں کے ساتھ مشاعرے والوں کے سلوک اور مشاعرے والوں کے ساتھ شاعروں کے سلوک کی داستانیں تو اپنی جگہ ہیں مگر شاعر کے ساتھ شاعر کے پیار اور پیار ہی پیار میں لڑائی کے بھی بہت سے واقعات ہیں۔ ان میں سے ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ میں جب فلم ''ادھورے خواب'' کے سلسلے میں سال 1947ء کے آغاز میں لاہور آیا تو فلم پروڈکشن کی طرف سے مجھے رتن سینما کے سامنے یونیورسل ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ اس زمانے میں شاعروں میں شراب نوشی عام تھی اور شراب پر پابندی بھی نہیں تھی۔ انگریز کی حکومت تھی۔ مجھے اچھے خاصے پیسے ملتے تھے اور میں رہتا بھی اکیلا ہی تھا۔ چنانچہ میرے پینے پلانے والے دوست اکثر میرے پاس آ جاتے تھے اور کبھی تو اپنی بوتل ساتھ لے آتے تھے اور کبھی مجھ سے فرمائش کر دیتے تھے۔ قریب ہی ایک پارسی خاتون کا بار تھا جہاں سے میں بوتل منگوا کر ان کی تواضع کر دیتا تھا۔ یہاں ایک دن میرے پاس مجید لاہوری اور سید عبدالحمید عدم بھی آ گئے۔ کہنے لگے کہ یار آج بڑی مدت کے بعد تمہارے ساتھ نشست ہو گی تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔ میں نے کہا ہرگز نہیں بلکہ میرے لئے تو یہ خوشی کی بات ہے۔ میرے پاس سنگل روم تھا جس میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے وہاں پر ایک بستر مہمانوں کے لئے رکھا ہوا تھا۔ میں نے یہ فالتو بستر انہیں قالین پر بچھا کر دے دیا کہ یہ تقریباً آٹھ بجے شام کو آئے تھے اور پیتے پلاتے جب تقریباً رات کے ایک بجے تو میں ان سے اجازت لے کر سو گیا۔ جب میں بستر پر دراز ہوا تو یہ آپس میں بڑی میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے اور عدم صاحب کہہ رہے تھے۔ مجید صاحب! اکبر الہ آبادی کے بعد اگر کسی نے مزاحیہ شاعری کی ہے تو وہ صرف آپ ہیں۔ آپ کا کوئی جواب نہیں۔ مجید صاحب نے جواب میں کہا کہ عدم صاحب کیوں کانٹوں پر گھسیٹتے ہیں۔ آپ اپنا

انداز بھی تو دیکھئے نا۔ ریاض خیرآبادی کے بعد اگر کسی نے خمریاتی شاعری کی ہے تو وہ صرف عدم ہے۔ بلکہ مجھے تو بعض مقامات پر آپ ریاض خیرآبادی سے بھی بہت آگے نظر آتے ہیں۔ انہی پیار بھری باتوں کے دوران میری آنکھ لگ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اونچی اونچی آواز آئی تو میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو دونوں غصے میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے۔ عدم صاحب کہہ رہے تھے کہ مجید لاہوری تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو۔ تمہاری شاعری میں تو کچھ نہیں۔ تم تو اپنا موٹا جسم دکھا کر لوگوں کو ہنسا لیتے ہو ورنہ تمہارے پاس کیا ہے۔ مجید لاہوری نے آگے سے کہا بکواس بند کرو۔ تم جو ریاض خیرآبادی کی نقل مارتے ہو اگر وہ چھوڑ دو تو تمہارے پاس کیا رہ جاتا ہے۔ بچوں کی واہیات سی زبان استعمال کرتے ہو۔ میں نے مداخلت کی اور کہا کہ بزرگو آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ ابھی تو آپ آپس میں بڑی اچھی باتیں کر رہے تھے اور اب آپ نے جھگڑنا شروع کر دیا ہے۔ عدم صاحب کہنے لگے کہ یہ موٹا مجھ سے ایسا کہتا ہے۔ جواب میں مجید لاہوری نے بھی کہا کہ یہ مجھے ایسا کہتا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ جو کام کر رہے ہیں خدا کے لئے وہی کرتے رہیے اور آپس میں جھگڑا نہ کیجئے کیونکہ ساتھ والے کمروں میں آواز جائے گی تو وہ لوگ کیا کہیں گے۔ میں تو یہاں بہت شرافت سے رہ رہا ہوں۔ دونوں مجھے کہنے لگے اچھا اچھا اب آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ آپ سو جایئے۔ چنانچہ میں سو گیا۔ ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ پھر شور ہوا جس سے میری آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دونوں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ میں نے اٹھ کر چھڑانے کی کوشش کی تو مجھے کہنے لگے کہ اسے یہاں سے نکال دیجئے۔ دوسرے نے بھی کہا کہ نہیں اسے یہاں سے نکال دیجئے کیونکہ میں آپ کا پہلے سے دوست ہوں۔ دونوں طرف سے اسی طرح کے دعوے ہو رہے تھے۔ میں نے کہا کہ آپ دونوں یہاں بیٹھیں میں یہاں سے نکل جاتا ہوں۔ اس وقت پو پھٹی ہوئی تھی۔ میں واقعی نکل گیا اور یہ بھی میرے پیچھے نکل آئے۔ جب باہر سڑک پر پہنچے تو میں نے کہا خدا حافظ اب آپ جایئے اور میں جا کر سونے کی کوشش کرتا ہوں۔

سید عبدالحمید عدمؔ

سید عبدالحمید عدم فطرتاً اور حقیقتاً بڑے معصوم آدمی تھے۔ میں نے کبھی کوئی ان سے بڑا معصوم آدمی نہیں دیکھا۔ اگرچہ ان کے بارے میں کچھ داستانیں بنی ہوئی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ جب دفتر سے تنخواہ لے کر نکلتے تو دو چار دن کے بعد گھر اس وقت پہنچتے جب ساری تنخواہ ختم ہو چکی ہوتی۔ وہ ملٹری اکاؤنٹس کے محکمہ میں ڈپٹی اسسٹنٹ کنٹرولر تھے اور اس سے آگے ترقی اس لئے نہیں چاہتے تھے کہ ان کا کہنا تھا کہ جتنا کام ہو سکتا ہے صرف اتنا ہی کروں گا۔ جب ان کا تنخواہ کے بارے میں یہ رویہ جاری رہا تو ان کے بچوں نے کوشش کر کے آدھی تنخواہ خود وصول کرنا شروع کر دی تھی جو انہیں گھر پہنچ جاتی تھی۔

لوگ عدم صاحب سے ان کی تنخواہ کھا پی جاتے تھے۔ چنانچہ جب ان کے پاس کوئی پیسہ نہ بچتا تو چونکہ وہ نامور آدمی تھے اور لوگ لحاظ کرتے تھے اس لئے ان کے بیوی بچے یا دوست ان کے نام پر قرض لے کر خرچ کر لیتے تھے جس سے بدنامی عدم صاحب کی ہوتی تھی

جہاں اب لاہور ہوٹل گرایا جا رہا ہے' اس کے ساتھ ایک کوٹھی تھی جس میں کئی پورشن تھے اور اس کے ایک پورشن میں ہمارے دوست شاد امرتسری رہتے تھے اور ان دنوں غالباً کسی کالج میں پڑھاتے تھے۔ بعد میں وہ ریڈیو میں پروڈیوسر ہو گئے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ میرے پاس علی الصبح ایک آدمی میرے ہوٹل میں آیا۔ وہاں سے میرے ہوٹل کا فاصلہ بمشکل ایک فرلانگ تھا۔ اس نے مجھے آ کر کہا کہ جلدی اٹھئے عدم صاحب شدید زخمی ہیں اور

شادامرتسری کے کمرے میں پڑے ہیں اور شاد صاحب انہیں چھوڑ کر کالج پڑھانے کے لئے چلے گئے ہیں۔ میں بھاگا بھاگا وہاں پہنچا تو دیکھا کہ عدم صاحب بستر پر لیٹے ہیں۔ ان کے ایک جبڑے کے اوپر کا گوشت اڑا ہوا ہے اور ایک آنکھ سوجھی ہوئی ہے۔ عدم صاحب کراہ رہے تھے میں نے پوچھا کہ عدم صاحب کیا ہو گیا ہے۔ کہنے لگے کہ وہ الطاف مشہدی ہے' ناحرامزادہ۔ وہ اور میں رات انارکلی میں رائل ہوٹل کی اوپر والی منزل پر بیٹھے تھے۔ اس نے کہا کہ:

پتا بھی نہیں ہلتا بغیر اس کی رضا کے

میں نے کہا کہ ہلتا ہے اور بغیر اس کی رضا کے ہلتا ہے۔ وہ پھر بھی بضد رہا کہ ہلتا ہے اور میں نے کہا کہ نہیں ہلتا پھر اس نے کہا کہ حرامزادے کیوں بکواس کرتے ہو۔ نہیں ہلتا' میں نے کہا کہ تم غلط کہتے ہو اور تم جو ثبوت چاہو میں دے سکتا ہوں۔ کہنے لگا مثلاً زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک اس کی مرضی نہیں مر سکتے۔ میں نے کہا میری مرضی ہو تو میں ابھی مر سکتا ہوں۔ کہنے لگا مر کے دکھاؤ چنانچہ میں نے اوپر سے چھلانگ لگا دی۔ ان کا تکیہ کلام حضور تھا۔ کہنے لگے حضور! میں نے چھلانگ لگائی تو نیچے ایک چھجا تھا پہلے میں اس پر لگا اور پھر زمین پر گرا۔ وہ تو مجھے وہیں چھوڑ کر چلا گیا اور کسی نے مجھے اٹھا کر یہاں پہنچا دیا ہے۔ میں نے کہا آپ فکر نہ کیجئے میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔ کہنے لگے نہیں حضور ڈاکٹر کو چھوڑیئے۔ میں نے تو آپ کو اس لئے بلایا ہے کہ آپ کے پاس وسکی کا کوئی کوارٹر پڑا ہو گا۔ میں نے کہا عدم صاحب وسکی تو آتی رہے گی سب سے پہلے تو آپ کا علاج ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی ایک ہندو ڈاکٹر رہتا تھا میں نے اسی لڑکے کو بھیج کر جو مجھے بلانے کے لئے آیا تھا ڈاکٹر کو بلایا اور انہیں فرسٹ ایڈ دی۔ اور پھر ان کے مطالبے کے مطابق کوارٹر کا بھی انتظام کیا اور آخر کار انہیں ایک آدمی کے ساتھ تانگے میں بٹھا کر فتح گڑھ روانہ کیا جہاں یہ ان دنوں رہتے تھے۔ بعد میں میں عدم صاحب کو پوچھا کرتا تھا کہ کیوں جی اس کی رضا کے بغیر پتا ہلتا ہے یا نہیں تو وہ میری بات سن کر ہنسا کرتے تھے۔

عدم صاحب ہی سے متعلق ایک اور واقعہ یہ بھی ہے کہ یہ تقسیم کے تھوڑی دیر بعد

راولپنڈی ٹرانسفر ہو گئے تھے اور وہاں جی ایچ کیو میں کام کرتے تھے۔ انہی دنوں میں نے راولپنڈی میں ایک سکھ دوست سے سٹیشنری کی دکان خریدی تھی اور کچھ دیر وہاں بیٹھتا بھی رہا۔ ایک دن صبح صبح میں نے دوکان کھولی ہی تھی کہ یہ وہاں آ گئے اور کہنے لگے۔ قتیل صاحب مبارک ہو۔ میں نے کہا کس بات کی۔ کہنے لگے مجھے ترقی مل گئی ہے۔ اس وقت انہیں ڈپٹی اسسٹنٹ کنٹرولر ملٹری اکاؤنٹس کی ترقی ملی تھی۔ کہنے لگے میں اس لباس میں بڑا افسر نظر آتا ہوں یا نہیں۔ میں نے کہا عدم صاحب آپ کی اپنی حیثیت ہے۔ آپ کو لوگ لباس سے تھوڑا ہی پہچانیں گے۔ کہنے لگے نہیں نہیں یہ پتلون بہت خراب ہے۔ آپ یوں کریں کہ میری پتلون آپ لے لیں اور اپنی پتلون مجھے دے دیں۔ میری پتلون بالکل نئی تھی جو میں نے بڑے شوق سے سلوائی تھی۔ اس لئے میں نے کہا عدم صاحب سائز کا بھی تو فرق ہے۔ کہنے لگے کوئی فرق نہیں آپ پتلون اتاریئے اور دے دیجئے۔ میں نے ان کی پتلون پہنی تو بہت کھلی تھی۔ میں نے اسے تہمند کی گانٹھ دے کر گزارا کیا اور جب انہوں نے میری پتلون پہنی تو وہ انہیں اتنی تنگ تھی کہ انہیں اوپر کے تین بٹن کھلے چھوڑنے پڑے۔ ہم دونوں ہی عجیب مضحکہ خیز نظر آ رہے تھے۔

میرے پبلشرز

کسی لکھنے والے کو اپنے آغاز ہی میں صاحب تصنیف بن جانے کا بڑا شوق ہوتا ہے جبکہ دیکھا جائے تو خاص پختگی کے زمانے میں ہی کوئی تصنیف لے کر میدان میں آنا چاہیے۔ لیکن بہر حال یہ ایک اضطرابی کیفیت ہوتی تھی۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ ہر مبتدی سوچتا ہے کہ میں صاحب تصنیف بن جاؤں۔ چنانچہ میں نے بھی سوچا کہ اب میری بھی ایک کتاب آ جانی چاہیے۔ اس زمانے میں بہاولپور میں ایک ادارہ تھا جس کا نام عباسیہ اکیڈمی تھی۔ اس کے مالک حیات ترین تھے جو میرے دوست بن گئے۔ وہ بہت اچھے انسان تھے اور ایک رسالہ ''ستلج'' بھی نکالتے تھے۔ میں ستلج میں باقاعدگی سے چھپتا تھا چنانچہ انہوں نے جب عباسیہ اکیڈمی سے پبلشنگ کا پروگرام بنایا تو خود مجھ سے کہا کہ آپ اپنی کوئی تصنیف مجھے دے دیں۔ ذہن میں تو پہلے سے ہی تھا اس لئے میں نے ان سے کہا کہ گیتوں کا مجموعہ چھاپ دیجئے۔

دوسو روپے معاوضہ طے پایا۔ لیکن میں بہر حال وہ خوش نصیب تھا جسے اپنی پہلی تصنیف پر ہی کچھ معاوضہ ملا۔ معاوضہ مجھے دے دیا گیا اور 1947ء ہی میں مجموعہ چھپ گیا۔ اگر اسے میرے بچپن کے گیتوں کا مجموعہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ مجموعہ ابھی تک چھپ رہا ہے اور اب اس کا آٹھواں ایڈیشن چھپنے والا ہے۔ اب اسے دیکھتا ہوں تو تھوڑی سی ہنسی بھی آتی ہے کہ میں نے کیا چیز چھپوا دی لیکن اس عمر کے اعتبار سے وہ بہر حال اچھے گیت تھے۔

اس مجموعے کے اور لاہور آنے کے بعد مکتبہ جدید نے مجھ سے ایک مجموعے ''جلترنگ'' کا معاہدہ کیا اور اس کے پانچ سو روپے طے پائے۔ پھر نیا ادارہ نے میرا مجموعہ ''گجر'' لیا اور اس کے بھی پانچ سو روپے طے پائے۔ اس کے بعد محمد طفیل صاحب نے مجموعہ ''روزن'' لیا تو اس کے بھی پانچ سو روپے طے پائے یہ سب معاوضے یکمشت کے حساب سے چل رہے تھے۔

اس زمانے میں کسی مصنف کو معاوضہ مل جانا بڑی بات تھی۔ ایک مصنف اور ایک پبلشر کا واقعہ مشہور ہے کہ مصنف پبلشر کے پاس گیا اور کہنے لگا۔ یہ پیسے لیجئے اور معاہدہ منسوخ کر دیجئے۔ پبلشر نے کہا اچھا تو اور پیسے دوں اور پیسے دینے کی بجائے اسے تھپڑ دے مارا۔ یہ کتنا افسوسناک واقعہ ہے۔

اس زمانے میں اندرون لوہاری گیٹ وغیرہ میں بھی پبلشر ہوا کرتے تھے جو مسودے کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کے نفس مضمون یا اس کی ادبی قدر سے نہیں بلکہ ہاتھ پر تول کر کرتے تھے۔ بہر حال اس پیشے میں شروع سے وہ لوگ زیادہ رہے ہیں جن کا مسئلہ ادب کی ترویج و اشاعت نہیں تھا بلکہ پیسے کمانا تھا۔ وہ ہمیشہ ایسا ادب چھاپتے تھے جس سے ان کو آمدن ہو جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ پبلشر بڑے نفاست پسند بھی تھے۔

ایک نام لیتے ہوئے مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ یہ نام چودھری نذیر احمد کا ہے جو پہلے اپنے چچا چودھری برکت علی کے ساتھ مکتبہ جدید سے وابستہ تھے لیکن بعد میں انہوں نے نیا ادارہ کے نام سے اپنا علیحدہ ادارہ قائم کیا اور پرچہ ''سویرا'' نکلا۔ یہ صاحب انتہائی طور پر کاروباری ذہن رکھتے ہوئے بھی کتاب کی چھپائی اور نفاست کے معاملے میں اتنے محتاط تھے کہ جب کاغذ لاتے تو کاغذ کی ہر ایک شیٹ کو پرکھتے اور پھر لیتے اور کوئی کاغذ تھوڑا سا ناقص ہوتا تو اسے الگ کر دیتے۔ اس کے بعد جب کتابت کا مرحلہ آتا تو وہ چار چار بار پروف ریڈنگ کرواتے تھے۔ جب چھپائی کا وقت آتا تو پریس میں جا کر سنگساز کے ساتھ چائے وغیرہ لے کر بیٹھ جاتے۔ اس زمانے میں پتھر کا کام ہوتا تھا۔ آخر میں وہ جلد ساز کے پاس جا کر بھی خود بیٹھتے اور انہوں نے کتابوں کے جو پشتے بنوائے وہ آج بھی کسی کو

نصیب نہیں ہیں۔ یہ ان کا ذاتی ذوق تھا حالانکہ کتاب ویسے بھی بک سکتی تھی۔ اس لئے انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کو جی چاہتا ہے کہ ان کے بعد کئی سال تک ایسا پبلشر نہیں آیا۔

ایک چیز جس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے' کم ہے یا یہ کہ اس پیشے میں جتنے بھی لوگ آئے مصنف کے ساتھ ان میں سے بیشتر کا سلوک دیانتدارانہ نہیں تھا۔ اگر کوئی پبلشر ایک ہزار کا ایڈیشن چھاپ لیتا تھا تو وہ عام طور پر اس کی زندگی تک ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے بلکہ اب تو کچھ ایسا ہے کہ پبلشرز نے مصنف کا مال ہضم کرنے کی عجیب عجیب ترکیبیں نکال لی ہیں۔

یوں تو میں کئی پبلشرز کا ستایا ہوا ہوں لیکن میں ایک پبلشر کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔ یہ صاحب پہلے سرکاری ملازم تھے اور ملازمت ہی کے زمانے میں انہوں نے پبلشنگ کا کام شروع کر دیا تھا۔ پھر انہیں جب وہاں سے سروس چھوڑنا پڑی تو یہ کل وقتی پبلشر بن گئے۔ مجھ سے ان کے تعلقات بہت قریبی تھے اور یوں نظر آتا تھا جیسے ان سے زیادہ میرا کوئی اور ہمدرد یا دوست نہیں ہے۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ اپنی چھ سات کتابیں اشاعت کے لئے مجھے دے دیں۔ میں چھاپوں گا۔ گھر کا معاملہ ہے آپ کی کتابوں کی حفاظت بھی ہو جائے گی۔ اس زمانے میں میرے ایک بیٹے کی شادی ہو رہی تھی اور مجھے پیسوں کی سخت ضرورت تھی میں نے شادی کے باقی اخراجات کا انتظام تو کیا تھا لیکن ولیمے کی دعوت کے لئے میں نے سوچا تھا کہ جو رائلٹی ملے گی اس سے یہ خرچ کر لوں گا۔ اس لئے میں تمام انتظامات سے مطمئن ہو گیا تھا۔ جب شادی کا وقت قریب آیا تو انہوں نے ٹالنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ شادی میں صرف چار دن باقی رہ گئے تو انہوں نے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک معاہدہ میرے سامنے رکھ دیا اور ساتھ ہی نوٹوں کا ایک بنڈل بھی نکال کر رکھ دیا۔ یہ ایک نفسیاتی مار ہوتی ہے کہ پیسہ بھی سامنے رکھ دو اور ایک مشکل سا معاہدہ بھی سامنے رکھ دو تا کہ انسان اپنی مجبوری کی خاطر وہ معاوضہ قبول کر لے۔ اس میں لکھا تھا کہ یہ معاوضہ دو ایڈیشن کے لئے ہے اور تصور کر لیا گیا تھا کہ ایک کتاب کی قیمت بیس روپے ہو گی۔ چنانچہ

بیس روپے کے حساب سے سات کتابوں کا معاوضہ فرض کر کے پیسے بنائے گئے تھے۔ میں نے کہا کہ یہ دو ایڈیشنوں کا معاملہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کہنے لگے آپ کو پتا ہے کہ ادبی کتاب بکتی نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بات تو میں گزشتہ پچاس برسوں سے سنتا آ رہا ہوں۔ لیکن میری کتاب تو بکتی ہے اور میری ہر کتاب کے اب تک چھ چھ سات سات ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ میں نے کہا آپ کو پتا ہے کہ چار دن کے بعد میرے بیٹے کا ولیمہ ہے اس لئے میں یہ پیسے لے رہا ہوں لیکن احتجاج کرتے ہوئے لے رہا ہوں۔ اگر آپ میری حق تلفی کر کے کروڑ پتی بن جاتے ہیں تو بن جایئے اور میں نے وہ رقم اٹھالی۔

جب میرے ساتھ اتنی بڑی بے ایمانی ہوئی تو مجھے جگہ جگہ اس کی باتیں کرنی چاہئیں تھیں۔ چنانچہ میں نے دو چار جگہ یہ بات کی۔ اس کے بعد وہ مجھ سے ملے تو بڑا شکوہ کیا کہ آپ میرے سلسلے میں غلط فہمیاں پیدا کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ بھئی تم جس کے ساتھ یہ سلوک کرو گے تو وہ شور تو مچائے گا۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ لیجئے میں دو ایڈیشن کا لفظ کاٹ کر ایک ایڈیشن کر دیتا ہوں اور ایک ایڈیشن کر دیا۔ لیکن چوتھا سال ہونے کو ہے ان کتابوں کا پہلا ایڈیشن ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے کہ اس عرصے میں دو کی بجائے چار ایڈیشن بک سکتے تھے۔ پھر ستم ظریفی یہ ہے کہ رائلٹی مقرر کرتے وقت ہر کتاب کی قیمت تخمیناً بیس روپے لگائی گئی تھی جبکہ ان کے ادارے کی طرف سے اب میرے نئے مجموعے ''ہریالی'' اور ''ابابیل'' آئے ہیں تو ان کی قیمت پچاس پچاس روپے رکھی ہوئی ہے۔ جب کبھی ہم اس مسئلے کا بیٹھ کر فیصلہ کرنا چاہیں گے تو وہ کوئی ایسا رویہ اختیار کریں گے کہ بچے وہی ہوں گے یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ کسی رکشا پر بیٹھ جایئے اور میٹر تیز چلنے پر احتجاج کیجئے تو رکشے والا الٹا آپ ہی کو ڈانٹے گا کہ آپ جھوٹے ہیں اور میں سچا ہوں۔ یہی صورت حال ہمارے پبلشرز کی ہے۔

پبلشرز کے سلسلے میں ادیبوں میں عجیب عجیب لطیفے بھی مشہور ہیں مگر ان سب لطیفوں کی بنیاد حقیقتوں پر ہی ہے۔ ویسے بھی مصنف بیچارا یہی کر سکتا ہے کہ اپنے واقعہ کو لطیفہ بنا کر بیان کرے۔ خود بھی ہنسے اور دوسروں کو بھی ہنسائے اور وہ رنج بھول جائے جو پبلشر کی

طرف سے اسے ملا ہے۔

تقسیم ملک سے پہلے ساحر لدھیانوی جب لاہور میں تھے تو ایک بہت بڑے ترقی پسند پبلشر سے ان کے مراسم تھے۔ ''تلخیاں'' کا دوسرا ایڈیشن انہوں نے ہی چھاپا تھا۔ ساحر صاحب نے معاوضے کے کچھ پیسے تو قسطوں میں وصول کر لیے تھے جبکہ ایک سو روپے ابھی باقی تھے۔ ساحر کے ایک دوست رام پرکاش اشک راولپنڈی کے رہنے والے تھے اور نظم کے شاعر تھے۔ انہوں نے نظمیں تو بہت کم کہی تھیں لیکن جو بھی کہی تھیں بہت عمدہ کہی تھیں۔ اس زمانے میں وہ لاہور میں ایل ایل بی کر رہے تھے اور ایک ہوسٹل میں مقیم تھے۔ جب دونوں کی جیب میں کوئی پیسہ نہ رہا تو ساحر نے کہا کہ چلو یار میں نے فلاں پبلشر صاحب سے ایک سو روپیہ لینا ہے' دکان کھل گئی ہو گی چل کر کوشش کرتے ہیں۔ صبح کا وقت تھا یہ وہاں پہنچے تو وہ پبلشر اور ان کا ایک چھوٹا سا بیٹا جواب کافی بڑا ہو گیا ہے' دکان پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے بڑے پرتپاک ان کا استقبال کیا اور پوچھا کہ صبح صبح کیسے آنا ہوا۔ ساحر نے بتایا کہ آپ کی طرف ایک سو روپیہ باقی ہے' ضرورت بہت شدید ہے اس لئے آپ کے پاس آئے ہیں۔ یہ سن کر انہوں نے حسب معمول جواب دیا کہ ہمارے ہاں تو رات ہنڈیا نہیں پکی اور آپ تو جانتے ہیں کہ کتابوں کی خریداری تو ہے نہیں اس لئے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے ہیں بلکہ میں تو اب پیشہ تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اکثر پبلشرز ہمیشہ پیشہ تبدیل کرنے کی بات کرتے ہیں لیکن پیشہ چھوڑتے بھی نہیں۔ ساحر نے کہا ٹھیک ہے آپ پیشہ تبدیل کر لیجئے لیکن جب تک یہ پروفیشن ہے اس وقت تک تو ہمارا جو حق بنتا ہے وہ دیجئے۔ ساحر لدھیانوی کے بھول انہوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اندر ہی اندر دو انگلیوں سے کچھ گنا اور پھر دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر ساحر سے کہا کہ یہ تو رکھ لیجئے باقی نوے روپے بھی میں آپ کو آہستہ آہستہ دے دوں گا۔ ساحر دس روپے کا نوٹ لے کر چلنے لگا تو رام پرکاش صاحب نے کہا کہ بھوک لگی ہے اس لئے چلو انارکلی چل کے ملا حلوائی سے ناشتہ تو کریں۔ پبلشر کا بیٹا یہ سن کر رونے لگا اور کہنے لگا کہ میں بھی چچا کے ساتھ ناشتہ کروں گا۔ ساحر نے اس بچے

کو ساتھ لیا' راستے میں سگریٹ وغیرہ لئے اور چونکہ رات سے فاقہ زدگی کا عالم تھا اس لئے ناشتہ کرنے لگے۔ اتنے میں وہ پبلشر صاحب بھی وہاں آ گئے اور کہنے لگے کہ چچا بھتیجا اکیلے اکیلے کھا رہے ہو' ہمیں نہیں پوچھو گے۔ ساحر نے کہا کہ آپ بھی بیٹھئے چنانچہ وہ بھی بیٹھ گئے اور ناشتہ کیا اور دس روپے میں سے جو باقی بچا تھا وہ وہاں ادا کیا اور ہم دو دوست سگریٹ پیتے ہوئے وہاں سے واپس چل پڑے۔

میرے ڈسٹری بیوٹرز

ادب میں ادیبوں کے ساتھ جو سلوک پبلشر کرتا ہے یا جو حیثیت پبلشر کی ہوتی ہے فلم لائن میں وہی حیثیت ڈسٹری بیوٹر کی ہوتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ڈسٹری بیوٹر کا پیسہ بھی فلم میں خرچ ہوتا ہے لیکن سب کوششیں پروڈیوسر کی اپنی ہوتی ہیں۔ ابتدائی پیسہ پروڈیوسر کا اپنا ہی ہوتا ہے لیکن جب ڈسٹری بیوٹر اس میں داخل ہوتا ہے تو فلمساز رفتہ رفتہ پیچھے چلا جاتا ہے ہے اور ڈسٹری بیوٹر آگے آ جاتا ہے۔ جب فلم مکمل ہو جاتی ہے تو اس کا مالک ڈسٹری بیوٹر بن جاتا ہے۔ حسابات اور بکنگ اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور جس طرح پبلشر کا پہلا ایڈیشن کبھی ختم نہیں ہوتا اس ڈسٹری بیوٹر کا دیا ہوا روپیہ بھی فلمساز کے سر سے نہیں اترتا اور وہ جو کچھ شروع میں لے چکا ہوتا ہے اسی پر اکتفا کرتا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی پیسے آ جائیں تو یہ اس کی خوش قسمتی ہے۔

میں شاعر کے علاوہ فلمساز بھی بنا ہوں اور اس سلسلے میں میرے تجربے اتنے تلخ ہوئے کہ میں نے توبہ کر لی کہ آئندہ فلم پروڈیوس نہیں کروں گا۔ شاعری کا مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ تو مجبوری ہے اور وہ تو خدا تعالیٰ کی طرف سے ودیعت ہو چکی ہوتی ہے اس لئے اندر جو شاعر بیٹھا ہوتا ہے وہ باہر کے آدمی کو لکھنے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ شاعری پبلشرز کے رویے کو دیکھ کر چھوڑی نہیں جا سکتی۔ بہر حال میں نے فلمسازی چھوڑ دی کیونکہ اس کا تعلق ذوق سے نہیں بلکہ صنعت اور کاروبار سے تھا۔

ہوا یوں کہ میں نے ''اک لڑکی میرے گاؤں کی'' کے نام سے ایک اُردو فلم شروع کی۔ یہ پکچر اپنے وقت میں تیسری رنگین فلم تھی کیونکہ ان دنوں ابھی رنگین فلموں کا زمانہ شروع ہوا ہی تھا۔ اس پکچر میں اس وقت کی بہت بڑی کاسٹ تھی۔ فلم اناؤنس کی تو اچھا رسپانس ملا اور اس کے گاہک بھی آ گئے۔ فلم کا افتتاح بے نظیر تھا کیونکہ میرا حلقہ احباب فلم کے علاوہ ادب اور صحافت سے بھی تھا اور اس زمانے میں وزراء' بڑے بڑے افسران' ادیب اور اخبار نویس سب اس میں شامل ہوئے تھے۔

ہم نے فلم کی شوٹنگ شروع کر دی۔ میرے ڈائریکٹر ایک ایسے بدنام زمانہ ڈائریکٹر تھے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ شخص اپنے باپ کا بھی لحاظ نہیں کرتا اور اس سے بھی دھوکا کرتا ہے۔ میں نے سوچا کہ میرے ساتھ ان کے تعلقات بہت اچھے ہیں ہو سکتا ہے کہ کسی اور کے تلخ تجربات ہوں اس لئے میں تو انہیں ہی ڈائریکٹر لوں گا۔ چنانچہ میں نے پے منٹ کا جو پہلا چیک کاٹا وہ ان ڈائریکٹر کا تھا۔ جب کام شروع ہوا تو پہلے دن کی شوٹنگ ہی میں انہوں نے میرے ساتھ جو کیا اسے میں زندگی بھر نہیں بھلا سکوں گا۔

بات ڈسٹری بیوٹر کی ہو رہی تھی۔ اسے تو پیسے روک لینے اور کم پیسے دینے کا کوئی نہ کوئی بہانہ چاہیے ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ڈائریکٹر صاحب کی ریشہ دوانیاں شروع ہوئیں تو ڈسٹری بیوٹر نے پیسے روکنے شروع کر دیئے۔ ڈائریکٹر صاحب کے بھی کچھ مقاصد تھے۔ انہوں نے میرے ساتھ دوستی کے پردے میں جن روابط کی ترویج کی اور میرے ساتھ اپنا وہ سلسلہ شروع کیا جو ان کی فطرت میں تھا تو ان کے مقاصد ظاہر ہونے لگے۔ انہوں نے اپنی ایک الگ پلاننگ شروع کر دی اور اس کے ساتھ ہی ڈسٹری بیوٹر سے مل کر ساتھ ساتھ ایک اور فلم بنانا شروع کر دی۔

میں نے ڈائریکٹر صاحب کو پہلے وارننگ دی اور پھر انہیں علیحدہ کر دیا۔ پھر انہوں نے معافی مانگی تو میں نے انہیں معاف کر دیا۔ بعد میں پتا چلا کہ انہوں نے معافی اس لئے مانگی ہے کہ وہ دوبارہ فلم میں آ کر فلم کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے انہیں دوبارہ الگ کر دیا۔ اب یہاں سے فلم کے ڈسٹری بیوٹر صاحب کا سلسلہ چلا۔

یہ صاحب فلم کی ہیروئن کے عاشق تھے اور جب ہیروئن کا تھوڑا سا التفات ہوتا تھا اور وہ انہیں تھوڑا سا پچکار دیتی تھی تو وہ فلم کی سپیڈ تیز کر دیتے تھے اور جب اس طرف سے تھوڑا سا discourage ہوتے تھے تو فلم بند کر دیتے تھے اور ہیروئن کو طوائف طوائف کہہ کہ بُرا بھلا کہتے تھے۔ پھر ڈسٹری بیوٹر صاحب اس فلم کے ہیرو کے بھی دوست تھے جن کی ایکسٹریس بیوی میری فلم کی ہیروئن سے اختلاف رکھتی تھی اور چاہتی تھی کہ یہ ہیروئن ان کے شوہر کے ساتھ کام نہ کر سکے کیونکہ اس ہیروئن کی وجہ سے وہ ہیروئن متاثر ہو چکی تھی اور فلموں میں اس کی مانگ کم ہو گئی تھی۔

ایک طرف تو میری فلم کے ڈسٹری بیوٹر صاحب تازہ تازہ میری فلم کی ہیروئن سے ستائے گئے تھے اور دوسری طرف انہوں نے ہیرو کی بیوی کو اپنی بہن بنا رکھا تھا اس لئے سازش یہ ہوئی کہ اگر میری فلم کی ہیروئن بدلی جائے تو فلم بنے گی ورنہ فلم نہیں بنے گی۔ جب ہمارا آپس میں پہلی مرتبہ جھگڑا ہوا تھا تو مرحوم آغا گل نے جو میرے ساتھ بہت تعاون کرتے تھے۔ یہ معاہدہ کروایا تھا کہ باقی کی فلم ڈسٹری بیوٹر بنائے گا اور اس فلم پر میرا جو پیسہ لگا ہے وہ سٹوڈیو سے فلم کے پرنٹ اٹھاتے وقت مجھے واپس کر دے گا چنانچہ ان صاحب نے تھوڑی سی فلم بنائی بھی لیکن ہیرو کی بیوی کے کہنے میں آ کر انہوں نے فلم بند کر دی۔ اب ہمارے معاہدے میں میعاد نہیں لکھی ہوئی تھی اور ایسی کوئی شق نہیں تھی کہ اگر وہ فلم نہیں بنائیں گے تو کیا ہو گا' اس لئے میں نے مجبوراً خاموشی اختیار کر لی کیونکہ اگر میں مقدمہ دائر کرتا تو یہ مقدمہ دیوانی عدالت میں دس سال چلتا اور جتنا روپیہ فلم پر لگا ہوا تھا اتنا روپیہ میں اس پر بھی لگاتا۔ چنانچہ وہ روپیہ ڈسٹری بیوٹر صاحب کی مہربانی سے ان کے مفادات کی بھینٹ چڑھ گیا۔

میں نے دوسری فلم پشتو میں ''عجب خان آفریدی'' کے نام سے بنائی۔ اس فلم میں کچھ پارٹنر بھی بنے اور ایک پارٹنر ڈسٹری بیوٹر تھے۔ پکچر بننے کے بعد مجھے یہ پتا نہیں چلا کہ انہوں نے کیا کمایا ہے اور فلم سے کیا آیا اور کیا گیا ہے۔ چونکہ اس فلم کا مین پارٹنر میں تھا اور فلمساز کے طور پر بھی میں ہی محکمہ انکم ٹیکس میں ذمہ دار تھا۔ اس لئے مجھے کافی نقصان اٹھانا

پڑا۔ یہ تو شکر ہے کہ حسابات کی عدم موجودگی کی وجہ سے اور انکم ٹیکس آفیسر کی رحمدلی کی وجہ سے میں زیادہ نقصان سے بچ گیا۔

میں نے تیسری فلم ہندکو میں ''قصہ خوانی'' کے نام سے شروع کی۔ یہاں بھی ڈسٹری بیوٹر صاحب نے یکے بعد دیگرے بہت کچھ کیا۔ مختصراً یہ کہ جو رول ادب میں پبلشر ادا کرتا ہے وہی رول یہاں فلم کے ڈسٹری بیوٹر صاحبان نے ادا کیا۔ یہ فلم آخر آخر میں صرف بیس ہزار روپے کی رقم پوری کرنے کے لئے کوئی پانچ سال پہلے ایک ڈسٹری بیوٹر کے پاس گئی تھی اور اس کے بعد مجھے پتا نہیں چلا کہ یہ فلم کہاں ہے اور اس کی آمدنی کہاں ہے۔

مسجد اور امام باڑے کا رول

ہری پور میں میری زندگی کے ابتدائی زمانے میں موسیقی اور شاعری کے علاوہ مذہب بھی پوری طرح حاوی تھا چنانچہ اکثر میں نمازیں پڑھتا تھا اور رمضان کے مہینے میں تراویح کے بعد بھی یادخدا میں مشغول رہتا اور جب لوگ نماز تہجد پڑھتے تو میں بھی ان کے ساتھ شریک ہوتا۔ اسی طرح جب ہم پنڈی میں رہتے تھے تو محرم کے دنوں میں میرے پہلے دس بارہ دن مجالس میں گزرتے تھے۔ چنانچہ میری شاعری کو جتنی جلا ملی ہے اس میں امام باڑے کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ اس زمانے میں ملتانی ذاکر بھی ہوتے تھے۔ لیکن ان کے علاوہ درمیانی وقفوں میں ایک آدمی اٹھ کر رباعی پڑھا کرتا تھا جو عام طور پر میر انیس جیسے شاعروں کے پائے کی ہوتی تھی اور انہیں عقیدے سے ہٹ کر اچھی شاعری میں رکھا جا سکتا تھا۔ یہ رباعی طبیعت پر بہت اثر کرتی تھیں اور جی چاہتا تھا کہ میں بھی ویسی چیزیں کہوں۔ میں نے ان دنوں ماتم بھی کیا اور زنجیر زنی بھی کی اگرچہ ہم سنی فیملی سے تعلق رکھتے تھے لیکن وہ ایسا زمانہ تھا کہ وہاں کے بچے بالے بھی دیکھا دیکھی اپنے گھروں میں چھوٹے چھوٹے امام باڑے بناتے تھے اور امام حسینؓ کے فقیر بنتے تھے۔

ادھر امام باڑے میں جو تربیت ہوئی وہ شعری تربیت تھی اور ادھر مسجد ہری پور میں جانے کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ مسجد اہلحدیث تھی چنانچہ ان کے جو عقائد تھے میں نے وہ بچپن میں قبول کئے۔ ان میں شرک، مزار پرستی اور پیر پرستی نہیں تھی اور یہ خدا اور اس کے رسولؐ کے آگے کے سلسلے کو اس حد تک نہیں مانتے تھے کہ اس کے بعد لوگ بھی خدا ہی نظر آئیں۔

اس طرح میری بنیادوں میں اہلحدیث والے عقائد پڑے ہوئے تھے اور جب جوانی میں ترقی پسند تحریک سامنے آئی تو میں نے محسوس کیا کہ اس تحریک میں اگر موجودہ سیاست نہ ہو تو باقی جو رہ جاتا ہے وہ اہلحدیث کے عقائد ہیں جو اس میں بڑی حد تک نمایاں نظر آتے ہیں۔

اس مسجد اور امام باڑے کے دور سے گزرنے تک مختلف فرقوں کی نعرہ بازیاں ابھی میرے ذہن میں نہیں آئی تھیں۔ آگے چل کر دیکھا تو معاملہ کچھ دوسرا نظر آیا کہ ایک فرقہ دوسرے فرقے کے عقائد پر اعتراض کرتا ہے اور دوسرا پہلے پر۔ جب غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ کوئی فرقہ دوسرے فرقے کی نظر میں مسلمان ہی نہیں۔ اس مرحلے پر مجھے سوچنا پڑ گیا کہ اگر ایک فرقہ دوسرے فرقے کو غیر مسلم سمجھتا ہے تو کون آ کر فیصلہ کرے گا کہ ان میں سے مسلمان کون ہے۔ کوئی انسان تو اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا کیونکہ اگر کوئی انسان فیصلہ کرے گا تو ایک اور فرقے کا اضافہ ہو جائے گا اور جس طرح پہلے فرقے بنے ہوئے ہیں اسی طرح اس کا بھی ایک نظریہ ہوگا۔ وہ بھی صرف اپنے آپ کو ہی مسلمان سمجھے گا اور باقی سب کو غیر مسلم۔ اس مسئلے نے مجھے چکرا کر رکھ دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ خدا اور رسولؐ پر تو میرا ایمان پہلے سے بھی پختہ ہو گیا لیکن آگے آ کر نہ مجھے اپنا سنی فرقہ بھلا نظر آتا ہے نہ شیعہ نہ اہلحدیث۔ یہ سب فرقے مجھے پسند نہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں انہیں ان کے حال پر چھوڑ دوں تو زیادہ بہتر ہے تا کہ جس کا جو جی چاہے کرتا رہے اور مجھ پر جو فرض ہے میں اسے نبھاتا جاؤں اور خدا اور اس کے رسول کو مانوں۔ بلکہ رسول کو تو میں کچھ عجیب طریقے سے مانتا ہوں، شاید کوئی بھی اس طرح نہ مانتا ہو۔

میں جب دیگر ادیان کے بزرگوں کو دیکھتا ہوں تو ان میں بڑے معجزے اور شعبدے اور بڑی Myth نظر آتی ہے لیکن اپنے رسولؐ کی طرف دیکھتا ہوں تو ان میں یہ ساری چیزیں نہیں ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے رسولؐ سے جو دو یا چار معجزے منسوب کیے جاتے ہیں اگر وہ نہ بھی ہوں تو میری نظر میں ہمارے رسولؐ اس پائے کے اونچے انسان ہیں کہ اگر وہ رسولؐ نہ بھی ہوتے تو کم از کم میں انہیں رسولؐ مان لیتا۔ مجھے روئے زمین پر اتنا مکمل انسان نظر نہیں آتا۔ میرے یہ عقائد آج تک چل رہے ہیں اور اس سلسلے میں میرا ایک شعر ہے:

دنیا میں احترام کے قابل ہیں جتنے لوگ
میں سب کو مانتا ہوں مگر مصطفےٰ کے بعد

لیکن باقیوں سے میرا ایمان اٹھ گیا۔ ارکان اسلام کی حد تک ٹھیک ہے۔ میں بہت آزاد خیال ہوں۔ متقی اور نمازی آدمی بھی نہیں ہوں۔ عید کی نماز یا واجب نمازیں یعنی نماز جنازہ وغیرہ پڑھ لیتا ہوں۔ اگر دیکھا کہ کوئی خطیب بہت اچھا خطبہ دے رہا ہے تو اگلے جمعہ کو وہاں جا کر نماز پڑھ لیتا ہوں۔

میں عمرہ بھی کر کے آیا ہوں۔ خانہ کعبہ تو خیر خدا کا گھر ہے لیکن روضۂ رسولؐ پر جو لطف آیا اور جو وجد طاری ہوا وہ بیان نہیں کر سکتا۔ لوگ اکثر کہتے ہیں کہ یہ نعت رسولؐ پر کہی گئی۔ ہر چند کہ نعت کہتا ہوں لیکن میں اب تک حیران ہوں کہ وہاں جا کر کوئی نعت کیسے کہہ لیتا ہے۔ وہاں تو تصورات ہی اور بن جاتے ہیں اور الفاظ ساتھ ہی نہیں دیتے۔

اس لئے وہاں کوئی آدمی کس طرح نعت کہہ سکتا ہے۔ اور وہاں سوائے عشقِ رسولؐ کے سوچ کیسے سکتا ہے۔ اس منزل سے بھی میں گزرا ہوں اور عمرہ بھی کیا ہے۔ خیرات اور زکوٰۃ اسلام میں بہت افادی چیزیں ہیں یہ بھی کی ہیں لیکن میں ملائیت کا آج تک قائل نہیں ہوا۔ میرا اسلام وہی ہے جو اقبال کا اسلام ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس مذہب کو جتنا نقصان ملائیت نے پہنچایا ہے شاید کوئی دوسرا نہ پہنچا سکے۔

میں کوئی اسلام کا عالم نہیں ہوں لیکن ایک عام قاری اور ایک غیر متعصب قاری کے طور ضرور سوچتا ہوں کہ ہمارے ملاؤں نے اپنے آپ پر اجتہاد کے راستے بند کر رکھے ہیں۔ میری جب ان سے گفتگو ہوتی ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ آپ زمانے کے ساتھ کیوں نہیں

چل رہے تو وہ کہتے ہیں کہ اسلام نے یہ کہا ہے اور پندرہ سو سال پہلے کی بات کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ کچھ چیزیں مقصود بالذات ہوتی ہیں۔ مثلاً سواری کا مطلب سواری ہے۔ اس زمانے میں اونٹ تھا اور آج اگر ملا یہ کہتا ہے کہ یہ سنت رسولؐ ہے تو پھر اونٹ سنت رسولؐ ہونے کے باوجود آج کے لئے کارآمد نہیں ہے۔ آج کے لئے کارآمد چیز ہوائی جہاز ہے۔ اس سے پہلے ریل گاڑیاں، بسیں اور ٹرک وغیرہ تھے مگر اب جہاز ہے۔ اس لئے مقصود بالذات چیز سواری ہے اونٹ نہیں۔

اگر ہم اونٹ سے ہوائی جہاز پر آ سکتے ہیں تو اس طرح ہمیں شوریٰ سے پارلیمنٹ تک آنا پڑے گا۔ اسلام نے الیکشن کی بنیاد رکھی ہے لیکن اس زمانے میں جمہوریت کی رسائی شوریٰ تک ہی تھی۔ اب زمانہ آگے آ گیا ہے اور اس کی ترقی یافتہ شکل پارلیمنٹ ہے لیکن انہی ملاؤں نے پچھلے گیارہ برسوں میں جمہوریت کی نفی کی۔ یہ لوگوں کو گمراہ کرتے رہے کہ جمہوریت اسلام کے خلاف ہے اور اسلام سے ٹکراتی ہے۔ اگر اونٹ سے جہاز تک پہنچنا جائز ہے تو شوریٰ سے پارلیمنٹ تک پہنچنا بھی بالکل جائز ہے۔

اسی طرح اور چیزوں کو بھی آپ لے لیں۔ مثلاً رسولؐ اللہ کھجور سے روزہ کھولتے تھے۔ ہم آج تک کھجور کے لئے رو رہے ہیں اور عراق سے کروڑوں روپے کی کھجوریں منگوا کر زرمبادلہ ضائع کر چکے ہیں اگر اس وقت سیب ہوتا تو سیب سے بھی روزہ کھل جاتا۔ مقصد تو کسی اچھی چیز سے روزہ کھولنا ہے۔ آج درجنوں فروٹ ہیں۔ ان سے کیوں روزہ نہیں کھولا جا سکتا۔ اب ہم ہر چیز کے بارے میں کہیں کہ پندرہ سو برس پہلے یوں تھا تو مناسب نہیں۔ پندرہ سو سال پہلے تو صوفہ بھی نہیں تھا تو کیا ہم چٹائی لے کر بیٹھ جائیں۔

جو نئی چیز آتی ہے اسے ملا پہلے تو گالی دیتے ہیں لیکن بعد میں قبول کر لیتے ہیں۔ انہوں نے پہلے لاؤڈ سپیکر کو شیطان کی آواز قرار دیا۔ اب بعض جگہ تو واقعی نظر آتا ہے کہ یہ ٹھیک کہتے تھے جب لاؤڈ سپیکر کا بے جا استعمال ہوتا ہے تو اس میں شیطان ہی بولتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس طرح بجلی آئی تو ان لوگوں نے کہا کہ نہیں مسجدوں میں سرسوں کے تیل کا چراغ جلے گا۔ چنانچہ ان میں لاعلمی اور کم عملی کی وجہ سے جو قدامت پسندی چلی ہوئی ہے اس کی وجہ سے ہر چیز کا ذکر پندرہ سو سال پہلے سے کرتے ہیں۔

فلم اور سکینڈل

ادب اور فلم میں سازشوں کا جو چکر چلتا ہے وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ادب میں تو یہ چکر نسبتاً کم ہے کیونکہ اس میں پیسے کا عمل دخل نہیں ہوتا لیکن فلم میں نام کے ساتھ پیسے کا بھی مسئلہ ہوتا ہے۔ اس لئے ایک دوسرے کو عجیب طرح سے گرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جب میں فروری 47ء میں شروع شروع میں لاہور میں آیا تو میں نے پہلی فلم ''ادھورے خواب'' کے گانے لکھے تھے۔ میرے گانے جب ریکارڈ ہوئے تو انہوں نے لوگوں کو چونکا دیا اور پوچھ گچھ شروع ہو گئی کہ یہ گانے کس نے لکھے ہیں۔ ایک نئے پروڈیوسر جن کا دفتر رائل پارک میں تھے کا آدمی مجھے بلانے کے لئے آیا۔ میں وہاں گیا تو خوب آؤ بھگت ہوئی اور وہ مجھے بڑے احترام سے ملے۔ اس زمانے میں شاعروں کے لئے زیادہ سے زیادہ دو سو روپے فی نغمہ معاوضہ ہوتا تھا چنانچہ ان سے بات بھی طے ہو گئی۔ اس دوران وہاں پر مجھ سے پہلے کا ایک فلمی شاعر بھی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ مجھے بڑے احترام سے ملا اور کہنے لگا کہ قتیل صاحب آپ کو ملنے کی بہت تمنا تھی۔ پشاور کے ایک مشاعرے میں آپ کو سنا تھا تو آپ سے ملنے کی خواہش تھی۔ میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔ جی چاہتا ہے کہ میں آپ کی خدمت کروں۔ اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ فلم میں نئے نئے آئے ہیں اور میں پہلے سے ہوں۔ ادب میں تو آپ کا ماشاء اللہ بہت مقام ہے لیکن فلم میں آپ نو آموز ہیں۔ اس میں آپ کو تھوڑی سی ٹریننگ کی ضرورت ہو گی میں اس کے لئے حاضر ہوں۔ جہاں بھی آپ کو ضرورت پڑے آپ مجھ سے مشورہ کر لیں؛

میں آپ کی رہنمائی کروں گا۔

سیدھا طریقہ تو یہ تھا کہ میں کہتا کہ بھئی آپ کون ہوتے ہیں۔ رہنمائی کرنے والے۔ میں فلم کو آپ سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ لیکن میں بالکل شرمیلا اور شریف سا آدمی تھا۔ میں نے کہا جی بالکل ٹھیک ہے۔ میں تو فلم میں نیا آدمی ہوں۔ آپ سے ضرور مشورے کروں گا اور امید ہے کہ آپ مجھے ضروری وقت دیں گے۔ جب یہ گفتگو ڈسٹری بیوٹر نے سنی تو اس کا رویہ تھوڑا سا اسی وقت بدل گیا اور کہنے لگا کہ اچھا صاحب پھر یہ بات آگے چلائیں گے۔ اس کے بعد اس نے کبھی رابطہ نہیں کیا۔ اس فلم کے گانے میری بجائے اس شاعر نے لکھے کیونکہ اس نے اپنی گفتگو کے ذریعے مجھ سے اقرار کروا لیا تھا کہ وہ واقعی گانے لکھتا ہے اور میں کمزور ہوں۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے جب میں Establish ہو چکا تھا اور میری سفارش بھی سنی جاتی تھی۔ میرے پنڈی کے دوست احمد ظفر اس زمانے میں ریڈیو کی ایک سنگر انیقہ بانو کی طرف جذباتی جھکاؤ رکھتے تھے۔ انہوں نے اس یقین پر کہ وہاں قتیل شفائی ہے اس کے ساتھ وعدہ کر لیا اور اسے میرے گھر پر لے کر آ گئے۔ وہ اچھی گانے والی تھی اور اس وقت غالباً فلم ''قاتل'' بھی بن رہی تھی۔ چنانچہ میرے کہنے پر اس فلم کا ایک گانا انیقہ بانو کے لئے چنا گیا۔ اس فلم کے پروڈیوسر پاشا صاحب تھے اور میوزک ڈائریکٹر ماسٹر عنایت حسین تھے۔ دونوں نے اتفاق کر لیا۔ لیکن منور سلطانہ کی ایک لابی تھی اور اس فلم کے ساؤنڈ ریکارڈسٹ اور کچھ دوسرے لوگ اس لابی سے تھے۔ ریہرسل ہوئی' ریکارڈنگ ہوئی اور واہ واہ ہو گئی۔ انیقہ بانو کو ادائیگی بھی ہو گئی اور ہم نے اسے پنڈی رخصت کر دیا۔

اس زمانے میں لیبارٹری کا کام ذرا دشوار ہوتا تھا اور اس میں ایک دو دن لگ جاتے تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ اس گانے کو اس طرح ریکارڈ کیا گیا کہ اس کی آواز دبی دبی تھی۔ میں نے پوچھا کہ صاحب کیا ہوا اس وقت تو آواز بالکل ٹھیک تھی تو ساؤنڈ ریکارڈسٹ نے کہا کہ اس کی آواز اس سے بہتر نہیں آ سکتی چنانچہ وہ بیچاری کٹ گئی اور وہی گانا منور سلطانہ نے گایا جو یہ تھا۔

لے کے پیار کا پیام
سانولی سلونی شام
آ گئی تو بھی آ

اس کے بعد منور سلطانہ کے ساتھ کیا ہوا۔ یہ بھی ایک الگ واقعہ ہے۔ ایک فلم ''نوکر'' بن رہی تھی جس میں ایک لوری تھی:

راج دلارے' میرے اکھیوں کے تارے

فلم میں یہ گانا منور سلطانہ نے گایا تھا۔ لیکن اس فلم کے مقتدر لوگوں میں سے ایک سنگر کوثر پروین پر نظر رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ اسے ممنون کر کے اپنے مقاصد پورے کریں۔ ان دنوں گانے کی ڈسک الگ بنا کرتی تھی اور گانا ٹریک سے منتقل نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ کوثر پروین کو خوش کرنے کے لئے ڈسک کے لئے وہی گانا کوثر پروین سے ریکارڈ کروایا گیا۔ اب منور سلطانہ بہت روئی۔ ہم نے کہا کہ آپ انیقہ بانو والا زمانہ یاد کریں۔ کہنے لگی میرا اس میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ میں نے کہا کہ بہر حال جو اس کے ساتھ ہو گیا تھا وہ ادھر بھی ہو گیا ہے۔

منور سلطانہ ویسے بہت اچھی گانے والی تھیں لیکن کتنے افسوس کی بات تھی کہ فلم میں تو منور سلطانہ کی آواز تھی لیکن ریکارڈ پر کوثر پروین کی۔ تو اس طرح کی چیزیں ڈائریکٹروں کے ساتھ بھی ہو جاتی تھیں اور کسی کو بھروسہ نہیں ہوتا تھا کہ آج میں جس مقام پر بیٹھا ہوں کل وہاں ہوں گا یا نہیں۔ دراصل فلم کا میدان اغراض کا میدان ہے۔ مجھے کسی سے غرض ہے تو میں اس کی خوشامد کر رہا ہوں۔ اسے غرض ہے تو وہ مجھ سے محبت کر رہا ہے۔ بس اغراض کا ایک چکر ہے جس میں ایک دوسرے کو وابستہ کئے ہوئے ہیں جب تک آپ سے کام ہے' آپ سے تعلقات بھی ٹھیک ہیں' محبت بھی ٹھیک ہے اور رومانس بھی ٹھیک ہے اور جب آپ سے کام نہیں رہا تو یہ سارا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

فلم ''گلنار'' بن رہی تھی' امتیاز علی تاج اس کے ڈائریکٹر تھے' نور جہاں کے شوہر شوکت حسین رضوی اس فلم کے پروڈیوسر تھے' شوکت تھانوی اس کے رائٹر تھے جو فلم میں ایک

کیریکٹر بھی کر رہے تھے۔ ماسٹر غلام حیدر میوزک ڈائریکٹر تھے' میں اس فلم کا شاعر تھا اور نور جہاں ہیروئن تھیں۔ شوکت رضوی صاحب بڑے نستعلیق آدمی تھے اور روایتی طور پر شعر و شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ ان کے ہاں شامیں بڑی رنگین ہوتی تھیں جن میں ہم لوگ بھی شامل ہوتے تھے۔ ایک دوستانہ فضا تھی اور بھائیوں جیسے تعلقات تھے۔

اب فلم میں ایک شعبہ سکینڈل کا بھی ہوتا ہے چنانچہ نور جہاں کے سلسلے میں افواہیں اڑنا شروع ہو گئیں کہ ان کے نذر صاحب (کرکٹر) سے تعلقات ہیں۔ شوکت صاحب اور ان کے آپس میں جھگڑے بھی ہونے لگے۔ نور جہاں ماسٹر جی کے پاس شکایت لے کر آتیں۔ ان دنوں سٹوڈیوز میں ریہرسلیں ہوتی تھیں اور ایک گانے کی پانچ دس بار ریہرسل ہوتی تھی۔ روز ہم سٹوڈیو میں بیٹھتے تھے۔ نور جہاں ریہرسل کیا کرتی تھیں جبکہ میں اور غلام حیدر ساتھ ہوتے تھے۔ نور جہاں ماسٹر صاحب سے شکایت کرتی تھیں کہ دیکھئے شوکت صاحب مجھ پر الزام لگا رہے ہیں کہ نذر سے میرے تعلقات ہیں جبکہ وہ تو میرے بیٹوں جیسا ہے۔ ہم بہت متاثر ہوتے تھے کہ بڑی مظلوم عورت ہے۔

ماسٹر صاحب نے شوکت صاحب کو سمجھایا کہ دیکھئے لوگوں کے کہنے میں نہ آیئے یہ معاملہ غلط ہے۔ ممکن ہے کسی نے انہیں ایک ساتھ دیکھا ہو لیکن یہ سارا سلسلہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ شوکت صاحب کہنے لگے کہ آپ ان باتوں کو چھوڑیئے' میں نے اس خاتون کے ساتھ عمر گزاری ہے' اس لئے میں جو کہہ رہا ہوں وہ ٹھیک ہے۔ ہم سب بھی چپ ہو گئے لیکن ہمیں ان کے جھگڑے دیکھ کر افسوس ہوتا تھا۔

ایک دن پتا چلا کہ شوکت صاحب ہاتھ میں پستول پکڑے بڑے غصے میں گاڑی میں بیٹھ کر جا رہے ہیں۔ اس کے بعد پتا چلا کہ شوکت صاحب نے ایک مکان کی تنہائی میں نور جہاں اور نذر کو جا کر گھیر لیا تھا اور پستول تان لیا تھا۔ نذر صاحب نے جان بچانے کے لئے ایک کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔ ان کا پاؤں اٹک گیا جس سے وہ بازو کے بل گرے اور ان کا بازو ٹوٹ گیا۔ نتیجتاً وہ کرکٹ کے کھیل سے ساری زندگی کے لئے فارغ ہو گئے۔ اب ماسٹر جی اور میں خاموشی میں ایک دوسرے سے سوال کرتے تھے کہ یہ تو کہتی تھی کہ نذر

میرے بیٹوں جیسا ہے۔

اس واقعہ کے بعد نور جہاں کے شوکت صاحب کے ساتھ تعلقات خراب رہنے لگے اور پھر دونوں الگ ہو گئے۔ اب میں دوسرے لوگوں کو چھوڑتے ہوئے چشم دید واقعات کی طرف آتا ہوں۔

فلم ''انتظار'' بن رہی تھی جس کے میوزک ڈائریکٹر مرحوم خواجہ خورشید انور تھے۔ اس پروڈکشن کا دفتر میکلوڈ روڈ پر تھا۔ رفتہ رفتہ ہمیں پتا چلا کہ نور جہاں اور خورشید انور صاحب کے LOVE AFFAIR کا آغاز ہو چکا ہے۔ خورشید صاحب بھی عجیب تضادات کا مجموعہ تھے۔ بڑے سنجیدہ آدمی تھے لیکن رنگین مزاج بھی رہ چکے تھے۔ پانچ وقت نماز باقاعدگی سے پڑھتے تھے اور ایک وقت شراب بھی باقاعدگی سے پیتے تھے اور پھر صبح تلاوت بھی کرتے تھے۔ دراصل وہ' وہ زمانہ گزار چکے تھے جب ان کی زندگی میں کئی لڑکیاں آتی تھیں۔ اب یہ نئی بات سن کر کچھ انوکھی سی بات نظر آئی۔ میری ان سے بے تکلفی تھی اس لئے پوچھ لیا کہ کیا سلسلہ چل نکلا ہے۔ کہنے لگے جی میں کیا بتاؤں یک طرفہ معاملہ چل رہا ہے۔ میں تو خود پریشان ہوں۔ نور جہاں کا خیال ہے کہ میں ان پر عاشق ہوں حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ دفتر میں کمرے کے اندر کمرہ آتا تھا اور آخری کمرے میں خورشید صاحب بیٹھتے تھے ایک دن اس کمرے سے پہلے کچھ اونچی اونچی آوازیں آئیں اور پھر کمرے میں سے خورشید انور' نور جہاں اور وہاں کے دو اور آدمی نکلے اور تیزی سے گزر کر چلے گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ نور جہاں چاہتی تھیں کہ خورشید انور صاحب سر پر قرآن اٹھا کر کہہ دیں کہ انہیں مجھ سے پیار نہیں ہے تو میں یقین کر جاؤں گی کیونکہ یہ جھوٹ بول رہے ہیں اور انہیں مجھ سے پیار ہے۔ چنانچہ یہ لوگ ٹمپل روڈ کی مسجد میں گئے اور وہاں جا کر خورشید صاحب نے قرآن سر پر رکھ کر کہا کہ مجھے نور جہاں سے کوئی محبت نہیں ہے میں بس ان کا احترام کرتا ہوں۔ سنا ہے کہ یہ سن کر نور جہاں بے ہوش ہوتے ہوتے بچیں اور پھر ان کے تعلقات خراب ہونے لگے۔ قبل ازیں کافی عرصہ تک نور جہاں ایک مرد کا رول ادا کرتی رہیں اور خورشید انور ایک عورت کا رول ادا کرتے رہے۔ مگر اس واقعہ کا نقصان ہوا کہ نور جہاں

اور خورشید انور Combination ٹوٹ گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ خورشید انور بہت باریک بین میوزک ڈائریکٹر تھے اور بہت باریکیوں تک ٹیون کا خیال رکھے تھے اور نور جہاں کی آواز ہی ایسی تھی جو خورشید انور چاہتے تھے۔ اس رومانس نے مفادات پورے کرنے کی بجائے مفادات کو نقصان پہنچایا اور یہ معاملہ ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد اگرچہ خورشید انور کی دھنوں میں ناہید نیازی اور کوثر پروین کی آوازوں میں بھی گانے ہٹ ہوئے لیکن ''کوئل'' اور ''انتظار'' میں جو گانے نور جہاں کی آواز میں آئے تھے وہ اپنی جگہ تھے۔ یہ نہیں کہ ان گانوں میں نور جہاں کا کمال تھا۔ کمال تو خورشید انور کا تھا جو نور جہاں کی آواز کے مطابق دھنیں بناتے تھے اور پھر انہیں دس دس مرتبہ ریہرسل کرواتے تھے۔ جب گانا پرفیکٹ ہو جاتا پھر ہی اس کی ریکارڈنگ کرواتے۔ اس لئے فلم ''انتظار'' کے گانے نور جہاں کے آج کے گانوں سے سو گنا زیادہ اچھے ہیں اور نور جہاں پھر کبھی ویسے گانے نہیں گا سکیں۔

اس رومانس کا یہی نقصان ہوا۔ خیر خواجہ خورشید انور تو فوت ہو چکے ہیں اور نور جہاں ابھی زندہ ہیں۔ خدا انہیں اور زندگی دے اور یہ بھی توفیق دے کہ ان پر خورشید انور کی دھنوں کے جو احسانات ہیں وہ ان کا بھی اعتراف کر لیا کریں۔

فلم انڈسٹری کے نیک نام لوگ

کہا جاتا ہے کہ فلم انڈسٹری میں جو عورت آتی ہے وہ گمراہ ضرور ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ بات ٹھیک ہوتی ہے لیکن اکثر اوقات ایسی باتیں ٹھیک نظر نہیں آتیں۔ میں نے نور جہاں کا ذکر کیا ہے تو میرا خیال ہے اگر وہ فلم میں نہ بھی ہوتیں تو ایک عام عورت کی حیثیت سے بھی ان کا کوئی رومانس سامنے آجاتا جیسا کہ اور ہزاروں عورتوں کے رومانس سامنے آتے ہیں جو فلم سے تعلق نہیں رکھتیں۔

فلم انڈسٹری میں بھی میں نے کچھ ایسی عورتوں کو دیکھا ہے کہ جس نیک نامی کے ساتھ فلم لائن میں داخل ہوئی اسی نیک نامی کے ساتھ ریٹائرمنٹ تک پہنچیں۔ چونکہ میرا تعلق شعبہ موسیقی سے ہے اس لئے ناہید نیازی کا نام لیتا ہوں۔ یہ ایک بہت اچھی نیازی پٹھان فیملی کی چشم و چراغ تھیں۔ ان کے والد سجاد سرور نیازی جو ایس ایس نیازی کے نام سے مشہور تھے۔ اپنے وقتوں کے ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اپنے خاندان کی روایات سے بغاوت کر کے اور بزرگوں کی پروانہ کر کے موسیقی کو اپنایا تھا۔ یہ غالباً 1930ء کی بات ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب کوئی گانے کا نام لیتا تو لوگ اسے سیدھا کنجر اور میراثی ہونے کا طعنہ دیتے تھے۔ لیکن مسلمانوں میں دو اشخاص ایسے تھے جنہوں نے اپنے والدین، برادری اور عزیز و اقارب کی پروانہ کی اور اس لائن میں آئے۔ ان میں سے نامور تو رفیق غزنوی ہوئے۔

رفیق غزنوی اپنے زمانے میں گانے میں مہدی حسن سے زیادہ شہرت یافتہ تھے اور

خوبصورت بھی انتہا کے تھے۔ ان کی کئی شادیاں ہوئیں اور ایک شادی موجودہ اداکارہ سلمٰی آغا کی نانی سے بھی ہوئی جو انوری امرتسر والی کے نام سے مشہور تھیں۔ رفیق غزنوی کے والد نے بھی اپنے بیٹے سے قطع تعلق کر لیا ہوا تھا۔ وہ پنڈی کے امیر آدمی تھے اور کہا کرتے تھے کہ اپنے بیٹے سے اب میرا کوئی تعلق نہیں رہا کیونکہ وہ اب کنجر ہو گیا ہے۔

دوسرے آدمی ایس ایس نیازی تھے۔ رفیق غزنوی کی طرح وہ بھی گریجویٹ تھے۔ اور انہوں نے بعد میں آ کر ریڈیو میں ملازمت کر لی اور آخری عمر میں سٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ یہ گاتے بھی تھے اور تھوڑی بہت شاعری بھی کر لیتے۔ ایک زمانے میں ان کا یہ نغمہ بہت گونجا:

اک بار پھر کہو ذرا

یہ نغمہ پہلے شمشاد بیگم نے گایا تھا لیکن بعد میں اسے ناہید نیازی نے بھی گایا۔ گویا ناہید نیازی کو موسیقی اپنے والد سے ورثے میں ملی۔ یہ جب فلم میں آئیں تو بے حد خوبصورت اور جوان تھیں۔ جب شروع میں کوئی لڑکی فلم لائن میں آتی ہے تو لوگ سوچتے ہیں کہ نئی لڑکی ہے' کچھ جال وغیرہ پھیلائیں گے۔ خاص طور پر میوزک ڈائریکٹر۔ لیکن اگر کوئی خود خراب نہ ہونا چاہے تو کسی کو کسی بھی جگہ خراب نہیں کیا جا سکتا۔

ناہید نیازی جب گانے کے لئے کسی پروڈکشن میں آتی تھیں تو ان کی والدہ ان کے ساتھ ہوتی تھیں اور میں نے کسی ریہرسل میں یہ نہیں دیکھا کہ اس نے گاتے ہوئے یا ریہرسل کرتے ہوئے کبھی کسی سے آنکھ ملائی ہو۔ ان کے سامنے گانے کا کاغذ پڑا ہوتا تھا اور نگاہیں گانے پر ہوتی تھیں۔ وہ خود بات تک نہیں کرتی تھیں اور اگر کسی کو کوئی بات کرنا ہوتی تھی تو وہ ان کی والدہ سے بات کر سکتا تھا۔ وہ جتنا عرصہ فلم میں رہیں ان پر کوئی ایک الزام بھی نہ آیا۔ اور وہ اپنی پاکدامنی کی مثال چھوڑ کر بالآخر میوزک ڈائریکٹر۔ مصلح الدین کے ساتھ بیاہی گئیں۔

مصلح الدین بنگال کے ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھنے والے تھے اور ذات کے وہ بھی پٹھان تھے۔ ان میں اور ناہید نیازی میں کوئی رومانس نہیں ہوا تھا۔ دونوں خوبصورت

تھے اور ظاہر ہے کہ ایک لڑکی کی ایک لڑکے سے شادی تو ہونی ہوتی ہے۔ لڑکے نے اپنی بہن کے ذریعے انہیں پیغام بھیجا تو شادی ہوگئی۔ اس کے بعد یہ کچھ دیر یہاں رہے لیکن چونکہ مصلح الدین بنگلہ دیشی تھے اور ناہید پاکستانی تھی تو دونوں نے درمیانہ راستہ یہ نکالا کہ انگلینڈ میں جا کر Settle ہو گئے۔ جب میں وہاں گیا تو میری ان کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی۔ یہ وہاں ایک ہوٹل چلا رہے ہیں اور اس کے علاوہ ایک میوزک کا انسٹیٹیوٹ بھی بنا رکھا ہے۔ ان کی زندگی بہت اچھی، سکھی اور اعتماد والی گزر رہی ہے اور ان کا بیٹا بھی بہت اچھا گویا ہے۔ چنانچہ فلم میں جو الزامات آتے ہیں یہ ان کے بغیر ہی یہاں سے چلے گئے اور آج تک ان کی زندگی ٹھیک ہے۔

ایکٹرسوں میں میں شبنم کا ذکر کروں گا۔ وہ بھی ان چند ایکٹرسوں میں سے ہیں جن کا تعلق چکلے سے نہیں ہے جیسا کہ یہ خام مال ہمیشہ اس منڈی سے آیا ہوتا ہے۔ یہ بنگال کی ہندو فیملی سے تعلق رکھتی ہیں اور جب ہمارا ان سے تعارف ہوا تو یہ روبن گھوش جو کہ عیسائی ہیں، سے شادی شدہ تھیں۔ انہیں فلم میں آئے پچیس سال سے زائد ہو چکے ہیں۔ ان کی زندگی میں ایک ہی مرد نظر آتا ہے جو ان کا خاوند ہے۔ اور ان سے کوئی سکینڈل بھی منسوب نہیں ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فلمی شادیاں ناکام ہو جاتی ہیں لیکن یہ کلیہ نہیں ہے کہ ضرور ناکام ہوں اور پھر یہ فرض نہیں کر لینا چاہیے کہ فلم میں آ کر ہر کوئی خراب ہو جاتا ہے۔ میں اس بات کی نفی کرتا ہوں کہ عورتیں فلم میں آ کر خراب ہو جاتی ہیں۔ دراصل بات یہ ہے

کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

آغا گل اور سلطان راہی

فلم والوں کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ بہت بے لحاظ ہوتے ہیں اور کسی کو بخشتے نہیں۔ میں بطور فلمساز ان دو لوگوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو مجھے اس الزام سے باہر نظر آتے ہیں۔ اداکاروں میں تو سلطان راہی ہیں۔ یہ میری فلم قصہ خوانی کے سٹوری ہیرو تھے۔ ان سے فلم کے لئے بات چیت ہوئی اور معاوضہ طے پا گیا بلکہ اس مرحلے پر بھی انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ ہمارے سینئر ہیں اور آپ کا حق ہے کہ مجھ سے رعایت لیں۔ چنانچہ آپ مارکیٹ سے جا کر میرا ریٹ پتا کر لیں اور اس کے بعد معاوضہ خود طے کر دیں۔ میں نے یہی کیا اور میں نے جو ریٹ طے کیا انہوں نے قبول کر لیا اور مجھے خاصی رعایت دی۔

اس کے بعد ہم آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے پشاور گئے تو وہاں حبیب ہوٹل میں قیام کیا۔ البتہ چھوٹے عملے نے ایک دوسرے درمیان درجے کے ہوٹل میں قیام کیا۔ سلطان راہی نے کہا کہ میری فیملی بھی ساتھ جائے گی' روٹین میں بھی عام طور پر ایسا ہی ہوتا تھا۔ پروڈکشن کا ایک کھاتہ کھلا ہوتا ہے اور جہاں دیگر بل ادا ہوتے ہیں وہاں فیملی کا بل بھی ادا ہو جاتا ہے۔ ان کی بیگم اور دو بیٹیاں بھی ساتھ گئیں۔ چنانچہ وہ ایک سنگل روم اور ایک ڈبل روم لے کر رہے۔ ہم نے آٹھ دس روز وہاں قیام کیا اور جب بل آیا تو سلطان راہی کے بل میں صرف ایک سنگل روم اور ایک آدمی کے کھانے کا خرچ درج تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا۔ میں نے سوچا کہ شاید ہوٹل والے نے سلطان راہی کے اعزاز میں بل کم کر دیا ہو۔ اس لئے میں نے جا کر ہوٹل والے سے استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ باقی بل سلطان

راہی صاحب نے خود اپنی جیب سے ادا کر دیا ہے۔

میں نے سلطان راہی سے کہا کہ بھائی یہ کیا معاملہ ہے اور آپ نے باقی کا بل اپنے پلے سے کیوں ادا کیا ہے۔ یہاں تو ایک برادری آئی ہوئی ہے جس میں آپ سب لوگ بھی شامل ہیں۔ ان کا تکیہ کلام سر جی تھا اور کبھی کبھی جان جی بھی کہتے تھے۔ کہنے لگے جان جی بات یہ ہے کہ آپ کی فلم میں اداکاری میں نے کی ہے میرے بیوی بچوں نے نہیں۔ انہیں تو میں اپنے ساتھ لایا تھا اس لئے ان کا بل میں نے ادا کر دیا ہے۔ میں ان کے جواب سے بہت متاثر ہوا کیونکہ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا بلکہ صورتحال اس کے برعکس ہوتی تھی۔ اکثر اوقات تو اداکار حضرات فرمائشیں بھی کیا کرتے تھے کہ میری بیوی یا بچوں کے لئے یہ لے کر آؤ۔ سلطان راہی نے میرے ساتھ یہی سلوک نہیں کیا بلکہ یہ بھی کیا کہ بعد میں جب یہ پکچر Delay ہو گئی۔ تو جتنے پیسے بقایا تھا وہ بھی انہوں نے نہیں لئے اور کہنے لگے کہ آپ یہ بات ذہن سے نکال دیں کہ میں آپ سے یہ پیسے لوں گا۔

یہ تو میں نے ایک اداکار کا ذکر کیا ہے اب ایک سٹوڈیو مالک کی بات کرتا ہوں۔ مرحوم آغا جی اے گل کچھ باتوں میں بہت نیک نام اور کچھ میں بہت بدنام تھے۔ ان کی نیک نامیاں تو سب جانتے ہیں لیکن بدنام اس لئے تھے کہ وہ پیسے کے معاملے میں کبھی کسی کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ ان کا سٹوڈیو فلم بنانے کے لئے کچھ پیسے ایڈوانس لے کر Raw material کریڈٹ پر دیتا تھا' فلم کی شوٹنگ اور دفتر کا کرایہ وغیرہ بھی کریڈٹ پر آ جاتا تھا۔ جب فلم اختتام کو پہنچتی تو ان کا جتنا بھی بل بنتا تھا جو عام طور پر دو تین لاکھ روپے ہوتا تھا۔ وہ وصول کیے بغیر پرنٹ بالکل نہیں دیتے تھے۔ تاہم فلم کی تیاری کے دوران وہ تمام رعائتیں بڑی فراخدلی کے ساتھ دیتے تھے۔

میرے ساتھ انہوں نے مسلسل مروت کا سلوک کیا۔ جب میری پہلی پکچر ''اِک لڑکی میرے گاؤں کی'' بن رہی تھی تو یہ پکچر ایک ڈسٹری بیوٹر اور ڈائریکٹر کی وجہ سے الجھن میں پڑی۔ پھر یہ معاہدہ ہوا کہ میرا ڈسٹری بیوٹر اس پکچر کو مکمل کرے گا اور پرنٹ اٹھانے سے پہلے میری رقم ادا کرے گا۔ اس معاہدے کے ایک فریق آغا گل جی تھے۔ جنہوں نے یہ

معاہدہ کروایا تھا۔ ہر چند کہ اس فلم کے مکمل نہ ہونے میں میرا کوئی قصور نہ تھا بلکہ سارا قصور ڈسٹری بیوٹر ہی کا تھا لیکن سٹوڈیو کا جو پیسہ فلم مکمل نہ ہونے کی وجہ سے رہ گیا وہ آغا صاحب نے برداشت کیا۔

جب دوسری فلم ''عجب خان آفریدی'' بنی تو اس وقت ہمارے پاس پیسے تھے۔ اس لئے جو بل بنا میں نے پیسے آغا صاحب کے سامنے رکھ دیئے۔ آغا صاحب نے ان میں سے بھی دس بیس ہزار روپے اٹھا کر مجھے واپس کر دیئے اور کہا کہ یہ پیسے میں تمہیں اپنے لحاظ سے واپس کرتا ہوں۔

میری تیسری فلم ''قصہ خوانی'' بھی ایک سازش کا شکار ہو کر لیٹ ہوتی گئی اور پھر ہمیں ہیروئن بدلنی پڑ گئی۔ اگر سازش نہ ہوتی اور ہیروئن نہ بدلنی پڑتی تو خیال یہ تھا کہ یہ فلم تین ماہ میں مکمل کر کے ریلیز کر دی جاتی۔ اگر ایسا ہو جاتا تو یہ فلم بہت پیسے کماتی کیونکہ یہ ہندکو کی پہلی فلم تھی اور اس کا موضوع بھی بہت دلچسپ تھا لیکن ہیروئن بدلنے اور سازش کی وجہ سے فلم رک گئی۔ اب پیسے ختم ہو گئے تھے۔ کچھ ادھار پکڑ کر مزید پیسے لگائے لیکن فلم پھر بھی مکمل نہیں ہو رہی تھی اور پھر ایسا مرحلہ بھی آیا کہ میں نے سوچا کہ اس پر جو لاگت آ چکی ہے اب اسے بھی جانے دیں اس عرصہ میں آٹھ سال گزر چکے تھے۔

ایک دن یونہی بیٹھے ہوئے تھے کہ آغا صاحب کہنے لگے کہ یار اُس پکچر کا کیا کر رہے ہو۔ میں نے کہا آغا صاحب پیسہ تو اپنے پاس ہے کوئی نہیں اور پکچر ابھی کافی بقایا ہے۔ کہنے لگے پھر بھی دیکھو کہ اس کا مارکیٹ میں کیا امکان ہے۔ میں نے کہا بہتر ہو گا اگر آپ بھی اسے ذرا دیکھ لیں۔ انہوں نے خود تو نہ دیکھی البتہ اپنے دو آدمی ساتھ بٹھا دیئے۔ انہوں نے پکچر دیکھی اور یہ رائے دی کہ اگر پکچر مکمل کر لی جائے تو فلاپ نہیں ہو گی۔ آغا صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ فلم مکمل کر لو۔ میں نے کہا آغا صاحب ایک تو ابھی آپ کا بل دینا ہے اور پھر فلم مکمل کرنے کے لئے ابھی مجھے ساٹھ ستر ہزار روپے اور لگانا پڑیں گے اور ڈر یہ ہے کہ میرے پیسے بھی جائیں گے اور آپ کا بل بھی ادا نہیں کر پاؤں گا۔ کہنے لگے چلو یار اللہ مالک ہے۔ بل کی فکر تم چھوڑو اور اسے مکمل کرو۔ یا تو میرے پیسے واپس آ جائیں گے یا

تمہارے بھی چلے جائیں گے۔ کہنے لگے یہ جوا کھیل سکتے ہو۔ میں نے کہا کہ کوشش کر لیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے کچھ پیسوں کا انتظام کیا۔ ساٹھ ستر ہزار روپے سے بھی زائد پیسے لگ گئے۔ فلم مکمل ہوئی تو دیکھا کہ بطور فلم یہ ٹھیک نظر آ رہی تھی۔ اسے پشاور میں ریلیز کیا گیا۔ اس کے مقابلے میں پشتو کی تین فلمیں لگی ہوئی تھیں۔ اس نے ان کے مقابلے میں رش بھی لیا اور پہلے شو میں ہال کے اندر تالیاں بھی بجیں۔ جب شو ختم ہوا باہر سے لوگ پوچھتے تھے کہ اس میں کوئی مسالہ ہے تو دیکھنے والے سر ہلا کر کہتے تھے نہیں۔ دراصل ان سات آٹھ برسوں میں فلم کا ٹرینڈ بدل چکا تھا۔ ویسے بھی میں نے تو ایک فلم بنائی تھی۔ ایک پاکیزہ اور دلچسپ فلم۔ اس میں اچھے ڈائیلاگ' اچھی ایکٹنگ اور اچھے گانے رکھے تھے لیکن ان دنوں پشتو فلموں نے فحاشی کا ایک سیلاب برپا کر رکھا تھا جن میں ننگے ڈانس اور واہیات مکالمے ہوتے تھے اور وہ سب کچھ اس فلم میں نہیں تھا۔

ہم نے بمشکل اس فلم کی پبلسٹی کا خرچ پورا کیا اور جو بیس ہزار روپے سینما والے نے ایڈوانس دیئے ہوئے تھے۔ ان میں یہ فلم گروی رہی اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ فلم ایک آخری ڈسٹری بیوٹر کو پانچ سال پہلے بیس ہزار روپے میں دی تھی۔ تو پتہ نہیں اس نے یہ کہاں چلائی۔ لیکن آغا صاحب نے ہمیں یہ پکچر دے دی تھی۔ مگر میرے علم میں نہیں کہ آغا صاحب نے کسی اور شخص کے ساتھ دو لاکھ روپے کی یہ رعایت کی ہو۔ میں نے یہ رسید تو لکھ دی تھی کہ اس فلم کی آمدن میں سے میں بل ادا کروں گا لیکن آغا صاحب نے کبھی بل کا تقاضا نہیں کیا۔ بلکہ وہ بعد میں اس فلم کا افسوس بھی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یار تمہارے ساتھ بڑی ٹریجڈی ہوئی ہے اور تمہارا پورے کا پورا پیسہ ڈوب گیا۔

اس طرح آغا صاحب دوسرے آدمی تھے جنہوں نے میرے ساتھ دو لاکھ روپے کی مروت کی۔ چنانچہ فلم لائن بھی مروتوں سے خالی نہیں۔ اگرچہ اس میں بیشتر لوگ ماتھے پر آنکھیں رکھنے والے ہیں لیکن آغا صاحب جیسے اچھے لوگ بھی موجود تھے۔ آغا صاحب آج ہمارے درمیان نہیں لیکن ان میں بہت خوبیاں تھیں اور مجھے امید ہے کہ وہ اپنی خوبیوں کی وجہ سے اگلے جہان میں اچھے مقام پر ہوں گے۔

ایک مجبور عورت

فلم لائن میں سہارے بہت تلاش کیے جاتے ہیں اور یہ دو طرح کے ہوتے ہیں بعض مرد فلم انڈسٹری میں مقام پیدا کرنے کے لئے کسی عورت کا سہارا لیتے ہیں اور بعض عورتیں فلم میں کام کرنے کے لئے کسی مرد کا سہارا لیتی ہیں۔ ہم نے ایسے کئی لوگ دیکھے' جو فلم انڈسٹری میں آئے' کوئی حسین سہارا لیا اور فلمساز' ڈائریکٹر یا اداکار بن گئے۔ اسی طرح اگر کسی کی بہن قسم کی چیز ہوئی تو کسی پیسہ لگانے والے نے خوش ہو کر اس کو چانس دلا دیا۔ چنانچہ عورتوں کی وجہ سے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر بننے والے لوگ بھی کم نہیں ہیں لیکن کچھ عورتیں ان مردوں کا سہارا بھی لیتی ہیں جو فلم میں برسر اقتدار ہوں۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب گانوں کے سلسلے میں میرے پاس پاکستان کی اسی پچاسی فیصد فلمیں ہوتی تھیں اور لوگوں کا یہ خیال ٹھیک ہی تھا کہ اگر میں کسی کو Recommend کروں تو اسے کام مل سکتا ہے۔ کوئی تیس سال پہلے کی بات ہے کہ یہاں ایک خاتون ہوتی تھی جو فلم میں چھوٹے موٹے رول ادا کرتی تھیں اور اس سے اکثر میری سٹوڈیو میں ملاقات ہوتی تھی۔ اچانک وہ کچھ عرصہ کے لئے غائب ہو گئی اور جب برآمد ہوئی تو سیدھی میرے پاس پہنچی۔ اس کے ساتھ کوئی سولہ سترہ سال کی لڑکی تھی اور کہنے لگی کہ قتیل صاحب آپ سے علیحدگی میں کچھ مشورہ کرنا ہے۔ اس نے مجھے اپنے یہاں کے ایڈریس کے بارے میں بتایا اور گھر آنے کی تاکید کی۔ میں وہاں گیا تو اس نے خاطر تواضع کے لئے کافی کچھ رکھا ہوا تھا۔ اور پھر مجھے کہنے لگی کہ فلم لائن بہت بری لائن ہے اور اس

میں بہت برے لوگ موجود ہیں یہ میری بیٹی ہے' یہ میٹرک تک پڑھی ہوئی ہے اور اس میں اچھی اداکارہ بننے کے آثار موجود ہیں۔ لیکن میں یہ نہیں چاہتی کہ یہ دست بدست گھومے۔ آپ ایک معزز آدمی ہیں میں اسے آپ کے سپرد کرتی ہوں۔ اس پر آپ کا ہر لحاظ سے حق ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کی زندگی میں صرف ایک مرد ہی آئے اور وہ آپ ہوں۔ اب آپ ہی اسے Establish کریں۔

یہ بہت بڑا لالچ تھا ویسے بھی میرا جوانی کا عالم تھا۔ جب ایک کنواری لڑکی ہو اور اس کی ماں اسے جسمانی طور پر سپرد بھی کر رہی ہو تو اس میں بہت کشش ہو سکتی ہے۔ لیکن میں نے اس خاتون سے کہا دیکھو تم فلم انڈسٹری میں رہ چکی ہو۔ تم نے وہاں سے کیا پایا ہے اور تم زندگی بھر چند چھوٹے چھوٹے رول کر کے یہاں تک پہنچی ہو۔ ہو سکتا ہے میں تمہاری نظر میں بہت عمدہ آدمی ہوں لیکن میں بھی دوسرے مردوں جیسا ہی ہوں۔ اگر میں اسے داشتہ رکھ کر بعد میں بے وفائی کر جاؤں یا اس میں اچھی اداکارہ بننے کی صلاحیت ہی نہ ہو تو یہ کہاں کی رہے گی۔ اس لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اس چکر میں نہ پڑو اور اسے کسی ٹریننگ میں ڈالو یا اور پڑھاؤ اور ایک دو سال تک اس کی شادی کر دو۔

میرا جواب سن کر وہ سکتے میں آ گئی اور اتنی حیران ہوئی کہ اس کے منہ سے کوئی بات نہیں نکلتی تھی۔ پھر اس نے کہا: قتیل صاحب آپ نے میری توقع کے خلاف جواب دیا ہے اور میں اندر سے ہل گئی ہوں۔ اب میں رات بھر سوچوں گی اور کل آپ کو بتاؤں گی۔ میں نے کہا کہ میرا جواب ابھی سے سن لو کہ میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں اب تم جو بھی فیصلہ کرو وہ تمہارا اپنا فیصلہ ہو گا' میں اپنا فیصلہ ابھی سے سنا چکا ہوں۔ اس کے بعد وہ خاتون کبھی مجھے فلم میں نظر نہیں آئی۔ دوسرے دن جواب کی توقع تھی لیکن وہ اس روز بھی نہیں آئی۔

کوئی چار پانچ سال بعد میں کراچی میں جبیس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا اور ہوٹل کے باہر ایک ٹیکسی کے انتظار میں کھڑا تھا کہ اچانک ایک گاڑی میرے قریب سے گزری اور پھر مڑ کر واپس آئی۔ اس میں وہی عورت بیٹھی ہوئی تھی' وہ نیچے اتری اور مجھ سے لپٹ گئی کہنے لگی' قتیل صاحب آپ یہاں کب اور کیسے آئے۔ میں نے بتایا کہ میں ایک مشاعرے کے

سلسلے میں آیا ہوں تو کہنے لگی کہ آپ میرے ساتھ میرے گھر چلئے۔ میں نے کہا اس وقت تو نہیں۔ کہنے لگی اچھا آپ وقت بتائیں میں آ کر آپ کو یہاں سے لے جاؤں گی۔ میں نے وقت بتایا وہ مقررہ وقت پر آئی اور مجھے اپنی اسی بیٹی کے گھر لے گئی۔

وہاں جا کر اس نے میرے پاؤں پر اپنا سر رکھ دیا اور کہنے لگی کہ اگر آپ اس روز مجھے نہ ملے ہوتے تو آج میں آپ سے کسی اور حیثیت میں مل رہی ہوتی۔ اس واقعہ کے بعد میں نے یہاں آ کر دائی گیری کا کام سیکھ لیا تھا اور پھر دائی بن گئی۔ اپنی اس بیٹی کی شادی میں نے ایک نیک لڑکے سے کر دی۔ اس وقت تو وہ معمولی آدمی تھا لیکن اب اس کا کاروبار کافی ٹھیک ہو گیا ہے۔ میری یہ بیٹی پاکدامن ہے اور میں بھی اچھی زندگی گزار رہی ہوں۔ مگر ان سب چیزوں کا کریڈٹ آپ کو جاتا ہے۔

میں اگر اپنی زندگی کی کچھ نیکیاں شمار کرتا ہوں تو یہ واقعہ مجھے یاد آتا ہے۔ میں بہت گنہگار آدمی ہوں۔ ممکن ہے کہ ہر جگہ میں ایسا نہ کر پاتا لیکن اس ایک نیکی کا مجھے خدا جانے کیا کیا اجر دے گا۔ زندگی میں خدا نے میری بڑی عزتیں رکھی ہیں اور ان میں اس واقعہ کا بھی ہاتھ ہے۔

بیس روپے کی چوری

اب ایک ایسا واقعہ سن لیجئے جس میں آپ کو ضرورت کے تحت مجبوریوں کا خاکہ ملے گا۔ ایک دن میں امان اللہ خان نیازی اور محبوب اختر سے ملنے کے لئے گیا۔ یہ دونوں اصحاب ہی مجھے فلم میں لائے تھے اور اب دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں۔ یہ راولپنڈی کا واقعہ ہے میں گیا تو اس ارادے سے تھا کہ امان اللہ صاحب سے کچھ قرض لوں گا لیکن ایک عجیب شرمیلا پن تھا کہ قرض مانگتے ہوئے بھی جان جاتی تھی۔ میں صبح ہی صبح ان کے ہاں پہنچا تھا کہ کہیں وہ نکل نہ جائیں۔ چنانچہ جب میں وہاں پہنچا تو انہوں نے ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا ہوا تھا۔ مجھے انہوں نے اندر بیڈ روم میں ہی بلا لیا۔ وہ خود نہانے کے لئے باتھ روم میں جانے والے تھے۔ انہوں نے میلے کپڑوں میں سے پیسے نکال کر وہاں رکھے اور خود باتھ روم میں چلے گئے۔ میں آدھ گھنٹہ سے ان کے پاس بیٹھا رہا تھا لیکن مجھ سے پیسے مانگنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ جب وہ پیسے وہاں چھوڑ کر اندر چلے گئے تو میرے ذہن میں آیا کہ ضرورت کے مطابق ان سے پیسے لے لوں۔ وہ دس دس روپے کے متعدد نوٹ تھے چنانچہ میں نے ان میں سے باقاعدہ بیس روپے چوری کیے اور جیب میں رکھ لئے۔ ویسے وہ کوئی دو تین سو روپے کے نوٹ تھے۔ اب عجیب کیفیت تھی ایک جیب سے نکال کر دوسری میں ڈالتا اور دوسری سے نکال کر پھر پہلی جیب میں ڈالتا۔ ذہن میں یہ خیال بھی آتا تھا کہ انہوں نے کہیں یہ پیسے گن کر نہ رکھے ہوں اور پھر وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ یہ زندگی کی پہلی چوری تھی۔ اس کے پہلے ماں کے پیسوں میں سے تو میں گھر پر چوری کرتا رہا تھا لیکن باہر کی

یہ پہلی چوری تھی۔

اس زمانے میں بیس روپے کافی ہوتے تھے چنانچہ میں نے ضرورت پوری کی۔ لیکن ذہن پر یہ بوجھ رہا۔ بہت عرصہ بعد میں نے امان اللہ صاحب کو بتا دیا تھا کہ مجھے ایک چیز کے لئے معاف کر دیں کہ میں نے یہ گناہ کیا ہے۔ وہ سن کر بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ بہت عجیب آدمی ہو، مجھ سے پیسے مانگ لینے تھے۔ پھر کہنے لگے کہ کوئی بات نہیں۔ بہر حال میں نے جب تک اس واقعہ کا اظہار کر نہیں دیا تھا۔ میرے ذہن پر بڑا بوجھ تھا۔ لیکن میں نے زندگی میں یہی ایک چوری کی۔

اب تھوڑی سی اور بری باتوں کا ذکر کرتا ہوں جو صرف تجربے کی حد تک بری رہیں۔ میں شروع ہی سے چرس اور بھنگ کو بری چیز سمجھتا تھا لیکن ایک مرتبہ دھوکے میں آ کر بھنگ پینی پڑی جبکہ چرس میں نے خود تجربے کے طور پر پی۔ یہ واقعہ ساغر صدیقی سے متعلق ہے جو اب درویش شاعر کہلاتے ہیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب انہوں نے ابھی کالے کپڑے نہیں پہنے تھے بلکہ نارمل کپڑے پہنتے تھے۔ ہم مشاعروں میں ایک ساتھ جاتے تھے۔ میں انہیں سمجھاتا تھا کہ آپ چرس کیوں پیتے ہیں تو وہ جواب میں کہتے۔ قتیل صاحب یہ روشنی ہے اور اس سے دماغ روشن ہو جاتا ہے۔ کسی روز آپ بھی پی کر دیکھیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہا اور ایک بار ہم سیالکوٹ کے مشاعرے میں گئے۔ انہوں نے چرس بھری اور ان کے ساتھ جو کچھ اور پینے والے بیٹھے تھے انہوں نے بھی چرس بھری۔ یہ سب چرس پینے لگے تو ساغر صدیقی نے مجھے بھی چرس پلا دی۔ چرس پی کر مجھے ایسے لگا جیسے آدمی الو کا پٹھا بن جاتا ہے۔ میری اس وقت یہی کیفیت تھی۔ ساغر صدیقی کے ساتھ بھی لطیفہ ہوا۔ ان کی ایک مشہور غزل تھی:

جام چھلکاؤ میں شرابی ہوں
منہ نہ کھلواؤ میں شرابی ہوں

ہوا یوں کہ لوگ ہم سب کو اور خاص طور پر ساغر صدیقی کو بہت زیادہ چرس پیتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔ چنانچہ جب یہ غزل پڑھنے کے لئے اٹھے اور ترنم سے پڑھنا شروع

کیا تو جب یہ مصرع کہتے تھے کہ میں شرابی ہوں تو حاضرین آوازیں لگا دیتے تھے کہ نہیں آپ شرابی نہیں چرسی ہیں۔

ان کے ساتھ تو یہ ہوا اور ہمارے ساتھ یہ ہوا کہ میں پہلی بار چرس پی کر مشاعرہ پڑھ رہا تھا۔ مجھے یوں نظر آئے جسے میں جو پڑھ رہا ہوں وہ آنکھوں کے سامنے بھی لکھا ہوا آرہا ہے۔ چنانچہ میں اپنی آواز کی طرف توجہ دینے کی بجائے اسے پڑھنا شروع کر دیتا تھا۔ لوگ حیران تھے کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ بڑی مشکل سے غزل پوری کر کے میں وہاں سے ہٹا۔ عام طور پر مجھ سے مزید کلام سنانے کی فرمائش ہوتی تھی لیکن اس روز یہ بھی نہ ہوئی۔ پھر رات کو مجھے بخار بھی ہو گیا۔ حالانکہ بظاہر چرس اور بخار کا آپس میں کوئی تعلق نہیں لگتا۔ شاید نفسیاتی طور پر ایسا ہوا تھا۔ صبح اٹھ کر میں نے کہا کہ آپ نے مجھے جو روشنی دی تھی۔ اس نے تو میرے اندر اندھیرا بھر دیا ہے۔ اچھا ہوا کہ آپ نے مجھے ایک تجربہ کروا دیا ہے۔ اب میں زندگی بھر کے لئے اس سے تائب ہوں۔

بھنگ کا تجربہ یوں ہوا کہ ایک میوزک ڈائریکٹر ہوا کرتے تھے جن کا نام کریم داد خان تھا۔ ان کا گاؤں سرائے صالح ہری پور سے تین میل دور اور ایوب خان کے گاؤں ریحانہ سے ایک میل دور تھا۔ یہ ان دنوں وہاں گئے ہوئے تھے۔ میں جب لاہور سے ہری پور گیا تو ان کا پیغام آیا کہ میں یہاں آیا ہوا ہوں۔ آپ ملنے کے لئے آجائیں۔ میں جب ان کے پاس پہنچا تو دوپہر کا وقت تھا۔ ان کے پاس ان کے کوئی ساتھی بھی بیٹھے تھے مگر وہ خود کوئی چیز رگڑ رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے تو کہنے لگے کہ سردائی ہے۔ آپ پئیں گے؟ وہاں بادام وغیرہ بھی پڑے ہوئے تھے۔ اس لئے میں نے اسے سردائی سمجھا اور کہا کہ ضرور پیوں گا۔ چنانچہ انہوں نے مجھے ایک گلاس بھر کر دیا جو میں نے پیا تو سرور سا محسوس ہوا۔ اس کے بعد کھانا کھایا اور بہت سا کھایا۔ پھر مجھے نیند آگئی اور اس میں میں نے عجیب نقشے دیکھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میری چارپائی آسمان کی طرف جا رہی ہے اور جب آدھے آسمان تک پہنچی ہے تو میرے نیچے سے چارپائی نکل گئی ہے اور میں دھڑام سے زمین پر آگرا ہوں۔ اس طرح آنکھ کھل جاتی تھی۔ پھر کبھی میں کانٹوں پر آجاتا تھا اور کبھی

پھولوں میں چلا جاتا تھا۔ کبھی جنت میں ہوتا تھا تو کبھی دوزخ میں۔ عجیب عجیب نقشے سامنے آتے تھے اور چونک کر اٹھ جاتا تھا اور پھر سو جاتا تھا۔ انہوں نے رات کے تقریباً آٹھ بجے مجھے اٹھایا تو میں بڑی مشکل سے جاگا اور میں نے کہا کہ یار یہ کیسی سردائی تھی۔ کہنے لگے یہ سردائی ہی تھی۔ میں نے کہا پھر اس میں نشہ کیوں ہے۔ کہنے لگے کہ میں نے تو بھنگ پلائی تھی۔ چنانچہ بھنگ کا تجربہ یوں ہوا۔

ہمارے بہت اچھے اور پیارے دوست تنویر نقوی بھی یہی کام کیا کرتے تھے۔ میں نے انہیں اپنا تجربہ بتایا تو کہنے لگے کہ آپ کے ساتھ ہی ایسا ہوا ہے ہمارے ساتھ تو کچھ نہیں ہوتا۔ میں تو یہ پی کر شعر بھی لکھتا ہوں۔ میں نے کہا کہ جناب آفرین ہے آپ پر۔

ماسکو یاترا

بچپن میں بہت نمازیں پڑھیں' اس کے بعد جب لوگوں کو فرقہ پرستیوں میں گھرے دیکھا تو میری نمازیں بے قاعدہ ہو گئیں اور ہوتے ہوتے یہ نمازیں سمٹ کر عید اور جنازے کی نمازوں تک آ گئیں۔ لیکن کبھی کبھی یوں ہی نماز پڑھنے کو جی چاہتا تھا۔ جب میں ماسکو گیا تو میرے ساتھ دو بنگالی پروفیسر تھے۔ ان میں سے ایک پروفیسر شوکت عثمان تھے جو بہت اچھے افسانہ نگار بھی تھے اور دوسرے پروفیسر سرور مرشد تھے۔ جب ہم لینن گراڈ پہنچے تو ہم نے تمنا کی تھی کہ ہمیں مساجد اور گرجے دکھائے جائیں۔ چنانچہ ہمیں لینن گراڈ کی مسجد میں لے جایا گیا۔

یہ کالے پتھر کی بنی ہوئی ایک بہت خوبصورت مسجد تھی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ امیر تیمور کے زمانے کی بنی ہوئی ہے۔ یہ جمعہ کا دن تھا اور مسجد میں کوئی سو ڈیڑھ سو مسلمان موجود تھے۔ میرا جی چاہا کہ یہاں نماز پڑھی جائے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ چلو بھئی نماز پڑھیں تو انہوں نے ہنس کر ٹال دیا۔ میں نے کہا کہ پھر میں نماز پڑھتا ہوں۔ وہ کہنے لگے ٹھیک ہے ہم سگریٹ پیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے وہاں جا کر نماز پڑھی لیکن انہوں نے نہیں پڑھی۔

اس طرح کا ایک واقعہ پاکستان کا بھی ہے۔ رحیم یار خان میں ایک مشاعرہ تھا جس کے منتظمین ہمیں شیخ زید بن سلطان النہیان کی شہر سے باہر واقع شکارگاہ دکھانے کے لئے لے گئے۔ وہاں ہم نے شکارگاہ میں ایک چھوٹی سی لیکن بڑی خوبصورت مسجد دیکھی۔ کوئی

بھی اچھی مسجد ہو تو مجھے بہت انگیخت کرتی ہے۔ لہٰذا میں نے اور کچھ دوسرے لوگوں نے وہاں پر نماز ادا کی۔ اس وقت ہمارے زیادہ اسلامی شاعر احسان دانش بھی ساتھ تھے۔ ان سے کہا کہ چلئے نماز پڑھتے ہیں۔ کہنے لگے بھئی ہمارے تو گھٹنوں میں درد ہے۔ مجھے یہ بات کھلی اور لطف کی بات یہ ہے کہ بیشتر شعراء نے نماز ادا کی لیکن انہوں نے نماز نہیں پڑھی۔

حفیظ جالندھری اور احسان دانش یہ دونوں ہمارے شاعر اسلام ہیں۔ ہم نے سینکڑوں مشاعرے ایک ساتھ پڑھے ہیں لیکن میں نے کسی جگہ ان دونوں کو نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔ میں نے اپنے معتبر ساتھیوں سے بھی پوچھا کہ شاید میری نظر سے یہ واقعہ نہ گزرا ہو۔ لیکن جب بھی میں نے کسی سے سوال کیا کہ آپ نے کبھی انہیں نماز پڑھتے دیکھا ہے تو سب کا جواب نفی میں تھا۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں:

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

یہ لوگ جو اسلام کا زیادہ نام لینے والے تھے' اسلام کا نام تو لیتے تھے لیکن اس کی عملی شکل نہیں رکھتے تھے۔ اس کے برعکس ہمارے جیسے لوگ جو اپنے آپ کو زیادہ گنہگار بھی سمجھتے ہیں اور جنہوں نے مذہب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بھی نہیں بنا رکھا' کبھی کبھی خلوص کی نمازیں بھی پڑھ لیتے ہیں۔ ممکن ہے ہمیں اللہ تعالیٰ انہی کا اجر دے دے۔

اس سلسلے میں مجھے مرحوم شورش کاشمیری بہت یاد آتے ہیں۔ کبھی کبھی جب ان سے ملاقات ہوتی تھی تو کہتے تھے کہ قتیل صاحب! آپ میرے مسلک سے بہت دور ہیں' آپ یونہی سرخوں کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں' مجھے تو آپ کی رومانی شاعری بہت پسند ہے۔ ان کا تکیہ کلام سرخوں کے ساتھ تھا۔ مگر وہ اپنے خیالات کے باوجود کبھی کبھی نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔

میری زندگی کا جو بہت تھوڑا تجربہ ہے اس میں میں نے مذہب کا نام لے کر واقعی خدا کا خوف رکھنے والوں کو بہت کم دیکھا ہے۔ میرے مشاہدے میں اکثر ایسے لوگ آئے ہیں

جو خدا کو خوش کرنا چاہتے ہیں اور کرتے بھی ہوں گے لیکن میں نے ان میں خدا کے بندوں کو خوش کرنے والے نہیں دیکھے۔ میں نے بہت نمازی دیکھے جو نمازیں تو باقاعدگی سے پڑھتے ہیں لیکن اگر کوئی پڑوس میں بھوک سے مر رہا ہو تو اسے دیکھنے کے لئے نہیں جاتے۔ یہ زندگی کا ایسا رویہ رکھتے ہیں کہ خدا کے بندوں کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہیں' ان کی مدد نہیں کرتے' اگر دوسروں میں کوئی خامی ہو تو ان کی تضحیک کرتے ہیں اور اپنے آپ کو عظمت کے ایک بہت بڑے پیڈسٹل پر کھڑا سمجھتے ہیں۔

والد کی وفات کے بعد جن لوگوں سے میرا واسطہ رہا ان میں سے اکثر وہ لوگ تھے جو میرے والد کے مقروض تھے اور اللہ کے فضل و کرم سے دیندار کہلاتے تھے۔ رسیدیں وغیرہ تو تھیں نہیں لیکن چونکہ میں بڑا بیٹا تھا اس لئے جانتا تھا کہ کس سے کتنا قرض لینا ہے۔ پھر کچھ لوگوں کو میرے والد نے پیسے میرے ہاتھ میں بھیجے تھے۔ مگر جب والد فوت ہو گئے تو ان میں سے بعض افراد تو مکر ہی گئے اور کہا کہ ہم نے تو کوئی قرض دینا ہی نہیں اور بعض نے کچھ قرض مانا لیکن کہا کہ ہمارے حالات اچھے نہیں ہیں تم معاف کر دو۔ اس طرح جان چھوٹی۔

ہمارے مقروضوں میں سے ایک آدمی ایسا تھا جس کے پاس مذہبی بڑائی جتانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ خدا سے بہت دور ہے۔ جب میرے والد فوت ہوئے تو یہ شخص ہری پور سے باہر تھا۔ واپس آیا تو اس نے خود آ کر مجھے بتایا کہ میں نے تمہارے والد سے بارہ سو روپے قرض لیے تھے اور وہ میرے ذمے واجب الادا ہیں۔ مجھے ان بارہ سو روپوں کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا لیکن اس نے نہ صرف اس بارے میں بتایا بلکہ پانچ سو روپے لا کر مجھے دے بھی دیئے اور کہا کہ باقی کے پیسے میں تھوڑے تھوڑے کر کے دے دوں گا۔ یہ اس آدمی کی بات ہے جو ان دینداروں کی نظر میں بالکل بے دین تھا۔

چھوٹے شہروں میں اور نسبتاً کم پڑھے لکھے گھرانوں میں مرگ کے بعد رسوم پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ چنانچہ میرے والد کے فوت ہونے کے بعد کبھی قل ہوئے تو کبھی

چہلم، چہلم والے دن تو یوں تھا کہ ہماری پنڈی اور ہری پور کی برادری اور شہروں والے لوگ اس طرح آئے ہوئے تھے جیسے کسی بارات پر آئے ہوں۔ یہ سب لوگ اس طرح ٹوٹ کر کھانا کھا رہے تھے کہ میرے ذہن میں بار بار یہ سوال اٹھتا تھا کہ ہم مرحوم کے لئے خیرات کر رہے ہیں یا اس کے مرنے کی خوشی میں تقریب کر رہے ہیں۔ میرے ذہن میں بغاوت تو پہلے سے تھی۔ اس واقعہ کے بعد اس میں مزید اضافہ ہو گیا۔

میں تو ایسے انسان کی عزت کرتا ہوں جو خدا کے بندوں کو خوش رکھے اور خدا کی راہ میں دوسروں کو کچھ دے لیکن ایسے معاملات میں کوئی خرچ نہ کرے جن سے انسان کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں اللہ کا گنہگار ہوں تو مجھے زیادہ فکر نہیں کرنی چاہیے۔ وہ رحیم ہے اور مجھے بخش دے گا۔ لیکن اس کے بندوں سے میں نے جو زیادتیاں کی ہوئی ہوں گی انہیں وہ نہیں بخشے گا۔ خود اس کا ارشاد ہے کہ اگر تم نے میرے فرائض ادا نہیں کیے تو میں تمہیں بخش دوں گا لیکن تم نے میرے بندوں سے جو زیادتیاں کی ہوں گی وہ بندہ ہی بخشے تو بخشے میں نہیں بخشوں گا۔

میرے سامنے جتنے بھی مصنوعی قسم کے دیندار آئے ان کا رویہ یہی رہا ہے کہ وہ مذہب کی آڑ میں کوئی نہ کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے رہے۔ میں یتیم تھا، میری والدہ بیوہ تھیں اور میرا ایک بھائی اور ایک بہن بھی تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم لوگ امیر تھے لیکن ہمیں سرپرستی اور رہنمائی کی ضرورت تھی۔ لیکن مجھے جو بھی سرپرست اور رہنما ملے ان کے پیچھے کوئی نہ کوئی غرض تھی، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

ان دیندار لوگوں کے برعکس میرے والد کا ایک ہندو دوست تھا۔ وہ شخص کباڑیا تھا اور پنڈی میں پرانے سامان کا کاروبار کرتا تھا۔ لکھ پتی آدمی تھا اور میرے والد کا جوئے کا ساجھی وال تھا اور دونوں مل کر جوا کھیلا کرتے تھے۔ دونوں کے ایک دوسرے سے کافی قریبی تعلقات تھے۔ جب میرے والد فوت ہوئے تو اس کا افسوس کا خط آیا۔ اس کے بعد ایک اور خط آیا جس میں وہ جتنے رنج کا اظہار کر سکتا تھا کیا تھا اور لکھا تھا کہ چند روز تک میں خود بھی آؤں گا۔ وہ قل اور چہلم کی رسموں کے دوران کسی روز آیا کیونکہ وہ ہندو تھا اور اس کا

خیال تھا کہ ممکن ہے ان رسموں میں میرا شامل ہونا بعض لوگوں کو ناگوار گزرے۔

وہ جب آیا تو جہاں میرے والد بیٹھا کرتے تھے وہاں بیٹھ گیا اور پورے چوبیس گھنٹے وہیں پر خاموشی سے بیٹھا رہا۔ اس دوران اس نے فروٹ کے علاوہ اور کچھ نہ کھایا نہ پیا۔ یہ ایک قسم کا برت تھا جسے ہمارا روزہ ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس نے اس ماتم میں ایک برت رکھا اور اس دوران آگ کی پکی ہوئی کوئی چیز نہیں کھائی اور پھر چلا گیا۔

بعد میں ہم نے جب اسے لکھا کہ چہلم ہے تو وہ چہلم کے ایک یا دو دن بعد آیا اور جہاں میرے والد بیٹھتے تھے وہیں بیٹھا اور جہاں میرے والد سوتے تھے اس چارپائی پر سویا اور زیادہ تر وقت خاموش رہا۔ البتہ کبھی کبھی اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ چوبیس گھنٹے کے بعد اس نے اپنا برت توڑا اور کھایا پیا۔ پھر مجھ سے کہا کہ بیٹے تم یہ نہ سمجھنا کہ تم اکیلے رہ گئے ہو، تمہارے والد میرے بھائی تھے اور میں تمہارا چچا ہوں۔ ہم میں کوئی فرق نہ سمجھنا اور زندگی میں کسی مرحلے پر بھی تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بلا تکلیف لکھنا۔ پھر اس نے اس زمانے میں سو روپے کا نوٹ نکال کر مجھے دیا یہ 1935ء کی بات ہے اور اس وقت کا سو روپیہ آج کے دس ہزار روپے کے برابر ہوگا اور کہا کہ یہ میری طرف سے اپنے باپ کے سلسلے میں خیرات کر دینا۔

اس ہندو کا یہ کیریکٹر اس وقت دیکھا جب اپنے لوگ پیسے تو درکنار، رہنمائی کے پردے میں ایسے کاروبار بتاتے تھے جن میں ان کا اپنا مفاد ہو۔ بلکہ ان لوگوں نے میرے والد کے استعمال کی بہت سی چیزیں تبرک کے نام پر آپس میں بانٹ لیں۔ ان لوگوں کو میرے والد کے عمدہ فراک کوٹ، بوٹ، یا ویسٹ اینڈ کی گھڑیوں میں سے جو چیز بھی نظر آئی انہوں نے وہ چہلم کے اندر اندر ختم کر لی۔ اس کے مقابلے میں ان کے ایک غیر مسلم دوست کا رویہ قابل تعریف تھا۔ چنانچہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کم از کم میری زندگی میں وہ تجربات آئے ہیں جنہوں نے مجھے ان جعلی دینداروں سے بہت مایوس کیا ہے۔ کچھ اصل دیندار بھی ملے ہیں لیکن کوئی دیندار سینکڑوں میں سے ایک ہی آیا ہے، اور جب آیا ہے تو مجھے ایسا لگا ہے کہ میں رسول اللہ کے زمانے میں بیٹھا ہوا ہوں اور کوئی صحابی آ گئے ہیں۔

میرے رشتہ داروں میں ہی ایک شخص تھا جسے ہم ملکا ماما کہا کرتے تھے۔ وہ معمولی حیثیت کا آدمی تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد جب میں تکلیف میں تھا تو وہ ہمارے ہاں آتا تھا' بیٹھ جاتا تھا اور چائے پیتا تھا لیکن ساتھ ساتھ یہ اندازہ بھی کرتا تھا کہ ہماری مالی حالت کیسی ہے۔ اسے یہ بھی پتا تھا کہ میں اس سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ اس لئے جب وہ محسوس کرتا تھا کہ ہم تکلیف میں ہیں تو مجھے کہتا تھا کہ یہ بیس روپے رکھ لو ان کی فکر نہ کرنا جس وقت ہوں مجھے دے دینا۔ میں کہتا تھا کہ ضرورت نہیں ہے اور واپس کرنے کی کوشش بھی کرتا تھا لیکن جب تک میرے حالات خراب رہے اور جب تک میں ہری پور میں رہا اس کا یہی رویہ رہا۔

والد کے انتقال کے بعد پہلے تین سال تو کچھ خوشحالی وغیرہ رہی لیکن اس کے بعد حالات کافی بگڑ گئے اور مجھے چھوٹی سی نوکری کرنا پڑی۔ پھر جائیداد سے بھی کچھ کرایہ آتا تھا لیکن اس کے باوجود میں مشکل میں تھا۔ چنانچہ غربت کو دور کرنے کے لئے میں نے ایک اور کام کیا ہوا تھا جو یہ تھا کہ لاہور سے ایک ماہنامہ رسالہ ''گزارا'' نکلتا تھا جس کے ایڈیٹر طاہر میراب بھی موجود ہیں۔ انہوں نے لاہور ہی میں ایک ادارہ دارالنشر کے نام سے قائم کر رکھا تھا اور ان کا اشتہار اسی پرچے میں چھپتا تھا کہ جو لوگ اپنے نام سے اشعار اور افسانے لکھوا کر مشہور ہونا چاہتے ہیں وہ ہم سے رجوع کریں۔ انہیں اس زمانے میں آرڈر آتے تھے کہ ہمیں اتنی غزلیں لکھ دیں چنانچہ وہ آٹھ آنے فی شعر کے حساب سے قیمت وصول کر کے چار آنے اپنے پاس رکھتے تھے اور چار آنے مجھے دیا کرتے تھے۔ اس طرح انہیں جتنے آرڈر ملتے تھے وہ میرے پاس ہری پور میں پہنچ جاتے تھے۔ میں نے اس زمانے میں اتنا کلام لکھ کر بیچا کہ ایک ہندو رئیس دلشاد نشکلنک' جو یہ کلام خریدتے تھے' نے میرے لکھے ہوئے کلام سے اپنے نام پر دو کتابیں چھپوائیں جن کے نام ''تیرے گیت'' اور ''میرے گیت'' تھے۔

میں یہ واقعہ اب شکایتاً بیان نہیں کر رہا بلکہ اس زمانے میں تو اس نے میرے لئے سہولت پیدا کر دی تھی اور میرا یہ روزگار بن گیا تھا کیونکہ آمدنی کم تھی جبکہ اخراجات وہی تھے

جو پہلے سے چلے آ رہے تھے۔ میں ملکا ماما سے جو قرض لیا کرتا' جب طاہر میر صاحب کا منی آرڈر لاہور سے آتا تو وہ قرض چکا دیا کرتا تھا۔

غربت کا یہ بھی عالم تھا کہ تنخواہ بائیس روپے ماہوار ملتی تھی۔ ایک کلرک اور محرر کی اس زمانے میں یہی تنخواہ ہوتی تھی کیونکہ بیس روپے ماہانہ سے تنخواہ شروع ہوتی تھی اور ایک روپیہ سالانہ ترقی لگتی تھی۔ میں دو سال ملازمت کر چکا تھا۔ آمدن کم تھی اس لئے میں ایک بنیے سے قرض لیا کرتا تھا اور اس سے ہم آٹا گھی اور شکر وغیرہ خریدا کرتے تھے۔ یہ قرض تنخواہ سے چکا دیا کرتا تھا۔

ایک مہینہ ایسا آیا کہ میں نے چھٹیاں بہت کیں۔ چھٹیاں تو محدود ہوتی ہیں جو پہلے ہی ایسی ہی سرگرمیوں کی وجہ سے ختم ہو چکی تھیں چنانچہ میں نے اس مہینے میں بلا تنخواہ چھٹیاں زیادہ لے لیں۔ اب تنخواہ کوئی نہ ملی اور میں نے بنیے کو بھی کوئی پیسہ نہ دیا اور خود بھی تکلیف میں رہا۔ دوسرے مہینے ایسا ہوا کہ میں ابھی تنخواہ لے ہی رہا تھا اور خیال یہ تھا کہ اس سے کہوں گا کہ بھائی اس ماہ کم لے لے آئندہ ماہ چکا دوں گا کہ اس نے بڑی بے تکلفی سے تنخواہ مجھ سے چھین کر اپنی جیب میں ڈال لی اور کہنے لگا کہ اچھا تم دوکان پر آؤ گے تو پھر حساب کتاب کریں گے۔ میں اتنا شرمیلا تھا کہ اسے کچھ کہہ بھی نہ سکا۔ میں نے وہ مہینہ انتہائی مشکل سے گزارا اور وہ بھی یوں کہ گھر کا کچھ اور سامان بیچا۔ لیکن خدا خوش رکھے میرے خریدار ہمیشہ متمول رشتہ دار ہی ہوتے۔

عبرت کا تازیانہ

ہری پور کے زمانے میں جن لوگوں سے ایک طرح کی تربیت حاصل کی ان میں پرچہ ''نوجوان افغان'' کے مالک محمد اکبر خان قریشی اور ان کے معاون ایڈیٹر تاج محمد خان تارخیلی بھی شامل تھے۔ اب یہ دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اکبر خان قریشی کبھی حب وطن کے جرم میں کافی عرصہ جیل میں رہے تھے اس لئے وہ اپنے نام کے ساتھ سابق اسیر فرنگ بھی لکھتے تھے۔ اس زمانے میں اسیر فرنگ ہونا بڑے فخر کی بات سمجھی جاتی تھی۔ تاج محمد خان تارخیلی بڑے بیباک آدمی تھے۔ ان کے بیٹے شاہد آجکل لاہور ہی میں وکیل ہیں جبکہ دوسرے بیٹے فوج میں اچھے عہدوں پر تعینات ہیں۔

میرا ہمیشہ سے یہ قاعدہ رہا ہے کہ میں اپنے سے زیادہ پڑھے لکھے لوگوں اور بالخصوص ان لوگوں کی محفلوں میں جا کر بیٹھتا تھا جو عمر اور رتبے میں مجھ سے بڑے ہوں اور جنہیں میں ذہنی طور پر اپنے سے بڑا سمجھتا تھا۔ غیر شعوری طور پر میرے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ وہاں بیٹھوں جہاں سے کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ بجائے اس کے کہ میں اپنے سے چھوٹوں میں بیٹھوں اور ان پر رعب ڈالوں اور وہ میری باتیں سنتے جائیں اور مجھے جوابی طور پر کچھ نہ دیں۔

اکبر خان اور تاج محمد کے علاوہ ''پیغام سرحد'' کے ایڈیٹر قاضی عزیز الرحمان کی محفل میں آنا جانا تھا جو صاحب علم آدمی تھے۔ پھر وہاں ایک مست قلندر انسان تھے' محمد حسین سرخپوش۔ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ یہ سرخ لباس پہنتے تھے اور انہوں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ جب تک آزادی نہیں ملے گی وہ سرخ وردی پہنے رہیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا عہد

نبھایا۔ لیکن لطیفہ یہ ہوا کہ آزادی بھی آ گئی تو اب وہ کیا کرتے۔ اب تو انہیں یہ کپڑے اتار دینے چاہئیں تھے۔ لیکن اب ان کا نام ہی سرخپوش پڑ چکا تھا اس لئے وہ مجبوراً وہی کپڑے پہنے رہے۔ یہ سادہ سے آدمی تھے اور زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے اور ہماری بزم ادب میں آیا کرتے تھے۔ انہیں علم و ادب کے سلسلے میں باتیں کرنے کا شوق تھا۔ اس لئے ہم ان کی باتیں بڑی توجہ سے سنا کرتے تھے۔

ان سب کے علاوہ وہاں ترکی سے آئے ہوئے ایک صاحب بھی تھے جن کا نام لطفی آفندی تھا۔ مگر پیشے اور ترک ہونے کی مناسبت سے لوگ انہیں حکیم ترکی کہا کرتے تھے۔ اب یہ بھی اس دنیا میں نہیں ہیں۔ مدت ہوئی وہ ہندوستان میں آئے تھے اور پھر پاکستان بھی بن گیا لیکن یہ حکیم ترکی کے نام سے ہی مشہور رہے۔ انہوں نے یہیں شادی کی تھی اور یہیں ان کے بچے بھی ہوئے۔ بڑے ملنسار آدمی تھے۔ ان کے مطب کے پچھلے حصے میں ہر وقت چائے اور محفل چلتی رہتی تھی اور لوگ تاش کھیلتے رہتے تھے۔ ایک بار انہیں نجانے کیا سوجھی کہ پیچھے خط و کتابت کی تو ان کے کچھ رشتے دار برآمد ہوئے۔ ان سے ملنے کے لئے وہاں گئے تو وہاں ان کی وفات ہوگئی یعنی جہاں کی مٹی تھی وہیں پہنچ گئی۔

ان کے علاوہ اس وقت دوستوں میں جو لوگ تھے ان میں ایک ڈاکٹر عزیز بھی تھے جو بعد میں پنڈی میں کرنل عزیز ہو کر فوت ہوئے۔ پھر ایک رگوننڈن کپور تھے جو میونسپلٹی میں ہیڈ کلرک تھے۔ ایک آغا فیاض علی شاہ جو خود شعر کہتے تھے اور ان کا ایک بیٹا بھی اچھا شاعر ہے جبکہ دوسرے بیٹے فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ پھر ایک دوست حفیظ تھے۔ ایک اور دوست غلام جان خان تارخیلی ہوتے تھے جبکہ ایک اور پرمی چرم کولی تھے۔ ان دونوں کو چھوڑ کر باقی سب عمر اور رتبے میں مجھ سے بڑے تھے۔ ان سب دوستوں اور بزرگوں کے علاوہ پھر ایک حکیم عبدالسلام تھے جو پہلے کانگرس میں رہے پھر مجلس احرار میں آ گئے۔

میں نے ان سب سے بہت کچھ سیکھا اور ان سے ہی کم علمی کے باوجود مجھے گفتگو کا طریقہ آیا اور محفل میں بیٹھنے کے آداب آئے۔ یہ چیزیں میں اپنے والد سے بھی سیکھ رہا تھا۔ میرے والد نے کاروبار تو کئی کیے لیکن ان کا جو مشغلہ ساری زندگی رہا' وہ جوا تھا۔ وہ نجی محفلوں میں فیروز ہری پوریا کے نام سے مشہور تھے۔ نام کے ساتھ یہ جولاحقہ لگ جاتا ہے

کسی کا نام ہوتا ہے تو ہی لگتا ہے۔ انڈیا کے کسی بھی علاقے میں جو رئیس جوار یا ہوتا تھا' وہ میرے والد کو جانتا تھا۔

میں اپنے والد کے ساتھ بہت رہا ہوں اور بہت بڑے بڑے جوئے دیکھے لیکن مجھے جوئے کی طرف رتی بھر رغبت نہیں ہوئی البتہ میں نے والد کی اور اچھی چیزوں کا اثر ضرور لیا۔ یا پھر میں نے جن لوگوں کا اثر لیا ہے ان کی فہرست میں نے اوپر گنوائی ہے یہ سب صاحب علم اور سیاست والے لوگ تھے۔ میں نے ان سے اثر لیا اور اپنی زندگی کی تعمیر کی۔

جب والد فوت ہو گئے اور بعد میں کچھ تکلیف کا زمانہ بھی آیا تو والد کے ایک دوست ملک قیوم تھے اور دوسرے پشاور والے جان صاحب تھے۔ ان کی ایک کار نیوال چلتی تھی اور ان کا پورے انڈیا میں ٹور ہوتا تھا۔ میں ملک قیوم صاحب کے پاس گیا تو انہوں نے کہا کہ تم میرے بھتیجے ہو' اگر تمہیں کبھی پیسوں کی ضرورت ہو گی تو ویسے بھی دے دیں گے لیکن کیا یہ بہتر نہیں کہ تمہیں ہم کار نیوال کے ساتھ بھیج دیں۔ تمہارا عہدہ اسسٹنٹ منیجر ہوگا اور ہم تمہیں دو سو روپے ماہانہ تنخواہ دیں گے۔ اور کہا کہ تم بس کار نیوال کے ساتھ رہا کرو گے اور ذرا چیک کر لیا کرو گے کیونکہ تم اپنے آدمی ہو۔

اس زمانے کے لحاظ سے دو سو روپے بہت تنخواہ تھی لیکن میں نے کہا کہ میں یہ کام ہرگز نہیں کروں گا۔ اگر آپ مجھے یہاں کسی دوکان پر پچاس روپے ماہوار دے کر بٹھا دیں تو مجھے وہ تو قبول ہے لیکن میں کسی ایسے کام میں نہیں جانا چاہتا جس کا جوئے سے کوئی تعلق ہو۔ میں نے اس زمانے میں جوئے کی دو سو روپے ماہانہ کی پیشکش ٹھکرائی تو کچھ رشتے دار کہنے لگے کہ تم نے بڑا اچھا چانس ضائع کر دیا ہے۔

اللہ کا فضل ہے کہ میرا ذہن کبھی ناجائز آمدن کی طرف نہیں گیا اور میں نے پیسے کے لئے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ میں نے اس وقت یہ عہد کیا تھا کہ محنت کروں گا اور چھوٹی سے چھوٹی نوکری بھی کر لوں گا لیکن رزق حلال کھاؤں گا۔ میں نے اس دور میں رزق حلال کا عہد کیا تھا جب اس کا اتنا شہرہ نہیں تھا۔ آج رزق حلال کا بہت شہرہ ہے اور نوٹوں پر بھی یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔ لیکن اس کے پیچھے جتنی حرام کاریاں ہوتی ہیں مجھے ان سے چڑ آتی ہے۔

ہمارے معاشرے میں کس قدر منافقت ہے۔ کسی دفتر میں جائیں تو وہاں قائداعظم کے نام سے ایک نعرہ لکھا ہوتا ہے اور اس کے نیچے بیٹھ کر اس کی سراسر خلاف ورزی ہو رہی ہوتی ہے۔ لیکن اس کا مجھ پر یہ کرم رہا ہے کہ میں نے ہمیشہ محنت کر کے اور چھوٹے سے چھوٹا کام کر کے حلال کی کمائی کی ہے اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے جسم میں جتنا بھی خون ہے وہ سارا حلال کی کمائی کا ہے اور اس پر مجھے فخر ہے میں اپنے آپ کو اس حاجی سے بہتر سمجھتا ہوں جو چار حج کر کے آتا ہے اور پھر آ کر بلیک کرنے لگتا ہے۔ اس سے میں وہ گنہگار بہتر ہوں جسے خدا کا خوف تو ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خدایا میرا دم محنت کرتے ہوئے یا اپنے فن کی انجام دہی کرتے ہوئے نکلے۔

کئی بار غربت کی وجہ سے انسان کا ایمان ڈولتا بھی ہے۔ جب میں میونسپلٹی میں کام کرتا تھا تو ایک ایسا موقع بھی آیا تھا۔ ان دنوں مجھے چونگی پر لگا دیا گیا تھا اور چونگی میں اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ اگر کوئی محرر بد دیانتی کرنی چاہے تو کر سکتا ہے۔ وہاں ایک ہندو ساہوکار تھے ان کی منڈی تھی اور ان کا منشی ان محرروں سے مل کر غبن کیا کرتا تھا۔ ایک دن وہ منشی میرے پاس بھی آیا اور مجھے اس نے طریقہ بتایا کہ اس طرح پہلے ایک رسید کاٹ دو اور پھر اس میں تبدیلی کر دو۔ جتنے پیسے آئیں گے اس میں سے آدھے تمہارے ہوں گے اور آدھے میرے۔

میں نے اس طرح کرنا شروع کر دیا۔ کوئی دو گھنٹے گزرے ہوں گے تو اصل سیٹھ میرے پاس آیا۔ وہ بہت نیک نام آدمی تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ یار تم تو بڑے اچھے باپ کے بیٹے ہو لیکن تم نے یہ کیا کام شروع کر دیا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اس کو پتہ چل گیا ہے اور خاموش ہو کر کھڑا رہا۔ اس نے میرے منہ پر پیار اور غصے سے ملا ہوا ایک ہلکا سا تھپڑ رسید کیا اور کہنے لگا کہ آئندہ ایسے مت کرنا اور یہ پرچی ہے اسے ٹھیک کر دو۔ میں اس کے ساتھ ہی لرز گیا۔ میں نے وہ پرچی ٹھیک کر دی اور شکر ہے کہ یہ کام شروع ہی میں چیک ہو گیا۔

یہ واقعہ میرے لئے عبرت کا تازیانہ بنا۔ اگر وہ سیٹھ زندہ ہے تو خدا اسے باقی زندگی خوش رکھے اور اگر وہ مر گیا ہے تو خدا اسے آخرت میں جو اچھی جگہ ہے وہ دے کہ اس ہندو ساہوکار نے مجھے سیدھے راستے پر ڈال دیا۔

دو یکطرفہ معاشقے

ہری پور میں ایک آزاد خیال اور ایڈوانس فیملی تھی جن کے ہاں میرا آنا جانا تھا۔ اس وقت میری عمر تقریباً بیس اکیس سال تھی۔ اس فیملی میں کچھ بیٹیاں بھی تھیں لیکن جس لڑکی کا میں ذکر کرنے والا ہوں اس کی عمر بھی تقریباً اتنی ہی تھی۔ اس لڑکی نے مجھ میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ مگر میرے دل میں ہمیشہ یہ تصور رہا ہے کہ میں جس دوست کے گھر میں جا رہا ہوں اس کی بہن میری بہن ہے اس طرح اگر محلّہ ہے تو وہ اپنی عزت۔ اگر رومانٹک ذہن ہے بھی تو اس کی کچھ حدود ہیں۔ ان حدود سے باہر شاعرانہ ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن ان حدود کے اندر ہرگز ایسا نہیں کر سکتے۔ چونکہ وہ لڑکی دوست کی بہن تھی اس لئے میں اسے ذہنی طور پر اپنی بہن ہی سمجھتا تھا۔

اس لڑکی نے خواہش ظاہر کی کہ ادیب فاضل کیا جائے چونکہ میں شاعر تھا اس لئے اس کا خیال تھا کہ میں اس کی معاونت کروں گا اور مل کر پڑھا کریں گے۔ چنانچہ کتابیں خرید کر ہم نے مل کر پڑھنا شروع کر دیا۔ اس دوران میں نے محسوس کیا کہ لڑکی نے پڑھنے کی تجویز محض قربت بڑھانے کے لئے پیش کی ہے۔ کیونکہ جو عشقیہ شعر ہوتا تھا یا جس میں عشقیہ باتیں کرنے کی زیادہ گنجائش ہوتی تھی وہ اس پر انگلی رکھ کر کہتی تھی یہ شعر سمجھائیں۔ جب مجھ پر اس نادان لڑکی کے ارادے کھل گئے تو میں نے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیا اور اسے یہ تاثر دیتا تھا جیسے مجھے کسی چیز کی سمجھ نہیں آ رہی ہے

ہمیں اس طرح پڑھتے ہوئے ابھی دس پندرہ دن ہی گزرے تھے کہ اس نے اندازہ

کیا کہ اب اگلا قدم مناسب رہے گا۔ ان دنوں پنڈی میں کوئی بڑی مشہور فلم لگی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس نے پروگرام بنایا کہ چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر پنڈی چلتے ہیں اور وہاں جا کر یہ فلم دیکھتے ہیں کیونکہ آپ کا گھر تو وہاں بھی ہے۔ میں نے کہا کہ ہاں گھر تو وہاں بھی ہے۔ چلے چلتے ہیں۔ غرض وہ لڑکی' اس کا چھوٹا بھائی اور میں پنڈی روانہ ہو گئے۔

پنڈی میں ایک بہت مشہور دواخانہ تھا جس کا نام شاہی دواخانہ تھا اور حکیم عبدالخالق اس کے مالک تھے۔ اس دواخانے کی ایک بہت بڑی بلڈنگ تھی جو کہ جامع مسجد کے سامنے واقع تھی۔ اس بلڈنگ کو گرا کر کچھ اور بنا دیا گیا ہے۔ حکیم عبدالخالق کے ایک بیٹے ایوب صاحب تھے جو کہ میرے ہم عمر تھے اور جن سے میرے بڑے قریبی تعلقات تھے۔ ان دنوں میں جب پنڈی جاتا تھا تو ان کے ہاں جا کر رہتا تھا کیونکہ بہت کھلی جگہ تھی' کھانا پینا بھی اچھا تھا اور بے تکلفی سے باتیں بھی ہوتی تھیں۔ میں نے انہیں پہلے سے اطلاع دے دی تھی کہ ہم فلاں دن آپ کے پاس رہنے کے لئے آ رہے ہیں اور ہمارے ساتھ کوئی خاتون بھی ہوں گی۔

ہم دوپہر کا کھانا کھا کر لاری میں بیٹھ کر ہری پور سے پنڈی روانہ ہوئے۔ تقریباً دو گھنٹے کا سفر تھا۔ وہاں پہنچ کر ہم تین بجے والا شو دیکھنے کے لئے سینما گئے۔ اس لڑکی نے اپنے بھائی سے کہا کہ یہ چابی لے لو اور یہ کام ہے اور تم ہری پور چلے جاؤ کیونکہ میں تو دوسرا شو بھی دیکھوں گی اور کل صبح خود ہی قتیل صاحب کے ساتھ واپس آ جاؤں گی۔ وہ لڑکا واپس چلا گیا۔ ہم نے فلم دیکھی' رات کا کھانا کھایا اور تنہا کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

اس نے جس جس انداز سے مجھے رغبت دلائی اس لحاظ سے یہ میرے لئے امتحان کی رات تھی۔ میں سوچتا تھا کہ میرے دوست نے اور اس کے والدین نے کیا سوچ کر اسے میرے ساتھ بھیج دیا ہے اور اگر میں غلط راستے پر چل پڑا تو ان کے اعتماد کا کیا حال ہو گا۔ کیونکہ آج کا بویا ہوا بیج پودا بن سکتا ہے اور درخت بن سکتا ہے۔ ویسے بھی یہ باتیں چھپی ہوئی تو رہتی نہیں۔ پھر میرے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ میں اپنے آپ پر بہت ناز کرتا ہوں لیکن اگر میں نے بھی یہی راستہ اختیار کیا تو میں تو مٹی کا ڈھیر بن کر رہ جاؤں گا۔

ہم دونوں دو الگ الگ چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ اس نے چارپائی کے آخری حصے تک اپنا جسم رکھا ہوا تھا اور عجیب عجیب باتیں کر رہی تھی۔ رات تقریباً ایک بجے کے قریب میں نے مصنوعی نیند لا کر خراٹے لینے شروع کر دیئے تو اس نے پھر مجھے جگایا لیکن میں نے کوئی توجہ نہ دی۔ خیر رات گزر گئی اور جب ہم صبح کو اٹھے تو اس نے ناشتے پر مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور واپس ہری پور چلے گئے۔

میں جب شام کو پڑھنے کے وقت پر حسب معمول اس کے گھر گیا تو اس نے کہا کہ میں اب پڑھنا نہیں چاہتی یہ ساری کتابیں آپ ہی رکھیں۔ اس کے بعد ہمارے آپس میں تعلقات بھی منقطع ہو گئے۔ ''گجر'' میں اس واقعہ پر ایک نظم ہے۔ میری سبھی نظمیں زندگی کے کسی نہ کسی واقعہ کو Touch کرتی ہیں۔

پنڈی سے بات جنس مخالف کی چلی ہے تو اس سلسلے میں ایک اور واقعہ بھی ہے۔ یہ زمانہ یونینسٹ پارٹی کی حکومت کا تھا اور میرے دوست جگن ناتھ آزاد اس وقت لاہور میں تھے۔ ملک خضر حیات ٹوانہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے۔ اور اس وقت ہندو مسلم اتحاد کی تحریک چلانا ان کی ضرورت تھی۔ انہوں نے اپنی وزارت اطلاعات کے ذریعے تحریک رفاقت کے نام سے ایک تحریک چلا رکھی تھی۔ مولوی ابراہیم علی چشتی اس کے سربراہ تھے۔ یہ بڑے پڑھے لکھے آدمی تھے لیکن ملائیت والا انداز ہی تھا۔ جگن ناتھ آزاد اس تحریک میں ان کے فیلڈ منیجر قسم کی چیز تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ مختلف شہروں میں مشاعرے کر کے لوگوں میں اتحاد اور رفاقت کی تلقین کریں اور لوگوں کو یہ بات سمجھائیں کہ وہ اپنے اپنے نظریات رکھنے کے باوجود شہری کے طور پر آپس میں مل جل کر رہیں۔ لطیفہ یہ ہوتا تھا کہ جہاں ہم تحریک رفاقت کا اجلاس کرتے تھے' ایک دو ہفتے کے بعد وہاں ہندو مسلم فساد ہو جاتا تھا۔

ایک بار انہوں نے مجھے پنڈی سے بلایا اور بتایا کہ ملتان میں مشاعرہ ہے اس لئے تم آ جاؤ۔ جگن ناتھ آزاد میرے دوست بھی تھے۔ کچھ میں مقبول بھی تھا کیونکہ ترنم سے پڑھتا تھا اور کلام بھی نئے انداز کا تھا جو لوگوں میں سنا بھی جاتا تھا تو اکثر مشاعروں میں میں بلایا جاتا تھا۔ یہ مشاعرہ جنگ کے بعد کے زمانے میں ہو رہا تھا اور ان دنوں ریل گاڑیوں میں

بہت رش ہوتا تھا۔ ہم نے انٹر کلاس کا ٹکٹ لیا کیونکہ اس زمانے میں سفید پوش قسم کے لوگ اس کلاس میں سفر کرتے تھے۔ ہمیں رش کی وجہ سے ٹرین میں بیٹھنے کی جگہ نہ ملی لیکن جگن ناتھ آزاد کے پاس ایک بڑے سائز کا کالے رنگ کا ٹرنک تھا جس میں ان کی فائلیں وغیرہ تھیں۔ یہ ٹرنک اس زمانے میں بڑے افسروں کی نشانی ہوتی تھی اور اس پر سفید رنگ سے نام لکھا ہوتا تھا جب قلی یہ ٹرنک اٹھا کر پیچھے پیچھے چلتا تو پتہ چلتا تھا کہ یہ کوئی آفیسر ہے۔ اس لئے جب قلی اس طرح ٹرنک لے کر ڈبے مین پہنچا تو کچھ لوگوں نے جگہ دے دی۔

سیٹ تو مل نہ سکی تھی اس لئے ہم نے ٹرنک لیٹرین کے پہلو میں فرش پر رکھا اور دونوں اس پر بیٹھ گئے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ خانیوال سے ایک سٹیشن پہلے مسافروں کا ایک اور ریلا ڈبے میں داخل ہوا اس میں ایک خوبصورت لڑکی' ایک بوڑھا بابا اور ایک جوان آدمی جس نے معمولی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ بھی داخل ہوئے۔ بوڑھے نے جب ٹرنک پر کچھ جگہ دیکھی تو اس نے کہا کہ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو یہ لڑکی یہاں پر بیٹھ جائے۔ ہم دونوں تھوڑا تھوڑا سرکے اور وہ میری طرف بیٹھ گئی۔ اس کی عمر بمشکل سترہ سال ہوگی لیکن وہ میرے ساتھ اس طرح لگ کر بیٹھی کہ اس کی ران میری ران کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ میں بدحواس ہوگیا۔ اس بدحواسی میں نجانے کیا کچھ ہوا کہ اس سے باتیں ہونے لگیں۔

اس نے بتایا کہ یہ جو دو آدمی میرے ساتھ ہیں ان میں سے ایک میرا خاوند ہے اور ایک میرا سسر ہے۔ میں اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی کیونکہ یہ آدمی اچھا نہیں ہے۔ اس نے مزید بتایا کہ میں اپنے میکے چلی گئی تھی لیکن یہ برادری بٹھا کر مجھے میری مرضی کے خلاف لے آئے ہیں۔ پھر اس نے مجھے سرائیکی میں کہا کہ ''تو میں کونٹھا کھڑ'' یعنی تم مجھے بھگا کر لے جاؤ۔ سردی کی وجہ سے میں نے اور جگن ناتھ آزاد نے اوپر کمبل لیا ہوا تھا لیکن اب وہ بھی اس کمبل میں شامل ہوگئی تھی۔ اب ہماری کچھ ہونٹوں سے گفتگو ہو رہی تھی اور کچھ ہاتھوں سے۔ پتہ نہیں اس نے مجھے اتنا جوانمرد کیوں سمجھا کہ دو لاٹھی والے آدمیوں کی موجودگی میں اور صرف دو گھنٹے کی ملاقات میں اس پر اتنا عاشق ہو جاؤں گا کہ جب ہم پلیٹ فارم پر اتریں گے تو میں اسے وہاں سے اٹھا کر بھاگ جاؤں گا اور ہم ان کے ہاتھ

نہیں آئیں گے۔ جب سٹیشن آیا تو ہم اترے لیکن ہمارا ٹرنک اترتے ہوئے ان کے اور ہمارے درمیان کوئی سو قدم کا فاصلہ ہو گیا تو وہ کھڑی ہو کر پیچھے دیکھنے لگی کہ میرا ہیرو آئے گا اور مجھے ان سے نجات دلا دے گا۔

میں نے جگن ناتھ آزاد سے کہا کہ ابھی کچھ دیر اور کھڑے رہیے۔ وہ پہلے تھوڑی دیر کے لئے رُکی، پھر چلی اور آگے جا کر پھر رک گئی۔ اس بار اس کے خاوند نے اسے چوٹی سے پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا کہ پیچھے کیوں دیکھتی ہے۔ اب وہ روتے ہوئے چلی۔ میں نے جگن ناتھ آزاد سے کہا کہ ہم اب دوسری طرف سے نکلیں گے تا کہ اس طرف سے کہیں پھر ہیروئن سے ملاقات نہ ہو جائے اور ہماری پٹائی نہ ہو جائے۔ لیکن اس واقعہ کے بعد کئی دن تک میں سوچتا رہا کہ ہمارے ملک میں لڑکی کی مرضی کے خلاف اور زبردستی کی جانے والی شادی کا آخر کار انجام یہی ہوتا ہے کہ وہ لڑکی کسی سے یہی کہے گی کہ مجھے بھگا کر لے جاؤ۔ یہاں تو پھر میاں بیوی کی عمروں میں بھی بڑا فرق تھا اور آدمی کی عمر چالیس سال کے قریب تھی۔ اس کے علاوہ تجربے کی کسوٹی پر پرکھا جا چکا تھا، وہ لڑکی اس کے ساتھ رہنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ سسرال میں پہنچنے کے بعد وہ پھر کسی کے ساتھ بھاگ کر چلی گئی ہو۔

شاعروں کا استحصال

جگن ناتھ آزاد میرے بہت پیارے دوستوں میں سے تھے۔ یہ اصل میں تو تلوک چند محروم کی طرح عیسیٰ خیل کے رہنے والے تھے اور ان کی پیدائش بھی وہیں ہوئی تھی لیکن ان کا زیادہ تر وقت پنڈی ہی میں گزرا۔ تقسیم کے بعد جگن ناتھ آزاد کی شاعری اپنے وطن کی یاد کا نوحہ بنی رہی اور جو نظمیں انہوں نے کہیں ان میں وطن کی یاد کی بالادستی رہی اور جب تقسیم کے بعد ان کا پہلا مجموعہ ''وطن میں اجنبی'' کے نام سے آیا تو وہ اس موضوع کی وجہ سے پاپولر ہوئے۔ شاعر تو وہ پہلے بھی اچھے تھے لیکن یہ موضوع لوگوں کو بھایا۔ چنانچہ وہ پاکستان میں پھر اکثر بلائے جاتے تھے۔

میں ان کے حوالے سے آپ کو یہ ایک بات بتانا چاہتا ہوں کہ شاعر ایک ایسا طبقہ ہے کہ جس کا استحصال بہت ہوا ہے۔ امراء اور کھاتے پیتے لوگ ہی نہیں بلکہ سرکاری افسران اور سرکاری ادارے بھی ان کا بہت استحصال کرتے رہے ہیں۔ جہاں انہیں شاعر کی ضرورت پڑی تو یہ سوچے بغیر کہ شاعر کا پیٹ ہوتا ہے' اس کے بیوی بچے ہوتے ہیں اور اس کی ضرورتیں ہوتی ہیں' کبھی تو شاعر کو قومی خدمت کے نام پر بلا لیا جاتا ہے اور کبھی اس چکر میں کہ آج آپ کے اعزاز میں کھانا ہے' آپ آیئے۔

اسی طرح کی بعض محفلیں میرے ذہن میں موجود تھیں کہ جگن ناتھ آزاد کے اعزاز میں پنڈی کے ایک رئیس نے چائے کا انتظام کیا اور اس مشاعرے میں جو دوسرے شاعر آئے ہوئے تھے ساتھ انہیں بھی بلا لیا۔ اس نے یہ قطعاً تاثر نہیں دیا کہ اس کے کوئی اور

مقاصد بھی ہیں۔ جب ہم چائے پی چکے اور میں اور جگن ناتھ آزاد ساتھ بیٹھے ہوئے تھے تو میزبان کی طرف سے فرمائش ہوئی کہ اب کچھ ارشاد فرمایئے۔ میں نے اشارتاً کہا کہ ہمیں تو چائے پر بلایا گیا تھا اس لئے میں تو ذہنی طور پر کچھ سنانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ لیکن کچھ لوگوں کو سنانے کی عادت ہوتی ہے چنانچہ انہوں نے سنانا شروع کر دیا۔

ہم کوئی سات آٹھ شاعر تھے جب میری باری آئی تو میں نے جیب سے دو روپے نکالے اور میزبان سے کہا یہ لیجئے جناب وہ کہنے لگے یہ کیا ہے۔ میں نے کہا: چائے کی قیمت کیونکہ چائے پلا کر شعر نہیں سنے جا سکتے۔ اگر آپ کو شعر سننے ہیں تو معاوضہ نکالیے۔ یہ جگن ناتھ آزاد باہر سے آئے ہیں' یہ ان پیسوں سے کچھ خرید و فروخت کریں گے' پھر ہم لاہور سے آئے ہیں ہماری بھی کچھ ضرورتیں ہیں۔ آپ دو روپے کی چائے پلا کر یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہم سے کلام سنیں گے تو یہ دو روپے رکھ لیجئے۔

میری ان باتوں سے بدمزگی ہوگئی اور کچھ خوشامدیوں نے کہا کہ یہ نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن اکثریت خوش ہوئی۔ چنانچہ جو دو شاعر پہلے پڑھ چکے تھے' وہی پڑھ چکے تھے اور باقی سب بغیر پڑھے ہی چلے آئے۔ جگن ناتھ آزاد نے اس واقعہ پر مجھے بہت داد دی بلکہ اپنے مضامین میں بھی بعد میں اس کا ذکر کیا۔ لیکن شاعروں کے استحصال کا یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔

کچھ عرصہ پہلے میں قطر میں گیا وہاں ایک مشاعرہ تھا۔ انہوں نے ہمیں معاوضہ دیا اور ہم نے شعر پڑھے۔ اب اس مشاعرے کے پیٹ سے ایک اور مشاعرہ نکلا کہ فلاں کے گھر پر آپ کی دعوت ہے۔ ہم اس دعوت میں گئے اور وہاں بھی کہا گیا کہ شعر سنائیں۔ میں نے کہا کہ میں تو نہیں سناتا کیونکہ آپ نے پہلے کہا نہیں تھا۔ اگر کہا ہوتا تو میں سوچتا کہ مجھے اس دعوت میں آنا چاہیے یا نہیں آنا چاہیے اور اب مجھے یہ بھی افسوس ہو رہا ہے کہ آپ کا کھانا بھی کھا چکا ہوں لیکن میں شعر نہیں سناؤں گا کیونکہ میرا موڈ نہیں ہے اور میں اس کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو کر آیا ہی نہیں۔

وہاں بیٹھے ہوئے کچھ چمچے شاعروں نے کہا کہ جی کیا ہوا۔ آپ سنایئے میں نے کہا

کہ آپ سنائیں چنانچہ انہوں نے شعر سنائے۔ مجھے پتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہونا ہے۔ میزبان نے شاعروں کے لئے جو تحفے رکھے تھے' مجھ سے چھپ کر سب کو وہ دے دیئے اور مجھے کوئی تحفہ نہیں دیا۔ پھر اگلے سال جو اگلا مشاعرہ ہوا تو انہوں نے کہا کہ قتیل صاحب تو بڑے مغرور آدمی ہیں۔ انہوں نے ہمارے ہاں کچھ نہیں پڑھا تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے سفارت خانے کے کچھ لوگوں کو بھڑکایا کہ سفارتخانے کا بھی فلاں آدمی دعوت میں بیٹھا تھا اور اس کے باوجود انہوں نے کلام نہیں سنایا۔ حالانکہ وہ کوئی خدا کا بیٹا تو وہاں نہیں بیٹھا ہوا تھا۔ میں شاعر ہوں اور میں نہیں سنانا چاہتا۔ چنانچہ انہوں نے سزا کے طور پر مجھے اس اگلے مشاعرے میں مدعو نہیں کیا۔ جو شاعر گئے تھے انہوں نے واپس آ کر مجھے کہا کہ وہ صاحب تو آپ سے ناراض ہیں۔ کیونکہ آپ نے ان کی محفل میں کلام نہیں پڑھا تھا اور اس میں سفارتخانے کا آدمی بھی بیٹھا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ کا زور سفارتخانے پر ہے کیا وہ خود تنخواہ نہیں لیتے۔ وہ جب سرکاری کام کرنے یا یہ خدمت خلق کرنے جاتے ہیں تو ان کی تنخواہ چل رہی ہوتی ہے پھر میں ان کا آلہ کار کیوں بنوں۔

اسی طرح میں جب اپنے ہاں کسی دوست کی دعوت کرتا ہوں تو اس کا اہتمام کرتا ہوں کہ اس محفل میں شعرو شاعری نہ ہو۔ اگر میں ایک شاعر دوست کو اپنے گھر بلا لیتا ہوں کہ آپ باہر سے آئے ہوئے ہیں تو آپ کے اعزاز میں یہ دعوت ہے۔ لوگ تو یہ کرتے ہیں کہ کچھ افسروں کو اور کچھ ایسے افراد کو بلا لیتے ہیں جن سے ان کے کام ہوتے ہیں اور ان کے کان میں یہ ڈالتے ہیں کہ آپ کی تفریح کا سامان کیا گیا ہے۔ اور چنانچہ ایک دو شاعروں کو بلا کر ان کا استحصال کرتے ہیں۔ لیکن میں نے اس قسم کی اعزازی دعوتوں میں کبھی کسی مہمان کو تکلیف نہیں دی اور نہ کہیں جا کر خود پڑھنا پسند کیا ہے۔ اس کے برعکس ایک دو شاعر جو انڈیا سے آئے تھے میں نے انہیں اپنے گھر پر بلایا اور ان سے عمداً اس لئے کچھ شعر سنے کہ میں ان کی کچھ خدمت کر سکوں۔ چنانچہ میں نے لوگوں سے چھپا کر اور جو مجھے ہو سکا ان کو دیا اور لفافے میں بند کر کے دیا اور ساتھ یہ کہا کہ آپ کو کچھ تحفہ دینا تھا لیکن آپ کی پسند کا نہیں پتہ ہے اس لئے آپ اپنی پسند کا تحفہ جا کر خرید لیجئے

مگر جو گھٹیا یا کم ظرف لوگ ہوتے ہیں وہ نہ پڑھنے کی باتوں کو اپنا Point of Prstige بنا لیتے ہیں۔

شاعروں کے اس طرح کے استحصال کے بارے میں میں نے سب سے پہلے احمد شاہ بخاری یعنی پطرس بخاری سے باتیں سنی تھیں۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب وہ یو این او میں ہوا کرتے تھے اور ہر سال وہ پاکستان آ کر ایک محفل برپا کیا کرتے تھے جس میں ان دوستوں کو بلاتے تھے جنہیں وہ پسند کرتے تھے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں جونیئرز میں ان کا پسندیدہ آدمی تھا۔

پہلی بار جب سید امتیاز علی تاج کے گھر محفل ہوئی تو اس میں میرے علاوہ احمد ندیم قاسمی کچھ سکالرز اور بعض دوسرے لوگ موجود تھے۔ اچانک کسی نے کہا کہ شاعر حضرات بیٹھے ہیں ان سے کچھ کلام سنا جائے تو پطرس صاحب نے سختی سے ٹوک دیا اور کہا کہ میں نے انہیں ملنے کے لئے بلایا ہے اور یہ شاعرانہ نشست نہیں ہے۔ اگر آپ وہ پسند کریں گے تو میں ان سے درخواست کر کے ایک الگ محفل رکھوں گا۔ یہ نہیں کہ جہاں کوئی شاعر آیا ہے آپ اسے کہیں کہ کچھ سناؤ اور سنانا شروع کر دے۔ یہ مناسب بات نہیں ہے۔

اگر پطرس صاحب نے کہا ہوتا تو ظاہر ہے کہ میں، ندیم صاحب اور دوسرے ساتھی بھی ان کے حکم کی تعمیل کرتے لیکن میں نے ان کا یہ نکتہ پلے باندھ لیا کہ ہر جگہ شاعر سے نہ تو کسی کو فرمائش کرنی چاہیے اور نہ ہر جگہ شاعر کو سنانا شروع کر دینا چاہیے۔

پطرس صاحب مجھ سے بڑے تھے، پھر بھی وہ مجھے قتیل صاحب کہہ کے بلاتے تھے حالانکہ مجھے شرم آتی تھی۔ لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ تم چھوٹے ہو اور میں بڑا ہوں یا تم علمی سطح پر مجھ سے کمتر ہو اور میں برتر ہوں۔ وہ ایسا رویہ اختیار کرتے تھے کہ برابری کا احساس ہو اور دوسرے کا ارتقاء رکنے نہ پائے۔ مجھے انہوں نے بتایا کہ تمہاری غزل ہے۔

تمہاری انجمن سے اٹھ کے دیوانے کہاں جائیں

یہ غزل ہم نے بارہا سنی ہے اور ہمارے ساتھی اس کی دھن بھی بنا چکے ہیں اور متعدد

بار اسے گا بھی چکے ہیں۔ یہ غزل انہوں نے بعض اوقات کورس کے ساتھ گائی ہے، بعض اوقات قوالی کے انداز میں گائی ہے اور بعض اوقات کسی گلوکار نے تنہا بھی گائی ہے۔ اتنا بڑا سکالر اگر میرے جیسے جونیئر کو اتنی زیادہ داد دے دے تو وہ ذہنی طور پر کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ بر خلاف اس کے کہ پرانے قسم کے جو شاعر حضرات ہوتے ہیں اور جنہیں اساتذہ کہا جاتا ہے ان کا رویہ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی جونیئر شاعر کی صرف خامیوں کی اپنی خوردبین سے نشاندہی کرتے ہیں لیکن اس کے کلام کے جو محاسن ہوتے ہیں انہیں نظر انداز کر جاتے ہیں۔

ان کے علاوہ ڈاکٹر تاثیر کے ہاں آنا جانا تھا وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ان میں بھی یہ خوبی دیکھی کہ وہ دل کھول کر داد دیتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہ اگر کسی کا کوئی کام ہوتا تھا اور اس میں ان کی شہرت کا بھی کوئی پہلو نہیں ہوتا تھا تو یہ کام بھی کر دیتے تھے۔

کام کرنے کے سلسلے میں سب سے اونچا نام عبدالمجید سالک کا آتا ہے۔ وہ اپنا آدھا دن اسی غرض سے وقف کر دیتے تھے۔ ان کے پاس گھر میں یا دفتر میں ہر وقت کوئی نہ کوئی بیٹھا ہوتا تھا۔ وہ کسی کے لئے تو فون کر رہے ہوتے تھے اور کسی کے ساتھ خود بھی چھڑی اٹھا کر اور تانگے میں بیٹھ کر چلے جاتے تھے بلکہ پیسے بھی پاس سے خرچتے تھے۔ اسی طرح اگر کوئی اپنی تحریر دکھانے کے لئے لاتا اور کہتا کہ آپ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے تو اس کی خامی اس طرح بتاتے تھے کہ اس کی دل شکنی نہیں ہوتی تھی۔ پھر خوبی کی اس طرح تعریف کرتے تھے جیسے اس سے بہتر کہنے والا کوئی ہے ہی نہیں۔

اس ضمن میں ''شاہکار'' کے ایڈیٹر تاجور صاحب بھی قابل ذکر ہیں۔ میں اس زمانے میں انہیں ہری پور سے اپنی نگارشات چھپنے کے لئے کثرت سے بھیجتا تھا۔ ایک بار میں نے انہیں چھپنے کے لئے کچھ بھیجا تو انہوں نے جواباً جو لکھا اس کے الفاظ کچھ ایسے تھے کہ قتیل شفائی ایک سنگلاخ سرزمین سے تعلق رکھتا ہے اور اس علاقے میں پیدا ہونا اس کی اپنی خوش قسمتی ہو نہ ہو لیکن اس علاقے کی ضرور یہ خوش قسمتی ہے کہ قتیل شفائی جیسا خوش گو شاعر وہاں پیدا ہوا۔

جب مولانا تاجور کی لکھی ہوئی یہ رائے مجھ تک پہنچی تو سب جانتے ہیں کہ اگر کسی گھوڑے کو بھی تھپکی دے دی جائے تو وہ زیادہ بھاگتا ہے۔ اسی طرح اس رائے نے میری زندگی پر خوشگوار اثرات کیے اور میں جو پہلے کچھ سست روی سے چل رہا تھا اب اس طرف اور بھی توجہ دینے لگا۔

ایک ایسا ہی واقعہ حفیظ ہوشیار پوری سے متعلق ہے۔ وہ غزل گوؤں میں عجیب طرح کا بانکپن رکھتے تھے اور ان کے کلام میں بڑی پختگی ہوتی تھی۔ یہ زمانہ تقسیم سے ذرا پہلے کا تھا۔ میں اور میرے ساتھ فکر تونسوی نظام ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ یہاں اس زمانے میں قرب و جوار کے ادیب حضرات آیا کرتے تھے اور حفیظ ہوشیار پوری بھی وہاں آتے تھے۔ میں نے اس زمانے میں ایک غزل کہی تھی:

پربت پربت گھوم چکا ہوں' صحرا صحرا چھان رہا ہوں
ہر منزل کے حق میں لیکن' کافر کا ایمان رہا ہوں

اس غزل کا ایک اور شعر تھا:

دیکھ مری انمول شرافت' لٹ بھی گیا شرمندہ بھی ہوں
جیت بھی لی' اخلاص کی بازی ہار بھی اپنی مان رہا ہوں

میں نے یہ غزل سنائی تو حفیظ ہوشیار پوری صاحب نے کہا کہ قتیل میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ مجھے تمہارے ہاں نغمگی بہت شدت سے نظر آتی ہے۔ لیکن ایک خامی پر ابھی سے دھیان دو گے تو آگے چل کر ٹھیک رہے گی۔ میں نے کہا فرمایئے تو کہنے لگے کہ مطلع کو چھوڑ کر باقی اشعار میں پہلے مصرع میں ردیف والا لفظ یا اس سے ملتی ہوئی آواز والا لفظ نہ آئے۔ کیونکہ یہ صوت کو متاثر کرتا ہے۔ کہنے لگے کہ ابھی میرے سامنے بیٹھ کر اسے درست کرو۔ تو میں نے مذکورہ بالا شعر میں یوں تبدیلی کی۔

دیکھ مری انمول شرافت لٹ کر بھی شرمندہ ہوں میں
جیت بھی لی اخلاص کی بازی' ہار بھی اپنی مان رہا ہوں

کہنے لگے کہ اب ٹھیک ہے۔ اس واقعہ کے بعد میں نے دوسرے شاعروں کے کلام

پر بھی نظر رکھی اور ان میں بھی یہ خامی موجود پائی اور صوت کو مجروح ہوتے دیکھا۔ مگر اس کے بعد میرے ایک ہزار اشعار میں سے کسی ایک میں ایسی خامی آ گئی ہو تو ہو ورنہ میں نے یہ غلطی کبھی دوبارہ نہیں کی۔

تقسیم سے کوئی دس سال بعد کراچی کے شفیع عقیل صاحب جو اخبار جہاں کے ایڈیٹر ہیں' نے میرا ایک انٹرویو لیا اور اساتذہ کا ذکر آیا تو میں نے کہا کہ جن جن لوگوں سے میں نے سیکھا ہے ان میں ایک نام حفیظ ہوشیار پوری صاحب کا بھی ہے۔ حفیظ صاحب نے جب یہ انٹرویو پڑھا تو حیران ہوئے کہ یہ تو میرا شاگرد نہیں ہے۔ ایک دن ملے تو کہنے لگے کہ یار بات سنو' تم میرے کب سے شاگرد ہو؟ میں نے کہا وہ تو میں آپ کو بتاؤں گا لیکن کیا آپ کو اس پر اعتراض ہے۔ کہنے لگے نہیں تم میرے شاگرد ہوتے تو مجھے فخر ہوتا لیکن ہو نہیں۔ میں نے کہا کہ بات کیا ہے۔ کہنے لگے کہ تم نے اپنے انٹرویو میں یہ ذکر کیا ہے۔ میں نے وہی واقعہ یاد دلایا اور کہا کہ آپ نے مجھے وہ نکتہ سمجھایا تھا جس نے میری شاعری کے تیور بدل دیئے اور مجھ میں آخر تک جو مستقل خامی چلی جاتی' آپ نے اس کی اصلاح کر دی۔ کیونکہ میں غنائی شاعر بھی کہلواتا ہوں۔ اگر یہ خامی رہتی تو میری شاعری میں ایک دھبہ لگا ہوا نظر آتا۔ یہ واقعہ سن کر وہ آبدیدہ ہو گئے اور کہنے لگے کہ مجھے تو یاد بھی نہیں' تم نے یاد دلایا ہے تو اب مجھے یاد آیا ہے کہ یہ واقعہ ہوا ہے۔ پھر کہنے لگے کہ جب ذرا نام ہو جاتا ہے تو میرے شاگرد میری شاگردی سے مکرنے لگتے ہیں اور تم ہو نہیں اور ایک نکتہ پکڑ کر میرے شاگرد بن گئے ہو۔ اس لئے میرا ایمان ہے کہ ابھی دنیا میں کچھ اچھے لوگ بھی باقی ہیں۔

بعد میں احمد ندیم قاسمی صاحب نے بھی میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ چونکہ مجھے ایسے لوگ ملے جو لوگوں کی مدد کر کے راحت محسوس کرتے تھے' اس لئے ایک طرح سے مجھے ورثے میں یہ چیز ملی کہ اگر کوئی ایسا شخص ہے جس میں کچھ جوہر موجود ہے تو اس کے ساتھ چند قدم چلو تا کہ وہ منزل پر پہنچ جائے کیونکہ اسے منزل پر تو بہر حال پہنچ جانا ہے لیکن جو سفر وہ سو قدم کا چکر لگا کر طے کرے گا اگر اس کے ساتھ تم چلو گے تو وہ وہی سفر دس قدم چل کر

ہی طے کرے گا اور منزل پر پہنچ جائے گا۔ اس طرح وہ تمہیں بھی یاد رکھے گا اور اس کا اپنا وقت بھی بچے گا پھر اس کے دل میں بھی نیکی کے جذبات پیدا ہوں گے۔

ادب میں تو میں نے اس قسم کے کئی کام کیے۔ فلم کا ایک واقعہ بھی یاد ہے جو بیان کرتا ہوں۔ سلیم رضا ایک عیسائی فیملی سے تعلق رکھتے تھے اور پڑھے لکھے نوجوان تھے۔ انہیں میرا ایک پرانا دوست سرور سیال میرے پاس لے کر آیا اور کہنے لگا کہ اس سے گانا سنو اور اگر یہ اس قابل ہے تو اسے آگے بڑھاؤ۔ میں نے سنا تو مجھے ان کا گانا بہت پسند آیا کیونکہ بہت اچھا گاتے تھے۔ میں اس زمانے میں بطور نغمہ نگار چھایا ہوا تھا اور اسی فیصد سے زائد فلمیں میرے پاس تھیں اور یہ شوق تھا کہ بہت زیادہ فلمیں پاس ہونی چاہئیں حالانکہ اب یہ خیال ہوتا ہے کہ بہت کم فلمیں پاس ہوں تا کہ زیادہ وقت صرف کیا جا سکے۔ بہر حال میں نے سلیم رضا کے لئے کچھ لوگوں سے کہا۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ جب کسی نئے آدمی کو ملواؤ تو اس کے بارے میں پوچھا جاتا ہے کہ اس نے پہلے کہیں گایا ہے' ظاہر ہے کہ اسے گانے دیں گے تو وہ گائے۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ جیسا منہ ویسا تھپڑ والا معاملہ کیا جائے۔ میں ان دنوں ''اداکار'' کا ایڈیٹر تھا۔ یہ فلمی ہفت روزہ تھا۔ میں نے اس میں یونہی ایک خبر چھاپی کہ سلیم رضا نے فلاں فلم کے لئے گانا گایا اور بہت کامیاب رہے۔ اس کے بعد میں نے ایک اور کام کیا۔ اس وقت شاہ نور سٹوڈیو میں فلم ''گلنار'' بن رہی تھی اور میں اس کے گانے لکھ رہا تھا۔ وہاں نور جہاں' شوکت صاحب اور دوسرے حضرات بیٹھ کر تبادلہ خیالات کرتے تھے۔ امتیاز علی تاج بھی وہاں آتے تھے۔ میں نے سلیم رضا کو وقت دے دیا کہ وہاں آ جانا۔ یہ آ گئے۔ میں نے نور جہاں سے کہا کہ ایک نیا لڑکا آیا ہے۔ ذرا اسے سنئے۔ انہوں نے سنا اور میں نے کہا کہ میڈم یہ بالکل طلعت محمود سے مشابہت نہیں رکھتا۔ انہوں نے کہا کہ ہاں یہ واقعی اچھا گاتا ہے اور اسے تھپکی بھی دی۔ میں نے یہ خبر بنا کر ''اداکار'' اور دوسرے پرچوں میں نمایاں طور پر چھپوا دی۔ اس کے بعد سلیم رضا کی پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔ وہ گانے تو پہلے ہی اچھے گاتے تھے لیکن میں نے انہیں شارٹ کٹ بنا دیا تھا اور پھر وہ ایسے مقبول ہوئے کہ ہر طرف ان کی

آواز گونجنے لگی۔

دس پندرہ سال چلنے کے بعد سلیم رضا صاحب کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ ایک گلوکارہ کوثر پروین ہوتی تھیں۔ اب یہ دونوں اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ ان دونوں کی جذباتی وابستگی ہوگئی اور یہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ ویسے تو مذہب بیدار نہیں ہوتا لیکن ان معاملات میں مذہب بیدار ہو جاتا ہے۔ جب یہ خبر عام ہوئی کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آ چکے ہیں اور سلیم رضا عیسائی اور کوثر پروین مسلمان ہیں تو اندر ہی اندر سلیم رضا صاحب کے خلاف سازشیں شروع ہوگئیں۔ سارے میوزک ڈائریکٹر مسلمان تھے۔ انہوں نے انہیں واش کرنا شروع کر دیا۔ بالآخر یہ اس حد تک پہنچے کہ ایک دن میں کسی مشاعرے کے سلسلے میں ریڈیو پاکستان گیا تو یہ وہاں موجود تھے۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہوا تو کہنے لگے کہ کوئی کام ہی نہیں ہے۔ اس طرح کوثر پروین کو بھی ڈرایا دھمکایا گیا اور ان دونوں میں دوری ہوگئی۔ بعد میں کوثر پروین نے ایک میوزک ڈائریکٹر اختر اکھیاں سے شادی کر لی اور یہ دل برداشتہ ہو کر کینیڈا چلے گئے۔ میں ایک بار کینیڈا گیا تو میں ابھی ٹورنٹو میں تھا کہ مجھے ان کا فون ملا کہ میں مینٹو بر میں ہوں اور سنا ہے کہ آپ کا یہاں کا بھی پروگرام ہے۔ اس لئے جب یہاں آئیں تو ضرور مل کر جائیں۔

مشاعروں میں میرا ساتھ اکثر ضمیر جعفری صاحب کے ساتھ ہوتا ہے۔ پروین فنا سیّد اور حمایت علی شاعر بھی اس وقت ساتھ تھے۔ وہاں گئے تو پتا چلا کہ سلیم رضا صاحب کے دونوں گردے خراب ہو گئے تھے اور حکومت نے ان کو پاس سے دو مصنوعی گردے لگوا کر فری دیئے ہیں اور اب انہیں ہفتے میں ایک بار ہسپتال میں جانا پڑتا ہے اور زیادہ گھومنے پھرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ اب یہ کمزور ہو چکے تھے اور رنگ بھی کچھ سیاہ ہو گیا تھا۔ لیکن اس طرح ملے کہ دیکھنے والوں نے دیکھا اور پھر اس نے کہا کہ اگر میں وہاں ہوتا تو اب تک فاقہ زدگی سے مر چکا ہوتا کیونکہ وہاں میرا کمائی کا کوئی انتظام نہیں رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ روزی کا یہاں کیا انتظام ہے تو کہنے لگے کہ یہاں تو بیماروں کے لئے الاؤنس ہوتا ہے۔ لیکن میں وہ پسند نہیں کرتا اور میں نے میوزک کی کلاس کھول رکھی ہے اور ٹیوشن سے

گزر اوقات کرتا ہوں۔ ان کے شاگردوں میں سے ایک شخص راج تھا جو ہندو تھا اور امریکہ کی ایک ریاست میں رہتا تھا۔ اس ریاست کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہاں بہت سے ہندوستانی لوگ آباد ہیں جنہیں انگریز شروع شروع میں دھوبی اور حجام وغیرہ کے کام کرنے کے لئے ہندوستان سے ساتھ لے کر گئے تھے اور ان کی بولی اب بھی پوربی ہے۔ راج کی کچھ دلچسپی شاعری سے بھی تھی۔

ہم جس پارٹی کے ساتھ گئے تھے انہوں نے ہمارے ساتھ بالکل خرکاروں والا سلوک کر رکھا تھا۔ وہ ہمیں آرام بھی نہیں کرنے دیتے تھے اور امریکہ اور کینیڈا کے آٹھ دس شہروں میں ہمیں تیز تیز گھما چکے تھے۔ سلم رضا نے مجھ سے کہا کہ آپ یہاں رکیے اور میں نے اس شخص راج کا ایک ایل پی کرنا ہے جس کے لئے آپ کا کلام منتخب کر رکھا ہے۔ اس نے مجھے ایک ہزار ڈالر دیئے۔ میرے باقی ساتھی تکلیف میں تھے اور میں نے انہیں بھی حسب ضرورت کچھ پیسے دیئے۔ پھر سلیم رضا نے مجھے ایک بکس بھی تحفہ کے طور پر دیا۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ سفر کے لئے بہت موزوں ہے اور اسے چاہے دسویں منزل سے نیچے گراؤ ٹوٹتا نہیں۔ پھر انہوں نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو اپنی اور راج کی گاڑی میں دو روز میں پورے علاقے کی سیر کروائی۔

افسوس یہ ہوتا ہے کہ سلیم رضا کی آواز بھی مذہبی تعصب کی بھینٹ چڑھ گئی۔ یہ نہیں کہ تعصب صرف ہمارے ملک میں ہی ہے بلکہ مذہبی تعصب دوسرے ممالک میں بھی موجود ہے پھر بھی جب کوئی اچھا فنکار اس مذہبی تعصب کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے تو مجھے بہت رنج اور افسوس ہوتا ہے۔

طفیل ہوشیار پوری اور مشیر کاظمی

ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے جو بیان کرتا ہوں' اس میں خودستائی نہیں ہے بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انسان کو صرف وہی کام کرنا چاہئے جو وہ کر سکتا ہے۔ اسے اپنے آپ سے اور اس کام سے انصاف کرنا چاہئے جو خواہ مخواہ اس کی جھولی میں ڈالا جا رہا ہو۔ تمہیدی طور پر میں یوں کہوں گا کہ میں فلمساز بھی رہا ہوں اور جو پہلی فلم میں نے شروع کی وہ ''اک لڑکی میرے گاؤں کی'' تھی۔ مجھے سب کہتے رہے کہ اس کی ڈائریکشن آپ کریں اور کہانی اور ڈائیلاگ بھی خود لکھیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اچھے ڈائیلاگ لکھ سکتا ہوں اور مصنف اور شاعر سے بہتر ڈائریکشن کوئی دوسرا آدمی نہیں کر سکتا۔ لیکن میں نے کہا کہ میں بنیادی طور پر نغمہ نگار ہوں اور میرے صرف دو ہی ٹائٹیل ہوں گے ایک نغمہ نگار کا اور دوسرا فلمساز کا۔ چنانچہ میں نے کہانی' ڈائیلاگ اور ڈائریکشن تینوں چیزیں ہی باہر سے لیں۔

باقی فلموں میں بھی میں نے ایسا ہی کیا۔ جب ہند کو فلم ''قصہ خوانی'' بنائی تو اس میں بھی یہی کیا حالانکہ ہندکو میری مادری زبان ہے اور میں بہت اچھے ڈائیلاگ لکھ سکتا تھا۔ لیکن میں نے کہانی' ڈائیلاگ اور ڈائریکشن تینوں چیزیں باہر سے لیں اور خود صرف نغمے ہی لکھے۔ میں یہاں یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ میں صرف وہی کام کرتا ہوں جو کہ میں کر سکتا ہوں اور جس پر مجھے عبور ہے۔

جس زمانے میں محترمہ فاطمہ جناح اور جنرل ایوب کے درمیان الیکشن تھا' اس زمانے میں خدا جانے کیا وجہ تھی کہ پروگریسو ہونے کے باوجود میرا جھکاؤ صدر ایوب کی

طرف تھا حالانکہ ان کی طرف سے کوئی لالچ یا مفاد بھی نہیں تھا۔ حبیب جالب اس کے برعکس یہ کہہ رہا تھا کہ:

ایسے دستور کو میں نہیں مانتا

مگر اس مسئلے پر میرا اور اس کا اختلاف بھی رہتا تھا اور میں کہتا تھا کہ صدر ایوب ذاتی طور پر ٹھیک آدمی ہیں۔ مگر وہ کہتا تھا کہ تم ذاتی باتیں چھوڑو' یہ شخص جو نظام لے کر آیا ہے وہ اس ملک کا بیڑا غرق کر دے گا اور اس ملک کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ لیکن میں جالب سے لڑتا تھا اور بعض اوقات تلخ بھی ہو جاتا تھا۔ بعد میں آ کر میں نے جالب سے اس کا اعتراف بھی کیا کہ میں غلط تھا اور میں نے تم سے جو تلخ گوئی کی ہے اس کی معافی چاہتا ہوں۔

صدر ایوب ہی کے دنوں کا واقعہ ہے کہ میں' احمد ندیم قاسمی صاحب اور کچھ دوسرے دوست رائل پارک میں اپنے ایک دوست موجد صاحب کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ محکمہ اطلاعات کے ایک سینئر آفیسر جہانگیر خان وہاں آئے اور مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے کہ قتیل صاحب میں ایک بہت بڑے آدمی کی طرف سے بھیجا گیا ہوں۔ وہ پہلے کسی فلم میں ہیرو بھی آ چکے تھے اور میرے دوستوں میں سے تھے۔ اس لئے میں نے بے تکلفی سے کہا کہ یہاں پر سب سے بڑے آدمی تو جنرل ایوب ہیں۔ کہنے لگے کہ آپ وہی سمجھ لیں۔ بہر حال میں آیا ہوں اور کام یہ ہے کہ آئندہ الیکشن میں آپ سٹیج پر مجمع کو شاعر کے طور پر کنٹرول کریں اور آپ جو کہیں گے وہی معاوضہ ہو گا۔ میں نے کہا کہ آپ معاوضہ کیا دیں گے۔ میں تو فلم میں ہی بہت کما لیتا ہوں۔ وہ کہنے لگے کہ آپ بتا دیں کہ آپ فلم میں کیا کماتے ہیں ہم اس سے بھی دو ہزار روپے زائد آپ کو دیں گے۔ اس کے علاوہ آپ کو سفر خرچ بھی ملے گا۔ پھر صدر صاحب خوش ہو کر جو دیں گے وہ اس کے علاوہ ہو گا۔

اس زمانے کے لحاظ سے یہ دس بارہ ہزار روپے ماہانہ کی پیشکش بنتی تھی لیکن میں نے جہانگیر صاحب سے کہا کہ میں اگرچہ صدر ایوب کا حامی ہوں اور انہیں ووٹ بھی دوں گا لیکن میں جلسے یا سٹیج کا شاعر نہیں ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں نے کبھی اس طرح کی

سیاست بازی میں آ کر حکمرانوں کی قصیدہ گوئی نہیں کی۔ اس لئے آپ مجھے معاف ہی رکھیں البتہ موجد صاحب کے اوپر ''محفل'' کے دفتر میں طفیل ہوشیار پوری صاحب ہوتے ہیں جو اس سلسلے کے بہترین آدمی ہیں۔ آپ وہاں چلے جایئے وہ ایسی چیزیں لکھتے ہیں اور پڑھتے بھی ترنم سے ہیں۔ اس لئے جلسے کے لئے ٹھیک ٹھاک رہیں گے۔ جہانگیر صاحب کہنے لگے کہ اس مشورے کا شکریہ لیکن مجھے تو آپ کے لئے کہا گیا ہے۔ اس لئے آپ غور کر لیں میں کل پھر آپ سے رابطہ کروں گا۔

اگلے دن وہ پھر وہاں پر آئے اور دوبارہ وہی بات کی۔ میں نے پھر انہیں اپنا وہی مؤقف دہرایا اور کہا کہ میں یقیناً ان کا حامی ہوں مگر یہ کام کر نہیں سکتا کیونکہ میری فطرت کے خلاف ہے۔ چنانچہ وہ اوپر چلے گئے مگر اس وقت طفیل ہوشیار پوری وہاں موجود نہیں تھے۔ اس لئے ان سے رابطہ نہ ہو سکا۔ اس کی بجائے بعد میں ان کا رابطہ مشیر کاظمی سے ہو گیا۔

مشیر کاظمی فلموں میں اداکاری بھی کر لیتے تھے اور نغمہ نگاری بھی مگر تک بند قسم کے شاعر تھے۔ ان کا رابطہ حسن اختر کے ہاں آنا جانا تھا جو پہلے منٹگمری میں ڈپٹی کمشنر رہ چکے تھے۔ رابطہ حسن اختر نے ہی انہیں جہانگیر صاحب سے Recommend کیا تھا۔ اور جب یہ جہانگیر صاحب سے ملنے کے لئے گئے تو پہلے ہی سے کوئی نظم وغیرہ ساتھ لکھ کر لے گئے تھے۔ اور انہیں گا کر سنائی۔ دوسرے کو آئینے میں اتارنا بھی جانتے تھے۔ اس لئے انہوں نے جہانگیر صاحب کو اپنے آئینے میں اتار لیا۔

مشیر کاظمی جلسوں میں جا کر لمبی لمبی نظمیں سنانے لگے انہیں اس کے صلے میں روٹ پرمٹ ملے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ اس طرح ایک غیر شاعر کے سر پر ہما بیٹھ گیا اور اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خوب کھایا۔ اس طرح جو موقع طفیل صاحب کو ملنے والا تھا وہ انہیں مل گیا۔ طفیل صاحب کو اگر یہ موقع مل جاتا تو دوسری بات تھی کیونکہ وہ کم از کم شاعر تو تھے مگر مشیر کاظمی صاحب تو تک بند تھے۔ اس طرح طفیل صاحب کی حق تلفی تو ہوئی لیکن اس کی تلافی بعد میں جا کر جنرل ضیاء کے دور میں ہو گئی۔

صدر ایوب

جنرل ایوب جس کسی پر مہربان ہوتے تھے پوری طرح ہوتے تھے اور اشاروں کنایوں میں پوچھ لیا کرتے تھے کہ جس سے وہ مخاطب ہیں اس کی ضروریات کیا ہیں۔ میرا شروع سے رویہ یہ تھا کہ اپنے لئے کوئی کام کہنا سر پر پہاڑ اٹھانے کے برابر ہوتا تھا لیکن میں دوسروں کے لئے فراخدلی سے کہہ بھی لیا کرتا تھا اور لڑ بھی لیا کرتا تھا۔

ایک بار مجھے صدر ایوب کے ملٹری سیکرٹری کا ٹیلیگرام موصول ہوا کہ پنڈی میں فلاں دن فلاں وقت پر آ کر صدر صاحب سے ملاقات کرو۔ حسب پروگرام میں وہاں گیا۔ میرے اپنے پاس تو کوئی گاڑی نہیں ہوتی تھی البتہ میرے دوست احمد ظفر کی پنڈی میں گاڑی ہوتی تھی اور ان کے بھائی ڈرائیو بھی کر سکتے تھے' چنانچہ ان کی گاڑی میں بیٹھ کر میں ایوان صدر پہنچا۔

جب میں صدر صاحب سے ملنے کے لئے گیا تو وہ کمرے میں تنہا بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے باتیں پوچھیں۔ ایک تو انہوں نے ہری پور کے بارے میں تفصیلات پوچھیں جو میں نے وضاحت سے بیان کیں۔ اصل میں انہیں میری یہ بات بھا گئی تھی کہ جب گزشتہ بار انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا تم ہری پور کے رہنے والے ہو تو میں نے کہا تھا کہ میں ہری پور کا رہنے والا تو یقیناً ہوں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہاں ہزاروں آدمی اور بھی رہتے ہیں۔ مجھے تو یہ فخر ہے کہ آپ نے مجھے شاعر کے طور پر پہچانا ہے اور آپ مجھے جو ملاقاتوں سے نواز رہے ہیں اس میں میری شاعری کو دخل ہے۔

صدر ایوب کو یہ چیز پسند تھی کیونکہ ذہنی سطح پر وہ علاقائیت کے قائل نہیں تھے وہ اپنے آپ کو پورے پاکستان کا باشندہ سمجھتے تھے اور پاکستانی ہونے پر انہیں بھی فخر تھا۔ اس لئے اگر کوئی شخص علاقائیت سے ہٹ کر بات کرتا تھا تو وہ خوش ہوتے تھے۔ اسی حوالے سے اب بھی باتیں ہوئیں تو انہوں نے کہا کہ یونہی میں جاننا چاہتا ہوں کہ تمہارا کیا حدود اربعہ ہے۔ میں نے بتایا تو کہنے لگے کہ اچھا کوئی کام ہو تو بتاؤ۔ میں نے کہا کہ ہمارا علاقہ بڑا پسماندہ ہے۔ میں نے پہلے بھی آپ سے گزارش کی تھی کہ یہاں تعلیمی سلسلہ زیادہ ہونا چاہئے۔ کہنے لگے کہ تمہیں معلوم نہیں کہ میں نے اپنی کتاب "FRIENDS NOT MASTERS" کی ساری رائلٹی وہاں کے سکولوں کو دے دی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بات میرے علم میں ہے لیکن اس علاقے کی پسماندگی اس سے بھی زیادہ چاہتی ہے اور اس کے لئے میری تجویز یہ ہے کہ وہاں پر ایک لائبریری بنے جس میں ادبی، مذہبی، سائنسی اور تکنیکی کتابیں ہوں اور اسے بڑے سائنٹیفک بنیاد پر چلایا جائے اور لوگوں میں کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا کیا جائے۔ ساتھ میں نے یہ بھی کہا کہ اس لائبریری کا نام آپ کے نام پر ہونا چاہئے۔ کہنے لگے کہ تم نے یہ بڑی اچھی تجویز پیش کی ہے، اس لئے میں چاہوں گا کہ یہ لائبریری تمہارے نام سے ہی منسوب ہو۔ میں یہ جواب سن کر بڑا خوش ہوا کہ اتنا بڑا آدمی مجھے یہ بات کہہ رہا ہے۔ اس موقع پر ہی انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ اس لائبریری کا تخمینہ لگا کر کسی وقت مجھے پوری تفصیلات سے آگاہ کرنا۔

اس کے علاوہ انہوں نے مجھے ایک لفافہ دیا اور کہا کہ یہ لے لو اور بچوں کو مٹھائی کھلا دینا۔ میں تو اس غرض سے گیا نہیں تھا لیکن انکار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ پریذیڈنٹ تھے۔ پھر انہوں نے مجھے کہا کہ روزگار کا ذریعہ کیا ہے۔ میں نے صاف صاف بتایا دیا کہ گزر بسر ہو جاتی ہے اور کچھ پیسے فلم سے آ جاتے اور کچھ مشاعروں سے۔ اس کے بعد جب میں باہر نکلا تو اعلان ہوا کہ قتیل شفائی صاحب کا ڈرائیور گاڑی لائے تو وہ مانگی ہوئی گاڑی آ گئی۔ میں نے لفافہ کھول کر دیکھا تو اس میں ایک ہزار روپیہ تھا۔

اس کے بعد جب میں لاہور آیا تو ایک روز مجھے گورنر ہاؤس سے اطلاع آئی کہ آپ

کے لئے پرمٹ ہیں۔ آپ آ کر یہ روٹ پرمٹ لے لیں۔ میں نے سوچا کہ صدر ایوب جو پوچھ رہے تھے اس کی روشنی میں یہ کیا ہے۔ ہر انسان کے دل میں کچھ لالچ بھی ہوتا ہے میں للچایا بھی لیکن ساتھ یہ بھی چاہا کہ یہ نہ ہو کیونکہ یہ ٹھیک نہیں ہے اور یہ باتیں انسان کو رسوا کرتی ہیں۔ لیکن صدر صاحب نے یکطرفہ کارروائی کر کے ایک طرف تو ایک ہزار روپیہ لفافے میں ڈال کر پکڑا دیا اور دوسرا یہ پرمٹ بھجوا دیئے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جس دن مجھے گورنر ہاؤس سے یہ اطلاع ملی تھی اس سے اگلے ہی دن اخبارات میں یہ اعلان ہو گیا کہ اب تک جتنے روٹ پرمٹ جاری کیے گئے ہیں وہ سب منسوخ ہو گئے ہیں۔ میں نے اپنے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ یہ روٹ پرمٹ منسوخ ہو گئے ہیں ورنہ ہو سکتا ہے کہ میں لالچ میں آ کر فالتو آمدنی کی غرض سے یہ پرمٹ لے لیتا اور اس کے بعد یہ لالچ نجانے مجھ سے کیا کچھ کرواتا۔

یہ واقعہ اگر ہو گیا ہوتا تو مجھ پر یہ ایک سچا الزام ہوتا۔ جبکہ اس کے بعد جب صدر ایوب مستعفی ہو کر چلے بھی گئے اور جنرل یحییٰ کا زمانہ آیا اور ان کے بعد بھٹو صاحب کا زمانہ آیا تو الطاف گوہر صاحب پر ایک کیس بنا اور اس میں میرا ذکر آ گیا کہ قتیل شفائی کو خفیہ فنڈ سے بیس ہزار روپے ادا کیے گئے۔

دراصل یہ وہی بیس ہزار روپے تھے جو الطاف گوہر صاحب نے فلم کے سلسلے میں ایک اور محکمے کو درمیان میں لا کر مجھے ایڈوانس کے طور پر چیک کے ذریعے دیئے تھے لیکن یہ پیسے اتنے کم تھے کہ ڈاکومنٹری فلم بن کر بھی مجھے کوئی بچت نہ ہوئی۔ میں نے بمشکل اپنا خرچ پورا کیا اور میری محنت اکارت گئی۔ یہ پیسے کسی کانفیڈنشل اکاؤنٹ سے نہیں تھے بلکہ فلم کے سلسلے میں مجھے دیے گئے تھے۔

میرے بہت ہی عزیز اور محترم دوست مختار مسعود ہیں جنہوں نے ''آواز دوست'' کتاب لکھی ہے۔ جب انہوں نے یہ خبر پڑھی تو انہیں حیرت ہوئی کہ قتیل شفائی نے یہ کام کیونکر کیا۔ تو انہوں نے تحقیق کی تو انہیں پتہ چل گیا کہ اصل بات کیا ہے۔ بہر حال یہ بات اخبارات میں آ گئی۔ میں نے اس کی تردید بھی بھجوائی لیکن جو سرخیاں جمی تھیں وہ بڑی تھیں

اور اس کے مقابلے میں تردید بہت چھوٹی اور ایک کالمی تھی اور کسی نے دیکھی اور کسی نے نہ دیکھی۔

جب الطاف گوہر صاحب اس مقدمے سے فارغ ہوئے تو ان سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ مجھے کہنے لگے کہ مجھ پر مقدمے کی تو کچھ وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن آپ تو خواہ مخواہ ہی رگڑے گئے۔ میں نے کہا کہ آپ ہی کے ہاتھ سے یہ ہوا تھا۔ وہ کہنے لگے کہ آپ کو کیس میں داخل ہو جانا چاہیے تھا۔ میں نے کہا مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔

روس میں کچھ ایّام

صدر ایوب ہی کے دور حکومت میں ایک ادبی و ثقافتی وفد مرتب کیا گیا جس میں مغربی پاکستان سے میں تھا اور مشرقی پاکستان سے دو بنگالی سکالر تھے جن کے نام پروفیسر سرور مرشد اور پروفیسر شوکت عثمان تھے۔ مؤخرالذکر مغربی پاکستان میں آتے جاتے رہتے تھے اور ہم سے واقف تھے۔ وہ بڑے اچھے افسانہ نگار بھی تھے۔ ہم تینوں تین ہفتے کے دورے پر روس گئے۔ انڈیا کے علاوہ ملک سے باہر یہ میرا پہلا دورہ تھا۔

اس وقت گلڈ کے سیکرٹری جنرل جمیل الدین عالی تھے۔ میں اس وقت کوئی عہدیدار نہیں تھا البتہ سنٹرل ایگزیکٹو کارکن تھا۔ مرے دورہ ماسکو کا سن کر عالی صاحب پریشان ہوئے اور مجھے کہنے لگے کہ آپ کے خیالات ونظریات پہلے ہی بائیں بازو کے ہیں' اب تو آپ وہاں سے پورے سرخے بن کر آئیں گے۔ میں نے کہا کہ عالی صاحب! میں کوئی احمق نہیں ہوں بلکہ کچھ سوجھ بوجھ رکھتا ہوں۔ میرا تو طریقہ یہ ہے کہ جہاں سے کوئی اچھی چیز ملتی ہے لے لیتا ہوں لیکن جو پسند نہیں ہوتی' اسے میں قبول نہیں کرتا۔ بنیادی طور پر میں لبرل ہوں۔ آغاز میں مسلم لیگ سے وابستہ رہا ہوں لیکن ان کی دو چیزیں مجھے پسند نہیں تھیں جنہیں میں مسترد کر چکا ہوں۔ اس طرح مجھے سوویت روس کی جو چیز ناپسند ہوں گی انہیں بھی مسترد کر دوں گا۔ میری اب کسی سیاسی پارٹی سے Commitment نہیں ہے۔ میں اپنے ذہن سے سوچتا ہوں۔ اب میری ادب کے ساتھ اور اپنے ملک کے ساتھ ایک ہی کومٹ منٹ ہے اور وہ یہ ہے کہ میں زندگی میں کسی استحصال کرنے والے کا ساتھ نہیں

دوں گا اور ملائیت کا ساتھ بھی نہیں دوں گا اور بالکل انہی چیزوں پر چلوں گا جو علامہ اقبال سکھا گئے تھے۔ اس کے علاوہ کسی تو ہم پرستی میں نہیں پڑوں گا۔ مزاروں پر جا کر دعائیں نہیں مانگوں گا اور اگر مانگوں گا تو اللہ تعالیٰ سے مانگوں گا۔ اسی طرح غریبوں اور مزدوروں کا استحصال کرنے والوں کے ساتھ کبھی مفاہمت نہیں کروں گا۔ اب اگر روس بھی استحصالی رویہ اختیار کرے گا تو میں اس سے بھی انکار کروں گا۔ اگر روس کے بارے میں دور کے ڈھول سہانے والی آپ کی بات صحیح ہوئی تو میں وہاں سے جو خیالات لے کر آؤں گا وہ آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔

ماسکو روانگی کیلئے ہیں اور دونوں بنگالی سکالرز کراچی میں جمع ہوئے اور وہاں سے ایک ساتھ ماسکو روانہ ہوئے۔ میرے ذہن میں یہ تھا کہ روس میں پہنچتے ہی ہمیں ایک دھچکا لگے گا اور ہماری برین واشنگ شروع ہو جائے گی۔ دھچکا یوں لگا کہ ہمیں کہا گیا تھا کہ آپ کی روس روانگی کی اطلاع آپ کے سفارت خانے کو دے دی گئی ہے اور آپ روس میں قیام کے دوران ان سے رابطہ رکھیں گے۔ لیکن ہم نے ماسکو پہنچ کر ایئر پورٹ پر چاروں طرف دیکھا تو ہمیں دور دراز تک اپنے سفارت خانے کا کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ البتہ سوویت رائٹرز یونین کے ایک دو عہدیدار وہاں موجود تھے جو ہمیں اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب صدر ایوب بھی دورہ روس پر گئے ہوئے تھے اور ہمیں توقع تھی کہ کسی نہ کسی شہر میں ہماری ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ ماسکو میں پہلے ہی دن ہمیں احساس ہو گیا کہ سوویت حکومت کا ہمارے ساتھ سلوک سرد مہری کا ہے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ ایک روسی خاتون INTER PRETER جس کا نام سوویتلانہ تھا کی ڈیوٹی لگا دی تھی جو ترجمان کے فرائض انجام دیتی تھی۔ ہمیں ایک اکیس منزل ہوٹل یوترانہ میں ٹھہرایا گیا تھا۔ اس ہوٹل کے تقریباً اکیس سو کمرے تھے اور فلور گراؤنڈ پر چار بڑے بڑے ریستوران تھے۔

عام طور پر طریق کار یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے وفد کے ارکان کو ملک میں پہنچتے ہی ایک الاؤنس دے دیا جاتا ہے تا کہ ارکان اپنی ضروریات مناسب طریقے سے پوری کر سکیں۔ ہمیں سوویت حکومت کی طرف سے ایسی کوئی سہولت نہ دی گئی بلکہ ہمارے کھانے

پینے کی ذمہ داری بھی سوویتیلانہ ہی کو سونپی گئی۔ جب ہم ریستوران میں کھانے کے لئے جاتے تو وہ بل پر دستخط کر دیتی تھی۔ ایک دن وہ کسی وجہ سے نہ آسکی تو ہم رات کو بھوکے ہی سوئے۔

اس طرح ہمیں بجائے اس کے کہ تعلیمی اداروں میں گھمایا جائے' وہ ہمیں سیاح کی طرح کبھی سرکس دکھانے کے لئے لے جاتے اور کبھی کوئی عمارت۔ جب ہم ایک رات فاقے میں رہے تو ہم نے احتجاج کیا کہ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایک بھوکے ملک سے آئے ہیں جہاں کے لوگ فاقے کرتے ہیں تو یہ بات ذہن سے نکال دیں۔ پاکستان کے لوگ یہاں کے لوگوں سے زیادہ کھاتے ہیں اور ہمیں فاقے کرنے کی عادت نہیں ہے۔ خیر سوویتیلانہ نے معذرت کی کہ یہ میری غلط ہے۔

اس واقعہ سے اگلے روز ہم پاکستانی سفارتخانے گئے تو دیکھا کہ وہاں صرف ایک چپڑاسی تھا اور اس کے علاوہ کوئی شخص نہیں تھا۔ ہم نے پوچھا کہ سفیر صاحب اور دیگر افسران کہاں ہیں تو اس نے کہا کہ وہ سب ماسکو سے باہر ہیں' آپ اپنی آمد کے بارے میں اس رجسٹر میں تحریر کر دیں۔ ہم تینوں نے اپنے نام اور پتے درج کیے اور رابطے کے لئے ٹیلیفون نمبر بھی لکھ دیئے۔ لیکن ہمارے ساتھ کسی نے کوئی رابطہ نہ کیا۔

اس دورے کے دوران میرے دل میں یہ بڑی تمنا تھی کہ کہیں کوئی اُردو یا پنجابی بولنے والا مل جائے کیونکہ میرے ساتھی بنگالی سکالروں میں سے ایک تو سرے سے اُردو جانتے ہی نہ تھے جبکہ دوسرے صاحب ابھی اُردو بولنا سیکھ رہے تھے اور میں ان کی اُردو درست کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ میں فرسٹ فلور پر لابی میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک دیکھا کہ دو سکھ سردار بحری فوج کی وردی پہنے آ رہے تھے۔ اس وقت میرے دونوں بنگالی باہر گئے ہوئے تھے کیونکہ ان کے مقاصد کچھ اور ہوتے تھے۔ دراصل بات یہ تھی کہ میں کچھ ممنوعہ چیزوں سے اجتناب کرتا تھا جبکہ وہ سور کا گوشت پسند کرتے تھے۔

میں اٹھ کر سردار صاحبان کی طرف بڑھا اور انہیں ست سری اکال کیا۔ وہ سن کر بڑے خوش ہوئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ میں نے بتایا

کہ میں لاہور کا رہنے والا ہوں۔ میں نے کہا کہ آئیں کچھ دیر میرے ساتھ بیٹھیں۔ وہ کہنے لگے کہ مسئلہ کیا ہے میں نے کہا کہ مسئلہ پنجابی کا ہے اور کتنے دنوں سے میں نے پنجابی میں بات نہیں کی۔ جس پر وہ بیٹھ گئے اور میرے لئے کچھ سنیکس منگوائیں اور خوب باتیں ہوئیں۔ ذہن پر جو بوجھ تھا وہ اترا۔

اس عرصے میں سفارتخانے سے فون آیا کہ سفیر صاحب مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ یہ فون کسی اہلکار نے کیا تھا اور وہ میرے نام ہی سے واقف تھے۔ اگر میں نہ ہوتا تو ممکن ہے کہ وہ انہیں بلاتے ہی نہیں۔ ہم ان سے ملنے کے لئے گئے تو وہ وہاں پر اکیلے بیٹھے ہوئے تھے۔ پروفیسر سرور مرشد اس دوران میں روس سے واپس جا چکے تھے۔ سفارتخانے میں ہمیں چائے اور بسکٹ پیش کیے گئے اور سفیر صاحب نے ہم سے پہلی بار ملاقات نہ ہو سکنے کی معذرت کی۔

میں نے پوچھا کہ آپ کے پاس کوئی پاکستانی اخبارات یا اور کوئی ادبی کتابیں وغیرہ ہیں تو انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور کہا کہ یہاں بہت دشواریاں ہیں۔ میں نے پوچھا کہ جب کوئی وفد آئے تو آپ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں تو کہنے لگے کہ ہمیں آپ کے آنے کی اطلاع نہیں تھی۔ لیکن ان کا یہ رویہ بتا رہا تھا کہ انہیں ضرور اطلاع ہوگی۔

ہوا یوں کہ فضل الرحمان خان جو صدر ایوب کے رشتہ دار تھے اور میرے کلاس فیلو تھے، وہ مغربی جرمنی میں سفیر لگے ہوئے تھے۔ میں نے ماسکو روانگی سے قبل انہیں خط میں لکھا تھا کہ میں ماسکو سے آپ کے ہاں آؤں گا، اس طرح میں نے انگلینڈ میں بھی اپنے بچوں اور دوستوں کو کچھ خطوط لکھے تھے کیونکہ وہاں سے مجھے انگلینڈ بھی جانا تھا۔ لیکن مجھے کسی بھی طرف سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔

وہاں ریڈیو نے میری کچھ ریکارڈنگ کی تھی اور معاوضے میں مجھے کچھ روبل مل گئے تھے مگر روسی کرنسی کو روس سے باہر کوئی پوچھتا نہیں تھا جبکہ مجھے مغربی جرمنی اور انگلینڈ بھی جانا تھا۔ چنانچہ میں نے روس میں پاکستانی سفیر سے کہا کہ مجھے پانچ پاؤنڈ کی ضرورت ہے کیونکہ میرے پاس ٹکٹ تو ہے لیکن مجھے کسی خط کا جواب نہیں آ رہا اور اگر لندن میں کوئی

مجھے لینے کے لئے ایئر پورٹ پر نہ پہنچا تو مجھے سخت دشواری ہوگی۔ وہ کہنے لگے کہ مجھے افسوس ہے ہم سے اس کا انتظام نہیں ہوگا۔ پھر کہنے لگے کہ میں دفتر میں کسی سے پوچھتا ہوں اور مجھ سے تبادلے میں پورے روبل وصول کر کے ان کے عوض پانچ پاؤنڈ عنایت کیے حالانکہ ان کے پاس فنڈز ہوتے ہیں اور اگر کوئی پاکستانی تکلیف میں ہو تو وہ اس کی مدد کرتے ہیں اور انہیں ان فنڈز کا حساب بھی نہیں دینا پڑتا۔

جب میں ماسکو سے انگلینڈ روانہ ہوا تو جس جہاز میں میں سفر کر رہا تھا وہ کراچی سے بذریعہ ماسکو لندن جا رہا تھا۔ اس جہاز میں بیٹھتے ہی دو آدمی پیچھے سے میرے پاس آئے اور پوچھا کہ آپ قتیل شفائی ہیں۔ میں نے کہا ہاں تو کہنے لگے کوئی تکلیف ہو تو بتایئے۔ میں نے کہا کہ میرے پاس پانچ پاؤنڈ تو ہیں لیکن ممکن ہے کہ وہاں مجھے زیادہ پیسوں کی ضرورت پیش آئے تو ان دونوں نے مجھے دس دس پاؤنڈ نکال کر دے دیئے۔

جب جہاز جا کر ایئر پورٹ پر رکا تو میں نے یہ دیکھا کہ میں نے جن جن لوگوں کو خطوط لکھے ہوئے تھے وہ سب مجھے لینے کے لئے ایئر پورٹ پر موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر کچھ جان میں جان آئی۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ نے میرے خطوں کا جواب کیوں نہیں دیا تو کہنے لگے کہ ہم نے تو آپ کو کئی کئی خط لکھے ہیں اور تار بھی دیئے ہیں۔ حیرت ہے کہ آپ کو کچھ بھی نہیں ملا۔

جب میں وہاں سے واپس لاہور آیا تو میرے لاہور پہنچنے کے بھی تقریباً دو ہفتے کے بعد مجھے ایک پیکٹ ملا جس میں فضل الرحمان صاحب سفیر پاکستان اور ان سب لوگوں کے خطوط بھی شامل تھے۔ حالانکہ میں اس دوران تقریباً تین ہفتے تک انگلینڈ میں بھی قیام پذیر رہا تھا۔

اس دورہ ماسکو کے بعد میں نے عالی صاحب سے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ میں سرخا بن کر آیا ہوں میں تو اپنا خون سفید کر کے آیا ہوں۔ کیونکہ ہمارے ساتھ روس والوں کا رویہ قطعی ناروا تھا۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ ہم لوگ جو وہاں آ رہے ہیں سب پروگریسو ہیں اور غالباً اسی لئے روس بھیجے بھی جا رہے تھے کہ ہم تعصبات رکھ کر کوئی بات نہیں کریں

گے۔ لیکن روس والوں نے ایک تو ہمارے ساتھ ادیبوں کی بجائے سیاحوں والا برتاؤ کیا اور دوسرے سرد مہری سے پیش آئے اور ہمیں فاقے کروائے۔ لیکن میں نے کہا کہ ان سب چیزوں کے باوجود میں سوشلزم سے تو منحرف نہیں ہوں لیکن روس والوں کا یہ رویہ دیکھ کر اب میں پہلے سے کہیں زیادہ قوم پرست بن کر واپس آیا ہوں۔

روس سے روانگی سے قبل جبکہ صدر ایوب بھی وہیں تھے تو میں نے ایک خط صدر ایوب کو تحریر کیا تھا جس میں میں نے لکھا تھا کہ میرے دونوں ساتھیوں کی اور خاص طور پر میری بڑی خواہش تھی کہ یہاں آپ سے ہماری ملاقات ہو جاتی۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکا اور ہم آپ کو یہاں خوش آمدید کہتے ہیں۔ میں نے یہ خط پاکستانی سفارتخانے کی معرفت بھجوایا تھا اور ظاہر ہے کہ صدر صاحب کے نام کوئی خط سفارتخانے کے عملے کے لئے صحیفہ آسمانی کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ میرا وہ خط صدر ایوب تک پہنچا دیا گیا۔

صدر ایوب سے جب ایوان صدر میں مذکورہ بالا ملاقات ہوئی تو اس موقع پر انہوں نے مجھ سے اس خط کا تذکرہ بھی کیا تھا اور پوچھا کہ دورۂ روس کیسا رہا۔ میں نے بتایا کہ غیروں سے تو کوئی شکوہ نہیں کیا جا سکتا لیکن اپنوں کا رویہ بھی مناسب نہیں تھا اور انہیں پانچ پاؤنڈ والا واقعہ سنایا۔ شاید تمام سفارتخانے ایسے ہی کرتے ہوں لیکن مجھے اس واقعہ سے بہت رنج ہوا تھا۔

دو حماقتیں

زندگی میں حماقتیں اور بھی کی ہوں گی لیکن ان میں سے دو تین حماقتیں بلکہ ظلم ایسے بھی مجھ سے سرزد ہوئے ہیں جو کہ آج بھی میرے ذہن کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا تعلق اقبال بانو سے بھی ہے۔ اقبال بانو سے میرے جذباتی تعلقات چل رہے تھے اور ان کے تمام امور اور مسائل میرے ذمے ہی ہوتے تھے۔

انہوں نے روہتک کی جائیداد کے سلسلے میں یہاں ایک کلیم (CLAIM) داخل کیا ہوا تھا جس کی پیروی میں ہی کر رہا تھا۔ ایک دن ان کی ملتان میں اسی سلسلے میں پیشی تھی اور جو افسر بحالیات اس کی سماعت کر رہے تھے وہ میرے جاننے والے تھے۔ اقبال بانو کے پاس کوئی کاغذات وغیرہ نہیں تھے پھر ان کا کیس زائد المعیاد بھی تھا لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح کیس رکوا دیا تھا اور اس کی پیروی بھی خود ہی کر رہا تھا۔

جب مذکورہ پیشی تھی تو اس سے ایک روز پہلے میں لاہور میں تھا اور یہاں یہ اطلاع آ چکی تھی کہ میرے سسر شدید علیل ہیں۔ چنانچہ میری بیوی ہری پور جا چکی تھی۔ اس پیشی سے ایک دن پہلے میری بیوی کا مجھے فون آیا کہ والد صاحب یعنی میرے سسر فوت ہو گئے ہیں اور آپ چلے آیئے۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔

اس کے بعد میں نے اقبال بانو سے فون پر بات کی اور بتایا کہ میرے سسر فوت ہو گئے ہیں اس لئے آپ کل جا کر اگلی تاریخ لے لیں۔ پھر میں سنبھال لوں گا۔ انہوں نے اسی طرح پریشانی کے عالم میں کہا کہ وہ تو فوت ہو گئے ہیں اور وہ تو واپس نہیں آئیں گے لیکن اگر اگلی تاریخ نہ ملی اور فیصلہ یکطرفہ ہو گیا تو بہت نقصان ہو گا۔

میں سسر کے جنازے میں شرکت کی بجائے ملتان چلا گیا۔ میری زندگی میں یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ میں اب بھی اپنے آپ کو اپنی بیوی کی طرف سے' مرحوم کی طرف سے اور اپنے ضمیر کی طرف سے مجرم سمجھتا ہوں۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ میری پھوپھی زاد بہن کے شوہر بزرگ اور معزز آدمی تھے۔ ان کے ساتھ کسی مسئلے پر جھگڑا ہو گیا۔ انہوں نے مجھے سخت سست کہا۔ جوانی کا عالم تھا میں اپنے غصہ پر قابو نہ پا سکا اور میں نے انہیں تھپڑ دے مارا۔ مجھے وہ کیفیت آج تک نہیں بھولتی کہ اس خلاف توقع تھپڑ پر جس طرح ان کا سراضطراری کیفیت میں ہلا وہ آج بھی میری نظروں کے سامنے گھومتا ہے۔ یہ منظر آج بھی میرے ذہن کو اذیت دیتا ہے۔ یہ واقعہ جب بھی یاد آتا ہے تو میں ہاتھ اٹھا کر اپنے اللہ سے دعا مانگتا ہوں۔ لیکن پھر سوچتا ہوں کہ اللہ اپنے جرائم تو معاف کر دے گا اور اگر نمازیں بھی نہ پڑھی ہوں گی تو وہ بھی معاف کر دے گا لیکن میرا یہ جرم شاید وہ معاف نہ کرے۔

مجھ سے قربت بڑھنے سے پہلے اقبال بانو کی ایک چوری ہوئی تھی۔ انہیں شبہ تھا کہ یہ چوری خاکوانی فیملی کے ایک رئیس نے ان کے ہاں کروائی ہے جس کی یہ پہلے داشتہ رہ چکی تھیں۔ اب خاکوانی خاندان بڑا اثر و رسوخ والا تھا اور اقبال بانو کا کیس ایک طرح سے ڈوبا ہوا تھا۔ اعجاز حسن بٹالوی میرے دوست تھے۔ میں نے ان سے بات کی اور ہم یہ کیس ہائی کورٹ میں لے گئے۔ ہم نے ہائی کورٹ سے ایسے وارنٹ جاری کروائے کہ وہ شخص گرفتار ہو کر حوالات میں چلا گیا۔ اب میں شہر میں دندناتا پھر رہا تھا اور یہ بھی نہ سوچا کہ ملتان ان کا اپنا شہر ہے اور یہ بڑے اثر و رسوخ والے اور زور والے لوگ ہیں۔ یہی نہیں بلکہ میں تھانے میں خود بھی گیا اور جا کر ایس ایچ او سے باتیں کرتا رہا جبکہ یہ خاکوانی شخص مجھے دیکھتا رہا۔

میرے ملتان کے دوستوں نے کہا کہ تم آ گئے ہو تو ہم تمہیں کچھ ہونے نہیں دیں گے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ تم ہماری موجودگی میں بھی بچ کر چلو کیونکہ تم نے خاکوانی خاندان کی عزت خاک میں ملا دی ہے اور ایسا کام کر دیا ہے جو پہلے ان کے ساتھ کبھی کسی نے نہیں کیا اور جس کی وجہ سے وہ کوئی بھی حملہ کر سکتے ہیں۔ اب میں سوچتا ہوں کہ عشق کے پاگل پن میں آدمی ایسے ایسے کام بھی کر جاتا ہے جن میں جان کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔

لتا منگیشکر

1961ء میں جب میں انڈیا کے سفر پر گیا تو میرے ساتھ میری بیوی اور بیٹا نوید تھے۔ اور بمبئی میں جب میں مقیم تھا تو مجھے میرے شاعر دوست اندیور نے بتایا کہ لتا منگیشکر کو جب میری بمبئی آمد کی اطلاع ملی تو انہوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے بھی پہلے سے تہیہ کر رکھا تھا کہ مشرق کی اس عظیم گلوکارہ سے بہر حال نیاز حاصل کروں گا۔ چنانچہ اندیور صاحب نے اس ملاقات کو یوں طے کیا کہ جب سٹوڈیو میں ان کے گانے کی ریکارڈنگ ہوگی تو وہیں ہماری ملاقات بھی ہو جائے گی۔

اس روز اندیور صاحب کے لکھے ہوئے دو نغمات کی ریکارڈنگ ہونی تھی۔ جب میں ریکارڈنگ روم میں پہنچا تو پہلے نغمے کی ریکارڈنگ جاری تھی۔ اس موقع پر کلیان جی آنند جی جو دو بھائی میوزک ڈائریکٹرز ہیں' ریکارڈنگ میں ہمہ تن مصروف تھے۔ لیکن انہوں نے دو ٹیکوں کے درمیان میں میرا ایسا استقبال کیا اور مجھے ایسی عزت دی جس نے تھوڑے سے وقت کی ملاقات کو مستقل دوستی میں بدل دیا۔

پھر جب پہلے نغمے کی ریکارڈنگ ختم ہوئی تو لتا جی خود چل کر مجھ تک پہنچیں اور گفتگو کا سلسلہ کچھ اتنا طویل ہو گیا کہ دوسرے نغمے کی ریکارڈنگ میں تاخیر ہونے لگی۔ میں نے لتا جی سے کہا کہ باتیں پھر بھی ہو سکتی ہیں آپ پہلے ریکارڈنگ کروا لیجئے لیکن لتا جی نے کہا کہ ریکارڈنگ بعد میں ہو جائے گی' باتوں کا سلسلہ نہیں ٹوٹنا چاہیے۔ چنانچہ باتوں کا سلسلہ نہ ٹوٹا اور میوزک ڈائریکٹرز کلیان جی آنند جی نے ریکارڈنگ کسی اور دن پر ملتوی کر دی۔

گفتگو کے موضوعات وہی شعر و موسیقی تھے البتہ خاص بات یہ ہوئی کہ لتا جی نے میری یہ تجویز قبول کر لی کہ میری دس غزلوں کا ایک لانگ پلے ریکارڈ بنایا جائے اور یہ تمام غزلیں صرف لتا جی گائیں۔ میوزک ڈائریکٹر کے لئے میں نے سجاد کا نام پیش کیا جسے لتا جی نے قبول کر لیا اور ہماری دوسری ملاقات لتا جی کے گھر ''پربھو کنج'' میں طے پائی جب مقررہ وقت پر میں ان کے گھر پہنچا تو لتا جی کو گھر کی دہلیز پر منتظر پایا۔ وہ ایک سفید ساڑھی پہنے' زیورات سے بے نیاز سادگی کی ایک خوبصوت مثال پیش کر رہی تھیں۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ میرے سامنے ایک اپسرا کھڑی ہے۔ میں نے لتا جی کی سادگی میں جو حسن دیکھا وہ حسن زیورات اور بھڑکیلے لباسوں سے لدی ہوئی خواتین میں کبھی نظر آیا۔

میرے ہمراہ میری بیوی اور میرا چار سالہ بیٹا نوید قتیل بھی تھا جو ماشاء اللہ اب جوان ہو چکا ہے اور ایک شوقیہ گلوکار کے طور پر اپنی شہرت کا آغاز کر چکا ہے۔ لتا جی ہم سب کو دیکھ کر پہلے سے زیادہ خوش نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے چائے سے فارغ ہو کر ہمیں ایک کمرے میں سجی ہوئی اپنی بہن اوشا منگیشکر کی تصاویر بھی دکھائیں اور ساتھ ہی اوشا جی سے ہمارا تعارف کروایا اور ہم لوگ تھوڑی دیر میں ان سے اجازت لے کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔

1961ء کے بعد 1979ء میں انڈین فلمساز منوج کمار نے میری ایک غزل:

کب تلک شمع جلی یاد نہیں
شام غم کیسے ڈھلی یاد نہیں

کی ریکارڈنگ کے موقع پر مجھے بمبئی آنے کے لئے کہا۔ چنانچہ پورے اٹھارہ برس بعد میں' میری بیوی اور نوید قتیل جو اب جوان تھا' عازم بمبئی ہوئے۔ چونکہ میری غزل کیھندر کپور اور لتا جی کی آواز میں ریکارڈنگ ہونی تھی اس لئے میری بڑی تفصیل کے ساتھ لتا جی سے ملاقات ہو گئی۔ لیکن وہ میری بیوی اور بیٹے کی آمد سے بے خبر رہیں۔

چند دنوں بعد ہز ماسٹر وائس ریکارڈنگ کمپنی نے تاج محل ہوٹل میں لتا جی کے اعزاز میں ایک استقبالیہ پیش کیا جس میں بمبئی کی فلم انڈسٹری کے سینکڑوں لوگ مدعو کیے گئے اور

پاکستان کی نمائندگی کے لئے مجھے اور میرے بچوں کو مدعو کیا گیا۔ جب یہ تقریب شروع ہوئی تو سب سے پہلے مجروح سلطانپوری صاحب نے لتا جی کے لئے ایک نظم پڑھی' پھر مرحومہ نرگس جی نے انگریزی زبان میں ایک یادگار تقریر کی اور کچھ لوگوں کی تقریروں کے بعد جب کھانے پینے کا مرحلہ آیا تو ہم لتا جی سے دور ایک ٹیبل پر بیٹھے تھے کہ اچانک لتا جی ہماری طرف آتی دکھائی دیں۔

انہوں نے آتے ہی میری بیوی سے کہا کہ ارے آپ کب آئیں۔ قتیل صاحب نے تو مجھے بتایا ہی نہیں کہ آپ بھی آئی ہوئی ہیں۔ میری بیوی نے نوید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میرے علاوہ آپ کا پرانا ننھا مہمان بھی ہمارے ساتھ ہے۔ لتا جی نے جوان ہو گئے اس بچے کو حیرت سے دیکھا اور اسے دعا دی۔

میں اس واقعے کے بعد اب تک حیرت میں ڈوب ڈوب جاتا ہوں کہ ایک معروف آرٹسٹ نے پورے اٹھارہ سال بعد ایک گھریلو عورت کو کیسے پہچان لیا۔ کیا یہ اس آرٹسٹ کی عظمت کی دلیل ہے یا ایسا ہے کہ ایک عورت دوسری عورت کو ہمیشہ یاد رکھتی ہے۔

ممتاز مفتی

جب کوئی شخص نئے ابھرتے ہوئے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے تو وہ برسوں کا سفر مہینوں میں اور مہینوں کا سفر ہفتوں میں طے کر لیتا ہے۔ اس کی حوصلہ افزائی ہو جاتی ہے اور وہ بلا جھجک آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ شعر و شاعری میں ڈاکٹر تاثیر، تاجور صاحب، سالک صاحب، حفیظ ہوشیار پوری اور اپنے استاد احمد ندیم قاسمی کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی سے میں اس میدان میں آگے آیا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ شاعری سے پہلے میرا رجحان افسانہ نگاری کی طرف تھا اور میں اس حد تک افسانے لکھنے لگا تھا کہ انہیں دوسرے درجے کے افسانے کہا جا سکتا ہے۔ یہ افسانے ساقی دہلی اور سنگ میل کے علاوہ دوسرے ادبی پرچوں تک بھی پہنچ گئے تھے۔

میں نے ممتاز مفتی صاحب کی چند چیزیں پڑھی ہوئی تھیں اور میں نے دیکھا کہ میں جن موضوعات کو چھیڑتا ہوں وہ انہی موضوعات کے قبیلے کے سرخیل ہیں۔ اس وقت تک میں شاعری میں ندیم صاحب سے استفادہ کر رہا تھا۔ لیکن ندیم صاحب کا افسانوں کا انداز میرے رجحانات سے بالکل مختلف تھا۔ مفتی صاحب نفسیات کی بھول بھلیاں اور جنسی موضوعات زیر بحث لاتے تھے۔ میرا ذہن بھی ادھر ہی تھا۔

ایک دن میں نے سوچا کہ ممتاز مفتی صاحب سے مشورہ کروں۔ میں نے ایک افسانہ لکھا اور مفتی صاحب کے پاس لے گیا اور کہا کہ میں افسانے لکھ رہا ہوں اور آپ سے کچھ مشورہ لینا ہے۔ آپ میری رہنمائی کریں۔ کہنے لگا کہ اچھا افسانہ سناؤ۔ یہ افسانہ چار یا پانچ

فل سکیپ کاغذات پر مشتمل تھا۔ میں نے سنایا تو مفتی صاحب نے اس پر جس طرح رائے زنی کی وہ میری توقعات کے برخلاف تھی کیونکہ وہ مجھ سے ہمیشہ مروت سے پیش آتے تھے لیکن افسانہ سن کر مجھے کہنے لگے کہ یار تم نے یہ افسانہ لکھا ہے۔ میں نے کہا جی میں نے افسانہ ہی لکھا ہے۔ کہنے لگے کہ نہیں، یہ افسانہ نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ آپ اسے کیا نام دیں گے۔ کہنے لگے کہ یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کا کیا خیال ہے۔ امپرووومنٹ ہوسکتی ہے۔ کہنے لگے، نہیں قطعاً نہیں ہوسکتی۔ اس میں کوئی گنجائش ہی نہیں۔

یہ سن کر میرا دل ٹوٹ گیا۔ لیکن میں نے ان کی رائے کو سچ مانا

اس لئے کہ میں بطور نامور افسانہ نگار کے ان کا دل سے معترف تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ افسانہ واقعی اتنا ہی برا ہوگا جتنا یہ کہہ رہے ہیں۔ اس کے بعد میں نے وہی افسانہ کچھ اور لوگوں کو بھی دکھایا انہوں نے کہا کہ اگرچہ یہ پائے کا افسانہ نہیں ہے مگر پھر بھی اچھا افسانہ ہے۔ اور اس میں تمام افسانوی ضرورتیں موجود ہیں۔

اصل بات یہ تھی کہ میں ان دنوں ویسے بھی یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ میں ان دونوں اصناف ادب میں سے کونسی ایک رکھوں۔ چنانچہ مفتی صاحب کے یہ کلمات میرے ذہن میں گونجتے رہے۔ ان کے ان کلمات سے میری کافی دل شکنی بھی ہوئی لیکن اس فیصلے میں بھی مدد ملی کہ میں شاعری اور افسانہ نگاری میں سے کونسی چیز اختیار کروں۔

شاید مفتی صاحب کو یہ واقعہ یاد بھی نہ ہو۔ لیکن مجھے بہرحال یاد ہے اور میں اب بھی سوچتا ہوں کہ انہوں نے یہ رائے دینے میں اتنی شدت کیوں اختیار کی۔ ورنہ بزرگوں کا قاعدہ تو یہ ہوتا ہے کہ نئے لکھنے والوں کو سمجھاتے ہیں مگر بات لیکن سے شروع کرتے ہیں اور پھر اصل مقصد تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس واقعہ کے بعد میں نے افسانہ نگاری کو خیر باد کہا اور شاعری کی طرف مکمل توجہ دی۔

انڈیا کا سفر

انڈیا میں نے بچپن میں بھی دیکھا تھا لیکن اس وقت میں بالکل بچہ تھا اور اس وقت کے واقعات مجھے اس طرح یاد ہیں جیسے خواب کے کچھ دھندلے دھندلے منظر ہوں۔ یہ میں اپنی پھوپھی' پھوپھا اور ان کی بیٹی کے ساتھ گیا تھا۔ وہ ذرا پیر پرست قسم کے لوگ تھے اور مزاروں پر آتے جاتے تھے۔ انہیں اجمیر شریف' کلیر شریف' دہلی میں نظام الدین اولیاء کے مزار اور تاج محل جسے اس وقت تاج بی بی کا مزار کہا جاتا تھا' پر جانا تھا۔

اس کے بعد میرا انڈیا کا سفر 1952ء میں ہوا۔ یہ تقسیم کے بعد میرا انڈیا کا پہلا سفر تھا۔ دہلی چیمسفورڈ کلب کا ایک مشاعرہ تھا جس میں پاکستان سے مجھے بلایا گیا تھا اور اس کے اہتمام کرنے والوں میں کنور مہندر سنگھ بیدی' ساحر ہوشیار پوری اور جگن ناتھ آزاد تھے۔ چنانچہ میں دہلی گیا۔ یہ ہوائی جہاز میں بیٹھنے کا بھی میرا پہلا موقع تھا اور میں نے لاہور سے دہلی تک کا سفر ہوائی جہاز میں کیا۔

فوکر جہاز کے ذریعے دہلی پہنچا تو جگن ناتھ آزاد وہاں مجھے لینے کے لئے آئے تھے۔ ان سے مدت بعد ملاقات ہوئی۔ وہ میرے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ انہوں نے میرے قیام کا بندوبست ساحر ہوشیار پوری صاحب کے گھر میں کیا تھا۔ یہ ایک بڑا گھر تھا اور کبھی اس میں جوش ملیح آبادی رہا کرتے تھے۔ یہ پل بنگش کے علاقے میں واقع تھا اور اب یہ جگن ناتھ آزاد صاحب کو الاٹ ہو چکا تھا اور انہوں نے اس کا کچھ حصہ ساحر ہوشیار پوری صاحب کو دیا ہوا تھا' جو وہاں رہتے تھے۔

ساحر ہوشیار پوری کا اصلی نام اوم پرکاش ہے۔ لیکن ان کی دوسری شادی ایک مسلمان خاتون سے ہوئی تھی اور انہی کے ساتھ وہ وہاں رہ رہے تھے۔ ان کی دو سالیاں اپنے وقت کے مشہور ہیرو میاں نجم الحسن اور ایک بریگیڈیئر صاحب سے بیاہی ہوئی تھیں، جو تقسیم کے بعد پاکستان میں رہ رہے تھے۔

میں دونوں کا مشترکہ مہمان تھا لیکن جگن ناتھ آزاد صاحب کے سٹڈی روم میں ایک پلنگ اور دو کرسیاں لگا دی گئی تھیں جہاں میں رات کو سوتا تھا۔ دن میں ویسے بھی سارا وقت دعوتوں میں گزر جاتا تھا۔

مشاعرہ ہوا۔ چیمسفورڈ کلب جگمگا رہا تھا اور ایک عجیب سماں پیش کر رہا تھا۔ دہلی میں بڑی آزادی کا زمانہ تھا اور اس کلب میں آنے والے سبھی لوگ پینے پلانے والے تھے۔ مشاعرے والوں نے کلب کے بار کے علاوہ اپنے بار کا بھی بندوبست کر رکھا تھا۔ کیونکہ وہاں تقریباً نوے فیصد شعراء پینے والے تھے۔

میرے جانے سے یہ مشاعرہ ہندو پاک ہو گیا حالانکہ میں یہاں سے اکیلا ہی گیا ہوا تھا۔ جب کسی مشاعرے یا محفل موسیقی میں اس طرح پینے پلانے والے لوگ بیٹھے ہوتے ہیں تو انہیں کوئی اچھی چیز ایک عام آدمی سے دس گنا زیادہ اچھی لگتی ہے یہ ماحول تھا اور لوگ خوب داد دے رہے تھے۔ دلیپ کمار صاحب سے بھی اس مشاعرے میں ملاقات ہوئی۔

لاہور میں کرفیو کے زمانے میں نے ریڈیو کے لئے ایک غزل لکھ کر جگن ناتھ آزاد صاحب کو دکھائی تھی۔ انہوں نے یہ غزل ناپسند کی تھی لیکن ریڈیو پر یہ غزل حاصل مشاعرہ رہی اور میرے اچھے تعارف کا ذریعہ بنی تھی۔ اس مشاعرے میں جب میری باری آئی تو میرے ذہن میں یہ غزل آئی۔ میں نے کہا کہ میں آج کے وقت کو تھوڑا پیچھے لے جانا چاہتا ہوں اور وہی واقعہ بیان کیا البتہ جگن ناتھ آزاد صاحب کے نام کا حوالہ نہ دیا۔ اور کہا کہ اس روز بھی جگن ناتھ آزاد میرے ساتھ تھے اور آج بھی یہاں میزبان ہیں۔ اس لئے میں یہ غزل ان کی نذر کرتا ہوں:

تمہاری انجمن سے اٹھ کے دیوانے کہاں جاتے

میں نے جب یہ غزل سنائی تو لوگوں نے ایک ایک شعر پانچ پانچ بار پڑھوایا اور جیسے یہ غزل لاہور میں میری شہرت کا باعث بنی تھی' اس طرح دہلی میں بھی یہ میری شہرت کا باعث بنی اور اس مشاعرے کے بعد بیسیوں نامور شاعروں نے اس زمین میں غزلیں کہیں اور اسی غزل کو شکیل بدایونی جیسے شاعر نے چار فلموں میں اس کا چربہ کر کے استعمال کیا اور ساتھ یہ بھی کہ کام کا کوئی شعر نہیں دیا۔ آپس میں شاعروں کی لاگت بازی تو ہوتی ہے چنانچہ مجھے یہ فائدہ ہوا کہ مجروح صاحب نے اس بات کو ہوا دی کہ شکیل نے قتیل کی غزل چوری کر لی ہے۔ یہ بات اخبارات میں بھی آئی۔ اس طرح میرا تعارف ہوتے ہوتے اور زیادہ ہو گیا۔

اس سے تھوڑا عرصہ پہلے کی بات ہے کہ میری ایک غزل تھی:

اک جام کھنکتا جام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

پاکستان میں یہ غزل ماسٹر غلام حیدر کی ٹیون میں نور جہاں کی آواز میں ریکارڈ ہونی تھی اور سید شوکت حسین رضوی کی فلم میں لی جانی تھی کہ اچانک ایک دن انڈیا کے ریڈیو سے سنا کہ ایک غزل لتا کی آواز میں گائی جا رہی تھی جس کی ردیف تھی' رات گزرنے والی ہے۔ اب بعض ردیفیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں ردیف ہی نمایاں ہوتی ہے۔ اگر وہ ردیف کسی اور جگہ استعمال کر لی جائے تو اصل غزل کی حیثیت ہی کوئی نہیں رہتی مثلاً

پریشاں رات ساری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

اب اس میں ''ستارو تم تو سو جاؤ'' ایک بڑی دلکش ردیف ہے۔ اگر فلم کی حد تک کوئی اور شخص ''ستارو تم تو سو جاؤ'' ردیف رکھ کے غزل ڈال لے تو قطع نظر اس کے کہ اس کے باقی مصرعے اس کے اپنے ہوں گے یہ چوری کہلائے گی۔ مجھے اس سے بہت صدمہ ہوا۔ میں نے' ماسٹر غلام حیدر نے اور کچھ دوسرے ساتھیوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ چونکہ یہ ردیف آ چکی ہے۔ اس لئے اب اس غزل کو روک لیا جائے۔ اس طرح فلم گلنار کی یہ غزل جس میں نور جہاں کی اس وقت کی آواز تھی جیسے سونے کی گھنٹیاں بج رہی ہوں اور جس کی دھن بھی ماسٹر غلام حیدر نے بہترین بنائی تھی' رہ گئی۔

میں نے اس واقعہ کے بعد راج کپور صاحب کو لکھا لیکن بعد میں پتا چلا کہ یہ چٹھی راج کپور صاحب تک نہیں پہنچنے دی گئی۔ اس دوران یہ بات اخبارات میں بھی آ چکی تھی۔ چنانچہ جب شکیل صاحب نے میری چوری کی تو یہ بات بھی اخبارات میں آ گئی۔ میری ان چوریوں کی وجہ سے جب میرا بار بار نام آیا اور اس کے بعد میں بمبئی پہنچا تو کئی پارٹیاں میرے پیچھے پیچھے تھیں۔ کیونکہ وہ کہتے تھے کہ جس شخص کی یہاں چوری چلتی ہے' اب جبکہ وہ خود یہاں آیا ہوا ہے تو اس سے اصل چیز کیوں نہ لی جائے۔ یہ 1952ء کا واقعہ ہے۔

سن باون کو گزرے ہوئے تو بہت عرصہ گزر گیا ہے لیکن انڈیا میں میرے کلام کی چوری اب تک نہیں رکی اور بقول ندا فاضلی' اس سے کوئی انکار نہیں کہ انڈیا میں جتنی بے دردی سے میرا کلام لوٹا گیا ہے اس کے ساتھ کہیں اور ایسا سلوک نہیں کیا ہوگا۔ ورنہ کسی بڑے یا چھوٹے شاعر کا نام لے لیں۔ اس نے میری کچھ نہ کچھ چوری کی ہوگی اور کچھ نے تو تقریباً پورے کا پورا گیت بھی چوری کیا ہوگا۔ مجھے نہ تو اس کا معاوضہ دیا' نہ سکرین پر میرا نام آیا اور نہ مجھ سے اس کی اجازت لی گئی۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ میرے اس گیت کا بھی ہے کہ:

مجھے آئی نہ جگ سے لاج
میں اتنے زور سے ناچی آج
کہ گھنگرو ٹوٹ گئے

یہ گیت آج سے کوئی بیس بائیس برس پہلے پاکستانی فلم ''ناز'' میں موسیقار نثار بزمی کی دھن میں شریف نیئر صاحب نے اپنی فلم میں شامل کیا۔ چونکہ گیت کی ادبی حیثیت بھی تھی اس لئے میں نے اسے ''شمع'' دہلی میں بھی چھپوا دیا تھا۔ یہ گیت آج سے تقریباً آٹھ دس سال پہلے ہندستان اور پاکستان کے گویوں پر ایسا سوار ہوا کہ جسے دیکھو وہ کسی نہ کسی طرح اسے استعمال کر رہا تھا۔

یہ گیت سب سے پہلے بغیر اجازت کے میں نے برمنگھم میں بی بی سی ٹیلیویژن سے استعمال ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہاں کچھ لوگوں نے مجھ سے ذکر کیا کہ ایک گیت ہے

''گھنگرو ٹوٹ گئے'' جو بہت خوبصورت ہے۔ میں نے کہا کہ وہ تو میرا گیت ہے۔ وہ بڑے حیران ہوئے۔ اس کے دو چار دن بعد بی بی سی والے میرا انٹرویو لینے آئے تو میں نے انہیں کہا کہ آپ کے ادارے تو بڑے با اصول ہیں لیکن میرا ایک گیت آپ کے یہاں چل رہا ہے۔ ایک تو بغیر اجازت ایسا ہو رہا ہے اور دوسرا میرا نام بھی ساتھ نہیں لیا جاتا۔ کہنے لگے کہ جی اگر گانے والے رئیس خان نے بتایا ہوتا تو ہم ساتھ آپ کا نام بھی دے دیتے۔ بہر حال اب یوں کرتے ہیں کہ آپ کے انٹرویو کے ساتھ اسے دوبارہ چلاتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے میرے مفصل انٹرویو کے ساتھ یہ گیت دوبارہ نشر کیا تو پھر لوگوں کو پتا چلا کہ یہ میرا گیت ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ بغیر اجازت کے کوئی کلام استعمال کرتے ہیں، وہ اصل مصنف سے تو رجوع کر نہیں سکتے چنانچہ وہ غلطیاں کرتے ہیں۔ اس گیت میں بھی کم از کم چار شعری غلطیاں رکھ کے رئیس خان نے اسے گایا اب اس کے بعد اور جس کسی نے اسے گایا تو وہ بھی غلطیاں کرتا چلا گیا اور جگہ جگہ یہ گیت غلط سکرپٹ کے ساتھ گایا جاتا رہا۔ یہ غلطیاں ایک عام موسیقی نواز یا شعری فہم رکھنے والے کے لئے تو کوئی اہمیت نہیں رکھتیں لیکن باذوق آدمی کو یہ غلطیاں بہت کھٹکتی ہیں۔

انڈیا کے پنکج اداس صاحب سے کچھ دوستانہ تعلقات بھی تھے اور انہوں نے ایک بار دعوت بھی کی تھی لیکن جب میں ادھر آیا تو پتا چلا کہ انہوں نے یہ گیت ''گھنگرو ٹوٹ گئے'' گایا اور اس طرح یہ گیت جلوٹا صاحب اور پھر ایک خاتون بھوپالی نے گایا اور تو اور میں دہلی آیا تو جس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا وہاں میرے پاس گراموفون کمپنی والے آئے اور کہنے لگے کہ یہاں آپ کے قوالوں میں سے ایک صاحب آئے تھے اور کچھ گا گئے ہیں۔ یہ تو ہم نے لوگوں سے سنا ہے کہ ان کا گایا ہوا گیت آپ کا ہے لیکن اس گیت میں جو بند ٹھیک نہیں لگتا آپ ذرا اسے سن لیں۔ میں نے سنا تو پہلے تین بند تو میرے ہی تھے جن میں پہلے جیسی کچھ غلطیاں بھی تھیں لیکن چوتھا بند انہوں نے خود ہی شامل کر دیا تھا۔ یہ قوال غلام فرید صابری صاحب کے بھائی مقبول صابری نے گایا تھا۔ تاہم گراموفون کمپنی والوں نے اسے بغیر

اجازت ہونے کی وجہ سے روک لیا پہلے تو انہوں نے چوتھا انترا کاٹا اور پھر مجھ سے اس گیت کی اجازت طلب کی۔ میں نے اجازت دے دی۔

پھر ایک بار پتا چلا کہ سلمٰی آغا نے یہ گیت ایک انڈین فلم کے لئے گایا ہے۔ اصل میں محمود سپرا نے یہ گیت اپنی ایک فلم میں رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ لیکن جب ان دونوں کی ناراضی ہو گئی تو سلمٰی آغا نے جلدی جلدی یہ گیت پلے بیک کے طور پر ریکارڈ کروا دیا حالانکہ اس نے اس فلم میں کام بھی نہیں کیا تھا۔ اس کی مجھے آج تک ادائیگی نہیں کی گئی۔ اس کے بعد میرے پاس ایک صاحب آئے اور کہا کہ یہ گیت پنجابی میں ہونا چاہیے اس کا مکھڑا یہی رہے لیکن باقی گیت پنجابی میں ہو۔ اس شخص نے مجھ سے اجازت لے کر اور مجھ سے پنجابی میں یہ گیت لکھوا کر استعمال کیا۔

اس گیت کے بارے میں میں نے جتنا بیان کیا ہے یہ اس سے کہیں زیادہ استعمال ہوا ہے اور بغیر اجازت استعمال ہوا ہے۔ بلکہ میں نے انڈیا میں ایک گجراتی فلم میں اس کا پورا ترجمہ بھی دیکھا۔ اور یہ بھی سنا کہ کچھ اور زبانوں میں بھی ترجمہ کر کے اسے استعمال کیا گیا ہے۔ یہ گیت میری زندگی میں دیکھتے دیکھتے ایک Folk song کی حیثیت اختیار کر گیا ہے لیکن جنہوں نے اس گیت پر ڈاکہ زنی کی' انہوں نے مجھے بہت ہی نقصان پہنچایا۔

صرف یہی نہیں بلکہ میرے کچھ اور گیت بھی چوری ہوئے۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے:

ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ

اسی طرح ایک اور گیت:

حسن کو چاند جوانی کو کنول کہتے ہیں

یہ گیت بھی چوری ہوئے اس کے علاوہ جو گیت چوری ہوئے ان میں سے کچھ جو مجھے یاد ہیں وہ یہ ہیں۔

انگڑائی پر انگڑائی لیتی ہے رات جدائی کی

○

تمہاری انجمن سے اٹھ کے دیوانے کہاں جاتے

مؤخرالذکر گیت تو چار مرتبہ چوری ہوا۔ ایک عجیب واقعہ یہ ہوا کہ میں بمبئی میں کیفی اعظمی صاحب کے ہاں گیا ہوا تھا۔ وہاں ایک فلم پروڈیوسر میرے پاس آئے اور کہا کہ میری فلم ''ایکبار کہو'' کی دو تین ریلیں ساتھ ہی پروجیکشن ہال میں دیکھ لیں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ فلم کی کہانی قتیل شفائی سے شروع ہوتی ہے اور ہیروئن شاعر کی فین ہے۔ ہیرو اس کی اس کمزوری سے واقف ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ قتیل شفائی کی ایک نئی کتاب آئی ہے۔ وہ لاتا ہے اور اسے اس میں سے یہ نظم سنا کر اظہار محبت کرتا ہے۔

زندگی میں تو سبھی پیار کیا کرتے ہیں
میں تو مر کر بھی مری جان تجھے چاہوں گا

میرے ساتھ اس وقت جو لوگ بیٹھے تھے ان میں میرے شاعر دوست کیفی اعظمی بھی بیٹھے تھے جنہوں نے اس فلم کے گانے لکھے ہوئے تھے۔ اور انہیں شاید اس بات کا نہیں پتا تھا۔ چنانچہ جب ہم وہاں سے اٹھ کر دوبارہ کیفی صاحب کے ہاں آئے تو وہ پروڈیوسر سے بڑے ناراض تھے۔ پروڈیوسر نے مجھ سے کہا کہ جی ایک تو میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ پہلے سے آپ سے اجازت نہیں لی اور دوسرے آپ سے اس کی اجازت طلب کرتا ہوں۔ میں نے کہا کہ اگر تم مفت میں اسے استعمال کرنے کی اجازت لینا چاہتے تھے تو وہ تو تم استعمال کر چکے ہو لیکن اگر معاوضہ ادا کر کے اجازت لینا چاہتے تھے تو وہ تم اب ادا کر دو۔ لیکن وہ صاحب نجانے کیوں مجھ سے ناراض ہوئے کہ آخر تک ناراض رہے۔

زندگی میں ہر انسان کی کچھ حسرتیں ہوتی ہیں اور اگر کبھی قدرت انہیں پورا کرتی ہے تو بڑی شان سے کرتی ہے۔ بچپن میں فلم اور گراموفون ریکارڈوں کے حوالے سے میری کچھ تمنائیں ہوتی تھیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اچھے شعر کہوں اور میرا کلام سہگل گائے۔ یا پھر میرا کلام سریندر گائے۔ اس کا ایک گانا تھا:

یاد نہ کر دل حزیں بھولی ہوئی کہانیاں

یہ گانا سپرہٹ تھا اور جگہ جگہ نوجوان گاتے تھے۔ اس لئے تمنا تھی کہ سریندر میرا کلام گائے۔ اس کے علاوہ قوالوں میں محمد علی فریدی کے ریکارڈ میرے پاس تھے۔ یہ ہری پور

کے نزدیکی گاؤں شاہ محمد میں اپنے کسی جاننے والے دوست کے پاس آیا کرتے تھے اور وہاں گانے کی محفل ہوتی تھی۔ میں ان کی آواز کا بڑا عاشق تھا اور جی چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی ایسا سمبندھ ہو کہ یہ میری کوئی چیز گا دیں۔

ان گلوکاروں کے علاوہ میرے ذہن میں دو میوزک ڈائریکٹر مدن موہن اور سی رام چندرا بھی تھے جن کے بارے میں ذہن میں یہ خواہش تھی کہ یہ میرے گیتوں کی دھن بنائیں۔ یہ میری شروع کی تمنائیں تھیں۔ اب دیکھئے کہ قدرت کیسے ان تمناؤں کے پورے ہونے کا وقت لاتی ہے۔ لیکن اس مرحلہ پر بھی ہوتا کیا ہے۔

چند سال پہلے میں انگلینڈ گیا تو میں وہاں اپنے ایک بیٹے اور ایک دوست سوہن راہی کے ساتھ بیٹھا تھا تو ایک فون آیا۔ فون کرنے والے نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ میرا نام سی رام چندرا ہے۔ شاید آپ مجھے جانتے ہوں۔ مجھے توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ اتنا بڑا میوزک ڈائریکٹر خود مجھے فون کر سکتا ہے۔ اس لئے میں نے کہا کہ میں ایک سی رام چندرا کو جانتا ہوں جو بہت مشہور میوزک ڈائریکٹر ہیں۔ اگر آپ وہ ہیں تو آپ کو کون نہیں جانتا لیکن اگر آپ کوئی اور ہیں تو پھر اپنا تعارف کروا دیجئے۔ وہ ہنسنے لگے اور کہنے لگے کہ میں وہی ہوں۔ دراصل آپ جب پچھلی بار بمبئی آئے تھے تو مجھے آپ کے آنے کا دیر سے پتا چلا تھا۔ میری خواہش تھی کہ آپ کی غزلوں کا ایل پی بناؤں۔ چنانچہ جب آپ کا پتا کیا تو آپ دہلی جا چکے تھے اور مجھے آپ کا وہاں کا ایڈریس معلوم نہیں تھا۔ پھر وہاں ایک سندھ کے ہندوار جن داسانی تھے مجھے پتا چلا کہ ان کے پاس آپ کا کلام ہے۔ میں نے ان سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ انڈیا میں میرے سوا اور کوئی قتیل صاحب کا کلام استعمال نہیں کر سکتا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا یہ بات ٹھیک ہے تو میں نے کہا کہ یہ بات ٹھیک تو نہیں ہے۔ خیر مجھے کہنے لگے کہ آج میں شام کی فلائٹ سے جا رہا ہوں اور اب مجھے پتا چلا ہے کہ آپ یہاں ہیں' اس لئے آپ اپنے صاحب خانہ سے کہیے کہ وہ مجھے ایڈریس سمجھا دیں اور میں آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں۔

میرے لئے تو یہی کافی تھا کہ میں جسے چاہتا ہوں وہ میوزک ڈائریکٹر مجھ سے

ہمکلام تھا۔ اس لئے میں نے کہا کہ یہ نہیں ہوگا بلکہ آپ اپنا ایڈریس بتایئے میں آپ کے پاس پہنچتا ہوں۔ انہوں نے ایڈریس بتایا اور میں' میرا بیٹا اور سوہن راہی وہاں پہنچے۔ ان کا حلیہ سن رکھا تھا کہ اونچے قد کے' گوری رنگت اور وسکی کا گلاس ہاتھ میں ہوتا ہے جب میں وہاں پہنچا تو دروازے تک اٹھ کر آئے پھر بات چیت ہوئی۔

میں نے انہیں بتایا کہ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ میرا کلام سننا چاہتے ہیں ورنہ میری تو کئی سال پہلے سے تمنا تھی کہ آپ کے ساتھ میں کسی فلم میں ہوں۔ کہنے لگے کہ فلم تو اب بعد میں دیکھی جائے گی' میری خواہش یہ ہے کہ میں آپ کے کلام کا غیر فلمی ایل پی. بناؤں۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے' یہاں تو میرے پاس کلام نہیں ہے۔ میں عنقریب پاکستان جانے والا ہوں۔ وہاں سے میں آپ کو پندرہ غزلیں بھیج دوں گا' اس میں سے آپ جو غزلیں استعمال کرنا چاہیں کریں۔ یہ غزلیں آپ کی ملکیت ہوں گی' آپ معاوضے کا فکر نہ کریں۔ یہ میری طرف سے نذرانہ ہوگا اور میں معاہدہ بھی ساتھ ہی لکھ کر بھیج دوں گا۔ کہنے لگے کہ معاوضہ تو خیر آپ کو کمپنی کی طرف سے ملے گا کیونکہ میں اپنے لئے بھی یہ پسند نہیں کرتا کہ معاوضہ نہ لوں' اس لئے آپ کو معاوضہ تو لینا ہی ہوگا۔

وہ اس شام بمبئی روانہ ہو گئے۔ بعد میں میں پاکستان آیا اور حسب وعدہ یہاں سے یہ چیزیں رجسٹری کے ذریعے پوسٹ کر دیں۔ کئی دن گزر گئے لیکن ان کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ اچانک ایک دن کسی بھارتی پرچے میں یہ خبر پڑھی کہ ان کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے اور وہ چل بسے ہیں۔ یہ خبر پڑھ کر مجھے دوہرا صدمہ ہوا۔ ایک تو اپنی خواہش کے پورا نہ ہونے کا اور دوسرے مرنے والے کی خواہش کے پوری نہ ہو سکنے کا۔

اسی طرح بمبئی کا واقعہ ہے کہ مجھے سریندر کا فون آیا اور کہا کہ میں ایک پرانا ایکٹر ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ پرانے نہیں ہیں' آپ اب بھی نئے ہیں۔ کہنے لگے نہیں اب تو میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ مجھے دیکھیں گے تو میں بھی بوڑھا ہوں۔ کہنے لگے کہ آپ کلام سے تو بوڑھے نظر نہیں آتے۔ کہنے لگے کہ فلم میں تو آج کل میں نہیں آ رہا ہوں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری آواز اب بھی ٹھیک ہے۔ آپ کرم کیجئے

کیونکہ میں آپ کا کلام ریکارڈ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا جی بہتر میں آپ کو خط لکھ کر بھیج دوں گا۔ آپ کو میرا جو کلام پسند آئے لے لیجئے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں آپ سے ملنے کے لئے آؤں گا لیکن بہت سے مشاعرے آپڑے اور میں کلکتہ چلا گیا۔ پھر مصروفیت کی وجہ سے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ میں نے انہیں خط لکھنے اور کچھ کلام بھیجنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔

واپس لاہور آ کر تقریباً ڈیڑھ ماہ گزر گیا۔ انہوں نے مجھے جو ایڈریس دیا تھا وہ مجھ سے کھو چکا تھا۔ جب یاد آیا تو میں نے ''شمع'' دہلی والوں کو لکھا کہ ان کا ایڈریس بھیج دیں۔ اس کے بعد پھر یہ بات ذہن سے نکل گئی۔ اس طرح سال ڈیڑھ سال گزر گیا اور پھر پتا چلا کہ وہ بھی اس دنیا میں نہیں رہے۔

محمد علی فریدی صرف قوالی ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ریکارڈوں کے لئے گیت بھی گاتے تھے۔ میں یہاں سمن آباد ہی میں پرانے مکان میں رہتا تھا تو ایک دن دوپہر کے وقت مجھے پتا چلا کہ کوئی آدمی ملنے کے لئے آیا ہے۔ نام پتا کروایا تو نوکر نے بتایا کہ ان کا نام محمد علی فریدی ہے۔ میں یہ نام سن کر چونکا۔ باہر نکل کے دیکھا تو باہر ایک لمبی ڈاڑھی والا آدمی کھڑا تھا۔ اب میں نے انہیں ان کی جوانی میں دیکھا تھا۔ وہ کلین شیو ہوتے تھے اور خالص پنجابی پہلوانوں والی پگڑی باندھتے تھے۔ لیکن غور سے دیکھا تو وہی تھے۔ میں نے کہا کہ آیئے تشریف رکھیے اور بتایئے کہ کس طرح تکلیف کی۔ کہنے لگے کہ آپ کو ایک تکلیف دینے آیا ہوں۔ امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ میں پرانے زمانے کا آدمی ہوں اور پہلے دربار گولڑہ شریف میں آپ کی ایک غزل گاتا رہا ہوں جو مرحوم پیر صاحب بہت پسند کرتے تھے۔ وہ غزل تھی:

تمہاری انجمن سے اٹھ کے دیوانے کہاں جاتے

کہنے لگے کہ میں نے کوئی دس سال تک یہ غزل گائی ہے اور مرحوم پیر صاحب کی خوشنودی حاصل کی۔ اب مجھے خیال آیا ہے کہ آپ سے کچھ اور چیزیں لے لوں اور گاؤں۔ میں نے کہا کہ یا حضرت! اب میں آپ کو جو بتانے والا ہوں' آپ سینے پر ہاتھ رکھ کر سنیے

کہ میں ہری پور کا رہنے والا ہوں موضع شاہ محمد آپ جایا کرتے تھے اور آپ کا ایسا حلیہ ہوا کرتا تھا اور آپ یہ گایا کرتے تھے۔ وہ میری باتیں سن کر اچھل پڑے اور کہنے لگے کہ آپ نے اس زمانے میں مجھے سنا اور دیکھا ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ میں آپ کا بڑا قدردان اور فین ہوں۔ سن کر بڑے خوش ہوئے اور انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ میری اپنی تمنا تھی کہ آپ میرا کلام گائیں لیکن اس زمانے میں میرا کلام اس قابل تھا ہی نہیں۔ اب اگر قدرت نے موقع دیا ہے تو میں آپ کی خدمت کروں گا۔

چنانچہ میں نے انہیں کچھ چیزیں دیں۔ لیکن ان کا زمانہ اب گزر چکا تھا۔ بہت ہی بوڑھے ہو چکے تھے۔ اور اب گانے کا انداز بھی بدل چکا تھا اس لئے میرا اکیلا کلام بھی ان کی مدد نہ کر سکا۔ بہر حال مجھے ان کے آنے سے جو خوشی ہوئی وہ کبھی کبھی حاصل ہوتی ہے۔

بمبئی کا مشاعرہ

شعروں کی مقبولیت سے شاعروں کو راحت ہوتی ہے البتہ بعض اوقات راحتوں کی شکل بدل جاتی اور ہوتا یوں ہے کہ داد تو ملتی ہے لیکن بڑی پریشان کر کے۔ مدراس کے ایک مشاعرے پر گیا تو واپسی پر ''مغل اعظم'' فلم کے پروڈیوسر کے آصف نے مجھے بمبئی میں روک لیا۔ اس وقت ان کی فلم ''محبت اور خدا'' بن رہی تھی اور وہ اس کے گانے مجھ سے لکھوانا چاہتے تھے۔ ان کے ایک ہندو دوست نے میری دعوت کی جس میں چند ایک دوسرے شاعروں کو بھی مدعو کیا گیا۔

کھانے کے بعد شعری نشست ہوئی اور عین اس وقت جب میں اپنا کلام سنانا شروع کر چکا تھا تو ایک معزز شخص جو کہ لباس سے سیٹھ لگتا تھا اور جس کی سب عزت کر رہے تھے۔ وہاں آیا۔ میں نے ابھی ایک یہ شعر پڑھا تھا لہٰذا غزل پھر سے پڑھنا شروع کر دی۔ غزل یہی تھی:

تمہاری انجمن سے اٹھ کے دیوانے کہاں جاتے
جو وابستہ ہوئے تم سے وہ افسانے کہاں جاتے

جوں جوں میں پڑھتا جا رہا تھا ان صاحب کے چہرے پر غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ جب مقطع ختم ہوا تو چونکہ اس آخری شعر میں میرا نام نہیں تھا تو وہ شخص مجھ سے مخاطب ہوا کہ صاحب یہ آپ کی اپنی غزل ہے؟ میں نے کہا جی۔ کہنے لگے نہیں آپ جھوٹ بولتے ہیں یہ تو قتیل شفائی کی غزل ہے۔ کے آصف بھی ہنسے اور مجھے بھی سمجھ آ گئی کہ یہ شخص مجھے کیوں

گھور رہا تھا۔ چونکہ وہ دیر سے آیا تھا اور اس نے اناؤنسمنٹ نہیں سنی تھی اس لئے وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ کوئی بمبئی کا شاعر ہے اور قتیل شفائی کی غزل اپنے نام سے پڑھ رہا ہے۔

کے آصف نے کہا کہ سیٹھ جی یہ قتیل شفائی ہی ہیں۔ اور پاکستان سے تشریف لائے ہیں یہ سن کر اس شخص نے بہت معذرت کی اور اگلے دن اپنے ہاں دعوت بھی رکھی۔ جب میں اگلے روز اس دعوت میں شرکت کے لئے گیا تو وہ پھر بہت معذرت کرنے لگا۔ میں نے کہا کہ آپ نے تو مجھے بہت بڑی داد دی ہے تب کہیں جا کر وہ شخص کچھ مطمئن ہوا۔

انڈیا میں میرے بہت سے کلام کی چوری کی وجہ سے میرا نام کافی مشہور ہو چکا تھا چنانچہ جب میں وہاں گیا تو کے آصف کے علاوہ اور بھی بہت سے پروڈیوسروں نے اپنی فلموں کے لئے مجھ سے گیت لکھوانے کی خواہش ظاہر کی۔ جب اس طرح کوئی غیر ملکی آ کر پہلے سے وہاں موجود لوگوں میں دراڑ پیدا کر دے تو محسوس تو ہوتا ہے۔ لیکن میرا معاملہ یہ نہیں تھا کیونکہ میں وہاں عملاً جا کر کوئی گڑ بڑ نہیں کر رہا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ مدارس سے واپسی پر بمبئی میں وشوامتر عادل کے گھر میں میں ساحر لدھیانوی کے ساتھ دیوالی کی رات کی وجہ سے چلا گیا۔

میرا مقصد تو دوستوں کو ملنا تھا اور ساحر کو پتا تھا کہ وہاں بہت سے لوگ دیوالی کی وجہ سے اکٹھے ہوں گے اس لئے وہ مجھے وہاں ساتھ لے گیا تھا۔ چنانچہ وہاں بہت سے لوگ موجود تھے۔ جن میں میں کیفی اعظمی، سردار جعفری، وشوامتر عادل اور کے آصف بھی شامل تھے۔ کے آصف میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مولانا آپ نے اپنے آنے کی اطلاع ہی نہیں دی اور ہمیں تو آپ کی وہ غزل چاہیے تھی۔

پریشاں رات ساری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

میں چونکہ بیوی کو دہلی میں ساحر ہوشیار پوری کے گھر چھوڑ آیا تھا، اس لئے جلد واپس جانا چاہتا تھا لیکن کے آصف کے اصرار پر مجھے وہاں رکنا پڑا۔ میں جب ان کی فلم کے گانے لکھ رہا تھا تو ایک طوفان مچ گیا اور اعتراض ہوا کہ یہ غیر ملکی یہاں گانے نہیں لکھ سکتا۔ کیونکہ یہ ہماری یونین کا ممبر نہیں ہے۔ مجھے کچھ اور پروڈیوسروں کی طرف سے بھی ایڈوانس

پیسے مل چکے تھے۔اس لئے میں کچھ پریشان ہوا۔

اس وقت وہاں رائٹرز یونین کے سیکرٹری قمر جلال آبادی تھے جو میرے لاہور کے زمانے کے دوست تھے۔انہوں نے کہا کہ اگر ان کے پاس یونین کی ممبر شپ نہیں ہے تو انہیں ممبر شپ دے دیتے ہیں۔انہوں نے خلوص دل سے چاہا کہ میں ممبر بن جاؤں۔ چنانچہ میں نے ان کے کہنے پر درخواست دے دی تو انہی لوگوں نے یہ پوائنٹ کھڑا کر دیا کہ کوئی غیر ملکی آدمی اس یونین کا ممبر نہیں بن سکتا۔اب وہاں دو گروپ بن گئے۔ایک وہ گروپ تھا جو بڑے بڑے پیسے لے کر فلموں پر چھایا ہوا تھا اور دوسرا چھوٹا گروپ جس میں شامل افراد کو کم معاوضہ ملتا تھا اور کام بھی کم ملتا تھا۔یہ دوسرا گروپ میرے وہاں جانے سے بہت خوش تھا۔اس لئے کہ ان کی بہت حق تلفی ہو رہی تھی۔

اس دوسرے گروپ نے میرے حق میں کہا کہ ان لوگوں کو اعتراض کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے جبکہ یہ خود ایک شخص کی چوری کرتے ہیں اور جب وہ خود آتا ہے تو اسے کام کرنے نہیں دیتے اور ممبر شپ نہیں دیتے۔اس زمانے میں میری ایک بیٹی کو گردن توڑ بخار ہوا تھا اور میں اس کے علاج کے لئے جگہ جگہ تدبیر کر رہا تھا۔اور بمبئی جانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہاں ایک ڈاکٹر سنہا تھے جو ہومیو پیتھک علاج کرتے تھے اور میں ان سے مشورہ بھی کرنا چاہتا تھا۔یہ بات اس یونین کو بھی معلوم تھی اور انہوں نے ازراہ تضحیک میرے لئے بیس ہزار روپے کی امداد منظور کی اور کہا کہ ہم ممبر شپ تو نہیں دے سکتے لیکن یہ عطیہ پیش کرتے ہیں کیونکہ وہ شاعر برادری سے ہیں اور بیٹی کا علاج کروالیں۔

مجھے جب اس کا پتا چلا تو میں نے اس پر احتجاج کیا اور کہا کہ میں یہاں بھیک مانگنے کے لئے نہیں آیا اور نہ ہی میں آپ کی فلموں میں گانے لکھنا چاہتا ہوں۔آپ اپنے پروڈیوسروں سے پوچھئے کہ وہ کیوں مجھ سے گانے لکھوانا چاہتے ہیں جب میرا یہ خط انہیں پہنچا تو ایک گروپ نے ان سے کہا کہ انہوں نے بالکل ٹھیک لکھا ہے' آپ دستور میں ترمیم کیجئے اور ہم انہیں اپنا ممبر بنائیں گے۔چنانچہ یونین کی طرف سے مجھے ممبر شپ نہ دینے کا فیصلہ واپس لیا گیا۔میں نے سوچا کہ میں کس مصیبت میں پڑ گیا ہوں اور واپس چلا آیا۔

اس زمانے میں میں یہاں سب سے بڑا گیت نگار تھا۔ اگر میں وہاں رک جاتا تو وہاں سب سے بڑا نہ ہوتا بلکہ بہت سے بڑوں میں سے ایک ہوتا۔ میرے پاس گرودت کا کچھ ایڈوانس تھا' آنے سے پہلے میں نے انہیں ان کا ایڈوانس لوٹانا چاہا تو انہوں نے کہا کہ ہم یہ پیسے واپس نہیں لیں گے کیونکہ Defaulter ہم ہیں۔

اس عرصے میں میں نے دیکھا کہ جو بڑے شعراء تھے اور میرے دوست بھی تھے' پس پردہ وہی میرے مخالف تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں انڈیا میں گانے لکھوں کیونکہ ان پر سیدھی زد پڑتی تھی۔ لیکن یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے میرا بہت سا کلام استعمال کیا ہوا تھا۔ البتہ ان میں ایک مست قلندر آدمی اندیور تھا جس کے گھر میں ٹھہرا ہوا بھی تھا۔ اس زمانے میں وہ آمدن کے اعتبار سے دوسرے درجے کا شاعر تھا۔ اس نے میرا ساتھ دیا۔ انڈیا میں گانے لکھنے کا ایک اور مرحلہ بھی آیا۔ منوج کمار صاحب وہاں کے چوٹی کے ڈائریکٹر اور پروڈیوسر اور نامور ایکٹر تھے جب یہ لاہور آئے تو مجھ سے ملنا چاہا کیونکہ انڈیا میں ان سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ صاحب ذوق آدمی تھے اور شعری ذوق انہیں ورثے میں ملا ہوا تھا۔ ان کے والد بھی شاعر تھے اور خضر تخلص کرتے تھے۔ جب یہ 1978ء میں یہاں آئے تو میں ان سے ملنے کے لئے ایک مقامی ہوٹل میں گیا۔ لابی ہی میں ان سے ملاقات ہو گئی۔ کہنے لگے کہ ہم تو آپ کے بڑے مداح ہیں۔ ان کے ساتھ ان کا بیٹا بھی تھا۔ جس کا نام کنال تھا۔ کہنے لگے کہ اب یہ فلموں میں ہیرو بھی آ رہا ہے اور پھر بیٹے کو مخاطب کر کے کہنے لگے چلو بیٹے انہیں ان کی غزل سناؤ تو اس نے وہیں کھڑے کھڑے ہی مجھے میری غزل سنا دی۔ اس کی ٹیون بھی اس نے خود ہی بنائی تھی۔ اس بے تکلفی کی وجہ سے ان کے ساتھ تعلقات بڑھے تھے۔

انڈین شاعروں کا سلوک

یہ غالباً 1961ء ہی کی بات ہے جب انڈیا کے دوست شاعروں نے مناسب سمجھا کہ وہ غیر ملکی ہونے کی وجہ سے مجھے کام سے روک دیں۔ اس زمانے میں وہاں جو ایک دو مخلص دوست ملے ان میں او پی نیئر کا نام میں بہت اونچائی پر رکھتا ہوں۔ یہ شخص اتنا کھرا' منہ پھٹ اور سچا تھا کہ نقصان اٹھا لیتا تھا مگر سچ سے باز نہیں آتا تھا۔ یہ اس کا وہ زمانہ تھا جب اس کے تعلقات اپنی دوسری بیوی آشا بھونسلے سے بگڑ چکے تھے۔

آشا بھونسلے اور لتا منگیشکر آپس میں بہنیں ہیں کسی وقت جبکہ او پی نیئر فلم میں بالکل نووارد تھے' لتا منگیشکر نے نیئر صاحب کو گانے کا وقت نہیں دیا تھا اور روایت یہ ہے کہ نیئر صاحب نے اس وقت طے کر لیا تھا کہ وہ زندگی بھر لتا منگیشکر سے گانا نہیں گوائیں گے چنانچہ انہوں نے اوّل سے آخر تک یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ لتا کے بغیر بھی چل سکتے ہیں۔ انہوں نے لتا کی بہن آشا بھونسلے سے شادی کر لی اور آشا نے ایک انٹرویو میں تسلیم کیا کہ ان کی آواز میں جو Expression ہے یہ او پی نیئر کی دین ہے۔ آشا کی طرف سے یہ بات کہنا بہت بڑی بات ہے کیونکہ انہوں نے یہ الفاظ اس وقت کہے تھے جب وہ نیئر صاحب سے علیحدہ ہو چکی تھیں۔

لتا سے تو ان کے تعلقات پہلے سے ہی خراب تھے' اب آشا بھونسلے سے بھی قطع تعلق ہو گیا تو ان کے پاس زیادہ کام کاج نہ رہا۔ کیونکہ پروڈیوسرز زیادہ تر انہی دو آوازوں کو پسند کرتے تھے۔ اس سے ایک بار پہلے جب میں انڈیا گیا تھا تو نیئر صاحب نے مجھے کہا تھا

کہ آپ بمبئی آ جائیں تو ہم مل کر کام کریں گے۔ کیونکہ میں شاعری کے سلسلے میں اپنا سٹائل تھوڑا سا بدلنا چاہتا ہوں۔ پہلے میں بالکل نچلی سطح پر کام کرتا تھا اب میں تھوڑا سا اوپر آ کر کام کروں گا۔ جس کے لئے مجھے آپ کی شاعری کی مدد درکار ہے۔

اس بار جب میں وہاں گیا تو نیئر صاحب بہت خوش ہوئے اور ہر دوسرے تیسرے روز جگہیں بدل بدل کر میری دعوتیں کرنے لگے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ کام نہ ہونے کی وجہ سے وہ کچھ تلملائے ہوئے سے رہتے ہیں لیکن غیور اتنے تھے کہ ان دونوں بہنوں سے مصالحت کر لیں اور ان سے گانے گوائیں یہ قبول نہیں تھا۔

لوگ او پی نیئر کے اس حد تک معترف تھے کہ انہیں Master of Rhythm کہتے تھے اور پورے صفحے پر ان کا نام دیتے تھے اور پکچر بک جاتی تھی۔ چنانچہ لوگ ان کے فن سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ مگر لتا اور آشا کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں تھی جو پوری فلم کے بوجھ کو سہار سکے۔ چنانچہ نیئر صاحب بھی اس صورتحال کی وجہ سے اندر سے ہلے ہوئے تھے۔

میرے ایک دوست بابا بہادر شاہ تھے جو اب انتقال کر چکے ہیں۔ آخر میں وہ دمے کے مرض کے سپیشلسٹ بن کے کام کر رہے تھے۔ لیکن شروع میں وہ بمل رائے پارٹی میں ایکٹنگ کرتے رہے تھے۔ انہوں نے بمل رائے سے میرا ذکر کیا مجھ پر یہ اللہ کا بڑا کرم رہا ہے کہ فلم کے سبھی بڑے لوگ میرے نام سے واقف تھے۔ چنانچہ بابا بہادر شاہ سے بمل رائے نے کہا کہ میں قتیل صاحب سے اگلی فلم کے گانے لکھواؤں گا تم ان سے بات کرو۔ انہوں نے بابا بہادر شاہ سے کہا کہ آپ گانے قتیل صاحب کے رکھیں لیکن میوزک میرا ہو۔ اور پھر میری وجہ سے لاکھ روپے سے نیچے آتے آتے نیئر صاحب اس بات پر رضامند ہو گئے کہ وہ ایک روپیہ بھی معاوضہ نہیں لیں گے۔

اب پھر آوازوں کا سوال پیدا ہوا تو نہ تو میں نے اور نہ بابا بہادر شاہ نے ان کے سامنے لگا منگیشکر اور آشا بھونسلے کا نام لیا کیونکہ وہ بڑے نازک دل کے مالک تھے اور ہم نہیں چاہتے تھے کہ انہیں یہ بات ناگوار گزرے۔ یہ بڑا اچھا Combination ہوتا لیکن

اس بات کی ضمانت کون دیتا کہ آشا بھونسلے گائے گی۔ چنانچہ یہ معاملہ رہ گیا۔

نیئر صاحب کے پیار کی بات یہ تھی کہ انہوں نے ایک نیا فلیٹ لیا اور اس کا ایک کمرہ میرے لئے ریزرو کر دیا اور اس کے باہر قتیل شفائی کے نام کی نیم پلیٹ لگا دی اور مجھ سے کہا کہ میں نے یہ کمرہ مستقل طور پر آپ کے لئے ریزرو کر دیا ہے۔ آپ جب بھی بمبئی آئیں گے، یہیں ٹھہریں گے۔

اس واقعہ کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان جنگوں کی وجہ سے اٹھارہ سال کا وقفہ پڑ گیا تو اس وقفے کے بعد جب میں بمبئی گیا تو اب نیم پلیٹ تو دروازے پر نہیں تھی لیکن نیئر صاحب کا پیار اب بھی اسی طرح قائم تھا۔ اگر کوئی تبدیلی آئی تھی تو وہ صرف یہ تھی کہ نیئر صاحب اب میوزک ڈائریکٹر کی بجائے ہومیو پیتھک ڈاکٹر بن چکے تھے اور ان کے جو ٹھاٹھ میوزک ڈائریکٹر کے طور پر تھے وہی ٹھاٹھ اب ڈاکٹر کے طور پر تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک بڑے ڈاکٹر کی طرح وہ مصروف تھے اور ان کی اچھی خاصی کمائی تھی۔

میں نے پوچھا کہ یہ تبدیلی کیوں آئی ہے۔ کہنے لگے کہ کام تو کوئی کرنا ہی تھی اور اس کام کا مجھے پہلے سے شوق تھا۔ البتہ پہلے صرف دوستوں کا شوقیہ علاج کرتا تھا اور اب میں نے اسے ذریعہ معاش بنا لیا ہے۔ کیونکہ بمبئی کی فلم انڈسٹری میں دو ہی چیزیں ہوتی ہیں یا تو جوتے مار کر کام کرو یا پھر جوتے کھا کر کام کرو۔ میں نے اس انڈسٹری میں بہت جوتے مارے ہیں۔ کام اب بھی کر سکتا ہوں لیکن اب کام جوتے کھا کر کر سکتا ہوں اور وہ مجھے گوارا نہیں ہے۔

او پی نیئر کے علاوہ میری دوسری دوستی راجندر کرشن سے بنی۔ یہ یہاں تقسیم سے پہلے گجرات کے قریب کسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے اس زمانے میں کوئی تخلص بھی رکھا ہوا تھا۔ پھر یہ شملہ میں ملازمت کرتے رہے لیکن بعد میں بمبئی آ گئے۔ یہ بڑے بذلہ سنج، دوست اور شاعری میں انوکھے تیور کے آدمی تھے۔ لیکن دوسرے شاعروں کی طرح ان کی اس طرح کی پبلک ریلیشننگ نہیں تھی کہ انہیں ایوارڈ وغیرہ ملیں۔ وہ سب سے زیادہ کام کرتے تھے اور ایک زمانہ وہ تھا کہ مدراس کی فلم انڈسٹری پر ان کی پوری طرح

Monoply تھی۔

وہ نہ صرف فلم کے گانے اور ڈائیلاگ لکھتے تھے بلکہ فلم کے دوسرے کام بھی ان کی مرضی سے کیے جاتے تھے۔ چنانچہ مصروفیت کے باعث ان کا ایک قدم بمبئی میں ہوتا اور دوسرا مدراس میں۔ پھر شان یہ تھی کہ اگر فلم مدراس کی ہے تو اس کا میوزک بمبئی کے ایک ہوٹل کے کمرے میں بن رہا ہے جہاں پر میوزک ڈائریکٹر ان کے زیر ہدایت کام کر رہا ہے۔

ایسے پر زور آدمی تھے کہ مزاحیہ گانے بھی لکھتے تھے اور کلاسیکل بھی۔ انہوں نے ہر ایک رنگ میں گانے لکھے۔ میں جب بمبئی گیا تو میری ان سے پہلی ملاقات ڈاکٹر نارنگ کے گھر پر ہوئی۔ ڈاکٹر نارنگ نے لاہور سے فلم کیریئر کا آغاز کیا تھا اور پنچولی کی فلم میں ہیرو بھی آ چکے تھے۔ راجندر کرشن ان دنوں ڈاکٹر نارنگ کی کسی فلم کے گانے لکھ رہے تھے۔

راجندر کرشن نے اس زمانے میں میری وہاں دعوت کی جب وہاں شراب کی مکمل بندش تھی۔ یہ مرار جی ڈیسائی کا زمانہ تھا جنہوں نے شراب کی بجائے پیشاب پینا شروع کر رکھا تھا۔ لیکن فلم انڈسٹری کی کوئی دعوت شراب کے بغیر ہوتی نہیں تھی۔ چنانچہ راجندر کرشن نے میرے اعزاز میں جو دعوت کی اس میں انڈسٹری کے سب بڑے بڑے لوگ بلائے۔ میرے راہبر میوزک ڈائریکٹر ایس ایم بابل تھے جو اب یہاں ہیں اور معذور ہو چکے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں آپ کو وہاں پہنچا دوں گا۔ انہوں نے خود پہلے ہی بہت زیادہ پی لی تھی اور جب مجھے ساتھ لیا تو زیادہ پینے کی وجہ سے صحیح راستہ بھول گئے۔ تقریباً دو تین گھنٹے تک مجھے ٹیکسی میں بٹھا کر گھماتے رہے۔ آخر میں نے کہا کہ ٹیکسی چھوڑیے اور پیدل ہی گھر ڈھونڈتے ہیں۔

ہم ٹیکسی سے اترے ہی تھے کہ ہم نے دیکھا کہ میوزک ڈائریکٹر مدن موہن ایک پان والے کی دوکان سے پان لے رہے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو پیار اور ناراضی کے ملے جلے انداز میں میرے سینے پر مکا مار کر کہنے لگے۔ ظالم تو نے اس کی ساری پارٹی تباہ کر کے رکھ دی ہے۔ ابھی ابھی لوگ کھانا کھا کر گئے ہیں اور اس نے مسلسل تین گھنٹے تمہارا انتظار کیا

ہے۔ میں نے کہا ہمیں ان کے گھر لے کر تو چلیں۔ مدن موہن راولپنڈی کے رہنے والے تھے اور جانتے تھے کہ میں بھی ہری پور اور پنڈی کا رہنے والا ہوں۔ اس لئے مجھ سے بہت زیادہ پیار کرتے تھے اور دو تین ملاقاتوں میں ہی بہت قریب آ گئے تھے۔

وہ ہمیں ساتھ لے کر راجندر کرشن کے گھر گئے جو کہ وہاں سے قریب ہی تھا۔ راجندر نے مجھے دیکھا تو بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ کہنے لگا کہ یار پھر بھی شکر یہ کہ تم آ گئے ہو۔ وہ بوتل میں تھوڑی سی پڑی ہے اگر پینی چاہو تو پی لو اور وہ تھوڑا سا کھانا پڑا ہے اگر کھانا چاہو تو کھا لو۔ اس کے علاوہ اب اور کیا کیا جا سکتا ہے بہر حال جو میرے ساتھ ہوا ہے وہ ان لوگوں سے پوچھ لو۔ مجھے یہ سن کر بڑی شرمندگی ہوئی۔ معافی تو مانگی لیکن معافی مانگ کر بھی کیا ہو سکتا تھا کیونکہ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ شراب پر پابندی ہونے کے باوجود اس نے ساری فلم انڈسٹری کو بلایا ہوا تھا اور نجانے کس طرح اتنی ساری شراب کا اہتمام کیا۔ اور شراب بھی پھر سکاچ تھی۔ پھر اس نے اس دعوت پر اس وقت کے حساب سے اتنا پیسہ خرچ کیا تھا جو عام آدمی نہیں کر سکتا۔ شرمندگی تو بہت ہوئی لیکن ہمارے تعلقات بہت بڑھ گئے۔

اٹھارہ برس کے بعد 1979ء میں میں جب دوبارہ بمبئی گیا تو سب سے پہلا فون جو مجھے آیا وہ راجندر کرشن کا تھا۔ اس نے فون پر مجھے کہا سناؤ پٹھان' تم آ گئے ہو۔ مجھے امریک سنگھ آنند نے بتایا کہ پٹھان آ گیا ہے۔ اب میری پارٹی خراب کرنے کا کب ارادہ ہے۔ میں نے کہا کہ راجندر جی اب تو جی چاہتا ہے کہ میں آپ کی پارٹی کروں اور آپ اسے خراب کریں۔ کہنے لگے کہ بات تو وہی ہے۔ اگر تمہاری پارٹی خراب ہوئی تو پھر بھی تو میرا ہی نقصان ہے۔ بہر حال میں نے کہا کہ میں ملنے کے لئے تو آج ہی آپ کے پاس آ رہا ہوں باقی پارٹی خراب کرتے رہیں گے۔ میرے ساتھ میرے بیوی بچے بھی تھے اور اس شخص نے ایک نہیں بلکہ تین مہینے کے قیام کے دوران درجنوں دعوتیں کیں۔ اس نے میرے بیٹے نوید کو اپنا دوست بنا لیا اور مجھے ہنس کے کہتا تھا کہ تم تو میرے ریٹائرڈ دوست ہو' اصل دوست تو یہ نوید ہے۔ پھر نوید کو اور میری بیوی کو بہت سے تحفے لے کر دیئے حالانکہ

اسے لاہور بھی نہیں آنا تھا کہ اسے اس سب کچھ کے بدلے میں کچھ اور ملنے کی لالچ ہوتا۔

راجندر کرشن ریس کا رسیا تھا اور ریس کھیلنے والوں میں یہ وہ خوش نصیب ہے کہ جس نے جیک پاٹ جوئے میں پچاس لاکھ روپے جیتے۔ جیک پاٹ یہ ہوتا ہے کہ اس میں براہ راست شرط نہیں لگائی جاتی بلکہ پانچ پانچ روپے کے ٹکٹ لے کر کچھ گھوڑوں کے نمبر بتانے پڑتے ہیں اور پہلی سے آخری ریس تک اگر یہ نمبر ملتے چلے جائیں تو جتنے بھی پانچ پانچ روپے جمع ہوتے ہیں جو کہ لاکھوں میں ہوتے ہیں وہ اس ایک یا ایک سے زائد آدمیوں کو جن کے نمبر مل جائیں' دے دیئے جاتے ہیں۔ اس کی خوش قسمتی کہ جس دن اس نے جیک پاٹ میں حصہ لیا یہ پچاس لاکھ روپے کا تھا اور اس کا نکل آیا۔ یہ واقعہ میرے 1961ء میں انڈیا سے لوٹ آنے کے تین چار سال بعد پیش آیا تھا۔

راجندر کرشن ایک تو فلم سے کافی پیسہ کما رہا تھا پھر جب جیک پاٹ میں بھی اس کا پچاس لاکھ روپیہ نکل آیا تو اس نے بہت سی جائیداد بھی خریدی اور کاروبار میں بھی بہت سا روپیہ لگایا۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ بیٹے صرف باپ پر انحصار کر رہے تھے اور جب میں 79ء میں انڈیا گیا تو میں نے پوچھا کہ یہ بیٹے کیا کر رہے ہیں تو کہنے لگا کہ بس باپ کا مال کھا رہے ہیں اور انہوں نے کیا کرنا ہے۔ پھر آرٹسٹ بنے بیٹھے ہیں۔ گلا ہے نہیں اور شور مچاتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ساز بجانا جانتے نہیں لیکن اندر ہزاروں روپے قیمت کے ساز پڑے ہیں۔ غرض وہ بیٹوں سے بہت نالاں تھا لیکن چونکہ آمدنی بہت ٹھیک تھی اس لئے چپ ہو رہا۔

میرے ایک اور دوست امریک سنگھ آنند کے نام سے پہچانے جاتے تھے اور امرتسر سے ''پگڈنڈی'' نام کا ایک رسالہ نکالتے تھے۔ پارٹیشن سے پہلے تو ان کا لاہور آنا جانا تھا لیکن پارٹیشن کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ رسالہ بند کر کے بمبئی چلے گئے ہیں چنانچہ جب میں پارٹیشن کے بعد پہلی بار انڈیا گیا تو میں تہیہ کر کے گیا تھا کہ اسے ضرور ڈھونڈ نکالوں گا۔ چنانچہ جب وہاں گیا تو راجندر نے کہا کہ امریک نے بتایا ہے کہ وہ پٹھان آیا ہے۔ میں نے راجندر سے کہا کہ وہ سکھ کہاں ہے۔ کہنے لگا کہ یہ اس کا فون نمبر

ہے خود فون کرلو۔ میں نے فون کیا تو وہی بول رہا تھا۔

میں اسے کہتا تھا کہ تم واقعی سکھ ہو کیونکہ وہ جو کوئی بھی کام کرتا تھا غیر معمولی انداز میں کرتا تھا۔ مجھے کہنے لگا کہ آپ بھابی سمیت میرے گھر میں رہیں گے۔ میں نے کہا کہ آج تو میں ادھر ہی رہوں گا کل پھر تمہاری طرف رہ لوں گا۔ کہنے لگا نہیں ایک دن نہیں بلکہ دس دن۔ میں نے کہا کہ دس دن کیا کرو گے تو کہنے لگا کہ آپ کو دس دن ہی رہنا پڑے گا۔ چنانچہ اس نے مجھے دس دن اپنے گھر رکھا۔

یہ بات باور کرانے کے لئے کہ اس گھر میں کوئی چیز تمہارے مذہب کے خلاف نہیں ہوتی اس نے صبح اٹھتے ہی مجھے کہا کہ چلو یار تھوڑی دور پیدل چلتے ہیں اور پھر مارکیٹ سے کچھ سودا لے کر گھر میں دے دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ مجھے ساتھ لے گیا۔ مارکیٹ میں ایک مسلمان قصاب کی دوکان تھی۔ اسے مخاطب کر کے کہنے لگا کہ دیکھو بھئی محمد رمضان یہ میرے مہمان لاہور سے آئے ہوئے ہیں اور میں انہیں ساتھ اس لیے لے کر آیا ہوں کہ گوشت تم سے لے کر جانا ہے۔ ویسے بھی گوشت تو میں تم سے ہی لے کر جاتا ہوں لیکن اب ان کے لئے ذرا اچھا گوشت دینا۔ دراصل وہ مجھے یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں مسلمان قصاب سے گوشت لا رہا ہوں اور تمہیں جھٹکے کا گوشت نہیں کھلاؤں گا۔ میں نے کہا کہ تم واقعی سکھ ہو اور جگہ جگہ یہ واقعہ سنایا۔

صابر دت

بمبئی میں صابر دت میرا اختر تھا جسے میں نے پہلے پہل 1956ء میں مشرقی پنجاب کے ایک شہر سنگلور کے ایک مشاعرے میں دیکھا تھا۔ اس وقت یہ ایک بچہ سا تھا اور اپنے آپ کو کشمیری لال ذاکر کا کزن بیان کرتا تھا۔ یہ چونکہ بہت جونیئر تھا اس لئے اس کے نام کو حوالہ بنا کر آگے بڑھنے کے لئے اپنا تعارف کرواتا تھا۔ بمبئی جانے سے پہلے میں نے امرتسر ٹیلیویژن سے نشر ہونے والے ایک مشاعرہ میں اس لڑکے کو پڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس مشاعرے کے بعد ہی مجھے اس کا ایک خط بھی یہاں ملا تھا۔ جس سے پتا چلا کہ وہ بمبئی میں ایک پرچہ فن اور شخصیت نکال رہا ہے۔ اس نے خط میں بھی یہی لکھا کہ اس پرچے کے سلسلے میں مجھ سے تعاون کریں۔

جب میں بمبئی گیا تو میں جتنا عرصہ وہاں رہا وہ اس طرح میرے ساتھ رہا جیسے بدن کے ساتھ سایہ ہوتا ہے۔ وہ روزانہ صبح میرے پاس پہنچ جاتا اور پھر رات تک ہر پروگرام میں میرے ساتھ رہتا۔ البتہ اس دوران ایک شخصیت اور میرے ساتھ شامل ہوئی جو صرف شام کے لئے تھی۔ اس کا نام دیویانی چوبل تھا اور یہ رسالہ سٹار اینڈ سٹائل میں دیوی کے نام سے کالم لکھتی ہے۔ یہ مرہٹن عورت ہے اور بڑے دبنگ اور کھلے انداز میں کالم لکھتی ہے جیسے کہ اب بمبئی میں رواج ہے۔

دیوی سے قربت یوں ہوئی کہ وہ سپورٹس کلب میں حاجی علی کے مزار کے سامنے رہتی تھی اور اس سے یہ طے تھا کہ ہم شام کو وہاں سے اسے ساتھ لے کر رات کو میرے اعزاز

میں ہونے والی پارٹی میں اکٹھے جائیں گے۔ میرے اعزاز میں ہر روز بلاناغہ کوئی نہ کوئی پارٹی ہوتی تھی۔

جب میں بمبئی گیا تو صابر دت نے فن اور شخصیت ایڈیشن کی تیاری شروع کر دی اور میرے وہاں ہونے سے یہ فائدہ ہوا کہ پرچہ جلد ہی تیار ہو گیا۔ یہ چھ سو صفحات کا پرچہ تھا اور تین مہینے میں اس کی چھپائی بھی ہو گئی۔ میں ہوم سک ہو کر جلد واپس آنا چاہتا تھا لیکن سنیل دت صاحب نے کہا کہ آپ اس پرچے کا افتتاح اپنے ہاتھ سے کر کے جائیں۔ سنیل دت صاحب یہیں جہلم کے رہنے والے ہیں اور بڑے صاحب علم و فضل آدمی ہیں پرچے کا افتتاح ہوا اور میں واپس چلا آیا۔ یہ 1982ء کا واقعہ ہے۔

اس سے پہلے 1979ء میں جب میں اٹھارہ سال کے وقفے کے بعد انڈیا گیا تو دوستوں کا بڑا اشتیاق تھا۔ چنانچہ میرے دو ماہ وہاں قیام کے دوران میرے اعزاز میں اتنی کثرت سے پارٹیاں ہوئیں کہ بعض اوقات ایک دن میں دو دو پارٹیاں بھی ہوئیں۔ یہاں ایک پارٹی کا ذکر خاص طور پر کروں گا جسے میں زندگی بھر نہیں بھلا سکوں گا۔ یہ پارٹی میرے لئے تو باعث فخر تھی ہی لیکن پارٹی دینے والے کے لئے بھی یہ باعث فخر تھی۔

یہ پروڈیوسر موہن کمار کی دعوت تھی جو میرے بڑے دیرینہ دوست پروڈیوسر اور ڈائریکٹر جے اوم پرکاش کے برادر نسبتی ہیں۔ انہوں نے یہ پارٹی بمبئی کے ایک بڑے ہوٹل سنتور میں دی اور کوشش یہ کی کہ فلم انڈسٹری کا ہر وہ آدمی جو بمبئی میں موجود ہے اس پارٹی میں آنے سے رہ نہ جائے۔ چنانچہ فلم پروڈکشن کے لوگوں کا ایک دریا امڈ آیا تھا اور صرف وہی آدمی نہیں آئے تھے جو بمبئی میں موجود نہیں تھے۔ اس دعوت میں کم و بیش ساڑھے تین یا چار سو آدمی موجود تھے۔ اس دعوت کے ٹھاٹھ یہ تھے کہ سب سے پہلے تو بمبئی کی ریت کے مطابق پینے کا اہتمام کیا گیا تھا کیونکہ وہاں کوئی پارٹی اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جاتی جب تک اس میں پینے کا انتظام نہ ہو۔ اس کے بعد گانے کا انتظام تھا جس میں کچھ لوگوں نے میری غزلیں اور گیت گائے۔ ان میں نابینا گلوکار رویندر خصوصاً قابل ذکر ہیں جنہوں نے یہ کہہ کر غزل سنائی کے جب میں فلم انڈسٹری میں داخل ہوا تھا اور سنگر بننا چاہتا تھا تو میں

نے قتیل صاحب کی یہ غزل ٹرائل کے طور پر سنائی تھی۔ انہوں نے غزل سنا کر سماں باندھ دیا۔ وہ جتنے اچھے کمپوزر ہیں اتنی اچھی آواز بھی ہے۔ اللہ کی دین ہے کہ بعض آنکھوں والے اندھے ہوتے ہیں اور بعض اندھوں کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ رویندر کی محبت کو میں اب تک یاد کر رہا ہوں اور ان کی تصویریں بھی سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میرے ساتھ میرا بیٹا بھی ہے اور اسے بھی موسیقی سے شغف ہے تو انہوں نے خاص طور پر خواہش ظاہر کر کے اس کے ساتھ تصویر بنوائی۔

میوزک پروگرام کے بعد مشاعرہ ہوا تو اس میں تمام نامور شاعروں کو اور فلم اور ادب سے تعلق رکھنے والے میرے دوستوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ سب نے اپنا اپنا کلام سنایا حتیٰ کہ نوشاد صاحب، کیفی اعظمی اور مجروح سلطانپوری بھی اس میں بطور شاعر شریک ہوئے تھے۔ حسن کمال نے بڑی خوبصورتی سے اس میں سٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دیئے۔ اس درمیان میں میں نے دیکھا کہ ایک آدمی دور دروازے سے بھاگتا ہوا چلا آرہا ہے۔ وہ قریب آیا تو دیکھا کہ یہ فلمسٹار پران تھے۔ وہ آتے ہی سامنے بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر بعد انہوں نے کہا کہ پروگرام چلتا رہے گا مگر میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میں راجستھان میں شوٹنگ کر رہا تھا۔ وہاں مجھے معلوم ہوا کہ قتیل صاحب کے اعزاز میں تقریب ہے اور اس کے لئے مجھے بھی دعوت ہے۔ اگر دعوت نہ بھی ہوتی تو پھر بھی میں یہی کرتا۔ میں وہاں سے بذریعہ سڑک چلا اور گھر جانے کی بجائے سیدھا یہاں آ گیا ہوں۔ پھر انہوں نے کہا کہ میں تھکا ہوا ہوں اور میرے لئے ایک پیگ لاؤ۔ پیگ لگا کر انہوں نے کہا کہ اب میں ایک گیت سناؤں گا۔ چنانچہ انہوں نے وہی گیت ''کہ گھنگرو ٹوٹ گئے'' نرت کے ساتھ تحت اللفظ سنایا۔ مجھے اس گیت کا وہاں جو مزا آیا وہ کسی گانے والی کی آواز میں نہیں آیا۔ پھر جب وہ بیٹھے بیٹھے پورے موڈ میں آ گئے تو جب بھی کوئی موقع آتا تھا تو سو کا نوٹ میرے سر سے وار کے بیروں کی طرف پھینک دیتے تھے۔

یہ ایسی باتیں ہیں جو بھلائی نہیں جا سکتیں۔ یہاں ایک یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ مجلس کے شروع ہونے سے پہلے مجھے ایسی جگہ بٹھایا گیا تھا جہاں سے سب کو گزر کر آنا تھا۔ جو آتا

تھا باری باری مجھ سے ہاتھ ملا کر گزرتا تھا اور اس کی ایک تصویر لی جاتی تھی۔ اس طرح ایک اتنا البم بن گیا جس سے سینکڑوں تصویریں ہیں اور یہ زندگی کی بہترین یادگاریں ہیں جواب بھی میرے پاس پڑی ہوئی ہیں۔

اس تقریب میں راج کپور صاحب کا ایک پیغام موصول ہوا کہ مجھے ضرور آنا تھا مگر میں بیمار ہوں میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس دعوت میں موجود نہیں ہیں اور میری نظر میں وہ بمبئی کے بڑے لوگوں میں سے ایک تھے اور میں چاہتا تھا کہ وہ بھی آئیں۔ لیکن پیغام آنے کے بعد صورتحال واضح ہوگئی۔ وہ دراصل دمہ کے مریض تھے۔ ان کے علاوہ امیتابھ بچن بمبئی میں موجود نہیں تھے۔

دیو آنند آئے تو دور سے انہوں نے آواز دی کہ قتیل صاحب ہم آپ سے معافی چاہتے ہیں کہ ہم نے آپ کی غزل مار لی۔ میری ایک غزل تھی۔

تم پوچھو اور میں نہ بتاؤں ایسے تو حالات نہیں
ایک ذرا سا دل ٹوٹا ہے اور تو کوئی بات نہیں

یہ غزل ان کے شاعر نے ذرا سی تبدیل کر کے اپنی فلم میں رکھی ہوئی تھی۔ میں اس بات کو محسوس کیے ہوئے تھا۔ دیو آنند نے جب یہ کہا تو مجھے ان پر بڑا پیار آیا۔ وہ آ کر مجھ سے گلے ملے تو میں نے کہا کہ دیو جی آپ جو کچھ مجھ سے کہہ چکے ہیں اس کے بعد تو میرا جو کچھ بھی ہے وہ مارنا تو کیا آپ حق کے طور پر لے سکتے ہیں۔ ان سے میرے اچھے تعلقات بن گئے۔ اور پھر جب میں دوبارہ انڈیا گیا تو ان سے پروگرام یہ بنا تھا کہ اگر پاکستان اور انڈیا کے درمیان کبھی کوئی پروڈکشن ہوئی تو ہم مل کر فلم بنائیں گے۔ اس کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا کہ جب آپ دوبارہ یہاں آئیں اور میری کوئی فلم شروع ہونے والی ہو تو اس کے پورے گانے لکھ دیں۔ یوں ان سے تعلقات بن گئے۔

بمبئی میں دیو آنند کے بھائی چیتن آنند کا میں اس وقت سے معترف تھا جب انہوں نے ''نیچا نگر'' بنائی تھی۔ وہ زمانہ سٹیج کے انداز کی بڑی تصنع والی فلمیں بنانے کا تھا۔ انہوں نے حقیقت کے بڑا قریب رہ کر نچلے طبقے کے متعلق یہ آرٹ فلم بنائی تھی۔ مرحوم رفیع پیرزادہ

نے اس میں ولن کا بہت خوبصورت کردار ادا کیا تھا۔ یہاں حمید اختر صاحب ہیں یہ بھی اس میں ڈاڑھی لگا کر ایک کیریکٹر کر چکے تھے۔

اتفاق کی بات ہے کہ انہیں تھوڑی سی دمے کی شکایت تھی اور وہ بابا بہادر شاہ کے مریض تھے۔ بابا بہادر شاہ کے ہاں کہیں میرا ذکر چل نکلا تو انہوں نے کہا کہ میں تو قتیل صاحب کو بہت پسند کرتا ہوں۔ انہوں نے مجھے خط لکھا تو میں نے جواب دیا کہ ان سے کہیے کہ میں ان سے پہلے سے انہیں پسند کرتا ہوں۔ اور ''نیا نگر'' سے ان کا فین ہوں۔ پھر ان کے ساتھ خط و کتابت ہوتی رہی۔

خط و کتابت سے قربت ہوگئی۔ جب میں بمبئی گیا تو ان کی فلم ''قدرت'' بن رہی تھی۔ انہوں نے مجھے دعوت میں چائے پر بلایا اور کہنے لگے کہ میرا ارادہ تو تھا کہ اپنی اگلی فلم انارکلی میں آپ کو زحمت دیتا۔ لیکن اب اس فلم میں ایک الجھن پڑی ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں ایک تھیم سانگ ہے۔ وہ کئی شاعر لکھ چکے ہیں لیکن میری مرضی کا نہیں آیا۔ شاعر بات سمجھ نہیں پا رہے۔ اگر آپ محسوس نہ کریں تو اس کا ایک یہ والا گانا سردست مجھے لکھ دیں۔ وہ انارکلی والا سلسلہ تو ہے کہ اس کے گانے آپ ہی لکھیں گے۔

میں نے پوچھا کہ ''قدرت'' کے گانے کون لکھ رہا ہے تو کہنے لگے کہ مجروح سلطانپوری لکھ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ اصولاً تو یہ ہے کہ آپ ان سے مجھے کہلوا دیں۔ کہنے لگے کہ انہیں پیسے دے دیئے گئے ہیں۔ وہ لکھ نہیں پائے تو ان کے بعد ہم نے فاضلی صاحب سے کہا۔ ندا فاضلی بھی بات تک نہیں پہنچ پائے۔ ان کے بعد کسی اور کو بھی کہا تھا اور اب آپ چوتھے آدمی ہیں۔ اس لئے اجازت لینے کا مرحلہ تو گزر چکا ہے۔ ان کی بات ٹھیک تھی۔ میں سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ کیونکہ شاعر سچوئیشن کی تہہ تک پہنچ جائے پھر تو وہ لکھ لیتا ہے ورنہ مشکل ہوتی ہے۔

میں نے انہیں گیت لکھ کر دیا۔ اور یہ ٹیون بننے کے لئے موسیقار آر ڈی برمن کے پاس چلا گیا۔ اس کے بعد ایک طوفان مچ گیا اور پتا چلا کہ مجروح سلطانپوری صاحب کو اعتراض ہے کہ قتیل صاحب تھیم سانگ کیوں لکھ رہے ہیں۔ ہمارا کریڈٹ خراب کر دیا

ہے۔ میں نے سوچا کہ میں کس مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔ اچھا خاصا دوست تھا اور اب اسے شکایت پیدا ہوئی ہے۔

آنند صاحب نے میرے سامنے فون کیا اور کہا کہ کیا معاملہ ہے۔ تو مجروح سلطانپوری صاحب نے کہا کہ قتیل صاحب کو ہم سے پوچھنا چاہیے تھا۔ انہوں نے کہا کہ بات تو آگے نکل چکی ہے اور آپ نے سارا معاوضہ لے لیا ہے۔ کہنے لگے پھر بھی انہیں پوچھنا چاہیے تھا اور ہم یہ دوستی میں کہہ رہے ہیں۔ میں نے اشارہ کیا اور انہوں نے کہا کہ اچھا بھئی وہ آپ سے اجازت لے لیں گے۔ جب آئیں گے تو میں انہیں کہہ دوں گا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے انہیں فون کر کے کہا کہ مجروح صاحب میں نے تو ان سے بہت سی باتیں پوچھ لی تھیں لیکن اس کے باوجود اگر آپ کو شکایت ہے تو میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں وہ گانا دے دوں۔ کہنے لگے کہ اچھا ہم سوچ کر کل بتائیں گے۔

دوسرے دن میں نے پوچھا تو کہنے لگے کہ آپ اس شرط پر گانا لکھیں گے کہ وہ مجھے مزید ایک گانے کے پیسے دے دیں۔ میں نے کہا کہ یہ تو آپ کا اور ان کا معاملہ ہے۔ اب دوسری طرف یہ بات ہے کہ انہی مجروح سلطانپوری صاحب نے میرا گیت 'گھنگرو ٹوٹ گئے' یہی مکھڑا رکھ کے اور آگے تھوڑی سی تبدیلی کر کے استعمال کیا تھا اور فلم ''دھرم کانٹا'' کے لئے یہ کام کر چکے تھے۔ انہوں نے میری اجازت کے بغیر ایسا کیا تھا۔ اور جب یہ گانا فلم میں آ چکا تھا تو اس کے بعد حمید اختر کہیں بمبئی گئے اور انہوں نے کہا کہ یہ تو قتیل صاحب کا گیت ہے تو کہنے لگے کہ ان سے کہنا کہ ہمارے پروڈیوسر نے تمہارے گھنگرو ہمارے سر میں مار دیئے اور اب تم اس کا سکینڈل نہ بنا لینا۔ پھر بھی میں نے انہیں خط میں لکھا تھا کہ آپ نے کر لیا ہے تو اب کوئی بات نہیں۔

میرے گیت سے تو انہوں نے پہلے پیسے کمائے اور اب جب میں اپنا گیت لکھ رہا تھا تو انہیں اعتراض ہو رہا تھا۔ بہر حال چیتن آنند نے کہا کہ ان کی بات بڑی بیہودہ ہے ہم انہیں پہلے سب گانوں کے پیسے دے چکے ہیں اور اب گیت آپ لکھیں اور ہم انہیں گیت

کے اور پیسے دیں' یہ غلط ہے۔ ہم کوئی پیسہ انہیں نہیں دیتے۔ آپ گیت ریکارڈ ہونے دیجئے۔

یہ ناگواری صورت بنی تو اخبارات میں یہ بھی سلسلہ چل نکلا اور پھر اُردو اور پنجابی کا مسئلہ بھی چل نکلا۔ اور انہوں نے الزام لگایا کہ پنجاب والے پنجاب والوں کی رعایت کرتے ہیں۔ ان کا اشارہ چیتن آنند اور میری طرف تھا۔ اس واقعہ کی وجہ سے ہم میں کافی دیر ناچاقی رہی۔ اس ناچاقی کی وجہ سے رنجشیں بڑھتی گئیں اور یہ سلسلہ بہت دیر تک رہا۔ جب میں دوبارہ گیا تو صلح ہوئی اور انہوں نے مجھے گھر پر بلا کر چائے وغیرہ پلائی۔ میں نے پوچھا کہ آپ کا غصہ دور ہوگیا ہے تو کہنے لگے کہ زندگی کے دن کتنے ہیں۔ اس لئے ان معاملوں کو چھوڑو۔

شانتا رام سے ملاقات

بمبئی میں میری جو یادگار ملاقاتیں ہوئی ہیں ان میں سے ایک ہدایتکار وی شانتا رام سے ملاقات تھی۔ میرا بچپن سے فلمیں دیکھنے کا رجحان کچھ ایسا تھا کہ Artistic فلمیں مجھے زیادہ پسند آتی تھیں۔ چنانچہ شروع میں مجھے غیر شعوری طور پر شانتا رام کی فلمیں اچھی لگتی تھیں۔ ان میں ایک عجیب ماحول اور ایک عجیب بانکپن ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس ڈائریکٹر کی کوئی ایسی فلم نہیں ہوگی جو میں نے دیکھی نہیں ہوگی۔ اس کی جو فلم میں یہاں پاکستان میں نہیں دیکھا سکا وہ میں نے بمبئی جا کر دیکھی۔

ایک مرحلہ ایسا آیا کہ دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں وی شانتا رام سے مل کر اپنے جذبات کا اظہار کروں کہ میں انہیں کیا سمجھتا ہوں۔ جب میں 1961ء میں انڈیا گیا اس وقت تو اتنی خواہش نہیں تھی لیکن جب 1979ء میں دوبارہ انڈیا گیا اور اس دوران شانتا رام کی اور بھی فلمیں دیکھ چکا تھا تو ان سے ملنے کی کوشش کی۔ مگر ملاقات اس لئے نہ ہو سکی کہ ایک بار تو وہ بیمار تھے جبکہ دوسری بار وہ پونا گئے ہوئے تھے۔

بالآخر 1979ء میں ای ایم آئی گراموفون کمپنی کے وہاں کے منیجر مسٹر ڈوبے سے میں نے کہا کہ شانتا رام جی سے میری ملاقات کا بندوبست کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے طور پر شانتا رام جی کو میرے بارے میں بتایا اور کہا کہ قتیل صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے بخوشی دو دن کے وقفے سے ملاقات کا وقت دے دیا۔ ہم ان کے سٹوڈیو میں گئے۔ ان کا کمرہ بہت سادہ تھا مگر آرٹسٹک تھا اور اس میں ایک عجیب قسم کا حسن تھا۔ اس

میں تصاویر یا کوئی اور آرائشی چیزیں نہیں تھیں۔

ملاقات ہوئی تو میں نے ان کے پاؤں چھوئے۔ کہنے لگے کہ بیٹھئے آپ یہ کیا تکلف کر رہے ہیں۔ میں بیٹھ گیا تو انہوں نے بات شروع کرتے ہوئے کہا کہ قتیل صاحب میں معافی چاہتا ہوں کہ مجھے آپ کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ہیں۔ اس لئے اپنے بارے میں ذرا بتا دیں تا کہ میرا اور آپ کا تعارف ہو جائے۔ میں نے کہا کہ جی آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا۔ آپ کو مجھے جاننا بھی نہیں چاہیے اس لئے کہ ہمارے ملک الگ ہیں اور میرا کوئی کام یہاں تجارتی پیمانے پر آیا نہیں جس سے آپ مجھے جانیں۔ البتہ میں آپ کو جانتا ہوں اور جو میرے آنے کا مقصد ہے وہ بھی سے متعلق ہے۔ پھر میں نے انہیں ان کی فلموں اور اپنے جذبات کے بارے میں بتایا اور کہا کہ میری یہ تمنا تھی کہ میں آپ کے پاؤں چھوؤں جو کہ میں نے چھو لئے ہیں۔ اور شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ہم میں یعنی مسلمانوں میں کسی کے بھی پاؤں نہیں چھوئے جاتے بلکہ یہ بات بعض اوقات مذہب کی حدوں سے نکلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن میں مذہب سے اسے الگ رکھتے ہوئے یہ سمجھتا ہوں کہ میرے ذہن میں آپ سے اپنی عقیدت کے اظہار کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں آیا۔

میرے الفاظ سن کر ان کی حالت کچھ ایسی تھی جیسے کوئی اپنی تعریف سن کر خوش بھی ہوتا ہے اور پھولتا بھی نہیں ہے۔ میں نے نے پھر انہیں ان کی کچھ بہت پرانی فلموں کے بارے میں بتایا۔ جب میں نے ایک فلم ''مایا مچھندر'' کے بارے میں بتایا تو حیران ہو کر کہنے لگے کہ آپ نے وہ فلم بھی دیکھی ہے۔ میں نے کہا کہ ہاں جی دیکھی ہے اور میں نے اس کا ایک گانا بھی اپنی زبانی سنایا جو یہ تھا کہ:

گورکھ جاگ مچھندر آیا۔

پھر میں نے ان کی فلموں ''امرجیوتی'' ''آدمی'' اور ''پوتی'' کے بارے میں بتایا اور کہا کہ آپ نے فلم ''پرچھائیں'' میں کمال کا کام کیا ہے۔ اور پھر چندر موہن کے بعد آپ نے ''شکنتلا'' کے دوسرے رنگین ورژن میں جو کام کیا ہے وہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ

چندر موہن کے بعد اتنا اچھا کام کریں گے۔ اس طرح میں نے ان کی فلموں پر بھرپور تنقید کی تو کہنے لگے کہ بالکل ٹھیک ہے اور آپ تو میرے بارے میں پوری طرح جانتے ہیں اور شاید کوئی انڈیا کا آدمی بھی اتنا زیادہ نہ جانتا ہو۔

مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے کہ آپ کی کوئی چیزیں کبھی ادھر انڈیا میں نہیں آئیں۔ میں نے کہا کہ آئی ہیں۔ میرا ایک گانا ادھر آیا تھا:

الفت کی نئی منزل کو چلا

کہنے لگے وہ آپ کا ہے۔ وہ بہت حیرت زدہ تھے اور کہنے لگے کہ میں نے تو یہ گانا بلیک میں خریدا تھا۔ میں نے کہا میں جانتا ہوں کہ یہ گانا پاکستان سے سمگل ہو کر ادھر آتا تھا اور یہاں بلیک میں بکتا تھا کہنے لگے یہ گانا تو میں نے بہت زیادہ پسند کیا تھا اور یہ تو اب بھی میری لائبریری میں ہے۔ کہنے لگے کہ آپ کا کوئی اور گانا جو ادھر آیا ہو۔ میں نے کہا کہ جی اور بھی کئی ہیں لیکن آجکل ایک گیت بہت چل رہا ہے ''گھنگرو ٹوٹ گئے''۔ پھر چونک کر کہنے لگے کہ اچھا وہ بھی آپ کا ہے۔ وہ تو میں نے کئی لوگوں سے سنا ہے۔

دوبے صاحب نے کہا کہ جگجیت اور چترا دونوں نے مل کر ان کی غزلوں کا ایک ایل پی بنایا ہے جو میں نے آپ کو پیش بھی کیا ہے۔ کہنے لگے وہ تو میں نے سنا ہے۔ وہ ان کا کلام ہے۔ انہوں نے کہا کہ جی ہاں وہ رچنائیں ان کی ہی ہیں۔ مسکرا کر کہنے لگے پھر تو میں آپ کو جاننے لگا ہوں۔ اچھا اپنی کوئی چیز سنایئے۔ چنانچہ میں نے اپنی کچھ غزلیں اور ایک دو گیت انہیں سنائے اور میں نے دیکھا کہ وہ بالکل ٹھیک موقع پر داد دے رہے تھے۔

میں نے جب کلام ختم کیا تو کہنے لگے کہ یہ سب اُردو ہے۔ میں نے کہا جی بالکل اُردو ہے۔ کہنے لگے کہ پاکستان میں یہی اُردو چلتی ہے۔ میں نے کہا ہاں۔ کہنے لگے اچھا تو پھر کیا بات ہے کہ یہاں پر اُردو کے جو میرے پاس شاعر آتے ہیں' وہ مجھے جو کچھ سناتے ہیں مجھے اس کی سمجھ ہی نہیں آتی۔ میں نے کہا کہ جی وہ اُردو نہیں بلکہ سنسکرت ہوتی ہوگی۔ میں نے مذاق کیا تھا مگر وہ جواباً کہنے لگے کہ سنسکرت تو مجھے آتی ہے۔ البتہ عربی میں ہوتا ہو گا۔ اصل میں وہ لوگ اپنی اُردو کا رعب ڈالنے کے لئے ایسے ایسے مکلف اور باترکیب شعر

سناتے ہیں۔ جنہیں عام آدمی سمجھ ہی نہیں پاتا۔

وہ مجھے کہنے لگے کہ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی ہے کہ میں آپ کی کچھ غزلیں اور گیت رکھوں گا لیکن اس وقت میری کوئی فلم سیٹ پر بن نہیں رہی۔ تو کیا آپ مناسب سمجھیں گے کہ آپ اپنی کچھ چیزیں مجھے بھیج دیں اور مجھے اجازت دیں کہ اگر ان میں سے کوئی چیز کسی سچوئیشن پر پوری آتی ہو تو میں وہ لے لوں اور میں اس کی قیمت دوں گا۔ میں نے کہا کہ جی آپ نے میرے لئے فخر کا مقام پیدا کر دیا ہے کہ شانتا رام نے بھی مجھ سے میرا کلام مانگا تھا۔ میرے لئے یہی زندگی کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ پھر یہ طریقہ ٹھیک بھی نہیں ہوتا کیونکہ مجھے پتا ہی نہیں کہ آپ کی فلم کی کہانی کیا ہے اور میں یونہی ہوا میں ایک تیر چھوڑ دوں۔ اگر لگ گیا تو لگ گیا اگر نہ لگا تو نہ سہی۔ چنانچہ میں نے کہا کہ اگر زندگی رہی اور پھر آنا ہوا اور آپ کوئی فلم بنا رہے ہوئے تو میں سچوایشن سن کر کوئی گیت لکھوں گا اور مزا بھی آئے گا۔ وہ اس وقت بیاسی سال کے تھے مگر بالکل چاق و چوبند اور ذہنی طور پر روشن تھے۔

دوبے اس بات چیت سے بہت متاثر ہو رہا تھا۔ اس نے کہا کہ ''لتا'' آپ دونوں کے درمیان اتنی خوبصورت گفتگو ہو رہی ہے مگر مجھے ایک افسوس ہو رہا ہے کہ اس موقع پر کیمرہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ پتا کیجئے شاید ہمارا فوٹو گرافر ہو پتا چلا کہ وہ چار دن کی چھٹی پر ہے۔ لتا مرہٹوں میں احترام کے ساتھ بزرگوں اور بڑے بھائی کو کہتے ہیں۔ خیر مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ اس یادگار ملاقات کی تصویر نہ ہو سکی۔ لیکن بہر حال یہ ملاقات میری ان یادگار ملاقاتوں میں سے ایک ہے جن کی مجھے تمنا تھی اور جو پوری بھی ہوئی۔

منوج کمار

منوج کمار صاحب کی فلم کے ایک اپنے لکھے ہوئے گانے کی ریکارڈنگ کے سلسلے میں جب میں بمبئی گیا تو شروع میں تو کچھ دن میں ان کے گھر میں رہا' اس کے بعد کسی اور جگہ منتقل ہو گیا لیکن پھر بھی ان کے ہاں آنا جانا رہا۔ دراصل منوج صاحب زیادہ سوشل آدمی نہیں ہیں۔ وہ اوپر کی منزل میں رہتے تھے اور نچلی منزل میں ان کے والد رہتے تھے جو خضر تخلص کرتے تھے۔ ان سے میری بیٹھک ہو جاتی تھی۔ خضر صاحب کے دوستوں میں قمر جلال آبادی بھی شامل تھے جو میرے پرانے دوست تھے میری وجہ سے انہوں نے کچھ اور بھی آنا بڑھا دیا جس سے گپ شپ کا موقع مل جاتا تھا۔

منوج صاحب کا وہ عروج کا زمانہ تھا۔ ان کی فلم ''کرانتی'' جس میں دلیپ کمار صاحب نے بھی کام کیا تھا۔ ایک ایسی فلم تھی جو منوج صاحب کے گھر میں بوریوں میں نوٹ بھر کے لائی تھی۔ یہ اس فلم کا زمانہ تھا مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ ان کے والد جو گھٹنوں کے درد کے مریض تھے' کچھ کھچے کھچے سے تھے۔ وہ گراؤنڈ فلور پر رہتے تھے۔ منوج صاحب فرسٹ فلور پر رہتے تھے جبکہ ان کی والدہ سیکنڈ فلور پر رہتی تھیں۔

منوج صاحب خوشحال بھی تھے اور گھریلو معاملات بھی ٹھیک تھے لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ ان کے والد سب کچھ ہونے کے باوجود ایک مطمئن آدمی نہیں ہیں۔ حالانکہ وہ اپنے ڈسٹری بیوشن آفس کے مالک اور انچارج بھی تھے۔ جب شعر سناتے تھے تو ان میں کوئی نکتہ ایسا آ جاتا تھا جو ان کے اندر کی بے چینی کو ظاہر کرتا تھا۔

وہ پہلے پاکستان کے اپنے واقعات سناتے تھے کیونکہ وہ اصل میں ضلع شیخوپورہ کے گاؤں جنڈیالہ شیر خان کے رہنے والے تھے اور منوج کمار صاحب بعد میں ایبٹ آباد میں پیدا ہوئے تھے اور ان کے ننھیال ہری پور کے تھے۔ اگرچہ منوج کے والد مجھ سے کھل کر باتیں نہیں کرتے تھے پھر بھی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک بے چین اور بے سکون آدمی ہیں۔ وہ تفصیل نہیں بتاتے تھے لیکن ایک دن تفصیل از خود سامنے آ گئی۔

میں گیا تو وہ کچھ پریشانی کے عالم میں بیٹھے تھے اور کہنے لگے کہ آج منوج سے آپ کی ملاقات ہوگی۔ میں نے کہا کہ جی اصل میں تو آپ سے بیٹھک ہو جاتی ہے۔ مل گئے تو مل لیں گے ورنہ پھر ملاقات ہو جائے گی۔ کہنے لگے کہ نہیں ضرور ملیں اور آپ ہی کا ایک شعر ہے وہ انہیں میری طرف سے سنا دیجئے کہ:

میں ریت کے دریا پر کھڑا سوچ رہا ہوں
اس شہر میں پانی تو یزیدوں نے پیا ہے

انہوں نے یہ شعر سنایا تو ساری داستان کھل کر میرے سامنے آ گئی۔ اور ان کی بے اطمینانی اور بے سکونی کا سارا منظر میرے سامنے آ گیا۔ میں نے کہا کہ جی آپ نے بڑا مشکل کام میرے سپرد کیا ہے۔ یہ ایک باپ اور بیٹے کے درمیان کی بات ہے۔ اس میں میں برا بنوں گا۔ مجھے نہیں پتا کہ منوج صاحب کتنی برداشت کے آدمی ہیں۔ اگرچہ حوالہ آپ کا ہے لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی آبگینے کو ٹھیس لگ جائے۔ کہنے لگے کہ نہیں آپ اسے میری طرف سے یہ شعر سنا دیں۔

یہ ذمہ داری لینے کے بعد حسب معمول ان سے ملاقاتیں تو ہوتی رہیں لیکن میں بار بار حوصلہ کرتا تھا اور پھر ارادہ ترک کر دیتا تھا اور منوج صاحب سے کچھ کہہ نہیں پاتا تھا۔ ایک دن میں نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔ جب میں نے انہیں یہ شعر سنایا تو منوج صاحب ایک بے حس و حرکت مجسمہ بن کر رہ گئے۔ ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ ایک جمے ہوئے انسان کی مانند نظر آ رہے تھے۔ میں محسوس کر گیا کہ یہ شعر ان کی طبیعت پر بہت ناگوار گزرا ہے لیکن چونکہ انہیں میرا بھی احترام ہے اور پھر باپ کا حوالہ بھی

آتا ہے اس لئے وہ کچھ کہنے سے گریزاں ہیں۔ اگر کوئی اور ہوتا تو شاید وہ اپنا بہت ردعمل ظاہر کرتے۔

یہ واقعہ شاید قمر جلال آبادی کے سامنے ہوا یا شاید ان کے علم میں تھا۔ چونکہ قمر جلال آبادی بھی لاہور سے خضر صاحب کے قریبی دوستوں میں سے تھے اور پھر دونوں کا مشغلہ بھی شعر و شاعری تھا۔

خیر جب میں لاہور چلا آیا تو میں منوج کمار صاحب کے بارے میں ہمیشہ باخبر رہتا تھا۔ ایک تو خط و کتابت سے اور دوسرے خبروں سے میں ان کے بارے میں جانتا رہتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اخبار میں ایک خبری پڑھی کے منوج صاحب کے والد ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر بمبئی سے باہر کسی ندی یا جھیل کے کنارے گئے اور ڈرائیور کو گاڑی ہی میں بٹھا کر خود پوجا پاٹ کے لئے اور یا کسی اور فریضے کے لئے پانی کے قریب گئے تو پاؤں پھسلنے سے گہرے پانی میں جا گرے اور ڈوب گئے۔ ڈرائیور نے کچھ دیر انتظار کیا اور بعد میں جا کے دیکھا تو وہ ڈوب چکے تھے اور فوت ہو چکے تھے۔

عام لوگوں کے لئے تو یہ محض ایک خبر تھی مگر میں یہ خبر پڑھ کر کانپ اٹھا اور میرے ذہن میں اس کا سارا پس منظر گھوم گیا اور میری سمجھ میں آ گیا کہ خضر صاحب نے اپنے بیٹے منوج کمار کو جب شعر سنانے کے لئے مجھے کہا تھا تو اس کا مطلب کیا تھا۔

قمر جلال آبادی

قمر جلال آبادی کا نام غیر معروف تو نہیں ہے لیکن اب کے جاننے والے جانتے ہیں کہ ان کا تعلق فلم سے ہے۔ وہ پچھلے چالیس پینتالیس سال کے عرصے سے فلم سے منسلک ہیں اور ابتدائی دور میں انہوں نے اپنی تخلیقات فلم میں پیش کر کے بہت معرکے کیے۔ انہوں نے فلمی گانوں کے علاوہ ڈائیلاگ بھی لکھے۔ اور پھر ایک فلم بھی پروڈیوس کی۔ لیکن بطور نغمہ نگار ان کے گانے بہت زیادہ مقبول ہوئے۔ وہ ابھی تک فلم انڈسٹری سے وابستہ ہیں لیکن اب وہ صورت نہیں ہے اب تو وہ بس ایک روایت سی نبھا رہے ہیں۔ کوئی پرانا چاہنے والا آ جاتا ہے تو وہ کچھ لکھوا لیتا ہے۔

میں ان کی ایک اور حیثیت پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ تقریباً پچاس برس پہلے لاہور میں گیلانی پریس کے نام سے ایک بہت مشہور پریس تھا۔ اس کے مالک بابو نظام الدین تھے جن کے بیٹے غوری برادران کہلاتے تھے۔ انہی میں سے ایک غوری فلم ایکٹر بھی ہوئے۔ بمبئی میں چارلی اور غوری دو مزاحیہ اداکاروں کی جوڑی تھی۔ یہ مزاحیہ اداکار غوری اس بابو نظام الدین فیملی ہی سے تھے۔

ان کے پریس ہی میں ہفتہ وار ''سٹار'' کا دفتر تھا۔ اس پرچے کے ایڈیٹر قمر جلال آبادی تھے۔ اس زمانے میں ہر اس پرچے نے جو اشاعت بڑھانا چاہتا تھا یا تو معمہ بازی رکھی ہوئی تھی یا کوئی بزم یا انجمن بنائی ہوتی تھی تا کہ لوگ بزم کے ممبر بنیں اور پرچے کی اشاعت بڑھے۔ اس پرچے میں بھی پریم لیگ کے نام سے ایک ادبی و غیر سیاسی بزم بنائی

گئی۔ اگرچہ اس کا مقصد بھی ایسی ہی باقی بزموں جیسا تھا لیکن قدرتی طور پر پریم لیگ کا حلقہ اتنا پھیلا کہ آج کے بیشتر سینئر لکھنے والوں میں سے اس پریم لیگ کے ممبر تھے۔

مبتدی ہونے کی شکل میں چھپنے کی جو ہوس ہوتی ہے وہ ہوس یہ پرچہ پوری کرتا تھا۔ اس میں چھپنے والے اس کے ارکان لطیفے بھی لکھ کر بھیج دیتے تھے اور اچھے اچھے افسانے اور نظمیں بھی۔ غرض ممبر کا یہ حق ہوتا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ بھیج کر چھپوا لے۔ ہوتے ہوتے پورے ہندوستان میں بالعموم اور صوبہ سرحد اور پنجاب میں بالعموم ہر شہر میں اس پریم لیگ کی برانچیں قائم ہو گئیں۔ ان برانچوں کے باقاعدہ اجلاس ہوا کرتے تھے جن کی کارروائیاں باقاعدہ ''سٹار'' میں چھپا کرتی تھیں۔

مرحوم ساحر لدھیانوی اور انجم رومانی میرے ساتھ اس پرچے سے متعارف ہوئے تھے۔ بلکہ فارغ بخاری، رضا ہمدانی بھی اس پرچے سے متعارف ہوئے اور ہماری ملاقاتیں بھی ایسی ہوئیں کہ ضلع ہزارہ کی تاریخ کا پہلا مشاعرہ جو میں نے یوم اقبال کے موقع پر 1939ء میں ہری پور میں منعقد کیا تھا اسے ترتیب دینے والی بھی پریم لیگ ہی تھی۔ جس کے ارکان کا میں وہاں پر سربراہ تھا۔ چنانچہ قمر جلال آبادی، نفیس خلیلی اور اختر رضوانی کو ہم نے باہر سے مہمان شعراء کے طور پر بلوایا تھا۔

اس طرح میں نے پشاور میں زندگی کا جو پہلا مشاعرہ پڑھا وہ بھی پریم لیگ کے پشاور کے صدر حبیب ایشیائی صاحب نے منعقد کیا تھا۔ اس مشاعرے میں ہری پور سے میں گیا تھا اور لاہور سے قمر جلال آبادی اور اختر رضوانی کو بلوایا گیا تھا۔ چنانچہ پریم لیگ کی وجہ سے مجھے پشاور کے احباب سے قربتیں حاصل ہوئیں اور کم و بیش یہی صورتحال دوسرے شہروں کی بھی تھی۔ پریم لیگ کے ممبران کی آپس میں خط و کتابت بھی ہوتی تھی اور ''سٹار'' میں ایک دوسرے کے نام ان کے پیغامات بھی چھپتے تھے۔

ہر چند کہ پرچے کے مالکان کا مقصد یہ نہیں تھا لیکن اس پرچے کی وجہ سے ممبران میں مسابقت کا سلسلہ چل نکلا اور ان کی ذہنی تربیت ہوتی رہی۔ پرچے کے مالکان کا مقصد تو صرف اس کی شاعت بڑھانا اور فروخت میں اضافہ کرنا تھا۔ ان کا یہ مقصد بھی پورا ہوا اور

قدرتی طور پر ایک حلقہ بھی بن گیا جس کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کو آگے بڑھنے کا موقع ملا۔

قمر جلال آبادی "شاز" سے ہٹ کر "پرتاپ" میں ایک قطعہ بھی لکھتے تھے یہ پرچہ ایک خاص نقطہ نظر رکھتا تھا لیکن جب میں نے قمر صاحب کو قریب سے دیکھا تو پنڈت' VEGETARIAN اور اپنے مذہب کے بہت پابند تھے لیکن ہندو مسلم سکھ معاملات میں انتہائی روادار' مشفق اور صاف ستھرے ذہن کے آدمی تھے۔ وہ لوگوں کی خدمت کرنے والے تھے اور بمبئی میں جا کر بھی انہوں نے وہاں کی رائٹرز ایسوسی ایشن کے سیکرٹری کی حیثیت سے ادیبوں کی جو خدمت کی وہ شاید اتنے خلوص کے ساتھ کسی اور نے نہ کی ہوگی۔

یہ انہی کی سوچوں کا نتیجہ تھا کہ جب پریم لیگ قائم ہوئی تو اس میں بھی لکھا تھا کہ اپنے اپنے سیاسی نظریات پر قائم رہتے ہوئے آپ اس لیگ کے ممبر بن سکتے ہیں۔ یہ محض ادبی لیگ ہے اور اس میں شعر و سخن اور علم و ادب کی ترویج کے فرائض انجام دیئے جاتے ہیں۔

قمر صاحب اب بھی سلامت ہیں اور خدا انہیں اور سلامت رکھے۔ وہ محض ایک فلمی شخصیت ہی نہیں ہیں بلکہ ان کا ہمیشہ ادب سے بھی گہرا تعلق رہا ہے۔ ان کا اپنا ایک شعر ہے:

تجھ سے تیری یاد اچھی ہے جو مجھ سے شرماتی ہی نہیں
تو جا کے کبھی آتا ہی نہیں یہ آ کے کبھی جاتی ہی نہیں

انگریز کے خلاف جدوجہد کے زمانے میں ان کی یہ رباعی بہت مشہور ہوئی۔ یہ پینتالیس برس پہلے کی رباعی ہے۔ اب شاید اس میں وہ کشش نہ ہو لیکن اس زمانے کے لحاظ سے یہ بہت اچھی رباعی ہے۔

بلبل جب اسیرِ دام ہو جاتا ہے
کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے
بن جاتے ہیں آسمان کے تارے آنسو
جب ملک کوئی غلام ہو جاتا ہے

کمال امروہوی

الفت کی نئی منزل کو چلا
تو ڈال کے بانہیں بانہوں میں
دل توڑنے والے دیکھ کے چل
ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

میرا یہ گیت انڈیا اور پاکستان دونوں میں ہی بہت مقبول ہوا۔ اور اس کی وجہ سے ہر باذوق شخص مجھے جاننے لگا تھا۔ اس زمانے میں پاکستان کا کوئی ریکارڈ وہاں کی گراموفون کمپنی جاری نہیں کرتی تھی حالانکہ ہز ماسٹر وائس کمپنی جو آجکل یہاں ای ایم آئی کے نام سے کام کر رہی ہے ایک بین الاقوامی کمپنی تھی اور اس کی دونوں ملکوں کی شاخوں کی ملکیت بھی ایک ہی تھی۔ لیکن یہاں کا کوئی ریکارڈ باضابطہ طور پر وہاں جاری نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس حقیقت میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ یہ ریکارڈ پاکستان سے ہزاروں کی تعداد میں سمگل ہو کر انڈیا گیا اور وہاں ستر روپے میں بکا جبکہ یہاں اس کی قیمت ڈھائی تین روپے تھے۔ جب یہ ریکارڈ سمگل ہو کر ہزاروں کی تعداد میں انڈیا پہنچ گیا تو کمپنی نے مجبور ہو کر اسے باضابطہ طور پر اپنی بمبئی برانچ سے بھی جاری کیا۔ میرے علم کے مطابق کسی پاکستانی گیت کا وہاں سے باضابطہ طور پر جاری ہونے والا یہ پہلا ریکارڈ تھا۔

میری یہی غزل مینا کماری سے میرے تعارف کا باعث بنی۔ مینا کماری ایک باذوق خاتون تھیں۔ ادب سے دلچسپی رکھتی تھیں اور خود بھی شعر کہنے کا ذوق رکھتی تھیں۔ غالباً اسی

ذوق کی وجہ سے کمال امروہوی صاحب سے ان کی شادی بھی ہوئی۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے جب وہ کمال صاحب کی بیوی کی حیثیت سے وقت گزار رہی تھیں۔ ہوا ایسا کہ کمال صاحب سے میرا تعارف پہلے سے تھا جب میں بمبئی گیا تو چونکہ یہ مجھ سے سینئر تھے اس لئے میں اپنا فرض سمجھ کر ان سے ملنے کے لئے گیا۔ یہ میرے ساتھ بہت شفقت سے پیش آئے۔ آہستہ آہستہ یہ شفقت بے تکلفی میں بدل گئی اور ہم دوستی کی اس نہج پر آ گئے جہاں انسان ایک دوسرے کو بے تکلفی سے مخاطب بھی کر سکتا ہے۔ ایک دو ملاقاتوں میں ہم بہت قریب آ چکے تھے۔

کمال صاحب' ڈائیلاگ کے معاملے میں اتنی شہرت رکھتے ہیں کہ آج بھی شاید لوگوں میں ان کی اس شہرت کو چھونے کی ہمت کم ہو۔ کیونکہ میں خود لفظیات اور لفظیات کی صوت کا طالب علم ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ قدرت نے یہ علم مجھے ودیعت کر رکھا ہے اس لئے میں نے دیکھا کہ ان کے مکالموں میں بھی وہی چیز موجود تھی۔ ان مکالموں میں غنائیت یا موسیقی تو نہیں تھی لیکن یہ ایسے متاثر کن جملے ہوتے تھے جو ختم ہونے کے بعد دل کے ساتھ چپک کر رہ جاتے تھے۔ میری کمال صاحب سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی۔

انہوں نے میری شاعری کے اس پہلو کو پہلے سے محسوس کر رکھا تھا اور جب انہوں نے اس بارے میں مجھ سے بات کی تو میں نے کہا کہ وہ تو شاعری ہے اور شاعری میں تو ایسا ہو ہی جاتا ہے لیکن آپ مجھے اپنے بارے میں بتایئے کہ آپ کے یہاں الفاظ کی یہ کیا Jugglery ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ قانون کا ایک غلط فیصلہ بھی آپ کے ڈائیلاگ کے زور سے صحیح ثابت ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر چندر موہن کی ایک فلم میں جب نسیم بانو ملکہ بنتی ہے اور اس کے تیر سے کسی عورت کا خاوند مر جاتا ہے اور اس پر مقدمہ چلتا ہے تو سیدھی بات تو یہ ہے کہ وہ قاتل ہے اور اسے سزا ملنے چاہیے لیکن شہنشاہ فیصلہ یہ دیتے ہیں کہ چونکہ اس نے تمہیں بیوہ بنایا ہے اس لئے تم بھی اسے بیوہ بنا دو۔ اب یہ فیصلہ بالکل غلط تھا لیکن کمال صاحب نے ڈائیلاگ کے زور سے وہ جادو کیا کہ کسی نے یہ سوچا ہی نہیں کہ بادشاہ نے کتنا غلط فیصلہ دیا ہے۔ بلکہ اس ڈائیلاگ پر ہال میں ہر شو میں تالیاں بجتی تھیں۔

کمال صاحب میری بات سن کر بڑے ہنسے اور پھر مجھے ایک کاغذ دکھا کر کہنے لگے کہ یہ دیکھئے یہ ایک جملہ ہے اس کے آٹھ الفاظ ہیں۔ انہی آٹھ الفاظ کو میں یوں کہتا ہوں تو ان کا تاثر یہ بنتا ہے لیکن جب میں ایک لفظ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا کر وہ جملہ ادا کرتا ہوں تو اس کا اثر بالکل بدل جاتا ہے چنانچہ میں جب ڈائیلاگ لکھتا یوں تو اکثر جملے تو خود بخود ذہن میں آ جاتے ہیں لیکن جہاں ذہن ذرا اٹکتا ہے تو میں اس طرح یہ جملے پڑھتا ہوں۔ اور الفاظ کی ترتیب بدل کر تنہا کمرے میں باقاعدہ ڈائیلاگ بول کے دیکھتا ہوں۔ تب جا کر کہیں یہ ڈائیلاگ کاغذ پر لکھتا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میرا ہر ڈائیلاگ وہی اثر رکھتا ہے جس کا آپ نے ذکر کیا ہے۔

کمال صاحب سے میں نے الفاظ کی جگہ تبدیل کرنے کا یہ فن سیکھا اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی مجھ سے بڑا ہو یا چھوٹا ہو لیکن اگر مجھے اس میں کوئی روشنی نظر آئے تو میں ضرور یہ کوشش کرتا ہوں کہ اس روشنی سے اپنے آپ کو تھوڑا سا منور کر لوں۔ زندگی بھر میرا یہی دستور رہا ہے۔ میں نے سکھانے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا لیکن سیکھنے کا دعویٰ ضرور کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے کمال صاحب سے باقاعدہ سوال کر کے ان کی اس خوبی کے بارے میں پوچھا۔

کمال صاحب نے مجھ سے کہا کہ ہماری بیگم آپ کی شاعری کی دلدادہ ہیں اور محض ریکارڈوں کی حد تک ہی نہیں بلکہ آپ دیکھیں گے کہ ان کے پاس آپ کی تصنیف بھی موجود ہے۔ اس وقت تک میری ایک ہی کتاب ''گجر'' آئی ہوتی تھی۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میری بیگم چاہتی ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں' میں نے ہامی بھر لی۔

میرے ذہن میں مینا کماری کے نام کا بڑا رعب تھا۔ میں سوچتا تھا کہ وہ اتنی بڑی آرٹسٹ اور اتنی بڑی ہیروئن ہیں کہ میں ان سے کس طرح ملوں گا۔ ان کا معاملہ بالکل الٹ تھا۔ چنانچہ جب ہم کھانے پر بیٹھے تو پہلے تو مینا کماری میری کتاب لائیں اور پھر بڑی مؤدب ہو کر کہنے لگیں کہ اس پر اپنا آٹوگراف دے دیں۔ پھر ''ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں'' کا ریکارڈ لائیں اور اس پر بھی آٹوگراف لیا۔

میں دیکھ رہا تھا کہ ایسا کرتے ہوئے ان کے ہاتھوں میں ہلکا سا لرزہ آجاتا تھا۔ جب کھانے کے لئے بیٹھے تو ان کے ہاتھ سے دو بار چمچ گرا۔ جب میں بات کرتا تھا تو ان پر کچھ ایسا اثر ہوتا تھا جیسے میں ان کی نظر میں بہت بڑا ہوں اور وہ مجھے Face نہیں کر پا رہیں۔ اس کا تجزیہ یہی ہے کہ جس طرح میں ان کے فن سے بہت متاثر تھا اسی طرح وہ بھی فنکار اور شاعرہ اور میری شاعری کی دلدادہ ہونے کی وجہ سے جب میں پہلی بار ان کے سامنے گیا تو ان پر بھی وہی اثر ہوا جو مجھ پر ہوا تھا۔

ایک بات جو خاص ہوئی وہ یہ تھی کہ کھانے پانچ سات بنے ہوئے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کھانے کی اس طرح داد دی جیسے کوئی سخن فہم آدمی غزل کے اس شعر کی داد دیتا ہے جسے شاعر بھی اپنا حاصل غزل شعر سمجھتا ہے۔ اس کھانے پر میں نے داد دی تو دونوں میاں بیوی میری طرف دیکھنے لگے اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کچھ سوچا اور کہا کہ ہمیں اس بات کا پتا ہی نہیں تھا کہ آپ یہ ذوق بھی رکھتے ہیں۔

میں کوئی تین ماہ تک بمبئی میں رہا اور اس کے بعد وہ ہمیشہ یہ کرتے تھے کہ جب بھی ان کے ہاں انوکھی چیز پکتی تھی تو اکثر ان کا آدمی مجھے تلاش کر کے لے جاتا تھا اور وہ مجھے کھانے میں شامل کرتے تھے۔

بظاہر ان کی زندگی بڑی اچھی تھی لیکن اِدھر اُدھر سے کانوں میں آواز بھی پڑ جاتی تھیں کہ کوئی گڑ بڑ بھی ہے اور دونوں ایک دوسرے سے آسودہ نہیں ہیں بالخصوص مینا کماری۔ اس زمانے میں ''پاکیزہ'' فلم کا ابتدائی حصہ فلمایا جا رہا تھا۔ میں سیٹ پر گیا تو دونوں میاں بیوی نے میرے ساتھ تصویر بھی بنوائی۔ مجھے بالکل ایسی کوئی بات نظر نہیں آ رہی تھی کہ ان میں کوئی اختلاف ہے لیکن جب میں انڈیا سے واپس آ گیا تو بعد میں پتا چلا کہ دونوں میں اختلافات بڑھ گئے ہیں اور علیحدگی بھی ہو گئی ہے۔

مگر اس خاتون کی عظمت دیکھئے کہ جب علیحدگی ہوئی تو فلم ادھوری تھی اور اس پر لاکھوں روپے لگے ہوئے تھے۔ اگر وہ چاہتی اور آرٹسٹ نہ ہوتی تو کمال صاحب سے بدلہ لیتی اور فلم کا باقی کام نہ کرتی۔ لیکن بہت سے اختلاف رکھنے کے باوجود مینا کماری نے باقی

فلم مکمل کروائی اور سنا ہے کہ آخری دنوں میں بیماری کی وجہ سے اس قابل نہیں تھیں کہ فلم میں کام کر سکیں لیکن انہوں نے کمال صاحب کے لئے اس میں کام کیا۔

اس کے بعد کے دن ایسے آئے کہ انہوں نے اپنے دکھ درد کو مٹانے کے لئے شراب کا سہارا لیا اور گرتے گرتے اس حالت کو پہنچیں کہ بیان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہم معاشرے کو فیشن کے طور پر بھی برا بھلا کہتے رہتے ہیں لیکن اس خاتون کے ساتھ معاشرے نے جو کیا وہ معاف نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایک ایسی خاتون تھی کہ جس شخص کے ساتھ بھی اس کا رابطہ ہوا وہ پھلا پھولا۔ آج کے کئی بڑے نام مینا کماری کے نام سے وابستہ ہیں کیونکہ مینا کماری نے ہر شخص کو فائدہ پہنچایا۔ مگر ان سب بڑے ناموں کے باوجود مینا کماری بہت چھوٹی ہو کر مری اور جن کو اس نے بڑا بنایا تھا انہوں نے اس کی کوئی خبر نہ لی۔ سنا ہے کہ مرنے کے بعد اس کے جنازے میں جتنے لوگوں نے شرکت کی وہ بمبئی کی فلم انڈسٹری کے لئے کوئی قابل فخر بات نہیں۔ خدا اسے جنت دے اور اس کی روح کو سکون دے کیونکہ یہاں اس نے بڑی تکلیفیں برداشت کیں۔

ہم ہر مرنے والے کے بعد کہتے ہیں کہ اس کی جگہ پر نہیں ہو گی لیکن وہ اتنی بڑی آرٹسٹ تھی کہ اس مرنے والی کے بعد واقعی آج تک اس کی جگہ پر نہیں ہوئی۔

گلزار دینوی

مینا کماری کے ذکر کے ساتھ جو اور نام ذہن میں ابھرتے ہیں ان میں گلزار کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ پنجاب اور پنجاب میں بھی ایک چھوٹی سی جگہ دینہ کے رہنے والے سردار ہیں۔ لیکن جب وہ بمبئی پہنچے تو تو بالوں سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ وہ شروع شروع میں گلزار دینوی کے نام سے مختلف ادبی پرچوں میں لکھا کرتے تھے۔ وہ خصوصاً امرتسر سے نکلنے والے پرچے ''پگڈنڈی'' میں باقاعدگی سے لکھا کرتے تھے۔

نوجوان تھے اور شروع ہی میں انہیں یہ موقع ملا کہ وہ بمل رائے ٹیم کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ خدا نے انہیں بڑی صلاحیتیں دی ہوئی تھیں۔ شعر کہتے تھے، نثر لکھتے تھے، اور ڈائریکشن کا بھی شوق تھا۔ وہ اسی سلسلے میں بمل رائے کے پاس ایک مدت تک کام کرتے رہے اور وہاں سے بہت کچھ سیکھا۔ چنانچہ مینا کماری کے پسندیدہ لوگوں میں سے ایک وہ بھی تھے۔

ان کے بارے میں داستانیں تو بہت سی مشہور ہیں مگر میں ان داستانوں سے ہٹ کر گلزار کی شخصیت کے بارے میں کچھ کہوں گا۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے اور بمبئی کے بہت بڑے ہجوم میں انہوں نے اپنی پہچان پیدا کر رکھی تھی۔ دیکھنے میں وہ کوئی اتنا قابل فخر نوجوان بھی نہیں تھا کہ ہم کہیں کہ وہ رانجھے جیسا خوبصورت آدمی تھا اور ہیریں اس کی طرف کھچی چلی آتی تھیں۔ لیکن یہ بھی دُرست ہے کہ اس کی زندگی میں جو نام آئے وہ ہیروں سے کم نہ تھے۔

میں نہیں سمجھتا کہ مینا کماری اس کی زندگی میں کہاں تک آئی لیکن یہ درست ہے کہ یہ دونوں دوست تھے اور مینا کماری انہیں اچھا جانتی تھی۔ اس کے بعد راکھی بنگال کی بہت خوبصورت عورت تھی اور چوٹی کی ہیروئن تھی۔ وہ باقاعدہ ان کی شادی میں آئیں۔ دونوں نے شادی کی اور اس سے ایک بچی بھی پیدا ہوئی۔ جس کا نام انہوں نے بوسکی رکھا اور اس مناسبت سے گلزار نے اپنے مکان کا نام بوسکیانہ رکھا پھر دونوں کی علیحدگی بھی ہوگئی لیکن نجانے راکھی اب تک راکھی گلزار کیوں لکھ رہی ہے۔ جبکہ علیحدگی کو بھی کوئی دس بارہ سال ہو چکے ہیں۔

جب میں بمبئی گیا تو اس سے پہلے سے میرا ان کے ساتھ تھوڑا سا تعارف تھا وہ یوں کہ تبر کا بالواسطہ تعارف ہو چکا تھا۔ یہ گلزار صاحب کی بڑائی کا ثبوت ہے کہ انہوں نے اپنی یہ ایک کتاب مجھے پیش کی تو اس پر لکھا تھا..... قتیل شفائی صاحب کے نام جن کی انگلی پکڑ کر میں نے اس رستے پر چلنا سیکھا..... میں پتا نہیں اتنا بڑا ہوں یا نہیں لیکن یہ الفاظ لکھنے والا یقیناً بڑا ہے۔

چنانچہ جب میں وہاں گیا تو انہوں نے مجھے دعوت پر بلایا۔ اس وقت تک ان کی فلم ''میرا'' چل چکی تھی جو کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی تھی۔ مگر چونکہ گلزار کی فلم تھی اس لئے میرے ذہن میں تھا کہ اس میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ گلزار صاحب خود بھی یہ تجزیہ کر رہے تھے کہ یہ فلم جو ان کی نظر میں اچھی تھی فلاپ کیوں ہوگئی۔ چنانچہ انہوں نے اس فلم کا ایک خاص شو میرے لئے کیا۔ اس میں میرے ساتھ میرا بیٹا اور میری بیوی بھی تھیں۔ اس زمانے میں میری راتیں دعوتوں میں صرف ہو جاتی تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بمبئی کے لوگ بڑے زندہ دل ہیں اور ان کا دن دس گیارہ بجے رات کے بعد شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ محفلیں تین چار بجے صبح کے وقت ختم ہوتی تھیں اور مجھے سونے کا موقع کم ملتا تھا۔

انہوں نے فلم دیکھنے کی دعوت دی اور ہم وہاں گئے تو نیند پوری نہ ہو سکنے کی وجہ سے مجھے درمیان میں اونگھ آ جاتی تھی۔ ایک بار اونگھ آئی تو میں نے بیٹے سے کہا کہ اگر مجھے اونگھتے دیکھو تو فوراً مجھے کہنی مار دینا۔ کیونکہ انہوں نے جتنے پیار سے فلم کا اہتمام کیا ہے اس لحاظ

سے میرے لئے یہ بڑی شرم کی بات ہوگی۔

ہمارے علاوہ وہاں سادہ سے خدوخال والا ایک اور چہرہ بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے اس وقت تو نہیں پہچانا لیکن بعد میں پتا چلا کہ وہ دیپتی نول تھیں۔ وہ امرتسر کی رہنے والی اور خوابوں کے پیچھے بھاگنے والی لڑکی تھی۔ چونکہ گلزار بھی اسی قبیلے کا شخص تھا اس لئے اب وہ اس کی زندگی میں دوست کی حیثیت سے آئی ہوئی تھی۔ پکچر دیکھنے کے بعد یہ مجھے بھی اچھی لگی لیکن دو چیزوں کی اس میں مجھے بھی کمی محسوس ہوئی۔ ایک تو یہ ہے کہ ہماری پبلک جو کچھ بچپن میں معجزاتی قسم کی چیز سن چکتی ہے فلم میں اگر اس سے انحراف کر لیا جائے تو پبلک اس کا ساتھ نہیں دیتی۔ مثال کے طور پر شریف نیئر یہاں کے بہت بڑے آرٹسٹ اور ہدایتکار ہیں انہوں نے فلم ''شیریں فرہاد'' بنائی۔ اس میں انہوں نے یہ کیا کہ بجائے اس کے لوگوں کو پہلے سے سنی سنائی کہانی دوبارہ سنا دیتے' انہوں نے اس موضوع پر ریسرچ کی اور دودھ کی نہر والی روایتی کہانی سے انحراف کیا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اس میں کچھ نئے کردار بھی شامل کیے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی فلم فلاپ ہوگئی۔ اس کے برعکس ''لیلیٰ مجنوں'' کی روایتی کہانی کے مطابق اس موضوع پر کئی فلمی بنی ہیں لیکن یہ کبھی فلاپ نہیں گئیں۔

''میرا'' کے ساتھ یہ ہوا کہ چونکہ اس میں گلزار نئے ذہن کے آدمی تھے اس لئے انہں نے کہانی کو روایت سے ہٹ کر لیا۔ اب اصل کہانی جو لوگوں نے سنی ہوئی ہے وہ تو یہ ہے کہ جب میرا گاتی ہے تو محل کو آگ لگ جاتی ہے۔ اب گلزار نے اس معجزاتی کہانی سے ہٹ کر یہ کیا کہ میرا جہاں بیٹھ کر گا رہی ہے وہاں دیئے کسی زنجیر کے ساتھ لٹک رہے ہیں اور تیز ہوا بھی چل رہی ہے۔ چنانچہ کسی دیئے کا تیل چھلک کر لکڑی کے دروازے پر پڑ جاتا ہے جو آگ پکڑ لیتا ہے اور یوں محل کو آگ لگ جاتی ہے۔ یہ سائنٹیفک بات تھی اور اس میں بھگوان کا آگ لگانے میں عمل دخل نہیں تھا۔ چونکہ یہ بات روایت سے ہٹ کر تھی اس لئے لوگوں نے اسے قبول نہیں کیا۔

اس کے علاوہ میرا بائی کے مشہور بھجن ہیں جن کی دھنیں پہلے سے بنی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے:

اے ری میں تو پریم دیوانی میرا درد نہ جانے کو

اب اس کی ایک مانوس دھن ہے جو میں نے بھی بچپن میں سنی تھی اور بعد میں بھی جن لوگوں نے یہ بھجن گائے اس کی وہی مانوس دھن استعمال کی۔ لیکن گلزار نے ان سب کے دھنیں بدل دیں اور اب ان کی نئی دھنیں بنائیں۔ اس لئے فلم کا میوزک دیکھنے والوں کو بالکل متاثر نہ کر سکا۔ چنانچہ فلم کی کہانی میں عقلی موڑوں اور ان نئی دھنوں کو لوگوں نے پسند نہ کیا اور یہ فلم بھی رہ گئی۔

سننے کی حد تک یہ بات بھی آئی ہے کہ گلزار صاحب کی زندگی میں اس کے بعد بھی آگے چل کر رومانس کے کچھ مراحل آئے ہیں لیکن میں خود ابھی تک ان کی تصدیق یا تردید نہیں کر پایا۔

دھرمیندر

مینا کماری کے حوالے سے جو ایک اور نام سامنے آتا ہے وہ دھرمیندر کا ہے۔ اتفاق سے دھرمیندر بھی بنیادی طور پر سردار ہیں مگر بالوں کے بغیر۔ یہ 1960ء کے قریب نیا نیا نام رکھ کر بمبئی آئے۔ یہ بہت جی دار اور با اصول ہیں۔ شروع میں ان کی کچھ فلمیں فیل ہوئیں لیکن یہ حوصلے سے آگے بڑھتے رہے۔ اب ان کی عمر کچھ بڑھ بھی گئی ہے۔ لیکن بظاہر زیادہ عمر کے لگتے نہیں ہیں۔ ان کا بیٹا بھی اب ہیرو بن چکا ہے لیکن اب بھی بیٹے سے زیادہ کامیابی ان کے قدم چوم رہی ہے۔

ان کی طرف سے شعر و شاعر کی سرپرستی کیے جانے کے بارے میں کئی داستانیں سننے میں آئی ہیں۔ انہی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک محفل میں ایک گائیکہ میری غزل گا رہی تھیں تو انہوں نے خوش ہو کر اپنا سونے کا لاکٹ اتار کر گائیکہ کو دے دیا اور اسے مالا مال کر دیا۔ ان کی سخاوت کی اور لوگوں کی مدد کرنے کی اسی طرح کی اور بھی بہت سی داستانیں مشہور ہیں۔

میں جب بمبئی گیا تو دل میں ان سے ملنے کا خیال تھا۔ پتا چلا کہ وہ فلم ''رضیہ سلطان'' کے سیٹ پر موجود ہیں۔ میں نے کمال امروہوی صاحب سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے تصدیق کی چنانچہ میں' میرا بیٹا نوید اور صابر دت سیٹ پر پہنچے تو دیکھا کہ یہ غلام کا رول کر رہے تھے اور انہوں نے کالا میک اپ کیا ہوا تھا۔ عجیب بات ہے کہ انہوں نے دیکھتے ہی مجھے پہچان لیا۔ اسی دوران کمال صاحب نے جو ہمارے ساتھ تھے کہا کہ یہ قتیل

صاحب ہیں۔ مجھے بڑے پیار سے ملے اور اس طرح گلے لگا لیا جس طرح سالہا سال کے دوست ہوں۔ پھر مجھ سے خیریت دریافت کی' کھانے پینے کا چھوٹا سا انتظام کیا اور پھر ایک ساتھ کچھ تصویریں ہوئیں۔

اس کے بعد ان سے دوبارہ ملاقات نہ ہو سکی۔ کیونکہ میں کچھ غیر ضروری دعوتوں میں الجھا ہوا تھا جبکہ وہ پہلے ہی سے فلموں کے سلسلے میں بہت مصروف تھے۔ لیکن بعد میں میرے دوست صابر دت جنہوں نے وہاں سے قتیل شفائی نمبر نکالا ہے' بتایا کہ میرے انڈیا سے چلے آنے کے بعد جب ان کی دھرمیندر سے ملاقات ہوئی تو اس میں یہ طے پایا کہ میں اب جب بمبئی جاؤں گا تو وہ اپنی فلموں کے گانے جس حد تک میں لکھ سکا مجھ سے لکھوائیں گے۔ یہ 1979ء کا واقعہ ہے۔

کے آصف اور نگار سلطانہ

1961ء میں مرحوم کے آصف نے مجھے اپنی فلم کے گانوں کے لئے بمبئی میں روکا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ فلم ''محبت اور خدا'' بنا رہے تھے۔ اس وقت تک فلم ''مغل اعظم'' ریلیز ہو کر آصف کا بہت نام پیدا کر چکی تھی۔ یہ پہلی فلم تھی جس پر ایک کروڑ روپیہ خرچ آیا تھا جبکہ اس زمانے میں فلم دس لاکھ روپے میں بن جاتی تھی۔ یہ فلم بہت زیادہ پیسہ کما رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ یہ مشہور ہو رہا تھا کہ آصف دلیپ کمار کی بہن سے شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن چونکہ یہ پہلے سے نگار سلطانہ سے شادی شدہ ہیں اس لئے دوسری شادی کی راہ میں کچھ رکاوٹیں حائل ہیں۔ پھر چونکہ دلیپ صاحب بھی آصف صاحب سے اس نئے رشتے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس لئے بھی یہ شادی ہو نہیں پا رہی۔ پھر لوگ آصف کو تنقید کا نشانہ بھی بنا رہے تھے۔ اگر ان کی ایک ہزار جگہ پر تعریف ہوتی تھی تو ساتھ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ان کا جنسی پہلو بہت کمزور ہے۔

اس سے پہلے کے آصف کے کھاتے میں اپنی ممانی ستارہ کا اغوا بھی پڑا ہوا تھا۔ ستارہ اپنے زمانے کے مشہور ہدایتکار اور اداکار نذیر صاحب کی بیوی تھی اور ڈانسر تھی۔ آج کا زمانہ تو اسے نہیں جانتا لیکن پچھلے زمانے کے لوگ جانتے ہیں کہ وہ کتنے پائے کی ڈانسر تھی۔ وہ محبوب صاحب کی فلم روٹی میں ہیروئن آئی تھیں اور انہوں نے اپنی صلاحیتوں کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔ اس کے علاوہ وہ متعدد فلموں میں بھی ہیروئن آ چکی تھیں۔

نذیر صاحب بہت خوبصورت آدمی تھے' بطور مردان کی شخصیت بہت پرکشش تھی اور

اداکاری میں بھی ان کا اپنا ایک سٹائل تھا۔ جہاں تک کے آصف کا تعلق ہے، وہ واجبی سی شکل وصورت کے آدمی تھے بلکہ بعض صورتوں میں تو خوبصورتی کے معیار سے ذرا نیچے گرے ہوئے نظر آتے تھے لیکن ''مغل اعظم'' کی وجہ سے انہیں بہت شہرت مل گئی تھی اور بقول نگار سلطانہ اس شہرت پر پہنچ کر کوئی بھی لڑکی کے آصف کی طرف راغب ہو سکتی ہے۔

چنانچہ یہی ہوا ہوگا کہ دلیپ صاحب کی بہن ادھر راغب ہو گئی ہوں گی۔ ویسے بھی کے آصف صاحب اب نگار سلطانہ کے ساتھ نہیں رہ رہے تھے بلکہ جوہو ہوٹل میں دریا کے کنارے ایک خوبصورت کاٹیج لے کر رہ رہے تھے۔ وہیں وہ اپنی فلم کا کام بھی کرتے تھے اور پتا یہ چلتا تھا کہ اب بھی دلیپ صاحب کی بہن کے ساتھ ان کی پیام رسانی ہو رہی ہے جسے لوگ ناپسندیدہ قرار دے رہے تھے۔

اسی زمانے میں میری ملاقات نگار سلطانہ کے ساتھ ہوئی۔ نگار سلطانہ ایک بہت ہی خوبصورت خاتون تھیں، وہ شعر و شاعری کی دلدادہ تھیں اور جب ترنم سے پڑھتی تھیں تو دل موہ لیتی تھیں۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ تانیث میں باتیں نہیں کرتی تھیں بلکہ تذکیر میں باتیں کرتی تھیں مثلاً میں آیا اور میں گیا۔ اس طرح مردوں کی طرح باتیں کرتی تھی۔ انہیں بچپن ہی سے اس طرح باتیں کرنے کی عادت تھی۔

ان سے میری پہلی ملاقات تو آصف صاحب نے ہی کروائی تھی۔ یہ ایک دن گھومتے ہوئے مجھے ان کے پاس لے گئے تھے۔ اس وقت ان کے بچوں سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد بھی نگار سلطانہ سے ایک دو بار ملاقات ہوئی۔ اتنی دیر میں حیدر آباد سے مجھے ایک مشاعرے کی دعوت موصول ہوئی۔ نگار سلطانہ پیدائشی طور پر حیدر آباد سے تعلق رکھتی تھیں۔

جب مشاعرے کی دعوت آئی تو اس زمانے میں حبیب جالب صاحب بھی انڈیا پہنچے ہوئے تھے۔ قبل ازیں میں اور وہ دہلی میں ایک ساتھ مشاعرہ بھی پڑھ چکے تھے۔ جہاں سے میں مدراس چلا گیا تھا اور مدراس سے واپس آ کے آصف صاحب کے لئے بمبئی ٹھہر گیا تھا جبکہ جالب صاحب بعد میں دہلی سے بمبئی آئے اور غالباً بڑے غلام علی کے ہاں ٹھہرے

کیونکہ ان کے بیٹے سے ان کے مراسم تھے۔

جالب صاحب مجھ سے ملنے کے لئے آجاتے تھے۔ میں مشہور نغمہ نگار اندریو کے ساتھ رہ رہا تھا۔ جالب صاحب اس زمانے میں خاصے غیر ذمہ دار آدمی تھے۔ کوئی احتیاط نہیں کرتے تھے۔ جو جی میں آیا کہہ دیتے تھے۔ کسی کو ملال ہوتا ہے تو ہو اور اگر ان کی ذات پر کوئی حرف آتا ہے تو آئے اس وجہ سے اکثر دوست ایک حد تک ان سے تنگ رہتے تھے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جسے قدرت نے قوت برداشت کچھ زیادہ ہی دی ہے۔ نصیحتیں تو کرنے لگ جاتا ہوں لیکن کسی سے تنگ نہیں آتا۔

جب جالب صاحب میرے پاس آئے تو پوچھا کہ سنا ہے آپ حیدر آباد جا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہاں جا رہا ہوں۔ کہنے لگے کہ میں بھی جا رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ دعوت نامہ آیا ہے۔ کہنے لگے کہ آجائے گا۔ میں نے کہا کہ کس طرح' کہنے لگے آپ منگوا کر دیں گے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ جالب کے لئے دعوت نامہ منگوانا کوئی مشکل بات نہیں تھی کیونکہ ان کا نام تو تھا ہی چنانچہ میں نے جب مشاعرے کے منتظمین سے کہا تو انہوں نے بخوشی انہیں دعوت نامہ بھیج دیا۔

اب مجھے معلوم تھا کہ اس دعوت نامے کے ساتھ جو کوفت برداشت کرنی ہوگی' وہ مجھے ہی برداشت کرنی ہوگی۔ بہر حال جالب صاحب کو دعوت نامہ آ گیا اور وہ حیدر آباد چلے گئے۔ میں جس ٹرین میں روانہ ہوا اس میں مشہور خاتون میوزک ڈائریکٹر اوشا کھنہ ان کے والد اور بمبئی کے کچھ دوسرے شعراء بھی تھے۔ حیدر آباد میں مشاعرہ بھی تھا اور ساتھ کوئی میوزک پروگرام بھی تھا۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ نگار سلطانہ حیدر آبادی ہونے کے ناتے وہاں موجود ہیں اور مشاعرہ بھی پڑھیں گے۔ یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی۔

وہاں راجہ راج دھن گیر بھی موجود تھے جو نواب کے مصاحبین میں سے تھے۔ وہاں ہندو راجہ کہلواتے تھے جبکہ مسلمان نواب کہلاتے تھے۔ راجہ صاحب ایک چھوٹی سی ریاست کے خود بھی مالک تھے اور انہوں نے باہر سے آئے ہوئے شعراء کی دعوت کی۔ اس میں نگار سلطانہ بھی موجود تھیں۔ ہم پہلی بار ایک محل میں داخل ہوئے تھے اور جب گیٹ

سے اندر داخل ہوئے تو ایک سڑک بہت دور تک چلی جا رہی تھی۔ راستے میں پہریدار بھی کھڑے تھے۔ ہم کافی فاصلہ طے کر کے اندر محل تک پہنچے۔ اس دعوت میں جانے والوں میں معرکے کے انقلابی شاعر مخدوم محی الدین نکسلواڑی اور نگار سلطانہ بھی شامل تھیں۔

اس دعوت میں ایک بہت خوبصورت چہرہ بڑی خصوصیت کے ساتھ نظر آ رہا تھا جو راجہ دھن راج گیر کی بیٹی کا تھا۔ ان کا نام اندرا تھا۔ اور یہ حسن کا مجسمہ تھیں۔ یہ انگلش کی شاعرہ تھیں۔ پتا چلا کہ مخدوم صاحب روزانہ راجہ صاحب کے ہاں حاضری دینے جاتے ہیں اور جا کر اندرا جی کو دیکھتے ہیں۔ ہم نے بھی اندرا جی کو دیکھا اور وہ واقعی اس لائق تھیں کہ:

تجھ کو بٹھا کے سامنے یاد خدا کریں

وہاں دھن راج گیر کا کردار بھی سامنے آیا۔ انہوں نے اپنی جوانی میں اور تو جو کچھ کیا ہوگا وہ الگ ہے مگر انہوں نے اپنے زمانے کی خوبصورت اور مشہور ترین ہیروئن زبیدہ سے بھی شادی کر رکھی تھی جو ہندوستان کی پہلی متکلم فلم میں ہیروئن بھی آ چکی تھیں۔ لیکن جوانی گزر جانے کے باوجود اس بڑھاپے میں بھی راجہ صاحب کی حسن پرست طبیعت باقی تھی۔

جہاں میں بیٹھا تھا اس سے آگے نگار سلطانہ تھیں اور ان سے آگے دھن راج گیر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس عمر میں بھی جبکہ اکثر لوگ زندگی سے ریٹائرڈ ہو جاتے ہیں وہ نگار سلطانہ سے کہہ رہے تھے کہ نگار تم ہاں تو کرو میں اب بھی تمہیں جواہرات میں تول سکتا ہوں نگار کن انکھیوں سے کبھی میری طرف دیکھے اور کبھی تھوڑا سا جواب دے۔ اصل میں وہ کے آصف کی بیوی تھیں اور میں آصف صاحب کا دوست تھا اس لئے کچھ حجاب سا تھا۔

اس وقت وہاں سب لوگ پئے ہوئے تھے اور جس کے جی میں جو آ رہا تھا کہے جا رہا تھا۔ نگار سلطانہ کے ایک بھائی بھی وہاں موجود تھے مگر ایسے بھائیوں کی اپنی تو کوئی حیثیت ہوتی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ نامور خاتون تھیں اور ان لوگوں کی کفیل بھی تھیں۔ پھر بھی وہ بظاہر منہ سا بنا کر یہ تاثر دے رہے تھے کہ دھن راج گیر کیوں ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ مگر یہ سب نمائشی تھا۔

یہ محفل بہت دیر تک رہی۔ میں نے دیکھا کہ دھن راج گیر صاحب کو رومانس کی

چھوٹی چھوٹی باتوں سے آگاہی تھی۔ مجھے پوچھنے لگے کہ اقبال بانو کا کیا حال ہے؟ میں بہت پریشان ہوا۔ اور کہا کہ جی بس ٹھیک ہے۔ کہنے لگے کہ بھئی میں تو آپ کے حوالے سے پوچھ رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ اب تو سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔ کہنے لگے کہ آپ کی طرف سے یا ان کی طرف سے۔ میں نے کہا کہ بس دونوں ہی کی طرف سے سمجھ لیجئے۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے اکتا چکے تھے۔ کہنے لگے کہ اچھا اس معاملے میں آدمی اکتا بھی جایا کرتا ہے۔ وہ اس طرح کی زندہ دلی کی باتیں کر رہے تھے۔ مشاعرے میں پنجاب کے یونینسٹ وزیر بھیم سین سچر جو اس وقت گورنر تھے۔ وہ بھی آئے ہوئے تھے۔ اس دن مجھے محسوس ہوا کہ اپنے علاقے کے رہنے والے ہم وطنوں سے پیار ایک لازمی سی چیز ہے۔ اور اس میں بعض اوقات درمیان میں مذہب و ملت بھی نہیں آتا۔ مثال کے طور پر بنگالی مسلمان، مغربی پاکستان کے مسلمان کی نسبت بنگالی ہندو کو نسبتاً زیادہ چاہتا تھا۔ کیونکہ زمین اور زبان کا رشتہ بڑی چیز ہوتی ہے۔

جب ہم مشاعرے میں بیٹھے ہوئے تھے تو اس کی صدارت گورنر لالہ بھیم سین سچر کو کرنی تھی۔ وہ خالص پنجابی آدمی تھے۔ جالب چونکہ جونیئر تھے اس لئے وہ انہیں نہیں جانتے تھے لیکن مجھے جانتے تھے جب آ کر وہ کرسی صدارت پر بیٹھے تو سب سے پہلے پوچھا کہ ہمارے قتیل شفائی آئے ہوئے ہیں۔ وہ کہاں ہیں۔ میں نے سنا تو اٹھ کر آیا۔ وہ مجھ سے بغل گیر ہو گئے اور میرا منہ چوما۔ پھر انہیں جن شاعروں کے نام یاد تھے ان کے بارے میں پوچھا کہ ان کا کیا حال ہے۔

انہوں نے اگلے روز گورنر ہاؤس میں باہر سے آئے ہوئے سب شعراء کو دعوت دی اور اس میں خاص طور پر مجھے مدعو کیا۔ جب میں نے جالب کے بارے میں بتایا تو اسے بھی خاص طور پر مدعو کیا۔ اگرچہ دعوت تو سب کے لئے تھی لیکن ہمارا تعلق چونکہ پنجاب سے تھا اس لئے انہوں نے ہمیں خصوصی طور پر مدعو کیا۔ اس کے علاوہ وہاں سے ایک پرچہ ''ملاپ'' نکلتا تھا۔ اس کے سٹاف کے ان سب ارکان کو بھی خصوصی طور پر مدعو کیا جو پنجاب سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھے اتنی عزت دی کہ یہ مشاعرہ اور یہ تقریب میرے لئے

یادگار بن گئے۔ انہوں نے حقیقی معنوں میں ہم وطن ہونے کا حق ادا کر دیا۔

وہ زمانہ کچھ ایسا تھا کہ سب ہی زیادہ پیتے تھے لیکن جالب صاحب کچھ زیادہ ہی پی جاتے تھے اور اس کے بعد ان کی شوخیاں سامنے آتی تھیں جو بعض اوقات حد سے بڑھی ہونے کی وجہ سے کچھ ناگوار ہو جاتی تھیں۔ میں نے بمبئی سے حیدر آباد کے لئے روانہ ہونے سے قبل ان سے کہا تھا کہ میں اور آپ ایک ساتھ تو رہیں گے لیکن اس شرط پر کہ میں آپ کے پینے کے معاملے میں باقاعدہ مداخلت کروں گا اور آپ پر سنسر لگاؤں گا کہ آپ کو کتنی پینی ہے۔ کہنے لگے کہ بالکل یہ تو ہونا ہی چاہیے۔

جب ہم حیدر آباد آ گئے تو انہوں نے میرے علاوہ تو جو کیا سو کیا۔ لیکن میری موجودگی میں بھی ایک واقعہ کیا۔ ہم ایک ریستوران میں بیٹھے تھے وہاں مرحوم شاعر شاہد صدیقی اور کچھ دوسرے لوگ بھی بیٹھے تھے۔ ہمارے درمیان دو پیگ کا معاہدہ تھا۔ ان کے دو پیگ پورے ہوئے تو اس دوران شاہد صدیقی اور ان کے ایک دو ساتھیوں نے جو دوسرے ٹیبل پر بیٹھے تھے انہیں حیدر آبادی انداز میں سلام کیا۔ یہ سلام کا جواب دینے کے ساتھ ہی خود بھی اٹھ کر ان کی میز پر چلے گئے۔ انہوں نے ایک اور پیگ دیا تو انہوں نے میری طرف دیکھا اور پھر وہ بھی اٹھا لیا۔

دو پیگ وہاں سے اور لگانے کے بعد انہوں نے اپنی غزل شروع کر دی۔ میں نے شاہد صاحب سے کہا کہ مولانا اب کام سے گئے۔ ان کی عادت تھی کہ جب زیادہ پی لیتے تھے تو جو غزل کی فرمائش کرتا اسے غزل سنانی شروع کر دیتے تھے۔ ہم چونکہ فارغ ہو چکے تھے اس لئے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے غزل ختم کی تو میں نے کہا کہ آیئے کہنے لگے آتا ہوں اور پھر ایک اور غزل شروع کر دی۔ جب یہ بھی ختم ہوئی تو میں نے کہا کہ اب تو آیئے۔ کہنے لگے کہ قتیل صاحب آپ بھی محتسب بن جاتے ہیں کبھی تو ہمیں کھلا رہنے دیجئے میں نے کہا اچھا بیٹے اس وقت سے تم کھلے ہو۔

شاہد صدیقی کچھ گرم ہونے لگے تو میں نے کہا کہ نہیں اب اسے آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ دل کا بہت اچھا آدمی ہے۔ بس یہی ایک کمزوری ہے کہ زیادہ پی لے تو یہ حال ہو

جاتا ہے۔ ہم نے جالب صاحب کو چھوڑا اور خود وہاں سے اٹھ کر ادھر گھومنے کے لئے چلے گئے۔ اب میں اور جالب ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ جب میں بارہ بجے شب کے قریب اپنے کمرے میں جا کر سو گیا تو یہ ابھی نہیں آئے تھے۔

چار بجے کے قریب کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے اٹھ کر دیکھا تو یہ جالب صاحب تھے۔ حلیہ ایسا تھا جیسے کسی نے بہت پیٹا ہو۔ انہوں نے آتے ہی میرے پاؤں پکڑ لئے۔ اپنے آپ کو بہت سی گالیاں دیں اور کہنے لگے کہ میں بہت ایسا ویسا ہوں' آپ کی بات نہیں مانتا اور نتیجہ برا نکلتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ ہوا کیا ہے۔ کہنے لگے کہ میں گانا سننے کے لئے چلا گیا تھا اور وہاں جا کر تھوڑی سی اور پی لی۔ گانا سنتے سنتے میں سو گیا۔ تین بجے کے قریب آنکھ کھلی تو وہاں سے نکل آیا۔ تانگے میں بیٹھ کر یہاں تک آیا ہوں اور جب پیسے دینے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو جیب خالی تھی' اس لئے جو آدمی باہر کھڑا ہے۔ پہلے تو اسے پیسے دیں۔ میں نے کہا کہ ظالم! پیسے تمہارے نہیں گئے بلکہ میرے گئے ہیں کیونکہ اب آگے کا سارا خرچ میرے ذمے ہوگا۔ چنانچہ اسے میں نے پیسے دیئے اور جالب صاحب سو گئے۔ مجھے اس واقعہ کا دکھ نہیں ہوا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ جہاں یہ جاتے ہیں وہاں یہ سب تو ہوتا ہے اور انہوں نے اپنے حسب حال یہ شعر ٹھیک کہا ہے کہ:

جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

لیکن اب اگر جالب صاحب کو دیکھیں تو وہ بہت ذمہ دار اور سلجھے ہوئے ہیں۔ ایسے ہے جیسے وہ کچا سونا تھا اور تجربات کی کٹھالی میں پڑ کے کندن بن گیا ہے۔ اس وقت تو وہ وہاں ہے جہاں اس کے کھاتے میں بہت سی قربانیاں اور اصول پرستیاں جمع ہیں اور وہ ایک رہنما کی حیثیت رکھتا ہے۔ خدا کرے کہ اس ملک میں اس کی جو شان ہے وہ برقرار رہے اور وہ کہیں اصول پرستی کی سیاست میں فلور کراسنگ کا شکار نہ ہو جائے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اس فلور کراسنگ کا شکار نہیں ہوگا۔

حیدر آباد کا یادگار مشاعرہ

جب ہم بمبئی سے روانہ ہو کر حیدر آباد ریلوے سٹیشن پر پہنچے ہی تھے تو ایک آدمی نے دور سے مجھے اشارہ کیا۔ میں نے حیدر آبادی شیروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس اس شخص کے بارے میں اندازہ کیا کہ وہ حیدر آباد کا کوئی مسلمان ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے تو وہ کہنے لگے کہ کیا آپ مسلمان ہیں اور پاکستان سے آئے ہیں۔ میں نے کہا ہاں تو کہنے لگے کہ میں آپ سے بات کرتے ہوئے شرمندہ ہوں۔ یہاں کے مسلمانوں کی حالت آپ خود دیکھ لیں گے۔ میں اتنا مجبور ہوں کہ رات سے فاقے میں تھا اور صبح صبح نکل کر ادھر آیا ہوں۔ آپ کو دیکھا ہے تو خیال آیا کہ آپ سے گزارش کروں کہ میری کچھ امداد کریں۔ آگے پھر اللہ مالک ہے۔ وہ بالکل سچا نظر آ رہا تھا چنانچہ جو کچھ میرے پاس تھا میں نے اسے دیا۔

یہاں سے پتا چلا کہ وہ حیدر آباد جہاں مسلمانوں کی بڑی شان و شوکت تھی، اب زوال کے اس نکتے پر پہنچ گیا ہے کہ مسلمان بہت تنگدست ہیں۔ انڈین حکومت کے تسلط کے بعد حیدر آباد میں اگرچہ اجتماعی اعتبار سے کچھ ترقیاں ہوئیں لیکن مسلمانوں کی حالت دیکھ کر حیرت ہوتی تھی لیکن اس میں قصور حیدر آباد کے عام مسلمانوں کا بھی نہیں تھا بلکہ یہ قصور نظام دکن کا تھا جس نے کوئی پلاننگ نہیں کی تھی اور رضا کار تحریک کے قاسم رضوی صاحب نے بھی تشدد کی تحریک چلا دی تھی اور یہ سمجھ کر کہ مسلمانوں کی حکومت ہے، وہ نظام کے بھی مخالف تھے اور ہندوؤں کے بھی۔

اس تحریک میں رضا کاروں نے ہندوؤں کو بہت تنگ کیا تھا چنانچہ نظام اور ہندو دونوں ہی چاہتے تھے کہ اس تحریک کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ اس تحریک کے نام پر جو انقلاب آیا اسے بہانہ بنا کر انڈین حکومت نے بھی مداخلت کی اور رضوی صاحب کے بہت سے رضا کار مارے گئے۔ ان رضا کاروں کی عجیب انداز سے ٹریننگ ہوئی تھی کہ یہ واقعی ٹینکوں کے آگے لیٹ گئے تھے۔ یہ ایک مذہبی جنون تھا جس کے بعد ہندوؤں نے جہاں جہاں مسلمانوں کو دیکھا انہیں نقصان پہنچایا۔ یہ اس تحریک ہی کا ردعمل تھا۔ اس لئے مسلمانوں کی حالت بڑی دگرگوں ہوگئی تھی البتہ نظام فیملی کا سلسلہ ابھی ویسا ہی تھا۔

نظام دکن کے بڑے صاحبزادے معظم جاہ نے شاعروں کی دعوت کی۔ یہ رات کا کھانا تھا اور ہم یہ کھانا آٹھ بجے کی بجائے زیادہ سے زیادہ دس بجے تک کھا سکتے تھے۔ لیکن گیارہ بج گئے اور کھانا نہ کھلایا گیا۔ میں نے پوچھا تو پتا چلا کہ ابھی تو وہ جاگے ہیں اور اب سرکار تیار ہو کر بلائیں گے کیونکہ وہ رات کا کھانا بارہ بجے کھاتے ہیں۔ ہمارے ذہن میں ان بڑے لوگوں کے بارے میں وہی خناس تھا۔ اس لئے میں نے کہا کہ اب اور انتظار نہیں ہوسکتا کیونکہ مجھے تو بہت بھوک لگی ہے۔ ویسے بھی ہم کوئی درباری نہیں ہیں۔

وہاں کے لوگ اس چیز کو ناپسند کرتے تھے کہ ہم نظام صاحب کے خلاف کوئی بات کہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ مسلمانوں کے حاکم نہیں بلکہ اپنی ذات کے اندر ذہنی اعتبار سے حاکم ہیں جبکہ مسلمان محکوم طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ نظام کے بیٹے کے بارے میں شکایت بھی سننا نہیں چاہتے تھے اور اس فیملی کی بڑی عزت کرتے تھے۔ میری باتیں سن کر دو چار اور شعراء بھی میرے ساتھ مل گئے تھے۔ ہم نے کہا کہ جو کھانا پکا ہوا ہے' آپ وہ اٹھا لائیے' جیسا بھی ہے ہم کھا لیں گے۔ پتا نہیں وہ کہاں سے کھانا لے کر آئے۔ ہم نے کوئی گیارہ بجے کے قریب یہ کھانا کھایا اور ان سے ملے بغیر واپس آ گئے۔

ہمیں اس بات کا کوئی افسوس نہیں ہوا کہ ہم نے معظم جاہ صاحب کے کھانے میں شرکت نہیں کی بلکہ بعد میں جب یہ پتا چلا کہ وہاں جاتے ہوئے کئی بار جھک کر سلام کرنا پڑتا ہے تو خوشی ہوئی کہ ہم ان سے ملے بغیر ہی واپس آ گئے۔ حیدر آباد کو زوال آ چکا ہے

لیکن نظام کے ٹھاٹھ اب بھی وہی تھے اور رعایا سے اب بھی انہی پرانے آداب کی توقع کی جاتی تھی۔

وہاں گھومے پھرے تو وہاں کا حیرت انگیز سالار جنگ میوزیم بھی دیکھا۔ نواب سالار جنگ بھی اسی طرح کے نواب تھے جیسے کہ نظام کے مقربین میں سے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ایک لحاظ سے باقی نوابوں سے مختلف تھے کہ یہ ایک بہت بڑے میوزیم کا خزانہ دے کر گئے تھے۔ یہ میوزیم ایک بہت بڑی عمارت پر مشتمل تھا اسے دیکھتے ہوئے آدمی تھک جاتا ہے۔ اس میوزیم میں دنیا کی ہر چیز موجود ہے اور اس میں موجود سب کچھ انہوں نے تنہا جمع کیا۔ اس لیے ایسے ایسے نادر مجسمے دیکھنے میں آئے کہ طبیعت خوش ہو گئی۔ انہی میں سے ایک مجسمہ مرمر کا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے یہ ابھی نہا کر پانی سے نکلا ہے اور اس کے کپڑے بھیگے ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک خشک مجسمہ تھا۔

اسی طرح میوزیم میں ایک شعبہ گھڑیوں کا تھا جس میں ناخن کے برابر گھڑی سے لے کر ہاتھی کے برابر گھڑی موجود تھی۔ ایک گھڑی ایسی بھی تھی جس میں سے ہر پندرہ منٹ کے بعد ایک آدمی ہاتھ میں ہتھوڑا لیے باہر نکلتا ہے اور گھنٹے پر ہتھوڑا مار کر ٹن ٹن کرتا ہے اور اس کے بعد واپس چلا جاتا ہے اور وہ دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ اس گھڑی کو دیکھنے کے لئے وہاں قطاریں بنی ہوئی تھیں اور بہت رش ہوتا تھا۔

میوزیم میں تصویروں کا بھی ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ دنیا کے دوسرے بہت سے مصوروں کے علاوہ ایک پوری دیوار چغتائی صاحب کی تصویروں سے بھری ہوئی تھی۔ غرض اس میوزیم میں بہت سی نادر چیزیں موجود تھیں۔ اب یہ میوزیم انڈیا گورنمنٹ کی تحویل میں ہے۔ یہ میوزیم اربوں روپوں کی مالیت کا ہے۔

وہاں کی یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ کی عمارت بھی پر شکوہ ہے۔ اس یونیورسٹی میں ساری زندگی اُردو کی ترویج کو مرکز بنا کر تعلیم دی جاتی رہی۔ مگر سچی بات یہ ہے مجھے وہاں کوئی بات اُردو کی ترویج کی نظر نہیں آئی۔ وہاں لوگ اتنا عرصہ تنخواہیں لے کر انگریزی زبان کی اصطلاحات کو اُردو میں ڈھالنے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ اصطلاحات وہیں کی وہیں

رہیں۔ بعض تراجم تو اتنے مشکل نظر آئے کہ اصل اصطلاح آسان نظر آئی۔

اس کے علاوہ کچھ اور عمارتیں' ادارے اور آثار ایسے نظر آئے جو ایک شخصی حکومت اور اس کے ہم مذہبوں کو حاصل مراعات کی عکاسی کر رہے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر رونا آتا تھا کیونکہ غربت کا اب یہ عالم ہو گیا تھا کہ مسلمان لڑکیوں کے لئے رشتے کا ملنا مشکل ہو گیا تھا۔ والدین کے پاس پیسے ہی نہیں ہوتے تھے کہ وہ لڑکیوں کی شادیاں کر سکیں۔ ان حالات میں ہمارے عرب بھائیوں نے اس صورتحال سے فائدہ اٹھایا۔ اب گزشتہ دس بارہ برسوں میں عربوں نے وہاں آنا شروع کیا۔

اس عرب شیخ کے ایجنٹ پہلے سے وہاں موجود ہوتے تھے اور چونکہ عربوں میں کثرتِ ازواج کوئی بری چیز نہیں' اس لئے وہ ایک خوبصورت لڑکی دیکھ کر اس کے والدین سے بات کرتا

۔ وہ ماں باپ کا حق مہر ادا کرتا اور لڑکی کو شادی کر کے ساتھ لے جاتا۔ پھر سال چھ مہینے کے بعد لڑکی کو طلاق دے کر واپس اس کے گھر بھیج دیتا۔

حیدر آباد کے مسلمانوں کی غربت اس نہج تک جا پہنچی کہ وہاں پر بیٹیاں قربانی کی بھینٹ چڑھیں۔ اب جب اُردو کا ہندوستان میں بہت زیادہ نام لیا جاتا ہے تو مجھے یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ جب طرح قومی تشخص کے نام پر انہوں نے انگریزی زبان کا بائیکاٹ کر کے نقصان اٹھایا اسی طرح اب یہ ہندی کا بائیکاٹ کر کے مزید نقصان اٹھائیں گے۔ کیونکہ اب ہندوستان کی بشمول حیدر آباد کے سرکاری زبان ہندی ہے۔ اس لئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرا نہ دے اور مسلمان بہت سا وقت اُردو پر لگا دیں۔ اور ہندی میں کمزور رہ جائیں اور بالآخر معاشی طور پر ایک بار پھر نقصان اٹھائیں۔ بہر حال یہ ان کا اپنا معاملہ ہے۔ اگر چہ دیکھنے کی حد تک اُردو کی خدمت بھی ہو رہی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی بچہ میٹرک پاس کر کے آئے گا تو وہ ہندی رسم الخط کو کیسے پڑھے گا۔

حیدر آباد میں مشاعرے کے بعد دوسرے روز میوزک پروگرام تھا جس میں اوشا کھنہ بھی شامل تھیں۔ اس پروگرام میں میوزک ڈائریکٹر اقبال قریشی بھی شامل تھے۔ جو بڑے اچھے گلوکار بھی تھے۔ اس زمانے میں میری ایک غزل ہندوستان اور پاکستان میں بہت مشہور تھی:

گرمیٔ حسرت ناکام سے جل جاتے ہیں
ہم چراغوں کی طرح شام سے جل جاتے ہیں

اوشا کھنہ نے یہ غزل سٹیج پر آ کر سنائی۔ میں نے اس غزل کی اور بہت درجنوں دھنیں سنی ہیں لیکن جو مزا اوشا کھنہ کی دھن اور آواز سن کر آیا' وہ اپنی جگہ ہے۔ اوشا نے یہ غزل گا کر ساری محفل کو لوٹ لیا۔ پھر جب ہم لوٹ کر بمبئی آئے تو وہاں آ کر میں نے جی بھر کر اوشا کی زبانی یہ غزل سنی۔ اب تو وہ کافی فلموں کا میوزک بھی دے رہی ہیں۔

اوشا کھنہ کی آواز میں یہ غزل گاتے ہوئے جو سوز تھا بعد میں اس کی وجہ بھی پتا چل گئی کہ ان کے اندر جنس مخالف کی طرف سے سوز دروں تھا۔ پھر ان کی فلم ساز' ہدایتکار ساون کمار سے شادی ہو گئی اور شادی کے بعد علیحدگی بھی ہو گئی۔ لیکن اب بھی جب میں اشتہارات دیکھتا ہوں تو یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ علیحدگی کے باوجود میاں کی فلموں میں بیوی کا میوزک ہوتا ہے۔

ابراہیم جلیس

میرے نزدیک حیدرآباد کا ذکر اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک میں اپنے عزیز ترین دوست مرحوم ابراہیم جلیس کا ذکر نہ کروں۔ ابراہیم جلیس ایک کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ جب وہ حیدرآباد میں تھے تو ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے۔ اس وقت نوجوان لکھنے والوں میں شوق تھا کہ وہ اپنی تحریروں میں کسی غریب' مزدور یا کسان کے بیٹے نظر آئیں اور طبقوں کے تضاد کی عکاسی کر سکیں۔ لیکن جلیس صاحب اس سے بھی کچھ آگے تھے۔ وہ اس زمانے میں جب اپنے دوستوں کو خط لکھتے تھے تو اس میں اپنی ذاتی زندگی کا نقشہ اصل زندگی سے ہٹ کر لکھتے تھے۔

ایک دوست کو انہوں نے خط میں لکھا کہ سینے میں درد ہو رہا ہے' کھانسی بھی ہے' خدا جانے کونسی بیماری ہے۔ اس کا تو اب بعد میں ہی پتا چلے گا لیکن اس وقت بارش نے بہت تنگ کر رکھا ہے۔ تیز بارش ہو رہی ہے اور مکان کی چھت ٹپک رہی ہے۔ اس کے نیچے ایک کونے میں بیٹھا میں تمہیں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ جبکہ صورتحال یہ تھی کہ جلیس صاحب بہت تنومند آدمی تھے۔ قد بھی اونچا تھا اور صحت اتنی اچھی تھی کہ اگر کسی کو تھپڑ مار دیں تو اس کا جبڑا توڑ دیں۔ اس طرح ان کا گھر بھی بہت خوبصورت تھا اور یہ ایک طرح سے رئیسوں کی حویلی تھی جس کی چھت سے بارش کے پانی کے ٹپکنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

اس زمانے میں قاسم رضوی صاحب نے رضا کاروں کی جو تحریک چلائی تھی اس سے بہت سے نوجوان گمراہ ہوئے تھے جن میں سے ایک ابراہیم جلیس بھی تھے۔ جلیس صاحب

نے حیدر آباد ریڈیو سے رضوی صاحب کی ہمنوائی شروع کر دی اور جب ریاست کا زوال ہو گیا تو وہ انڈیا سے ہوتے ہوئے پاکستان پہنچے۔ یہاں آ کر انہوں نے اپنی پہلی مشہور کتاب تقسیم کے بعد ''دو ملک ایک کہانی'' کے نام سے لکھی۔ اس سے پہلے وہ اور بھی عمدہ کتابیں لکھ چکے تھے جن میں ''چالیس کروڑ بھکاری''۔ ''زرد چہرے'' اور ''تکونا دیس'' شامل تھیں۔ ان کی یہ افسانوں کی کتابیں بہت مقبول ہوئی تھیں۔ لیکن پارٹیشن کے بعد لکھی گئی ان کی کتاب ''دو ملک ایک کہانی'' ایک طرح کا سفر نامہ تھا اور اس میں دونوں ملکوں کے حالات پر ایک تنقیدی نظر ڈالی گئی تھی۔

انہیں احساس ہوا کہ انہوں نے قاسم رضوی کی تحریک سے متاثر ہو کر جو کچھ کیا تھا وہ غلط تھا اور وہ خواہ مخواہ ایک رجعت پسندانہ فعل میں شریک ہو گئے تھے جس سے حیدر آباد کے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچا اور ان کا بہت قتل عام ہوا۔ چنانچہ انہوں نے یہاں آ کر ترقی پسند مصنفین کی انجمن میں پیش پیش رہ کر بہت کام کیا۔ وہ پہلے تو کافی عرصہ لاہور ہی میں رہ کر اپنی سرگرمیاں کرتے رہے اور بعد میں کراچی چلے گئے۔

ان کے علاوہ حیدر آباد میں روزنامہ ''ریاست'' کا کردار بھی قابل ذکر ہے۔ سہمے ہوئے مسلمانوں کا حوصلہ بندھانے میں اس پرچے نے بہت اہم رول ادا کیا۔ اس کے مالک نواب عابد علی خان تھے۔ وہ نواب تو تھے لیکن ان کا اپنے سٹاف اور دیگر ملنے والوں سے رویہ انتہائی دوستانہ اور برادرانہ تھا۔ وہ ایسے چشمہ فیض رکھنے والے آدمی تھے کہ جس کسی کا کام ہوتا یہی سمجھتے کہ یہ کام کرنا ان کا فرض ہے۔ چنانچہ اس اخبار سے انہوں نے جو کام کیا اور جس طرح اُردو کی خدمت کی وہ اب تک جاری ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس پرچے کے ایڈیٹر بھی جلیس صاحب کے بھائی ہیں اور اس پرچے میں ایک مدت سے کام کر رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو پورے پرچے کو انہی نے سنبھال رکھا ہے۔ اس کے علاوہ وہاں پر جو علمی و ادبی سرگرمیاں ہوتی ہیں ان میں بھی جلیس صاحب کے بھائی پیش پیش نظر آتے ہیں۔

میں حیدر آباد میں چار مرتبہ جا چکا ہوں۔ پہلی مرتبہ تو 1961ء میں ہی گیا تھا جس

وقت جالب صاحب بھی میرے ہمراہ تھے۔ اس کے کوئی دو سال بعد پھر گیا۔ آخری اور چوتھی بار میں 1980ء میں وہاں گیا۔ اس میں حسب معمول نواب عابد علی خان پیش پیش تھے۔ انہوں نے وہاں میرے ساتھ بہت قریبی رابطہ رکھا۔ پھر وہاں جو مشاعرہ ہوا میں اس کے انتظامات اور حاضری کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یہ مشاعرہ ٹکٹ سے منعقد کیا گیا تھا اس کے باوجود اس میں حاضری پندرہ سولہ ہزار سے کم نہیں تھی جس میں سے پانچ چھ ہزار کے قریب عورتیں تھیں۔ بے شک حیدر آباد میں اُردو کی تہذیب دم توڑ چکی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں پر اس تہذیب کا جو کھنڈر باقی ہے اس کی بھی اپنی ایک شان ہے۔

مشاعرے سے لطف اندوز ہونے کا جو سلیقہ میں نے حیدر آباد کے لوگوں میں دیکھا وہ کم ہی کہیں نظر آیا ہے۔ برمحل داد دینا برمحل ہوٹ کرنا اور برمحل جملہ بازی سے لطف اندوز ہونا یہ کوئی ان لوگوں سے سیکھے۔ اس مشاعرے میں ہندوستان کے بیشتر شعراء موجود تھے۔ پاکستان سے میں اور حمایت علی شاعر گئے ہوئے تھے۔ میری نظریں ایک شاعر کنول پرشاد کنول کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ ان کا ایک گیت پارٹیشن سے پہلے میں نے کسی رسالے میں پڑھا تھا:

دیکھ اڑتے پنچھیوں کو کیوں رے من ڈولتا ہے

اس کی زمین اور اس کا صوتی اثر مجھ پہ کچھ ایسا اثر کر گیا کہ یہ گیت میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ اس مشاعرے سے پہلے بھی میں ایک بار کنول صاحب سے مل چکا تھا لیکن حیدر آباد جاتے ہی اس بار بھی کنول صاحب سے ملنے کو بہت جی چاہا۔ میں انہیں بتانا یہ چاہتا تھا کہ آپ جو کچھ لکھ چکے ہیں اس سے میرا پیچھا چھڑائیں۔ میں تو اس مصرعے سے متاثر ہو کر دو تین چیزیں لکھ چکا ہوں اور اچھی چیزیں لکھ چکا ہوں لیکن یہ مصرع مجھے ہمیشہ Haunt کرتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ اس سے تاثر لے کر میں آگے بڑھتا چلا جاؤں۔ لیکن کنول پرشاد کنول سے ملاقات نہ ہو سکی۔

میں یہ باتیں کنول پرشاد کو نذرِ عقیدت پیش کرنے کے لئے کہہ رہا ہوں۔ بعض چیزیں بعض لوگوں سے ہو جاتی ہیں لیکن اس مصرع میں انہوں نے کوئی ایسی چیز کہی ہے جو

اب بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ انہوں نے اور بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ غزلیں بھی کہی ہیں لیکن اس ایک مصرعے میں میں نے اتنی چیزیں پنہاں دیکھی ہیں کہ یہ مصرع اب تک میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہا۔

اس مشاعرے میں پروفیسر مغنی تبسم سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ اس مشاعرے کے منتظمین میں سے تھے۔ اور ہمیں اپنی برادری کے لوگ سمجھ کر ہماری خدمت کرتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ پینے کے معاملے میں تھوڑی بد احتیاطی کر رہے تھے تو ایک دوست کی حیثیت سے میں نے انہیں ٹوکا۔ وہ ہنس دیئے اور پینا چھوڑ دیا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ کسی اور جگہ جا کر پی رہے ہیں۔ تو میں نے پوچھا کہ یہ ہمیشہ سے ایسے ہی کرتے آئے ہیں تو مجھے جواب ملا کہ نہیں۔ اصل میں جب سے ان کی اہلیہ فوت ہوئی ہیں تو یہ شدید تنہائی محسوس کرنے لگے ہیں اور اس تنہائی سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ذریعہ انہوں نے شراب کو بنا لیا ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے اور اس میں مداخلت ٹھیک نہیں ہے۔ زندگی کا ساتھی بچھڑ جائے تو ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہوئی کہ ایک دن نواب عابد علی خان صاحب کے گھر دعوت تھی۔ لوگ کھانے پر آئے' انہوں نے اس دن وہاں کے ایک بہت اچھے گویے مثل کے گانے کا انتظام بھی کیا ہوا تھا۔ انہوں نے خصوصاً میری ایک دو غزلیں گائیں۔ اس تقریب میں پروفیسر مغنی تبسم آ گئے وہ اس حالت میں تھے کہ انہیں اپنا ہوش نہیں تھا۔ وہ تھوڑی دیر محفل میں بیٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ ان کی حالت تشویشناک نظر آ رہی تھی۔

اس سے پہلے وہ مجھے کہہ چکے تھے کہ کل صبح چھ بجے کے جہاز سے مجھے دہلی جانا ہے اور کسی سرکاری معاملے میں میری وہاں مصروفیت ہے۔ جب حالت کچھ اور بھی بگڑی تو اس طرح باتیں کرنے لگے جیسے کوئی وصیت کر رہا ہو۔ ہم نے کہا کہ انہیں کسی ہسپتال میں پہنچائیے کہیں معاملہ زیادہ گڑبڑ ہو جائے۔ لیکن عابد علی خان صاحب کہنے لگے کہ آپ فکر نہ کیجئے یہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ انہوں نے پی بہت زیادہ لی ہے۔ بہر حال آپ اس واقعے کا انجام کل دیکھیں گے۔ محفل برخاست ہوئی تو ہم ہوٹل چلے گئے۔

اگلے دن عابد صاحب کے کوئی ایڈیٹر میرے پاس آئے۔ انہیں میرے پاس کسی اور سلسلے میں آنا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ پروفیسر مغنی تبسم صاحب کا کیا حال ہے۔ وہ کہنے لگے کہ کیوں انہیں کیا ہوا ہے۔ میں نے رات کی بات بتائی تو وہ ہنسنے لگے اور کہنے لگے کہ وہ تو دہلی پہنچ چکے ہیں اور اس وقت وہاں میٹنگ میں ہوں گے۔ مجھے یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی۔

عابد صاحب کے یہ ایڈیٹر میرے پاس اس سلسلے میں آئے تھے کہ جب میں پہلی بار 1961ء میں حیدرآباد آیا تھا تو میں نے ایک درزی سے شیروانی بنوائی تھی۔ اس درزی کے ہاں سے جگر صاحب' مجروح صاحب اور دوسرے سب جونیئر اور سینئر شاعر اکثر شیروانیاں بنوا چکے تھے۔ اس کی فٹنگ ایسی تھی کہ میں نے کبھی کسی اور شیروانی کی ایسی فٹنگ نہیں دیکھی.. مجھے اُسی روز واپس بھی روانہ ہونا تھا۔ چنانچہ میں نے رات کے مشاعرے میں عابد صاحب سے اس درزی کا ذکر کیا تھا تو انہوں نے بتایا تھا کہ اس کا نام جوبلی ٹیلرز ہے۔ اور اب وہ آدمی تو نہیں موجود البتہ اس کی اولاد موجود ہے۔ چنانچہ عابد صاحب نے صبح نو بجے اپنے اس آدمی کو میرے پاس بھیجا تھا۔

ہم بزاز کی دکان پر گئے۔ کپڑا پسند کیا اور یہ کپڑا دس بجے ٹیلر کو دیا۔ اس نے ناپ لیا۔ چار بجے مجھے روانہ ہونا تھا اور ٹھیک ساڑھے تین بجے وہ ٹیلر مجھے شیروانی پہنا کر رخصت ہوا۔ حالانکہ میں نے رات عابد صاحب سے کہا تھا کہ اتنی جلدی شیروانی نہیں بن سکتی لیکن اس سے عابد صاحب کے خلوص اور ان کے اثر و رسوخ کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جب میں بزاز کی دکان پر گیا اور پیسے دینے لگا تو اس نے پیسے نہ لیے اور کہا کہ ہمارا عابد صاحب سے لین دین ہے ہم خود ہی معاملہ کر لیں گے۔ درزی نے بھی یہی کہا۔ اس طرح عابد صاحب کی شاعروں کی پذیرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی فرز سے یہ شیروانی ایک طرح سے مجھے گفٹ کر دی۔

بھوپال کا مشاعرہ

سلیقے کے سامعین ایک تو حیدر آباد دکن کے مشاعرے میں ملے اور دوسرے بھوپال کے ایک مشاعرے میں۔ بھوپال ایک مسلم ریاست تھی اور مسلمان حکمرانوں کا ذوق تو رہا ہے کہ وہ شعر و موسیقی پر زیادہ توجہ دیتے رہے ہیں۔ ہندو راجے اور مہاراجے زیادہ تر پہلوانی اور موسیقی پر توجہ دیتے رہے ہیں لیکن شاعری کا ایک میدان ایسا تھا جہاں مسلمان حکمرانوں کی اجارہ داری تھی۔ جیسا بادشاہ ویسی رعایا کے مصداق بھوپال میں بھی مسلمان حکمرانوں کے زیر اثر لوگ شعری ذوق رکھتے تھے۔ نواب حمید اللہ خان علم و ادب اور سیاست میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ ان کے علم و ادب کی سرپرستی کے انداز علامہ اقبال کی کتابوں سے بھی ظاہر ہیں جنہوں نے ضرب کلیم ان کے نام منسوب کی اور ان کے شیش محل میں جہاں یہ مہمان ٹھہرائے گئے تھے' علامہ اقبال نے جو کچھ کہا اس کا حوالہ اپنی نظموں میں بھی دیا۔

میں نے بھوپال کے بارے میں بہت سی داستانیں سنی ہوئی تھیں اور تمنا تھی کہ میں بھی بھوپال دیکھوں۔ شاعری کی برکت سے مجھے یہ موقع بھی میسر آ گیا۔ اور جب بھوپال گئے تو پرانے دوستوں میں سے شعری بھوپالی ملے جن سے مختلف مشاعروں میں پہلے سے ملاقات ہو چکی تھی۔ میں بھوپال اور شعری بھوپالی کو لازم و ملزوم بھوپال کی پہچان سمجھتا تھا۔

پرچہ ''افکار'' پارٹیشن سے پہلے یہیں سے نکلتا تھا اور بعد میں کراچی منتقل ہو گیا۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے افکار کے پہلے شمارے سے لکھنا شروع کیا تھا چنانچہ یہ

چیزیں ذہن میں لے کر میں بھوپال پہنچا۔ پہلے تو وہاں کے دستور کے مطابق ہمیں شہر کی سیر کے لئے لے جایا گیا۔ شہر دیکھا اور اس کے خاص خاص محلات دیکھے۔ اس کے بعد مشاعرے کی رات آ گئی۔

اس مشاعرے کی صدارت باجپائی صاحب کر رہے تھے۔ ان کے بارے میں تاثر یہ پایا جاتا تھا کہ وہ اُردو کے حامی نہیں ہیں۔ میرے خیال میں انہوں نے اس مشاعرے کی صدارت اس لئے قبول کی تھی کیونکہ وہ اس تاثر کی تردید کرنا چاہتے تھے۔ یہ مشاعرہ جس جگہ ہوا اسے اقبال گراؤنڈ کا نام دیا گیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا گراؤنڈ تھا جس کے آس پاس عمارتیں ہیں۔ بیچ میں ایک گراؤنڈ ہے جس میں ہزاروں آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ اہتمام یہ کیا گیا تھا کہ شہر کے چار پانچ چوکوں میں سپیکر لگا دیئے گئے تھے۔ چنانچہ اس گراؤنڈ میں موجود ہزاروں آدمیوں کے علاوہ بے شمار لوگ ان چوکوں میں کھڑے ہو کر بھی مشاعرہ سن رہے تھے۔ یہ چیز وہاں کی جدت تھی اور ظاہر کر رہی تھی کہ یہ پورا شہر علم و ادب اور شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتا ہے ورنہ لاؤڈ سپیکر کا بے جا استعمال ہو تو لوگ احتجاج کرتے ہیں لیکن بھوپال میں یہ انتظام وہاں کے لوگوں کی فرمائش پر کیا گیا تھا۔

اس مشاعرے میں بھی کیفیت حیدرآباد دکن والی تھی اور باذوق سننے والے موجود تھے اور بے جا ہلڑ بازی نہیں تھی۔ اس مشاعرے سے پہلے وہاں ایک دعوت ہوئی چونکہ شرکاء میں ہندو اور مسلمانوں دونوں ہی موجود تھے اس لئے ملحق میزوں پر دو طرح کا کھانا رکھا گیا تھا۔ ایک ویجیٹرین کھانا تھا اور دوسرا نان ویجیٹرین۔ ہم گوشت خور لوگ زیادہ تر گوشت کی بنی ہوئی چیزیں پسند کرتے ہیں لیکن میں نے کہا کہ میں تو ویجیٹرین کھانا کھاؤں گا۔

جب میں اس میز پر پہنچا جو ویجیٹرین لوگوں کے لئے مختص تھا تو میں نے دیکھا کہ وہاں بھی کباب اور کوفتے وغیرہ پڑے ہیں۔ میں نے حیرت سے کہا کہ میں نے تو سبزی کھانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ لیکن یہاں تو دال کے علاوہ زیادہ تر چیزیں گوشت ہی کی ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ آپ کھا کر دیکھئے۔ میں نے چانپ اٹھائی تو دیکھا کہ وہ بینگن سے بنی ہوئی تھی۔ کوفتے دیکھے تو وہ پنیر کے تھے۔ کباب دیکھے تو وہ بھی کسی سبزی کے بنے ہوئے تھے مگر یہ سب کچھ ایسا لذیذ بنا ہوا تھا کہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

جب ایک بار جنرل ضیاء الحق انڈیا گئے تھے تو انہوں نے واپس آ کر کہا تھا کہ وہاں تو سبزیاں بہت اچھی پکتی ہیں اور یہاں پر لوگ نجانے ایسی سبزیاں کیوں نہیں پکاتے۔ میں جنرل ضیاء الحق کا یہ بیان پڑھ کر ہنسا اور تائید کی کیونکہ جب تک کوئی وہاں سے کسی سپیشل دعوت سے یہ سب کچھ کھا کر نہ آئے تو اسے یقین نہیں آ سکتا کہ سبزی اور دالوں سے اتنی اتنی لذیذ چیزیں بھی بن سکتی ہیں۔

حکیم نیئر واسطی کی بڑی اہلیہ نواب فیملی سے تھیں۔ میں ان کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا اور ان سے کہا تھا کہ مجھے بھی یہ سب کچھ سکھایئے تو انہوں نے کہا تھا کہ ہم لاہور آنے والے ہیں اور وہاں آپ کی بیگم کو سکھائیں گے لیکن کسی وجہ سے وہ یہاں نہ آ سکے مگر ہمیں ان کھانوں کا شوق اتنا تھا کہ جب میری بیوی اور بہو انڈیا گئیں تو انہوں نے وہاں سے یہ کھانے پکانے سیکھے اور اب یہ صورت ہے کہ ہمارے گھر میں بھی کسی ہندوستانی یا ہندو گھر سے کم ویجیٹرین چیزیں نہیں پکتیں اور ان کھانوں میں بھی ہم خود کفیل ہو گئے ہیں۔

مشاعروں کا ذکر چلا ہے تو ایک اور مشاعرہ یاد آ رہا ہے یعنی علی گڑھ کا مشاعرہ۔ یہ مشاعرہ بھی غالباً 1955 کا ہے۔ ہم دہلی کے کسی مشاعرے میں گئے ہوئے تھے تو کنور مہندر سنگھ بیدی کی معرفت ہمیں علی گڑھ کے مشاعرے میں بلوایا گیا۔ اس مشاعرے کی روایت ہے کہ لڑکے ذرا ذرا سی بات پر ہوٹ کرنے کے لئے تل جاتے ہیں اور بمشکل ہی کوئی ایسا موقع ہو گا کہ پورا مشاعرہ شروع سے آخر تک صحیح سلامت اور بغیر ہوٹنگ کے سن لیا گیا ہو۔

اس مشاعرے کے ذکر سے پہلے میں پاکپتن میں ہونے والے اس انڈو پاک مشاعرے کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو اس مشاعرے سے تقریباً چھ ماہ پہلے منعقد ہوا تھا اور جس میں کنور مہندر سنگھ بیدی اور انڈیا کے بہت سے دوسرے نامور شعراء نے بھی شرکت کی تھی۔ کنور صاحب سیاسی آدمی نہیں ہیں بلکہ ایک شاعر ہیں۔ اگرچہ شاعروں میں ایک حد تک نظریہ بھی ہوتا ہے لیکن اس مشاعرے میں جتنے شعراء نے بھی شرکت کی ان کا براہ راست سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پھر بھی کچھ لوگ وہاں ایسے بھی تھے جن کے غیر ضروری حب وطن نے غیر ضروری طور پر جوش مارا اور ایسے ہی ایک شخص نے کشمیر کے موضوع پر نظم

شروع کر دی۔ اس نظم کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور یہ محض مہمانوں کی دلآزاری کے لئے پڑھی جا رہی تھی۔ میں نے کھڑے ہو کر اس پر احتجاج کیا اور کہا کہ یہ سیاسی جلسہ نہیں ہے اور نہ اس میں شامل لوگ کشمیر کے جھگڑے میں شامل ہوئے ہیں۔ یہ ہمارے مہمان ہیں اور ہم نے انہیں ادبی نمائندوں کے طور پہ بلوایا ہے۔ چنانچہ میری مداخلت کے بعد صاحب صدر نے اس آدمی کو روک دیا۔ چنانچہ یہ مشاعرہ بخیر و خوبی انجام کو پہنچا۔

اب اس مشاعرے کے بعد جب علی گڑھ کا مشاعرہ ہوا تو اس میں بھی کچھ ایسی صورتحال پیش آ گئی۔ ایک تو وہاں کے سامعین پہلے ہی گلے پڑتے تھے اور پھر جب کسی نے مجھے دیکھا تو اسے بھی کشمیر یاد آ گیا اور اس کا حب وطن بھی اسی طرح جاگا جیسے کسی کا پاکستان میں جاگا تھا۔ اس نے کہا کہ جی میں ایک نظم قتیل صاحب کی نذر کرتا ہوں جس کا عنوان ہے ''کشمیر'' اس مشاعرے کی صدارت کنور مہندر سنگھ بیدی کر رہے تھے وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے کشمیر کے آگے بولنے نہیں دیا اور کہا کہ میں یہ نظم پڑھنے کی بالکل اجازت نہیں دوں گا۔ اس محفل کو ادبی محفل ہی رہنے دیجئے اور اسے سیاست میں مت گھسیٹئے۔ قتیل صاحب وہاں کے سیاسی لیڈر نہیں ہیں بلکہ شاعر ہیں۔ ان صاحب نے کہا کہ جی کیوں نہیں۔ یہ موضوع بھی ادب میں آتا ہے۔ اس پر کنور صاحب نے کہا کہ پھر میں صدارت نہیں کروں گا اور یہ مشاعرہ برخاست کر دیتے ہیں۔ چنانچہ پھر کہیں جا کر وہ صاحب باز آئے۔

میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر قوموں اور ملکوں کے درمیان اسی طرح صحیح سوچ رکھنے والے لوگ موجود ہوں تو کم از کم بعض مقامات پر تو ہم ایسی چیزوں کو روک سکتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ کسی شخص کا کوئی بھی نظریہ ہو سکتا ہے لیکن اس نظریے کے پرچار کے لئے میدان اور ہوتا ہے۔ ہر چیز اپنے اپنے میدان میں ہی اچھی لگتی ہے۔ اگر یہ سیاسی جلسے ہوتے تو کشمیر کے موضوع پر نظمیں ٹھیک تھیں مگر یہ ادبی محفلیں تھیں۔ اس لئے ادھر جو میں نے کہا وہ پسند کیا گیا اور ادھر جو کنور صاحب نے کیا اسے بھی پسند کیا گیا۔

اس واقعہ کے بعد یہ مشاعرہ ٹھیک طرح چلا اور سنتے ہیں کہ یہ مشاعرہ علی گڑھ کے ان ایک دو گنے چنے مشاعروں میں سے تھا جس میں ہونگ بھی نہیں ہوئی۔

مدراس اور کلکتہ کے مشاعرے

مدراس میں میں دوبار گیا۔ پہلی بار 1961ء میں میں وہاں گیا تھا جبکہ میں بمبئی گیا ہوا تھا تو مدراس سے مشاعرے کی دعوت آئی۔ جب میں وہاں گیا تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ پارٹیشن کو تھوڑا عرصہ گزرنے کے باوجود وہاں تعصبات قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اور وہاں کے مسلمان کھلے عام ترکی ٹوپی اور شیروانی پہنتے تھے اور ہندو مسلم فساد کے ڈر سے اپنی شخصیت کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے رسم ورواج پر عمل کرتے تھے اور یہی نہیں بلکہ مسلم لیگ بھی وہاں موجود تھی۔

جب یہاں سے احمد آباد گئے تو وہاں تو اس سے بھی زیادہ دیکھا اور دیکھا کہ مسلم لیگ کا دفتر کھلا ہے اور اس میں قائداعظم کی تصویر لگی ہوئی ہے۔ بہت حیرت ہوئی۔ پتا چلا کہ قائداعظم کے آباؤ اجداد احمد آباد ہی سے تھے اور مہاتما گاندھی کے آباؤ اجداد بھی وہاں کے ہی تھے۔ اس لئے وہاں پر مسلم لیگ کا دفتر یا قائداعظم کی تصویر کوئی ایسی بات نہ تھی۔ البتہ اب مسلم لیگ کا کردار وہ نہیں رہا تھا جو پارٹیشن سے پہلے تھا۔ اب اس میں تبدیلی آ چکی تھی۔

مدراس کا ایک اور واقعہ بھی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میری فلم ''قاتل'' والی غزل بہت مشہور تھی۔

الفت کی نئی منزل کو چلا
تو ڈال کے بانہیں بانہوں میں

مدراس کے مشاعرے میں جب میں اپنا کلام سن چکا تو دیکھا کہ لمبی لمبی ڈاڑھیوں والے دو آدمی میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ آپ سے ایک گزارش ہے۔ میں نے کہا فرمایئے۔ کہنے لگے کہ مشاعرے کے دوسرے دور میں آپ اپنی غزل ''الفت کی نئی منزل کو چلا'' سنائیں۔ میں نے ہزار سمجھایا کہ وہ فلم کی غزل ہے اور آپ مجھ سے یہ سن کر بہت بے مزہ ہوں گے۔ مگر وہ نا مانے اور کہنے لگے کہ ہمیں یہ غزل آپ کی زبان سے سننے کی بڑی تمنا ہے۔ چنانچہ خاص طور پر اس غزل کے لئے اناؤنسمنٹ ہوئی اور اس کی فرمائش کی گئی۔ میں نے تحت اللفظ یہ غزل پڑھی۔ اور اس پر مجھے جو داد ملی وہ نا قابل فراموش ہے۔ مجھ سے اس کا ایک ایک مصرع چار چار بار پڑھایا گیا اور پتا چلا کہ یہی وہ غزل تھی جس کی وجہ سے مجھے وہاں بلایا گیا تھا۔

وہیں سے ہم احمد آباد گئے جہاں پرانے مسلمان بادشاہوں کے آثار دیکھے اور پتھر کی جالیوں کا کام دیکھا جن کا جواب نہیں تھا۔ ایک مسجد میں بھی پتھر کی جالیاں دیکھیں۔ اس کے ایک مینار کے بارے میں مشہور تھا کہ اگر اسے اوپر سے دھکا دیا جائے تو ہلتا ہے۔ اس لئے اس مینار لرزاں بھی کہتے تھے۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ مینار سنگ لرزاں سے بنا ہوا ہے۔

ہمارے ساتھ مشہور خاتون سیدہ اختر حیدر آبادی تھیں جو خاکسار تحریک میں بھی کام کر چکی تھیں۔ انہیں خطیبۂ ہند بھی کہا جاتا تھا۔ وہ بہت موٹی تھیں۔ وہ کچھ انجمنوں کی عہدیدار تھیں اور مشاعروں اور دوسری تقاریب میں ہر جگہ آگے آگے رہتی تھیں۔ جب ہم مینار کے اوپر چڑھے تو یہ ذرا سا ہلتا ہوا نظر آیا۔ سیدہ اختر سے میرے بڑے اچھے مراسم تھے۔ وہ بنگلور کی رہنے والی تھیں اور مشاعرہ کرنا چاہتی تھیں۔ ان کے ساتھ میرے بہت تعلقات بن گئے تھے لیکن بعض اوقات ایک جملہ تعلقات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔

جب ہم مینار لرزاں سے نیچے اترے تو کہنے لگیں کے کہ دیکھا میں نے کہا تھا کہ یہ مینار ہلتا ہے۔ میں نے کہا بیگم اختر یہ مینار ہمارے ہلانے سے تو نہیں ہلا البتہ آپ کے اوپر جانے سے ہلا ہے۔ وہ یہ جملہ سننے کے بعد بالکل خاموش ہو گئیں اور اس کے بعد جتنا عرصہ

ہم ایک ساتھ رہے۔ انہوں نے بول چال بند رکھی اور بنگلور کا پروگرام بھی گول کر دیا۔

دراصل سیدہ اختر حیدر آبادی بہت موٹی تھیں اور خواہ مخواہ جی چاہتا تھا کہ ان سے کوئی شرارت کی جائے۔ اس وقت ہمارے ساتھ پاکستان سے سحاب قزلباش بھی تھیں۔ سیدہ اختر کے بال اتنے لمبے تھے کہ بلا مبالغہ ٹخنوں تک پہنچتے تھے اور کنگھی کر کے انہیں کھلا چھوڑتی تھیں۔ موٹی تو سحاب قزلباش بھی تھیں مگر یہ اچھی شکل وصورت والی تھیں۔ یہ کہنے لگیں کہ مجھے نظر آتا ہے کہ اختر کے بال مصنوعی ہیں۔ ہم نے کہا کہ نہیں مصنوعی بال اتنے زیادہ سنبھالے ہی نہیں جا سکتے۔ کہنے لگیں نہیں کسی طرح ان کے بال ٹیسٹ کر کے مجھے بتاؤ۔ جوانی کا زمانہ تھا اور شرارتیں کرنے کے دن تھے۔ جب ہم گاڑی میں بیٹھے تو وہ میرے ساتھ بیٹھی تھیں۔ میں نے عمداً یہ کیا کہ ان کے بیٹھتے ہوئے بال ذرا ادھر رکھ کے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا۔ بال اٹک گئے اور جب میں نے سیٹ بدلوانے کے لئے انہیں اٹھنے کو کہا تو چونکہ بال اٹکے ہوئے تھے اس لئے ان کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ بال کھنچنے سے انہیں تکلیف ہوئی۔ انہیں پتا نہیں تھا کہ میں نے یہ عمداً کیا ہے۔ لیکن سحاب قزلباش کے لئے تصدیق ہو گئی اور اب یہ محترمہ چین سے بیٹھیں۔ اگر انہیں پتا چل جاتا تو یقیناً اس روز ناراضی ہو جاتی۔ میں نے زندگی میں اتنے لمبے بال کسی کے نہیں دیکھے۔

اب ایک مشاعرہ کلکتے کا سن لیجئے۔ ہندوستان کے مشہور، خوش گو اور خوش گلو شاعر بیکل اتساہی پاکستان میں بھی آ چکے ہیں اور یہاں بھی مشاعرے لوٹ چکے ہیں، مشاعرے کے اچھے شاعر ہیں اور بڑے دھڑلے سے مشاعرے پڑھتے ہیں۔ میں 82ء میں جب بمبئی میں تھا تو مجھے ان کا فون آیا کہ کلکتہ میں میرا جشن منایا جا رہا ہے۔ میں نے آپ کی صدارت تجویز کی ہے۔ اس لئے آپ وقت نکال کر آیئے۔ کلکتہ نہیں دیکھا تھا، اس لئے میں نے ہامی بھر لی۔ چنانچہ ہم کلکتہ چلے گئے۔ وہاں جو مشاعرہ ہو رہا تھا اس کے سرپرست شہزادہ سلیم نامی ایک صاحب تھے جو مشاعرے کے اخراجات بھی اٹھا رہے تھے لیکن پیچھے سے چکوال کے رہنے والے تھے۔ وہ اپنی چکوال کی بولی نہیں بول سکتے تھے اور کلکتہ کے لہجے میں اُردو بولتے تھے۔

جب میں کلکتہ ایئر پورٹ پر پہنچا تو یہی مجھے لینے کے لئے آئے تھے۔ ان کے ساتھ کچھ دوسرے شعراء بھی تھے۔ جب ہم گاڑی میں بیٹھے تو ایک بارونق بازار میں سب سے پہلے تو یہ نظارا دیکھا کہ پانچ چھ سو عورتوں کا ایک جلوس گزر رہا تھا اور ان میں سے ایک دو لیڈر عورتیں مکے تان کر نعرے لگا رہی تھیں۔ میں نے کلکتہ آنے سے پہلے سنا ہوا تھا کہ یہاں کے لوگ بڑے AGITATORS ہیں چنانچہ جب یہی عورتوں کا جلوس دیکھا تو میں نے کہا کہ ٹھیک ہے کلکتہ کی پہلی جھلک تو دیکھ لی۔ تو وہ لطیفہ یاد آ گیا کہ ایک بار کلکتے میں مردوں کا جلوس نکلا اور یہ لوگ کہہ رہے تھے کہ بس کا کرایہ بڑھ گیا ہے اور ہمیں روز کا ایک آنہ فالتو دینا پڑے گا۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد عورتوں کا ایک جلوس نکلا کہ اب حکومت نے بس کا کرایہ کم کر دیا ہے اور اس طرح ہمارے خاوند کے پاس روزانہ ایک آنہ بچ جائے گا اور یوں ایک ماہ میں اس کے پاس جو دو روپے بچ جائیں گے وہ ان سے وسکی پیئے گا۔

اس بازار سے آگے پہنچے تو دیکھا کہ اتنا رش ہے کہ جیسے چونٹیاں ایک دوسرے سے ٹکرا کر گزر رہی ہوں۔ کلکتہ کے بارے میں یہ سچ لگا کہ واقعی یہ دنیا کا مصروف ترین اور اسی وجہ سے غلیظ ترین شہر ہے۔ یہاں سے ہو کر ہم اپنے ہوٹل میں پہنچے اور اس کے بعد سیر کا پروگرام بنا۔ مجھے شوق پیدا ہوا کہ فورٹ ولیم کالج دیکھا جائے۔ سوچا تھا کہ وہ زمین پر کھڑی ہوئی کوئی بہت بڑی عمارت ہو گی لیکن جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ یہ کالج تو سارے کا سارا زیر زمین ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو اس وقت کالج میں داخلے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ میں چونکہ دو دن کے لئے کلکتہ گیا تھا اس لئے پھر یہ کالج نہ دیکھ سکا اور دل میں یہ حسرت ہی رہی کہ یہ کالج بھی دیکھتا۔ بہرحال میں نے اپنے طور پر اس کالج کے بارے میں کچھ معلومات لیں۔

انہی داستانوں میں سے ایک داستان سبھاش چندر بوس کی تھی۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس نے انگریز سے بھی ٹکر لی اور کانگرس سے بھی۔ انگریز سے ٹکر لینے کی وجہ تو ظاہر تھی لیکن کانگرس سے اس لئے ٹکر لی کیونکہ وہ عدم تشدد کے قائل نہیں تھے اور کہتے تھے کہ طاقت کا

جواب طاقت سے دینا چاہیے۔ اس لئے وہ ہندوستان سے نکل کر جاپان جا پہنچے اور وہاں جا کر انہوں نے جاپانیوں کی مدد سے آزاد ہند فوج قائم کی جس میں ہندو سکھ' مسلمان اور عیسائی سبھی شامل تھے۔ جنرل شاہنواز اسی زمانے میں جنرل بنے۔ پھر آ کے وہ ہندوستان میں کانگرس میں شامل رہے۔ اگر چہ وہ کام کرتے بھی رہتے اور ان کے جہاز کو حادثہ پیش نہ آتا یعنی مر نہ بھی جاتے اور زندہ بھی رہتے تو جاپان کے ساتھ شکست تو ان کی بھی ہو جانی تھی لیکن اس سے پہلے ایک چیز نے ساری دنیا کو ہلا دیا کہ لوگ عدم تشدد ہی نہیں بلکہ تشدد کی پالیسی بھی سامنے رکھ کر لڑنے کے لئے تیار ہیں۔ اور انگریز سے نفرت اتنی بڑھ چکی ہے کہ لوگ اپنے ملک سے باہر نکل کر اور فوج بنا کر اپنی نفرت کا اظہار کر رہے ہیں۔

میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ جہاں جہاں ان کے ٹھکانے تھے میں جا کر وہ سب دیکھوں گا لیکن چونکہ کلکتہ میں قیام بہت مختصر تھا۔ اس لئے میں وہ ٹھکانے نہ دیکھ سکا۔ سبھاش چندر بوس کو وہ لوگ نیتا جی کہتے ہیں۔ انہوں نے گزرتے ہوئے بتایا کہ نیتا جی یہاں کیا کیا کرتے رہے۔ میں صرف ان کا مجسمہ ہی اچھی طرح دیکھ پایا جو ایک پارک میں لگا ہوا تھا۔ اور اس کے نیچے کچھ پھول پڑے ہوئے تھے کیونکہ جو بھی نیا آدمی آتا تھا وہ وہاں کچھ پھول رکھ جاتا تھا۔ میں نے بھی کچھ پھول لے جا کر ان پر نچھاور کئے میں سمجھتا ہوں کہ کلکتے کے سفر میں ایک مجاہد آزادی کے قدموں میں پھول رکھ دینا میرا حاصلِ سفر تھا۔

پونا کا مشاعرہ

بمبئی کے سفر میں میرے ذہن میں پونا بھی تھا۔ پونا بمبئی سے تقریباً ایک سو میل کے فاصلے پر واقع ہے اور پارٹیشن سے پہلے فلم انڈسٹری کا ایک یونٹ وہاں موجود تھا۔ میرے دوست اور مشہور فلم ڈائریکٹر ڈبلیو زیڈ احمد کا وہاں پر فلم سٹوڈیو بھی تھا۔ پونا میں انہوں نے صاحب علم و ادب لوگوں کو جمع کر رکھا تھا اور باقاعدہ ایک ٹیم بنا رکھی تھی۔ جس میں جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی اور مسعود پرویز وغیرہ شامل تھے۔ اس کے علاوہ جب کوئی شاعر یا پڑھنے لکھنے والا وہاں جاتا تھا تو وہ اس کی خدمت کرتے تھے اور کچھ حاصل کرتے تھے۔ اس لحاظ سے پونا بھی میرے ذہن میں تھا۔ ویسے بھی مجھے کہیں سے دعوت نامہ آتا ہے تو میرے لئے کشش کا باعث اس جگہ سے وابستہ کچھ یادیں ہوتی ہیں یا پھر اگر وہاں کوئی نادر چیز ہو تو اس جگہ کے لئے کشش محسوس ہوتی ہے۔

چنانچہ پونا کا دعوت نامہ ملا تو ذہن میں تھا کہ وہاں جا کر وہ سٹوڈیو دیکھوں گا جہاں ''من کی جیت'' اور ''الک رات'' جیسی فلمیں ڈبلیو زیڈ احمد نے بنائی تھیں۔ میرے ساتھ میرے دوست اندیور بھی تھے۔ یہ 1961ء کی واقعہ ہے۔ ہم نے وہاں مشاعرہ بھی پڑھا۔ وہاں داد دینے کا انداز وہ نہیں تھا جو دوسرے شہروں میں تھا۔ وہاں داد دینے کا یہ انداز تھا کہ جب شاعر کلام سنانے کے لئے سٹیج پر آتا تو تالی بجا دی جاتی اور جب وہ واپس جانے لگتا تو پھر تالی بجا دی جاتی۔ میری بیوی اور بچہ بھی ساتھ تھے۔

مشاعرے کے اختتام پر انہوں نے میری عزت افزائی یوں کی کہ صدر مشاعرہ اٹھے

اور کہا کہ جو کلام پڑھا گیا اس میں سب سے اچھا کلام قتیل صاحب کا رہا اور وہ اس مقابلے میں جیت گئے۔ اس لئے ہم انہیں اس جیت پر ایک کپ' ان کی بیوی کو ساڑھی اور ان کے بچے کو کھلونا دیتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ چیزیں ہمیں دیں اور ہم خوب تالیوں کی گونج میں وہاں سے واپس آ گئے اور دوسرے دن وہ سٹوڈیو دیکھا جس میں اتنی اچھی فلمیں بنی تھیں۔

انڈیا کے اسی ٹور میں لدھیانہ کے ایک مشاعرے میں بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ لدھیانہ ساحر کا گھر ہے اور ساحر لدھیانوی خود بھی اس مشاعرے میں موجود تھا۔ ساحر کے بچپن کے دوست اور نئے جاننے والے بھی اس مشاعرے میں موجود تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ ساحر عوام کا محبوب شاعر تھا۔ ساحر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ Teenagers کا شاعر تھا لیکن اس سے بطور شاعر اس کی مقبولیت اور حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ اس عمر کے لوگ بھی تو ہمیشہ یہی رہیں گے۔ یہ ایک جملہ معترضہ ہے۔ اس وقت کے اس مشاعرے کی طرف لوٹتا ہوں۔

ہم مشاعرے سے پہلے ایک دوسرے کو مجاز کے لطیفے سنا رہے تھے۔ ایک مشاعرے کا لطیفہ یہ ہوا کہ کچھ عورتیں اور بچے بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ مجاز کلام پڑھ رہے تھے تو اچانک ایک بچہ رونے لگا۔ مجاز بڑے جملہ باز تھے انہوں نے فوراً مائیک سے کہا:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

اس بات پر وہاں بڑا قہقہہ پڑا۔ یہ لطیفہ ہو چکا تھا اور جب ہم مشاعرے میں پہنچے تو میرے ساتھ میری بیوی اور بیٹا تھے۔ یہ اس وقت سامعین میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں جب کلام سنانے کے لئے سٹیج پر گیا تو نیچے سے میرے بیٹے نوید نے جس کی عمر کوئی چار سال تھی آواز دی "اباجی"۔ اب بجائے اس کے کہ کوئی نقش فریادی والی بات کرے' میں نے خود ہی ساحر کو مخاطب کر کے کہہ دیا:

نقش فریادی ہے میری شوخی تحریر کا

لوگ سمجھ گئے اور بہت محظوظ ہوئے۔

1985ء میں سہارن پور میں ایک مشاعرہ ہوا تو لکڑی کا کام کرنے والی ایک فرم کے صاحبان اختیار میری شاعری کے دلدادہ تھے۔ اب بھی وہ لکڑی کی بنی ہوئی کوئی چیز تحفہ کے طور پر میرے لئے بھیج دیتے تھے۔ اس مشاعرہ میں شرکت کے لئے ہم گئے تو انہوں نے پوچھا کہ آپ ہمارے پاس آئیں گے۔ میرے جواب دینے سے پہلے ہی یہاں پاکستان سے گئی ہوئی ایک شاعرہ بسمل صابری نے کہا کہ ہاں جی بالکل ہم آئیں گے۔ اب نہ میں اس شاعرہ کو کچھ کہہ سکا اور نہ ہی مدعو کرنے والے افراد کو۔ خیر وقت مقررہ پر میں نے دیکھا کہ وہ خاتون وہاں موجود نہیں تھیں۔ میں نے شکر ادا کیا اور حسب وعدہ خود اس فرم میں چلا گیا۔ جب وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہ خاتون پہلے ہی سے وہاں موجود تھیں اور اپنی پسند کی بہت سی چیزیں پہلے ہی ایک پارسل کی شکل میں پیک کروا چکی تھیں۔ میں گیا تو مجھے دیکھ کر ہنسنے لگیں۔

وہ صاحب مجھے کہنے لگے کہ آپ بھی کچھ چیزیں پسند کر لیجئے۔ میں نے کہا کہ شاعرہ جو چیزیں پسند کر چکی ہیں وہی ہمارے لئے کافی ہیں اور ہم آپس میں بانٹ لیں گے۔ میں نے سوچا کہ اس خاتون کو تھوڑا سا نقصان پہنچایا جائے۔ چنانچہ وہاں آ کر میں نے اس خاتون سے کہا کہ نکالو میرے حصے کی آدھی چیزیں۔ وہ ذرا کسمسائی لیکن میں نے کہا کہ تمہیں وہاں کس نے بلایا تھا اس لئے اب آدھی چیزیں نکالو۔

اسی سال امرتسر میں بھی ایک مشاعرہ ہوا تھا اور میرے بمبئی کے قیام کے دوران اس مشاعرے کے منتظمین نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ایک تو خود امرتسر کے مشاعرے میں پاکستان واپسی پر شرکت کروں اور دوسرے پاکستان سے بھی جن شاعروں کو چاہوں بلوا لوں۔ انہوں نے بسمل صابری کو بلوانے کے لئے کہا تھا۔ مشاعرے میں ہم نے شرکت کی تو سردار صاحبان وہی لئے بیٹھے ہوئے تھے۔ جب لڑکی سٹیج پر آئی تو نعرے تو اسی وقت لگ گئے۔ اس کے بعد کلام سنا تو اس کی داد بھی اچھی تھی اس لئے دوبارہ سہ بارہ بھی انہیں سنا گیا۔ وہ مشاعرہ خیریت سے گزرا تو ہم آ گئے۔

لطیفہ یہاں سے بنا کہ کوئی تین ماہ بعد اسی انجمن کا ایک خط آیا اور انہوں نے پرانے مشاعرے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا کہ ہم اب ایک اور مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں جس کے شعراء کی فہرست منسلک ہے۔ میں نے فہرست دیکھی تو اس میں فیض احمد فیض' احمد ندیم قاسمی' قتیل شفائی اور دوسرے شعراء کے نام تھے اور آخر میں بسمل صابری کا نام لکھا ہوا تھا۔ ناموں کے آگے انجمن نے جو معاوضہ منظور کیا وہ درج تھا۔ فیض صاحب کا معاوضہ آٹھ سو روپے تھا اس طرح سب شاعروں کا بشمول میرے معاوضہ بھی اتنا ہی درج تھا لیکن آخر میں بسمل صابری کے نام کے آگے معاوضہ بارہ سو روپے لکھا ہوا تھا۔ ہم یہ خط پڑھ کر بہت ہنسے۔ اس سے بڑا لطیفہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

کسی زمانے میں جالندھر میں پاکستان کا ایک قونصل خانہ ہوتا تھا۔ چودہ اگست آیا تو انہوں نے سرکاری طور پر لکھا کہ پاکستان کے شعراء یہاں آئیں کیونکہ ہم قومی دن کے موقع پر ایک مشاعرہ منعقد کرنا چاہتے ہیں۔ لینا دینا ظاہر ہے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہی فی سبیل اللہ والا معاملہ جو اکثر ہی شاعروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ سرکاری ملازمین اس دن کی اپنی تنخواہ نہ لیں۔ ان کی تنخواہیں اور الاؤنس تو چل رہے ہوتے ہیں بلکہ وہ مشاعرہ منعقد کرنے کا فنڈ بھی آدھا کھا جاتے ہیں تو اس قومی خدمت کے لئے لاہور سے شاعروں کی ایک بس بھری گئی۔ جس میں بیٹھ کر ہم سب جالندھر پاکستان قونصل خانے میں چلے گئے۔

وہاں قونصل خانے کے سربراہ عبدالرحمان صاحب نامی ایک صاحب تھے۔ جب ہم وہاں گئے تو ہمارے اس قافلے میں عبدالمجید سالک' صوفی تبسم' احمد ندیم قاسمی' سید عابد علی عابد' ناصر کاظمی اور بہت سے دوسرے شعراء شامل تھے۔ یہ سب معزز اور گنے چنے ہوئے لوگ تھے اور گھروں سے ہی کھاتے پیتے تھے۔ ہمارے کھانے پینے کا انتظام انتہائی ناقص کیا گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ جب ہم نے نہانے کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے کہا کہ باہر کنویں پر جا کر نہا لیں۔ میں ان دنوں میں خاصا تیز ہوتا تھا میں نے کہا کہ کیوں غسل خانے کو کیا ہو گیا ہے۔ تو کہنے لگے کہ وہاں صاحب کے ایک مہمان نہا رہے ہیں۔ میں نے

کہا کہ یہ سب لوگ تمہارے صاحب کے سائلان آئے ہوئے ہیں۔ تم انہیں جانتے ہو کہ یہ سب کتنے مرتبے والے ہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ تم صاحب کو یہاں بلا کر لاؤ۔ وہ کہنے لگا کہ صاحب تو اس وقت سو رہے ہیں۔ سالک صاحب بہت بردبار آدمی تھے۔ انہوں نے کہا کہ چلو یار چھوڑو۔ ہم تو قومی کام کے لئے یہاں آئے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو احساس نہیں ہے تو چلو چھوڑو۔

شام کا کھانا آیا تو انہوں نے سبزی' دال اور تھوڑا سا بکرے کا گوشت پکایا ہوا تھا۔ ان لوگوں کے پاس سرکاری اخراجات کے لئے بے پناہ فنڈ ہوتے ہیں لیکن یہ کھانا دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی اور کھانے کے ساتھ کوئی میٹھی چیز نہیں تھی۔ اسی دوران قونصل خانے کے سربراہ عبدالرحمان صاحب بھی وہاں آ گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ ہمیں معلوم ہے کہ ذبیحہ گاؤ یہاں ممنوع ہے۔ لیکن کیا ذبیحہ مرغ بھی یہاں ممنوع ہے۔ کہنے لگے کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ میں تو یہی دیکھ رہا ہوں کہ یہ بھی ممنوع ہے کیونکہ جو کھانا ہمیں دیا گیا ہے اس میں تو یہ موجود نہیں۔ کہنے لگے کہ اچھا تو آپ مرغ کھانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ جناب ہم اپنے گھر میں مرغ ہی کھاتے ہیں ویسے بھی جب کوئی مہمان آئے تو اسے دال اور بھات نہیں کھلایا کرتے اور پھر کھانے کے ساتھ ایک میٹھا بھی ہوتا ہے۔ میں نے انہیں بہت شرمندہ کیا۔ وہ کھسیانے ہو کر وہاں سے گئے۔

سالک صاحب نے ان کے جانے کے بعد کہا کہ شاباش قتیل تم نے ہمارا دل خوش کر دیا ہے۔ ہم پرانی قسم کے وضعدار لوگ ہیں اور بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ہم میں یہ کہنے کی ہمت نہیں رہی۔ تم نے بجا طور پر سچائی کا اظہار کر دیا ہے۔ یہ تو ایک نوجوانوں کی سی شوخی کا راستہ ہے۔ اب آپ بوڑھوں کا وضعداری دیکھئے۔

یہ وہی زمانہ تھا جبکہ وسکی پی جاتی تھی۔ شاعر ہر مشاعرے میں پیتے تھے۔ وسکی کا انتظام وہاں پر ہمارے جالندھر کے دوستوں نے کیا تھا۔ سب شاعر حضرات وسکی پی رہے تھے۔ صرف سالک صاحب نہیں پی رہے تھے باقی جتنے شاعر وہاں پر موجود تھے سب پینے والے تھے۔ سالک صاحب وہاں بیٹھے شراب کے بارے میں لطیفے سنا رہے تھے۔ سب

نے ان سے کہا کہ آپ لطیفہ وغیرہ بعد میں سنایئے۔ پہلے آپ ہمارے ساتھ وسکی پیجئے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے کبھی شراب نہیں پی۔ ویسے تم لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہوں اور تمہیں بھی بنا کر دیتا ہوں۔ لیکن سب لوگ بضد رہے کہ آج تو آپ کو ہمارے ساتھ پینا ہی پڑے گی ورنہ ہم بھی نہیں پئیں گے۔ صوفی تبسم اور عابد علی عابد نے بھی ان سے کہا کہ پی بھی لو یار۔ ہم سب نے انہیں اتنا مجبور کر دیا کہ انہوں نے بھی کوارٹر پیگ وسکی ڈال کر اس کو سوڈا واٹر سے بھر لیا۔ باقی سب لوگ تو تیز پیتے رہے لیکن یہ بھی تھوڑی تھوڑی کر کے پیتے رہے اور ساتھ ساتھ لطیفہ بھی سناتے رہے۔ ایسے وضعدار بزرگ آج کہاں ملیں گے۔ یعنی انہوں نے دوسروں کا دل رکھنے کے لئے وہ کام بھی کر لیا جو انہوں نے زندگی بھر کبھی نہیں کیا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ کام انہوں نے کراہت ہی سے کیا ہوگا۔ جب اٹھے تو یہ لطیفہ کیا کہ اپنے ساتھ والے آدمی کو ایک ہلکا سا تھپڑ مار کر کہنے لگے کہ میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ اب میں نشے میں آ گیا ہوں اور صوفی! اب تم بھی میرے سامنے نہ آنا کیونکہ میں نشے میں ہوں اور تمہیں بھی ماروں گا۔

یہاں سید عابد علی عابد کا ذکر آیا ہے۔ میں نے اتنے کھلے دل کے اور اتنے صاحب علم لوگ بہت کم دیکھے ہیں۔ کھلے دل کے اس طرح کہ اگر آپ ان کے پاس چلے گئے ہیں اور آپ کا ان سے کوئی تعلق ہے یا نہیں اور آپ ان سے کوئی چیز پوچھ لیتے ہیں تو وہ اپنی تمام مصروفیات میں سے وقت نکال کر اپنا یہ فرض سمجھ لیتے تھے کہ ان کے پاس اس بارے میں جو علم ہے وہ آپ کو دے کر ہی رخصت کریں۔ گفتگو کا ایسا میٹھا سلیقہ تھا کہ وہ سننے والے کی سطح پر آ کر بات کرتے تھے۔ وہ آج کی تنقید کی زبان سے بہت دور تھا۔ اگر ان کے سامنے کوئی عالم بیٹھا ہوتا تو اسی سطح کی بات کرتے لیکن اگر ان کے سامنے کوئی طالب علم بیٹھا ہوتا تو وہ اس کی ذہنی سطح کے مطابق انتہائی سلیس زبان میں بات کرتے تھے۔ میں جب بھی ان کے پاس گیا ہوں تو وہاں سے اٹھتے وقت مجھے محسوس ہوا کہ آج میرے علم میں اضافہ ہوا ہے اور جیسے میں یہاں آنے سے پہلے بے علم تھا اور اب کسی فرشتے نے میرے اندر یہ سارا علم جذب کر دیا ہے۔

یہ نہیں کہ انہیں صرف شاعری اور ڈرامے پر ہی قدرت حاصل تھی بلکہ موسیقی کے بارے میں انہیں علمی اور عملی سطح پر جتنا عبور حاصل تھا' وہ بہت کم ہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ میں ایک بار اپنی کتاب ''مطربہ'' لے کر ان کے پاس گیا۔ یہ طوائف کے موضوع پر ہے اور مجھے قبل ازیں اس کتاب پر انعام بھی مل چکا تھا مگر اس کتاب کے آغاز میں دیباچہ کوئی نہیں تھا۔ مجھے خیال گزرا کہ میں اس عالم سے اس کا دیباچہ لکھواؤں۔ پھر ذہن میں یہ بھی تھا کہ جب اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ ہوگا تو یہ دیباچہ طوائف کے بارے میں اچھا تعارفی مضمون ہوگا۔ میں اس سے پہلے عابد صاحب سے بات کر چکا تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ میں خود نہیں لکھ کر دے سکوں گا۔ اس لئے کسی ایسے آدمی کو ساتھ لاؤ جو تیز لکھتا ہو اور جسے میں دیباچہ Dictate کرا سکوں۔

ارشاد حسین کاظمی میرا جونیئر دوست تھا اور لکھتا بھی تیز تھا۔ وقت بھی اس کے پاس تھا۔ میں اسے ساتھ لے کر ایک دن عابد صاحب کے پاس چلا گیا۔ عابد صاحب نے اسے کاغذ اور قلم پکڑایا اور ایک ڈیڑھ گھنٹہ لگا کر طوائف کا پورا پس منظر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ دیباچہ بھی لکھوا دیا۔ جب ہم واپس آنے لگے تو میں نے دیکھا کہ ارشاد حسین کاظمی کا لکھا ہوا مجھ سے نہیں پڑھا جا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ یہ رف کاغذ مجھے دے دو۔ میں صاف لکھ لوں گا۔ لیکن اس کی لکھائی مجھ سے پڑھی نہیں جا رہی تھی۔ پھر وہ کہنے لگا کہ آپ یہ میرے پاس چھوڑ دیں میں سب کچھ صبح لکھ کر آپ کو لا دوں گا۔ وہ جتنا لائق اور جتنی خوبیوں کا مالک ہے اتنا ہی غیر ذمہ دار بھی ہے۔ غیر ذمہ داری ایسا ہے کہ اور کسی کا اتنا نقصان نہیں ہوتا بلکہ اس کا اپنا زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ لیکن اس معاملے میں مجھے جو نقصان پہنچا وہ ناقابل تلافی ہے۔ اس واقعہ کو جب دس پندرہ دن گزر گئے تو میں نے اس سے پوچھا تو کہنے لگا کہ میں نے تھوڑا سا کر لیا ہے اور تھوڑا سا باقی ہے۔ اسی طرح تقریباً دو ماہ گزر گئے۔ میں نے اس سے پھر کہا کہ اب کتاب کا دوسرا ایڈیشن آنے والا ہے۔ اس لئے مجھے اب وہ دیباچہ دے دو۔ کہنے لگا کہ اچھا میں لے کر آؤں گا۔ خیر ایک دن وہ چار صفحے ہاتھ میں پکڑے ہوئے آ گیا اور کہنے لگا کہ باقی چالیس صفحوں کا مجھے کچھ پتا ہی نہیں کہ

کہاں گئے۔ میں یہ سن کر سر پیٹ کر رہ گیا۔ یہ چار صفحے وہی ہیں جن میں انہوں نے میرے بارے میں اور میرے کلام کے بارے میں تعریفی کلمات کہے ہیں اور میں یہ کبھی کبھی تبرکاً استعمال کر لیتا ہوں۔ لیکن جو اصل دیباچے کے چالیس صفحات تھے وہ ایک بیوقوف اور غیر ذمہ دار دوست کی وجہ سے کھو گئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ زندگی میں میری ایک بہت قیمتی چیز ایک ایسے دوست کی وجہ سے کھو گئی ہے۔

قتیل شفائی نمبر

1979ء میں جب میں بمبئی میں تھا اور رسالہ ''فن اور شخصیت'' کا قتیل شفائی نمبر پریس میں تھا تو اس زمانے میں اداکار، فلمساز اور ہدایت کار سنیل دت نے ایک تجویز سے اتفاق کیا کہ رسالہ ''فن اور شخصیت'' کے لئے ایک بینیفٹ مشاعرہ کیا جائے۔ یہ مشاعرہ اندور میں رکھا گیا کیونکہ وہاں کچھ لوگوں نے سنیل دت صاحب کو ویسے بھی بلا رکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ کام اور مشاعرہ دونوں ایک ساتھ ہو جائیں گے۔

سنیل دت ایک بہت سوشل آدمی ہیں اور رفاہی کاموں میں آگے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ انہیں اُردو سے اس لئے بہت گہرا لگاؤ ہے کیونکہ وہ بنیادی طور پر جہلم کے رہنے والے تھے اور ان کا بچپن اُردو ہی کے ماحول میں گزرا تھا۔ وہ پارٹیشن کے بعد انڈیا میں گئے تو پھر بھی ان کا زیادہ تر کام کاج اُردو ہی میں رہا۔ وہ بی ایس سی پاس اور صاحب علم و بصیرت آدمی تھے۔ پھر ''فن اور شخصیت'' کے مالک و مدیر صابر دت صاحب سے ان کی برادری بھی بنتی ہے اور سنیل دت چاہتے تھے کہ ان کی کچھ مدد بھی ہو جائے۔ چنانچہ طے پایا کہ مشاعرہ اندور میں ہوگا۔

یوں تو وہ آل انڈیا مشاعرہ تھا لیکن میری موجودگی سے اسے انڈو پاک مشاعرہ بنا دیا گیا۔ حسب پروگرام سب لوگ اندور میں پہنچے۔ مشاعرہ تو خیر ٹھاٹھ کا ہونا ہی تھا اور ہوا بھی لیکن بہت سی دوسری دلچسپ چیزیں بھی اندور جا کر سامنے آئیں۔ سب سے بڑے گلوکار امیر خان اور موسیقار رئیس خان دونوں اندور ہی سے تھے۔ گویا کہ گویوں کا ایک پورا

خاندان اندور سے متعلق ہے۔ ادھر پٹیالہ گھرانا مشہور ہے۔ اسی طرح موسیقی کا اندور گھرانا بھی پاک و ہند میں مشہور ہے۔ اس کے علاوہ روپ متی باز بہادر کی مشہور داستان بھی اسی علاقے سے متعلق ہے۔ چنانچہ طے پایا کہ وہاں کچھ ایسے مقامات دیکھے جائیں جن کی کچھ تاریخی حیثیت ہو۔

سنیل دت صاحب اور ان کے پرستاران گاڑیوں میں بیٹھ کر ہمارے ساتھ وہاں سے آئے۔ ایک قصبہ ماندو پہنچے جہاں ایک پرانا قلعہ ہے وہاں کچھ پرانے آثار موجود تھے۔ ایک طرف تو باز بہادر کا محل تھا۔ اس سے کچھ دور دوسری طرف روپ متی کا مزار تھا۔ باز بہادر اور روپ متی کی کہانی کچھ یوں ہے کہ روپ متی ایک ہندو شہزادی تھی۔ باز بہادر ایک مسلمان بادشاہ تھا۔ دونوں ہی میں قدر مشترک موسیقی تھی۔ دونوں موسیقی کے دلدادہ تھے۔ دونوں کی اس حوالے سے قربت ہوئی اور پھر شادی ہوئی۔ لیکن اس کا انجام ٹریجڈی پر ختم ہوا۔ ہم ایک محل کے اوپر گئے اور وہاں سے دوسرے محل کو مختلف زاویوں سے دیکھا اور تصور میں ہم سب تاریخ کے اس دور میں پہنچ گئے۔ ہم میں سے ہر شخص نے اپنے آپ کو باز بہادر اور اس طرف روپ متی کو موجود پایا۔

ہم نے گائیڈ سے تفصیل کے ساتھ یہ کہانی سنی۔ یہ کہانی وہاں کے بچے بچے کو ازبر یاد ہے۔ حالانکہ دونوں الگ الگ مذہبوں سے تھے اور وہاں پر ہندو اور مسلمان دونوں طرح کے لوگ موجود تھے۔ لیکن اس کہانی کے بارے میں ہم نے ہندو یا مسلمان کسی میں بھی اختلاف رائے نہیں پایا۔ شاید اس کہانی کو روحانیت میں بھی لے جایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے Artisitc معنوں میں بھی لیا جاتا ہے۔ کیونکہ دونوں کے درمیان موسیقی کا پل تھا۔ وہاں کے لوگ جن میں اکثریت ہندوؤں کی ہے اس داستان کو فخر کے ساتھ بیان کرتے تھے۔

ہم نے وہاں بادشاہ کے محل کے علاوہ رانیوں کی آرام گاہیں اور تالاب بھی دیکھے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ کسی راجہ کی داستان سنائی جاتی ہے کہ اس کی بہت سی رانیاں تھیں۔ وہاں پر برگد کا ایک بہت بڑا درخت تھا' دن کے وقت وہاں چمگادڑیں الٹی لٹک

رہی تھیں۔ اس کے بارے میں مشہور یہ تھا کہ یہاں کا راجہ زمانہ قدیم میں بہت اچھا راجہ تھا لیکن اس کی رانیوں نے اس کے ساتھ بے وفائی کی تھی۔ چنانچہ اس راجہ یا بادشاہ نے انہیں بد دعا دی جس سے وہ سب چمگادڑیں بن گئیں اور ابھی تک وہاں الٹی لٹک رہی ہیں۔ ہم اس طرح کی دیو مالائی باتیں سن کر بہت محظوظ ہوئے۔ پھر اندور میں وہ ٹھکانے دیکھے جہاں اہل موسیقی نے ریاض کئے۔ پھر وہاں کی خاص چیز کچلے کے درخت تھے۔ جو دواؤں کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

مجھے کسی نے کہا تھا کہ اندور جاؤ تو وہاں کچلے کے درختوں پر شہد کی مکھیوں کے چھتے ہیں تو ان کا شہد لانا کیونکہ وہ اعصاب کے لئے بہت اچھا ہے۔ مجھے اس زمانہ میں رعشے کی شکایت تھی۔ بہت تلاش کیا اور وہ شہد حاصل کیا۔ میرے لئے اندور کی یہی سوغات تھی۔

وہیں ہمیں سنیل دت کی سربراہی میں خاص طور پر ایک مندر میں لے جایا گیا۔ اس کے بارے میں روایت یہ ہے کہ یہ سرزمین ہند یا پھر پوری دنیا کا پہلا مندر تھا۔ یہ ایک ایسی عمارت تھی جیسی کہ ہندو طرز تعمیر کی ایک پرشکوہ عمارت ہوتی ہے اور اندر سے اس کی سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ بہت نیچے جا کر ایک مندر آتا ہے جس میں مورتیاں سجی ہوئی ہیں اور پجاری بیٹھ کر پوجا کرتے ہیں۔ اندر لوبان اور صندل کی خوشبوئیں مچل رہی تھیں۔ میں تو باہر کھڑا ہوا تھا لیکن سنیل دت ایک روشن خیال آدمی تھے۔ وہ مجھے ساتھ لے گئے اور کہنے لگے کہ یہ تو بھگوان کا گھر ہے اور سب انسانوں کے لئے ہے اس لئے آپ باہر کیوں رکتے ہیں۔ آپ تو خود دیوتا اور شاعر ہیں اس لئے اندر آیئے۔ وہ مجھے نہ صرف اندر لے گئے بلکہ اُس جگہ پر بٹھایا جہاں خاص خاص آدمیوں کو بٹھایا جاتا ہے اور پوجا کی جاتی ہے۔ میں نے ان کے ساتھ بیٹھ کر سارے رسم و رواج دیکھے۔

ویسے تو میں پہلے ہی ان کی عظمت کا قائل تھا لیکن اس سفر کے دوران اور وہاں قیام کے بعد ان کی ساری خوبیاں کھل کر میرے سامنے آئیں تو گویا اس سفر میں مشاعرے کے علاوہ روپ متی باز بہادر کی پوری داستان اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھی اور دنیا کا پہلا مندر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے علاوہ کچلے کا شہد بھی زندگی میں پہلی بار دیکھا۔ جس

میں تھوڑی سی کڑواہٹ بھی تھی۔ اس کے علاوہ وہاں کے موسیقی کے گھرانے دیکھے اور پھر راستے میں میو چھاؤنی دکھائی دی۔ مجھے یاد آیا کہ جنگ کے زمانے میں ہمارے ایک عزیز وہاں ہوتے تھے کیونکہ اس زمانے میں فوجیوں کی نئی تقرریاں وہاں ہوتی تھیں۔ چنانچہ وہ چھاؤنی بھی دیکھی۔

میں واپس پاکستان آیا تو اپنے ہری پور کے عزیزوں سے کہا کہ میں وہ چھاؤنی بھی دیکھ کر آیا ہوں جہاں آپ کے بزرگ کام کرتے تھے۔ تو ان کی بیوی مجھ سے پوچھنے لگیں کہ بتایئے وہ کس قسم کا شہر ہے۔ جب میں نے آثار بتائے تو وہ کہنے لگیں بالکل ٹھیک ہے۔

اندور کے مشاعرے کے بارے میں یہ بات بھی ہے کہ وہاں کے لوگ موسیقی سننے والے ہی نہیں بلکہ اچھے گویئے بھی تھے اور برمحل داد دیتے تھے۔ پھر گویّا ہو یا شاعر داد اس کی کمزوری بن جاتی ہے اور وہ کھل کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس مشاعرے میں بھی ہزاروں آدمی تھے اور لوگوں نے خوب سنا۔ مشاعرہ بہت خوب رہا اور کہا جاتا ہے کہ یہ اندور کی تاریخ کا سب سے بڑا مشاعرہ تھا۔ اس کا سارا کریڈٹ سنیل دت صاحب کو جاتا ہے۔ اس مشاعرے سے جتنی آمدنی ہوئی وہ رسالہ ''فن اور شخصیت'' کو دی گئی۔ اس طرح ایک ادبی پرچے کی جائز مدد بھی ہوگئی۔

میرٹھ میں نوچندی کا مشاعرہ

میرٹھ میں ہر سال ایک میلہ لگتا ہے جسے نوچندی کا میلہ کہا جاتا ہے۔ یہ میلہ ہمہ گیر قسم کا ہوتا ہے اور کئی دن تک رہتا ہے۔ اس میں مختلف تماشے' ناچ گانا اور رنگا رنگ پروگراموں کے علاوہ ایک آل انڈیا مشاعرہ بھی ہوا کرتا ہے۔ اس میلے میں دور تک باقاعدہ بازار بنے ہوتے ہیں جن میں سے دنیا کی ہر چیز ملتی ہے۔ آس پاس کے لوگ دور دراز سے آتے ہیں اور وہاں آ کر کھیل تماشے دیکھتے ہیں اور خرید و فروخت کرتے ہیں۔

مجھے بھی وہاں نوچندی کے ایک مشاعرے میں ایک بار جانے کا موقع ملا۔ میں دہلی گیا ہوا تھا جہاں میں اس مشاعرے میں شرکت کے لئے میرٹھ گیا۔ اس میلے میں ایک ہنگامہ برپا تھا اور ایسا ہی ہنگامہ مشاعرے میں بھی برپا تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دس بیس آدمیوں کی ایک ٹولی ایک طرف سے آتی ہے اندر جھانکتی ہے اور دوسری طرف سے باہر نکل جاتی ہے۔ کسی کو مشاعرہ پسند آتا تو بیٹھ جاتا ورنہ آگے چل دیتا۔ غرضیکہ لوگ یوں آ جا رہے تھے جیسے یہ مشاعرہ نہیں بلکہ کوئی ورائٹی شو ہو۔ بہرحال ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ اگرچہ سامعین بدل رہے تھے لیکن داد اسی طرح چل رہی تھی۔ وہاں سے مجھے تین ساڑھے تین ہزار روپے کا جو معاوضہ مجھے ملا وہ بہت زیادہ رش ہونے کی وجہ سے کسی نے میری جیب سے نکال لیا۔ میں نے شرم کے مارے کسی کو بتایا بھی نہیں کیونکہ شاعروں سے ایسی بہت سی داستانیں وابستہ ہیں کہ وہ جھوٹ موٹ کی چوری کا بہانہ گھڑ کے دوبارہ معاوضہ بھی لے لیتے ہیں۔ اس لئے میں نے اس بات کا کسی سے ذکر نہ کیا۔ واپسی کے لئے چونکہ گاڑی کا

انتظام تھا۔ اس لئے چپکے سے میں واپس آ گیا۔ یہ تلخ تجربہ میرٹھ میں ہوا۔

ایک اور تلخ تجربہ جے پور کے مشاعرہ میں ہوا۔ یہاں کا مشاعرہ بہت ٹھاٹھ کا تھا۔ اس میں بھی گائیڈ کنور مہندر سنگھ بیدی تھے۔ اصل میں ہم لوگ مشاعرے کے لئے انبالہ گئے تھے جہاں سے مجھے دہلی کلاتھ ملز کے مشاعرے کے لئے آنا تھا۔ ساتھ کچھ پاکستانی شعراء تھے جن میں انور مسعود بھی شامل تھے۔ ان دو تین شاعروں کو ہم وطن ہونے کی وجہ سے میں نے جے پور کے مشاعرے کے لئے بک کروا دیا تھا۔ ہم وہاں گئے اور مشاعرہ پڑھا۔ یہ شکر کرتا ہوں کہ وہ وہاں اچھے رہے۔ وہ اچھے شعراء تھے میں نے تو صرف سفارش کی تھی۔ ویسے بھی میں ایسے لوگوں کی سفارش نہیں کرتا ہوں جو اچھا کلام نہ کہتے ہوں کیونکہ عزت کا سوال ہوتا ہے۔

وہاں ہمیں جودھا بائی کے بھائی راجہ مان سنگھ کا محل دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ یہ راجہ اکبر اعظم کے سالے تھے۔ یہ محل بہت بڑا تھا اور ہم نے سوچا کہ اگر راجہ مان سنگھ کا محل اتنا بڑا ہے تو شہنشاہ اکبر اعظم کا محل کتنا بڑا ہوگا۔ وہ محلوں کا شہر ہے اور وہاں اور بھی بہت سے راجاؤں کے محل ہیں۔ بازار سے گزریں تو دو رویہ ایسی عمارتیں ہیں جو محل ہی کا ایک حصہ دکھائی دیتی ہیں۔

اس مشاعرے کے منتظم راہی شہابی تھے۔ ان کی خوبی یہ تھی کہ انہیں سو پچاس اشعار یوں ہی یاد ہوتے تھے۔ وہ نظم کے شاعر ہیں' بڑی اچھی نظم کہتے ہیں اور پھر پوری کی پوری نظم زبانی سناتے چلے جاتے ہیں۔ بہت جوش ولولے سے کلام پڑھتے ہیں۔ ہمیں اس مشاعرے میں بہت سے راجستھانی شاعروں سے کلام سننے کا موقع ملا۔ اس مشاعرے میں ایک راجستھانی خاتون شاعرہ بھی شریک تھیں۔ یہ شروع میں راجستھانی زبان میں شعر کہتی تھیں لیکن بعد میں انہوں نے اُردو میں شعر کہنے شروع کئے۔ انہوں نے وہاں کمال کر کے دکھایا اور مشاعرے کو لوٹا۔

ایک شاعر سٹیج پر آئے اور انہوں نے مزاحیہ انداز میں کلام سنانا شروع کیا۔ ان کی نظم میں مشاعرے کے تقدس کے بارے میں کچھ نئے مضامین شامل تھے جن سے انہوں نے

ثابت کیا تھا کہ مشاعرہ کوئی لہو ولعب قسم کی چیز نہیں ہوتی بلکہ یہ بڑے محترم اور مکرم لوگوں سے اظہار خیال کی جگہ ہوتی ہے اور بڑی مقدس جگہ ہوتی ہے۔ میرے ذہن میں یہ مضمون تھا جب یہ مشاعرہ ختم ہوا۔

مشاعرہ ختم ہوا تو میں نے اپنا جوتا تلاش کرنا شروع کیا لیکن وہاں میرا جوتا موجود نہیں تھا۔ اب جوتے کی روایت تو یہ ہے کہ:

اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہوشیار
اک بزرگ آئے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

لیکن اب جوتے کی چوری کی بات مسجد سے نکل کر مشاعرے تک آ گئی تھی۔ اب وہ جو شاعر مشاعرہ گاہ کو ایک مقدس جگہ بیان کر رہے تھے میرے ذہن میں ان کا خیال آ گیا اور مجھے ان کی بات کا یقین آ گیا کہ یہ مشاعرہ گاہ مسجد سے پیچھے نہیں ہے۔ وہاں سے بھی جوتے چرائے جاتے ہیں اور یہاں سے بھی جوتا چرایا گیا۔

خوشتر گرامی

ہندوستان اور پاکستان کے مابین ہونے والی جنگوں سے پہلے دہلی میں اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ یہ سلسلہ 1956ء سے لے کر 1961ء تک باقاعدہ رہا۔ یوں وہاں کثرت سے آنا جانا رہا اور اس دوران وہاں دہلی کلاتھ مل کے مشاعروں میں شرکت کا موقع بھی ملا۔ دہلی کلاتھ مل والوں کی لائل پور میں بھی ایک کلاتھ مل تھی جسے لائل پور کاٹن مل کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ ہر سال بہ اہتمام ایک ہندو پاک مشاعرہ باقاعدگی سے دہلی میں کرواتے تھے اور ایک مشاعرہ لائل پور میں کرواتے تھے۔ اس طرح ادھر کے شاعر ادھر اور ادھر کے شاعر ادھر کثرت سے آتے جاتے تھے۔

میں ایک ایسا شاعر تھا جسے ہر مشاعرے میں دونوں جگہ بلوایا جاتا تھا۔ اس زمانے میں روی چوپڑا دہلی کلاتھ مل کے پبلک ریلیشنگ آفیسر تھے۔ یہ لاہور کے رہنے والے تھے اور لاہور کی ایک لڑکی سے ان کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کے بھائی یہاں سیکرٹری لیول کے آدمی تھے۔ یہ لڑکی گلبرگ کی رہنے والی تھی اور سب ماڈرن لوگ تھے۔ اس لئے جب شادی ہوگئی تو کسی کو اعتراض بھی نہیں ہوا۔ دہلی میں بھی یہ میاں بیوی بچوں کے ساتھ رہ رہے تھے۔

ان کے علاوہ اس کلاتھ مل کے لاہور ہی سے متعلق ایک اور معتمد افسر ساہنی تھے۔ ان دونوں افسران کی وجہ سے وہاں کے مشاعرے میں بڑی گہما گہمی ہوتی تھی۔ ایک تو دہلی کلاتھ مل والے شاعروں کو اچھے ہوٹلوں میں ٹھہراتے تھے اور دوسرے کھانے وغیرہ کا خاص

انتظام ہوتا تھا۔ وہاں مشاعرے کی بھی دو الگ الگ نشستیں ہوتی تھیں ایک مزدوروں کے لئے اور دوسری خاص خاص لوگوں کے لئے۔ مشاعرہ بہت بڑے پنڈال میں ہوتا تھا۔

جو دعوتیں مل والوں کی طرف سے ہوتی تھیں وہ اپنی جگہ۔ لیکن اس کے علاوہ روی چوپڑا اور ساہنی صاحب بھی اپنے اپنے ہاں پاکستانی شاعروں اور اپنے دوست ہندوستانی شاعروں کو دعوت پر بلواتے تھے۔ افسوس یہ ہے کہ پچھلی بار جب میں تین سال پہلے دہلی مشاعرے میں گیا تو یہ دونوں صاحبان فوت ہو چکے تھے۔ ان لوگوں کے پاکستانی سفارتخانے کے افسروں سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ یہ 1961ء سے پہلے کی بات ہے۔ اس زمانے میں ایک دعوت سفارت خانے کے فرسٹ سیکرٹریوں کی طرف سے اور ایک دو دعوتیں سفارت خانے ہی کے دوسرے ایک دو افسروں کی طرف سے ہوتی تھیں۔ ان دعوتوں میں گھریلو ماحول ہوتا تھا اور چھوٹی چھوٹی نشستیں ہوتی تھیں۔ اس طرح ہم لوگ مشاعرے کے بعد بھی وہاں ہفتہ عشرہ گزارتے تھے۔

دہلی میں اور اچھے لوگوں کے علاوہ خوشتر گرامی کی ذات بڑی دلچسپ تھی۔ وہ رسالہ ''بیسویں صدی'' کے ایڈیٹر تھے۔ یہ رسالہ شروع میں لاہور سے نکلا تھا لیکن پارٹیشن کے بعد یہ پرچہ اور خوشتر گرامی دونوں دہلی منتقل ہو گئے تھے۔ ان کے سالک صاحب سے لے کر نیچے تک سبھی لوگوں سے تعلقات تھے اور ان کے دوستوں کی اکثریت لاہور ہی سے تھی جو زیادہ تر مسلمان تھے۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ شراب سے نفرت کرتے تھے اور گوشت سے محبت کرتے تھے۔ مچھلی اور مرغی ان کا من بھاتا کھانا تھا اور وہ اقبال کے اس شعر کو تحریف کر کے پڑھا کرتے تھے۔ اصل شعر تھا:

تری دنیا جہانِ مرغ و ماہی
مری دنیا فغانِ صبح گاہی

وہ کہا کرتے تھے:

مری دنیا جہانِ مرغ و ماہی
تری دنیا فغانِ صبح گاہی

وہ کسی کی دعوت کرتے تھے تو رقعہ میں لکھتے تھے کہ امید ہے کہ آپ اس دعوت مرغ وماہی میں تشریف لائیں گے۔ وہ کثرت سے مرغ اور مچھلی پکایا کرتے تھے۔ میں نے ان کی دعوت تو بہت سی کھائی ہوئی تھیں لیکن غلط فہمی کی بنا پر انہوں نے جس دعوت کا اہتمام کر دیا وہ ایک اور ہی دعوت تھی۔

میرے ساتھ میرے سندھ کے ایک دوست فضل علی شاہ جاموٹ تشریف لے گئے۔ ان کی سندھ کی ایک بڑی فیملی ہے۔ انہیں فلم میکنگ اور اداکاری کا بہت شوق تھا۔ یہ ایس گل کے نام سے فلم انڈسٹری میں آئے۔ فلم ''بیقرار'' بنائی پھر ''التجا'' اور ایک دو دوسری فلمیں بھی بنائیں۔ میرے ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات بھی تھے اور کاروباری تعلقات بھی۔

ان کے ساتھ ایک بار طے پایا تھا کہ ہم دہلی جائیں گے اور وہاں کی سیر کریں گے۔ چنانچہ جب ہم دہلی گئے تو خوشتر صاحب سے ملنے کے لئے دہلی گئے۔ وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ان کا انداز یہ تھا کہ جب ایک چیز کا ذکر آ جائے تو وہ اس کا پورا شجرہ نسب بتا کر بات ختم کرتے تھے۔ مثال کے طور پر اگر وہ پوچھتے کہ چائے پئیں گے۔ ہم کہتے پئیں گے۔ اب وہ چپڑاسی کو بلاتے اور کہتے کہ کرپارام ادھر آؤ۔ اسے کہتے کہ یہ مہمان لاہور سے آئے ہیں۔ پھر پوچھتے کہ یہ کہاں سے آئے ہیں وہ کہتا کہ لاہور سے۔ پھر کہتے کہ لاہور میرا وطن ہے اور یہ پاؤڈر والی چائے نہیں پئیں گے۔ اس لئے تم فلاں حلوائی کے پاس جاؤ اور اسے بتاؤ کہ خوشتر صاحب کے مہمان لاہور سے آئے ہیں ان کے لئے چائے بنانی ہے۔ اور دودھ چاہئے جو پاؤڈر والا نہ ہو۔ جب چپڑاسی رخصت ہوا اور دروازے تک پہنچا تو اسے دوبارہ آواز دی ''کرپارام'' میں نے کیا کہا تھا وہ پوری بات دہرائے گا پھر چلا جائے گا۔ اس کے جانے کے بعد کہنے لگے اس کو جس حلوائی کے پاس بھیجا ہے' آپ کو اس کے بارے میں بتاتا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ لوہاری دروازے کے اندر رام چند حلوائی ہوتا تھا۔ وہ پارٹیشن کے بعد یہاں آ گیا تھا اور اب مر گیا ہے۔ یہ اسی کا بیٹا ہے۔ ان کی دوکان بہت چلتی ہے کیونکہ یہ گوالوں سے دودھ نہیں لیتے بلکہ انہوں نے اپنی بھینسیں رکھی ہوئی ہیں

اور جب آدمی دودھ دوہتا ہے تو یہ خود سر پر کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر ان کی چالیس بھینسیں ہیں جن میں سے اتنے من دودھ نکلتا ہے۔ اس نے دودھ میں پانی کی ملاوٹ کرنا گناہ سمجھا ہوا ہے اور سرکاری آدمی لوگوں کے سامنے آ کر ان کا دودھ ٹیسٹ کرتا ہے۔ پھر اس دودھ سے اس کی جو مٹھائیاں بنتی ہیں ان کا تو جواب نہیں۔

غرضیکہ ایک اتنی لمبی چوڑی داستان سنانے کے بعد کہنے لگے کہ یہ دودھ وہاں سے آئے گا۔ پھر دودھ کے آتے آتے جو مٹھائی منگوا رہے تھے اس کا شجرہ نسب مجھے سنا دیا۔ غرض جب تک چائے تیار ہوگی وہ چائے کے اجزاء اور چائے کے ساتھ پیش کی جانے والی اشیاء کے شجرہ نسب بیان کرتے رہیں گے۔

اس بار جب ان کے پاس گئے تو وہ ہمیں دعوت کا کہنا بھول گئے اور اپنے دل میں سمجھ لیا کہ انہوں نے ہمیں کھانے کی دعوت دے دی ہے۔ ہمارے تو ذہن میں خود بخود یہ بات نہیں آ سکتی تھی۔ اس لئے ہم ملاقات کے بعد ان کے پاس سے اُٹھ کر آ گئے۔ اگلے دن ہم اپنے پروگرام کے مطابق گھومے پھرے اور شام کو کسی دوست کے ہاں دعوت بھی کھائی۔ اس سے اگلے دن ہم ایک اور تقریب میں گئے تو کچھ دوستوں نے سخت شکایت کے لہجے میں کہا کہ آپ نے خوشتر صاحب کے ساتھ کیا کیا ہے۔ انہوں نے کل رات آپ لوگوں کے لئے دعوت کا بندوبست کیا ہوا تھا لیکن آپ آئے ہی نہیں اور کہنے لگے کہ انہوں نے تو آپ کے اعزاز میں اتنے آدمی بھی بلا رکھے تھے۔

ہم اسی وقت خوشتر صاحب کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ آپ ہمیں لوگوں میں کیوں بدنام کر رہے ہیں۔ آپ نے کب ہماری دعوت کی تھی۔ کہنے لگے کہ پرسوں جب آپ آئے تھے تو میں نے آپ سے کہا تو تھا۔ ہم نے کہا کہ جی آپ نے کب کہا تھا۔ آپ تو مٹھائیوں کا شجرہ نسب اور دودھ کی ذات پات بتاتے رہے تھے۔ کہنے لگے کہ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں نے آپ کو دعوت کا نہ کہا ہو۔ میں نے تو آتے ہی آپ سے یہ کہا تھا۔

خیر جب ٹھنڈے ہوئے تو لطیفوں پر اتر آئے اور کہنے لگے کہ رات جب بہت دیر

انتظار کے باوجود آپ لوگ نہیں آئے تو جن دس پندرہ دوسرے دوستوں کو میں نے بلوایا ہوا تھا۔ انہیں کھانا کھلا کر رخصت کر دیا اور خود پھر بھی آپ لوگوں کا انتظار کرتا رہا۔ اس دوران ہمارے ایک اور دوست آ گئے۔ میں ان کا نام یہاں نہیں بیان کروں گا کیونکہ وہ بہت معزز آدمی تھے۔ تو کہنے لگے کہ ان دوست کو میں نے آپ لوگوں کے دعوت میں نہ آنے کا واقعہ سنایا۔ وہ سن کر پریشان ہوئے تو میں نے ان سے کہا کہ میں نے قتیل صاحب اور ان کے دوست کا کھانا ابھی تک رکھا ہوا ہے مگر وہ نہیں آئے اور اب تو میں وہ کھانا کتوں کو ڈالنے والا تھا۔ اب آپ آ گئے ہیں تو آپ کھالیں۔

خوشتر صاحب کے علاوہ دہلی کی ایک اور دعوت بھی مجھے ابھی تک یاد ہے۔ کلیم عثمانی صاحب دہلی کے رہنے والے ہیں۔ ان کے عزیز اب بھی وہاں آباد ہیں۔ ایک بار ہم اس دہلی کلاتھ مل کے مشاعرے میں وہاں گئے۔ ویسے تو ہم موتی محل ہوٹل میں ٹھہرتے تھے۔ دہلی کے کھانوں کی بات چلی تو انہوں نے کہا کہ میرے کچھ عزیز کل بھی اصرار کر رہے تھے کہ کیوں نہ ان کی دعوت قبول کر لی جائے۔ میں ان دنوں ماہنامہ ''شمع'' والوں کی کوٹھی کے Diplomat Enclave میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ کوٹھی نئی نئی بنی ہوئی تھی اور اتنی خوبصورت تھی کہ لوگ اسے دیکھنے کے لئے آتے تھے۔ ''شمع'' والوں نے مجھے ٹھہرا رکھا تھا اور باقی لوگ زیادہ تر موتی محل ہوٹل میں ہی ٹھہرے ہوئے تھے۔

ہم کلیم عثمانی صاحب کے ساتھ ان کے کسی عزیز کے ہاں کھانے کے لئے گئے تو دیکھا کہ سب کھانا ایک سے ایک بڑھ کر لذیذ تھا۔ ہر کھانے میں الگ طرح کی مرچیں اور مصالحے استعمال کئے گئے تھے۔ اگر ایک ڈش میں سبز مرچوں کا گوشت ہوتا تو دوسری میں سرخ مرچ یا کالی مرچ کا۔ کھانے سبھی لذیذ تھے اس لئے میں کھاتا چلا گیا۔ اس زمانے میں میری خوراک بھی اچھی خاصی تھی لیکن خوراک سے بھی زیادہ کھا گیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر جب میں رات کے گیارہ بارہ بجے ''شمع'' والوں کے ہاں پہنچا تو وہ سوئے ہوئے تھے۔ میں سیدھا مہمان خانے والے کمرے میں چلا گیا اور سو گیا۔ تقریباً دو بجے رات میرے معدے میں زندگی کا شدید ترین درد اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی

انتڑیوں میں بھی شدید جلن ہونے لگی۔ میں بے چین ہوگیا۔ سمجھ نہ آئی کہ کیا کروں۔ کوٹھی اتنی بڑی تھی کہ کسی اور سے رابطہ ہی نہیں تھا۔ پھر مجھے بھی حجاب محسوس ہو رہا تھا کہ رات کے اس پہر میں دوسرے کمروں کے دروازے کیوں کھٹکھٹاؤں۔ احتیاط میں نے پانی شروع کیا اور پانی پی پی کر وقت گزارا۔ اس سے کوئی افاقہ تو نہ ہوا لیکن وقت گزرتا رہا۔ جب پو پھٹی تو میں باہر نکل کر ٹیکسی میں بیٹھا اور ڈرائیور سے کہا کہ اُردو بازار کی طرف لے چلو۔ وہاں میں نے ایک دودھ دہی والے کی دوکان پر ٹیکسی رکوائی اور آدھ سیر دہی اور ایک پاؤ دودھ کی لسی بنوائی۔ دوکاندار میری طرف غور سے دیکھنے لگا کیونکہ وہاں آدھ سیر دہی کا شاید دستور نہیں ہوگا۔ یہ لسی وہاں سے پی کر میں واپس آیا۔ اتنی دیر میں میرا پیٹ بھی چل گیا۔ اسی اثناء میں یونس دہلوی بھی وہاں آئے۔ میرا رنگ پیلا دیکھ کر کہنے لگے کہ کیا ہوا۔ میں نے سارا واقعہ سنایا تو پریشان ہوئے اور کہنے لگے کہ مجھے خبر رات ہی میں کیوں نہیں کی۔ میں اس معدے کے درد اور انتڑیوں کی جلن کا علاج تقریباً دو تین ماہ تک کرواتا رہا۔ تب کہیں جا کر صحت یابی ہوئی۔

نظام الدین اولیاء کا مزار

میں مزار پرست نہیں ہوں لیکن اس لحاظ سے میں مزاروں پر چلا بھی جاتا ہوں کہ میرا مقصد وہاں جانے کا وہ نہیں ہوتا جو بعض شرک میں مبتلا لوگوں کا ہوتا ہے۔ وہ لوگ مزار سے کچھ مانگنے جاتے ہیں۔ میں یہ کام نہیں کرتا۔ میرے ذہن میں تو مزار والے بزرگ کی وہ زندگی ہوتی ہے جو وہ اپنے وقت میں گزار چکا ہوتا ہے۔ جس میں انہوں نے لوگوں کی اصلاح خدمت خلق اور اشاعت دین کی کوشش کی ہوتی ہے۔ تو میں ان خدمات کی وجہ سے اس کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے جاتا ہوں۔

اس بار جب میں دہلی گیا۔ یہ غالباً 1981ء کی بات ہے تو میں نظام الدین اولیاء کی درگاہ پر اس خیال سے گیا کہ ان کے ساتھ ہی امیر خسرو کے مزار پر جاؤں گا۔ پھر اس کے ساتھ ہی غالب کا مزار اور غالب اکیڈمی کا دفتر بھی تھا۔ وہاں جا کر یہ سب چیزیں ایک ساتھ ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ نظام الدین اولیاء کی درگاہ پر خواجہ حسن نظامی ثانی متولی ہیں۔ ان سے پہلے ہی ملاقات ہو چکی تھی۔ اس لئے میں نے فون کر کے انہیں کہا کہ ہم آ رہے ہیں۔

ہم وہاں پہنچے تو میری بیوی بہت خوش ہوئی کہ ہم اتنے بڑے بزرگ کے ہاں آئے ہیں۔ میں خود بھی خوش تھا۔ میں خواجہ حسن نظامی ثانی کو ساتھ لے کر خاص طور پر امیر خسرو کے مزار کے اندر گیا اور وہاں جا کر بیٹھ کر میں نے لمبی دعا کی جو یہ تھی کہ یا اللہ جتنا بڑا شاعر، خلاق اور بتاع یہ شخص ہے جو اس قبر میں لیٹا ہوا ہے اور جتنا نام اس نے پایا ہے مجھے اس کا عشرِ عشیر دے دے۔ میں نے وہاں یہ دعا مانگی اور دعا کے بعد دل میں بڑا اطمینان لے کر

اٹھا۔

اس کے بعد پاکستان میں آ کر میں نے امیر خسرو کی ایک فارسی نظم سے تاثر لے کر اُردو میں ایک نظم کہی۔ خدا جانے دعائیں قبول ہوتی ہیں یا نہیں ہوتیں لیکن اس دعا کے بعد دل کو بہت سکون ملا کہ میں نے اللہ سے جو مانگا ہے بڑا مناسب اور واجبی سا مانگا ہے۔ جس شخص کی خوبیوں میں سے میں نے ایک ریزہ مانگنے کی کوشش کی ہے مجھے یہی کچھ کرنا چاہئے تھا۔ اگر میری دعا قبول ہو چکی ہے تو زہے نصیب اور اگر قبول نہیں ہوئی تو اب بھی میری خدا سے دعا یہ ہے کہ وہ میری یہ دعا پوری کر دے۔

جج سنگھ

1950ء کے بعد میں' میری بیوی اور میرا بیٹا انڈیا گئے تو اندر جیت آرٹسٹ جواب امروز کے نام سے پہچانا جا رہا ہے' سے بھی ملے۔ اب امرتا پریتم سے اس کی شادی ہو چکی ہے اور دونوں میاں بیوی بڑی اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس زمانے میں ان دونوں کی شادی ابھی نہیں ہوئی تھی لیکن اکٹھے رہ رہے تھے۔ امرتا پریتم ان دنوں اپنی اس نظم سے بہت شہرت حاصل کر چکی تھیں کہ:

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتے قبراں وچوں بول

میں جب وہاں گیا تو امرتا پریتم سے ملاقات کی خواہش بھی دل میں تھی۔ جب اندر جیت نے دعوت بھی دے دی تو ہم ان کے ہاں گئے۔ امرتا پریتم کو سب لوگ پیار سے امی کہتے تھے۔ میں نے اپنی بیوی سے امرتا پریتم اور اندر جیت کا تعارف بطور میاں بیوی کروایا تھا۔ لیکن اندر جیت اسے جب امی کہہ کر پکارتے تو میری بیوی حیران ہو کر میری طرف دیکھتی۔ خیر وہ بولی کچھ نہیں۔ جب ہم دعوت سے واپس آئے تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ یہ میاں بیوی ہیں لیکن خاوند بیوی کو امی کہہ رہا ہے۔ میں بڑا ہنسا اور اسے ساری بات سمجھائی۔ یہ امرتا پریتم سے میری پہلی ملاقات تھی۔

دہلی میں دو بڑے آدمیوں سے بھی میری ملاقات ہو گئی اور ان کے ساتھ جو لطیفے ہوئے وہ بھی خوب ہیں۔ یہ دہلی کا تھوڑا ہی کا مشاعرہ تھا۔ ایک مشاعرے میں حضرت فراق گورکھپوری تشریف فرما تھے اور وہ ہر لحاظ سے مجھ سے بڑے سینئر تھے لیکن ان سے

دوستوں جیسے بے تکلفانہ تعلقات بن گئے تھے اور ایک دوسرے سے مذاق بھی ہونے لگے۔ یہ مذاق بڑی راز کے نوعیت کے بھی ہوتے جن کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے البتہ ایک لطیفے کا ذکر کرتا ہوں اور بتانا یہ چاہوں گا کہ اتنا بڑا آدمی بے تکلفی میں یہ توقع نہیں رکھتا تھا کہ بڑا تو چھوٹوں سے بے تکلفی برت جائے لیکن جب کوئی چھوٹا زندہ دلی کی بات کرے تو وہ برا مان جائے۔ وہ قطعاً برا نہیں مانتے تھے۔

ہوایوں کے مشاعرے سے کچھ وقت پہلے ہم شاعر دہلی کلاتھ مل کے ریسٹ ہاؤس میں بیٹھے تھے۔ فراق صاحب ہی جیسا ایک آدمی وہاں موجود تھا جو مل والوں کا چوکیدار یا دربان تھا۔ وہ ہاتھ میں ایک لٹھ لئے' بالے ڈالے کرسی پر بیٹھا وہی حرکت کر رہا تھا جو فراق صاحب کر رہے تھے۔ یہ وہی حرکت تھی جو ہر وہ آدمی کرتا ہے جس کے دانت نہیں ہوتے۔ جن لوگوں کے دانت نہیں ہوتے وہ جب بات نہ کر رہے ہوں تو یوں منہ کو ہلاتے ہیں جیسے کوئی جگالی کر رہے ہوں۔ ادھر فراق صاحب یہ حرکت کر رہے تھے ادھر وہ بھیا وہی حرکت کر رہا تھا۔ میں نے آس پاس کے ایک دو شاعروں سے کہا کہ میں ذرا فراق صاحب سے دل لگی کرتا ہوں۔ میں گیا اور کہا کہ فراق صاحب! مجھے اس وقت بہت غصہ آ رہا ہے۔ کہنے لگے کس بات کا پر؟ میں نے کہا بس جانے دیجئے۔ آپ مجھے روکئے نہیں۔ کہنے لگے لیکن بات کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اب تو انتہا ہوگئی ہے کیونکہ اگر کوئی ہمارے بزرگوں سے مذاق کرے تو ہم چپ نہیں رہ سکتے۔ کہنے لگے کہ کون مذاق کر رہا ہے اور کس سے مذاق کر رہا ہے۔ میں نے کہا کہ وہ دیکھئے سامنے جو بھیا بیٹھا ہے وہ آپ کی نقل کر رہا ہے۔ انہوں نے پہلے اس کی طرف دیکھا اور پھر ایک لمبی ہوں کی۔ پھر ہنس کر مجھے کہنے لگے کہ بدمعاشیوں سے باز آ جاؤ۔ پھر ایک قہقہہ لگا کر کہا کہ اب تمہارا میری طرف ایک نمبر ہوگیا ہے اسے چکا لیں گے۔

دوسرا لطیفہ حضرت یاس یگانہ چنگیزی سے متعلق ہے۔ ان سے جب میری ملاقات ہوئی تو پہلی ہی ملاقات میں کہنے لگے کہ یار میں نے ایسا قتیل پہلی بار دیکھا ہے جو مردہ نہیں ہے بلکہ باقاعدہ باتیں کر رہا ہے۔ یا پھر ایک ایسا مردہ ہے جو چل پھر بھی رہا ہے اور

باتیں بھی کر رہا ہے۔ میں نے کہا جی ٹھیک ہے میں نے بھی ایسا چنگیزی پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ جس کے ہاتھ میں نہ تو تلوار ہو اور نہ ہی تیر کمان حتیٰ کہ اس وقت تو آپ کے ہاتھ میں قلم بھی نہیں ہے۔ وہ میرا جواب سن کر بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ تم صوبہ سرحد سے ہو اور وہاں ہی ایسے زندہ دل لوگ ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ وہاں جا کر دیکھئے۔ آس پاس سے زندہ دلیاں آپ کو گھیر لیں گی۔ وہ میرا جواب سن کر بہت خوش ہوئے۔

ایسے بزرگ اس دنیا میں اب کہاں۔ اب تو اپنے کسی ہمعصر سے بھی دل لگی کر لو تو وہ دشمنی پر اتر آتا ہے اور جب تک دس بارہ آدمیوں میں آپ کی برائی نہ کر لے اسے چین نہیں آتا۔

دہلی کے اور دوستوں میں ایک Typical دوست سے اس وقت علیک سلیک ہوئی جب میں نے شروع شروع میں وہاں کے مشاعروں میں جانا شروع کیا۔ ان صاحب کا نام اوتار سنگھ ہے لیکن جج سنگھ کہلواتے ہیں۔ یہ پڑھے لکھے نوجوان تھے اور ادب سے شغف رکھتے ہیں۔ پچھلے دنوں میں نے انہیں بھارتی ٹیلی ویژن پر دیکھا وہ کچھ پروگراموں کی کمپیئرنگ بھی کرتے ہوئے نظر آئے۔ اس سے پہلے جب مجھ سے ملاقات ہوئی تھی تو وہ معاشی چکر میں مبتلا تھے۔ پھر انگلینڈ میں جا کر ملازمت بھی کرتے رہے۔ وہاں سے مالی حالت ٹھیک کر کے واپس انڈیا آ گئے اور آ کر گھریلو زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں جب پچھلی مرتبہ گیا تو ان سے اور ان کی بیوی سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان کی بیوی بہت اچھی ہیں۔ بچے بھی ٹھیک ٹھاک ہیں۔ ہر بار جب میں مشاعرے میں جاتا تھا تو جو لوگ میرے ساتھی وہاں دن رات کے بنتے تھے ان میں جج سنگھ بھی شامل ہوتے تھے۔ بعد میں جب دونوں ملکوں میں جھگڑے ہوئے تو ہمارا انڈیا آنا جانا منقطع ہو گیا۔ آخر میں جب شملہ معاہدہ ہوا تو انڈیا ٹی وی نے کچھ لوگوں کو ٹیلی ویژن پر بلانے کا اہتمام کیا۔ ان میں کچھ لوگ کچھ پاکستانی دوستوں کی یادیں تازہ کرنے کے لئے کچھ کلمات کہا کرتے تھے اور کچھ پیغامات بھی دیا کرتے تھے۔

ایک دن میں انارکلی کی طرف نکل گیا تو جدھر جاؤں لوگ مجھے روک کر کہتے تھے کہ

قتیل صاحب رات امرتسر ٹیلی ویژن پر دیکھا کہ ایک سردار صاحب جن کا نام یاد نہیں وہ بازو پھیلا پھیلا کر کہتے تھے کہ لاہور میں میرا ایک یار ہے قتیل شفائی۔ جسے ملے اس سے کہے کہ مجھے خط لکھے اور میرا سلام بھی دے۔ میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون سے سردار صاحب ہیں۔ اب یہ بات مجھے سات آٹھ آدمیوں نے بتائی تھی لیکن کوئی بھی نام نہیں بتاتا تھا۔ میرا ذہن سردار دوستوں میں نہ تو کنور مہندر سنگھ بیدی کی طرف گیا اور نہ ہی جتندر سنگھ کی طرف گیا کیونکہ وہ اس ٹائپ کے لوگ نہیں تھے اور ویسے بھی ان سے خط و کتابت تھی۔ ان سے میرا رابطہ نہیں تھا لیکن اس وقت تک میں نہیں سوچ سکا کہ یہ جج سنگھ ہوں گے۔

اگلے ہفتے امرتسر ٹی وی والوں نے پھر جج سنگھ کا پیغام ٹیلی کاسٹ کیا شاید ناظرین کو جج سنگھ کے ایکشن کے ساتھ کہے گئے الفاظ بہت پسند آ گئے تھے۔ میں اتفاق سے اس روز ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ جج سنگھ کو ٹی وی پر دیکھ کر بہت خوشی اور حیرت ہوئی۔ وہ اتنی وارفتگی سے ہاتھ پھیلا کر کہہ رہا تھا کہ میرا یار قتیل شفائی لاہور میں ہے۔ میں جذباتی آدمی ہوں۔ خیالوں میں اس سے لپٹا اور کتنی دیر آبدیدہ رہا کہ انسان بہرحال انسان ہے۔ ملکوں میں کچھ ہوتا رہے' ذاتی تعلقات کی ایک سطح ہوتی ہے۔ ایک فنکارانہ سطح بھی ہوتی ہے۔ ہم دونوں کے درمیان یہ دونوں سطحیں تھیں۔ اس کے پیغام دینے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کوئی فریاد کر رہا ہو۔ ادھر اس کے ردعمل میں میرے جذبات ایسے تھے کہ میں نے سوچا کہ سب ملکی جھگڑوں کے باوجود خدا کا شکر ہے کہ اس نے انسانوں کو زندہ رکھا ہے۔ اگر ہماری زندگی سے انسان ہی ختم ہو جائے تو پھر یہ دنیا ویرانے سے کم نہ ہو۔

کرشن لال نارنگ ساقی اب دہلی میں بہت عرصے سے مقیم ہیں۔ ان سے پہلے پہل امرتسر میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہاں ان کا چھوٹا سا ہوٹل تھا اور اس ہوٹل سے پہلے یہ فیروز پور سے ایک چند ورق کا معمولی سا پرچہ "ساقی" کے نام سے نکالتے تھے۔ اس لئے یہ ساقی ہی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ اپنے پرچے کی وجہ سے ان کا نام ساقی ہو گیا اور اب تک وہ اپنے دوستوں میں اسی نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ کرشن لال نارنگ سٹ کے اب کے

ایل نارنگ ہوگیا اور یہ نام صرف کاروبار ہی میں کام آتا ہے۔ عام مجلسی زندگی میں وہ ساقی ہی کہلواتے ہیں۔

پارٹیشن کے بعد ہمارا انڈیا آنا جانا شروع ہوا۔ اس زمانے میں راجہ غضنفر علی صاحب دہلی میں ہمارے سفیر تھے۔ انہوں نے دونوں ملکوں کے لوگوں کو قریب لانے کے لئے کرکٹ میچ شروع کروائے تھے۔ کبھی انڈیا کی ٹیم پاکستان آتی تھی اور کبھی پاکستان کی ٹیم انڈیا جاتی تھی۔ اس طرح ادھر کے ہزاروں لوگ ادھر اور ادھر کے ادھر آتے رہے۔ انہی آنے والوں میں ایک ساقی صاحب تھے۔ وہ جب پاکستان آئے تو ان سے دوستی کی کچھ بنیاد پڑی۔ پھر جب میں امرتسر میں گیا تو دوستی کچھ اور بڑھی۔

یہ سلسلہ آہستہ آہستہ بہت خلوص میں ڈھل گیا۔ اس کے بعد دونوں ملکوں کے مابین جھگڑوں کی وجہ سے اٹھارہ سال تک ملاقات نہ ہوئی۔ جب دوبارہ آنا جانا شروع ہوا تو دہلی میں میری ساقی صاحب کے ساتھ تجدید ملاقات ہوئی۔ اس وقت وہ مالی طور پر بہت آگے بڑھ چکے تھے۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ پیار سے ملے۔ پھر ان کی رہائش گاہ پر مجھے ٹھہرنے کا موقع بھی ملا۔ بیوی بچوں سے بھی قربت ہوئی اور اب دہلی میں میرے قریبی دوستوں میں ساقی صاحب ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ لوگ ہم دونوں کا حوالہ دیتے ہیں۔

اگر پاکستان سے میرا کوئی دوست خط لے کر دہلی جائے تو وہ یوں اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ جیسے میں آ گیا ہوں۔ اسی طرح ادھر سے کوئی آئے تو اس کی خدمت میرا فرض بنتا ہے۔ ہندوستان کے دوستوں میں بالخصوص جونیئر لوگوں میں خواہ وہ مسلمان ہی ہوں یہ مسئلہ بن گیا ہے کہ انہیں وہاں ہندی رسم الخط میں تعلیم دی جاتی ہے۔ اُردو رسم الخط جاننے والے کچھ پرانے لوگ موجود ہیں جن میں سے ایک ساقی صاحب بھی ہیں۔ ان سے جب خط و کتابت بھی ہوتی ہے تو اُردو ہی میں ہوتی ہے کیونکہ ان کا واسطہ اُردو سے ٹوٹا نہیں۔ اگرچہ کاروبار میں وہ دفتر میں ہندی اور انگریزی کا استعمال کرتے ہیں لیکن جہاں بھی کوئی اُردو جاننے والا ہوتا ہے' اس سے اُردو ہی میں خط و کتابت کرتے ہیں۔ وہ اُردو کو

آگے بڑھانے کی بھی دل میں تڑپ رکھتے ہیں اور ایسا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے جس میں اُردو زبان یا اُردو شاعر کی خدمت کر سکیں۔

افسوس یہ ہے کہ ان کی بعض تجاویز ہم اُردو والوں کی طرف سے پوری نہ ہو سکیں ورنہ ان کا تو کہنا یہ تھا کہ اُردو کے مشہور شعراء کے کلام کا انتخاب چھاپا جائے۔ جس میں خصوصاً پاکستانی شعراء کا کلام ہو۔ ساتھ ساتھ اسے ہندی سکرپٹ میں بھی پیش کیا جائے تاکہ اُردو شعراء کو ہندی پڑھنے والے بھی پڑھ سکیں۔ اگر انہیں ان شاعروں کو مزید پڑھنا ہو تو وہ اُردو رسم الخط کی طرف بھی آئیں۔ مجھے انہوں نے تجویز بھی دی تھی کہ ہم پاکستان میں عدم صاحب کے کلام سے شروع کرتے ہیں۔ پہلے ہم ان کے کلام کا انتخاب اُردو میں چھاپیں گے اور جب اسے بیچ لیں گے تو اسی آمدنی سے کسی اور شاعر کا کلام چھاپیں گے۔

یہ تجویز میں نے ان کے بیٹے عابد کو دی تھی اور کوئی ایک سال تک انہیں یاد دہانیاں بھی کراتا رہا۔ یہ انکم ٹیکس آفیسر تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے انسپکٹر صاحب سے کہہ رکھا ہے کہ وہ عدم صاحب کی کتابیں اکٹھی کر کے دے اور جونہی وہ یہ کتابیں اکٹھی کر کے دے گا تو وہ یہ سب کتابیں میرے سپرد کر دیں گے۔ وہ شخص نہ تو آج تک وہ کتابیں اکٹھی کر سکا اور نہ ان میں سے انتخاب کر کے ان کا منتخب کلام ساقی صاحب کے حوالے کر سکا ہوں۔ عابد صاحب کے تو عدم صاحب والد تھے اور وہ نفع نقصان کا جانتے ہوں گے' اس میں میری بھی کوتاہی شامل ہے کہ میں کسی اور ذریعے سے ان کی کتابیں جمع کر کے انتخاب کر لیتا لیکن ادھر بھی وہی بات ہے:

تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

میرا تو اپنے معاملے میں بھی یہ حال ہے کہ بمبئی کی ایک خاتون ستی شوری نے جو وہاں کی ایک کاروباری خاتون ہیں' نے مجھے آفر دی تھی کہ اپنے پورے کلام کا ایک انتخاب کر کے آپ مجھے دیدیں۔ میں اسے ہندی میں ترجمہ کروا کے یہاں سے شائع کروں گی اور اس کی تقریب رونمائی بھی منعقد کروں گی اور اس طرح جو آمدن بھی ہوگی وہ آپ کو دے دوں گی۔ آپ کی اس سے یہ خدمت بھی ہوگی کہ اُردو نہ جانے والے ہندی قارئین

بھی آپ کے کلام سے آگاہ ہو جائیں گے۔ لیکن یہ کام میں اپنے لئے نہیں کر سکا۔ ظاہر ہے جس طرح عدمؔ صاحب کا کام مجھ سے نہیں ہوا اسی طرح میرا کام بھی کسی دوست سے کیسے ہوتا اور میرا تو معاملہ یہ ہے کہ روز کنواں کھودتا ہوں اور روز اپنے لئے پانی حاصل کر رہا ہوں۔ روزی کا مسئلہ ایسا ہے کہ اگر اس سے الگ ہو جاؤں اور اپنا ہی کوئی فالتو کام اپنے ذمے لے لوں تو میرے لئے روزی کی مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس لئے یہ کام بھی کسی فرصت کے وقت کے لئے چھوڑ رکھا ہے اور اس مصروف زندگی میں اور آج کل کے مشینی دور میں فرصت بھی کسے نصیب ہو سکتی ہے۔ یہ تو وہی لوگ جان سکتے ہیں جنہیں جائز طریقے سے اپنی روزی حاصل کرنا ہوتی ہے اور وہ خون پسینہ ایک کر کے اپنے گھر کو چلاتے ہیں۔ اپنے بیوی بچوں کو آسائش کی زندگی دیتے ہیں جبکہ خود محنت کی بھٹی میں جلتے ہیں۔ مگر جو مزہ اس میں ہے وہ بھی اپنی جگہ ایک انوکھی شان رکھتا ہے۔

آخر میں اب یہ کہتا چلوں کہ مجھ سے اپنے سلسلے میں اور عدمؔ صاحب کے سلسلے میں جو کوتاہیاں ہو چکی ہیں ان کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے سلسلے میں ہونے والی کوتاہیوں کی تو یہ تلافی کر رہا ہوں کہ میں نے اپنے تمام مجموعے جمع کر کے اپنے دوستوں کے سپرد کر دیئے ہیں تاکہ وہ اس میں سے انتخاب کریں۔ ان دوستوں میں حضرت احمد ندیم قاسمی، شہزاد احمد اور ڈاکٹر خواجہ زکریا ہیں۔ یہ تینوں دوست انتخاب کا کام تقریباً مکمل کر چکے ہیں اور اس کے بعد میرا یہ پروگرام ہے کہ میں عدمؔ صاحب کے کلام سے خود انتخاب کروں۔ میں وہ کام بھی کرنا چاہتا ہوں۔ دعا کیجئے کہ میں اس فریضے سے بھی سبکدوش ہو سکوں جو کام ان کے ذمے کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ سوچتا ہوں کہ وہ کام میں کر جاؤں۔ اگر اب ہو سکا تو میں سمجھوں گا کہ میں بھی عدمؔ صاحب کا بیٹا ہوں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ عدمؔ صاحب ایک ایسے بزرگ تھے کہ انہوں نے اپنی شفقتوں کے طفیل اپنے سے نیچے سب جونیئر افراد کو یہی مقام دے رکھا تھا۔ عدمؔ صاحب کے سلسلے میں آگے چل کر کہوں گا کہ وہ کتنے دلچسپ، مشفق اور معصوم انسان تھے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ان کے سلسلے میں بعض کہانیاں مبالغہ آرائی کی حد تک بڑھا کر سنائی جاتی ہیں۔

دو کمیونسٹ دوست

جن دنوں میری رہائش راولپنڈی میں تھی، حسن طاہر صاحب بھی اس زمانے میں راولپنڈی ہی میں رہتے تھے۔ انتہا پسند ہیں بلا کے، کسی میدان میں قدم رکھ لیں تو وہاں قدم قدم سفر نہیں کرتے بلکہ چھلانگ لگا کر منزل تک ایک ہی جست میں پہنچنا چاہتے ہیں۔ ایک زمانے میں جب وہ کمیونزم کی طرف مائل تھے اور پارٹی کا کام باقاعدہ کر رہے تھے تو میں ہری پور میں تھا۔ یہ کہیں دیہات میں کسانوں میں گھومتے گھامتے ہری پور پہنچے۔ ہمارے مکان راولپنڈی اور ہری پور دونوں جگہ ہی تھے۔ ان دنوں میں ہری پور والے اپنے مکان کی بالائی منزل میں تھا جب مجھے پتا چلا کہ نیچے کوئی میرے دوست آئے ہیں جن کا نام حسن طاہر ہے۔ میں نے انہیں اوپر اپنے پاس ہی بلوالیا۔

آتے ہی کہنے لگے۔ دیکھئے قتیل صاحب! چاہے آپ اچھا سمجھیں یا برا سمجھیں میں آپ کو ایک بات بتا دوں کہ میں خدا کو نہیں مانتا۔ میں ہنس دیا اور میں نے کہا کہ طاہر صاحب! اس کا میری ذات سے کیا تعلق ہے۔ یہ تو آپ جانیں کہ آپ کو خدا کو ماننا چاہئے یا نہیں۔ آپ اگر مانیں گے یا نہیں مانیں گے تو اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ مجھے آپ ان لوگوں میں شمار نہ کریں جو آپ کی رائے سے اختلاف کر کے آپ کو چھرا مار دیں گے۔ جب تک آپ میرے پاس بیٹھے ہیں آپ میرے دوست ہیں۔ اس لئے آرام سے بیٹھیں اور کھل کر بات کریں۔ کہنے لگے کہ نہیں میں اس لئے آپ سے یہ بات کر رہا ہوں کہ اگر آپ کو میرا خدا کو نہ ماننا ناگوار ہو تو میں یہاں سے واپس چلا جاؤں۔ میں نے انہیں اٹھا کر

سینے سے لگا لیا اور کہا کہ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ آپ حسن طاہر ہیں اور میں قتیل شفائی اور ہم دونوں آپس میں دوست ہیں۔

ایک وہ زمانہ تھا اور ایک زمانہ اس کے بعد بھی آیا۔ یہ 1950ء کے لگ بھگ کی بات ہے۔ میں لاہور میں اپنے مصری شاہ کے گھر میں رہتا تھا۔ میں نے بیٹھک ہی میں ایک پلنگ بچھوایا ہوا تھا جس پر گول تکیہ رکھ کر میں رات کو دیر تک بیٹھا لکھا کرتا تھا۔ اس روز چونکہ گرمی زیادہ تھی میں نے باہر کا دروازہ کھلا چھوڑ رکھا تھا البتہ اس کی چک گری ہوئی تھی۔ رات کے تقریباً گیارہ بجے ہوں گے جب اچانک چک اٹھی اور دو اشخاص کچھ اس انداز سے کمرے میں داخل ہوئے جیسے ڈاکو داخل ہوتے ہیں۔ ایک آدمی کے ہاتھ میں ٹارچ تھی جبکہ دوسرے آدمی کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے۔ دونوں کے سر کے بال اور ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ میں پہلی نظر میں تو پہچان نہ سکا لیکن جب غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ ایک حسن طاہر ہیں اور دوسرے مصور علی امام۔ دونوں دوستوں کو یوں اچانک سامنے پا کر بہت خوشی ہوئی۔

میں نے مذاق سے کہا کہ کیا آپ لوگ اس وقت سٹوڈیو سے آ رہے ہیں۔ کہنے لگے کہ کون سا سٹوڈیو۔ میں نے کہا کہ جہاں آپ میک اپ کر کے یہ ڈاڑھیاں لگا کر آئے ہیں۔ سمجھ گئے اور میرے مذاق سے محظوظ ہوئے۔ بیٹھ گئے اور پھر انہوں نے بتایا کہ وہ حکومت کی نظر سے چھپے ہوئے ہیں اور انڈر گراؤنڈ ہیں۔ پھر کہا کہ ہم آج لاہور آئے ہیں اور آپ کے پاس رہائش اختیار کریں گے۔ میں نے کہا کہ بسم اللہ۔ شوق سے ٹھہریئے۔

یہاں میں پھر یہ بتاتا چلوں کہ میرا کمیونسٹ پارٹی سے کبھی تعلق نہیں رہا۔ لیکن میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہا اور جتنی پروگریسو تحریکیں ہوتی تھیں ان میں میں عملی شکل میں بھی موجود ہوتا تھا اور ان لوگوں کے ساتھ ہمدردی بھی ہوتی تھی۔ کمیونسٹوں سے لوگوں کو جو نفرت ہے وہ کمیونزم کو پوری طرح نہیں جانتے۔ ان جیسا میرا رویہ نہیں رہا۔ میرا نفرت کا رویہ تو دائیں بازو کی ان سیاسی جماعتوں سے بھی نہیں رہا جن کا مذہب ہی میں سمجھتا ہوں کہ سیاسی ہے اور وہ مذہب کو استعمال بھی کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کا طریق کار

ہے۔ شاید وہ بھی اسی منزل پر جا پہنچیں جہاں بائیں بازو والے پہنچنا چاہتے تھے۔ ممکن ہے کہ مقصد سب کا نیک ہو۔ اگر نیک نہ بھی ہو تو کبھی مجھے کسی سے نفرت نہیں ہے۔ میں بہرحال ہمیشہ بائیں طرف کے لوگوں سے ہمدردی رکھتا رہا ہوں۔

چنانچہ ان دونوں صاحبان کو میں نے بٹھایا۔ پھر ان کے بارے میں غور سے سوچا۔ اس وقت میرے پاس چار کمرے تھے اور بچے بھی چار ہی تھے۔ ایک کمرے میں تو میں الگ سے اپنا ڈیرہ جما کر رہتا تھا اور اس میں بھی کسی کو مداخلت نہیں کرنے دیتا تھا۔ ایک اس کے ساتھ والا کمرہ تھا جہاں میری بیوی اور بچے سب رہتے تھے۔ انہی کمروں کے پیچھے دو کمرے تھے جن میں سے ایک کو ہم سٹور کے طور پر استعمال کرتے تھے اور ایک کو مہمانوں کے لئے رکھا ہوا تھا۔ میں نے اپنے بیوی بچوں کو پچھلے کمرے میں شفٹ کر دیا اور انہیں اپنے ساتھ والے کمرے میں ٹھہرالیا جس کی کھڑکیاں باہر کی طرف کھلتی تھیں۔

یہ دن کے وقت وہیں رہتے تھے اور اگر کبھی دل چاہتا تو شام کے بعد میرے ساتھ گھوم لیتے تھے۔ علی امام جب تک جاگتے تھے۔ بیٹھے واٹر پینٹنگز بناتے رہتے تھے۔ حسن طاہر کوئی کتاب لے کر پڑھتے رہتے تھے اور میں حسب معمول مشق سخن کرتا رہتا تھا جو کہ میرا زندگی کا معمول رہا ہے۔ ان دنوں سی آئی ڈی میں ایک صاحب ہوتے تھے جن کا نام شوکت محمود تھا اور بلحاظ عہدہ سب انسپکٹر تھے۔ یہ گوجرانوالہ کے تھے اور چونکہ میرا تعلق راولپنڈی سے تھا اس لئے اس حوالے سے میرے دوست بن گئے تھے اور میرے پاس آتے رہتے تھے۔ ان کے اصل مقاصد تو ظاہر ہے پیشہ ورانہ تھے لیکن ہوتے ہوتے ان سے کچھ دوستی بھی بن گئی تھی۔ جب حسن طاہر اور علی امام میرے گھر آئے تو ان کے کوئی تیرہویں دن ان کا میرے گھر آنا ہوا۔ میرے دل میں وہم پیدا ہوا کہ یہ کہیں کوئی گڑبڑ کرنے نہ آئے ہوں۔ پھر جب وہ آئے تو کہنے لگے۔ قتیل صاحب! حسن طاہر اور علی امام لاہور میں آئے ہوئے ہیں۔ میرا دل دھک سے رہ گیا لیکن میں نے سنبھلتے ہوئے کہا کہ اچھا تو وہ کہاں ہیں۔ کہنے لگے کہ آپ سے مدد لینی ہے۔ آپ کے ساتھ اتنے تعلقات بھی بن چکے ہیں اور یہ ایسا موقع ہے کہ میں سوچتا ہوں کہ آپ کی کچھ خدمت بھی

کرسکوں۔ اگر آپ ان کی گرفتاری میں مدد کریں تو پیسوں کے علاوہ میں آپ کو ایک لائسنس والا پستول اور سند بھی دلوا سکتا ہوں۔

میں نے کہا جی چھوڑیئے! آپ لوگوں سے جھوٹے وعدے نہ کیا کیجئے۔ کہنے لگے کہ لایئے ہاتھ یہ میرا مردوں والا قول ہے۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید انہیں پتا چل گیا ہے کہ یہ دونوں میرے گھر میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور اسی لئے یہ مجھے لالچ دے رہا ہے۔ دراصل انہیں بالکل نہیں پتا تھا کہ یہ لوگ میرے گھر میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس وقت بھی وہ دونوں میرے گھر میں موجود تھے اور دوسرے کمرے میں دروازے کے ساتھ کان لگائے یہ ساری باتیں سن رہے تھے۔ میں نے کہا کہ اچھا جی آپ نے قول دیا ہے تو مجھے اب دو تین دن کی مہلت دیں میں انہیں گرفتار کروا دوں گا۔ کہنے لگے کہ یہ قومی کام ہے اس لئے ضرور کیجئے۔ خیر وہ چائے وغیرہ پی کر رخصت ہو گئے۔

بعد میں حسن طاہر اور علی امام میرے پاس آ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سب انسپکٹر نے ہمیں دھوکہ دینے کے لئے یا کسی اور وجہ سے آج یہ ظاہر نہیں کیا کہ اسے معلوم ہے کہ یہ دونوں یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ لیکن ممکن ہے کہ یہ کل ہی یہاں آ کر ان دونوں کو گرفتار کروا دے۔ چنانچہ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ہمیں آپ یہاں سے نکالئے اور کسی اور جگہ ہماری رہائش کا انتظام کیجئے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔

میں اپنے ایک دوست قمر اجنالوی کے پاس گیا۔ یہ آج کل روزنامہ ''مغربی پاکستان'' کے ایڈیٹر ہیں۔ یہ ان دنوں ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اور کرشن نگر میں رہتے تھے۔ ان سے میں نے کہا کہ کوئی اور انتظام ہونے تک آپ ان دونوں کو اپنے گھر میں رکھیئے۔ کہنے لگے کہ بالکل بھیج دیں۔ چنانچہ میں ان دونوں کو لے کر کرشن نگر پہنچا اور ان کے گھر میں انہیں چھوڑا۔

اس کے تیسرے ہی دن قمر صاحب بھاگتے ہوئے میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ میرے مکان کے آس پاس سی آئی ڈی کے آدمی گھومتے ہوئے نظر آئے ہیں۔ اس لئے آپ ان دونوں کے لئے فوری طور پر کوئی انتظام کیجئے۔ میں نے شریف صاحب سے

بات کی جو "انجم" رسالہ نکالتے تھے اور جن کا دفتر رائل پارک میں تھا۔ انہوں نے کہا کہ آپ انہیں لے آیئے۔ میں ان دونوں کو لے کر وہاں پہنچا۔ وہاں رہنے کے بعد ان دونوں نے سوچا کہ لاہور میں چھپ کر رہنے سے کیا فائدہ ہے۔ کوئی کام کاج تو ہو نہیں رہا جبکہ انہیں تو کسانوں اور مزدوروں میں جا کر کام کرنا ہوتا تھا اور بقول ان کے وہ بہت سا مفید کام کر چکے تھے۔ تو اچانک انہوں نے راولپنڈی جانے کا فیصلہ کیا اور چپ چاپ لاہور سے روانہ ہو گئے۔

اس کے چند دن بعد پتا چلا کہ وہ ندی لئی کے کنارے بیٹھے کپڑے دھو رہے تھے کہ پولیس نے انہیں وہاں سے گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد وہ نظر بند بھی رہے۔ علی امام تو اس کے بعد جب حالات نارمل ہوئے تو خود بھی وہ نارمل ہوئے۔ وہ کراچی میں چلے گئے اور وہاں جا کر انہوں نے اپنے آرٹ کے فروغ کے لئے کام کیا اور اس وقت علی امام ہمارے ملک کے بڑے آرٹسٹوں میں سے ایک ہیں اور بڑی متوازن زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کی گھریلو زندگی ہی نہیں بلکہ فنی اور سوشل زندگی بھی بڑی خوبصورت ہے۔ حسن طاہر صاحب کو کچھ عرصہ بعد دیکھا کہ پانچ وقت کی نماز پڑھ رہے ہیں اور مذہب کی ذرا سی بھی بات کیجئے تو اس جوش و جذبے کے ساتھ مذہب کی حمایت شروع کر دیتے ہیں جیسے وہ کمیونزم کے حق میں بات کرتے تھے۔ جیسے کہ میں نے کہا ہے کہ وہ ہر میدان میں انتہا پسندی سے کام لیتے ہیں۔ نمازی بننے کے کچھ عرصہ کے بعد ہم نے دیکھا کہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں لیکچرار ہوئے۔ وہ اپنی پوری سروس گزار کر اب ریٹائرمنٹ لے چکے ہیں اور علامہ اقبال ٹاؤن میں رہتے ہیں۔ مگر اب وہ نہ تو انتہا پسند Leftist ہیں اور نہ ہی انتہا پسند Rightist ہیں۔ اب ان کی زندگی میں بھی توازن پیدا ہو چکا ہے اور کہیں بھی کوئی اچھی چیز ہو تو اس کی تعریف کرتے ہیں۔ ان کی روشن خیالی اپنی جگہ قائم ہے اور میری ان کے لئے دعا ہے کہ وہ ہمیشہ روشن خیال رہیں اور انسانیت پرست رہیں۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے تو اسے جس طرح اقبال نے سمجھا اگر اس طرح کا مذہب ہو تو اس سے بہتر کوئی چیز نہیں اور سوشلزم یا کمیونزم اگر اس طرح کا ہو جس طرح حسرت موہانی نے اسے قبول کیا تو اس سے بہتر بھی

کوئی چیز نہیں۔

یہاں یہ بتاتا چلوں کہ پارٹیشن سے پہلے حسرت موہانی جب ساتواں حج کر کے لاہور ریلوے سٹیشن پر اترے تو انہوں نے اپنے طویل انٹرویو میں کہا تھا کہ سات حج کرنے کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ دنیا میں جو آئندہ قائم ہونے والا معاشی نظام ہے وہ سوشلزم ہے تو ایک کمیونسٹ مولانا بھی تھے:

ہے مشق سخن جاری ' چکی کی مشقت بھی

وہ پانچ وقت کے نمازی تھے لیکن معاشی نظام سوشلزم کا چاہتے تھے۔ ایسا سوشلزم میں بھی چاہتا ہوں اور ایسا مذہب میں بھی چاہتا ہوں جو کہ علامہ اقبال کا تھا اور جس میں ملائیت نہیں تھی۔ مسلم عقائد رکھنے کے سلسلے میں میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اللہ کے فضل وکرم سے میں نے عمرہ بھی کیا ہے اور یہ سرکاری خرچ پر نہیں کیا بلکہ اپنے خرچ پر کیا ہے۔ اس طرح میں ایک راسخ العقیدہ مسلمان بھی ہوں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ معاشی حد تک سوشلزم سے بہتر کوئی نظام نہیں ہے۔ دین اپنی جگہ ہے اور سیاسی و معاشی نظام اپنی جگہ ہے۔

اچھے دنوں کے دوست

میرا دوستی پر ایمان ہے' میں ہمیشہ دوستوں کے جھرمٹ میں رہا ہوں اور ابتدائی زندگی کے واقعات میں جیسے میں نے بتایا کہ اپنے باپ کا چھوڑا ہوا ترکہ جو نقدی' املاک اور زیورات کی شکل میں تھا اس میں سے بیشتر حصہ تو کچھ خودغرض رشتہ داروں کے مشوروں کی نذر ہوا اور کچھ ان دوستوں کی نذر ہوا جنہیں میں دوست سمجھتا تھا لیکن ایک اچھا مصرع جو احمد فراز نے دیا ہے:

دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

میں ہاتھ ملانے والے دوستوں سے بہت امیدیں رکھتا تھا۔ اس زمانے میں بھی وہ میرے ان احسانوں کا عشر عشیر بدلہ بھی نہ چکا سکے جو میں نے ان سے کئے ہوئے تھے۔ چنانچہ اس کے بعد میں دوستی کے معاملے میں محتاط ہوگیا تھا اور سمجھتا تھا کہ اب جو میرے دوست بنیں گے ان سے مجھے وفا کی امید بھی رکھنی چاہئے اور باہمی دوستی کے سلوک کے بھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اس میں کامیاب بھی رہا ہوں اور مجھے ایسے ایسے دوست میسر آئے جن پر میں فخر کرسکتا ہوں لیکن بہت آگے جاکر جب کچھ تلخ تجربے حاصل ہوئے تو میں نے سمجھا کہ:

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

کواکب تو کھلا دھوکا دیتے ہیں لیکن یہ دوست مخفی دھوکا دیتے ہیں جن کا انسان کو

بہت صدمہ ہوتا ہے۔

ایک بار ایسا ہی ہوا کہ ہم سرِ شام مینار پاکستان پر گھوم رہے تھے۔ بجلی بند ہوگئی اور میں پتھر کے فرش پر چلتے چلتے ایک نشیبی حصے میں پاؤں پڑ جانے کی وجہ سے گر گیا اور میرا پاؤں ٹوٹ گیا۔ اس زمانے میں میرے مالی حالات وقتی طور پر خراب تھے اور مجھ سے پہلے تنویر نقوی مفلوج ہو چکے تھے۔ وہ بڑے غیور آدمی تھے۔ مدد کی بات نہیں کرتے تھے اور یوں ہی کبھی کبھار پوچھا کرتے تھے کہ قتیل صاحب! اگر میں ٹھیک نہ ہوا تو میرے مالی ذرائع کیا ہوں گے۔ میں Dictate کر کے لکھوا کر کسی پرچے سے منسلک ہوسکتا ہوں۔ غرض وہ اس قسم کی باتیں کرتے تھے۔

اس حادثے کے بعد میرے ذہن میں بھی ایسی باتیں آنے لگیں۔ میں نے یہ نہیں سوچا کہ اللہ کے فضل سے میرے ہاں اولاد بھی ہے۔ لیکن میں اس حادثے کے بعد اس طرح اس لئے سوچ رہا تھا کہ میں نے زندگی میں اولاد کی طرف سے کبھی اس طرح مدد نہیں لی۔ میرے تین بیٹے ہیں۔ ان تینوں میں سے کسی ایک کی طرف سے بھی میرے گھر کے اخراجات میں ایک پیسے کی بھی مدد شامل نہیں ہے۔ اس لئے اس وقت بھی میرے ذہن میں ان کی مدد نہیں آ رہی تھی حالانکہ اگر ضرورت پڑے تو وہ میرے بیٹے ہیں اور میرے کفیل ہو سکتے ہیں۔ لیکن ذہن میں اس وقت بھی یہ نہیں آیا اور وسوسے دل میں آتے رہے کہ میں اب کیا کروں گا۔ لیکن قدرت مجھ پر ہمیشہ مہربان رہی ہے کہ جب بھی مصیبت آئی ہے تو اس نے اچانک کوئی سامان کر دیا ہے۔

اس حادثے کے بعد پہلے پندرہ دن کے دوران دوستوں کی اکثریت میری مزاج پرسی کے لئے آئی لیکن کچھ ایسے دوست بھی تھے جو پوچھنے نہیں آئے۔ جن دو چار اشخاص سے مجھے توقع تھی کہ وہ آئیں گے تو پوچھیں گے کہ کس حال میں ہو۔ آپ یقین جانیں کہ اس عرصہ میں کسی نے بھی مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ گھر کے اخراجات یا دواؤں کے لئے کوئی تکلیف تو نہیں ہے حالانکہ میرا اتنا اثاثہ تھا کہ کوئی تکلیف نہیں تھی۔ میں ضرورت پڑنے پر بیوی کے زیورات یا اپنے ہری پور کے مکانات بیچ سکتا تھا۔ اس لئے ایسی کوئی بات نہیں تھی

لیکن رسمی طور پر بھی بہت قریب کے دوستوں نے بھی مجھ سے نہیں پوچھا جس کا صدمہ آج تک مجھے ہے۔ اگر وہ کبھی جھوٹے منہ ہی پوچھ لیتے تو دوستوں پر میرا ٹوٹا ہوا اعتماد بحال ہو جاتا۔

خیر! دیکھئے کہ قدرت میری کیسے مدد کرتی ہے۔ اس حادثہ کے تقریباً پندرہ دن کے بعد ایک پروڈیوسر' میوزک ڈائریکٹر کو ساتھ لے کر میرے گھر پر آئے اور مجھے دیکھ کر کہنے لگے کہ آپ تو بیمار پڑے ہیں ہم تو اپنی فلم کے گانے لکھوانے آئے تھے۔ میں نے اپنی زندہ دلی سے کہا کہ آپ کو کس نے کہا تھا کہ میں پاؤں سے گانے لکھا کرتا ہوں۔ ٹوٹا تو میرا پاؤں ہے۔ اگر ہاتھ کبھی ٹوٹ جائے تو بھی کوئی بات نہیں۔ گانے ہاتھ سے بھی نہیں لکھے جاتے بلکہ ذہن سے لکھے جاتے ہیں۔

وہ میری بات سے بہت محظوظ ہوئے۔ انہوں نے ایک ہزار روپیہ نکال کر مجھے دیا اور کہا کہ یہ ایڈریس ہے باقی ادائیگی بعد میں ہوگی۔ اب میں آپ کو کہانی سناتا ہوں اور آپ کو گانے لکھتا ہوں گے۔ پس ان گانوں کا میوزک بنے گا۔ بیماری کے دوران یہ مجھے ملنے والا پہلا معاوضہ تھا۔ میں بہت خوش ہوا اور تیزی سے کام شروع کر دیا۔ اس کے بعد ٹی وی والوں کو جب پتا چلا کہ میں زخمی حالت میں بھی گانے لکھ رہا ہوں تو وہ بھی آنا شروع ہو گئے۔ اسی طرح ریڈیو والے بھی آتے رہے۔ اخبارات والے بھی یوں آتے رہے۔ ہوتا یہ تھا کہ جب کسی سے کوئی کام نہیں ہو پاتا تھا یا کوئی وعدہ خلافی کرتا تھا تو مجھے گھر پر فون آتا تھا اور میں گھر پر بیٹھا ہی ان کا کام کر دیتا تھا۔ فلم والے بھی اس کے بعد اسی طرح آئے اور یقین جانئے کہ اس دوران مجھے جو آمدنی ہوئی وہ عام حالات میں ہونے والی آمدن سے بھی کہیں زیادہ تھا اور مجھے مالی معاملے میں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔

اس سارے عرصے میں مالی مدد کا جو معاملہ ہے وہ یوں ہے کہ مجھے رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ایک بینک ڈرافٹ ملا۔ مجھے پتا نہیں چلا کہ یہ کس نے بھیجا ہے کیونکہ بھیجنے والے کا اس پر نام نہیں ہوتا ہے۔ میں اس پوزیشن میں بھی نہیں تھا کہ اسے واپس کر دوں اور اس پوزیشن میں بھی نہیں تھا کہ قبول کر کے بھیجنے والے کا شکریہ ادا کروں کیونکہ مجھے بھیجنے والے

کا پتا ہی نہیں تھا۔ لیکن بعد میں مجھے کسی طرح پتا چل گیا کہ یہ ڈرافٹ مجھے ڈیرہ غازیخان سے میرے دوست شاعر محسن نقوی نے بھیجا۔ میں آج تک اس شخص کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ اس وقت اس شخص سے میرے تعلقات اتنے قریبی نہیں تھے اور انہوں نے بھی مجھے سینئر سمجھ کر ایک جونیئر کا فریضہ سمجھ کر مجھے یہ ڈرافٹ بھیجا تھا۔ لیکن میرے قریب کے دوستوں نے مجھ سے پوچھا تک نہیں۔ جس کا مجھے آج بھی بہت دکھ ہے کیونکہ میں ان دوستوں سے بہت قربتیں محسوس کرتا تھا۔ بعض اوقات میرا ضمیر بھی مجھے ملامت کرتا ہے کہ میں نے کن لوگوں سے کیا توقع رکھی۔

اب کچھ ایسے دوستوں کا ذکر کرتا ہوں جو زندگی میں دوست بن کر آئے اور مجھ سے مالی مدد لی۔ کچھ نے تو کہا کہ ہماری مدد کرو۔ کچھ نے قرض لیا اور بالکل واپس نہ دیا لیکن میں اپنے دو دلچسپ مقروض آپ سے متعارف کروانا چاہتا ہوں۔

علامہ لطیف انور کا نام آپ کو یاد ہوگا۔ بہت بھلے آدمی تھے۔ وہ فن کے اساتذہ میں سے تھے اور بہت گٹھے ہوئے شعر کہا کرتے تھے۔ ان کے ایک بھائی ہیں۔ میں اس زمانے میں رائٹرز گلڈ کا سیکرٹری تھا۔ دیکھا کہ ان کے بھائی صاحب کو ہتھکڑی لگی ہوئی ہے اور وہ پولیس کے ایک آدمی کے ساتھ گلڈ کے میرے دفتر میں آ گئے۔ میز کے سامنے کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ میں شراب پیے ہوئے تھا کہ پکڑا گیا۔ آج مجسٹریٹ نے مجھ پر جرمانہ کر دیا ہے۔ جرمانہ زیادہ ہے جو میں ادا نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے مجسٹریٹ سے کہا تھا کہ قتیل شفائی میرے محسن ہیں۔ اگر آپ پولیس کے سپاہی میرے ساتھ بھیج دیں تو میں ان سے پیسے لے کر آپ کو جرمانہ ادا کر سکتا ہوں۔ کہنے لگے کہ وہ مجسٹریٹ آپ کا معتقد نکل آیا تو اس نے یہ سپاہی ساتھ بھیجا ہے اس لئے میں آ گیا ہوں۔ آپ میری مدد کر دیجئے۔

میں موصوف کے مزاج کو جانتا تھا لیکن میں اسے اس حالت میں دیکھ نہیں سکا اور میں نے اسے پیسے دے دیئے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ تین مہینے کے اندر اندر یہ رقم مجھے واپس دے دے گا۔ یہ تین مہینے بڑھتے بڑھتے تین سال بن گئے۔ میں نے اس سے کئی بار کہا کہ میرا قرض لوٹا دو۔ میں کوئی اتنا بےحس آدمی بھی نہیں ہوں۔ میں نے تمہاری اس وقت

کی ضرورت اور مجبوری کے تحت تمہیں پیسے دے دیئے تھے۔ اس نے لاپروائی کے ساتھ کہا کہ میرے پاس اب تک پیسے تو کہیں سے بھی نہیں آئے۔ میں آپ کو ادائیگی کیسے کر دیتا۔ میں نے کہا کہ تمہارا تو نوے دن کا وعدہ تھا اور تم اپنے بیوی بچوں کو بھی تو آخر کہیں سے خرچہ دے رہے ہو۔ کہنے لگا کہ وہ خرچ بھی مشکل سے چل رہا ہے۔ البتہ ایک طریقے سے آپ کو پیسے ادا ہو سکتے ہیں۔ اس نے بے فکری اور بغیر کسی ندامت کے کہا کہ آپ یوں کریں کہ مجھے کوئی اچھی سی نوکری دلوا دیں۔ پھر میں پچاس روپے ماہانہ کی قسط کی شکل میں آپ کا قرض لوٹا دوں گا۔ میں نے اس کی بات سنی تو اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور کہا کہ گرو تمہاری یہ تجویز بھی باکمال ہے۔ اس کے بعد میں اس کے پاس سے چلا آیا۔ اب بجائے اس کے کہ وہ میرا قرض لوٹاتا۔ وہ ہفتے دس دن کے بعد میرے پاس چلا آتا اور کہتا کہ میری نوکری کا کوئی انتظام ہوا ہے یا نہیں:

کوئی بتلائے کہ میں بتلاؤں کیا

اسی طرح دوسرے قرض کا بھی ذکر سن لیجئے۔ ہماری فلم انڈسٹری کے ایک بہت بڑے ڈائریکٹر ایس ایم یوسف تھے۔ اب دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ خدا انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ میرے ان سے نغمہ نگار سے زیادہ ایک دوست کی حیثیت سے تعلقات تھے۔ وہ سمن آباد میں رہتے تھے۔ ہماری شامیں اکثر اکٹھی گزرتی تھیں یا تو وہ میرے گھر آ جاتے تھے یا میں ان کے گھر جاتا تھا۔ دوستوں کی ہمراہی میں بھی ہم اکثر اکٹھے ہی بیٹھتے تھے۔

میں فلم کی تکنیک میں بھی ان سے گفتگو کر کے کچھ حاصل کیا کرتا تھا۔ ان پر ایک وہ وقت آیا کہ ان کی کچھ فلمیں ناکام ہوئیں۔ ہماری فلم انڈسٹری میں تو یہ حال ہے کہ اگر کسی کی ایک فلم ناکام ہو جائے تو انڈسٹری زیادہ سے زیادہ یہ انتظار کرتی ہے کہ شاید اس کی اگلی فلم کامیاب ہو جائے۔ پھر تو وہ شخص جمار ہے گا ورنہ اگر اس کے اور کوئی وسائل نہ ہوں تو اسے گھر بٹھا دیا جاتا ہے۔

ایس ایم یوسف کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا کہ وہ مقبولیت اور ڈسٹری بیوشن کے

اعتبار سے پچھلی صف میں چلے گئے۔ ان کا پہلا دور اچھا تھا اور اس دور میں انہوں نے نجانے مجھے مالی طور پر کتنا مضبوط سمجھ کر مجھ سے قرض لیا تھا اور میں نے قرض دے بھی دیا تھا۔ انہوں نے یہ قرض پھر واپس کر بھی دیا تھا۔ ان کا اب کا زمانہ مالی طور پر اچھا نہیں تھا۔ انہیں انڈیا جانا تھا تو انہوں نے کہا کہ قتیل صاحب! مجھے انڈیا میں کچھ روپیہ چاہئے انہیں معلوم تھا کہ وہاں میرے رشتے دار اور دوست بھی ہیں اور میں وہاں رقم کا بندوبست کر کے دے سکتا ہوں۔ مجھے کہنے لگے کہ آپ مجھے انڈیا میں کسی کے نام رقم کی ادائیگی کا خط دے دیجئے اور یہاں میرا بیٹا آپ کو Post Dated چیک دے دیتا ہے۔ آدھی رقم آپ کو اگلے مہینے مل جائے گی اور آدھی اس سے اگلے مہینے۔ آپ ان چیکوں کے ذریعے رقم کیش کروالیں۔

ایس ایم یوسف کے بیٹے اقبال یوسف ہیں۔ ان کی کچھ فلمیں ہٹ بھی گئیں اور انہوں نے نام بھی پایا۔ ان کی پہچان ایس ایم یوسف کے بیٹے ہونے کی وجہ سے بھی تھی۔ میرے ساتھ ان کا کبھی بطور نغمہ نگار کے بھی واسطہ نہیں پڑا کیونکہ ایس ایم یوسف تو ایک ثقہ قسم کے آدمی تھے جبکہ اقبال یوسف ایک کھلنڈرے قسم کے شخص تھے۔ ان کے ساتھ مزاج بھی نہیں ملتے تھے لیکن ایس ایم یوسف صاحب کا حکم تھا کہ میں ان کے چیک لے لوں اور ادائیگی ہو جائے گی۔

خود تو ایس ایم یوسف انڈیا چلے گئے اور انہیں میرے لئے چھوڑ گئے۔ میں نے اگلے ماہ جب پہلا ہی چیک بینک میں پیش کیا تو وہ Dishonour ہو گیا۔ میں نے انہیں بتایا تو اقبال یوسف صاحب کہنے لگے کہ وہ کسی ٹیکنیکل وجہ سے پاس نہیں ہو رہا۔ میں آپ کو دوسرا چیک دیتا ہوں۔ دو چار دن بعد دیں گے تو پیسے مل جائیں گے۔ میں نے یہ دوسرا چیک دیا تو یہ بھی Dishonour ہو گیا۔ کرتے کرتے دوسرا مہینہ آ گیا۔ اگلے ماہ دوسرا چیک دیا تو وہ بھی کیش نہ ہو سکا۔

اب میں نے دونوں چیک لے کر ان کا پیچھا کرنا شروع کیا تو یہ نوجوان آدمی تھے کہاں ہاتھ آتے تھے۔ میرے عزیز ہیں ریاض الرحمان ساغر۔ یہ منہ پھٹ قسم کے آدمی

ہیں اور سچے ہیں۔ وہ بھی ان کے پیچھے پڑے کیونکہ وہ بھی یوسف صاحب کے ملنے والوں میں سے تھے لیکن اقبال یوسف ٹس سے مس نہ ہوئے۔ حالانکہ باپ کی عزت رکھنے میں بیٹوں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔

ایس ایم یوسف ایک غیور اور بااصول آدمی تھے۔ انہوں نے اچھی زندگی گزاری تھی لیکن بیٹے کے ہاتھوں اس قرض کے سلسلے میں یوں بھی رسوا ہوئے کہ ایک بار ایور نیو سٹوڈیو میں فوارے کے پاس ریاض الرحمان ساغر نے ان سے تلخ کلامی کی اور لوگوں کو پتا چلا کہ باپ قرض لے کر گیا تھا اور بیٹے نے چیک دیئے تھے جو کیش نہیں ہو رہے اور یہ قرض ادا نہیں کرتے۔

ایس ایم یوسف جب انڈیا سے واپس آئے تو وہ مارے شرم کے میرا سامنا نہیں کر سکے۔ حالانکہ میں نے انہیں پیغام بھی بھیجا کہ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔ چلو میرے پیسوں کو گولی ماریں۔ ہم دوست ہیں اور ملتے رہیں گے۔ میرے لئے زیادہ عزیز پیسے نہیں بلکہ آپ زیادہ متاع عزیز ہیں۔ اس لئے آپ یا تو خود میرے پاس تشریف لائیے اور یا پھر مجھے بلوا بھیجئے۔ لیکن اس کے بعد وہ بالکل میرے سامنے نہیں آئے۔ پھر وہ کینیڈا چلے گئے۔ وہاں بہت سال رہے۔ اس کے بعد واپس آ کر بہت سال کراچی میں رہے۔ اس دوران لاہور میں آتے رہے اور بالآخر کراچی میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وہ مرتے دم تک اپنے ایک نالائق بیٹے کی وجہ سے اپنے اندر کی ملامت سمیٹے رہے۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اللہ انہیں جنت نصیب کرے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے بیٹے کو سیدھی راہ دکھائے۔ جو میرا خیال ہے کہ انہیں کبھی نظر نہیں آئے گی۔ کیونکہ اپنی انہی عادتوں کی وجہ سے وہ گرتے گرتے بالکل گمنامی کے گڑھے میں گرے ہوئے ہیں۔ اب اقبال یوسف کے نام سے بھی لوگ واقف نہیں ہیں۔

تیسرا واقعہ قرض کا تو نہیں لیکن انسان ایک مفت کی جو ندامت اٹھاتا ہے اور وہ بھی بغیر کسی جرم کے تو اس کی ایک مثال سن لیجئے۔ اداکار محمد علی ہماری فلم انڈسٹری کے نیک نام شخص ہیں۔ اعلیٰ درجے کی اداکاری کی وجہ سے بھی ان کی پہچان ہے۔ سوشل آدمی ہیں اور

ہر لحاظ سے ٹھیک ٹھاک ہیں۔ مالی طور پر بھی بہت اچھے ہیں۔ میں یہ اس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں جب وہ بطور ہیرو ٹاپ پر تھے۔

انہوں نے ایک فلم شروع کی جس میں نثار بزمی میوزک ڈائریکٹر تھے۔ انہوں نے مجھے اس فلم کے لئے نغمہ نگار چنا۔ طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی کام شروع ہوتا ہے تو کام سے پہلے ہر شعبے کا آدمی ایڈوانس کا مستحق ہوتا ہے۔ محمد علی صاحب بھی جب کسی فلم کے لئے سائن کرتے تھے تو ایڈوانس پہلے لیتے تھے۔ لیکن میں نے دیکھا ہے کہ جب اس قسم کے لوگ دوسروں کو سائن کرتے ہیں تو ایڈوانس دینا بھول جاتے ہیں یا پھر ضروری نہیں سمجھتے۔ یہ کام شروع کروا دیتے ہیں اور چونکہ ان کے تعلقات بہت ہیں اس لئے کام شروع ہو بھی جاتا ہے۔ لیکن اصولی طور پر مجھے ہمیشہ یہ بات کھٹکی ہے اور میں اس کا مخالف رہا ہوں۔

خیر میں نے بھی ان کی فلم کا کام شروع کر دیا۔ میں نے اس کے گانے لکھ کر دیئے جو ریکارڈ بھی ہو گئے۔ اس کے بعد پکچر رک گئی۔ گانے بزمی صاحب نے ریکارڈ کروائے تھے اور ظاہر ہے کہ میں معاوضے کا مستحق تو تھا۔ پہلے تو سوچتا رہا کہ محمد علی صاحب خود ہی پیسے بھیج دیں گے کیونکہ آدمی بڑے معقول تھے۔ مجھے یہ توقع تو ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ میرے پیسے مار لیں گے۔ لیکن ان کی طرف سے پیسے نہیں آئے۔

جب کوئی چھ ماہ گزر گئے تو ایک دن مجھے خیال آیا کہ میں ہی انہیں کیوں نہ یاد دہانی کروا دوں۔ چنانچہ کسی فلم کے سیٹ پر میں ان سے ملا۔ میں نے ان سے یہ کہنا مناسب نہ سمجھا کہ آپ کی طرف میرے دو گانوں کے پیسے بنتے ہیں بلکہ میں نے اور طرح سے انہیں کہا کہ علی صاحب! ان دنوں میں مالی طور پر زیادہ ہی ضرورت مند ہوں۔ اس لئے اگر آپ مجھے میری ادائیگی کر سکیں تو اس وقت میری مدد بھی ہو جائے گی۔ یہ الفاظ سن کر مجھے کہنے لگے کہ قتیل بھائی! آج کل میرے بھی حالات کچھ ٹھیک نہیں ہیں اور افسوس ہے کہ میں اس وقت آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اب مجھ میں اتنی اخلاقی جرات نہیں کہ انہیں کہتا کہ میں مدد نہیں مانگ رہا بلکہ میں تو اپنا قرض مانگ رہا ہوں۔ انہوں نے سمجھا ہوگا کہ شاید میں بھی ان سے اسی طرح مدد مانگ رہا ہوں جیسے فلم انڈسٹری میں دوسرے لوگ مانگتے

ہیں۔ انہوں نے میرا لفظ مدد سن کے یہ سب کچھ کہہ ڈالا تھا حالانکہ میں تو زندگی میں کبھی اپنا قرض بھی نہیں مانگتا چہ جائیکہ میں کسی سے مدد یا خیرات مانگتا۔ تو میں انتہائی نادم ہو کر اور اپنا سا منہ لے کر اپنے آپ کو ذلیل سمجھتا ہوا واپس چلا آیا اور آج تک میں نے انہیں کبھی یہ نہیں کہا کہ آپ کی طرف میرے دو گانوں کے پیسے بچتے ہیں۔

نہ انہیں کبھی یہ یاد آیا کہ انہوں نے کسی شاعر سے دو گانے لکھوائے تھے جن کی ادائیگی انہوں نے نہیں کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ان کا حافظہ تو ٹھیک ہے لیکن چونکہ معاملہ بہت چھوٹا ہے اس لئے وہ بھول گئے ہیں۔ ان کے اپنے کنٹریکٹ تو لاکھوں کے ہوا کرتے تھے اس لئے انہیں یاد رہ جاتے تھے جبکہ یہ معاملہ چند ہزار کا تھا شاید اس لئے ان کے ذہن میں یہ معاملہ نہ ہو اور وہ بھول گئے ہوں۔ بہر حال کوئی اتنی بڑی بات نہیں۔

محمد علی صاحب کے دو گانوں کے علاوہ میں نے فلم انڈسٹری میں اور اتنے لوگوں سے پیسے لینے ہیں کہ کس کس کا ذکر کیا جائے۔ یہ ذکر بھی میں نے اس لئے کیا کہ خواہ مخواہ کی ندامت میرے ذمے آئی۔ یعنی مجھے جو قرض لینا تھا وہ مدد یا خیرات کے ذیل میں آ گیا اور میں کئی دن تک ندامت محسوس کرتا رہا۔ اس کے بعد بھی محمد علی صاحب سے کئی محفلیں ہوئیں لیکن میں نے ان سے کبھی یہ ذکر نہیں کیا کہ یہ واقعہ بھی ہو گیا تھا۔

ایک چیز جب شرم اور ہچکچاہٹ میں لپٹ جائے تو میرا خیال ہے کہ پھر اس کا باہر آنا اتنا آسان نہیں رہتا۔ یہی حال کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔

بڑے لوگوں کے سامنے کلام

جن بڑے لوگوں کے سامنے مجھے کلام پیش کرنے کا موقع ملا' ان میں پنڈت جواہر لعل نہرو' خواجہ ناظم الدین اور مولانا ابوالکلام آزاد کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب انڈیا اور پاکستان میں اکثر ادھر ادھر مشاعرے ہوا کرتے تھے اور غالباً راجہ غضنفر علی کی مہربانی ہی سے یہ ہوتے تھے۔ وہ اکثر یہ کام کیا کرتے تھے کہ دونوں ملکوں کے تعلقات کو خوشگوار بنایا جائے۔

دہلی کے جس مشاعرے کا میں اب ذکر کر رہا ہوں اس میں پاکستان کے بھی سرکردہ شعراء موجود تھے۔ جن میں صوفی تبسم' سالک صاحب اور کراچی سے ظریف جبل پوری' سید محمد جعفری اور دیگر شعراء موجود تھے۔ پنڈت نہرو کی جانب سے پاکستانی شاعروں کے اعزاز میں چائے کا بندوبست کیا گیا تو اس میں یہ سب شعراء گئے۔ یہ چائے پارٹی پنڈت صاحب کی رہائش گاہ پر منعقد ہوئی تھی۔ انہیں اُردو سے لگاؤ تھا کیونکہ وہ الہ آباد کے رہنے والے تھے اور موتی لال نہرو کے زمانے ہی سے ان کے گھر میں اُردو کا چلن تھا۔ ہر چند اس وقت ہندوستان کی سرکاری زبان ہندی ہو چکی تھی لیکن وہ باقیات و صالحات ذہنوں میں سے تھے اور اس کے تحت پنڈت جی نے یہ اہتمام کیا تھا۔

وہاں سب لوگوں نے کلام سنایا۔ پنڈت جی بڑی سنجیدگی سے کلام سن رہے تھے اور جہاں ضروری ہوتا سر ہلا دیتے تھے۔ ان کا داد دینے کا انداز یہ تھا کہ ذرا زیر لب مسکرا دیتے یا ذرا سا ہلا دیتے۔ میں نے جو غزل سنائی اس کا مطلع تھا:

مسجد کی اذاں ہو کہ شوالے کا گجر ہو
اپنی تو یہ حسرت ہے کسی طرح سحر ہو

پنڈت جی نے کچھ زیادہ سر ہلانے کی فراخدلی کا مظاہرہ کیا۔ محفل ختم ہوئی تو چائے وغیرہ پی گئی اس موقع پر پنڈت جی نے یونہی سرسری سا مجھ سے پوچھا کہ آپ نے وہ سحر والا جو شعر پڑھا تو کیا آپ کی وہ حسرت پوری ہوگئی۔ میں اتنے بڑے آدمی کے سامنے کیا جواب دے سکتا تھا۔ اس زمانے میں تو ہم سب فیض صاحب سے لے کر نیچے تک یہی کہہ رہے تھے:

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

اب پنڈت جی کے سامنے تو یہ مصرع بھی دہرایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس طرح ایک بڑے آدمی سے ہم کلام ہونے کا موقع ملا۔

اس کے بعد دہلی کے مشاعرے میں گئے تو سالک صاحب اس میں خاص طور پر یہاں سے مولانا ابوالکلام آزاد کے لئے قراقلی کھال ٹوپی کے لئے لے کر گئے تھے۔ انہوں نے لکھ بھی رکھا تھا کہ میں نیاز حاصل کرنے آؤں گا۔ مولانا آزاد اس زمانے میں وہاں وزیر تعلیم تھے۔ ظاہر ہے کہ سالک صاحب کے نام سے ان کا سیکرٹری واقف نہیں ہوگا۔ انہوں نے ایک آدھ بار ٹرائی کی تو فون پر ان کا رابطہ نہ ہوسکا۔ اس کے بعد ہم جوش صاحب کے ساتھ ملنے کے لئے گئے تو ان سے کہا کہ سالک صاحب کو مولانا ابوالکلام آزاد سے ملنا ہے کچھ انتظام کیجئے۔ جوش صاحب کہنے لگے کہ کیا اس میں کوئی دقت ہے۔ وہ اپنے خاص انداز میں بولتے تھے۔

ہم نے کہا کہ دقت تو ہے۔ انہوں نے فوراً فون اٹھایا اور مولانا آزاد کے سیکرٹری سے کہا کہ ہم جوش بول رہے ہیں۔ مولانا سے ملوایئے۔ سیکرٹری نے ملوا دیا۔ انہوں نے کہا کہ مولانا ہم آرہے ہیں۔ ہمارے ساتھ لاہور سے سالک صاحب اور کچھ دوسرے دوست بھی آپ کے پاس آرہے ہیں۔ انہوں نے پتا نہیں کیا جواب دیا لیکن جوش صاحب نے فون رکھا اور ہم سب سے کہا چلو۔ ہم وہاں چلے گئے اور جا کر دیکھا کہ مولانا نے جو اور کام

تھے سب چھوڑ دیئے تھے اور وہ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ مولانا جوش صاحب کا اتنا احترام کرتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی یہ عادت دیکھی کہ وہ خود تو سگریٹ پی رہے تھے لیکن کسی اور کو سگریٹ آفر نہیں کر رہے تھے۔ سنا ہے کہ ان کی یہی عادت تھی۔ باتیں چلیں تو جوش صاحب نے کہا کہ یہ سب پاکستانی شعراء ہیں۔ مولانا کہنے لگے کہ ویسے تو میرے پاس زیادہ وقت تو نہیں ہوتا لیکن کلام سننے کو بھی بہت جی چاہتا ہے۔ اگر آپ تکلف محسوس نہ کریں تو اپنے دو دو شعر سنا دیں۔ ان کا مقصد ہماری عزت افزائی کرنا بھی تھا اور محظوظ ہونا بھی تھا۔ چنانچہ ہم نے دو دو شعر سنائے۔ جب سب نے دو دو چار چار شعر سنا دیئے تو اب جوش صاحب کا مرحلہ تھا۔ مولانا جوش صاحب سے کہنے لگے کہ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو آپ بھی کچھ ارشاد فرمائیں۔ جوش صاحب کہنے لگے نہیں مولانا۔ سالک صاحب نے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں آپ وہ سن لیجئے۔ چنانچہ سالک صاحب نے دو باتیں کی ہوں گی تو جوش صاحب شروع ہو گئے اور اس کے بعد ہم جتنی دیر وہاں بیٹھے رہے جوش صاحب ہی باتیں کرتے رہے اور مولانا چپ چاپ سنتے رہے۔

آدھا گھنٹہ گزر گیا تو سالک صاحب نے کہا کہ اب ہمیں چلنا چاہئے کیونکہ مولانا مصروف ہیں اور دوسرے لوگ بھی باہر بیٹھے مولانا کی فراغت کا انتظار کر رہے ہیں۔ جوش صاحب کہنے لگے ہمیں تو یاد ہی نہیں رہا کہ مولانا تو وزیر تعلیم بھی ہیں۔ بعد میں پتا چلا کہ اس طرح جوش صاحب پہلے بھی ایک بار مولانا سے ملنے کے لئے گئے تھے۔ انہوں نے جانے سے پہلے فون نہیں کیا تھا بلکہ وہاں جا کر باہر سے رقعہ بھیج دیا تھا۔ کافی دیر ہو گئی اور جب اندر سے بلوایا نہ گیا تو انہوں نے ایک رقعے پر لکھ دیا تھا:

اب تو مشکل ہے خون کھولانا
پھر کسی اور وقت مولانا

جوش صاحب یہ شعر لکھ کر اس وقت چھوڑ آئے تھے۔ یہ ایک دو سال پہلے کا واقعہ تھا۔ شاید اسی وجہ سے اب یہ ملاقات کچھ جلدی ہو گئی۔ یہ اس پرچی کا فیض ہو گا جو جوش صاحب

نے کبھی آزاد صاحب کے نام لکھی تھی۔

تیسرا بڑا نام خواجہ ناظم الدین کا آتا ہے۔ یہ یقیناً ایک بڑے آدمی تھے۔ جس زمانے میں وہ وزیراعظم تھے تو انہوں نے بھی کراچی ہی میں اپنی رہائش گاہ پر ایک مشاعرے کا انتظام کیا تھا۔ میری پوزیشن اس وقت یہ تھی کہ میں جونیئرز میں سے تھا۔ نام تو میرا ابھر آیا تھا لیکن مجھ سے اونچے نظر آنے والے بڑے بڑے ہاتھی اور دیو موجود تھے۔ اس کے باوجود اس مشاعرے میں شرکت کر لینا ہی مجھ جیسے جونیئر کے لئے بڑی بات تھی۔

اس مشاعرے میں انڈیا سے جگر صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ پاکستان کے سب صوبوں سے بھی بہت سے نامور شعراء آئے ہوئے تھے۔ تقریباً چالیس شعراء اس مشاعرے میں شریک تھے۔ جب خواجہ صاحب سن رہے تھے تو میں دیکھ رہا تھا کہ خواجہ صاحب میں شعری ذوق موجود ہے اور وہ مجھے برمحل داد دینے میں ماہر نظر آئے۔ پھر جتنے خلوص سے انہوں نے شاعروں کو خوش آمدید کیا تھا اور کھانے کے بعد جتنے خلوص سے الوداع کیا تھا۔ اس سے ان کا بڑا پن نظر آیا تھا۔ اب تو وہ اور بھی بڑے نظر آ رہے ہیں۔

ان کے بعد جو بھی آتا گیا اس کا قد چھوٹا ہی ہوتا گیا۔ آج ہم دیکھتے ہیں تو ہر طرف ہمیں بونے ہی بونے نظر آتے ہیں اور ادب کے معاملے میں تو لوگ یہاں بونے بھی نہیں بلکہ چیونٹیوں سے ہیں۔ آپ پہلے پاکستان کے ماضی کی طرف دھیان دیں تو جگہ جگہ ادبی سرگرمیاں ہوتی تھیں۔ خواجہ ناظم الدین جیسے لوگ حکومت میں بھی اور باہر بھی ملتے تھے۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا تو خاص طور پر ادب متاثر ہوا اور اب جب ہم نظر دوڑاتے ہیں اور اپنے ہی شہر لاہور میں دیکھتے ہیں جو کہ علم و ادب کا گڑھ تھا۔ اس میں ادبی ویرانی ایسی نظر آتی ہے کہ کسی بھی محفل سے شعر کی آواز سنائی نہیں دے رہی۔ وہ ہال جن میں ادبی کانفرنسیں اور شعری نشستیں ہوا کرتی تھیں، اب وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک وقت تھا کہ اوپن ایئر تھیٹر میں بھی ایسے ایسے کل پاکستان اور ہندو پاک مشاعرے ہوئے جن کی گونج اب تک آتی ہے لیکن اب وہ ماضی کا حصہ ہیں۔ حال میں ویرانی کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا۔

اس لئے کہ ایک مدت سے جو غیر جمہوری سرگرمیاں یہاں شروع ہوئی ہیں انہوں نے یہاں علم و ادب کے سوتے خشک کر دیئے ہیں اور ذاتی اغراض کی ایک جنگ اب شروع ہو چکی ہے۔ ہر شخص دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں لگا ہے۔

اب پاکستان میں جمہوری اور غیر جمہوری ادوار کا حساب لگایا جائے تو نسبتاً غیر جمہوری ادوار کا عرصہ زیادہ ملے گا۔ غیر جمہوری زمانوں میں سب سے بڑا یہ نقصان ہوتا ہے کہ اخلاقی قدروں کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ کی اقدار کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ انسانیت مر جاتی ہے۔ فرقہ واریت ابھرتی ہے' طبقاتی جنگ زرگری شروع ہو جاتی ہے۔ طبقاتی جنگ ویسے تو بہت مفید چیز ہے اور اس میں نچلے طبقوں کو کچھ حاصل ہوتا ہے لیکن طبقاتی جنگ زرگری میں علم و ادب پستا چلا جاتا ہے اور مادرِ علم و ادب کی کوکھ بانجھ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس وقت صورتحال یہی ہے کہ مسلسل مارشل لاء اور غیر جماعتی سیاسی سرگرمیاں جن میں آپا دھاپی ہوتی ہے اور جس کے پاس چار پیسے زیادہ ہیں وہ آ کر پردھان بن کر بیٹھ جاتا ہے حالانکہ اس کا پس منظر کوئی نہیں ہوتا۔ اس کے پاس علم و ادب' سیاست یا کسی اور چیز کا کوئی پس منظر نہیں ہوتا۔ صرف پیسے لگا کر پیسے بٹورنے کی ایک کوشش ہوتی ہے۔ یہ صورتحال جاری ہے اور اس کا جتنا بھی ماتم کیا جائے وہ کم ہے۔

اب ایک مدت کے بعد الیکشن ہونے والے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہی لوگ جو سیاست کو خلاف اسلام قرار دلوانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے' جو جمہوریت کو خلاف اسلام قرار دے رہے تھے وہ آگے ہیں اور جمہوریت اور سیاسی سرگرمیوں کا نعرہ لگا کر اور جماعتی انتخابات میں شامل ہو کر اپنے آپ کو عوام کا خادم ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ منافقین جب تک ختم نہیں ہوں گے یہاں شعر و شاعری' موسیقی اور مصوری اور رقص کا کوئی مستقبل نہیں۔

جس قوم کو بھی دیکھیں اس میں رقص موجود ہے۔ رقص ایک پاکیزہ اظہار خیال کا نام ہے جو جسم سے کیا جاتا ہے۔ کیا ضروری ہے کہ آپ اسے طوائف کے ساتھ ہی منسوب کریں۔ اگر آپ ہیرا منڈیوں میں جا کر اس کی سرپرستی کریں گے تو یقیناً یہ ایک بری چیز

ہوگی لیکن اگر اسے فن کے طور پر قبول کریں گے تو یہی قوم کے لئے ایک صحت مند چیز ہوگی۔ لیکن یہ سوچنے کے لئے اور ذہنوں کی ضرورت ہے جو کھلے ذہن ہوں اس میں تنگ نظری اور تعصبات رکھنے والے گروہوں کی گنجائش نہیں کہ وہ آ کر اس کا احیاء کر سکیں۔

میرے خیال میں بالآخر یہی ہوگا کہ یہ لوگ اپنے تعصبات اور شک نظری کی وجہ سے اپنے مذہب کو بدنام کریں گے اور اپنے اعمال کو مذہب کی چادر میں لپیٹ کر ساتھ مذہب کو بھی لوگوں کی نظروں سے دور کر دیں گے۔ پھر وہ وقت آ جائے گا جو برا ہوگا۔ اب تو مجھے اس ملک میں کوئی لادین نظر نہیں آتا لیکن خدانخواستہ وہ وقت نہ آ جائے جب لوگ لادین ہو کر پھر ایسے برے رجحان کی طرف راغب ہو جائیں جو آرٹ کے ذیل میں نہیں آتا۔ جس طرح ان تنگ نظر لوگوں کا آرٹ کا نظریہ برا ہے اسی طرح ان بے دین لوگوں کا نظریہ بھی یہ ہوتا ہے کہ وہ بھی سب شعری و ادبی سرگرمیوں سے انکار کر دیتے ہیں اور ان کی سرگرمیاں بھی ان لوگوں سے کم نہیں ہوتیں۔ میرے خیال میں علم و ادب، فنون لطیفہ اور شعر و شاعری کو سرپرستی ملنی چاہئے اور میں اس میں کھیلوں کو بھی شامل کرتا ہوں۔

یہ وہ ملک ہے جہاں لڑکیوں کو ہاکی کھیلنے کی اجازت نہیں دی جا رہی اور انہیں یہ نہیں پتا کہ کھیل قوم کی صحت کے لئے تو ٹھیک ہے ہی اس سے ذہنی وسعتیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ کھیل بہت سی برائیوں سے بچاتی بھی ہے۔ صحت مند جسم صحت مند ذہن پیدا کرتا ہے اور توجہ ایک اچھے کام پر لگی رہتی ہے۔ نسبتاً ایک ان پڑھ عورت جو بیکار ہو اور اس کا کوئی مشغلہ نہ ہو اور اوپر سے اس کے معاشی حالات بھی ویسے ہوں جیسے ہمارے ملکوں کے ہوتے ہیں تو ایسی عورت جب پھسلتی ہے تو گناہوں کے اندھے کنویں میں جا گرتی ہے اور پھر وہاں سے اس کا نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ملک کو جو صحت مند چیزیں درکار ہیں وہ نہ تو ہمیں مولوی دے سکتا ہے اور نہ ہی انتہا پسند لادین دے سکتا ہے۔ یہ چیزیں تو متوازن اور پاکیزہ ذہن کے لوگ ہی دے سکتے ہیں۔ جن میں حس لطافت اور حسن جمال ہو۔ صرف یہی لوگ احیاء کر سکتے ہیں ان چیزوں کا جن کی اس ملک کو اشد ضرورت ہے۔

اب انتخابات ہو رہے ہیں خدا کرے کہ یہ انتخاب' انتخابات کے اس سلسلے کا پیش خیمہ ہو جو کسی ملک کے لئے چھلنی کا کام دیتے ہیں۔ وقت مقررہ پر الیکشن ہو جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم آئندہ کے لئے کوئی اچھے افراد چن لیں اور پہلے ہمیں جن برے لوگوں سے رابطہ ہے ان سے ہم جان چھڑالیں۔ اس ملک میں ابھی تک تو باقاعدہ الیکشن کی روایت بنی نہیں لیکن اگر بن گئی تو یہ ملک جتنا جوہر قابل رکھنے والا ملک ہے تو یہ بہت ترقی کرے گا۔ میں یہ بات اس لئے نہیں کہہ رہا کہ یہ میرا ملک ہے بلکہ واقعی اس میں بہت ذہین اور فطین لوگ موجود ہیں۔

اگر اس ملک میں جمہویت کو پنپنے دیا جائے اور الیکشن کے ذریعے لوگ سامنے لائے جائیں تو پھر آپ کو پتا چلے گا کہ یہ جوہر قابل کہاں کہاں اپنے کمالات دکھاتے ہیں۔ ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ ہم مرد تو ذہین ہیں ہی' ہماری عورتیں بھی اتنی ذہین' لائق' نیک اور پاکدامن ہیں کہ اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ جہاں تک میری نظر جاتی ہے بشرطیکہ ہم انہیں آگے بڑھنے کا پورا موقع دیں اور جمہوریت کو اپنائے رکھیں۔

مجھے ان لوگوں پر افسوس ہوتا ہے اور ان کے دعوے باطل نظر آتے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم قائداعظم کے پاکستان کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں اور ہم قائداعظم کے اصولوں پر چلتے ہیں۔ قائداعظم کے اصول کیا تھے؟ انہوں نے یہ ملک مسلمانوں کے لئے بنایا تھا اور تلقین یہ کی تھی کہ اپنے آپ کو پاکستانی کہو۔ ہم اپنے آپ کو پاکستانی نہیں کہتے۔ جو یہ کہتا ہے کہ مسلمان بنو۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہاں جو ہندو' سکھ یا عیسائی ہیں کیا آپ انہیں بھی کہہ رہے ہیں کہ مسلمان بنو۔ اگر آپ پاکستانی بننے کے لئے کہیں گے تو اس میں وہ بھی شامل ہو جائیں گے ورنہ آپ قائداعظم کے اصولوں پر عمل نہیں کر رہے۔ آپ اپنی اقلیتوں کو احساس کمتری میں مبتلا کرتے ہیں۔

قائداعظم نے الیکشن کا جو طریقہ رکھا تھا وہ جماعتی الیکشن تھا۔ ان کی اپنی جماعت مسلم لیگ تھی جس کے مقابلے میں کئی سیاسی جماعتیں تھیں۔ قائداعظم نے جماعتی الیکشن لڑ کر اور جیت کر یہ ملک قائم کیا تھا۔ جو لوگ غیر جماعتی الیکشن کر کے آگے آتے ہیں قائد

اعظم کے پاکستان سے ان کا کیا تعلق ہے۔ یہ سارے دعوے بالکل باطل ہیں اس طرح ہمارے مرحوم ضیاء صاحب نے چار سال پہلے علماء کرام کو ساتھ ملا کر اور ایڑی چوٹی کا زور لگا کر فتووں کے ذریعے یہ ثابت کرانے کی کوشش کی کہ سیاست غیر اسلامی چیز ہے۔ اس کے لئے انہوں نے فتویٰ فروش مولویوں سے فتوے بھی لئے۔

جو شخص سیاست کو غیر اسلامی ثابت کرنا چاہتا ہے اور سیاستدان کو برا سمجھتا ہے تو اس کے نزدیک یا اس کے پیروکاروں کے نزدیک قائداعظم کی کیا حیثیت رہ گئی۔ کیونکہ قائد اعظم تو سیاست کرتے تھے اور ہم سب میں سب سے بڑے سیاستدان وہی تھے۔ جو سیاست کو برا سمجھتا ہے وہ قائداعظم کو بھی برا سمجھتا ہے۔ جو سیاستدان کو برا سمجھتا ہے وہ بھی قائداعظم کو برا سمجھتا ہے۔ اگر ہم اس طرح سے قائداعظم کو برا سمجھتے ہیں تو ہم ان کے پیروکار کہاں سے ہوئے۔

یہ لوگ قائداعظم کا نام بیچ رہے ہیں۔ جو شخص بھی اٹھتا ہے وہ قائداعظم کا نام بیچتا ہے۔ قائداعظم کی روح پر کیا گزر رہی ہو گی یہ تو وہی جانتے ہوں گے لیکن میرے جیسا آدمی جس نے قیام پاکستان سے پہلے قیام پاکستان کے لئے کوشش کی تو اس کی روح بھی تڑپ اٹھتی ہے۔ اگر مجھ جیسے لوگوں کو اس سے اتنی تکلیف پہنچتی ہے تو یقیناً قائداعظم کی روح بھی اس قسم کے رویئے سے جنت میں تڑپ اٹھتی ہو گی۔

قیام پاکستان سے پہلے ریفرنڈم میں لوگوں نے کیسے کیسے مجاہدے کئے۔ آج کی نئی نسل کو یہ معلوم نہیں کہ یہ جدوجہد کیوں شروع ہوئی تھی۔ اس کی تاریخ تو لمبی چوڑی ہے لیکن مختصراً یہ کہوں گا کہ اس مطالبے میں جو عوامل شامل تھے ان میں برادران وطن کی مسلمانوں کے لئے نفرت بھی شامل تھی اور ایک ایسی تجارتی بالادستی بھی شامل تھی کہ جس کی بنیاد بھی نفرت ہی پر تھی۔ یہ ساری چیزیں دیکھ کر مسلمانوں نے جب ماضی میں مصالحانہ طور پر کچھ مطالبات کئے تھے تو وہ مطالبات کانگریس کے انتہا پسند لوگوں نے نہیں مانے تھے۔ تو پھر اس وقت کانگریس میں شامل مسلمان لوگوں نے اس سے نکل کر اپنی جدوجہد شروع کی۔ ان کی اس تحریک میں ایسی جان پڑ گئی اور اس کی صداقت ایسی نظر آنے لگی تھی کہ وہ کامیابی

سے ہمکنار ہوئے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے کمیونسٹ پارٹی نے قیام پاکستان کی حمایت کی تھی۔ اس حمایت کے بعد بہت سے وہ لوگ جو ترقی پسند ذہن رکھتے تھے پاکستان کے حامی بن گئے تھے۔

میرا معاملہ تو یہ ہے کہ میں نے سب معاملات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوئے تھے اور میں قیام پاکستان کا حامی بھی تھا۔ پھر میرا جھکاؤ لیفٹ کی طرف تھا اور جب ادھر سے بھی قیام پاکستان کی حمایت ہوگئی تو میں نے اس میں مزید دلچسپی لی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مجاز لکھنوی نے بھی ترانہ لکھا تھا:

راوی کی لہروں پر چمکا ایک ہلال ایک تارا

جوش ملیح آبادی اور دیگر کمیونسٹ شاعروں نے بھی قیام پاکستان کے حق میں اشعار کہے تھے۔ میں سرحدی ہونے کے ناتے سے وہاں پر سرگرم عمل تھا۔ وہاں پر جن دو ایک لوگوں نے تقریر کے انداز میں متاثر کیا ان میں مولانا شوکت علی جن کے ساتھ میں رہا' ان کے علاوہ مولانا حامد بدایونی اور نواب بہادر یار جنگ کی تقاریر نے بہت متاثر کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں نیا نیا شاعر تھا اور جیسے جونیئر لوگ جلسوں میں بڑے بڑے رہنماؤں کی تقاریر سے پہلے نظمیں پڑھتے ہیں اسی طرح میں بھی ان رہنماؤں کے جلسوں میں نظمیں پڑھا کرتا تھا۔

نواب بہادر یار جنگ حیدر آباد دکن کے رہنے والے تھے۔ ان کے پاس بہادر یار جنگ کا خطاب تھا لیکن جب قائداعظم نے خطاب واپس کرنے کو کہا تو انہوں نے خطاب واپس کر دیا تھا۔ ویسے قائداعظم کی اپیل پر سب سے پہلے خطاب واپس کرنے کا سہرا میرے ہی علاقے کے ایک صاحب خان بہادر جلال الدین تھے جو عرف عام میں خان بابا کہلواتے تھے اور جن کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔

بہرحال جن لوگوں نے قائداعظم کی اپیل پر فوراً اپنے خطاب واپس کئے انہی میں سے ایک نواب بہادر یار جنگ تھے جو اب نواب بہادر خان کے نام سے کہلوائے جانے لگے۔ جب یہ ہری پور میں تشریف لائے تو ان کی تقریر ہوئی۔ میں نے اور بہت سے لوگوں

کی تقاریر بھی سن رکھی تھیں جو باقاعدہ ایکشن اور اداکاری کے ساتھ تقریریں کرتے تھے۔ درمیان میں نعرہ تکبیر بھی لگاتے تھے مگر ان کا انداز ان سب سے مختلف تھا۔

یہ تو بہتی ہوئی ایک پرسکون ندی کے بہاؤ کی طرح تقریر کرتے تھے۔ جب سٹیج پر کھڑے ہوتے تو شیروانی کے اوپر والی دو جیبوں میں اپنے انگوٹھے پھنسا لیتے تھے اور جسم کو کوئی حرکت نہیں دیتے تھے۔ یہ شیروانی کے ساتھ تنگ موری کا پاجامہ اور ترکی ٹوپی استعمال کرتے تھے۔ چہرے پر ہلکی سی ڈاڑھی تھی۔ انہوں نے ہری پور میں ڈھائی گھنٹے تک تقریر کی جو میں نے سنی اور مجھے کوئی تھکان نہ ہوئی۔

ان کی تقریر میں نعرے بازی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی تھی کیونکہ لوگ سوچتے تھے کہ اگر نعرہ لگا تسلسل ٹوٹ جائے گا اور وہ مزا نہیں آئے گا۔ اس طرح ہوتا تھا جیسے وہ کوئی لکھی ہوئی کتاب پڑھ رہے ہوں۔ ان کی تقریر میں ایسی روانی ہوتی تھی اور سناٹا ایسا ہوتا تھا کہ اگر سوئی گرے تو اس کی بھی آواز آئے۔ پھر ان کی ساری تقریر ادبیانہ ہوتی تھی مگر ایسی بھی نہیں کہ لوگوں کے سر سے ہی گزر جائے۔ لوگوں کو سمجھ بھی آتی تھی مگر اس میں انشاپردازی کے موتی پروئے ہوئے ہوتے تھے۔

جب تقریر ختم کرنے لگے تو کہنے لگے کہ اب جبکہ لیلائے شب کی زلفیں تا بہ سحر پہنچی ہیں اور میں آپ کی آنکھوں میں نیند کے ڈورے دیکھ رہا ہوں تو مناسب یہی ہے کہ میں آج بہ حسرت و یاس آپ سے رخصت ہو جاؤں اور ایک ایسی تمنا اور کسک لے کر آپ کے پاس سے دور جاؤں جو مجھے پھر کھینچ کر آپ کے پہلو میں لے آئے۔

اس قسم کے الفاظ انہوں نے کہے تھے۔ ڈھائی گھنٹے تک لوگ بالکل خاموشی سے بیٹھے رہے۔ لوگ اتنی دیر خاموشی کے ساتھ سماع میں بھی نہیں بیٹھتے مگر وہاں بیٹھے رہے اور کوئی بدبخت ہی ہوگا جو اس دوران اٹھ کر ادھر ادھر گیا ہوگا۔

اس کے علاوہ جس گراؤنڈ میں انہوں نے تقریر کی اسی گراؤنڈ میں میں نے پہلے مہاتما گاندھی کی تقریر بھی سنی تھی۔ بہادر یار جنگ کی زبان تو اُردو ہی تھی لیکن مہاتما گاندھی اُردو نہیں جانتے تھے۔ ان کا یہ تھا کہ بہت ہی عام سی زبان میں بہت اچھی باتیں کرتے تھے۔

ان کے پیش نظر بہت پسی ہوئی مخلوق ہوتی تھی۔ ان کا ادبیانہ لہجہ تو تھا نہیں لیکن وہ جو زبان جانتے تھے اور جس میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے وہ بڑی دلنشین تھی۔ اگرچہ اس وقت ہمارے کچھ ادبیانہ ذہن رکھنے والے لوگ حرف گیری بھی کر رہے تھے کہ دیکھئے انہوں نے یہ کہہ دیا مگر سچ یہ ہے کہ ان کا انداز بڑا دلنشین تھا۔ میں نے بعد میں اپنے ان دوستوں سے کہا تھا کہ وہ کسی حلقہ ارباب ذوق میں آ کر کسی افسانے پر بحث نہیں کر رہے بلکہ ان کے سامنے تو وہ پبلک ہے جسے انہوں نے اپنا پیغام دینا ہے۔ اس لئے آپ اس چیز کو دیکھیں کہ انہوں نے کیا کہا ہے۔ اگر آپ کو زبان دانی سے لطف اندوز ہونے کی ضرورت ہے تو اس کے محل اور بھی ہیں۔

اس زمانے میں کانگریس کی مخالفت میں پوری حکومت ہند اور کچھ اس کے خریدے ہوئے لوگ بھی تھے۔ ایسا بھی ہوا کہ مہاتما گاندھی کی تقریر کے دوران ایک گوشے میں کھڑے ہوئے دس بارہ افراد نے جو حکومت کے خریدے ہوئے تھے شور مچایا۔ یہ بالکل خاموش کھڑے رہے۔ وہ ذرا دھیمے ہوئے تو یہ کہنے لگے کہ میں نے آپ کو بات کرنے کا موقع دیا؟ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہر شخص کو بات کرنے کا موقع ملنا چاہئے۔ اگر آپ نے کوئی اور بات کرنی ہے تو میں تھوڑی دیر کے لئے اور چپ رہ لیتا ہوں۔ اتنی دیر میں لوگوں نے ان افراد کو مار پیٹ کر باہر نکال دیا ہوا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے پھر تقریر شروع کی اور کہا کہ میں اختلاف رائے کو پسند کرتا ہوں لیکن یہ میرے بھائی جو چیخ رہے تھے وہ نامناسب ہے۔ انہوں نے چیخنے کے الفاظ استعمال کئے تھے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو اس لفظ کے معنی بہت گہرے ہیں۔ کیونکہ کتوں کے لئے بھی چیخنے ہی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ پھر چیخنا کا مطلب شور مچانا بھی ہے۔ تو اپنے استاد شفا صاحب کو جب میں نے بعد میں بتایا کہ مہاتما گاندھی نے یہ لفظ استعمال کیا تھا اور یہ کہہ رہے تھے تو وہ کہنے لگے کہ وہ تو پھر بہت زبان دان ہیں کیونکہ اس کے بہت سے معانی نکلتے ہیں اور بالواسطہ طور پر انہوں نے ان لوگوں کو کتا بھی کہہ دیا ہے۔ بہرحال مہاتما گاندھی نے اس موضوع پر لمبی تقریر کی کہ اختلاف رائے برداشت کرنا چاہئے مگر یہ افراد جن لوگوں کے بھیجے ہوئے تھے وہ

اختلاف رائے برداشت نہیں کرتے۔ میں جو بات کہتا ہوں وہ سنتے نہیں ہیں بلکہ گڑبڑ کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر کہنے لگے کہ میں تو ان لوگوں کو بھی سننے کے لئے تیار ہوں۔

غرض وہ اس طرح میٹھے میٹھے انداز میں تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کرتے رہے اور مجھے ان کی تقریر میں بھی بہت مزا آیا۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک بڑے آدمی تھے۔ ان کے خیالات سے اتفاق نہ کروں یا میرے دوسرے بھائی اختلاف کریں تو یہ اور بات ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کے چند بڑے لوگوں میں سے مہاتما گاندھی ایک تھے۔ ان کی باتیں بڑی دلنشین تھیں۔

میں نے پنڈت نہرو کو راولپنڈی کے کمپنی باغ میں تقریر کرتے ہوئے سنا تھا۔ ان کا انداز تقریر اور تھا۔ ان کی زبان میں اُردو کی چاشنی تھی اور وہ بالکل عوامی تقریر نہیں کرتے تھے بلکہ پڑھے لکھے لوگوں کو بھی ساتھ لے کر چلتے تھے۔ جب وہاں تقریر کرنے کے لئے آئے تو جہاز سے آئے تھے۔ اس جلسے میں اکثریت تو ظاہر ہے کہ ہندوؤں کی تھی جیسے کہ مہاتما گاندھی کی تقریر میں بھی تھی۔ لیکن نہرو کی تقریر سننے کے لئے مسلمان بھی جاتے تھے اور اس موقع پر بھی بہت سے مسلمان گئے تھے۔ جب ہم نے بھی سنا تھا کہ پنڈت نہرو آرہے ہیں تو پنڈی میں ہمارے محلے میں سے بھی بہت سے لوگ ان کی تقریر سننے گئے تھے۔

چونکہ یہ بھی پتا تھا کہ وہ کانگریسی ہونے کے علاوہ سوشلسٹ بھی ہیں۔ اس لئے بھی ہمیں دلچسپی تھی۔ ان کے بارے میں یہ داستانیں بھی سنی تھیں کہ وہ جب کانگریس میں شامل نہیں ہوئے تھے تو ان کے کپڑے پیرس سے دھل کر آتے تھے کیونکہ یہ بہت بڑے رئیس زادے تھے۔ مگر ہم نے انہیں دیکھا کہ کانگریس میں شمولیت کے بعد وہ اب سادہ کپڑے پہننے لگے تھے اور ایسے ہی سادہ کپڑوں میں تقریر کرنے کے لئے بھی آتے تھے۔

ان کی تقریر میں کچھ انگلش مدبرین اور کچھ دوسری کتابوں کے حوالے موجود تھے۔ پھر انہوں نے آزادی ہند اور انگریزوں کے مظالم کی بات کی۔ ان کا رویہ وہی تھا جو ایک

حریت پسند آدمی کا ہوسکتا ہے۔ جو لوگوں کو انگریزوں سے نفرت دلانا چاہتا ہے۔ وہ اپنی سب باتیں بہت موثر طریقے سے بیان کرتے رہے اور ایک عرصے تک ان کے فقرے ہمارے ذہنوں میں گونجتے رہے۔

ان تین آدمیوں سے ہٹ کر اگر میں نے بچپن میں ان سے بھی پہلے اگر کسی بڑے آدمی کی تقریر سنی تھی تو وہ قائداعظم ہی تھے۔ اسی راولپنڈی میں اسلامیہ ہائی سکول کی گراؤنڈ میں وہ ایک مختصر سے دورہ کے سلسلہ میں آئے تھے۔ یہ غالباً 1937ء کی بات ہے اور اس زمانے میں وہ نئے نئے اُبھرے تھے۔ جب وہ وہاں آئے تو لوگوں کو صحیح طور پر یہ بھی نہیں پتا تھا کہ ان کا نام محمد علی جناح ہے یا جائناح ہے۔ یہ سفید رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ دبلے پتلے تھے اور اس وقت ان کے سر پر سفید بالوں کی وہ لٹ نہیں تھی جو ان کی پہچان بنی۔ مگر ان کے بال بہت خوبصورت تھے اور ان پر سوٹ بہت سج رہا تھا۔

وہ وہاں آئے تو ان کا بہت گرم جوشی سے استقبال ہوا۔ انہوں نے انگریزی میں تقریر کی۔ ہمیں انگریزی زبان بالکل نہیں آتی تھی لیکن عجب بات ہے کہ ایسے لگ رہا تھا جیسے ان کی باتیں سمجھ آ رہی ہیں۔ حالانکہ ایسی بات نہیں تھی بلکہ اس کے برعکس ہم ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ چنانچہ کوئی ایک لفظ کہتا اور کوئی دوسرا اور ہم اندازے ہی سے ان کی بات سمجھتے رہے۔ بہرحال ان کی تقریر سب لوگوں نے انتہائی عقیدت سے سنی۔ ان کے عقیدت مندوں نے ان کی کار میں کچھ مشروبات رکھے اور وہ کچھ دن مری میں گزارنے کے لئے مری چلے گئے۔

میں نے سب سے پہلے جو کسی بڑے آدمی کے دیدار کئے وہ قائداعظم ہی تھے۔ لیکن ان سب چیزوں سے ہٹ کر ہر شخص کا اپنا ایک رنگ اور آہنگ تھا۔ اگرچہ سب کی منزل ایک ہی تھی اور وہ انگریز سے نجات حاصل کرنا اور آزادی بھی تھی۔ مگر مسلم لیگ نے آ کر ایک اور نعرہ اس لئے دے دیا کہ شاید یہ سب نہیں مل سکتے تھے اور آزادی کی جو نعمت سب کے لئے تھی اس میں مسلمانوں کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اس لئے انہوں نے علیحدہ راستہ نکالا۔ اس میں بھی بنیاد بہرحال ہندوستان سے انگریز کو نکالنا تھی۔

میں نے اسی زمانے میں سب کی تقریریں سنیں اور ذہن میں ان کو نقش کرلیا اور اب یہ یادیں میرے ذہن میں موجود ہیں۔ اب جب میں کراچی جاتا ہوں تو قائداعظم کے مزار پر حاضری دیتا ہوں۔ اسی طرح جب میں پہلی بار دہلی گیا تھا تو مہاتما گاندھی کی سمادھی پر جاکر میں نے اپنا احترام پیش کیا تھا۔ میں مسلم لیگی تھا اور اب مسلم لیگی نہیں بھی ہوں لیکن میں بہرحال کانگریسی نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں ان سب لوگوں کا احترام کرتا جن کی وجہ سے ہم آج آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔

میرے اساتذہ

اپنے وقت کے اساتذہ ادب جو تھے ان میں سے سب سے پہلے جس ہستی سے میری ملاقات ہوئی وہ علامہ سیماب اکبر آبادی تھے۔ ان سے ملاقات کا شرف 1945ء میں کوہاٹ میں حاصل ہوا۔ یہ وہاں اُردو کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ اس کانفرنس میں صوبہ سرحد کے علاوہ صوبہ پنجاب سے بھی کافی افراد نے شرکت کی۔ اس کانفرنس سے اردو کے مقاصد کو بڑی تقویت پہنچی۔ اس موقع پر وہاں مشاعرہ بھی ہوا۔

اس مشاعرے میں مسلمان شعراء کے علاوہ ہندو اور سکھ شعراء کی ایک بڑی تعداد بھی شامل تھی۔ اس مشاعرے کا انعقاد کروانے والے علامہ سیماب اکبر آبادی کے شاگرد رشید حضرت اخگر سرحدی تھے۔ ان کے علاوہ عزیز اختر وارثی اور صوبہ سرحد کے دیگر جونیئر شعراء جو اب سینئر بن چکے ہیں بھی اس مشاعرے میں شریک تھے۔

علامہ سیماب بڑی شفیق طبیعت کے مالک تھے۔ ایسے اساتذہ میں نے بہت کم دیکھے ہیں جو بڑی فراخدلی سے اپنے شاگردوں کی تربیت کرتے ہوں۔ یہ بھی درست ہے کہ مولانا کی معاشی مجبوریاں اور ضرورتیں بھی تھیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے شاگرد بنائیں تاکہ ان کے مالی حالات میں کچھ کفالت ہو جائے۔ مثلاً ان کی جو کتابیں چھپتی تھیں وہ فوری طور پر بک جاتی تھیں کیونکہ اگر صرف ان کے شاگرد ہی یہ کتابیں خریدنے لگتے تو ایڈیشن نکل جاتا۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ کسی شاگرد سے وصول کرنے کا یہ معاوضہ بہت کم ہے کیونکہ ہم نے تو ایسے ایسے استاد دیکھے ہیں کہ اگر بدقسمتی سے کوئی شاگرد بن جائے تو

اسے لوٹ کھاتے ہیں اور پھر اسے جو رموزِ فن بتاتا ہوں وہ بھی نہیں بتاتے۔ کیونکہ وہ خود بھی اپنے فن میں مکمل نہیں ہوتے لیکن مولانا اپنے فن میں مکمل ہی نہیں بلکہ اکمل تھے۔ وہ فراخدلی سے اپنے شاگردوں کو سکھاتے تھے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

اس سلسلے میں بڑی لمبی چوڑی داستانیں مشہور ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں سوائے علامہ کی فراخدلی کے اور کسی چیز پر اسے معمور نہیں کیا جاسکتا۔ میں اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ سب داستانیں بے بنیاد ہیں۔

علامہ نے میرا کچھ کلام مشاعرے میں سنا تھا۔ ظاہر ہے کہ مشاعرے میں سب کلام رواروی میں سنا جاتا ہے۔ ان میں سے اگر ایک آدھ شعر بھی ذہن میں رہ جائے تو بہت ہے اور پھر میں تو اس زمانے میں بڑا جونیئر شاعر تھا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت علامہ صاحب کو سوائے میرے اچھے ترنم کے اور کیا یاد رہنا تھا۔ لیکن جب میں مشاعرے کے بعد ان سے الگ ملا تو میں نے ان سے گزارش کی کہ میرا تھوڑا سا کلام الگ سے سنیں اور رائے دیں۔ چنانچہ انہوں نے جو سنا اس میں سے گیت کو زیادہ پسند کیا۔ اس زمانے میں گیت خالص ہندی میں لکھا جاتا تھا اور ہندی کے بھی رسمی الفاظ بالماساجنا وغیرہ استعمال کئے جاتے تھے۔ لیکن میں اس زمانے میں بھی اُردو میں گیت لکھ رہا تھا۔ اس زمانے میں صرف چند ایک لوگ ہی اُردو میں گیت لکھنے کا تجربہ کر رہے تھے۔ وہ اس سے بہت متاثر ہوئے کیونکہ اس وقت اُردو کی ترویج کا سلسلہ جاری و ساری تھا اور ہر شخص ہی اُردو کی ترویج چاہتا تھا۔ چونکہ گیت ہندی صنفِ سخن ہے اور اس وقت بھی بہت کم لوگوں کو اس کا احساس تھا کہ اُردو میں بھی گیت لکھا جاسکتا ہے۔ تو میں نے جب علامہ کو اپنے اُردو گیت سنائے تو انہوں نے انہیں بہت پسند کیا اور میری گزارش پر انہوں نے رائے بھی لکھ کر دی۔ یہ رائے میرے گیتوں کے پہلے مجموعے ''ہریالی'' کے پہلے ایڈیشن میں چھپی بھی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ بخل سے ہرگز کام نہیں لیتے تھے۔ کسی بھی شاعر کا کلام فراخدلی سے سنتے تھے۔ اور اگر اس میں کچھ ہے تو فراخدلی سے داد دیتے تھے اور اگر کوئی خامی ہے تو یوں شفقت سے بتا دیتے تھے جیسے وہ خامی کوئی خامی نہیں ہے بلکہ وہ ہر کسی سے سرزد ہو جانے والی چیز ہے۔

اتنے مانے ہوئے استاد سے جب مجھے یہ تجربہ حاصل ہوا تو میرے مزاج میں بھی ابتدا ہی سے وہی چیز شامل ہوئی کہ کسی کی عیب جوئی بری چیز ہے اور اگر کسی کی خامی اسے بتانی ہے تو وہ اس طرح نہ بتائی جائے کہ وہ برا محسوس کرے اور حوصلہ افزائی اتنی کی جائے کہ اس شخص میں خود اعتمادی پیدا ہو جائے جو ابتداء کر رہا ہے۔ غالباً میرے کسی بزرگ دوست نے کہا تھا کہ ایک آدمی ادب کے سفر پر نکلے تو یوں سمجھو کہ اسے ایک دن منزل پر پہنچنا ہے۔ وہ اگر دو سال میں پہنچنے والا ہے تو تمہاری رہنمائی سے اس کا فاصلہ مختصر ہو جائے گا۔ پہنچنا تو اسے ہے ہی لیکن اگر تم اس کی مدد کرو گے اور وہ جلدی منزل پر پہنچ جائے گا تو وہ تمہیں یاد رکھے گا۔ یہ چیز جو میں نے سیکھی اس کی ابتداء علامہ سیماب اکبر آبادی سے ہوئی۔

اس کے بعد کے لوگوں میں علامہ تاجور نجیب آبادی کا بھی یہی مزاج پایا اور بنیادی طور پر میرے جو اساتذہ تھے یعنی حضرت شفا اللہ جناب احمد ندیم قاسمی سب کا رویہ یہی تھا۔ یہی تربیت میرے کام آئی اور میرے مزاج کا حصہ بن گئی۔

ادب میں نہیں بلکہ کچھ دوسری چیزیں بھی سیکھنے کی ہوتی ہیں مثلاً پہننا' کھانا پینا' چلنا پھرنا اور بولنا چالنا۔ یہ سب چیزیں بھی سیکھی جاتی ہیں۔ ایک چھوٹی سی چیز ہے کہ جو چیز جہاں سے بھی سیکھی ہو وہ ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ میں نے زندگی میں کسٹرڈ نہیں کھایا ہوا تھا۔ علامہ سیماب اکبر آبادی سے ان کے شاگرد اخگر سرحدی نے پوچھا کہ علامہ آج آپ میٹھے میں کیا کھائیں گے تو انہوں نے کہا کہ کسٹرڈ ہو سکے تو بہتر ہے کیونکہ میرا معدہ اسے قبول کرتا ہے۔ میں نے اس وقت پہلی بار کسٹرڈ کا نام سنا تھا۔ میں نے کہا نہیں کہ مجھے تو اس کا نام ہی نہیں آتا لیکن اشتیاق پیدا ہوا کہ یہ کیا چیز ہے۔ چنانچہ کھانے کے آخر میں جب کسٹرڈ آیا تو پتا چلا کہ یہ کیا چیز ہے۔ اس زمانے میں کسٹرڈ کی بھی ابتدائی شکل ہی تھی۔ آج تو اس کی بھی کئی اقسام ہیں۔ اس وقت یہ ایک سیدھی سادی فرنی قسم کی چیز تھی جس میں خوشبو اور رنگ ہوتے تھے۔ میں نے کسٹرڈ کھایا اور اب جب بھی میرے سامنے کوئی متوجہ کرنے والا کسٹرڈ آتا ہے تو مجھے بے ساختہ سیماب اکبر آبادی اور اخگر سرحدی یاد آتے

ہیں۔

اسی طرح ایک گھر میں مہمان تھا تو وہاں میں نے بنیان دھونے کے لئے دی تو خاتون خانہ نے فوراً غسل خانے میں جا کر دو چار ہاتھ مار کر بنیان دھودی۔ میں نے کہا کہ آپ نے تو یہ دھوئی ہی نہیں۔ وہ کہنے لگیں کہ دیکھو بنیان میں میل تو ہوتی ہی نہیں صرف پسینہ ہوتا ہے۔ اس لئے اگر آپ اسے صرف سادہ پانی میں کھنگال لیں تو وہ پسینہ نکل جاتا ہے۔ میں نے اس خاتون کی بات پلے باندھ لی۔ اب میں جہاں بھی جاتا ہوں تو ایک مدت سے میرا یہ قاعدہ بن گیا ہے کہ میں اپنی بنیان اتار کر خود ہی اسے دھو کر سکھانے کے لئے ڈال دیتا ہوں۔ ایسا کرتے ہوئے ہر بار وہ خاتون مجھے یاد آ جاتی ہے۔ میں یہ بنیان اسی نسخے سے دھوتا ہوں جس طرح اس خاتون نے بتایا تھا۔

اسی طرح اور چیزوں میں بھی میں نے بہت کچھ سیکھا۔ جیسے کہ اگر میں قمیص پہنتے وقت دیکھوں کہ بٹن ٹوٹا ہوا ہے تو فوراً مجھے اپنی پھوپھی یاد آ جایا کرتی ہیں جو اپنے سے چھوٹوں کو تلقین کیا کرتی تھیں کہ جب کپڑے دھولو اور استری کر لو تو دیکھو کہ کوئی بٹن ٹوٹا ہوا تو نہیں ہے۔ لیکن میرے گھر میں ایسا نہیں ہے۔ کبھی دو چار مہینے کے بعد جب کوئی ٹوٹا ہوا بٹن ملے تو مجھے وہ یاد آ جاتی ہیں۔

شروع کی جتنی باتیں ہیں ان میں کسی شخص نے جو بھی رہنمائی کی تھی وہ مجھے یاد آ جاتی ہے۔ جس طرح حفیظ ہوشیار پوری صاحب نے صوت کے سلسلے میں مجھے بتایا تھا کہ اگر ردیف والا لفظ مطلع چھوڑ کر کسی اور شعر میں آ جائے تو وہ صوت کو مجروح کرتا ہے۔ اس سے بچنا۔ میں تو بچ گیا اور اس کو پلے باندھ لیا۔ نادانستہ ایک دو ہزار اشعار کے بعد کسی شعر میں آ جائے تو علیحدہ بات ہے ورنہ میں اس بارے میں محتاط ہوں۔ لیکن جب کہیں اور یہ خامی دیکھتا ہوں تو مجھے حفیظ صاحب کی یہ بات یاد آ جاتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ جو چیز زندگی میں پہلی بار سیکھی ہو یا دیکھی ہو وہ بہت یاد آتی ہے۔

بعض اوقات ایسی چیزیں بھی دھوکا دے جاتی ہیں جنہیں حاصل کرتے وقت انتہائی خوشی ہوئی ہو۔ راولپنڈی میں قیام کے دوران دو واقعات ہوئے۔ ایک تو یہ کہ شاہی

دواخانہ راولپنڈی کے مالک حکیم عبدالخالق بہت نامور طبیب اور سوشل آدمی تھے۔ انہوں نے عید میلادالنبی پر ایک انعامی مشاعرہ رکھا جس میں ایک گولڈ میڈل اور سلور میڈل پہلے اور دوسرے درجے کی نظموں کے لئے رکھا۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ شاعر بلا امتیاز مذہب وملت کے مشاعروں میں شامل ہوتے تھے۔ ہم کبھی ہولی کے مشاعروں میں چلے جاتے تھے تو دیگر مذاہب کے شعراء عید میلادالنبی کے مشاعروں میں چلے آتے تھے۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں تو ہولی ہی کے ریفرنس سے ''ہوری'' ایک صنف سخن بھی کبھی بن کر رہ گئی تھی۔ شاید امیر خسرو نے اس سلسلے میں کام کیا تھا اور اودھ کے درباروں میں اس کا چلن تھا۔ اس میں رادھا اور کرشن اور گوپیاں ہی نہیں بلکہ آج کے جیتے جاگتے' کردار بھی شامل نظر آتے تھے۔ یہ استعارۃً یا علامت کے طور پر کرشن اور رادھا وغیرہ یا گوپیوں کا نام استعمال ہوتا تھا۔ گویا یہ ایک ایسی صنف سخن تھی جسے مسلمان بھی لکھتے تھے اور وہ اس لئے لکھتے تھے کہ اس زمانہ کی یاد تازہ کی جائے جو اب گزر چکا ہے۔

اسی طرح نعتیہ مشاعروں میں ہندو اور سکھ شاعر شریک ہوتے تھے۔ وہ ایک صنف سخن کے طور پر نعتیں کہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس میں عقیدہ تو شامل ہونا مشکل ہے لیکن ایک صنف سخن سمجھ کر نعت بھی لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ مذکورہ بالا مشاعرے میں ہندو اور سکھ شعراء بھی شریک ہوئے تھے۔ گرمکھ سنگھ مسافر بھی اس مشاعرے میں شریک ہوئے جو بعد میں انڈین پنجاب کے وزیراعلیٰ بنے۔ وہ بہت شفیق آدمی تھے اور بنیادی طور پر پنجابی کے شاعر تھے۔

اس مشاعرے میں اُردو نعت پر مجھے گولڈ میڈل مل گیا اور مگر گرمکھ سنگھ مسافر کو چاندی کا تمغہ ملا۔ میں اس انعام پر بہت خوش ہوا۔ شہرت بھی ہوئی اور تصویریں بھی چھپیں۔ لیکن اس کے بعد ایک زمانہ ایسا آیا کہ میری مالی حالت بہت خراب ہوگئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ چیز جسے جان سے بھی عزیز سمجھ کر سنبھال کر رکھنا چاہئے اور جو انعام یا ایوارڈ میں ملی ہو اسے بھی بیچنا پڑا کیونکہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ بیچنے کا ملال بھی تھا کیونکہ میں نے اس گولڈ میڈل کو فریم کروا کے رکھا ہوا تھا۔ یہ گولڈ میڈل دو تولے سے زیادہ ہی نظر آرہا تھا

اور میں نے اسے مخمل کے کپڑے پر لٹکا کر شیشے کے فریم میں رکھا ہوا تھا۔ مگر جب مالی حالت بہت خراب ہوئی تو میں نے سوچا کہ اسے بیچ کر ایک ماہ کی روزی کا بندوبست تو کریں پھر اللہ وارث ہے۔

میں ملول سا ہو کر سنار کی دوکان پر گیا اور اس سے کہا کہ اسے تول کر لے لو اور جتنے پیسے بنتے ہیں وہ مجھے دے دو۔ اس نے اس میڈل کو کسوٹی پر کس کر دیکھا تو کہنے لگا کہ اس میڈل کے اوپر تو پانی چڑھا ہوا ہے اور نیچے سے تو یہ گلٹ ہے۔ یہ تو خالص چاندی بھی نہیں ہے۔ اس واقعہ پر شرمندگی کے علاوہ بہت زیادہ دکھ بھی ہوا۔ خیال یہ تھا کہ یہ مہینہ تو یہ میڈل بیچ کر گزر جائے گا۔ جب سنار کے پاس گیا تھا تو صرف یہ ملال تھا کہ یہ میڈل بیچنے جا رہا ہوں اور جب وہاں سے لوٹا تو آنکھوں کے سامنے تنگدستی کا مہینہ بقایا تھا اور شرمندگی اس کے علاوہ تھی۔ چنانچہ واپس آیا اور میں نے غصے میں آ کر اس میڈل کو ایک گندے نالے میں پھینک دیا۔ میں نے اس زمانہ میں اس موضوع پر ایک نظم بھی کہی تھی۔ اب میرے پاس وہ نظم ریکارڈ میں نہیں ہے۔ اس میں میں نے کہا تھا کہ اس اعزاز اور انعام کا مجھے کیا فائدہ جو میری بھوک نہیں مٹا سکتا۔

سیماب صاحب کا میں نے اساتذہ میں ذکر کیا ہے۔ ان کے بعد اپنے وقت کے جن استاد سے میری ملاقات ہوئی وہ تلوک چند محروم تھے۔ یہ پنڈی میں رہتے تھے اور مزاج کے درویش اور علم سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ کلاسیکل شاعری میں بہت پختہ تھے۔ یہ بنیادی طور پر مدرس تھے اور بعد میں پروفیسر ہو گئے۔ ان کا پڑھنے کا انداز بالکل اس طرح کا تھا جیسے وہ کلاس میں کھڑے طلباء کو شعر ذہن نشین کروا رہے ہیں۔ وہ ایک مصرعے کو پہلے ٹکڑوں میں دہرا کر پھر پڑھتے تھے۔ غالباً ان کی یہ عادت کلاس روم ہی میں سے بنی تھی۔ مگر اس زمانے میں ان کے کچھ اشعار اور نظمیں بہت مشہور ہوئی تھیں۔ مثلاً:

نہ تڑپ فراق بت میں دل بے قرار سو جا

''دل بے قرار سو جا'' والا ٹکڑا بعد میں کئی شاعروں سے ہوتے ہوتے منیر نیازی تک بھی آیا اور منیر نیازی نے بھی لکھا کہ:

جا اپنی حسرتوں پر آنسو بہا کے سوجا

ایک آدھ فلم میں بھی اس کا چربہ آیا۔ بہرحال ان سے جب میں ملتا تھا تو روحانی طور پر ایک اطمینان ہوتا تھا۔ وہ حوصلہ افزائی کرتے تھے اور شعروشاعری کے رموز بتاتے تھے۔ مجھ پر حیران ہوتے تھے اور مجھے عزیز کہہ کر کہتے تھے کہ عزیز! تمہاری شاعری میں ہندی کے الفاظ زیادہ کیسے آتے ہیں۔ میں کہتا تھا کہ یہ کوئی شعوری کوشش نہیں ہے اور میں ان الفاظ کو ہندی سمجھ کر نہیں بلکہ اُردو سمجھ کر استعمال کرتا ہوں۔ صرف یہ ہے کہ میں سہل زبان کا قائل ہوں اور مفرد الفاظ کی شاعری کر کے مجھے مزہ آتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ ہندی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ اُردو ہے۔ وہ میرا جواب سن کر ہنستے تھے کہ میں تو ہندی لفظ بھی اگر استعمال کرتا ہوں تو استعمال نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا کہ مزاج کا معاملہ ہے کیونکہ آپ نے فارسی اتنی پڑھی ہوئی ہے کہ وہی آپ کے ذہن میں رچی ہوئی ہے۔ پھر آپ منشی کہلواتے تھے۔ آپ تو انشاپردازی کے ماہر ہیں اور فارسی زبان کا آپ پر اثر ہے قبلہ میں فارسی کے بارے میں نابلد آدمی ہوں۔ میں نے کلاسوں میں جو تھوڑا بہت پڑھا ہے اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں جانتا۔

تلوک چند محروم اس زمانے میں پنڈی میں لال کرتی کے علاقہ میں رہتے تھے۔ تب جنگ کا زمانہ ابھی گزرا ہی تھا اور چینی کی بڑی قلت تھی۔ راشننگ ہوتی تھی۔ آپ سن کر حیران ہو جائیں گے کہ وہ ایک پیالی میں چھ چمچ چینی پیتے تھے۔ انسان یقین نہیں کر سکتا کہ لیکن وہ واقعی ایسا ہی کرتے تھے اور ہر دن میں کئی بار چائے پیتے تھے۔ اب چینی کی قلت ہوئی تو ان کے لئے مسئلہ بن گیا۔

میں اور میرے ساتھیوں احمد ظفر اور جمیل ملک نے ان کا مسئلہ کسی حد تک حل کر دیا۔ ہم جب بھی ان کے پاس جاتے تھے کسی نہ کسی طرح دو چار سیر چینی جمع کر کے ان کے لئے لے جاتے تھے۔ وہ اس چینی کو اس طرح قبول کرتے تھے جیسے وہ ان کے لئے کوہ قاف سے سوغات آئی ہو۔ وہ ہمیں بہت دعائیں دیتے تھے۔

جگن ناتھ آزاد ان کے صاحبزادے ہیں۔ عجب بات یہ کہ میرے چند ایک بہت

قریبی دوستوں میں سے ایک جگن ناتھ آزاد ہیں۔ ان کی عادت بھی بالکل والد پر ہے۔ وہ چھ چمچ چینی فی کپ تو نہیں پیتے لیکن اس زمانے میں بھی وہ تین کپ چمچ تو ضرور ایک پیالی میں پیتے ہیں۔ کچھ لوگ تو اس زمانہ میں چائے میں شکر پیتے ہی نہیں یا پھر زیادہ سے زیادہ ایک چمچ لیتے ہیں۔ یہ ان کی خاندانی عادت ہے۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ پھر بھی ان کے جسم میں شکر کی کمی ہے اور وہ اس لئے کہ وہ ذیابیطس کے مریض نہیں ہیں۔

اب علامہ تاجور نجیب آبادی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ہری پور سے انہیں اپنا کلام بھیجا۔ یہ ان دنوں ''شاہکار'' کے ایڈیٹر تھے جو اپنے وقت کا بہت خوبصورت پرچہ تھا۔ اس زمانے میں بے چینی یہ ہوتی ہے کہ جونہی کلام پرچے کے دفتر میں پہنچے تو فوراً کتابت ہو کر چھپ کر باہر آ جائے اور جتنے دن پرچہ لیٹ ہوتا جاتا ہے یہ بے چینی رہتی ہے کہ خدا جانے اس کلام کے ساتھ کیا سلوک ہوا۔

میں اس بے چینی سے اپنے کلام کے چھپنے کا انتظام کر رہا تھا کہ مجھے مولانا کا خط آ گیا اور خط بھی ایسا کہ اس نے مجھے زمین سے اٹھا کر اوپر کہیں خلا میں کھڑا کر دیا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ آپ کا کلام ملا اس کلام کے خالق کی خوش قسمتی ہو نہ ہو اس علاقے کی خوش قسمتی ضرور ہے جس علاقے میں ایسے کلام کا خالق پیدا ہوا۔ انہوں نے اسی طرح کا ایک آدھ جملہ اور بھی لکھا تھا۔

میں اس خط کو میز پر اس طرح رکھتا تھا کہ جو بھی میرے پاس آئے تو اس کی اس پر نظر پڑے اور میں اسی بہانے اسے یہ خط پڑھوا دوں۔ جب باہر نکلتا تھا تو میں اس خط کو جیب میں ڈال کر نکلتا تھا اور میں نے یہ خط ساری دنیا کو پڑھوا دیا تھا۔ علامہ سیماب اکبر آبادی کے بعد میرے پاس جو تحریری سند تھی وہ یہ تھی۔ اس خوشی کا یہ عالم تھا کہ دامن چھوٹا لگتا تھا اور خوشی اس میں سما نہیں پا رہی تھی۔ یوں ہی دل میں خیال آیا کہ لاہور چلتے ہیں سیر بھی کریں گے اور علامہ تاجور سے ملاقات بھی کریں گے۔ ان کا شکریہ بھی ادا کریں گے۔

چنانچہ میں لاہور گیا اور جب علامہ تاجور کے پاس پہنچا تو وہ اپنی ڈاڑھی کے بال ترشوا رہے تھے۔ میں نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو۔ میں

نے کہا ہری پور سے۔ کہنے لگے کہ قتیل شفائی ہو۔ میں نے کہا جی ہاں۔ کہنے لگے بیٹھو تو میں وہیں بیٹھ گیا۔ صبح کا وقت تھا مجھے اخبار دے کر کہنے لگے کہ تم یہ پڑھو میں غسل کر کے آتا ہوں اور پھر تم ناشتہ میرے ساتھ کرنا۔

نہا کر آئے تو ناشتہ بھی آ گیا۔ ناشتے کے بعد کہنے لگے کہ تم نے جو کلام بھیجا تھا میں نے اس پر صاد کر دیا ہے۔ یہ ان کا مخصوص لفظ تھا۔ یہ صحیح کی علامت تھی اور اس کا مطلب تھا کہ کلام صحیح ہے اور قابل اشاعت ہے۔ مجھے اس بات کی سمجھ آ گئی حالانکہ پہلی بار میں نے یہ لفظ سنا تھا۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔ بہت بذلہ سنج' لطیفہ گو' جملہ باز اور سب سے بڑھ کر پارٹی باز آدمی تھے۔ لیکن یہ سب کچھ صرف ادبی معاملات میں تھے۔ دوسری طرف ان کے مخالفین میں ڈاکٹر تاثیر تھے۔ اس دن انہوں نے کچھ باتیں بھی سنائیں اور کہنے لگے کہ بھائی میں اور کیا کر سکتا ہوں۔ صرف یہ کیا کہ جب ان کا کلام اشاعت کیلئے میرے پاس آیا تو اس پر ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر لکھا ہوا تھا۔ میں نے ایم ڈی میں چھپا ہوا محمد دین سامنے کر دیا اور اپنی طرف سے ڈاکٹر کے ساتھ ہومیو لکھ دیا۔ کہنے لگے کہ میں نے تو اپنے دل کی بھڑاس یوں نکال لی ہے کہ میں نے ان کے کلام پر ان کا نام ڈاکٹر محمد دین تاثیر (ہومیو) لکھ دیا ہے۔ میں نے کہا جی آپ اس کے علاوہ ان کے ساتھ کیا کرتے۔ آپ نے ایک اچھے بھلے پی ایچ ڈی آدمی کو ہومیو ڈاکٹر بنا دیا ہے اور پھر وہ ایم ڈی اس لئے لکھتے تھے کہ محمد دین بہت غیر شاعرانہ نام ہے۔ آپ نے اسے بھی بے نقاب کر دیا۔ یہ اس طرح ہے جیسے کہ خوشتر گرامی بہت خوبصورت نام ہے اور اگر کوئی لکھ دے رام رکھا مل خوشتر گرامی تو وہ تو بے چارا مارا گیا۔ وہ میری بات سن کر بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ پٹھانوں میں لطیفہ گوئی بھی ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ حضرت آپ بھی تو پٹھان ہیں۔ پھر ہنس پڑے۔ وہ بھی پٹھانوں میں سے تھے اور ان پٹھانوں میں سے جو صوبہ سرحد سے نقل مکانی کر کے بہت مدت پہلے نجیب آباد وغیرہ چلے گئے تھے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ اتنے عرصے کے بعد بھی زندہ دلی نہیں بھولے ہیں تو ہم تو ابھی وہاں موجود ہیں۔ اس طرح ان سے قربت ہوئی۔

میں نے باتوں باتوں میں ان سے بھی بہت حاصل کیا۔

ان سے جو چیز حاصل کی وہ یہ تھی کہ وہ مجھے کہنے لگے کہ سب سے اہم چیز تو خیال ہے لیکن اگر خیال کے ساتھ الفاظ رواں دواں نہیں ہوں گے اور غنائیت سے خالی ہوں گے تو خیال مر کے رہ جائیں گے۔ لیکن اگر خیال کمزور بھی ہے اور کھنکتے ہوئے اور خوبصورت الفاظ آپ دیں گے تو وہ چھوٹا خیال بھی قاری تک بڑا خیال ہو کر پہنچے گا۔ وہ وہاں پر بیٹھے ہوئے ایک اور صاحب جو غالباً شباب کیرانوی تھے سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ ان کے ہاں بہت غنائیت ہے۔ مجھے پہلی بار اس بات کا جس نے احساس دلایا تھا وہ مولانا تاجور تھے۔ مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی اور اس کے بعد میں نے ان کی اس بات کو پلے باندھ لیا کہ لفظوں کا جامہ بہت خوبصورت ہونا چاہئے۔ پھر خیال بڑا ادر دلکش نظر آئے گا۔ یہ چیز میں نے تاجور صاحب سے سیکھی۔

میں بتا چکا ہوں کہ میں نے ابتداء میں شفا صاحب سے اصلاح لی اور بعد میں قاسمی صاحب سے اصلاح لی۔ یہ پارٹیشن سے پہلے کی بات ہے کہ میں قاسمی صاحب سے ملا نہیں تھا۔ جی چاہا کہ قاسمی صاحب سے ملاقات ہو۔ اس زمانے میں وہ ضلع سرگودھا تحصیل خوشاب کے ایک گاؤں انگہ میں رہتے تھے۔ جو اک پہاڑی پر واقع ہے۔ اس زمانہ میں خوشاب سے انگہ تک سواری کا کوئی انتظام نہیں کیا یہ سفر یا تو پیدل کرنا پڑتا تھا یا پھر گھوڑی ہوتی تھی۔ اب تو سنا ہے کہ وہاں تک بس چلتی ہے۔

ہوا ایسا کہ میں لائل پور کے مشاعرے میں پہلی بار شرکت کے لئے گیا۔ لائل پور کے دو مشاعرے مشہور تھے ایک تو لائل پور کاٹن مل کا مشاعرہ تھا جس میں ہندوستان اور پاکستان کے شعراء شریک ہوتے تھے۔ دوسرا مشاعرہ مرحوم چوہدری منظور سیکرٹری میونسپل کمیٹی لائل پور اور خلیق قریشی مرحوم مالک مدیر اخبار ''عوام'' مل کر کرتے تھے۔ یہ مشاعرہ بھی بہت بڑے پیمانے پر ہوتا تھا۔

پہلے مشاعرے میں تھوڑی سی جانبداری کی جاتی تھی اور اس میں ایک تو اُردو بولنے والے آتے تھے اور دوسرے ہندو۔ کیونکہ مل کے مالک مرلی پرشاد تھے۔ چنانچہ کچھ شعراء تو

دہلی سے آجاتے تھے اور کچھ پنجاب میں بسنے والے اُردو بولنے والے شعراء آجاتے تھے۔ اس میں جگن ناتھ آزاد اور دوسرے شعراء بھی ہوتے تھے۔ اس مشاعرے میں تو ہمیں بلایا نہیں جاتا تھا۔

دوسرا مشاعرہ جو چوہدری منظور اور خلیق قریشی منعقد کرتے تھے۔ اس میں میں نے شمولیت کی۔ اس سے پہلے یہ ہوا کہ مجھے بھی لائل پور کاٹن مل کے مشاعرے میں بلوایا گیا تھا۔ نجانے یہ رسم کیسے ٹوٹی۔ اس زمانے میں مل والے ہر شاعر کو کپڑوں کی ایک پوٹلی بھی ساتھ دیا کرتے تھے۔ جس میں گرم اور سرد کپڑوں کے علاوہ شلوار قمیض یا پتلون وغیرہ کا کپڑا بھی ہوتا تھا۔

اس مشاعرے میں شمولیت کے بعد میں سیدھا انگہ قاسمی صاحب کے پاس گیا۔ میں نے انہیں پہلے اس بارے میں اطلاع دے رکھی تھی۔ انہوں نے پہلے ہی سے ایک آدمی کو گھوڑی دے کر خوشاب بھیجا ہوا تھا۔ میں نے گھوڑی کی سواری کبھی کی نہیں تھی۔ حضرت عمرؓ کی روایت ہے کہ جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو ان کا غلام اونٹنی پر سوار تھا اور وہ اونٹنی کی باگ سنبھالے ہوئے تھے۔ میرا بھی ہی حال تھا۔ گھوڑی پر وہ آدمی تھا جسے قاسمی صاحب نے مجھے لینے کے لئے بھیجا تھا اور میں گھوڑی کے ساتھ ساتھ پیدل چلتا ہوا انگہ میں داخل ہوا۔

قاسمی صاحب نے مجھے پیدل آتے ہوئے دیکھا تو بہت ہنسے۔ میں نے کہا کہ اگر میں گھوڑی پر ہوتا اور گر جاتا تو آپ تک پہنچ ہی نہیں پاتا۔ اس لئے اب پہنچ تو گیا ہوں۔ میں بچپن ہی سے ہر روز باقاعدگی کے ساتھ صبح نہانے کا عادی ہوں۔ اگر کبھی شدید بخار کی حالت میں نہ نہایا ہوں تو الگ بات ہے ورنہ میں ہمیشہ نہاتا ہوں۔ اب انگے میں یہ صورت تھی کہ وہاں تو پینے کا پانی بھی نہیں ملتا تھا۔ عورتیں اتنی اونچائی سے نیچے ڈھلان پر جا کر کسی کنویں سے پانی بھر کے گھڑوں میں لاتی تھیں۔

میں نے صبح صبح جب قاسمی صاحب سے کہا کہ میں نہانا چاہتا ہوں تو وہ کہنے لگے کہ مجھے پہلے یہ بتانا یاد نہیں رہا کہ یہاں تو نماز بھی تیمم کر کے پڑھی جاتی ہے اور پینے کا پانی بھی

بڑی مشکل سے آتا ہے۔ خیر کچھ کہتے ہیں۔ پھر کہنے لگے کہ یہ پینے والے گھڑے کے پانی سے گزارہ کرلیں۔ میں اس پانی سے اس طرح نہایا جیسے پٹرول سے ڈرائی کلیننگ کی جاتی ہے۔ انہوں نے اس کے بعد کسی اور کو بھیج کر گھڑے میں پینے کے لئے پانی منگوایا اور وہ آدمی کوئی دو گھنٹے کے بعد واپس آیا۔

اس کے بعد شرم کے مارے میں بھی دو تین دن نہیں نہایا۔ وہاں کی علم وادب کی داستانیں عجیب ہیں۔ قاسمی صاحب خود گریجویٹ ہیں۔ ان کے بھائی پیرزادہ محمد بخش بھی گریجویٹ ہیں۔ یہ گاؤں شہر سے بالکل الگ تھلگ ہے اور یہاں پینے کے لئے پانی تک نہیں۔ لیکن یہاں کے لوگوں میں پارٹیشن سے پہلے بھی کوئی گھر ایسا نہیں تھا جہاں کوئی نہ کوئی گریجویٹ نہیں۔

میری علمی پسماندگی تھی۔ مجھے وہاں بہت شرم آئی۔ مجھے جب وہ کسی آدمی کا تعارف کرواتے اور کہتے کہ یہ فلاں صاحب ہیں اور انہوں نے پچھلے سال گریجویشن کی ہے تو دماغ پاگل ہوجاتا۔ میں وہاں کچھ دن قیام پذیر رہا۔ بات یہ کرنی چاہتا تھا کہ قاسمی صاحب بھی اتنے دور دراز علاقے میں رہ کر گریجویشن کر گئے' ہر چند کہ ان کے تایا مال افسر تھے مگر ان کے والد فقیر منش تھے اور مجذوب اور پیر تھے۔ ان کے ساتھ معجزات بھی وابستہ تھے۔ مگر جب یہ دونوں بھائی پڑھ لکھ گئے تو انہوں نے پیری فقیری کے سلسلے کو آگے نہیں بڑھایا اور یہ سلسلہ ان کے کزن کی طرف منتقل ہوگیا۔ آج کل وہی یہ گدی سنبھالے ہوئے ہیں اور اسی طرح ہیں جیسے کہ پیروں کی قسمت میں عزت بھی ہوتی ہے اور دولت بھی۔ سو ان کی قسمت میں بھی یہ سب ہے۔ لیکن ویسے تو ایک صاحب علم اور شاعر سے زیادہ امیر آدمی کون ہوسکتا ہے۔ اس لئے یہ دونوں بھائی ان سے زیادہ امیر ہیں اگرچہ ان کی دولت اور طرح کی ہے۔ انہیں تعلیم نے اس راستے پر ڈالا جو صحیح اخلاقی و اسلامی راستہ ہے۔ میری نظر میں پیری اور مزار پرستی بالکل غیر اسلامی چیزیں ہیں۔ ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارا پیر رسولؐ اور اس کا قرآن ہے۔ ان دونوں چیزوں کی موجودگی میں میری نظر میں ہمیں اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہمیں اور کسی چیز کی ضرورت پڑسکتی ہے تو وہ مفسرین

ہیں۔ لیکن اگر آدمی خود پڑھا لکھا ہے تو اس کی بھی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ کیونکہ ہم خود حدیثیں اور تفسیریں پڑھ سکتے ہیں۔ یہ سب چیزیں قاسمی صاحب کی ذہن میں بھی ہوں گی اسی لئے وہ پیری فقیری کی طرف راغب نہیں ہوئے بلکہ ترقی پسند ذہن کے مالک ہیں۔

اس زمانے میں قاسمی صاحب سگریٹ پینے کے رسیا تھے اور میں نے دیکھا کہ اس گاؤں میں بھی ان کے پاس سٹیٹ ایکسپریس سگریٹ کا کاٹن موجود تھا۔ ادھر سے میں بھی ان کے لئے کچھ قیمتی سگریٹ کے پیکٹ لے کر گیا تھا کیونکہ اس وقت میں خود بھی سگریٹ پیتا تھا۔ میں نے وہاں جا کر دیکھا کہ ان کے پاس تو مجھ سے بھی بہتر برانڈ کے سگریٹ بلکہ سگریٹوں کے دادا موجود تھے۔ چنانچہ میں اپنے سگریٹ دیکھ کر شرمندہ ہوا۔ یہ اس طرح ہے جیسے ایک دیہاتی کسی بادشاہ کا دوست بن گیا۔ بادشاہ شکار پر گیا اور اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا۔ اسے بھوک لگی تو اس نے دیہاتی سے کھانا کھایا' بھوک لگی چنانچہ کھانا پسند آیا۔ اس نے دیہاتی کو انعام کے طور پر کوئی نشانی دی۔ دیہاتی کو پتا ہی نہیں تھا کہ بادشاہ کے ٹھاٹھ کیا ہوتے ہیں۔ وہ اسی میں خوش تھا کہ ایک آدمی نے اس سے کھانا کھایا ہے اور اس کا دوست ہو گیا ہے۔ ایک دن اس کا جی چاہا کہ وہ جا کر اپنے اس دوست سے ملے۔ یہ دیہاتی جہاں رہتا تھا وہاں قاسمی صاحب کے گاؤں انگہ کی طرح پانی کی بڑی قلت تھی۔ تو اس دیہاتی نے سوچا کہ اپنے دوست اور بادشاہ کے لئے اس سے بہتر تحفہ کیا ہو سکتا ہے کہ میں اس کے لئے پانی کا ایک گھڑا لے جاؤں۔ چنانچہ وہ گھڑا لے کر چلا گیا۔ بادشاہ کو جب اس دیہاتی کے آنے کی اطلاع دی گئی تو اس وقت بادشاہ جھیل میں کشتی میں سیر کر رہا تھا۔ بادشاہ کو وہ آدمی یاد آ گیا۔ اس نے اسے وہیں بلوا لیا۔ اس نے دیکھا کہ اس دیہاتی نے سر پر پانی کا گھڑا رکھا ہوا ہے۔ پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ تو دیہاتی نے سوچا کہ میرے سر پر تو پانی کا ایک گھڑا ہے جبکہ یہ تو جھیل میں سیر کر رہا ہے تو اس کی زبان سے کوئی بات بھی نہ نکل سکی۔ اس دیہاتی کی کہانی آگے چلتی ہے اور خیر بادشاہ اس کے خلوص سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے پانی رکھ لیا اور گھڑا ہیرے جواہرات اور موتیوں سے بھر کر اس کو واپس دے دیا۔

یہی حال میرے ساتھ ہوا جب میں قاسمی صاحب کے ہاں گولڈ فلیک یا اس سے

ملتے جلتے سگریٹ لے کر گیا تو آگے ان کے پاس سٹیٹ ایکسپریس سگریٹ کا کاٹن پایا۔ یہ تو اس وقت خوابوں کی دنیا کے سگریٹ ہوتے تھے۔ چنانچہ میں نے بھی بڑی سبکی محسوس کی کیونکہ میں بھی وہاں یہی سوچ کر گیا تھا کہ ان کے گاؤں میں زیادہ سے زیادہ حقہ پیا جارہا ہوگا اور اگر سگریٹ پیتے بھی ہیں تو ان کے پاس کوئی ایسے ویسے سگریٹ ہی ہوں گے لیکن وہاں معاملہ اس کے برعکس تھا۔

میں نے قاسمی صاحب کو بتایا کہ میں تو یہ سوچ کر آیا تھا تو وہ بہت ہنسے اور جب واپس آنے لگا تو انہوں نے مجھے ایک کارٹن سٹیٹ ایکسپریس کا دیا کہ یہ سگریٹ لاہور میں شاید کم ملتے ہیں۔

اساتذہ کے ساتھ میری ایک ساتھ سب سے زیادہ ملاقاتیں 1956ء میں دہلی کے چیمسفورڈ کلب کے مشاعرے میں ہوئیں۔ اس میں جوش' جگر' روش صدیقی' پنڈت ہری چند اختر' یاس یگانہ چنگیزی' فراق گورکھپوری اور دیگر بڑے شعراء شامل تھے۔ وہاں جگر صاحب کے نیاز بھی حاصل ہوئے۔ ان کا پاکستان میں بہت آنا جانا رہا۔ میں محسوس کرنے لگا کہ بعض لوگوں میں شکل صورت اور عادتوں میں انفرادیت پیدا کرنے کے لئے طریقے خودساختہ ہوتے ہیں۔

اس سے پہلے میں مولانا طاہر القادری کو جانتا تھا۔ وہ بھی پہلے بالوں میں کنگھی کر کے ہاتھ سے بال اس طرح خراب کر دیتے تھے جیسے وارفتگی میں ازخود ہو جاتا ہے۔ میں نے جگر صاحب کو محسوس کیا کہ ان کا ازار بند لٹکا رہتا ہے اور جب میں نے نوٹ کیا تو پتا چلا کہ یہ ان کی دانستہ عادت ہے۔ بلکہ انہوں نے یہ ایک قسم کی اپنی پہچان بنا رکھی تھی۔ اس زمانے میں مجھ میں شوخی زیادہ تھی۔ مگر اس کے باوجود میں ہر بزرگ کا احترام بھی کرتا تھا۔ اور وہ اب بھی کرتا ہوں۔ مگر پھر بھی ذرا لطف لینے کے لئے میں بعض اوقات شرارتیں بھی کر دیتا تھا۔

چنانچہ لائل پور کے مشاعرے میں جس میں پنڈت ہری چند اختر' قاسمی صاحب اور مجید لاہوری وغیرہ شامل تھے میں نے کہا کہ آیئے ذرا جگر صاحب سے لطف اندوز ہوتے

ہیں۔ میں نے مجید صاحب سے کہا کہ آپ انہیں کسی طرح کہہ دیں کہ آپ کا ازار بند لٹک رہا ہے اور دیکھئے پھر کیا ہوتا ہے۔ اس کے بعد کیا ہونا ہے۔ آپ ان کا ازار بند ٹھیک کروا دیں گے تو میں شرطیہ کہتا ہوں کہ پندرہ منٹ کے بعد پھر ان کا ازار بند لٹک رہا ہوگا۔

خیر مجید صاحب گئے۔ یہ کہنے لگے اسلام علیکم جگر صاحب کیا حال ہے؟ خیریت ہے؟ اور پھر کہنے لگے کہ جگر صاحب آپ کا نالہ پابند نے نہیں ہے۔ جگر صاحب کہنے لگے معاف کیجئے گا اور اپنا ازار بند اوپر اڑس لیں۔ پندرہ منٹ کے بعد دیکھا تو پھر ازار بند لٹک رہا تھا جس پر میں ان کے پاس گیا اور کہا کہ جگر صاحب آپ کا ازار بند لٹک رہا ہے۔ کہنے لگے معاف کیجئے گا اور پھر ازار بند اڑس لیا۔ کوئی پندہ بیس منٹ کے بعد دیکھا تو وہی صورت تھی۔ میں نے ہری چند اختر صاحب سے کہا کہ اب آپ ذرا کچھ کریں۔ وہ ان کے پاس گئے اور آداب بجا کر کہنے لگے کہ میں حیران ہوں کہ یہ ازار بند سوت کا ہے' ریشم کا ہے' یا پلاسٹک کا ہے۔ کہنے لگے کیوں۔ کہنے لگے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ اسے اوپر کرتے ہیں اور یہ پھر باہر نکل آتا ہے۔ اگر آپ فرمائیں تو لائل پور میں سوتی ازار بند بہت اچھے ملتے ہیں۔ میں یہاں سے آپ کو وہ لادوں۔ کہنے لگے جی ہاں جی ہاں۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا تو پھر بھی ازار بند بند لٹک رہا تھا۔

میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ انہوں نے ازار بند کو اپنی شخصیت کا حصہ بنا رکھا تھا۔ حالانکہ بڑے بے نیاز' بڑے شفیق اور بڑی محبت کرنیوالے آدمی تھے لیکن کبھی کبھی ان میں یہ عادت بھی ہوتی تھی کہ اپنی کوئی نئی چیز جب لکھ لیتے تو وہ سنانا چاہتے تھے۔ غالباً روش صدیقی نے یہ بات بتائی تھی کہ جگر صاحب کی یہ عادت ہے اور اب انہوں نے ایک فارسی کی نعت کہی ہے اور یہ سنانے کے لئے بے چین ہے۔ یہی ہوا ہم نے دیکھا کہ وہ اپنے معیار کے مطابق کسی آدمی کو تلاش کر رہے ہیں جسے یہ نعت سنائیں۔ روش صاحب نے کہا کہ اگر آپ تماشا دیکھنا چاہتے ہوں تو جسے جگر صاحب سننے کو کہیں وہ ذرا ٹال جائے۔ یہ مشاعرے اور کھانے کے دوران کے وقفے کی بات ہے۔ جگر صاحب قاسمی صاحب سے کہنے لگے کہ قاسمی صاحب ایک نعت ہوگئی تھی۔ فارسی کی اور میں وہ خاص طور پر آپ ہی کو

سنانا چاہتا ہوں۔ قاسمی صاحب کہنے لگے جی ہاں جی ہاں۔ اسی دوران میں نے قاسمی صاحب کو آواز دی تو وہ مجھے مخاطب کر کے باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے آنکھ ماری تو وہ اٹھ کر میرے ساتھ چلے آئے۔ جب باہر سے گھوم کر قاسمی صاحب واپس آ کر بیٹھے تو جگر صاحب نے سوچا کہ اب وہ اپنی نشست پر واپس آ گئے ہیں تو کہنے لگے کہ قاسمی صاحب میں نے عرض کیا تھا کہ فارسی کی ایک نعت ہوئی تھی جو میں خصوصی طور پر آپ کو سنانا چاہتا تھا۔ ادھر سے مجید لاہوری آ گئے اور کہنے لگے کہ قاسمی صاحب ذرا بات سنئے۔ قاسمی صاحب اٹھ کر ان کے ساتھ اندر چلے گئے۔ دوبارہ یہ ہوا تو جگر صاحب سنانے کے لئے تلملا رہے تھے۔ اس کے بعد جب وہ سٹیج پر پہنچے تو پھر قاسمی صاحب سے کہنے لگے کہ میں نے عرض کیا تھا کہ ایک نعت کہی ہے لیکن آپ کو موقع نہیں مل رہا۔ تو اگر آپ سٹیج پر ہی سن لیجئے تو بھی ٹھیک ہے۔ قاسمی صاحب کہنے لگے کہ جگر صاحب سٹیج پر سننے کا مزا نہیں آئے گا کیونکہ میں یکسوئی سے سن نہیں سکوں گا۔ بعد میں سن لوں گا ویسے تو آپ سے نعت سننا میرے لئے باعث سعادت ہے۔ جگر صاحب چپ ہو گئے اور کہنے لگے کہ اچھا ٹھیک ہے پھر مشاعرے کے بعد سن لیجئے گا۔

جب مشاعرہ ختم ہوا تو سب شعراء اپنے کمروں میں جانے سے پہلے ایک بڑے کمرے میں چائے کے لئے آ گئے۔ میں قاسمی صاحب کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ جگر صاحب چلتے چلتے قاسمی صاحب کے پاس آ گئے تو میں نے احتراماً اپنی نشست خالی کر دی۔ کہنے لگے کہ قاسمی صاحب اگر موقع ہو تو میں اب وہ نعت عرض کر دوں۔ اتنے میں پروگرام کے مطابق کسی اور نے قاسمی صاحب کو آواز دی تو وہ جگر صاحب سے یہ کہہ کر اٹھ گئے کہ ذرا معاف فرمایئے۔ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ اس طرح رات تک ان سے نعت نہیں سنی گئی۔

صبح جب ہم اٹھے تو ہمارے ایک شاعر دوست آئے اور کہنے لگے کہ دیکھئے گا اب تھوڑی دیر کے بعد جگر صاحب آئیں گے۔ وہ رات سو نہیں سکے ہوں گے۔ اس لئے اب ان سے یہ نعت سن لیجئے گا۔ وہی ہوا کہ ان صاحب کے بات کرتے ہوئے ہی جگر صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ ہم سب اٹھے اور قاسمی صاحب کہنے لگے کہ قبلہ انتہائی افسوس

ہے۔ میں رات بھر اس خیال سے سو نہیں سکا کہ آپ نے اتنی اچھی نعت کہی ہوگی جو مجھے سننے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس وقت اگر آپ کے پاس وہ نعت ہو تو ارشاد فرمایئے تاکہ ہم اس نعت ہی سے صبح کا آغاز کریں۔ یہ سن کر جگر صاحب کا چہرہ کھل اٹھا۔ فوراً شیروانی کی جیب سے انہوں نے وہ نعت نکالی اور سنانی شروع کی۔ ہم سب نے جی بھر کے انہیں داد دی اور ان کی ساری کوفت دور ہوئی۔ جہاں تک میں اس نعت کو سمجھ سکا بہت خوبصورت تھی۔ سو ہم نے ان کی اس عادت کا خوب لطف اٹھایا۔

ان کی ایک اور عادت تھی کہ فلاش بہت کھیلتے تھے۔ وہ رات رات بھر خود بھی جاگتے رہتے تھے اور دوسروں کو بھی جگاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے پیسے لگاتے تھے۔ بچوں کی طرح کھیلتے تھے اور کھیل کے دوران نوعمر بچوں کی طرح ساتھ والوں کے ساتھ ہیر پھیر بھی کرتے تھے۔ یہ نہیں کہ وہ یہ ہیر پھیر پیسوں کیوجہ سے کرتے تھے بلکہ مزا لیتے تھے۔ کبھی کسی کے چار آنے مار لیتے اور کبھی پتے تبدیل کر لیتے۔ پھر اس سارے کھیل کے دوران شعر کا ذکر نہیں ہوتا تھا۔ اگر کوئی شعر کی بات کرتا تو وہ بڑی ملائمت سے ٹال دیتے۔ میں یہاں لاہور میں ایک بار ان کا تماشا دیکھنے کے لئے اس کھیل کے دوران موجود رہا۔ کیونکہ مجھے اس کے علاوہ جوئے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کیونکہ میں تو جوئے پیرس میں رہنے کے باوجود اسے ناپسند کرتا تھا اور اس معاملے میں آپ مجھے چیچو کی ملیاں کا رہنے والا سمجھ لیجئے۔ میں جوئے کے بارے میں یہ بات اپنے والد صاحب کے حوالے سے کہہ رہا ہوں اور سچ بھی یہی ہے کہ مجھے تاش کے پتوں کے بارے میں بھی کچھ علم نہیں۔ چنانچہ تاش کھیلنا اور اس دوران بچوں کی طرح ہیرا پھیری کرنا جگر صاحب کی تیسری عادت تھی۔

اس سلسلے میں یہ بتا دوں کہ ہم جب کہیں کسی مشاعرے میں جاتے تھے تو ہمارے مستقل تاش کھیلنے والوں میں جناب احمد ندیم قاسمی اور حبیب جالب ہمیشہ سرفہرست ہوتے تھے۔ اگر احمد فراز ہوتے تو وہ بھی شریک ہوتے تھے۔ پھر جب یہ لوگ تاش کھیلتے تو مجھے بھی کہتے کہ آؤ ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھیلو۔ مگر میں نہیں کھیلتا تھا کیونکہ مجھے تاش کھیلنا آتا ہی نہیں تھا۔

ایک بار ہم ٹرین میں جا رہے تھے۔ ٹرین میں مجھے نیند بہت آتی ہے کیونکہ جب ٹرین کا پہیہ چلتا ہے تو اس کے شور کے Rhythm سے مجھے فوراً ہی نیند آنے لگتی ہے۔ چنانچہ اس روز بھی جب ہم ٹرین کے ذریعے سفر پر روانہ ہوئے تو گاڑی چلنے کے تھوڑی دیر کے بعد ہی میں اوپر برتھ پر چڑھ کر سونے کے لئے لیٹ گیا مگر ان کا اصرار تھا کہ تم بھی نیچے آؤ اور ہمارے ساتھ بیٹھ کر تاش کھیلو۔ اس سے پہلے بھی ایک دو بار ایسا ہوا تھا کہ ان کے اصرار پر میں ان کے پاس بیٹھ کر کھیلتا رہا اور جب مجھے اپنی دانست میں پتا چلتا کہ مجھے یہ کھیل آ گیا ہے تو میں ان کے ساتھ بیٹھ جاتا تھا اور سو دو سو روپے ہار کر پھر اوپر جا کر سو جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس کھیل میں شوق ہی نہ ہو اس میں جیت کیا ہے۔ اس طرح میں ان سے تنگ آ گیا تھا۔

اس بار ہم کراچی جا رہے تھے اور جب ریل گاڑی کو چلے ہوئے کچھ دیر ہو چکی تھی اور میں اوپر برتھ پر لیٹ چکا تھا۔ تو نیچے سے انہوں نے کہنا شروع کیا کہ قتیل صاحب نیچے آیئے اور آ کر ہمارے ساتھ کھیلئے۔ میں نے اوپر ہی سے پچاس روپے کا نوٹ نیچے پھینکا اور کہا کہ آپ اسے آپس میں بانٹ لیں کیونکہ مجھے پتا ہے کہ آپ مجھے نیچے کیوں بلا رہے ہیں۔ کیونکہ آپ سمجھتے ہیں کہ یہ اناڑی آدمی ہے اور پیسے ہار جائے گا۔ تو سمجھ لیجئے کہ میں ہار گیا ہوں۔ وہ سب ہنسے اور پچاس روپے رکھ لئے۔ اس کے بعد میں نے کبھی تاش کو ہاتھ نہیں لگایا۔

اپنے مقابلے میں جب جگر صاحب کی طرف دھیان کرتا ہوں تو سمجھ نہیں آتی کہ اتنا وقت کس طرح نکال لیتے تھے اور یہ کھیل کھیلتے رہتے تھے۔ کیونکہ وہ تو ایک بہت بڑے شاعر اور مصروف آدمی تھے۔ میرے خیال میں یہ سب شوق کا معاملہ ہے اور مجھے کبھی اس کا شوق نہیں رہا۔

روش صدیقی اور اختر رضوانی

روش صدقی چھوٹے قد کے اور دبلے پتلے تھے۔ ان کے مجاز صاحب کے ساتھ کچھ لطیفے بھی مشہور ہیں۔ وہ نظمیں کہتے تھے تو ان کو مخاطب کر کے کہتے تھے۔ وہ عام شاعری سے اٹھ کر سیاسی شعور کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ ان کی اپنے قد سے زیادہ گمبھیر آواز تھی اور جب مائیک پر پڑھ رہے ہوتے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے کوئی چھ فٹ کا آدمی پڑھ رہا ہو۔ پھر وہ ترنم سے پڑھتے تھے جو خوبصورت تھا۔ اس زمانے میں ان کی کئی چیزیں بہت مشہور بھی ہوئیں۔ درمیان میں ان کی بیوی فوت ہوگئی تھیں۔

ان کے بارے میں مشہور ہے کہ مجاز صاحب سے کہنے لگے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ اب دوسری شادی کر ہی لوں لیکن عمر کا تقاضا ہے کہ کسی کنواری لڑکی سے شادی نہ کروں کیونکہ یہ غیر مناسب ہوگا۔ بلکہ اگر کسی بیوہ سے شادی کرلوں تو بہتر ہوگا۔ مجاز صاحب بہت زندہ دل تھے کہنے لگے کہ آپ کسی بھی لڑکی سے شادی کرلیں وہ شادی کے بعد خود ہی بیوہ ہو جائے گی۔

اسی طرح انہی کے سامنے انہوں نے کہا کہ میری شاعری سے آپ لاکھ انکار کریں مگر ایک دن آپ مانیں گے کہ میری شاعری قدآور ہے۔ مجاز صاحب کہنے لگے کہ یار روش تمہاری شاعری بھی قدرآور بن جائے گی پہلے خود تو قدآور بن جاؤ۔ روش صدیقی اس قسم کی باتوں کا برا نہیں مانتے تھے بلکہ ان سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہ دوستوں کے دوست تھے۔ میں یہ پارٹیشن سے کچھ عرصہ بعد کی بات کر رہا ہوں۔

روش بات تو سوشلزم کی کرتے تھے لیکن خود پیر پرست تھے اور دربار گولڑہ سے ان کا تعلق تھا۔ گولڑہ کے علاوہ پیر شاہ نصیر الدین گیلانی کے دادا حضرت بابو جی اس وقت پیر ہوتے تھے۔ ایک بار روش کراچی کے مشاعرے میں شرکت کے لئے آئے تو وہاں سے لاہور آئے اور خاص طور پر گولڑہ میں حاضری دینے کے لئے گئے۔ ہمارے ایک دوست ہیں عارف عبدالمتین، روش لاہور میں ان کے ہاں ٹھہرے۔ ان سے ایک لطیفہ بھی منسوب ہے۔ عارف صاحب کے ہاں تکلف ہے۔ وہ جب باتیں بھی کرتے تھے تو وہ گھڑی گھڑائی ہوتی ہیں مثلاً اگر آپ نے سونا ہے اور آپ کہتے ہیں کہ ذرا چادر تو بچھا دیں تو یہ کہیں گے کہ قالین بچھا دوں۔ یعنی جو آپ نے مانگا ہے اس سے زیادہ کی بات کریں گے۔ اگر آپ نے ہاتھ کا پنکھا مانگا ہے تو کہیں گے کہ اگر آپ تھوڑا توقف کریں تو میں بجلی کا پنکھا لگوا دوں۔

اسی طرح جب روش ان کے پاس آ کر ٹھہرے تو عارف صاحب سے صبح اٹھ کر کہا کہ عارف صاحب ذرا پانی لا دیں گے۔ روش صاحب نمازی آدمی تھے اور پنجگانہ نماز ادا کرتے تھے۔ جب انہوں نے عارف صاحب سے پانی مانگا تو وہ کہنے لگے روش صاحب وضو لا دوں۔ ان کے بارے میں یہ لطیفہ مشہور ہوا۔

لائل پور میں ہندو پاک مشاعرہ تھا۔ پنڈت ہری چند اختر صدارت کر رہے تھے۔ اس مشاعرے میں انڈیا سے جو شعراء آئے ہوئے تھے ان میں علامہ انور صابری بھی شریک تھے۔ شکل صورت ایسی تھی کہ کالے بھجنگ اور بہت موٹے تھے۔ یہ شلوار اور کرتا پہنتے تھے۔ پیری کا دم بھی بھرتے تھے اور مریدی کا بھی۔ جہاں ضرورت پڑتی تھی پیر بن جاتے تھے اور جہاں ضرورت پڑتی تھی مرید بن جاتے تھے۔ پہلے یہ بتا دوں کہ یہ بڑا تکلف کرتے تھے اور ان کے ذہن میں جو طبع زاد چیز آ جاتی تھی اسے خود بھی حقیقت سمجھ کر بیان کر جاتے تھے۔ مثال کے طور پر ہندوستان کے وزیر اعظم شاستری ایک مشاعرے میں صدارت کر رہے تھے۔ انہیں عادت تھی کہ سٹیج پر اشعار سے پہلے کچھ باتیں کرتے تھے۔ کہنے لگے کہ واہ واہ کیا زمانہ تھا جب ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک چل رہی تھی اور پورا ہندوستان بیدار اور جذباتی تھا

تو ان دنوں میں اور صاحب صدر الٰہ آباد جیل میں بند تھے۔ پھر وزیر اعظم شاستری کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کیوں شاستری صاحب؟ اب شاستری صاحب نہ ہاں کر سکتے تھے اور نہ ہی نہ کر سکے تھے۔ سو یہ اس طرح کی باتیں کرتے تھے۔

اس طرح ایک بار پنڈت ہری چند اختر ایک مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے۔ یہ ایک نستعلیق قسم کے شاعر تھے اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے یہ بات ان کی صدارت میں بھی دہرائی تھی اور کہنے لگے کہ واہ واہ کیا وقت تھا' تحریک چل رہی تھی تو میں اور صاحب صدر ہری چند اختر کراچی جیل میں بند تھے۔ صاحب صدر نے کہا کہ ذرا ٹھہریئے صاحب! وہاں ہم دونوں تھے لیکن دونوں کے جرموں کی نوعیت الگ الگ تھی۔ اس سے حاضرین مشاعرہ نے بہت قہقہہ لگایا۔

چنانچہ جب یہ لائل پور کے مشاعرے میں سٹیج پر پڑھ رہے تھے تو کوئی فوٹو گرافر تصویر لینے کے لئے آیا تو کہنے لگے کہ نہیں صاحب ہم تصویر نہیں اتروائیں گے۔ ہٹایئے اپنا کیمرہ۔ اب تصویر تو اس نے لینی ہی تھی۔ یہ صرف نمایاں ہونے کے لئے یہ سب کچھ کر رہے تھے۔ پنڈت صاحب جو مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے کہنے لگے کہ علامہ صاحب تصویر لینے دیجئے۔ یہ اخبار میں چھاپنے کے لئے نہیں ہے بلکہ بچوں کو ڈرانے کے لئے ہے۔ اس پر وہاں بہت قہقہہ پڑا۔

اس مشاعرے میں کہنے لگے کہ طبیعت علیل ہے۔ کچھ پڑھنے کو جی نہیں چاہ رہا۔ لیکن حاضر ہوئے ہیں تو پانچ شعر عرض کروں گا۔ پھر پنڈت جی نے کہا کہ مولانا پانچ شعر کہتے ہوئے ذرا اپنا جثہ تو دیکھئے مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ہاتھی مینگنیاں دینے لگا ہے۔ اس پر بھی وہاں بہت قہقہہ پڑا۔

اب علامہ صاحب حسب ضرورت پیر بھی بن جاتے تھے اور مرید بھی۔ یہ پیر تو وہاں بنتے تھے جہاں کسی سے کچھ لینا ہو اور مرید بھی وہاں بنتے تھے جہاں سے کچھ لینا ہو۔ پیری کی بات تو سیدھی ہے کہ کوئی شخص جتنا سیدھا سادہ ہوگا وہ پیر کی باتوں میں آ جائے گا۔ تو یہ یوپی اور دہلی وغیرہ کے بعض علاقوں میں پیر بھی بنے ہوئے تھے اور وہاں جا کر اپنے

مریدوں سے نذرونیاز لیا کرتے تھے۔ لیکن ہم نے انہیں ایک بار مرید بنتے ہوئے بھی دیکھا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب یہ پاکپتن کے ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ جس میں کنور مہندر سنگھ بیدی اور بمبئی کے ایک دوسرے شاعر بھی شرکت کررہے تھے۔ یہ مجھے کہنے لگے کہ قتیل صاحب دیوان قطب جو یہاں کے متولی ہیں میں ان سے ملنا چاہتا ہوں کیونکہ ہم اس درگاہ کے مرید ہیں کیونکہ ہماری پیری کا شجرہ نسب ان سے ملتا ہے۔ اس لئے مرا ان کے پاس جانا باعث ثواب ہوگا۔ بمبئی کا دوسرا شاعر جس کا نام اب مجھے یاد نہیں وہ میں اور علامہ انور صابری نے دیوان صاحب سے فون پر رابطہ کیا۔ دیوان صاحب میرے نام سے واقف تھے۔ میں نے بات بتائی تو انہوں نے کہا کہ آجایئے۔ چنانچہ ہم ان کے پاس تینوں ایک ساتھ پہنچے۔

میں اور انور صابری دیوان صاحب کے پاس اندر کمرے میں بیٹھے تھے جبکہ وہ بمبئی والا شاعر اس کے ساتھ دالان میں بیٹھا تھا۔ وہاں جاکر میں نے علامہ کی اداکاری دیکھی۔ یہ جاتے ہی دیوان صاحب کے سامنے ان کے قدموں میں سجدے میں گر گئے۔ دیوان صاحب نے کہا علامہ صاحب اٹھیئے' یہ کیا کررہے ہیں۔ یہ کہنے لگے کہ نہیں صاحب یہ تو ہمارا پیر خانہ ہے۔ مجھے یہاں سے مت اٹھایئے' مجھے جی بھر کے اپنا سر ان قدموں میں رکھ لینے دیجیے۔ خیر بڑی مشکل سے انہیں اٹھایا گیا۔ جب اٹھے تو میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور کہہ رہے تھے کہ بڑی مدت کے بعد میری خواہش پوری ہوئی ہے اور آپ کی قدم بوسی سے میرا سینہ روشن ہوگیا ہے۔

خیر باتیں ہوتی رہیں اور میں سوچتا رہا کہ یہ بندہ آخر یہ سب کچھ کیوں کررہا ہے۔ آخر یہ بات بھی کھل گئی۔ یہ اٹھنے سے پہلے دیوان صاحب سے کہنے لگے کہ حضرت آپ ہمارے والی درگاہ کو جانتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے تو معلوم نہیں۔ کہنے لگے کہ ہم تو آپ کے مریدوں میں سے ہیں اور وہاں بھی آپ ہی کا سلسلہ فیض چلا ہوا ہے۔ اس درگاہ کے متولی ہم لوگ ہیں۔ ہماری اس درگاہ پر ہر سال عرس کے سلسلہ میں جو قوال آیا کرتے

تھے۔ وہ اب پاکستان آ چکے ہیں اور اب جب انہیں پتا چلا ہے کہ میں یہاں آیا ہوا ہوں تو وہ میرے پاس آنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اب وہ آئیں گے تو اسی توقع پر آئیں گے کہ میں انہیں کچھ دوں گا۔ اب میں تو یہاں مشاعرے کے سلسلے میں آیا ہوا ہوں۔ اب مجھے یہاں سے کیا ملے گا اور میں ان کی نذر کیا کروں گا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس سلسلے میں میری رہنمائی کریں۔ انہوں نے اپنی جیب میں سے پانچ سو روپے کا نوٹ نکالا اور کہنے لگے کہ آپ انہیں یہ نوٹ دے دیجئے گا۔ میں دل ہی دل میں بہت ہنسا اور کہا کہ علامہ صاحب یہاں جو مرید بنے ہیں اور بے غرض نہیں تھا۔ انہیں مرید بننے کے پانچ سو روپے مل گئے ہیں۔

اس موقع پر لطیفہ یہ ہوا کہ یہ بار بار دیوان صاحب سے کہتے تھے کہ حضور میں تو اس درگاہ کا کتا ہوں۔ اب وہ بمبئی کا شاعر علامہ صاحب کے ساتھ بہت بے تکلف تھا وہ اصل میں امروہہ کا تھا اور امروہی کہلواتا تھا۔ جب انہوں نے اندر بہت دیر لگا دی تو اس نے وہیں سے آواز دی قتیل صاحب اب اس کتے کو باہر بھی نکالئے بہت دیر ہو رہی ہے۔ یہ بات علامہ نے بھی سن لی تھی مگر پی گئے اور کہنے لگے کہ اچھا حضور اجازت دیجئے اور پھر اسی طرح اپنی چرب زبانی کا مظاہرہ کرنے لگے۔ یوں ہم وہاں سے چلے آئے۔

اس کے بعد جب شام کو ہمیں مشاعرے کے منتظمین کی طرف سے معاوضہ ملا تو پتا چلا کہ علامہ صاحب کو دیوان سے جو پانچ سو روپے ملے تھے وہ نوٹ کہیں کھو گیا ہے۔ ہم بہت حیران ہوئے اور پھر علامہ صاحب کہہ رہے تھے کہ بے شک قتیل صاحب سے پوچھ لیجئے ان کے سامنے میرے پاس پانچ سو روپیہ تھا۔ دیوان غلام قطب نے یہ نوٹ ہمیں نذر کیا تھا حالانکہ انہوں نے دیوان صاحب سے بھیک مانگی تھی۔ مگر اب یہاں کہہ رہے تھے کہ دیوان صاحب نے وہ نوٹ ہمیں نذر کیا تھا۔ اب مشاعرے کے منتظمین نے شرمندگی کے عالم میں معاوضے کے علاوہ جو کچھ اور بھی بن سکا وہ انہیں دیا۔

ان کے بارے میں ایک لطیفہ اور ہے۔ یہ محض لطیفے کی حد تک ہے اس میں حقیقت تو نہیں ہوگی۔ ایک بار کسی سے کہنے لگے کہ دھوبی کو بلواؤ ہم اپنی شلوار دھلوانا چاہتے ہیں۔

چنانچہ دھوبی آیا اور ان کی شلوار اٹھانی شروع کی۔ وہ شلوار اٹھاتا ہی چلا گیا۔ جب وہ کافی دیر تک شلوار اٹھاتا رہا اور وہ ختم نہ ہوئی تو اس نے ان کی شلوار نیچے گراتے ہوئے کہا کہ یا حضرت میں شلواریں دھوتا ہوں کوئی تنبو نہیں دھوتا۔

اب علامہ فوت ہو گئے ہیں۔ خدا انہیں جنت نصیب کرے۔ وہ دیوبندی خیالات کے تھے۔ ہم نے ایک بار جوش صاحب کو ان سے یہ کہتے سنا کہ یار پہلے مجھے سمجھ نہیں آتی تھی۔ یہ دیوبند کیوں کہتے ہیں۔ اب مجھے تم دیو کو دیکھ کر یہ پتا چلا کہ دیوبند کیوں کہتے ہیں۔ یہ پھبتی جوش صاحب نے کسی تھی۔

ادیبوں اور شعراء کے لطائف جو کچھ ذہن میں رہ گئے ہیں ان میں مولانا تاجور کے لطیفے بھی شامل ہیں۔ جو جس نے بھی گھڑے اس نے مولانا تاجور کو بھی سنائے تھے۔ مولانا بھی یہ لطیفے سن کر بہت ہنسے تھے اور پھر کہتے تھے کہ یار یہ لطیفہ کس نے گھڑا ہے۔ ذرا اس سے ملاؤ۔ مولانا بہت موٹے اور لحیم شحیم تھے۔ ان کا پیٹ بھی بہت نکلا ہوا تھا۔ ان کے بارے میں ایک لطیفہ یہ تھا کہ ایک بار انہیں چوک لکشمی سے لوہاری دروازے جانا تھا۔ انہوں نے تانگے والے کو روکا۔ اس زمانے میں یہاں سے وہاں تک ایک آنہ کرایہ ہوتا تھا اور اگلی اور پچھلی نشست پر تین سواریاں بٹھائی جاتی تھیں۔ انہوں نے تانگے والے سے کہا کہ یار لوہاری جانا ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں جانا ہے جی۔ انہوں نے پوچھا کہ کتنے پیسے لو گے۔ تو اس نے کہا چھ آنے۔ یہ کہنے لگے کہ ایک پھیرے کے کل تین آنے ہوتے ہیں تم کیوں چھ آنے مانگ رہے ہو۔ اس نے کہا کہ جناب آپ کو تو دو پھیروں میں لے جانا پڑے گا۔

ان کے بارے میں دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ ایک بار درزی کے ہاں شیروانی کا ناپ دینے کے لئے گئے۔ درزی نے انچی ٹیپ لیا اور اس کا سرا مولانا کی ناف پر رکھ کر ان سے کہا کہ مولانا آپ ذرا یہاں پر ہاتھ رکھئے اور میں دوسری طرف سے گھوم کر آتا ہوں۔

مولانا کے علاوہ شیر محمد اختر بھی بہت دلچسپ آدمی تھے۔ وہ نوائے وقت والوں کے رسالے ''قندیل'' کے ایڈیٹر ہوتے تھے۔ ان کے بارے میں بھی دو لطیفے ہیں۔ پہلا لطیفہ

یوں ہے کہ انہوں نے حمید نظامی کو ایک رقعہ لکھا اور چونکہ ہکلے تھے اور بات بہت اٹک اٹک کر کرتے تھے اس لئے انہوں نے نظامی صاحب کو رقعہ لکھا اور اس میں لکھا کہ نظامی صاحب مجھے آپ سے دو منٹ کی بات کرنی ہے ازراہ کرم دس منٹ عنایت کئے جائیں۔ دوسرا لطیفہ یہ تھا کہ وہ ایک بار جہاز میں بیٹھے تھے اور جہاز کا عملہ ہدایات جاری کر رہا تھا کہ اگر حادثہ ہو تو آپ یوں کریں۔ آخری شکل یہ ہے کہ آپ لائف جیکٹ پہن کر دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر تین تک گن کر نیچے چھلانگ لگا دیں۔ ان کی سمجھ میں بات نہ آئی تو انہوں نے اس آدمی کو بلایا جو ہدایات دے رہا تھا اور اس سے ہکلا کر پوچھا کہ کتنے تک گننا ہے۔ اس نے کہا کہ آپ صرف ایک ہی گن کر چھلانگ لگا دیں۔

یہ تو چھوٹے چھوٹے لطیفے ہوئے۔ جیسا میں نے علامہ انور صابری کے کردار اور ان کی دلچسپ زندگی کے بارے میں عرض کیا ہے۔ اسی طرح ایک اور کریکٹر تھے جن کا نام اختر رضوانی تھا۔ آج کل کے لوگ بالکل نہیں جانتے لیکن قیام پاکستان سے پہلے ان کا ڈنکا بجتا تھا کیونکہ پورے ہندوستان میں کوئی شہر ایسا نہیں تھا جہاں ان کی سواری نہ جاتی ہو۔ ان کا نام ستیہ پال تھا اور وہ جالندھر سائیڈ کے رہنے والے تھے۔ لمبے لمبے بال تھے جیسے ٹیگور کے بال تھے۔ کلین شیو تھے اور عام طور پر گیروے کپڑے پہنتے تھے۔ وہ زیادہ تر غزل اور رباعی کہتے تھے اور اپنے آپ کو رئیس الترنم بھی لکھتے تھے۔ پھر شیدائے غم بھی اپنے آپ کو لکھتے تھے۔ ان کی شکل وصورت بالکل درویشوں جیسی تھی۔ ان کا کام یہ تھا کہ جس کے پاس بھی چلے گئے ہیں ڈیرے جما دیئے۔ کسی کے بارے میں جو لطیفہ تھا کہ جب وہ کسی کے ہاں مہمان ٹھہرا تو ایک مہینہ گزرنے کے بعد صاحب خانہ نے پوچھا کہ آپ پھر کب آئیں گے تو مہمان نے کہا کہ پھر بھی انشاء اللہ آؤں گا۔ انہوں نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ آپ پھر نہیں آئیں گے۔ انہوں نے کہا کہ جی آپ کو یہ شبہ کیوں ہوتا ہے کہ میں پھر نہیں آؤں گا۔ کہنے لگے کہ میں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ آپ اگر جائیں گے تو آئیں گے۔ تو بالکل یہی حال اختر رضوانی کا بھی تھا۔

اختر رضوانی کے بارے میں بھی یہ مشہور ہے کہ جب وہ کسی کے ہاں مہمان بن

کر جاتے تو اتنا لمبا قیام کرتے کہ جب یہ کبھی تھوڑی دیر کے لئے گھر سے باہر جاتے تو اہل خانہ تالہ لگا کر خود بھی کسی اور کے گھر چلے جاتے اور چار پانچ دن وہیں قیام کرتے۔۔تب کہیں اختر رضوانی جاتے تھے۔ ان کی یہ خوبی تھی کہ جس شہر میں بھی جانا ہوتا وہ اندازہ کر لیتے تھے کہ اس شہر میں آپ کے دوست کون کون سے ہیں۔ پھر آپ ان کے نام خط لکھا دیتے تھے کہ اختر رضوانی ایک بہت بڑے شاعر ہیں۔ یہ آپ کے پاس آئیں گے ان کا خاص خیال رکھیئے گا۔ اس طرح یہ مختلف لوگوں کے ہاں مہمان بنے رہتے تھے۔

یہ سگریٹ بہت پیتے تھے اور انتہائی غلیظ آدمی تھے۔ جب یہ میرے ہاں گئے تو میری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ میں نے اس زمانے میں خیالی شاعر کا جو تصور سنا تھا یہ بالکل ویسے ہی تھے۔ یہ مجھے بہت بڑے شاعر نظر آئے اور میں نے ان کی تواضع کی۔ یہ میرے پاس اس طرح آئے کہ میں نے ہری پور کی تاریخ میں جب پہلا مشاعرہ منعقد کروایا تو اس میں نفیس خلیلی، قمر جلال آبادی اور انہیں بلوایا تھا۔ وہ دونوں شریف آدمی تو واپس اپنے گھروں کو چلے گئے لیکن یہ میرے ہاں ہی ٹھہر گئے۔

میں نے اپنا فرض سمجھا کہ یہ شاعر ہیں اور ان کی خدمت کروں۔ پھر انہوں نے مجھے ایسے ایسے اشعار سنائے کہ میں دنگ رہ گیا۔ بہت اچھے اشعار تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ ان میں سے کچھ اشعار جوش کے تھے اور کچھ جگر صاحب کے۔ بہرحال جب یہ میرے پاس مہمان ٹھہرے تو میں نے ان کی خوب خاطر مدارات کی۔ میرے پاس اپنی یعنی شادی کی جو فرکی لحاف تھی وہ میں نے انہیں دی۔ اس کے علاوہ اپنا سجا سجایا کمرہ بھی انہیں دے دیا۔ یہ اتنے غلیظ تھے کہ نہاتے نہیں تھے۔

ہم صبح کے وقت انہیں جگاتے اور کہتے تھے کہ اختر صاحب صبح ہوگئی ہے تو یہ بستر سے ہاتھ نکال کر کہتے تھے کہ سگریٹ۔ جیسے کوئی بادشاہ اپنے کسی ملازم سے کوئی چیز مانگتا ہے۔ میں سگریٹ سلگا کر دیتا تھا۔ یہ سوئے سوئے بند آنکھوں سے سگریٹ پینے لگتے تھے۔ پھر سگریٹ پی کر آنکھیں کھولتے تھے اور کہتے تھے کہ پانی۔ میں پانی لاتا تھا تو یہ اس میں ہاتھ ڈبو کر گیلے ہاتھ کو آنکھوں پر مل لیتے تھے اور آنکھوں کو تولئے سے صاف کر لیتے تھے۔ یہ ان

کی کل صفائی ہوتی تھی۔

اس کے بعد بستر ہی پر ان کے لئے چائے آجاتی تھی۔ یہ چائے پیتے تھے اور پھر یہ کلام سنانا شروع کر دیتے تھے۔ ان کا کمال یہ تھا کہ پوری پوری چیزیں دوسروں کی سنا دیتے تھے۔ پھر یوں کرتے تھے کہ کسی طرح مشاعرے میں چلے جاتے۔ حافظہ بہت کمال کا تھا۔ شعر سن لیتے تو لکھے بغیر ہی یاد کر لیتے۔ اگر کسی مشاعرے میں سولہ غزلیں پڑھی گئی ہیں تو جو کسی کی غزل کا اچھا شعر ہوتا تھا اسے یاد کر لیتے تھے۔ اس طرح ان اچھے اشعار میں سے آٹھ دس اشعار کی اپنی غزل نکال لاتے تھے۔ انہیں اتنی مشق تھی کہ مقطع خود بھی شامل کر لیتے تھے۔ اب ظاہر ہے کہ طرحی مشاعرے کی سب غزلوں میں سے چنے ہوئے اشعار کی ان کی غزل بہت اچھی ہوگی۔ اس طرح وہ شاعری کرتے تھے۔

ایک واقعہ اس طرح ہوا کہ شیخوپورہ سے احمد ندیم قاسمی صاحب کے بارے میں ایک شخص نے کسی اور شہر میں مقیم اپنے دوست سے کہا کہ میرے پاس احمد ندیم قاسمی صاحب آکر ٹھہرے ہوئے تھے انہیں کچھ سمجھایئے وہ شراب بہت پیتے ہیں۔ وہ شخص قاسمی صاحب کو جانتا تھا۔ اس نے کہا کہ خدا خدا ..... قاسمی صاحب شراب نہیں پیتے۔ وہ کہنے لگا کہ میرے پاس تو وہ تین چار دن ٹھہر کر گئے ہیں اور جا و بے جا مطالبہ کرتے رہتے تھے کہ شراب لا کر دو۔ اس نے پوچھا کہ شکل کیا تھی۔ اس نے کہا کہ لمبے لمبے بال تھے اور کلین شیو تھے اور گیروے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں قاسمی صاحب کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں ہوتی تھیں۔ اس نے کہا کہ قاسمی صاحب کا تو یہ حلیہ ہی نہیں ہے۔ وہ تو سوٹ پہنتے تھے اور عینک لگاتے ہیں۔ پھر اس نے کہا کہ جو حلیہ تم نے بتایا ہے وہ تو اختر رضوانی کا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ وہی ہوگا لیکن یہاں تو وہ احمد ندیم قاسمی بن کر ٹھہرا ہوا تھا۔

اسی طرح وہ کسی اور جگہ اختر رضوانی کی بجائے اختر شیرانی بن جاتے تھے۔ شادی تو کی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی بچے تھے۔ آگے پیچھے بھی غالباً کوئی نہیں تھے۔ اسی لئے اس طرح گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ ایک بار یوں ہوا کہ اختر رضوانی نے میرے ہری پور کے پہلے مشاعرے میں جو رباعی پڑھی تھی اور جو بہت ہٹ ہوئی تھی وہ کسی نے مشاعرے کی

کارروائی میں لکھ کر قمر جلال آبادی کے پرچے ''سٹار'' میں بھیج دی جو چھپ بھی گئی۔

تھوڑے دنوں بعد پشاور میں مشاعرہ ہوا تو اس میں لاہور سے اختر رضوانی اور قمر جلال آبادی شریک ہوئے تھے۔ ہری پور سے میں گیا ہوا تھا۔ ہم پشاور ریلوے سٹیشن پر ایک ساتھ اترے کیونکہ میں ٹیکسلا سے سوار ہوا تھا۔ جب ہم پشاور اترے تو ایک شخص نے آگے بڑھ کر اختر رضوانی کو گریبان سے پکڑ لیا اور کہا کہ تم نے میرے استاد کی رباعی اپنے نام سے کیوں پڑھی کیونکہ یہ تو میرے استاد ضیاء جعفری کی رباعی تھی۔ یہ کہنے لگے کہ میں نے تو یہ رباعی نہیں پڑھی تھی۔ وہ شخص مجھے کہنے لگا کہ جی اس مشاعرے کی کارروائی آپ نے لکھی تھی۔ میں نے کہا کہ ہاں میں نے لکھی تھی۔ اختر صاحب کا تکیہ کلام تھا آپ کے خلوص کی قسم۔ کہنے لگے کہ آپ کے خلوص کی قسم قتیل صاحب کو مغالطہ ہوا ہے۔ میں نے تو کہا تھا کہ استاد گرامی حضرت ضیاء کی رباعی پہلے عرض کرتا ہوں۔ پھر اپنا کلام سناؤں گا اور میں نے تو یہ رباعی ان کا نام لے کر پڑھی تھی۔ خیر اس طرح یہ جھگڑا ختم ہوا۔

آگے ہم گئے تو رات کو مشاعرے میں قمر جلال آبادی نے کوئی چیز پڑھی تو کھسر پھسر شروع ہوگئی اور لوگ انہیں داد نہیں دے رہے تھے۔ بعد میں لوگوں نے کہا کہ یہ جو قمر جلال آبادی ہے یہ تو اختر رضوانی کی غزل پڑھ گیا ہے۔ ہوا یہ تھا کہ اس مشاعرے میں کوئی دو چار ماہ پہلے اختر رضوانی یہاں پر ایک اور مشاعرے میں آئے تھے اور قمر جلال آبادی کی یہی غزل اپنے نام سے پڑھ گئے تھے۔ اب قمر صاحب نے جب اپنی ہی غزل پڑھی تو لوگ انہیں چور سمجھے۔ جب ہمیں اس سارے واقعے کا علم ہوا تو ہم نے اختر صاحب سے کہا کہ اختر صاحب یہ آپ نے کیا کیا۔ تو کہنے لگے کہ آپ کے خلوص کی قسم میں نے تو قمر صاحب کا نام لے کر اپنے کلام سے پہلے ان کی غزل پڑھی تھی کیونکہ میں ہمیشہ اپنے کلام سے پہلے اپنے بزرگ دوستوں کا کلام پڑھتا ہوں اور اس طرح کبھی کبھی مغالطہ بھی ہو جاتا ہے۔

پارٹیشن ہوگئی تو بہت لطیفے ہوئے۔ کچھ دوستوں نے کہا کہ ہمیں پاکستان بننے کا نقصان بھی ہوئے لیکن ایک فائدہ یہ ہوا کہ ہم نے انڈیا سے ایک بدلہ لے لیا اور وہ یہ کہ ہم

نے اختر رضوانی انڈیا کو دے دیا تا کہ اب وہ اسے بھگتیں۔

ایک بار جالندھر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میری بیوی بھی میرے ساتھ تھی۔ یہ 1950ء کے بعد کا واقعہ ہے۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ اختر رضوانی ابھی زندہ ہے۔ اس وقت اختر رضوانی خود کہنے لگے تھے اور رباعی بہت پختہ کہہ رہے تھے۔ مشرقی پنجاب کی حکومت نے ان کا کچھ وظیفہ بھی مقرر کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے وہاں کے ایک دو مجسٹریٹوں کو بھی گانٹھ رکھا تھا جو انہیں کھلاتے رہتے تھے۔

جب میں وہاں گیا تو لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ شخص جو دوسروں سے خود ہمیشہ کھاتا ہی رہتا ہے اس نے قتیل شفائی کے اعزاز میں دعوت کیسے کر دی۔ انہوں نے اس مشاعرے کی صدارت اس مجسٹریٹ سے کروائی۔ اس سے پیسے بھی خرچوائے اور سو پچاس آدمیوں کو بلوا کر میرے اعزاز میں دعوت دی۔ اس دعوت میں لوگ مجھ سے پوچھنے لگے کہ آپ کے پاس کیا گیدڑ سنگھی ہے۔ جو یہ شخص آپ کے اعزاز میں دعوت کر رہا ہے۔ ہر چند کہ اس نے اس دعوت پر کسی اور ہی سے پیسے خرچ کروائے ہیں لیکن پھر بھی یہ شخص کبھی کسی سے مروت نہیں کرتا۔ مگر مجھے جواب دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ اختر رضوانی نے خود ہی سب کو بتا دیا تھا کہ میں ان کے پاس جا کے رہتا تھا اور ہری پور میں ان کے ہاں اکثر قیام بھی کیا تھا۔

ان کا اور قاسمی صاحب کا ایک واقعہ ہے کہ قاسمی صاحب پنڈی کے امپیریل سینما میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں پر ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ یہ پارٹیشن سے پہلے کی بات ہے اور یہ آل انڈیا مشاعرہ تھا۔ میں بھی اس مشاعرے میں شریک تھا اور اختر رضوانی بھی میرے پاس بیٹھے تھے۔ قاسمی صاحب کی باری چونکہ بعد میں آنی تھی۔ اس لئے جب اختر رضوانی کی باری آئی تو یہ گئے اور سٹیج پر جا کر قاسمی صاحب کے بیٹھے ہوئے ہی ان کے قطعے پڑھ کر واپس آ گئے۔ جب یہ واپس آئے تو میں نے کہا کہ اختر یار کچھ شرم کرو۔ یہ قطعے تو قاسمی صاحب کے ہیں۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے کہ میں بھی قاسمی صاحب ہی کا ہوں۔ میں نے کب کہا ہے کہ یہ قطعے میرے ہیں۔

حافظ عنصر لدھیانوی قیام پاکستان کے بعد لدھیانہ سے ہجرت کر کے پشاور میں آ کر مقیم ہوئے۔ یہ ایک نابینا شاعر تھے اور اپنے نابینا ہونے کے مضامین انہوں نے اکثر مقطعوں میں باندھے تھے۔ آواز بھی اچھی تھی اور کلام بھی اچھا تھا۔ خاص طور پر جب ان کی بینائی کے حوالے سے کوئی شعر آتا تھا تو وہ متاثر کرتا تھا۔ انسان کے نفسیاتی معاملات عجیب ہوتے ہیں۔ وہ دیکھ تو سکتے نہیں تھے لیکن انہیں شوق تھا کہ جس مشاعرے میں خواتین ہوں وہاں یہ ضرور جاتے۔ اب اس بات کی سمجھ تو آتی ہے کہ ان کی آواز ان کے کان میں پڑتی ہوگی اور یہ لطف اندوز ہونے کے لئے جاتے ہوں گے۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ جس مشاعرے میں میں ہوتا تھا تو یہ مجھ سے کہتے تھے کہ یار قتیل! آج فوٹو ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ کسی اور شاعر سے بھی اس طرح کہتے ہوں لیکن مجھ سے ہمیشہ کہتے تھے۔ جب میں کہتا تھا کہ ہاں فوٹو بھی ہوگی تو کہتے تھے کہ منور سلطانہ اور بسمل صابری وغیرہ کو میرے آس پاس کھڑا کر کے تصویر اتروا دیں۔ تو میں یوں ہی کرتا تھا۔ بعض اوقات تو میں لڑکیوں سے بھی کہہ دیتا تھا کہ حافظ صاحب آپ کے ساتھ تصویر اتروانا چاہتے ہیں تو وہ بھی لطف اندوز ہوتی تھیں اور ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ان کے ساتھ بہت جڑ کر تصویر بنواتی تھیں۔ حافظ صاحب فوٹو گرافر کو خاص طور پر تصویر اور رجسٹری کے پیسے اور اپنا ایڈریس دیتے تھے تاکہ وہ اس ایڈریس پر ان کی تصویر بھیج دے۔

اب حافظ صاحب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن اگر ان کے گھر میں ان کا البم دیکھا جائے تو بہت سی تصاویر بتاں ضرور ملیں گی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہاں سے حسینوں کے خطوط شاید نہیں مل سکیں گے۔ اللہ بخشے بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ اب بھی وہ یاد آتے ہیں تو احباب مل کر ان کا ذکر کر لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حافظ صاحب کے ساتھ وہ تصویر اتروائی تھی اور سناؤ وہ اب کبھی خوابوں میں آئے۔ تو یوں ان کی باتیں یاد کر کے قہقہے لگا لیتے ہیں۔ سنا ہے کہ ان کے صاحبزادے ان کا مجموعہ کلام اب چھپوا رہے ہیں۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔

میں یہ بات کہنا بھول گیا کہ حافظ صاحب اندھا ہونے کے باوجود سکول چلاتے تھے

اور خود بھی کلاس لیتے تھے۔ وہ ایک اچھے استاد کے فرائض انجام دیتے تھے اور تنخواہ بھی اچھی لیتے تھے۔ انہوں نے اپنی معذوری کو مجبوری بننے نہیں دیا تھا۔

وہ جس میدان میں بھی جاتے تھے اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑتے چلے جاتے تھے۔ چنانچہ جب شادیوں کے میدان میں گئے تو موصوف نے وہاں بھی کامیابی کا مظاہرہ کیا اور تین شادیاں بھی کیں۔ جہاں اچھے خاصے بینا لوگ اپنے حقوق کا تحفظ نہیں کر سکتے تھے حافظ صاحب وہاں اپنے حقوق کا تحفظ کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے لئے بہت اچھا مکان الاٹ کروایا تھا اور خود آگے بڑھ کر یہ سارا کام کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے مہاجر ہونے کے استحقاق پر جو دوسری مراعات لی ہیں ان کی تعداد خاصی تھی اور یہ سب کام وہ تن تنہا کیا کرتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اگر ان کے ملنے والوں میں کوئی آفیسر ہوتا تو وہ اس کی مدد بھی لے لیا کرتے تھے۔ لیکن آفرین ان پر کہ انہوں نے مرتے دم تک ایک فعال شوہر، فعال عاشق، فعال باپ اور فعال مقدمہ باز کے طور پر زندگی گزاری۔

تائب رضوی

آج کل مشاعروں کی وہ کثرت نہیں ہے جو ماضی میں تھی بلکہ یوں سمجھئے کہ ماضی کے مقابلے میں آج کل مشاعرے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پھر خالص ادبی مشاعرے تو تقریباً ختم ہو چکے ہیں۔ اب مشاعرہ یا تو قوم آزادی پر 14 اگست کو ہوتا ہے یا عید میلاالنبیؐ یا ماہ رمضان کے دوران نعتیہ مشاعرہ ہوتا ہے۔ یا پھر محرم الحرام میں مسالے کے سلسلے میں مشاعرہ ہوتا ہے۔ دوسرے خالص ادبی مشاعرے گزشتہ گیارہ سال کے مارشل لاء کی نذر ہو گئے کیونکہ اس دوران خاصی پابندیاں لگا دی گئیں اور ہر چیز کو اس اسلام کی کسوٹی پر تولا جانے لگا جو جنرل ضیاء کا اسلام تھا اور جنرل ضیاء کا اسلام یہ تھا کہ مولویوں کو انہوں نے فتوے بازی کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ یہ لوگ اگر چاندنی نکلی ہو تو اس کا تجزیہ بھی کر لیتے تھے کہ یہ چاندنی اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔ اسی طرح یہ رویہ مشاعروں کے سلسلے میں بھی رہا۔ اس کا آغاز تو یہاں سے ہوا کہ عورت کو دفتروں میں کام کاج نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس کا کام صرف چولہے میں آگ جھونکنا یا گھریلو کام ہے۔ اس لئے وہ جہاں جہاں مردوں کے شانہ بشانہ کام کر سکتی ہے وہاں وہاں پابندی ہونی چاہئے کیونکہ یہ ان کے اسلام کے خلاف ہے۔

یہی صورت مشاعروں کے سلسلے میں بھی ہوئی۔ جب ادبی مشاعرے ہوا کرتے تھے تو ان میں خواتین بھی آیا کرتی تھیں اور صحت مند ادبی میلانات بڑھ رہے تھے۔ ایک تہذیبی و ثقافتی سلسلہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اس وقت ہیروئن رائج نہیں تھی۔ یہ تو مارشل لاء کے

دور کی برکت تھی کیونکہ جب زندگی میں دلچسپی کی کوئی چیز نہ رہ جائے تو لوگ اپنی توجہ دوسری چیزوں کی طرف کر لیتے ہیں اور ہوتے ہوتے خطرناک چیزوں کی طرف بھاگ جاتے ہیں۔ جب مشاعرے اور موسیقی کی محفلیں ہوتی تھیں تو لوگوں کے ذہن ان کی طرف لگے رہتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں چیزوں سے ذہنی بالیدگی میں اضافہ ہوتا ہے اور انسان بہت سے برے کاموں سے بچ جاتا ہے۔ اگر اوپن تھیٹر میں مشاعرہ ہے اور وہ رات دو بجے تک رہتا ہے تو وہ وہاں محو رہے گا۔ اسی طرح اگر میوزک کانفرنس ہو رہی ہے تو وہ ہیرا منڈی جانے سے بچ جائے گا۔

خیر یہ الگ بحث ہے۔ میں ذکر کر رہا تھا کہ اس زمانے میں شاعرات مشاعروں میں شامل ہوتی تھیں اور بڑے بھائی چارے کا ماحول تھا۔ لیکن بعض پہلوؤں سے دلچسپ رومانوی منظر بھی سامنے آ گئے تھے۔ میں نے ایک شاعر کو دیکھا۔ خدا مجھے معاف کرے ان کا حلیہ بیان کر رہا ہوں مگر اس نیت سے نہیں کہ ان کی تضحیک ہو۔ ان کا نام تائب رضوی تھا۔ وہ کبڑے تھے اور ان کے جسم میں کب بہت نمایاں تھا اور وہ کمان کی طرح تھے۔ قد چھوٹا تھا۔ ان کے بارے میں سننے میں آتا تھا کہ وہ یک طرفہ طور پر خواتین پر فریفتہ ہو جایا کرتے تھے۔ یقین نہیں آتا تھا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ اس زمانے کی بہت خوبصورت شاعرہ خورشید راٹھور ان کے سامنے آ گئیں۔ یہ شاعرہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں اور ان کا جوانی کا سماں کوئی کیا بیان کرے۔ بالکل ایسے تھیں جیسے ہیر۔ اس طرح قد کاٹھ' نین نقش وغیرہ تھے۔ تو معلوم ہوا کہ تائب رضوی صاحب خورشید راٹھور پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ یہ سن کر ہنسی آئی کیونکہ خورشید راٹھور کی شہرت اپنے کالج کے زمانے سے ہی تھی کہ کوئی شخص ان کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک آدھ بار کسی لڑکے نے جسارت کی تو خورشید نے دیال سنگھ کالج میں جہاں یہ طالبہ تھی اس لڑکے کے منہ پر تھپڑ مار دیا تھا۔ انہوں نے ایم اے وہیں سے کیا تھا۔ چنانچہ ان کی وہیں سے دھاک بندھی ہوئی تھی اور پھر یہ اپنے زمانے کی کشتی رانی کی چمپئن تھیں۔

یہ تو خیر سوچا ہی نہیں جا سکتا تھا کہ خورشید کو معلوم ہو کہ تائب صاحب ان کا پیچھا

کررہے ہیں اور یہ اپنا ردعمل ظاہر نہ کریں۔ بعد میں اس بات کی تصدیق بھی ہوگئی کہ انہیں تو اس بات کا پتا ہی نہیں تھا اور تائب صاحب یکطرفہ طور پر دل دیئے بیٹھے تھے۔ یہ سننے کے بعد حیرت ہوئی۔ خورشید کے گھر میں کچھ شاعرات کا آنا جانا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے گھر میں کچھ شعراء کا بھی آنا جانا تھا مگر یہ دوستی ادبی دوستی تھی۔ ایک دفعہ میں ان کے ہاں جارہا تھا اور میرے ساتھ حافظ لدھیانوی تھے جنہوں نے خورشید راٹھور کو اپنی منہ بولی بہن بنا رکھا تھا۔ یہ واقعہ 1965ء کا ہے جبکہ اس سے پہلے سے ہم تائب صاحب کے بارے میں سنتے آرہے تھے۔ اس وقت جنگ ختم ہوچکی تھی۔

ہم جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ تائب صاحب پہلے سے وہاں گھوم رہے تھے اور خورشید راٹھور کا مکان ڈھونڈ رہے تھے۔ ہم نے پوچھا تائب صاحب کیسے گھوم رہے ہیں۔ کہنے لگے کہ خورشید راٹھور کا گھر ڈھونڈ رہا ہوں۔ میں نے کہا خیر ہے۔ کہنے لگے کہ جنگ چھڑی تھی تو میں اب ان کی خیریت دریافت کرنے کے لئے آیا ہوں۔ میں نے کہا کہ باہر سے دیکھ لیجئے۔ اس محلے پر کوئی بم نہیں گرا اور اگر اس محلے پر کوئی بم نہیں گرا تو ظاہر ہے کہ وہ خیریت ہی سے ہوں گی۔ کہنے لگے کہ پھر بھی پوچھ لینا اچھا ہوتا ہے۔ خیر ہم سب ایک ساتھ ان کے گھر چلے گئے۔

حکیم تائب رضوی کی حالت اس وقت دیکھنے کے قابل تھی۔ ان کی بات تو یہ تھی کہ:

تجھ کو بٹھا کے سامنے یاد خدا کریں

وہ سب کی نظر بچا کر خورشید کے چہرے کی طرف دیکھتے چلے جارہے تھے اور ان کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس چلے گئے جبکہ میں اور حافظ لدھیانوی وہیں بیٹھے رہے۔ باتوں باتوں میں خورشید ہی نے کہا کہ کیا کریں۔ بیچارے آجاتے ہیں اور کچھ دیر بیٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میں انہیں کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔ ہم نے کہا کہ کوئی بات نہیں، دیکھ لیتے ہیں اور دل کی تپش بجھا کر چلے جاتے ہیں۔ ان کی بات وہی ہے:

زیر دیوار کھڑے ہیں تیرا کیا لیتے ہیں

کہنے لگیں کہ مجھے تو بس یہ ڈر ہے کہ کہیں یہ اپنی جگہ پر پختہ نہ ہو جائیں کیونکہ بال بچے دار آدمی ہیں۔ یہ ان کے اپنے حق میں ٹھیک نہیں ہے۔

بڑھتے بڑھتے بات یہاں تک بڑھی کہ لوگ حکیم صاحب سے مذاق سے پوچھ لیتے تھے کہ حکیم صاحب بمباری میں خورشید راٹھور محفوظ رہیں۔ انہیں بالکل سمجھ نہیں آتی تھی کہ لوگ ان کے ساتھ مذاق کر رہے ہیں اور وہ الٹا جواب دیتے تھے کہ اللہ کا فضل ہے۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔

ایک دن خورشید راٹھور نے خود ہمیں یہ لطیفہ سنایا کہ حکیم تائب رضوی خود میرے گھر میں آئے۔ ان کے ہاتھ میں کسی اخبار میں چھپا ہوا ایک مضمون تھا اور کہنے لگے کہ خورشید میں ایک خوشخبری سنانے آیا ہوں کہ امریکہ میں ایسے آپریشن ہونے لگے ہیں کہ جسم خواہ کتنا ٹیڑھا ہو اور کب کتنا ہی بڑا کیوں نہ وہ لوگ آپریشن کر کے انسان کو بالکل سیدھا کر دیتے ہیں۔ خورشید نے کہا کہ میں یہ بات سن کر ہکی بکی رہ گئی کہ یہ مجھے کیا خوشخبری سنا رہے ہیں لیکن ایک لمحے میں مجھے محسوس ہو گیا کہ وہ مجھے تسلی دے رہے تھے کہ تم فکر نہ کرو میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ پھر اس کے پیچھے جو لمبی چوڑی ٹریجڈی تھی اس پر وہ بھی افسوس کرنے لگی۔

حافظ عنصر اور حکیم تائب کی داستانیں تقریباً ملتی جلتی ہیں۔

اختر شیرانی

قیام پاکستان سے کچھ سال پہلے جتنا نام اختر شیرانی نے کمایا اور جتنی مقبولیت ان کے کلام کے حصہ میں آئی وہ بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی۔ ان کا انداز جیسا کہ سب جانتے ہیں رومانوی تھا اور وہ اپنے کلام میں بھرپور رومانس سموتے تھے۔ لیکن ان کا خاص کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے کلاسیکل شاعری اور روایتی شاعری کے برخلاف اپنا محبوب سبزۂ خط والا نہیں بلکہ براہ راست لمبی چوٹی والا اور نسوانی حسن والا بنایا۔ گویا انہوں نے امرد پرستی کو چھوڑ کر نسوانیت پرستی کو شاعری میں فروغ دیا۔ شاعری میں جہاں سے یہ موڑ شروع ہوتا ہے وہیں سے اختر شیرانی کا نام بھی شروع ہوتا ہے۔ اور یہ نام اس پوری شاہراہ پر ایک خوبصورت سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

حکیم نیر واسطی کا کہنا تھا کہ یہ سب سلمٰی اور عذرا کے کردار جو اختر شیرانی کی شاعری میں آئے یہ سب ان کا عربی شاعری کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ لیکن اختر شیرانی خود عربی پر عبور نہیں رکھتے تھے۔ بقول حکیم نیر واسطی مرحوم ان کے پاس قبل اسلام کے شاعروں کا بہت سا کلام موجود تھا اور اختر چونکہ ان کے دوست تھے اور اکثر ان کے ہاں قیام کرتے تھے تو انہیں سننے کا موقع ملتا تھا۔ اس طرح اختر شیرانی وہاں سے متاثر ہوئے اور انہوں نے یہ کردار عربی سے لے کر اُردو میں منتقل کیے۔ واقعہ جو بھی ہو بہرحال اس سے انکار نہیں کہ اُردو شاعری میں یہ خوبصورت موڑ دینے والا تنہا اختر شیرانی تھا۔

اس زمانے میں ان کی نظمیں بہت مقبول تھیں مثلاً

؎ بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو گیا ہوں
سلمیٰ سے دل لگا کر

یا پھر ؎ یہی کوچہ ہے اے ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

یا پھر ؎ او دیس سے آنے والے بتا کس حال میں ہیں یارانِ وطن

چنانچہ ان کی یہ سب نظمیں عروج پر تھیں۔ میں اس زمانے میں بالکل مبتدی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور میرا قیام اس زمانے میں راولپنڈی میں تھا۔ وہاں مجھے ایک دن معلوم ہوا کہ اختر شیرانی تشریف لائے ہیں۔ میرے دل میں ان سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا کیونکہ میں ابتداء میں جن چند شاعروں سے متاثر ہوا ان میں سے ایک اختر شیرانی بھی تھے۔ وہاں راولپنڈی میں بانسوں والے بازار کے پاس ایک محلے میں ایک مکان میں اختر شیرانی کے ایک دوست رہتے تھے جو پینے پلانے والے آدمی تھے۔ ان کے ہاں کچھ شاعروں اور کچھ موسیقاروں کی ایسی محفلیں چلتی تھیں۔ وہ بہت آزادی کا زمانہ تھا اور جگہ جگہ شراب کی دوکانیں کھلی ہوتی تھیں اور ریستورانوں میں کھلے عام مری بروری کی بیئر پیش کی جاتی تھی۔ وہیں سے پتہ چلا کہ کل شام ان صاحب کے ہاں ایک محفل جمے گی جس میں شعر و شاعری بھی ہوگی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ بھی پتہ چلا کہ اختر شیرانی کے ہمراہ سلمیٰ بھی ہوں گی۔ اور معلوم ہوا کہ انہوں نے سلمیٰ سے شادی کر لی ہے۔

ہمارے لیے یہ اور بھی کشش کی بات تھی۔ اگلی شام ہم بھی وہاں پہنچے اور معلوم ہوا کہ کسی دوست نے یونہی مذاق کیا تھا۔

ہم لوگ ان لوگوں میں سے تھے کہ جس رسالے میں ان کی نظم دیکھتے تھے وہ خرید لیتے تھے۔ اس دوران پارٹیشن ہو گیا۔ میں پارٹیشن سے کوئی چھ ماہ پہلے لاہور شفٹ ہو گیا تھا اور وہاں پارٹیشن کے بعد میری اختر شیرانی سے ملاقات ہوئی وہ اسی طرح رنگے ہوئے تھے۔ میں ان کا معتقد تھا اور خود بھی پیتا تھا۔ لیکن میں یہاں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ میں ایسا پینے والا نہیں تھا کہ اگر نہ ملے تو بے چین ہو جاؤں۔ ویسے ایک دو پیگ پی لیتا تھا۔ لیکن اگر کوئی ایسا شاعر مل جائے تو اس کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

چنانچہ میں نے اختر شیرانی کو اپنے ہاں بلایا اور اس دن بڑے اہتمام سے سکاچ کی بوتل خریدی جو کہ کافی مہنگی تھی۔ وہ آئے اور سکاچ دیکھ کر کہنے لگے کہ صاحب یہ کیا ہے یہ تو ہمیں راس ہی نہیں آتی۔ ہمارے لیے تو آپ ایک دیسی بوتل لے آیئے چنانچہ میں وہ بھی لے آیا۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے اس کا ڈھکنا نہیں کھولا اور نہ ہی سوڈے میں یہ ڈالی بلکہ قریب ہی پڑی ہوئی ایک ہتھوڑا نما قسم کی چیز اٹھائی اور بوتل کے سرے پر ماری۔ بوتل کا سرا ٹوٹ کر شیشہ ادھر ادھر بکھر گیا اور انہوں نے اسی طرح گلاس میں انڈیل کر NEAT ہی پینا شروع کر دی۔ میں تو انہیں اس طرح پیتے دیکھ کر ڈر گیا۔ لیکن وہ پیتے رہے۔ اور پی کر چلے گئے۔ پھر ان سے ملاقات حکیم نیر واسطی صاحب کے ہاں ہوئی۔

ایک بار پھر ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس میں پنجاب کے تمام سرکردہ شعراء شریک تھے۔ اس زمانے میں ساحر لدھیانوی بھی اپنی ماں اور نانی کے ساتھ لاہور ہی میں مقیم تھے۔ شورش کاشمیری بھی اس مشاعرے میں پیش پیش تھے۔ ساحر نے بھی شرکت کی۔ اختر شیرانی آئے تو بہت زیادہ پیے ہوئے تھے تو پبلک میں سے بہت سے لوگوں نے اس وقت احتجاج کیا۔ جب وہ اس حالت میں کلام سنانے کے لیے سٹیج پر آئے۔ بہت سے لوگوں نے کہا کہ ہم نہیں سنیں گے۔ اختر شیرانی آگے بڑھے۔ اتنے میں شورش کاشمیری سٹیج پر آ گئے وہ تقریر کے بادشاہ تھے اور جیسا بھی مجمع ہوتا اسے اپنے پیچھے لگا لیتے تھے۔ انہوں نے مائیک پر آ کر اختر شیرانی کے حق میں کچھ شاعرانہ جواز پیش کر کے پبلک کے جوش کو کچھ ٹھنڈا کیا اور اختر شیرانی سے دوبارہ پڑھنے کی درخواست کی تو وہ بے دلی سے کچھ پڑھ کر سٹیج سے اترے اور مشاعرے سے چلے گئے۔

اس کے بعد اختر شیرانی سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ مجھے کرید ہوئی کہ دیکھیں یہ جس سلمٰی کو پنڈی لے کر آ رہے تھے اس میں سے اب کتنے بچے پیدا ہو چکے ہیں۔ جن دنوں میں ''اداکار'' کا ایڈیٹر تھا، شریف نیر جو ہمارے بڑے مشہور ڈائریکٹر ہیں وہ کچھ عرصے کے لیے اس زمانے میں ''اداکار'' کے منیجر مقرر ہوئے تھے۔ دفتر ''اداکار'' میں نیر صاحب نے ان کی شراب کی دعوت کی۔ وہاں اختر شیرانی آئے تو میں نے بات چھیڑ دی کہ سنا تھا کہ

سلمٰی سے آپ کی شادی کچھ عرصہ پہلے ہوگئی تھی۔ کہنے لگے کہ کون سلمٰی؟ میں نے کہا کہ جس کا ذکر آپ شاعری میں کرتے ہیں بلکہ اس میں تو عذرا بھی ہے۔ انہوں نے قہقہہ لگایا اور پھر کہنے لگے کہ بھائی یہ سب علامتیں ہیں۔ نہ اصل نام سلمٰی ہے اور نہ عذرا ہے۔ اور نہ ہی کسی سلمٰی یا عذرا سے میری شادی ہوئی ہے۔ میری ایک گھریلو بیوی ہے۔ اس میں سے اولاد بھی ہے۔ بس اس کو عذرا اور سلمٰی سمجھو۔ پھر کہنے لگے کہ ویسے تو سب کی زندگی میں لڑکیاں آتی رہتی ہیں۔ کبھی کسی نے ہنس کر بات کرلی ہوگی۔ اس کا نام سلمٰی ہوگا۔ اور کبھی کسی اور نے ہنس کر بات کرلی ہوگی تو اس کا نام عذرا ہوگا اور وہیں سے میں نے یہ علامتیں بنالیں۔

حکیم نیرؔ واسطی صاحب نے تو باقاعدہ ایک کتاب لکھی تھی اور اس میں اس طرح کے دعوے کئے تھے جیسے سلمٰی نام کی کوئی لڑکی واقعی موجود تھی اور اس رومانس میں وہ بھی راز دار تھے۔ اب نیرؔ صاحب بھی ثقہ آدمی ہیں۔ میری ان سے بھی نیاز مندی ہے۔ نیرؔ صاحب کے تو ہمارے ساتھ گھریلو تعلقات بھی تھے۔ ہماری بیویوں کا بھی ملنا جلنا تھا۔ اب انہوں نے جو کتاب لکھی اس میں انہوں نے جو دعوے کئے وہ اپنی جگہ تھے۔ ادھر اختر شیرانی نے جو مجھے کہا وہ اپنی جگہ ہے۔ اب نہ تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ حکیم صاحب نے یہ دعوے کئے ہیں اور نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اختر شیرانی نے کہا ہے کہ یہ تو سب فرضی نام ہیں۔ مگر اختر شیرانی تو اس سے پہلے فوت ہو چکے تھے اس لیے ان سے میں کیا کہتا۔ البتہ میں نے نیرؔ صاحب سے کبھی نہیں کہا کہ کیا صورت ہے۔

اختر شیرانی کتنے بڑے باپ کے بیٹے تھے۔ ان کے والد حافظ محمود شیرانی ایک سکالر اور عالم و فاضل تھے۔ وہ دونوں ایک ہی مکان میں فلیمنگ روڈ پر رہتے تھے لیکن لطیفہ یہ ہوتا تھا کہ جتنی بار بھی دستک ہوتی تھی وہ بیٹے ہی کے لیے ہوتی تھی اور اکثریت کو یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ اس مکان میں اس نامور بیٹے کا فاضل باپ بھی رہتا ہے۔ چونکہ حافظ محمود شیرانی کی تخلیقی فیلڈ عالمانہ تھی اور نثر میں تھی۔ ان کے پڑھنے والے بہت کم تھے۔ اختر شیرانی چونکہ شاعر تھے اس لیے ان کے پڑھنے والے لاکھوں تھے۔ پھر جتنے بھی معتقد آتے تھے ان میں

سے ننانوے فیصد اختر شیرانی کے ہوتے تھے جبکہ صرف ایک فیصد حافظ محمود شیرانی کے ہوتے تھے

انہیں بیٹے پر فخر بھی تھا لیکن بیٹے کی بے راہروی انہیں بہت کھلتی بھی تھی۔ اختر شیرانی گھر سے غافل ہو چکے تھے اور کام کاج بھی کوئی نہیں کرتے تھے۔ اس زمانے میں شاعروں کی آمدن بھی کوئی نہیں ہوتی تھی پھر جہاں کلام چھپتا تھا وہاں سے بھی کچھ نہیں ملتا تھا کیونکہ رسالے والے تو کلام چھاپ کر الٹا شاعر پر احسان کرتے تھے۔

احسان کا ذکر آیا تو مجھے روزنامہ ''احسان'' یاد آ گیا۔ روزنامہ ''احسان، مسلم پرچوں میں ایک معروف پرچہ تھا جس کے مالک چودھری نور الٰہی تھے۔ وہ اپنے فن صحافت اور پبلشنگ میں بہت ماہر تھے۔ ان کا پرچہ چلتا تھا لیکن تنخواہوں کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ ایک تو اس زمانے میں مسلم پرچے ہندو پرچوں کے مقابلے میں کم چھپتے تھے دوسرے اشتہار والے مسلم پرچوں کی سرپرستی نہیں کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی ادارہ مالی مشکلات میں ہو تو اس کے کارکن بھی مشکل میں ہوتے ہیں۔ انہیں تنخواہیں بھی کم اور اقساط میں ملتی تھیں۔ ''زمیندار'' اور دوسرے پرچوں کا بھی یہی حال تھا۔

ملک نور الٰہی کے بیٹے انگلینڈ سے بیرسٹری کر کے واپس آئے۔ ان کا نام ملک مقبول الٰہی تھا اور وہ میرے جاننے والوں میں سے تھے۔ میں اس زمانے میں مصری شاہ میں رہتا تھا۔ اور جب میکلوڈ روڈ پر ''اداکار'' کے پرچے میں آتا تھا تو آدھے راستے میں ''احسان'' کا دفتر پڑتا تھا۔ پھر جب سے مقبول صاحب ولایت سے واپس آئے تھے تو انہوں نے پرچے میں اپنے نئے نئے اصول رائج کئے تھے۔ ان میں یہ بھی جذبہ جاگا کہ ان کے ادبی ایڈیشن میں لکھنے والوں کو معاوضہ دیا جائے۔ کیونکہ یہ دیکھ کر آئے تھے کہ انگلینڈ میں ایسا ہوتا ہے چنانچہ انہوں نے اپنے والد سے مشورہ کئے بغیر ہی کچھ لوگوں سے کہا کہ آپ ہمارے پرچے کے لیے لکھئے آپ کو معاوضہ دیا جائے گا۔ انہوں نے اس زمانے میں مجھ سے بھی ایک نظم لی اور جب آٹھ دس دن کے بعد میں ادھر سے گزر رہا تھا تو میں ''احسان'' کے پرچے میں چلا گیا۔ دس روپے معاوضہ ہوتا تھا۔ میں نے سوچا کہ معاوضہ لے لوں۔

میں مقبول صاحب کے دفتر میں گیا۔ انہوں نے میرے لیے چائے منگوائی۔ ان کے دفتر میں کیبن بنے ہوئے تھے اور مقبول صاحب کا کیبن الگ تھا۔ جس کیبن میں میں مقبول صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا اس کے ساتھ والے کیبن میں ملک نور الٰہی بیٹھے تھے۔ میں بیٹھا تھا تو مقبول صاحب کہنے لگے کہ قتیل صاحب اچھا ہوا آپ آ گئے اب آپ اپنا معاوضہ بھی لیتے جایئے اور پھر کہنے لگے کہ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

اس کے بعد مجھے ساتھ والے کیبن سے آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ وہ اپنے والد سے کہہ رہے تھے کہ آپ مجھے ایک دس روپے دے دیں۔ والد نے پوچھا کیا کرنے ہیں۔ انہوں نے کہا قتیل شفائی صاحب کو دینے ہیں۔ والد نے پوچھا کس سلسلے میں دینے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کی ایک نظم چھپی تھی اس کا معاوضہ دینا ہے۔ والد نے حیرت سے کہا کہ نظم چھپنے کا معاوضہ؟ اور پھر کہنے لگے کہ ایک تو ہم ان کی مشہوری کریں اور دوسرے انہیں معاوضہ دیں۔ یہ بات سن کر میرے تو سر میں پانی پڑ گیا اور اس کے بعد مقبول صاحب کی آواز بھی آنی بند ہوگئی۔ وہ شرم کے مارے اپنے کیبن میں بہت دیر تک واپس نہیں آئے بلکہ کسی اور کیبن جا کر انہوں نے سرگوشیوں کے انداز میں کسی اور سے دس روپے قرض لیے اور میرے پاس آئے۔ اور کہنے لگے کہ معذرت چاہتا ہوں میں ذرا لیٹ ہوگیا اور پھر انہوں نے دس روپے کا نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ یہ رہا آپ کا معاوضہ۔ میں نے کہا مقبول صاحب یہ رہنے دیجئے۔ یہاں پر جو دستور چل رہا ہے وہی چلنے دیجئے۔ میں آپ کے جذبے کی بہت قدر کرتا ہوں لیکن میں یہ دس روپے نہیں لوں گا۔ آپ کے والد صاحب کو بعد میں پتہ چل گیا کہ آپ نے کسی اور سے پیسے لے کر مجھے دیئے ہیں تو ممکن ہے کہ باپ بیٹے میں معاملہ دنگا فساد تک پہنچے۔ وہ بہت شرمندہ ہوئے۔ اور کہنے لگے کہ یہاں کے دستور ہی الٹے ہیں۔ میں جو سیکھ کر آیا ہوں اس پر عمل کرنے کی کوشش کی تو نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

ادبی پرچوں میں معاوضے کا سلسلہ تو خال خال ہی کبھی رہا ہوگا۔ یا تو معاوضہ وہ کمرشل پرچے دیتے تھے جو کثیر الاشاعت ہوتے تھے اور ان میں چٹخارے دار مواد زیادہ

ہوتا تھا۔ اور یا پھر سرکاری پرچے معاوضہ دیتے تھے جیسے یونیسٹ پارٹی کا پرچہ پنچایت تھا۔ مثلاً ''مست قلندر'' اور ''حسن پرست'' پرچے بھی معاوضے دیتے تھے۔ یہ قیام پاکستان سے پہلے کی بات ہے۔ جب بعد میں قیام پاکستان کا مرحلہ آیا تو سب سے پہلے معاوضہ دینے کی رسم روزنامہ ''امروز'' سے شروع ہوئی۔ یہ پرچہ میاں افتخار الدین صاحب نے پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے ادارے سے شائع کیا تھا۔ اس ادارے سے شائع ہونے والے دوسرے پرچوں ''پاکستان ٹائمز'' اور ''لیل ونہار'' وغیرہ میں بھی وہ اپنے لکھنے والوں کو برابر معاوضہ دیا کرتے تھے۔ امروز کے ادبی ایڈیشن کا نام ''قسمت علمی و ادبی'' تھا۔ اسے چراغ حسن حسرت مرتب کرتے تھے اور شروع کے پرچے کے ایڈیٹر بھی وہی تھے۔ بعد میں اس کے ایڈیٹر بدلتے بھی رہے لیکن جو معاوضہ دینے کی رسم چلی تھی وہ باقی رہی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس صفحے کا معیار اتنا اونچا تھا کہ لوگ اس میں چھپنا فخر سمجھتے تھے۔ اس میں نظم کا معاوضہ دس روپے تھا جبکہ نثر کا معاوضہ سات روپے فی کالم تھا۔ اور اس زمانے میں یہ کافی پیسے سمجھے جاتے تھے۔

چراغ حسن حسرت صاحب کے بعد احمد ندیم قاسمی صاحب کا زمانہ آیا اور اس کے بعد پھر آخر کار طفیل احمد خان کا زمانہ آیا۔ جب وہ اس کے ایڈیٹر ہوئے تو ہمارے دوست تھے۔ اس زمانے میں چیف ایڈیٹر کی تنخواہ تقریباً چھ سو روپے اور سب ایڈیٹر کی تنخواہ تقریباً دو سو روپے ہوتی تھی۔ اس زمانے کے لحاظ سے یہ بہت زیادہ تنخواہ ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ چونکہ طفیل احمد خان کی فیملی کراچی میں تھی اور انہیں وہاں بھی پیسے بھیجنے پڑتے تھے اور یہاں بھی اپنے اخراجات کرنے ہوتے تھے اس لیے وہ کوئی زیادہ کھلے ہاتھ کے آدمی نہیں تھے۔ اگر ہمیں کبھی چائے پلا دیتے تھے تو اگلی بار ہمیں ان کو چائے پلانی پڑتی تھی۔ ہم شام کو ٹی ہاؤس یا کافی ہاؤس میں جا کر بیٹھتے تھے۔

انہوں نے ہر ہفتے کوئی نہ کوئی چیز چھپنے کی چھوٹ دے رکھی تھی اس لیے اگر ایک ماہ میں چار چیزیں چھپ جاتیں تو چالیس روپے مل جاتے۔ میں یہ پیسے زیادہ تر چائے پیسٹری پر خرچ کر بیٹھتا تھا۔ اب چار نظمیں کیسے کہی جائیں کیونکہ ان چار نظموں کے علاوہ ادبی

پرچوں کو بھی چیزیں بھیجنی ہوتی تھیں۔ پھر آمد کا سلسلہ بھی تو ایسا نہیں تھا کہ ادھر سے کاغذ ڈالا اور ادھر سے نظم نکل آئی۔ کبھی نظم نہیں بھی ہوتی تھی۔

میں نے کچھ ایسا کیا کہ پرانی نظمیں اور پرانا کلام جو بہت پہلے چھپ چکا ہو وہ بھی دو چار بار وہاں چھپوایا۔ ایک بار خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ مظفر آباد سے کسی صاحب نے طفیل احمد خان کو لکھا کہ قتیل شفائی نے میری غزل چرالی ہے۔ وہ غزل کچھ یوں تھی:

؎ فلک سے رات کو جب چاندنی برسائی جاتی ہے
مرے سینے میں تیرے دل کی دھڑکن پائی جاتی ہے

اس نے اپنے خط کے ساتھ تین سال پہلے کی ایک کٹنگ بھی بھیج دی جس سے ظاہر تھا کہ یہ غزل اس سے پہلے مظفر آباد کے کسی پرچے میں چھپ چکی ہے۔ طفیل احمد خان تھوڑے سے بدحواس بھی تھے۔ یہ شکایت نامہ دیکھ کر پریشان ہو گئے اور مجھے کہنے لگے کہ دیکھئے یہ کیا ہو گیا ہے۔ اس سے ہمارے پرچے کی بدنامی ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ یار اب سچ بلوانا ہے تو بات یہ ہے کہ یہ غزل کوئی آٹھ سال پرانی ہے اور نہ صرف یہ کہ یہ رسالے میں چھپ چکی ہے بلکہ ایک فلم کے لیے اس کی ریکارڈنگ بھی ہو چکی ہے۔ اگرچہ یہ فلم مکمل نہیں ہو سکی تھی اس غزل کا ریکارڈ اب بھی میرے پاس پڑا ہے۔ میں تمہیں وہ رسالہ اور ریکارڈ دے دوں گا۔ اس سالے نے یہ غزل میری غزل کے چھپنے کے پانچ سال بعد کہیں اپنے نام سے چھپوالی اور اب اس نے یہ خط بھیج دیا ہے۔ میرے خیال میں وہ یا تو بیوقوف آدمی ہے اور یا پھر اسے کوئی شرارت سوجھی ہے۔

طفیل احمد خان تو میرے بے تکلف دوست تھے۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ اگر یہی واقعہ کسی اختلاف رکھنے والے آدمی تک پہنچتا تو ایک بار زندگی میں ہمیں بھی اپنی ہی غزل چوری کرنے کا مزا آجاتا۔

تو وہ معاوضہ جو ''امروز'' نے شروع کیا تھا اس کے بعد لکھنے والوں کو بھی احساس ہوا کہ اپنی محنت کا حق لینا چاہئے۔ اور اخبارات و رسائل کی اشاعت کے لیے خرچ آنے والی ہر چیز کا معاوضہ ادا کر دیتے ہیں اور صرف ہماری لکھی ہوئی اس چیز کا معاوضہ ادا نہیں کرتے

جس سے اخبار کا پیٹ بھرا ہوتا ہے۔ چنانچہ اب صورت حال یہ ہے کہ بعض اداروں کی طرف سے تو پانچ پانچ سو روپے بھی معاوضہ ملتا ہے۔ پچھلے دنوں ''اخبار جہاں'' کا بیس سالہ نمبر چھپا تو اس میں چھپنے والی میری چند رباعیوں کے انہوں نے پانچ سو روپے ادا کئے۔ یہ تو خیر بیس سالہ نمبر تھا۔ اگر یہ نمبر نہ بھی ہوتا تو بھی معاوضے کی ان کی طرف سے ادائیگی کم از کم دو سو روپے ضرور ہوتی۔

لکھنے والوں کو معاوضے کی ادائیگی کا سارا کریڈٹ میاں افتخار الدین کے ان پرچوں کو جاتا ہے جو اپنے زمانے کے بہت پروگریسو پرچے تھے۔ خاص طور پر ''امروز'' کو جس میں لکھنا فخر سمجھا جاتا تھا۔ بدقسمتی سے آج وہی ''امروز'' اس ''امروز'' کا لاشہ نظر آتا ہے اور افسوس ہوتا ہے کہ یہ پرچہ کتنی بلندی سے کتنی پستی میں آ گرا ہے۔

ڈیلی اخباروں کا ذکر آیا ہے تو مجھے یاد آ گیا کہ قیام پاکستان سے پہلے یونینسٹ پارٹی کی طرف سے روزنامہ ''شہباز'' نکلا۔ یہ سرکاری اخبار تھا اور اس پر کاغذ مفت صرف ہوتا تھا۔ اس کا ادارہ تحریر بھی بہت جاندار تھا۔ نہ صرف مسلم بلکہ تمام پرچوں میں اس کی ضخامت سب سے زیادہ تھی اور قیمت دوسرے پرچوں کے برابر یعنی ایک آنہ تھی۔ جبکہ ہاکروں کو پچیس فیصد کمیشن ملتی تھی۔ گویا وہ یہ پرچہ تین پیسے میں خرید کر چار پیسے میں بیچا کرتے تھے۔ سستا زمانہ تھا۔ اور اس وقت کلرک کی تنخواہ بھی بیس روپے ہوتی تھی۔

میں اس زمانے میں ہری پور میں تھا اور میرے مالی حالات کچھ بگڑتے جا رہے تھے۔ کچھ تو مکانوں کا کرایہ آ جاتا تھا اور کچھ نظمیں میں قیمتاً لکھ کر بیچا کرتا تھا۔ اس سے آمدن ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹی سی سروس بھی کی تھی جس سے کچھ پیسے آتے تھے مگر ان چیزوں کے باوجود اخراجات زیادہ تھے کیونکہ گھریلو اخراجات کے علاوہ میرا بہت سا خرچ مشاعروں پر آنے جانے میں ہو جاتا تھا۔ چنانچہ میں نے آمدنی کی مختلف تدابیر سوچنی شروع کیں۔

مجھے آمدنی کی ایک عجیب ترکیب روزنامہ ''شہباز'' کو دیکھ کر سوجھی۔ میں نے یہ پرچہ دیکھا تو اس کی ضخامت بہت تھی۔ میں نے اسے تولوا کر دیکھا تو اس کی ردی ایک آنے

کی تھی۔ میں نے اس پرچے کی ایجنسی کے لیے کوشش کی تو وہ مل گئی۔ ادارے نے مجھ سے جتنی زرضمانت مانگی وہ میں نے بھیج دی۔ پہلے میں نے بیس پرچے منگوائے۔ اس کے بعد تقریباً ایک ہفتہ گزرا تو میں نے انہیں لکھا کہ ہری پور میں یہ پرچہ بہت پاپولر ہوا ہے اس لیے اس کی تعداد ایک سو کر دیجئے۔ انہوں نے پرچے میں میرا خط بھی چھاپا اور ہری پور میں ایک سو پرچہ بھی بھیجنا شروع کر دیا۔ میں اس سو پرچے کا یوں کرتا تھا کہ اس میں سے جو پانچ دس پرچے بکنے والے ہوتے تھے انہیں بیچ دیا کرتا تھا اور یہ پرچے میرا ایک دوست پرتھوی چند کوہلی جو اخباروں کا ایجنٹ تھا وہ بیچ دیا کرتا تھا۔ میں نے یہ سب کچھ اسے اعتماد میں لے کر ہی کیا تھا۔ اس کے سٹال سے جو پانچ دس پرچے بک جاتے اور باقی جو پرچے بچتے انہیں میں ردی میں فروخت کر دیتا تھا۔ کیونکہ سٹال پر بھی وہ پرچہ ایک آنے کا بکتا تھا اور ردی میں بھی وہ ایک آنہ فی پرچہ ہی بکتا تھا۔ اس طرح مجھے ردی بیچ کر کوئی ڈیڑھ روپیہ روزانہ کے حساب سے بچت ہو جاتی تھی۔ اگر اس طرح ہونے والی ماہانہ آمدن کا حساب کیا جائے تو مجھے ایک کلرک کی آمدن سے اڑھائی گنا زیادہ آمدن گھر بیٹھے ہوئے ہی ہو رہی تھی۔ یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا۔ حتیٰ کہ کوئی آدمی سروے کے لیے ہری پور آیا تو اسے پتہ چلا کہ حضرت قتیل شفائی ان کے پرچے سے ہاتھ کر رہے ہیں ورنہ پرچہ سو تو کیا دس کی تعداد میں بھی نہیں بک رہا تھا۔ تو انہوں نے پرچہ بند کر دیا جس سے میری آمدن کا یہ ذریعہ بھی ختم ہو گیا۔

ہیر پھیر کے سلسلے

کمانے کے ڈھنگ بھی عجیب وغریب ہوتے ہیں جیسے میں نے روزنامہ ''شہباز'' سے ناجائز آمدنی اپنے لیے مناسب سمجھی۔ کچھ لوگ اور طرح کی بددیانتی بھی کر لیتے ہیں جیسے ایک معزز شخص نے میرے ساتھ روا رکھی۔ میں ہری پور میں اپنے گھر کی بالائی منزل میں بیٹھا لکھ رہا تھا۔ گھنٹی ہوئی۔ نیچے گیا تو ایک انتہائی سفید پوش آدمی جو آنکھوں سے اندھا تھا وہاں کھڑا تھا۔ اس نے مجھے اپنی داستان سنائی کہ میں پانچ بیٹیوں کا باپ ہوں۔ ایک حادثے میں میری آنکھیں پھوٹ گئی تھیں اور اب میں بالکل نہیں دیکھ سکتا۔ مگر سر پر بیٹیوں کا بوجھ ہے۔ سنا ہے کہ آپ اللہ والے ہیں اور میری مدد کریں گے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میرے والد صاحب فوت ہو چکے تھے اور گھر میں کافی پیسہ موجود تھا۔ اس نے اپنی داستان کچھ اس دردناک انداز سے سنائی کہ میں والدہ کے پاس گیا اور کہا کہ مجھے پچاس روپے دے دیجئے۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ میں نے بات بتائی تو وہ بھی بہت متاثر ہوئیں۔ اور مجھے انہوں نے پچاس روپے دے دیئے۔

اس زمانے میں جب فقیر کو ایک پیسہ دیا جاتا تھا، اور اگر کوئی اس سے بہت متاثر بھی ہوتا تو ایک روپیہ دے دیتا لیکن میں نے اس خضر صورت آدمی کو پچاس روپے دے دیئے۔ وہ دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

اس واقعہ کے چھ مہینے بعد میں راولپنڈی والے مکان میں تھا کہ دستک ہوئی۔ باہر نکلا تو وہی بزرگ کھڑا تھا اور اس نے بالکل وہی داستان مجھے سنائی۔ میرا جی چاہا کہ اس شخص کو ڈاڑھی سے پکڑوں اور پٹائی کروں یا پھر جوتا اٹھا کر خود اپنے سر میں ماروں کیونکہ دھوکا تو

میں نے کھایا ہے۔ مجھے چاہئے تھا کہ پچاس روپے جو آج کے کم از کم دو ہزار روپے ہوں گے، دینے سے پہلے اسے پرکھ لیا ہوتا۔ میں یوں بھی کرسکتا تھا کہ اس سے کہتا کہ آپ اپنا ایڈریس لکھوا دیجئے اور میں منی آرڈر کردوں گا۔ بہرحال میں نے صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس بوڑھے آدمی سے صرف یہی کہا کہ مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاسکتا اور پھر میں نے اسے بتایا کہ وہ ہری پور میں بھی میرے پاس آیا تھا اور یہی داستان سنائی تھی۔ پہلے تو چونکا لیکن پھر کہنے لگا کہ بیٹے دیکھو نا پانچ بیٹیوں کا معاملہ تھا۔ دو کی تو میں نے شادی کردی ہے لیکن ابھی تین بیٹیاں باقی ہیں۔ میں نے کہا اس وقت آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کی بیٹیاں ایبٹ آباد میں ہیں، اب آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کی بیٹیاں گوجرانوالہ میں ہیں۔ کہنے لگے کہ جی میری دونوں جگہ ہی رشتہ داریاں ہیں، کبھی وہاں چھوڑ آتا ہوں اور کبھی وہاں۔ میں نے کہا کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہاں بیٹھیں میں پولیس کو بلا لاؤں۔ اگر آپ کی بات سچ ہوئی تو یقین کریں کہ میں آپ کی کم از کم ایک بیٹی کی شادی کا پورا خرچ اٹھالوں گا ورنہ آپ جیل چلے جائیں گے۔ پہلے تو وہ شخص بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ آپ بے شک تصدیق کرلیں۔ لیکن جب میں نے ایک دوست کو کہا کہ تم جاکر پولیس کو بلالاؤ، تو اس کے جانے کے پندرہ بیس منٹ بعد تک بھی یہ بزرگ بڑے حوصلے سے بیٹھا رہا۔ اس کے بعد میرے پاؤں پکڑ لیے اور کہنے لگا کہ میں سچا تو ہوں مگر پولیس سے بہت ڈرتا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے جانے دیجئے۔ ویسے بھی اگر میرے عزیزوں کو پتہ چل گیا۔ تو میری بیٹیوں کی شادیاں متاثر ہوں گی۔ میں نے کہا کہ تم بڑے ملعون آدمی ہو۔ اب بھی سچ نہیں بول رہے ہو جب پولیس والے ایک تھپڑ ماریں گے تو تم خود ہی سچ بول دو گے لیکن پھر بھی میں تمہاری عمر کا لحاظ کرتے ہوئے تمہیں چھوڑ دیتا ہوں اور خدا کے لیے اب اس کام سے باز آجاؤ۔ کیوں اپنی قبر بھاری کررہے ہو۔ اس طرح وہ شخص وہاں سے چلا گیا اور مین نے سوچا کہ میں نے تو پھر بھی اخبار کی ناجائز کمائی ردی بیچ کر ہی کمائی تھی مگر یہ شخص تو خدا کا نام بیچتا ہے اور بیٹیوں کی مظلومیت کا مفروضہ بھی گھڑتا ہے۔ اللہ مجھ پر بھی رحم کرے اور اس پر بھی رحم کرے۔

ہیر پھیر کے سلسلے تو عجیب طرح سے ہوتے ہیں۔ اب ان چیکوں کا معاملہ لے لیجیے جو کوئی شخص جان چھڑانے کے لیے بعد کی تاریخ کے دے دیتا ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ ایسے POST DATED چیک عام طور پر ڈس آنر ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ کی بات ہے کہ ایک پروڈیوسر جعفر شاہ صاحب نے فلم ''بھروسہ'' بنائی جس کا ایک گیت مجھ سے لیا۔ یہ ایک ایسی ماں کی اپنے بچے کے لیے لوری تھی جس کا بچہ حقیقی شوہر سے نہیں تھا۔ دوسرے معنوں میں وہ حرامی بچے کی ماں تھی۔ یہ لوری والا گیت اس زمانے میں بہت مشہور ہوا۔ اس کا ایک مصرع تھا:

؎ سو جا میری جوانی کی بھول

انہوں نے مجھے دو سو روپے کا پوسٹ ڈیٹڈ چیک دے دیا۔ اس زمانے میں اچھے گیت نگار کا معاوضہ دو سو روپے ہوتا تھا۔ پندرہ دن کے بعد میں مقررہ تاریخ کو بینک گیا تو یہ چیک ڈس آنر ہو گیا۔ میں نے ان سے جا کر کہا کہ آپ کا چیک تو ڈس آنر ہو گیا ہے تو وہ کہنے لگے کہ اصل میں مجھے جو چیک ملا تھا اور جو میں نے جمع کروایا تھا وہ ڈس آنر ہو گیا تھا۔ پھر کہنے لگے کہ ایک دوسرا چیک جمع کروایا ہے۔ آپ دس دن کے بعد جا کر بینک سے پیسے لے لیں۔ جب میں پھر بینک گیا تو چیک دوبارہ ڈس آنر ہو گیا۔ بینک کا کلرک میرے اشعار پڑھنے والا تھا۔ وہ مجھے کہنے لگا کہ قتیل صاحب آپ کب تک اس چیک کے ساتھ یوں ہی چکر لگاتے رہیں گے۔ اس شخص کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جسے پیسے دینے ہوتے ہیں اسے چیک دے کر مقررہ تاریخ سے ایک دن پہلے اتنے پیسے جمع کروا دیتا ہے اور پیسے بھی اس وقت جمع کرواتا ہے جب بینک بند ہونے والا ہوتا ہے۔ پھر کہنے لگا کہ اب یہ جس دن آ کر پیسے جمع کروائے گا تو میں آپ کو فون کر دوں گا۔ چنانچہ ایک دن دو بجے کے بعد مجھے فون آیا کہ اس نے آج پانچ سو روپیہ جمع کروایا ہے۔ اس کلرک نے مجھے کہا کہ آپ صبح بینک کھلتے ہی یہاں پہنچ جائیں۔ چیک کیش ہو جائے گا۔ چنانچہ میں نے اسی طرح کیا اور چیک کیش کروا کے دو سو روپے وصول کر لیے۔ پیسے لینے کے بعد میں بینک کے اندر ہی بیٹھ کر اب پانچ سو روپے والے چیک والے آدمی کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ جب

وہ آیا تو اس کا چیک ڈس آنر ہو گیا کیونکہ اس کے اکاؤنٹ میں صرف تین سو روپے تھے۔

ایک اور پروڈیوسر صاحب نے ایک بار مجھے ایک ہزار روپے کا پوسٹ ڈیٹڈ چیک دیا تو وہ ڈس آنر ہو گیا۔ میں نے بینک کے کیش کلرک کو اعتماد میں لے کر پوچھا کہ بات کیا ہے۔ اس نے کہا کہ ان کے اکاؤنٹ میں اس وقت بھی ساڑھے آٹھ سو روپے ہیں مگر آپ کا چیک ایک ہزار روپے کا ہے۔ میں نے وہیں سے ایک آدمی سے ڈیڑھ سو روپے لے کر اس کے اکاؤنٹ میں جمع کروائے اور جب پتہ چل گیا کہ وہ ڈیڑھ سو روپیہ ان کے اکاؤنٹ میں کریڈٹ ہو گیا ہے تو اسی دن دوپہر کے قریب میں نے وہ چیک پھر پیش کر دیا۔ اب وہ چیک کیش ہو گیا۔ گویا میں نے ساڑھے آٹھ سو روپے تو لے لیے لیکن ڈیڑھ سو روپے کی قربانی دے کر ہی لیے۔ وصولیاں کبھی اس طرح بھی کرنی پڑ جاتی ہیں۔

شاعری اور شراب

عام لوگوں میں یہ خیال راسخ ہو چکا ہے کہ شاعر کے لیے شراب ایک ضروری چیز ہے۔ لیکن میں آپ کو حقیقت بتانا چاہتا ہوں کہ شراب اور شاعری کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اب شراب کا چلن کم ہوگیا ہے اور پاکستان میں یہ اس طرح اب نہیں پی جاتی جس طرح پارٹیشن سے پہلے پی جاتی تھی۔ پہلے شاعروں میں اکثر شراب پی جاتی تھی اور اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ شراب پی کر شعر لکھتے تھے یا شاعری کے لیے یہ ضروری تھی بلکہ دراصل جن محفلوں میں شعر و شاعری ہوا کرتی تھی عام طور پر وہ محفلیں رؤسا کی ہوتی تھیں اور ان میں فیشن کے طور پر بھی شراب پی جاتی تھی۔ چنانچہ شاعر جہاں بھی جاتے تھے ان کی شراب سے تواضع ہوتی تھی۔ اس کے بعد شاعری کی محفلیں ہوتی تھیں۔

داستانوں میں ہم نے پڑھا اور سنا تھا کہ مرزا غالب خوب پیتے تھے اور:

؎ قرض کی پیتے تھے مے اور دل میں کہتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

اس کے پیچھے کچھ داستانیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ ایک اور داستان بھی سنی تھی کہ وہ ایک بار مسجد میں نماز پڑھنے گئے اور سلام پھیرا تو پیچھے کافی دور ان کے شاگرد کھڑے تھے۔ شاگرد نے دور ہی سے شراب کی بوتل دکھائی۔ مرزا اس وقت فرض نماز پڑھ چکے تھے لیکن ابھی سنت نماز بقایا تھی مگر وہ سب کچھ وہیں چھوڑ کر باہر چلے آئے اور کسی نے اس دوران ان سے پوچھا کہ نماز آدھی کیوں چھوڑ دی تو کہنے لگے کہ جب فرض پڑھتے ہی اللہ تعالیٰ نے دعا پوری کر دی ہے تو سنت پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان کے بارے میں اس طرح

کی داستانیں مشہور تھیں۔

عصر حاضر کے شاعروں میں جگر مراد آبادی کی شراب نوشی کی داستانیں عروج پر تھیں انہیں لوگوں نے ورافتگی کے عالم میں دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ پینے کے باوجود وہ ایک اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں اور مشاعروں پر چھا جاتے ہیں۔ پھر مجاز لکھنوی کی شراب نوشی کے قصے اور لطیفے بھی سن رکھے تھے۔ جوش صاحب سے ان کا ایک لطیفہ مشہور تھا۔ جوش صاحب کی عادت تھی کہ وہ بالکل روزہ داروں کی طرح مے نوشی کا اہتمام کرتے تھے اور شام کو دیکھتے تھے کہ سورج کس وقت غروب ہوا۔ چنانچہ یہ بھی افطاری کرنے والوں کی طرح سورج غروب ہوتے ہی جام اٹھاتے تھے اور پینی شروع کر دیتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا شعر بھی ہے کہ

جب مہر مبیں غروب ہو جاتا ہے
پیمانہ بکف طلوع ہوتا ہوں میں

وہ اس کے ساتھ یہ اہتمام کرتے تھے کہ گھڑی سامنے رکھ کر پون گھنٹے میں ایک پیگ ختم کیا کرتے تھے۔ اسرار الحق مجاز بہت فقرہ باز تھے انہوں نے جوش صاحب سے کہا کہ جوش صاحب! آپ تو گھڑی سامنے رکھ کر پیتے ہیں لیکن ہم گھڑا سامنے رکھ کر پیتے ہیں۔ لطیفے کی حد تک تو یہ ٹھیک ہے لیکن گھڑا سامنے رکھ کر پینے والوں کے ساتھ جو کچھ شراب نے کیا وہ عبرت ناک ہے۔ بہر حال مجاز، جوش، فراق، گورکھپوری غرضیکہ جتنے نامور شعراء تھے سبھی پیتے تھے اور نئی نسل میں جنہیں شاعری سے شغف ہوتا تھا اور جن میں شاعری کے جراثیم ہوتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ جتنے بھی بڑے شاعر ہیں یہ سب شراب پی کر بڑے بنے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ شاعر اور شعور دو بہت قریب کی چیزیں ہیں۔ اور ایک ہی قبیلے کی چیزیں ہیں اور جب تک شعور بیدار نہ رہے شعر نہیں ہوتا۔ اور شراب کے بارے میں تو یہ ہے کہ اگر تھوڑی زیادہ پی لی جائے تو پینے والا شخص سوچ کے قابل نہیں رہتا۔ اور اگر کوٹے کے مطابق بھی پی لے تو بھی یہ تو ہو سکتا ہے کہ پینے والے کی زندہ دلی یا لطیفہ گوئی بڑھ

جائے یا وہ جملہ بازی زیادہ کرنے لگے یا غم بھول کر ہنسی خوشی کی باتیں کرے۔ لیکن شعر کہنا پینے کے بعد آسان نہیں ہوتا۔

میں یہ بات اس لیے بھی کہہ رہا ہوں کہ میں خود پیتا رہا ہوں اور یقین جانئے کہ میں نے شراب نوشی کے عالم میں کبھی ایک شعر نہیں کہا۔ اگر کبھی کہنے کو بیٹھا ہوں تو اس وقت تو یوں لگا جیسے میں نے کاغذ پر آسمان کے تارے توڑ کر رکھ دیئے ہیں لیکن جب صبح اٹھ کر دیکھا تو وہ اشعار اتنے پھیکے ہوتے تھے کہ میں حیران ہوتا کہ رات کو تو اتنے اچھے نظر آ رہے تھے مگر اب یہ زیادہ اچھے نظر نہیں آ رہے۔ مجھے بالآخر اس بات کی سمجھ آ گئی کہ پیئے ہوئے آدمی کو ایک معمولی سا چہرہ نظر آئے تو شراب اسے خوبصورت بنا کر پیش کرتی ہے اور ایک چیز کے حسن کو یوں ہی بڑھا دیتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت جو آپ کو ستارا نظر آ رہا ہو درحقیقت وہ ایک کنکر ہو اور پھر اپنے شعر پڑھ کے اس وقت لگتا ہے کہ میں غالب سے آگے نکل گیا ہوں۔ اگر شراب پی کر شعر کہے جائیں تو نتیجہ یہی رہتا ہے۔

میں نے اختر شیرانی سے پوچھا تھا کہ آپ شعر کس وقت کہتے ہیں۔ کہنے لگے کہ یوں تو ہر وقت کہہ سکتا ہوں لیکن صبح جب میں جاگتا ہوں تو زیادہ تر اس وقت کام کے شعر ہو جاتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو بہت پینے والے تھے۔ وہ شاعر تو نہیں لیکن ایک بہت اچھے افسانہ نگار تھے۔ ان کا تو عالم یہی تھا کہ صبح اٹھ کر شیو کر کے تیار ہو کر اچھا لباس پہنتے۔ ناشتہ کر کے لکھنے کے لیے بیٹھ جاتے۔ جتنا بھی ادبی کام ہوتا تھا وہ وہ صبح آٹھ اور دس بجے کے درمیان کر لیتے تھے۔ اس کے بعد وہ اپنی تحریر کو جہاں پہنچانا ہوتا پہنچاتے، معاوضہ وصول کرتے اور اس کے بعد پینا شروع کر دیتے تھے اور نجانے کب تک پیتے چلے جاتے تھے۔ اس دوران وہ صرف ایک ہی کام کر سکتے تھے کہ اگر کسی فلم کمپنی نے کہانی پر بحث رکھی ہوتی یا مکالمے لکھنے ہوتے تو وہ کام کر لیتے تھے۔ لیکن ان کا سارا تخلیقی کام صبح اس وقت ہوتا تھا جب رات کا نشہ دور ہو چکا ہوتا تھا اور ابھی پینی شروع نہیں کی ہوتی تھی۔ انہی چند گھنٹوں کے دوران وہ تخلیقی کام کرتے تھے۔

ان کے علاوہ بھی اچھے خاصے پینے والے لوگوں سے بھی میں نے پوچھا تو ان کی

کیفیت بھی میرے ہی جیسی تھی اور وہ بھی پی کر نہیں لکھ سکتے تھے۔ البتہ سگریٹ ایک ایسی چیز ہے کہ یہ لکھنے پڑھنے والوں پر سوار ہو جاتی ہے۔ سگریٹ یا حقہ پینا بھی ہمیں ایک روایت سے ملا ہے۔ شروع میں سنتے تھے کہ جب مولانا ظفر علی خان شعر کہتے ہیں تو ادھر حقے کا ایک کش لگاتے ہیں تو ادھر ایک شعر ہو جاتا ہے۔ اور وہ سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کو لکھوا دیتے ہیں۔ اور جتنے کش لگاتے ہیں اتنے شعر ہو جاتے ہیں۔

میں نے بہت بچپن میں سگریٹ نوشی شروع کر دی تھی۔ میرے جتنے دوست تھے سب سگریٹ پیتے تھے۔ لیکن جب پتہ چلا کہ اندر شعر کہنے کے کچھ جراثیم ہیں اور جب شعر کہنے لگا تو سن رکھا تھا کہ ظفر علی خان حقہ پی کر شعر کہتے ہیں تو حقہ تو ساتھ نہیں رکھا لیکن سگریٹ ساتھ رکھ لیے اور وہ ایسی عادت بنی کہ میں برابر پچاس سال تک سگریٹ پی کر شعر کہتا رہا اور میں لکھتے وقت Chain Smoker ہو جاتا تھا۔ اور رات کو دیر تک کام کرتا تھا۔ لیکن اگر کبھی رات کو گیارہ بجے کے قریب سگریٹ ختم ہو جاتے اور باہر جا کر کہیں سے سگریٹ نہ ملتے تو فکر اور تخلیق کا سلسلہ وہیں ختم ہو جاتا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ شعر میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ سگریٹ کہہ رہی ہے۔

چونکہ میں نے بہت بچپن میں سگریٹ نوشی شروع کی تھی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے اعصاب خراب ہو گئے۔ ہاتھوں میں رعشہ جوانی ہی میں آ گیا۔ اب کم ہو گیا ہے پہلے زیادہ تھا۔ میں نے جب رعشے کا علاج بھی کروایا تو پتہ چل گیا تھا کہ یہ رعشہ نکوٹین کی وجہ سے ہے۔ سوچتا تھا کہ سگریٹ ترک کرنے کا مطلب ہے شاعری ترک کرنا اور میرا تو گزر بسر ہی اس سے ہوتا تھا پھر بھی میں نے حوصلہ کر کے چار مہینے باقاعدہ سگریٹ ترک کیے رکھے۔ اور اس عرصے میں ایک شعر بھی نہیں کہہ پایا جس کے بعد میں نے مجبوراً دوبارہ سگریٹ شروع کر دیئے۔

۱۹۸۶ء میں ایک دن میں چل رہا تھا تو سینے میں گھٹن کا احساس ہوا۔ گھٹن اس قدر بڑھی کہ اس سے آگے ایک قدم نہ اٹھا سکا۔ وہیں پر بیٹھ گیا۔ اس وقت میں اپنی بیٹی کے گھر سے اپنے گھر آ رہا تھا اور دونوں گھروں کے درمیان چار پانچ فرلانگ کا فاصلہ

ہے۔ سانس بحال ہوئی تو پھر چلنا شروع کیا لیکن اسی طرح پھر گھٹن ہوئی اور پھر بیٹھنا پڑ گیا۔ میں اس طرح بمشکل گھر پہنچا اور گھر آ کر اپنے ایک دوست ڈاکٹر جہانگیر عالم کو فون کیا اور کہا کہ میں نے آپ سے کچھ مشورہ کرنا ہے۔ انہوں نے بلا لیا اور میں چلا گیا۔

انہوں نے میری کیفیت سن کر اور طبی معائنہ کر کے کہا کہ یہ تو مجھے انجوائنا نظر آتا ہے۔ پھر کہنے لگے کہ میں آپ کو خط لکھ دیتا ہوں۔ آپ ڈاکٹر زبیر کے پاس جائیں وہ صحیح بتائیں گے۔ میں ان کے پاس گیا تو انہوں نے بھی معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ یہ تو انجوائنا ہے۔ انہوں نے کچھ ادویات لکھ کر دیں اور ریسٹ کرنے کا مشورہ دیا۔ اور پندرہ دن کے بعد دوبارہ آنے کے لیے کہا۔ انہوں نے کچھ پرہیز بھی بتائے لیکن سگریٹ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ شاید وہ سمجھتے ہوں کہ یہ سگریٹ نہیں چھوڑ سکے گا۔

اس دن میں نے فیصلہ کیا کہ اب سگریٹ چھوڑ دینے چاہئیں۔ لیکن پھر خیال آتا تھا کہ لکھنے پڑھنے کا کیا ہوگا اور بغیر لکھنے پڑھنے کے زندہ کیسے رہوں گا۔ غرضیکہ ایک طرف مجھے موت پکارتی تھی اور دوسری طرف زندگی۔ آخر میں نے زندگی کے حق میں فیصلہ کیا اور کسی نہ کسی طرح سگریٹ چھوڑ دیئے۔

لکھنا پڑھنا تو کیا تھا۔ میں نے پندرہ دن تک پورا ریسٹ لیا۔ اس کے بعد جب لکھنے بیٹھا تو لکھا نہ جائے۔ میں نے سوچا کہ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ شاعری چھوڑ دوں گا۔ اور پیشہ بدل کر کسی اور طریقے سے روٹی کما لوں گا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا اور میں کوشش کرتا رہا۔ آخر کوئی ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد ذہن ساتھ دینے لگا اور میں سگریٹ کے بغیر بھی لکھنے پڑھنے لگا۔

مجھے سگریٹ نوشی ترک کرنے کا حوصلہ اس لیے بھی ہوا کہ مجھ سے چھ ماہ پہلے احمد ندیم قاسمی صاحب بھی سگریٹ چھوڑ چکے تھے حالانکہ وہ بہت پرانے سگریٹ پینے والے تھے۔ اس کے بعد جو رعشہ کبھی ختم نہیں ہوا تھا وہ بڑی حد تک کم ہو گیا۔ اب میرے ہاتھ بالکل نہیں کانپتے۔ زبان کا ذائقہ جو سگریٹ نوشی کی وجہ سے خراب ہو چکا تھا وہ بھی ٹھیک ہو گیا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ضمیر پر جو بوجھ تھا کہ روزانہ بیس روپے کے سگریٹ پی جاتا ہوں

اور اتنا خرچ تو ہنڈیا پکانے پر نہیں آتا۔ چنانچہ ضمیر کے اس بوجھ سے بھی نجات مل گئی اور اب میں ایک نارمل آدمی کی طرح شاعری کر رہا ہوں۔

یہ سچ ہے کہ شراب کا شاعری سے کوئی تعلق نہیں لیکن سگریٹ کا کچھ تعلق ہے۔ جو آدمی سگریٹ یا حقہ پی کر شعر کہنے کا عادی ہو جائے تو اس کے لیے تمباکو نوشی بہت لازم ہو جاتی ہے اور اسے اس سے نجات بہت مشکل ملتی ہے۔

شراب اور مولوی

تخلیق کاروں پر شراب نے بہت برے اثرات کیے۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ جو لوگ بڑی بے احتیاطی سے شراب پیتے ہیں وہ چالیس اور پنتالیس سال کی عمر کے دوران اس دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں۔ اور اگر اس عمر سے آگے بڑھ جائیں تو پھر وہ طبعی موت مرتے ہیں ورنہ بیالیس اور چوالیس سال کے درمیان مرنے والوں کی لمبی فہرست ہے۔ ان میں مجاز لکھنوی بھی شامل ہیں جو اس عمر میں شراب کے ہاتھوں فوت ہو گئے۔ گانے والوں میں کے ایل سہگل اسی عمر میں چلے گئے۔ میوزک ڈائریکٹروں میں شام سندر اسی عمر کے دوران وفات پا گئے۔ اختر شیرانی نے بھی اسی عمر میں وفات پائی۔ شاد امرتسری بھی اسی فہرست میں شامل ہیں۔ لیکن یہ ایک لمبی فہرست ہے۔

جو پینے والے اس عمر سے آگے بڑھ گئے ان میں سید عبدالحمید عدم، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری اور دوسرے شامل ہیں۔ یہ فہرست بھی بڑی طویل ہے۔ ان میں جوش صاحب کچھ قاعدے سے پیتے تھے۔ ان تینوں شعراء نے بڑی لمبی عمر پائی۔ لیکن کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بے اعتدالی سے پینے والے لوگ بیالیس اور چوالیس سال کی عمر کے دوران اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں اور اللہ کو کیا بلکہ شراب کو پیارے ہو جاتے ہیں۔

شراب کے ذکر کے سلسلے میں ہم غور کریں تو مارشل لاء کے دور اور ضیاء صاحب کے سلسلے کے اسلام میں شراب نوشی کے خلاف بہت زور دیا گیا اور اس کی ممانعت پر بھی زور دیا گیا۔ اگر شراب کی پاکستان میں بندش ہوئی تو وہ ذوالفقار علی بھٹو کے حکم سے ہوئی۔ جب ان کا زوال آ چکا تھا تو انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا دینے کے لیے جو دو چار قدم اٹھائے

تھے اور جن میں ان کا مسلک شامل نہیں تھا ان میں سے ایک شراب پر پابندی بھی تھی۔ لیکن ہم اس چکر میں پڑے بغیر کہ انہوں نے شراب بندی کیوں کی۔ یہ مان لیتے ہیں کہ مکمل شراب بندی بھٹو صاحب نے کی۔ اس پر بظاہر بہت عمل ہوتا رہا لیکن چند روز پہلے میں نے ''نوائے وقت'' کا ایک نوٹ پڑھا جس میں لکھا تھا کہ ہمارے ملک میں جو شراب بنتی ہے اور جو غیر ممالک سے غیر قانونی طور پر سمگل ہو کر آتی ہے اس کے علاوہ ہماری حکومت نے دو کروڑ روپے کی شراب درآمد کی ہے۔ میں یہ پڑھ کر حیرت میں نہیں ڈوبا کیونکہ میں درونِ پردہ باتیں جانتا ہوں کہ اس ملک میں شراب اسی طرح پی جا رہی ہے اور یہ شراب کون مہیا کرتا ہے یہ بھی سب جانتے ہیں۔ چھوٹے موٹے آدمی جن کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہوتا وہ ضرور پکڑے جاتے ہیں لیکن استطاعت رکھنے والا حلقہ اسی طرح پیتا رہتا ہے۔ یہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے یہ میرے بتانے کی بات نہیں۔

وہ لوگ جو شراب سے ڈر گئے تو وہ اب ہیروئن کی طرف چلے گئے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو یقینی طور پر انسان کو قتل کر کے رکھ دیتی ہے۔ شراب بری چیز ہے لیکن یہ ہیروئن سے کم نقصان دہ ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہیروئن پر کوئی مولوی ملامت نہیں کرتا اور جس طرح شراب کے خلاف باتیں کی جاتیں ہیں اس طرح ہیروئن پینے والے کے خلاف باتیں نہیں ہوتیں۔ غالباً ایسا اس لیے ہے کہ قرآن مجید میں شراب کا ذکر تو ہے ہیروئن کا نہیں ہے۔

ہیروئن اور شراب سے بڑھ کر جس چیز کے خلاف مہم چلانی چاہئے وہ تمباکو نوشی ہے۔ ہیروئن تو اکثر بھٹکے ہوئے لوگ پیتے ہیں اور یہ بہت مہنگی چیز ہے۔ اس طرح شراب بھی ایک مہنگی چیز ہے اور اس کا عام طور پر شام کا وقت ہوتا ہے۔ لیکن سگریٹ تو لوگ صبح بیدار ہونے سے لے کر رات سونے تک پیتے رہتے ہیں اور یہ وہ ہلکا زہر ہے جو آہستہ آہستہ پورے جسم میں سرایت کرتا رہتا ہے۔ یہ زہر کبھی تپ دق پر منتج ہوتا ہے تو کبھی کینسر پر۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تو سگریٹ نوشی اعصاب کو برباد کر کے رکھ دیتی ہے اور بینائی پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔

میں نے کبھی کسی مسجد میں کسی مولوی کو سگریٹ کے خلاف تقریر کرتے نہیں دیکھا بلکہ صوبہ سرحد میں تو کچھ مولوی حضرات منہ میں نسوار رکھ کر تقریر کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر میں عالم دین ہوتا مگر مولوی نہیں تو یہ برحق ہے کہ قرآن مجید میں شراب کی شدید ممانعت کا ذکر آیا ہے مگر میں اپنے کام کا آغاز سگریٹ نوشی کے خلاف بات سے کرتا کیونکہ اس کے حلقہ اثر میں بہت زیادہ لوگ ہیں اور پھر تمباکو نوشی جتنی قاتل چیز ہے شراب نوشی اتنی مہلک نہیں۔ اور پھر ہیروئن کو میں تمباکو نوشی کے بعد دوسرے نمبر پر رکھتا اور شراب کے خلاف ان دونوں کے بعد ہی بات کرتا۔

آج پاکستان میں جس رفتار سے ہیروئن اور سگریٹ نوشی بڑھ رہی ہے اسے دیکھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ آئندہ دس پندرہ برس میں ہمارا ہیروئن بنانے والا طبقہ ہیروئن سمگل کرتے ہوئے اپنے ملک کی کثیر آبادی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ اللہ تعالیٰ اس ملک کو اس برے وقت سے بچائے۔ جس چیز کو کچھ جرائم پیشہ افراد نے اپنا ذریعہ معاش بنا رکھا ہے مجھے ڈر لگتا ہے کہ وہ کہیں اس قوم کے لیے ذریعہ موت نہ بن جائے۔ ہمارے شاعروں میں کچھ مثالیں موجود ہیں۔ ساغر صدیقی مرحوم چرس سے شروع ہوئے تھے اور مشاعروں میں سے کچھ آمدن بھی تھی جس سے چرس خرید لیتے تھے لیکن یہ چرس بڑھتے بڑھتے مارفیا پر منتج ہوئی۔ اور ہر وقت ان کے ہاتھ میں سرنج رہنے لگی۔ وہ مارفیا کا ٹیکہ لگواتے رہتے تھے ادھر ان پر ازخود رفتگی کا دورہ شروع ہو گیا اور مشاعروں سے بھی غیر حاضر رہنے لگے۔ فلم میں بھی گیت نگاری میں ان کی بڑی اچھی شہرت تھی مگر ادھر بھی نہیں گئے اور آخر یہ ہوا کہ انہوں نے تکیہ پکڑ لیا۔ کالے کپڑے پہن لیے اور مارفیا تک پہنچے۔ اس وقت چونکہ ہیروئن نہیں تھی اس لیے وہ مارفیا تک پہنچے۔ اگر آج وہ ہوتے تو ہیروئن تک پہنچتے مگر ہمارے مذہبی حلقوں میں اس وقت بھی مارفیا کا کوئی ذکر نہیں تھا اور آج بھی نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ خدارا ان نشوں کا بھی کچھ علاج سوچیں جن کا ذکر قرآن مجید میں اس لیے نہیں آیا کہ اس وقت وہ نشے موجود نہیں تھے۔ شراب سے مراد شراب ہی نہیں بلکہ ہر وہ نشے والی چیز جو انسان کی بربادی کا باعث بن سکتی ہے وہ بھی شراب ہے اور جس طرح

ہم شراب کو حرام سمجھتے ہیں ہمیں چاہئے کہ ہم باقی چیزوں کو بھی اسی طرح حرام سمجھیں۔ مارفیا، چرس، ہیروئن اور سگریٹ سب ایک جیسی ہی چیزیں ہیں۔ یہ سچ ہے کہ سگریٹ بے ہوش نہیں کرتا لیکن اس کے پورے مضر اثرات کو دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ دوسرے نشوں سے کم نہیں ہے۔

اب صاحب منبر کو چاہئے کہ ان چیزوں سے بھی وہی سلوک کریں جو وہ شراب سے کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ جس چیز کا ذکر قرآن مجید میں موجود نہیں ہے اور جو اس زمانے میں موجود نہیں تھی اسے یہ مضر چیزوں سے خارج کر دیں۔ یقیناً یہ بھی سب شراب ہی کے قبیل کی چیزیں ہیں۔ بلکہ شراب سے بھی زیادہ مضر چیزیں ہیں۔

ساحر لدھیانوی

ساحر لدھیانوی ایک ایسا نام ہے جو از سر تا پا کشش ہی کشش ہے۔ ادب سے لے کر فلم تک جتنی شہرت، نام اور مرتبہ ساحر نے حاصل کیا وہ قابل رشک ہے۔ ساحر کے بارے میں لوگ اور تو بہت کچھ جانتے ہیں لیکن کچھ ایسی چیزیں ہیں جن پر ابھی تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ اور وہ محض افواہوں کی حد تک ہیں۔ اس کے بارے میں کچھ مضامین ایسے چھپے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ساحر مردانہ اوصاف سے محروم تھا۔ بظاہر اس کی زندگی یوں ہی سمجھ لیجئے کیونکہ مرتے دم تک اس کی شادی نہیں ہوئی تھی جبکہ فوت ہوتے وقت اس کی عمر تقریباً پینسٹھ برس تھی۔ چنانچہ اس کے بارے میں ایسے شکوک پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ پھر اس کے دوستوں نے اس کے بارے میں جو کچھ کہا وہ بھی اس کی تصدیق کرتا تھا۔ لیکن میں اس سے آگے کی کچھ باتیں بتانا چاہتا ہوں کیونکہ ساحر میرا بہت عزیز، قریبی اور بے تکلف دوست تھا اور مجھ سے وہ کچھ ایسی باتیں بھی کہہ جاتا تھا جو اوروں سے نہیں کہتا تھا۔ اور مجھے اس پر فخر ہے۔

جس وقت ساحر ممبئی چھوڑ کر اور لدھیانہ کے مہاجرین کیمپ سے اپنی والدہ اور نانی کو لے کر لاہور پہنچا تھا تو اس وقت اس سے میری قربت شروع ہوئی تھی ورنہ پہلے ایک دو خطوں کے تبادلے کے سوا ہمارے تعلقات نہیں تھے۔ یہاں آنے کے بعد شروع شروع میں ساحر کمیونسٹ پارٹی کے دفتر کی بالکل بالائی منزل پر ایک برساتی نما کمرے میں میکلوڈ روڈ پر ٹھہرا تھا۔ یہ وہی بلڈنگ ہے جس میں بعد میں روزنامہ ''کوہستان'' کا دفتر بھی قائم ہوا

تھا۔ یہ ۱۹۴۷ء کے آخر کی بات ہے۔ جب وہ یہاں آ کر ٹھہرا تو اس کی ماں کے پاس کچھ زیورات اور نقدی تھی۔

اسے بہت سی توقعات تھیں کہ پاکستان میں آ کر ساحر کا نام بہت آگے بڑھے گا۔ نام کی حد تک فیض صاحب اور قاسمی صاحب کو چھوڑ کر نوجوانوں میں کوئی ایسا نہیں تھا جو اس کی شہرت اور مقبولیت کو پہنچے۔ وہ کچھ اس عرصہ اس سٹور نما کمرے میں اپنے گھر والوں کے ساتھ مقیم رہا۔ اس کے بعد اسے ایبٹ روڈ پر ایک مکان کا حصہ الاٹ ہوا جس میں وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ منتقل ہو گیا۔ اور ساتھ ساتھ روزگار کی کوشش کرنے لگا۔

یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ ہمارے ایک بزرگ جو رواداری کے لیے بڑے مشہور تھے وہ اپنی ذات کے حوالے سے اس کے لیے مضر بھی ثابت ہوئے۔ اس زمانے میں پاکستان ٹائمز اور امروز دو پرچے پروگریسو پیپرز کی جانب سے نکلے جن کے مالک میاں افتخار الدین تھے۔ ان اخبارات میں جہاں بہت سے دوسرے افراد کو روزگار کے مواقع میسر آئے وہاں خیال تھا کہ ساحر کو بھی کوئی ملازمت مل جائے گی۔ لیکن اخبار کے چیف ایڈیٹر چراغ حسن حسرت تھے۔ وہ بڑے مشفق آدمی تھے اور ان کے دل میں ساحر کے بارے میں ایک گانٹھ پڑی ہوئی تھی۔

حسرت کی ایک غزل اس زمانے میں بہت مشہور ہوئی تھی۔ جو یہ تھی

؎ عارض و رخسار کی باتیں کریں
آؤ حسن یار کی باتیں کریں

سہل الممتنع میں یہ ایک بہت اچھی غزل تھی۔ ساحر کی عادت تھی کہ وہ جس غزل کو پسند کرتا تھا اسی زمین میں اپنے انداز کی بات کر جاتا تھا۔ چنانچہ اس نے اس زمین میں یہ غزل کہی

؎ اجنبی سرکار کی باتیں کریں

اس نے انگریز کے خلاف اپنی اس غزل میں باتیں کی تھیں۔ میرے خیال میں یہ اس آدمی کو TRIBUTE ہوتا ہے جس کی زمین میں غزل کہی جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اگر

Parody کہی جائے تو بھی وہ سمجھتا ہے کہ میری غزل مقبول ہے جو اس زمین میں غزل کہی جارہی ہے اور وہ خوش ہوتا ہے۔ لیکن چراغ حسن حسرت کے دل میں ساحر کی اس جرات کے بعد ایک گانٹھ پڑی ہوئی تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ ساحر نے ان کی غزل کو بگاڑا ہے۔ چنانچہ جب ساحر کا نام آیا تو انہوں نے اسے ملازمت دینے سے انکار کردیا جس پر وہ بہت دلبرداشتہ ہوا کیونکہ اسے اس سے پہلے بھی کئی جگہ ملازمت کے سلسلے میں ناکامیاں ہوچکی تھیں۔ اسے اس سے پہلے ایک سہ ماہی پرچے ''سویرا'' میں ملازمت ملی تھی لیکن اس کے پیسوں سے تو اس کا جیب خرچ بھی نہیں چلتا تھا۔ پھر ان دنوں جو مشاعرے ہوتے تھے وہ بھی اس کے اخراجات کے لیے ناکافی تھے۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد اسے بہت صدمہ ہوا اور اسی دوران اس کے ماموں نے انڈیا میں اسے واپس بلوالیا جس کے بعد اس نے پاکستان چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔

اسی لاہور میں جب ساحر پہلے رہتا تھا تو امرتا پریتم بھی یہیں رہتی تھیں۔ امرتا پریتم نہایت خوبصورت لڑکی کے طور پر اس زمانے میں مشہور تھی اور ان کے یکطرفہ طور پر چاہنے والے بہت سے تھے۔ وہ بڑے گھر کی بھی تھیں اور پڑھی لکھی بھی تھیں پھر ایک اعلیٰ درجے کی شاعرہ بھی تھیں۔ چنانچہ ان کے بہت سے چاہنے والے پیدا ہوگئے۔ اور ساحر بھی ان میں سے ایک تھے لیکن اس کی خوبی یہ تھی کہ امرتا پریتم بھی اسے چاہتی تھی اور اس کے انتظار میں رہتی تھی۔

امرتا پریتم اور ساحر لدھیانوی کے بارے میں لوگوں کا خیال یہ تھا کہ ان کے مراسم عام حدود سے آگے پہنچ چکے ہیں۔ واللہ علم بالصواب۔ اس بارے میں آگے چل کر لوگوں کو اور شبہات اس لیے پیدا ہوئے کہ امرتا پریتم کے ایک بیٹے کی شکل ساحر پر ہے۔ امرتا پریتم نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ میرا بیٹا مجھ سے پوچھتا ہے کہ ''ممی مجھے لڑکے پوچھتے ہیں کہ کیا تم ساحر انکل کے بیٹے ہو۔ کیونکہ تمہاری شکل ان پر ہے۔'' تو میں اسے کہتی ہوں کہ اگر تم ساحر انکل کے بیٹے ہوتے تو میں تمہیں سچ کہہ دیتی۔ تم ساحر کے بیٹے نہیں ہو۔ میرے ساتھ یہ ہوا کہ ساحر میرے تصورات پر چھایا ہوا تھا اور ہر وقت میرے

تصور میں اس کی تصویر رہتی تھی اس لیے تمہاری شکل ان پر ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ان کی اس بات کو مانا جائے لیکن یہ بڑی غیر سائنسی بات ہے۔

امرتا پریتم کی بات اپنی جگہ۔ لیکن سائنس اس چیز کی نفی کرتی ہے کہ اگر کوئی تصورات پر چھایا ہو تو بچے کی شکل اس پر ہوگی۔ میں یہ بات ان لوگوں کے حوالے سے کہہ رہا ہوں جو اس طرح کی بات کی نفی کرتے ہیں۔ ایک بہت پڑھے لکھے ہندو نے مجھ سے کہا کہ ہمارے ہر ایک گھر میں کرشن جی مہاراج کی تصویر لگی ہوتی ہے اور تصویر بھی بہت خوبصورت ہوتی ہے۔ کرشن جی مہاراج کی تصوراتی تصویر بناتے بناتے ایک ایسا شاہکار بن چکا ہے کہ دنیا میں ایسا خوبصورت مرد کہیں بھی نہیں ہے۔ اور کرشن جی عورتوں کے تصورات پر چھائے بھی رہتے ہیں۔ کیونکہ اس میں ان کا عقیدہ شامل ہوتا ہے۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ بچے کی تصویر وہ بنتی ہے جو ذہن پر چھایا رہے تو ہندو گھروں میں نوے فیصد بچوں کی شکل کرشن جی مہاراج پر ہونی چاہیے۔

یہ ایک پڑھے لکھے ہندو کا کہنا ہے۔ اب ایک طرف امرتا پریتم کا بیان ہے جو کہ بڑی دلیر خاتون ہیں اور ان کی بات ماننے کو جی چاہتا ہے۔ دوسری طرف یہ سائنسی بات ہے جسے بھی رد نہیں کیا جا سکتا لیکن میں یہ تمہید اس لیے باندھ رہا ہوں کہ میں ساحر کے بارے میں اس بات کی تردید کرنا چاہتا ہوں کہ وہ مردانہ اوصاف سے محروم تھا۔

ایک تو امرتا پریتم کے بیٹے کی شکل ساحر کے بارے میں اس بات کو شبہے میں ڈالتی ہے دوسرا ساحر کے بارے میں میرا یہ آنکھوں دیکھا واقعہ ہے کہ دسمبر ۱۹۴۷ء میں ساحر ایبٹ روڈ پر رہتے تھے جبکہ میں رائل پارک میں رہتا تھا۔ میرے ساتھ چندر کانتا رہتی تھیں جن کا نام میرے ساتھ وابستہ رہا ہے۔ ساحر ایبٹ روڈ پر اپنی ماں اور نانی کے ساتھ رہتے تھے۔ ہمارے دونوں کے مکانوں میں فاصلہ بمشکل آدھے فرلانگ کا تھا۔ اس زمانے میں پینے پلانے پر کوئی پابندی نہیں تھی اور لوگ اکثر پیتے تھے اور ایک دوسرے کے ہاں اکثر پروگرام بنتا تھا۔

ایک دن ساحر میرے ہاں آئے اور یہاں پینے کا پروگرام بنا۔ ساحر نے دو پیگ

لیے اور کہنے لگے کہ اگر میں اس سے زیادہ پیوں تو مجھے نیند آ جاتی ہے۔ اس لیے میں اور نہیں پیوں گا۔ میرا بھی یہی معاملہ تھا میں تو اور لوگوں کا ساتھ دیتا تھا۔ اس دن میں نے ساحر سے کہا کہ ایک پیگ اور پی لو اگر نیند آئی بھی تو ساتھ ہی تو تمہارا گھر ہے چلے جانا۔ کہنے لگا کہ مجھ سے نہیں اٹھا جاتا۔ میں نے کہا کہ یہ بھی تو تمہارا گھر ہے اس لیے یہاں سو جانا۔ کہنے لگا اچھا۔ چنانچہ اس نے ایک پیگ اور لیا۔ واقعی وہ پیگ پینے کے بعد وہ اونگھنے لگا۔ اور کہنے لگا کہ مجھے پاجامہ دو کیونکہ میں کپڑے بدل کر سونا چاہتا ہوں۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا بلکہ صرف پینے کے دوران ہی کچھ SNACKS لیے۔ اور سو گیا۔

صبح میں اٹھا تو دیکھا کہ ساحر نہیں ہے۔ ساحر اس سے پہلے بھی کئی بار میرے ہاں سو چکا تھا اور سوتے ہوئے میں کئی بار مردانگی کے عام آثار اس میں دیکھ چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے جو معاشقہ بھی کیا وہ کبھی وصال تک نہیں پہنچا۔ انہی دنوں اس کا یہاں ایک مسلمان لڑکی سے معاشقہ ہوا تھا اور اس کے ساتھ وہ راتیں بھی گھومتا تھا۔ اور ان کی خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔ لڑکی بڑی خوبصورت تھی اور ایک امیر گھرانے سے تھی لیکن جب دونوں کی قربت ہونے لگی تو ساحر وہاں سے بھاگ گیا۔ میرے ذہن میں ساحر کے یہ سب واقعات تھے اور ساتھ ہی ذہن میں اس کے بارے میں مشہور یہ افواہیں بھی تھیں کہ وہ مردانہ اوصاف سے محروم ہے۔

چنانچہ اس روز جب میں صبح اٹھا اور دیکھا کہ وہ نہیں ہے تو میں نے کپڑے ڈھونڈے جو وہ رات کو پہن کر سویا تھا۔ اس کے اپنے کپڑے بھی وہاں موجود نہیں تھے۔ میری سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔ کچھ دیر بعد جھاڑو دینے والی لڑکی آئی تو اس نے صفائی کے دوران کہا کہ چارپائی کے نیچے پاجامہ پڑا ہے۔ میں نے وہ اٹھایا تو دیکھا کہ وہ خراب ہوا تھا۔ گویا خواب کی کیفیت میں جو مرد کو ہوتا ہے وہ ہوا تھا۔

اس کے بعد میں نے حکیم نیئر واسطی سے پوچھا کہ کیا نامرد آدمیوں کو احتلام ہوتا ہے تو انہوں نے کہا کہ نہیں ہوتا۔ میں نے کہا کہ ساحر کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ نامرد ہے لیکن میرے گھر میں رات یہ واقعہ ہوا ہے۔ تو وہ کہنے لگے کہ پھر وہ نامرد نہیں ہے بلکہ

ٹھیک ہے۔

جب ساحر ممبئی چلا گیا تو پتہ چلا کہ وہاں ایک نئی گلوکارہ سدھا ملہوترا سے اس کے مراسم کافی بڑھے لیکن پتہ چلا کہ آخر میں یہ معاملہ ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد ساحر کا لتا سے سلسلہ مشہور ہوا اور پھر پتہ چلا کہ وہ معاملہ بھی ٹوٹ گیا۔ اس دوران برابر اس کی ہجر و وصال کی نظمیں بھی ہو رہی ہیں اور ساتھ یہ بھی کہ

؎ تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

اس نے یہ شعر اس طرح کہا جیسے درمیان میں سماج آ گیا تھا۔ حالانکہ کوئی سماج درمیان میں نہیں آیا تھا بلکہ یہ خود ہی بھاگ جاتے تھے۔

میں ممبئی جب جاتا تو ساحر ہی کے گھر ٹھہرتا تھا۔ وہاں میں نے اس سے کہا کہ چند لوگ ایسے ہیں جن سے میرا انداز مخاطب ''تو'' ہے۔ میں انہیں تو کہتا ہوں اور وہ بھی مجھے تو کہتے ہیں۔ ورنہ میں اپنے سے چھوٹے کو بھی آپ کہہ کر بلاتا ہوں۔ چنانچہ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ کیونکہ مجھے تو ایسے لگتا ہے کہ تمہاری زندگی میں تو کوئی عورت آئی ہی نہیں ہے۔ کہنے لگا کہ بھائی چھوڑو اس بات کو، میری زندگی میں کوئی لڑکی آئی تھی۔ اس کا تکیہ کلام بیر (بھائی) تھا، اور مجھے بھی اکثر بیر کہہ کر بلاتا تھا اور میرے ساتھ پنجابی ہی میں بات کرتا تھا۔

میں نے کہا کہ اگر کوئی تمہاری زندگی میں بھی آئی ہے تو اس طرز زندگی کو چھوڑ دو۔ کیونکہ تمہاری ماں مجھ سے کہتی ہے کہ اسے کہو شادی کرے۔ اور تم معاشقے کر کے بھاگ جاتے ہو۔ تو وہ کہنے لگا کہ میں یہ تو نہیں بتاؤں گا کہ میرے مراسم کس کے ساتھ رہے ہیں کیونکہ یہ بہت بری بات ہے۔ آپ کا ذہن بھی اسی طرف جائے گا لیکن اس نے اپنی زبان سے اس کا نام نہیں لیا۔ کہنے لگا کہ دوسری بات یہ ہے کہ اسی زمانے میں کوئی اور واقعہ بھی ہو گیا تھا لیکن اب میں ٹھیک ہوں۔ میں نے کہا کہ یہ میں جانتا ہوں کہ تم ٹھیک ہو۔ مگر دوسری بات بتاؤ۔ کہنے لگا کہ اب میں جب بھی کسی عورت کے بارے میں سوچتا ہوں کہ

میں ایک مرد کی حیثیت سے اسے ہاتھ لگاؤں گا تو مجھے لگتا ہے کہ میں پگھل کر گر جاؤں گا۔ مجھ میں حوصلہ ہی نہیں ہے۔ مجھے پسینے آ جاتے ہیں اور میں بے ہوش ہو جاتا ہوں۔

میں نے کہا کہ اس کا علاج کروانا تھا کہنے لگا کہ علاج بھی کروا تا رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ نفسیاتی علاج کروانا تھا۔ کہنے لگا کہ اس میں میں بہت بدنام ہو جاؤں گا۔ میں نے کہا کہ اس طرح بھی تو بدنام ہو رہے ہو کیونکہ لوگ کہتے ہیں کہ تم نامرد ہو۔ کہنے لگا کہنے دو۔ اب تو بہت سی زندگی گزر گئی ہے اور جو اور ہے وہ بھی گزر ہی جائے گی۔

تو اصل ساحر یہ ہے۔ وہ ذہنی نامردی کا شکار تھا۔ اور نفسیاتی طور پر نامرد تھا۔ ورنہ وہ بالکل ٹھیک تھا اور میں نے اس کی جو پچھلی باتیں بتائی ہیں۔ انہیں ذہن میں رکھیں۔

شوقیہ جھوٹ بولنے والے

ابراہیم جلیس بھی میرے ان بے تکلف دوستوں میں سے تھے جن سے نہ میرا کچھ چھپا ہوا تھا اور نہ ان کا کچھ چھپا ہوا تھا۔ زوال حیدر آباد کے بعد جب وہ لاہور پہنچے تھے تو جن دوستوں سے ملنے کی انہوں نے خود خواہش کی تھی ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ انہوں نے آتے ہی میری اس نظم کا حوالہ دیا جو میں نے مہاتما گاندھی پر کہی تھی اور جو ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئی تھی اور اخبارات و رسائل میں بھی چھپی تھی۔ انہوں نے میری اس نظم کی بہت تعریف کی۔ پھر یہاں وہ چونکہ اکیلے تھے اور ہوٹل میں رہتے تھے اس لیے میری طرف آتے رہتے تھے۔

اس زمانے میں میرے جتنے بھی غیر شادی شدہ یا اکیلے دوست تھے ان کی میرے گھر پر محفل جمتی تھی اور ہفتے میں ایک بار میرے ہاں ان سب کے لیے کھانا ہوتا تھا۔ ابراہیم جلیس اس میں پیش پیش ہوتے تھے۔ بعض لوگ شوقیہ جھوٹ بولنے والے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں ابراہیم جلیس کا کوئی جواب نہیں تھا اور وہ بے تکان شوقیہ جھوٹ بولتے تھے اور جب انہیں ٹوک دیا جاتا تو کہتے اچھا میں نے یہ کہا تھا۔ تو یار آپ اس کی تصحیح کر لیں۔ کتابت کی غلطی ہوگی۔ یوں کہہ کر وہ بات ٹال جایا کرتے تھے۔ اس طرح ایک بار انہوں نے کہا کہ میرے والد نے حیدر آباد سے خط لکھا ہے کہ تم واپس آ جاؤ اور میں اپنی ساری جائیداد تمہارے نام کر دوں گا اور باقی بیٹوں کو عاق کر دوں گا۔ تو میں نے کہا کہ آپ کب واپس جا رہے ہیں تو کہنے لگے کہ جانا کسے ہے:

؎ کون جائے ذوق اب دلی کی گلیاں چھوڑ کر

اور قہقہہ لگایا۔ کوئی غم کی بات ہوتی یا خوشی کی وہ قہقہہ لگاتے تھے۔ ہم نے کہا کہ نہیں آپ چلے جائیے نجانے آپ کے والد کو کیا تکلیف ہو۔ کہنے لگے کہ اچھا آپ کہتے ہیں تو چلے جاتا ہوں کیونکہ آپ میرے ساتھ بہت مخلص ہیں۔ جب اس بات کو ڈیڑھ دو ماہ گزر گئے تو میں نے ایک دن ان سے پوچھا کہ آپ حیدرآباد کب جا رہے ہیں تو کہنے لگے کیوں؟ میں نے کہا کہ آپ نے ذکر کیا تھا کہ والد نے کوئی خط بھیجا ہے جس میں جائیداد کا کوئی ذکر کیا ہے۔ کہنے لگے کہ میں نے آپ سے یہی کہا تھا کہ والد نے خط میں لکھا ہے کہ تم لاہور ہی میں بیٹھے رہو۔ وہاں ٹھیک ہے اور یہاں جائیداد سنبھالنے والے تمہارے بھائی بڑے لائق ہیں۔ میں نے کہ آپ نے تو کہا تھا کہ والد نے لکھا ہے تم آجاؤ باقیوں کو عاق کردوں گا۔ اور تمہیں مختار عام بنادوں گا۔ قہقہہ لگا کر کہنے لگے کہ میں نے یہ کہا تھا تو پھر یہی بات ہوگی اور کتابت کی غلطی ہوگی آپ اسے ٹھیک کر لیجئے۔ لیکن تازہ خبر یہی ہے جو آپ کو اب بتا رہا ہوں۔ اس قسم کی باتیں وہ اکثر کرتے رہتے تھے۔

ایک دن بہت اداس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں گیا تو کہنے لگے کہ گھر سے یہ خط آیا ہے اور اس میں لکھا ہے کہ بیوی قریب المرگ ہے اور اس کے ساتھ ہی زور سے قہقہہ لگایا۔ میں نے کہا کہ بیوی قریب المرگ ہے اور آپ قہقہہ لگا رہے ہیں ذرا خط تو دکھائیے۔ میں نے خط اٹھا کر پڑھا تو اس میں بیوی کی بیماری یا قریب المرگ ہونے کا کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔ ان کے اس طرح جھوٹ بولنے کی وجہ کوئی بھی نہیں ہوتی تھی۔

میں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ انہوں نے کچھ عادتیں لطیفے کے طور پر راسخ کر رکھی تھیں اور ان کا سوائے اس کے اور کوئی مطلب نہیں ہوتا تھا۔ جب یہاں سے کراچی چلے گئے تو ایک بار کوئی دوست وہاں گئے۔ کہنے لگے کہ کب آئے آپ؟ اس نے جواب دیا کہ کل آیا ہوں۔ پھر پوچھا کہ کب جانا ہے۔ وہ کہتا منگل کو تو کہنے لگے کہ اوہ ہو۔ بدھ کو تو میں آپ کی دعوت کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح پھر قہقہہ لگانے لگے۔ دو چار بار میرے ساتھ بھی یہ واقعہ ہو چکا تھا۔

ایک بار میں اور احمد ندیم قاسمی صاحب ایک ساتھ وہاں گئے تو میں نے راستے ہی میں قاسمی صاحب کو بتا دیا تھا کہ ابراہیم جلیس اس طرح دعوت کی بات کریں گے اور آپ دیکھئے کہ آج میں ان کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ جب ہم وہاں پہنچے تو انہوں نے اسی طرح قہقہہ لگا کر باتیں شروع کیں اور پھر کہنے لگے کہ جانا کب ہے۔ میں نے کہا قاسمی صاحب آپ ٹھہریئے میں بتاتا ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ کو ہمیشہ گلہ ہوتا ہے کہ جس دن آپ دعوت کرنا چاہتے ہیں ہم اس سے ایک دن پہلے چلے جاتے ہیں۔ اس لیے ہم اس بار فیصلہ کر کے آئے ہیں کہ جس دن آپ دعوت کریں گے تو اس سے اگلے دن ہی ہم جائیں گے۔ قہقہہ مار کے کہنے لگے کہ اوہ ظالم مار دیا۔ میں نے کہا کہ آپ بتائیں کہ کس دن آپ دعوت کرنا چاہتے ہیں۔ کہنے لگے تو آپ دعوت کے بارے میں سنجیدہ ہو گئے ہیں؟ میں نے کہا کہ سنجیدہ نہیں ہو گئے بلکہ اس بار لاہور ہی سے سنجیدہ ہو کر آئے ہیں۔ کہنے لگے کہ چلو آج ہی کر لیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہمیں یقین نہیں اسی وقت انہوں نے ایک سو روپے کا چیک کاٹ کر دیا۔ اس زمانے کے لحاظ سے ایک سو روپیہ بہت تھا۔ میں نے کہا کہ اب چلئے ''نگار'' کے دفتر میں الیاس رشیدی کے پاس چلتے ہیں جہاں آپ ملازمت کرتے ہیں اور وہاں سے یہ چیک کیش کرواتے ہیں۔ کیا پتہ کہ شام کو کھانے کے پیسے تو ہم دے دیں اور اگلے دن یہ چیک ڈس آنر ہو جائے۔ تو قہقہہ لگا کر کہنے لگے کہ آپ واقعی یقین نہیں کرتے۔ میں نے کہا ہم واقعی یقین نہیں کرتے۔ چنانچہ ہم ''نگار'' کے دفتر گئے اور الیاس رشیدی سے ان کے چیک کے بدلے میں ایک سو روپیہ وصول کیا۔ اور اسے بھی رات کے کھانے میں اپنے ساتھ شریک کیا۔ ایک دو دوسرے دوستوں کو بھی اس کھانے میں شریک کیا اور سب کو ان کا یہ واقعہ سنایا۔ سب کہنے لگے کہ جلیس صاحب آپ کو پہلے ایسا کوئی آدمی نہیں ملا ہوگا۔ اس لیے اب آپ اپنے اس مذاق کو بدل دیجئے۔ کیونکہ لوگوں کو آپ کی اس عادت کا پتہ چل چکا ہے۔ چنانچہ جلیس صاحب بعض باتیں محض مذاق کے طور پر کرتے تھے۔

اس کے بعد ان کی ایک سنجیدہ زندگی بھی شروع ہوئی۔ جب پیپلز پارٹی کی حکومت

آئی تو انہوں نے ''عوامی عدالت'' کے نام سے ایک پرچہ چلایا۔ لیکن بھٹو صاحب کے زوال کے بعد اس پرچے پر جو بیتی اور ان کے اپنے اوپر جو تشدد ہوا اس کے نتیجے میں یہ دل کے مریض ہو گئے۔ ان کے ہونٹوں پر قہقہے تو بدستور ہوتے تھے لیکن یہ بجھے ہوئے ہوتے تھے۔ اس کے بعد ایک دن پتہ چلا کہ ان کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔ خدا انہیں جنت نصیب کرے۔

ہمارے شوقیہ جھوٹ بولنے والے دوستوں میں ظہور نظر کا بھی جواب نہیں تھا۔ وہ بھی جب بہاولپور سے لاہور آتے تھے تو تازہ بتازہ جھوٹ اپنے ساتھ لے کر آتے تھے اور اس وثوق سے بات سناتے تھے کہ آدمی کو یقین آ جاتا تھا۔ اس زمانے میں انہوں نے ایک یہ جھوٹ سنایا کہ یار لاہور کے دوست بھی بڑے یہ وہ ہیں۔ سلام مچھلی شہری یہاں آیا تھا اور کسی نے اسے لفٹ ہی نہیں کروائی اور وہ یہاں سے سیدھا بہاولپور میرے پاس چلا آیا اور وہاں پورا ایک مہینہ میرے پاس رہ کر اب وہ واپس گیا ہے لیکن لاہور کے سب دوستوں کے ساتھ بہت ناراض واپس گیا ہے۔ اور میں اسے اب ریلوے سٹیشن پر چھوڑ کر آیا ہوں۔ وہاں سے وہ کراچی جائے گا اور کراچی سے بحری جہاز کے ذریعے آگے جائے گا۔ سب نے پوچھا کہ کب آیا تھا یہاں تو بالکل نہیں آیا۔ کہنے لگے کہ چھوڑو یار ایک تو سب لوگوں نے اس کی بے عزتی کی اور دوسرے یہ کہتے ہو کہ یہاں تو بالکل نہیں آیا تھا۔ پھر اس کی باتیں سنانے لگے کہ بہاولپور میں اس کے قیام کے دوران ہم نے اس کے اعزاز میں متعدد دعوتیں کیں۔ تم نے اخباروں میں نہیں پڑھا۔ خبریں تو کافی چھپی تھیں۔ سب دوستوں نے حیرت کا اظہار کیا پھر مجھے کہنے لگے کہ وہ کہتا تھا کہ قتیل سے تو میں زندگی بھر بات نہیں کروں گا۔ میں اس کے بارے میں بڑی آس لے کر آیا تھا کیونکہ سنا تھا کہ وہ بڑی محبت کرنے والا آدمی ہے۔ لیکن اس نے تو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ میں نے کہا کہ ظہور نظر صاحب کیوں جھوٹ بولتے ہیں یہاں تو ہم نے ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں پڑھی۔ کہنے لگے کہ یار ایک تو تم لوگ اخبار بھی نہیں پڑھتے ہو۔ اس کے بارے میں سب خبریں باقاعدہ چھپتی رہی ہیں اور میرے پاس بہاولپور میں سب اخبارات کے تراشے پڑے ہیں

اور جب واپس جاؤں گا تو آپ لوگوں کو یہ تراشے بھیجوں گا۔ پھر کہنے لگے کہ وہ بہاولپور کے شہزادگان سے تو بہت خوش گیا ہے کیونکہ انہوں نے خوب دعوتیں کی تھیں اور تحائف بھی دیئے لیکن لاہور والوں سے خوش نہیں تھا اور اب جب ہم لاہور آئے تو میں نے کہا کہ یہاں بھی کچھ دن دوستوں کے پاس رکتے ہیں تو وہ کہنے لگا کہ میں لاہور والوں پر لعنتیں بھیجتا ہوں۔ چنانچہ میں اسے ریلوے سٹیشن پر چھوڑ کر آ گیا ہوں۔ پھر کہنے لگے کہ انہوں نے وہاں آ کر مجھے یہ یہ نظمیں سنائیں اور میں نے یہ یہ اصلاح دی۔ ہم بہت سٹپٹائے۔ لیکن جب تصدیق کی تو پتہ چلا کہ ظہور نظر صاحب سب جھوٹ کہہ رہے تھے اور وہ تو یہاں آئے ہی نہیں۔

ظہور نظر کی ایک اور خوبی یہ تھی کہ وہ نقلیں بہت اچھی اتارتے تھے اور شاعروں، مولویوں اور لیڈروں کی نقلیں ہو بہو اتارتے تھے۔ کبھی عطاء اللہ شاہ بخاری کی نقل اتارتے تو کبھی ظہیر کاشمیری کی اور کبھی بہاولپور کے کسی امام مسجد کی۔ ان کی نقلیں الفاظ میں تو ادا نہیں ہو سکتیں لیکن یہ سچ ہے کہ جس کی نقل اتارتے تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہو بہو وہ آدمی ہمارے سامنے موجود ہے۔ مولانا بوالا کی نقلیں اتارنے میں انہیں خاص مہارت تھی اور آخر کار انہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑ گیا۔ شاعر تو زندہ دل آدمی تھے سب برداشت کر لیتے تھے لیکن مولویوں کی نقلیں انہیں مہنگی پڑیں۔

عطاء اللہ شاہ بخاری بھی مولوی تھے لیکن وہ زندہ دل آدمی تھے اور وہ کبھی اس کا برا نہیں مانتے تھے۔ انہوں نے خود ایک بار لطیفہ سنایا کہ ایک بار ایک مرید میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ پیر صاحب میری بکریوں کو بھیڑیا پڑ جاتا ہے اس لیے کوئی تعویذ لکھ کر دیں۔ وہ روشن خیال پیر تھے۔ کہنے لگے میں نے اس سے کہا کہ میرے مرید تو اس طرح کر کہ کوئی کتا رکھ لے۔ میں تجھے تعویذ بھی لکھ دیتا ہوں لیکن تو بکریوں کے لیے کوئی کتا رکھ۔ کہنے لگے کہ جواب میں مرید نے کہا کہ ''نہ پیرا مینڈھا تے پیر وی توں تے کتا وی توں (نہیں پیر صاحب! میرے تو پیر بھی آپ ہیں اور کتا بھی آپ۔)

یہ بخاری صاحب تو ایک بڑے آدمی تھے جو خود اپنے ساتھ بھی مذاق کر لیتے تھے۔

انہوں نے ایک بار ظہور نظر کو سامنے بٹھا کر خود ان سے اپنی نقل سنی۔ لیکن مولوی یہ بات کہاں برداشت کرتے ہیں کہ کوئی ان کی نقل اتارے چنانچہ انہیں خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اور وہ یوں کہ ان کی فیملی کے بہت سے لوگ احمدی ہیں اور یہ اس وقت کی بات ہے جب احمدیوں کی اتنی مخالفت نہیں تھی جتنی آج ہے۔ اب ظہور نظر ایک سیدھے سادے پروگریسو آدمی ہیں، بلکہ پروگریسو سے بھی آگے کی چیز ہیں اور پورے لیفٹسٹ ہیں۔ یہ نہ تو سنی ہیں نہ شیعہ، نہ احمدی نہ کچھ اور۔ ہم ذاتی طور پر جانتے ہیں کہ وہ کم از کم احمدی نہیں تھے۔ لیکن ان کے بارے میں مولویوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ شخص مولویوں کی اس لیے تضحیک کرتا ہے کیونکہ یہ احمدی ہے۔ بہاولپور کی ادبی سرگرمیاں انہی کی وجہ سے ہوتی تھیں۔ وہاں ایک مشاعرہ ہوا اور ظہور نظر پڑھنے کے لیے اٹھے تو درمیان سے گڑبڑ کی کچھ آوازیں آئیں۔ یہ بہت دلیر آدمی تھے لیکن اس وقت چپ ہو گئے۔ مگر جوں جوں یہ کلام پڑھتے رہے توں توں آوازیں آتی رہیں۔ آخر انہوں نے کلام روک کر کہا کہ کیا بات ہے اور تم لوگ بک بک کیوں کر رہے ہو۔ اور جن لوگوں کے تم ایجنٹ ہو ان کی بھی ایسی تیسی اور تمہاری بھی ایسی تیسی۔ پھر کہا کہ مجھے جو ہونے کا تم کہتے ہو ان کی بھی ایسی تیسی میں وہ نہیں ہو۔ اس طرح انہوں نے اپنے بارے میں احمدی ہونے کی تردید کر دی۔ لیکن مولویوں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اور جب وہ فوت ہوئے تو مولویوں نے دو دن تک ان کا جنازہ نہیں پڑھنے دیا۔ حالانکہ وہ بہت شگفتہ دل تھے۔

میرے ابتدائی یا کچے گیتوں کا پہلا مجموعہ "ہریالی" بہاولپور ہی سے چھپا تھا۔ وہاں عباسیہ اکیڈمی کے نام سے ایک پبلشنگ ادارہ تھا جس کی طرف سے حیات ترین "ستلج" رسالہ بھی نکالتے تھے۔ وہ میرے بہت پیارے دوست تھے۔ ان سے مراسم بہت بڑھ گئے۔ ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ وہاں کے رئیس الرؤسا حسن محمود صاحب سیاست میں اترے تو انہوں نے حیات ترین سے رابطہ کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کے ادیبوں شاعروں سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ چنانچہ پہلے تو انہیں اخبار نکالنے کے لیے سرمایہ دیا۔ چنانچہ وہ لاہور آئے اور رائل پارک میں اخبار کا دفتر بنایا۔

انہوں نے بہت سا روپیہ حیات ترین کے سپرد کیا اور کہا کہ لاہور کے اخبار والوں سے رابطہ کر کے کہو کہ وہ پریس کو میرے حق میں کر دیں اور میرے مخالف کے بیانات ذرا کم شائع کریں۔ یہ میری زندگی کا پہلا اور آخری تجربہ تھا کہ پریس والوں کو رشوت کیسے دی جاتی ہے۔ حیات ترین کا لاہور میں سب سے اچھا دوست میں ہی تھا اور میرے تعلقات سب سے تھے۔ تو مجھے انہوں نے کہا کہ یہ کام میرے سپرد ہوا ہے اور میں یہاں پر اجنبی ہوں۔ اس لیے آپ میری معاونت کریں۔ اور ساتھ یہ بھی کہا کہ یہ کام ہے بھی جائز جیسا کہ ہر آدمی کہتا ہے کہ اس کا کام جائز ہے۔ اور کہا کہ دوسرا فریق بہت کمینہ ہے جبکہ حسن محمود بہت شریف آدمی ہے۔ چونکہ مخالف فریق بااثر ہے اور جھوٹے الزامات لگاتا ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ وہ ذرا ٹھنڈا رہے اور ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو۔ اور اس نے مجھے اس طرح اس بارے میں بریف کیا کہ میرے منہ میں بھی اس کے الفاظ ہی آ گئے اور پھر مجھے کہنے لگا کہ یہ پیسے آپ رکھئے اور جو کسی کی چائے پانی کی خدمت کرنی ہو وہ بھی آپ ہی کیجئے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ چنانچہ سب پرچوں میں میرے جتنے بھی جاننے والے تھے اور جو لوگ بھی اس معاملے میں مددگار ہو سکتے تھے میں نے جا کر ان سب کو ان گنہگار ہاتھوں سے پیسے دیئے اور ساتھ وہ سب کچھ بھی کیا جو مجھے کہا گیا تھا۔ اور تاکید کی کہ ان کے خلاف جو بیانات ہیں وہ شائع نہ کریں کیونکہ ان کا مخالف فریق بہت کمینہ ہے اور یہ آپ کا ہدیہ ہے۔

آج بھی ان صحافیوں میں سے بہت سے لوگ زندہ ہیں۔ البتہ کچھ مر چکے ہیں۔ ایک مرحوم صحافی جو لیڈر بھی تھے میں ان کے پاس بہت ڈرتے ڈرتے گیا اور کہا کہ مجھے پتہ ہے کہ آپ تو بہت مجاہد آدمی ہیں آپ سے تو گفتگو کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے لیکن ایک حق کی بات لے کر آپ کے پاس آیا ہوں کیونکہ آپ حق کے علمبردار ہیں اور پھر انہیں حسن محمود کے بارے میں ساری بات اسی طرح کہی اور کہا کہ ان کا مخالف بڑا کمینہ آدمی ہے اور انہیں بلیک میل کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے آپ ذرا مہربانی کیجئے۔ پھر کہا کہ آپ کے پرچے کی حالت آج کل بہت کمزور ہے اس لیے آپ اُن کی طرف سے یہ پانچ ہزار

روپے کا ہدیہ قبول کیجئے۔ اسے کچھ اور نہ سمجھئے بلکہ یہ آپ کے پرچے کی مدد کے لیے ہے۔ پانچ ہزار روپیہ اس زمانے میں بہت تھا جب میں نے سب صحافیوں کو پیسے پہنچا دیئے تو مجھے بھی حق المحنت کے طور پر بہت پیسے ملے۔ گویا اگر میں نے یہ حرام کام کیا تھا تو اس میں رزق حرام مجھے بھی ملا تھا۔ آج بھی جب میں اس واقعہ کے بارے میں سوچتا ہوں تو ہنستا ہوں کہ میں نے یہ رقم اسی طرح لی تھی جیسے واقعی حق المحنت ہو اور کام بھی اس طرح کیا تھا جیسے واقعی میں کوئی جائز کام کر رہا ہوں۔ کیونکہ میرے دوست حیات ترین نے مجھے Convince کرلیا تھا کہ بات حقیقتاً یہی ہے۔ لیکن بعد کے آنے والے واقعات سے پتہ چلا کہ جو انہوں نے کہا وہ سراسر ایک داستان تھی۔ جیسے دوسرا تھا ویسے ہی یہ تھے اور دونوں فریق اپنی مقصد براری کے لیے روپیہ خرچ کر رہے تھے اور ایک فریق کے فنڈ میں سے پیسہ میرے ہاتھ سے پریس میں تقسیم کیا گیا جس میں سے مجھے بھی میرا حصہ ملا۔ اللہ مجھے بھی بخشے اور ان لوگوں کو بھی بخشے جن لوگوں نے یہ روپیہ کھایا تھا۔

یہ بھی ان دنوں کی بات ہے جب لائل پور کاٹن مل والوں کی جانب سے دہلی اور لائل پور میں مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ان دنوں کاٹن مل والوں کا انڈو پاک مشاعرہ تھا۔ انہی دنوں ہمارے ایک شاعر دوست احمد ریاض تھے جو تپ دق کے مرض میں فوت ہو گئے تھے۔ بہت خوش گو شاعر تھے۔ ان کے بعد ان کے بیوی بچوں کا کوئی ذریعہ آمدن نہیں تھا۔ اس لیے وہاں پر ان کے بیوی بچوں کی امداد کے لیے احمد ریاض بینیفٹ مشاعرہ منعقد ہوا۔

نجانے کس نے شرارت کی تھی کہ جس روز لائل پور میں لائل پور کاٹن مل والوں کا مذکورہ بالا مشاعرہ ہونے والا تھا اسی دن احمد ریاض بینیفٹ مشاعرے کی بھی تاریخ رکھ دی گئی تھی۔ ہمیں پتہ چلا تو ہم نے کہا کہ ٹھیک ہے ہم پہلے ایک طرف پڑھ لیں گے اور پھر دوسری طرف پڑھ لیں گے۔ لیکن ہمارے شاعروں کا کردار بحیثیت مجموعی درست نہیں ہے اور ہم لوگ بہت بے حس آدمی ہیں۔ اس مشاعرے کا جب شاعروں سے کہا گیا تو انہوں نے کہا کہ ہمیں پہلے کاٹن مل والوں سے پوچھنا پڑے گا۔ جب مل والوں سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ ہم تو اس کی اجازت نہیں دیتے کیونکہ آپ تو ہمارے مشاعرے کے لیے

آئے ہیں۔ اب اپنے موقف پر وہ قائم رہے جو وہ مشاعرہ چھوڑ سکتا ہو۔ وہ اچھے خاصے پیسے دیتے تھے جبکہ احمد ریاض کے امدادی مشاعرے میں مفت پڑھنا پڑتا تھا۔

میں نے ایک ترقی پسند شاعر سے کہا جو بہت زیادہ ترقی پسندی کا دعویٰ بھی کرتے تھے تو انہوں نے الٹا مجھے سمجھانا شروع کیا کہ دیکھئے ہمارا تو کاٹن مل والوں سے معاہدہ ہے اور ہم ان کے مشاعرے کے اوقات کے دوران اور کہیں نہیں جاسکتے۔ اس لیے آپ احمد ریاض کے امدادی مشاعرے والوں سے کہئے کہ وہ کل کا دن رکھ لیں تو ہم آجائیں گے۔ میں نے کہا کہ مجھے اس بات کا پتہ ہے اور میرا بھی مل والوں سے معاہدہ ہے لیکن ایک درمیانی راستہ نکل سکتا ہے کہ ہم وہاں جاکر پہلے پڑھ آئیں پھر یہاں آجائیں گے۔ اور پھر اگر ہم مل کر مل والوں سے کہیں گے تو وہ ہماری بات مان بھی سکتے ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ صاحب میں تو سمجھتا ہوں کہ انہیں یہ کہنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ نہ کہیں۔

ایک دوسرے آدمی بھی وہاں تھے جو اچھی طبیعت کے تھے یہ ساحر صدیقی تھے۔ اس سے میں نے کہا کہ تم تو میرا ساتھ دو۔ کچھ نہیں ہوگا۔ اس نے کہا کہ پھر یہاں نہیں پڑھوائیں گے۔ اس لیے میں نہیں جاتا۔ میں نے دو تین اور شاعروں سے بھی کہا لیکن کسی نے میرا ساتھ نہیں دیا اور جس نے میرا ساتھ دیا وہ جمیل ملک تھے جو راولپنڈی سے تعلق رکھتے تھے اور میرے بھائیوں جیسے دوست تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ مل والوں سے بات کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے روی چوپڑا اور ساحی جو کہ مل والوں کی طرف سے مشاعرہ کا انتظام کرتے تھے سے کہا کہ ہمارے ایک شاعر بھائی کا معاملہ ہے اس لیے آپ ہمیں اس مشاعرے میں جانے کی بھی اجازت دے دیجئے۔ ہم وہاں پڑھ کر ایک گھنٹے میں واپس آجائیں گے اور آپ کا مشاعرہ متاثر نہیں ہوگا۔ اور اگر آپ یہ نہیں کرسکتے تو میں تو آپ کا بائیکاٹ کرنے کے لیے تیار ہوں۔

وہ میرے مزاج سے واقف تھے۔ اس زمانے میں میں جو کہتا تھا وہ کرگزرتا تھا اور اپنے ساتھی بھی پیدا کرلیتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ کچھ دوست بھی تھے۔ اس لیے کہنے لگے کہ آپ دونوں چپکے سے چلے جائیں اور وہاں مشاعرہ پڑھ کر آجائیں۔ لیکن باقی لوگوں کو نہ

چھیڑیے۔ میں باقیوں کو ٹٹول چکا تھا اور ان میں سے کوئی بھی وہاں جانے کے لیے تیار نہیں تھا خاص طور پر ساحر صدیقی۔ ہم نے نہ صرف وہاں جا کر مشاعرہ پڑھا بلکہ اپنے پلے سے بھی کچھ پیسے احمد ریاض کے امدادی مشاعرے کے لیے دیئے۔ اور واپس آ گئے۔ ہم نے مل والوں کا مشاعرہ بھی آ کر پڑھا۔ یہاں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔

اس کے بعد ایسا ہوا کہ مری میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں لاہور کے بہت سے شاعر گئے جن میں سے ایک ساحر صدیقی بھی تھے۔ راستے میں بات چلی تو میں نے ساحر صدیقی سے کہا کہ میں اپنی شاعر برادری کو جانتا ہوں کہ وہ کتنے پانی میں ہے لیکن میں نے احمد ریاض کے امدادی مشاعرے کے لیے تم سے بڑی آس لے کر بات کی تھی۔ مگر تم نے انکار کر دیا اور خدا جانے کب کس پر یہ وقت آ جائے اور امداد کی ضرورت آ جائے۔ اس لیے اس وقت سے ڈرنا چاہئے جب انسان کو خود بھی اس کی ضرورت پڑ جائے۔ تو وہ چپ ہو گیا اور کچھ ندامت محسوس کی۔

مری پہنچے تو وہاں مصطفیٰ زیدی صاحب اس کے منتظم تھے جو کہ ڈپٹی کمشنر بھی تھے۔ وہ جب انڈیا سے اپنے وطن سے آئے تھے تو ان کا نام تیغ الہ آبادی تھا اور یہ جوش صاحب کے شاگرد تھے۔ شاعر ہونے کی حیثیت سے لاہور میں ان کا ہمارے ساتھ بھی ملنا جلنا تھا۔ وہ سینئر شاعر ہونے کی وجہ سے ہماری بہت عزت کرتے تھے اور ان کے پاس ایک کیمرہ ہوتا تھا اور انہوں نے سب کی تصویریں لے کر ایک البم بھی بنایا ہوا تھا۔ ایک دن میکلوڈ روڈ پر مجھے ملے تو بڑی عقیدت کا اظہار کیا۔ ادھر ادھر کی کچھ باتیں کیں اور پھر مجھے کہنے لگے کہ آیئے میرے ساتھ پکچر دیکھیے۔ ٹکٹ بھی انہوں نے لیے اور ہم نے پکچر دیکھی۔ انٹرول میں میں نے پوچھا کہ آج کل کیا کر رہے ہو۔ تو کہنے لگے کہ میں اسسٹنٹ کمشنر کی ٹریننگ لے رہا ہوں۔ میں نے پوچھا کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔ کہنے لگے کہ میں نے سی ایس پی کا امتحان دیا تھا اور اس میں کامیابی پر یہ تقرری ہوئی۔ میں نے انہیں دعائیں دیں۔ اس کے بعد بھی وہ ملتے رہے اور ہمیشہ بڑے ادب سے ملتے تھے۔ اس کے بعد ان کی شادی ایک غیر ملکی خاتون بیرا سے ہو گئی۔ بہت اچھی خاتون تھی۔ اس نے شادی کے بعد اُردو بھی سیکھی۔ وہ اتنی

ذہین عورت تھی کہ اس نے یہاں کا کلچر بھی سیکھا اور یہاں کا لباس بھی پہنا۔ جب بھی ہم ان کے گھر جاتے تھے تو یوں نظر آتا تھا جیسے کہ وہ اپنوں ہی میں سے ہے۔

اس کے بعد مری میں مصطفیٰ زیدی صاحب نے ایک مشاعرہ کروایا جس میں شرکت کے لیے میں ساحر صدیقی اور دوسرے شعراء گئے ہوئے تھے۔ توقع یہ تھی کہ جب مری جائیں گے تو مصطفیٰ زیدی اس خلوص سے ملے گا۔ لیکن جب وہاں جا کر ملے تو پروٹوکول ان کے اور ہمارے درمیان آ گیا۔ پھر ان کے پاس وہاں پر ایک وسیع و عریض کوٹھی تھی جبکہ یہ صرف میاں بیوی ہی تھے۔ اگر یہ چاہتے تو سب شاعروں کو اپنے ساتھ ٹھہرا سکتے تھے کیونکہ ان کی کوٹھی میں کئی بیڈروم تھے۔ اس کے برعکس انہوں نے شاعروں کو جس کوٹھی میں ٹھہرایا جو بڑی غیر آباد تھی اور بعد میں پتہ چلا کہ اسے بھوتوں والی کوٹھی کہا جاتا ہے۔ وہاں غسل خانوں میں پانی تک نہیں تھا اور اخبارات وہاں ٹائلٹ پیپر کے طور پر رکھے ہوئے تھے۔ پھر سونے کے لیے بھی عجیب قسم کی چارپائیاں تھیں۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ مصطفیٰ زیدی صاحب نے خود نہیں کیا تھا بلکہ جن لوگوں سے انہوں نے کہا ہوگا انہی کا انتظام تھا۔ مگر اس سے ان کی عدم دلچسپی ظاہر ہوتی تھی۔

یہی حال کھانے کا بھی تھا۔ چنانچہ انہوں نے جن لوگوں سے کھانے کا کہا ہوا تھا انہوں نے بھی کوئی خاص توجہ نہ دی اور شاعروں کو جو کھانا کھلایا گیا وہ اتنا باسی تھا کہ مشاعرے کی رات ہی ساحر صدیقی کو FOOD POISONING ہوگئی۔ باقیوں کو بھی کچھ تکلیف ہوئی لیکن وہ بچ گئے۔ مگر ساحر صدیقی کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ وہ مری سے لاہور کے لیے روانہ ہوا اور راستے میں پنڈی جا کر ہی اس مرض کی وجہ سے فوت ہوگیا۔

عبرت کا مقام یہ ہے کہ ساحر صدیقی نے احمد ریاض کے امدادی مشاعرے میں شرکت نہیں کی تھی لیکن اب ہمیں ان کے لیے امداد کا بندوبست کرنا پڑا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ہم وہاں پر روسا سے ان کی مدد کے لیے چندہ لے رہے تھے تو سامنے سے میاں بشیرالدین آ رہے تھے۔ ان سے کہا کہ یہ واقعہ ہوگیا ہے۔ آپ بھی اس میں کچھ مدد

کریں تو انہوں نے پہلے تو تقریر کی کہ یہ طریقہ بہت غلط ہے۔ کیونکہ شاعر کا تو بہت بلند مقام ہوتا ہے۔ پھر کہنے لگے کہ میری نظر میں تو یہ طریقہ بھیک کے ذیل میں آتا ہے۔ اور جو شاعر مر گیا ہے اس کے لیے بھیک مت مانگئے۔ میں نے کہا کہ پھر کیا کریں کہنے لگے کہ قرض لیجئے اور اپنی جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر دیتے ہوئے کہنے لگے کہ یہ پچاس روپے میری طرف سے قرض رکھئے۔ میں نے کہا اس قرض کی واپسی کا مطالبہ آپ مرنے والے سے کریں گے یا ہم سے۔ کہنے لگے کہ مجھ بہر حال یہ طریقہ پسند نہیں ہے اور پچاس روپے کا نوٹ چھوڑ کر چلے گئے۔ ہم نوٹ نہ رکھ سکے اور نہ لوٹا سکے۔ میرے ساتھیوں نے کہا کہ یار چپ کر کے رکھ لو۔

غرضیکہ ساحر صدیقی اپنے ایک ساتھی شاعر کی وفات کے بعد ان کے امدادی مشاعرے میں نہیں گئے تھے۔ اور ان کی وفات سے چند گھنٹے قبل میں ان کے ساتھ یہی باتیں کر رہا تھا کہ وہ خود بھی فوت ہو گئے اور اب ساحر کی امداد کے لیے ہمیں یہ سب چندہ اکٹھا کرنا پڑ رہا تھا۔ اگر انسان محسوس کرے تو جگہ جگہ عبرت کے مقام موجود ہیں۔

مری کے مشاعرے کے بعد ہماری ملاقات مصطفیٰ زیدی سے جہلم کے مشاعرے میں ہوئی۔ یہ ان دنوں جہلم کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ اس مشاعرے میں حفیظ جالندھری، صوفی تبسم، احمد ندیم قاسمی، احسان دانش اور دوسرے سینئر شعراء کے علاوہ نوجوانوں میں سے ہم لوگ جو پاکستان کی کریم تھے شریک ہوئے۔ اس بار وہاں پر مشاعرے میں قیام و طعام کا مناسب انتظام تھا کیونکہ وہاں کچھ باذوق لوگ بھی موجود تھے۔ مصطفیٰ زیدی وہاں موجود نہیں تھے۔ اچانک پتہ چلا کہ ڈی سی صاحب تشریف لا رہے ہیں آپ لوگ اس ہال میں موجود رہیں۔ چنانچہ ہمیں ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا۔ ہم تو مصطفیٰ زیدی کا انتظار کر رہے تھے لیکن جب دیکھا تو وہ ڈی سی صاحب نکلے۔ اور وہ ایک بیوروکریٹ کے مخصوص انداز میں سر ہلا کر خیریت دریافت کرتے ہوئے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچے۔ سب نے محسوس کیا کہ انہوں نے ٹھیک طرح سلام نہیں لیا۔

اس سے پہلے مری میں جب ساحر صدیقی غلط خوراک کی وجہ سے فوت ہو گیا تھا تو

اس وقت سے سب لوگ ان سے جلے ہوئے تھے کیونکہ انہوں نے غلط جگہ ٹھہرایا تھا اور کھانا بھی ٹھیک نہیں دیا تھا اور جب ساحر صدیقی فوت ہوگیا تو سب شاعروں نے اس کی وفات پر زیدی کے بارے میں مل کر ایک نظم کہی تھی جس میں سب نے چندے میں شعر کہے تھے۔ جواب بھی اظہار ناراضگی کے طور پر ریکارڈ پر موجود ہے۔

چنانچہ جب یہاں جہلم میں بھی انہوں نے ایسا ہی سلوک کیا تو اکثر شعراء ان سے ناراض ہوگئے اور انہوں نے کہا کہ اس سے راہ ورسم اب نہیں رکھنا۔ یہ شاعر تو رہا نہیں بلکہ یہ تو اب سیدھا افسر بن گیا ہے۔ آگے معاملہ بڑھا تو ملتان میں میرے ایک دوست کی گراموفون کمپنی کی ایجنسی ہے۔ میں اس کے پاس بیٹھا تھا تو دیکھا کہ اس کے اندر جھانکتے ہوئے مصطفیٰ زیدی آ گئے۔ میں نے بھی دیکھا تو کہنے لگے کہ ارے قتیل بھائی آپ کہاں ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کہاں۔ میں نے انہیں اندر بلایا تو کہنے لگے کہ میں لیہ میں ڈپٹی کمشنر ہوں۔ مجھے اس کا پہلے سے پتہ تھا لیکن ذہن میں تلخی تھی۔ پھر کہنے لگے کہ یہاں کیا کر رہے ہیں چلئے میرے ساتھ۔ چل کر کہیں کھانا کھاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ سے ہم بہت کھانا کھا چکے اور پہلے بھی ایک بار مری میں آپ سے کھانا کھایا تھا اور اس وقت وہاں ایک شخص ساحر صدیقی بھی موجود تھا اور اس کے ساتھ جو ہوا وہ آپ جانتے ہیں۔ کہنے لگے کہ ان باتوں کو چھوڑیئے۔ مجھے احساس ہے کہ مجھ سے کچھ غلطیاں ہوئی ہیں لیکن چل کر اب کھانا کھاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اگر آپ پسند کریں تو کھانا یہیں ہمارے ساتھ کھائیں۔ میں نے انہیں اپنے اس دوست حبیب فاضلوی سے ملوایا جو آج کل نوائے وقت میں بہت چھوٹا سا کام کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ اچھا اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو یہیں کھانا کھاتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ہمارے ساتھ وہیں کھانا کھایا۔

کھانے کے بعد میں نے کہا کہ آپ کو ہو کیا گیا تھا۔ کہنے لگے کہ مجھے شرمندہ نہ کیجئے۔ اگر آپ میری جگہ ہوں اور آپ کو بھی شاعر سے ڈی سی بنا دیا جائے تو آپ بھی ایسے ہی ہو جائے گا۔ لیکن بہرحال میں مری اور جہلم والے واقعات سے شرمندہ ہوں۔ اب آپ مجھے مزید شرمندہ نہ کریں۔ پھر کہنے لگے کہ اب میں یہاں لیہ میں مشاعرہ کروا رہا

ہوں جس میں جوش صاحب کو اور باقی سب شعراء کو بھی بلوا رہا ہوں اور آپ بھی ضرور آیئے۔ میں نے کہا کہ اس مشاعرے میں اب کوئی نہیں آئے گا۔ جوش صاحب البتہ آجائیں گے کیونکہ وہ آپ کے استاد ہیں۔ اس بات چیت سے انہیں حالات کا اندازہ ہوگیا۔ چنانچہ انہوں نے جاکر فرداً فرداً سب سے معافی مانگی اور خدا کا شکر ہے کہ ڈپٹی کمشنر کے اندر چھپا ہوا شاعر پھر سے باہر نکل آیا اور اس کے بعد لیہ میں جب مشاعرہ ہوا تو اس میں انہوں نے واقعی چھوٹے بھائیوں کی طرح سلوک کیا اور سب شاعروں کی خوب تواضع کی۔ یوں ان کے اندر چھپا ہوا ایک صاف ستھرا انسان اور ایک مخلص دوست ہمیں پھر سے مل گیا۔

لیہ کے اس مشاعرے میں جاتے ہوئے راستے میں ایک لطیفہ ہوا۔ ظہیر کاشمیری اور حبیب جالب میں مسلسل مذاق چل رہا تھا۔ ظہیر کاشمیری مذاق میں حبیب جالب پر سوار تھے۔ یہ مذاق جاری تھا کہ راستے میں ایک نہر آئی۔ شام کا وقت تھا سب نے کہا کہ چلو اس نہر پر تھوڑی دیر رک کر ریسٹ کرتے ہیں۔ جالب نے کہا کہ دوستو بات سنو! اور ظہیر صاحب آپ بھی سنئے۔ پھر کہنے لگے کہ سب لوگ ہاتھ اٹھا کر دعا کریں کہ میری تمنا پوری ہو۔ سب نے ہاتھ اٹھائے اور دعا کی کہ یا خدا اس کی تمنا پوری کر۔ پھر سب نے پوچھا کہ تمہاری تمنا کیا ہے۔ تو جالب کہنے لگے کہ میری تمنا یہ ہے کہ زندگی میں ایسے کئی دن آئیں۔ اسی طرح شام کا سہانا وقت ہو، دریا کا خوبصورت کنارہ ہو، سبزہ زار ہو، پھول کھلے ہوں، پرندے چہچہا رہے ہوں اور ہم سب دوست بیٹھے ہوں لیکن یہ ظہیر کاشمیری موجود نہ ہو۔ ان کے اس مذاق پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ لیکن ظہیر کاشمیری کی کیفیت دیکھنے والی تھی۔ ہر چند کہ وہ بہت زندہ دل آدمی ہیں لیکن لمحاتی طور پر ان کی کیفیت ذرا مختلف ہوگئی۔ پھر اس کے فوراً ہی بعد بھی قہقہوں میں شامل ہوگئے۔ اور یوں جالب صاحب نے ظہیر کاشمیری سے بہت سے مذاقوں کا بدلہ ایک ہی مذاق میں لے لیا۔

شاعر سربراہ ادارہ

میں پہلے کہیں عرض کر چکا ہوں کہ میری ادبی تربیت امام باڑے میں ہوئی ہے اور مذہبی تربیت مسجد اہل حدیث میں۔ میرا بچپن زیادہ تر ہمارے گھر کے قریب واقع مسجد میں گزرا ہے۔ وہاں پر جو مسئلے مسائل بیان ہوتے تھے مجھ پر ان کا اثر یہ تھا کہ میں ظلم ہوتے ہوئے نہیں دیکھتا تھا خواہ یہ ظلم اپنے اوپر ہو یا کسی اور کے اوپر۔ اسی طرح امام باڑے میں بھی حضرت امام حسین کی شہادت اور کربلا کے واقعات اور یزید کے ظلم وستم کے واقعات سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے وہ بھی یہی تھا کہ ظلم خواہ کسی پر ہو نہیں ہونا چاہئے۔ یہ تو بڑے واقعات ہیں ان کا میرے چھوٹے سے ذہن پر اثر یوں ہوا کہ اگر کوئی زور آور لڑکا کسی کمزور لڑکے کو مار رہا ہو تو میرا اس کمزور لڑکے سے تعلق ہو نہ ہو میں اس کی طرف سے بول پڑتا تھا اور اس طاقتور لڑکے سے جنگ مول لے لیتا تھا۔

میرا یہ مزاج بچپن سے ہی ایسا بن چکا تھا اور جوانی میں بھی میں ایسا ہی رہا۔ ایک دن ہم رائل پارک میں پاک ایشیا ریسٹورنٹ کے باہر بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے علاوہ وہاں پر موجد اور عالم علی سید موجود تھے۔ ہم کھانا کھا رہے تھے کہ ایک انگریزی سوٹ پہنے ہوئے صاحب اچانک ہی اٹھ کر اس چھوٹے سے بچے کو مارنے لگے جو ان کی میز پر کھانا سجا رہا تھا۔ پتہ چلا تو بات اتنی تھی کہ وہ ان کی بات مان کر پہلے پانی نہیں لا رہا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ نے اسے مارا کیوں ہے۔ اس سے معافی مانگئے۔ وہ کہنے لگے کہ آپ کون ہوتے ہیں اس معاملے میں دخل دینے والے۔ بس پھر مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں نے ان صاحب کی خوب اچھی طرح پٹائی کی۔ بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے اور انہوں نے میرا ہی ساتھ دیا

کہ اگر بچے نے پانی لیٹ دیا ہے تو اس میں مارنے والی کیا بات ہے۔ میرا ان دنوں ایسا ہی مزاج بنا ہوا تھا۔

آگے چل کر جب مجھے رائٹرز گلڈ کی سیکرٹری شپ ملی تو اس زمانے میں مجھے ادیبوں کی مدد کرنے کا موقع ملا۔ جب کہیں کسی ادیب کے ساتھ زیادتی ہوتی تو میں بول اٹھتا۔ ریڈیو پاکستان سے ایک فرمائشی پروگرام اس وقت بھی چلتا تھا جب میں رائٹرز گلڈ کا سیکرٹری نہیں تھا۔ اس پروگرام میں درجنوں فرمائش کرنے والوں کے نام نشر کئے جاتے تھے اور اس کے بعد گلوکار اور موسیقار کا نام بتا کر نغمہ سنا دیا جاتا تھا لیکن شاعر کا نام نہیں آتا تھا کہ یہ گیت کس کا لکھا ہوا ہے۔ ان کے اس سلوک کی وجہ سے مجھے بہت غصہ آتا تھا میں سمجھتا تھا کہ پورے گانے کی بنیاد جس چیز پر ہے وہ شاعری ہے۔ کیونکہ پہلے شاعر نے گیت لکھا تو پھر اس کی دھن بنی، اسے گایا گیا اور سامعین نے اس کی فرمائش کی لیکن شاعر کا نام ہی نہیں دیا جا رہا۔ اس سلسلے میں پہلے تو میں مقامی طور پر جھگڑا کرتا رہا۔ پھر اس کے بعد میں سنٹر سے بھی کوشش کرتا رہا۔ اس دوران دو تین ڈائریکٹر جنرل بھی تبدیل ہوئے لیکن کوئی شنوائی نہیں ہو رہی تھی۔ ان دنوں ریڈیو کا ہیڈ آفس کراچی میں ہوتا تھا۔ میں دو بار پہلے بھی اپنے خرچ پر اسی مسئلے کے لیے کراچی جا چکا تھا۔ جب میں تیسری بار وہاں گیا تو ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر رشید صاحب تھے انہی نے میرے خط کے جواب میں مجھے وہاں بلوایا تھا۔ میں وہاں گیا تو انہوں نے اپنے متعلقہ اہلکاران کو بلوا کر ان کے ساتھ میری میٹنگ کروائی اور ان سے پوچھا کہ قتیل صاحب کو یہ بتائیں کہ فرمائشی فلمی گانے کے ساتھ شاعر کا نام کیوں نہیں آتا۔ وہ کہنے لگے کہ وقت کا مسئلہ ہے کیونکہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہوتا ہے۔ مجھ بے حد غصہ آیا۔ اس زمانے میں میں غصے سے آپے سے باہر ہو جایا کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے برا بھلا کہہ کر کہا کہ آپ فرمائش کرنے والوں کے تو پچیس نام سنا دیتے ہیں جن کا اس نغمے کی تخلیق کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن جو شخص اس نغمے کی تخلیق کرتا ہے اس کا ایک نام نہیں لیتے اور کہتے ہیں کہ وقت کم ہوتا ہے۔ اگر آپ فرمائش کرنے والوں میں سے صرف ایک نام کم لیں تو شاعر کا نام آجاتا ہے۔ بلکہ میں نے یہاں تک کہا کہ وقت کم

ہونے کی دلیل دیتے ہوئے آپ مجھے بڑے احمق انسان نظر آ رہے ہیں اور آپ کو ایسی دلیل دیتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ ڈائریکٹر جنرل میرا نکتہ سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے مجھے ٹھنڈا کیا اور پھر خود ان پر گرم ہو گئے۔ اور کہنے لگے کہ قتیل صاحب اس مسئلہ کے لیے پچھے دو تین سال سے جدوجہد کر رہے ہیں اور کیا آپ لوگوں نے اس چھوٹی سی بات کے لیے اس معاملے کو لٹکا رکھا تھا۔ انہوں نے اسی دن تمام ریڈیو سٹیشنوں کو پالیسی کے طور پر خط لکھا کہ آئندہ نغمے کے ساتھ شاعر کا نام ضرور دیا کریں۔ چنانچہ اس کے بعد فلمی فرمائش کے ساتھ شاعر کا نام بھی آنے لگا۔

یہ خبر شمع دہلی میں شائع ہوئی جو اس وقت پاکستان کو بھی کوریج دیتا تھا۔ ساحر لدھیانوی بھی انڈیا میں اس مسئلہ کے لیے کوشاں تھے کیونکہ وہاں بھی یہ زیادتی ہو رہی تھی۔ ساحر لدھیانوی نے ''شمع'' میں یہ خبر پڑھی تو انہوں نے وہاں بھی اس خبر کا حوالہ دے کر جنگ لڑی اور بالآخر انڈیا میں بھی فلمی گانوں کی فرمائش کے ساتھ شاعر کا نام آنا شروع ہو گیا۔ اور پھر ''شمع'' نے اسی حوالے سے اپنا اداریہ بھی لکھا تھا۔ اس وقت شمع میں اداریہ بھی آتا تھا۔

وہ مسئلہ تو ہم نے اس وقت حل کروا دیا تھا لیکن یہ الگ بات ہے کہ وہ لوگ جو حرام کی تنخواہیں کھاتے ہیں اب بھی شاعر کا نام چھوڑ جاتے ہیں۔ اس سے ایک تو یہ نقصان ہوتا ہے کہ ریڈیو کی اپنی وضع کردہ پالیسی کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور دوسرا شاید ریڈیو والوں کو پتہ نہیں ہے کہ وہ کاپی رائٹ ایکٹ کی بھی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اگر کوئی شاعر ان پر مقدمہ کر دے تو وہ مواخذے کے لائق ہیں کیونکہ اس ایکٹ کے تحت مصنف کے نام کا حوالہ دیئے بغیر اس کی کوئی بھی چیز استعمال نہیں کی جا سکتی۔ تیسرا نقصان یہ ہے کہ نام نہ لینے کی وجہ سے وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ رائلٹی رجسٹر میں بھی شاعر کے نام کا اندراج ہونا ہوتا ہے اور اگر اس رجسٹر میں اس کا نام درج نہیں ہوگا تو وہ اپنی رائلٹی سے بھی محروم ہو جائے گا۔ یہ سلسلہ اب بھی چل رہا ہے لیکن میں اب اس سلسلے میں تھک چکا ہوں چونکہ میں نے اپنی برادری کے لیے ساری زندگی جو جدوجہد کی ہے اس میں دیکھا ہے کہ جب میں

نے شاعر کا نام دلوانے والا معرکہ سر کیا تو مجھے ایک بھی مبارکباد نہیں آئی تھی۔ اور جب میں نے ان جھگڑوں میں کئی بار ریڈیو کا بائیکاٹ کیا یا ریڈیو نے میرے نغموں پر پابندی لگائی تو کہیں سے بھی کوئی میری ہمدردی کے لیے آگے نہیں بڑھا۔ اگر زیادہ سے زیادہ کسی نے کہا تو یہ کہ اگر ملاقات ہوئی تو زبانی طور پر واہ واہ کردی اور کہا کہ آپ بہت اچھا کام کررہے ہیں۔ اب بھی ایسی خلاف ورزیاں ہورہی ہیں لیکن اب میں اگر زیادہ سے زیادہ کچھ کرتا ہوں تو خود بائیکاٹ کردیتا ہوں۔

برادری کے لیے لڑنے کی میری عادت ایسی ہے کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کبھی کبھی ایسا مسئلہ آجاتا ہے۔ ۱۹۸۷ء کی بات ہے کہ ٹیلیویژن پر شاعروں کے نغموں کے ساتھ ان کا نام نہیں آتا تھا جبکہ پروڈیوسر کا نام ضرور آتا تھا۔ اس کے علاوہ گلوکار کا نام بھی آجاتا تھا جو خود سکرین پر نظر بھی آرہا ہوتا تھا لیکن شاعر کا نام نہیں دیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں میں نے متعدد بار اس وقت کے مینجنگ ڈائریکٹر ضیاء جالندھری سے بات کی جو اتفاق سے شاعر بھی تھے۔

میرا تجربہ یہ ہے کہ جس ادارے کا سربراہ شاعر ہوگا اور وہ اندرونی طور پر یہ محسوس کر رہا ہو کہ اسے جتنی شہرت ملنی چاہئے وہ نہیں ملی تو وہ انتقام پر اتر آئے گا اور اس کا بدلہ دوسرے شاعروں سے لے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حضرت ضیاء جالندھری شاعروں سے بدلہ تو لے ہی رہے تھے کیونکہ ان کے گیتوں کے ساتھ ان کے نام نہیں دیتے تھے لیکن انہوں نے میرے ساتھ یہ کیا کہ ٹیلیفون پر یہ حکم صادر کردیا کہ میرے گیتوں پر بین ہے۔ جب مجھے اس بات کا پتہ چلا تو میں نے پریس کانفرنس کر کے ان کی باتوں کا جواب دیا۔ جس کے بعد انہوں نے پابندی اٹھادی۔

میں نے دلیل کے طور پر پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ شاعروں کے ساتھ زیادتی یوں ہورہی ہے کہ اگر کسی اور کا نغمہ ہو تو اس کے ساتھ شاعر کا نام نہیں آتا لیکن جب حضرت ضیا جالندھری اہتمام کے ساتھ اپنا نغمہ ٹیلی کاسٹ کرواتے ہیں تو نغمہ شروع ہونے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی ان کا نام دیا جاتا ہے۔ میری اس پریس کانفرنس کے بعد مجھ سے

پابندی تو اٹھ گئی لیکن ان ضیاء صاحب کی کچھ ایسی سنی گئی کہ تقریباً اسی افراد نے ایک معذرت نامے پر دستخط کئے جس میں مارشل لاء حکومت سے کہا گیا تھا کہ وہ سندھ میں تشدد بند کرتے ہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں مشرقی پاکستان جیسے حالات پیدا ہو جائیں۔ ادھر اس معذرت نامے کا چھپنا تھا ادھر ضیاء صاحب کو موقع ملا اور انہوں نے مجھے اور باقی لوگوں کو ٹیلیویژن پر بین کر دیا۔ اور میرے سلسلے میں تو انہوں نے خاص طور پر کہہ دیا کہ جب تک میں ٹی وی پر ہوں قتیل شفائی نہیں آ سکتا۔ انہوں نے میرے خلاف یہ سب کچھ ذاتی سطح پر لے کر اسے انا کا مسئلہ بنا لیا اور یہ نہیں سوچا کہ یہ ایک جائز بات ہے اور اسے مان لینا چاہئے۔ کیونکہ وہ بھی ماشاء اللہ شاعر تھے اور میں اسی لیے کہتا ہوں کہ خدا کسی شاعر کو کسی محکمے کا سربراہ نہ بنائے۔

عمرہ کی سعادت

مکہ اور مدینہ دو ایسی سرزمینیں ہیں کہ جب تک وہاں سے بلاوا نہ آئے کوئی وہاں پہنچ نہیں سکتا اور جب بلاوا آ جائے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی۔ یہ ایک عام مسلمان کا ایمان ہے۔ یہ سنا تھا لیکن کبھی اس کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ ہوا یوں کہ ناروے میں ایک مشاعرہ تھا۔ پروگرام یوں بنا تھا کہ ناروے سے واپسی پر میں کچھ دن کے لیے انگلینڈ میں ٹھہروں گا جہاں میرا بیٹا اور بیٹی مقیم ہیں جہاں سے میرا ضمیر جعفری صاحب کے ساتھ کچھ ایسے ملکوں کی سیر پر جانے کا پروگرام بنا تھا جو ہم نے پہلے نہیں دیکھے تھے۔ چنانچہ میں اور ضمیر جعفری صاحب ناروے کے مشاعرے سے فارغ ہو کر انگلینڈ پہنچے۔ ضمیر جعفری صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آئندہ پروگرام پر قائم ہو۔ اس وقت تک میں ان سے پوری طرح متفق تھا اس لیے پھر ہاں کر دی۔

لیکن رات کچھ ایسا ہوا کہ مجھے بہت دیر تک نیند نہیں آ رہی تھی اور پھر وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ نیند کیوں نہیں آ رہی۔ ایسے موقعوں پر جب کہ شعر کی آمد ہونے والی ہو تو مجھ پر یہ کیفیت رہتی ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ شاید کچھ اشعار صفحہ قرطاس پر آنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے لائٹ جلائی اور کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا۔ مگر کوئی شعر وارد نہ ہوا۔ اور وہ رات بے چینی میں کٹی۔ دو تین گھنٹے کے لیے بمشکل سو سکا مگر پھر بھی تھکاوٹ دور نہ ہوئی۔ جب میں جاگا تو صبح ذہن میں یہ بات تھی کہ مجھے عمرہ کرنے کے لیے سعودی عرب جانا چاہیے۔

خواب تو مجھے کوئی نہیں آیا اور نہ میں خوابوں کا قائل ہوں۔ البتہ اپنے اندر سے یہ آواز آ رہی تھی کہ عمرے کے لیے جانا چاہیے۔ ناشتہ کر چکا تو ضمیر جعفری صاحب کا ٹیلیفون آیا اور انہوں نے پوچھا کہ پہلے کہاں جایا جائے۔ میں نے کہا کہ جعفری صاحب میرا پروگرام بدل گیا ہے۔ کہنے لگے کہاں جانا ہے۔ میں نے کہا کہ میں تو عمرہ کرنے کے لیے جا رہا ہوں۔ وہ کہنے لگے کہ اس سے اچھی کیا بات ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم پہلے پروگرام کے مطابق کچھ ممالک کی سیر کر آئیں پھر آپ عمرہ کے لیے چلے جایئے گا۔ میں نے کہا کہ نہیں جی اس پھیرے میں تو یہی ایک کام ہو گا۔ اور میں لندن سے اب وہیں جاؤں گا۔ چنانچہ انہوں نے بخوشی اجازت دیدی اور وہ اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ جمیل الدین عالی بھی ان دنوں وہیں پر تھے اور ہمارے ساتھ ہی ناروے سے واپس آئے تھے۔ ان کے بینکوں کا سلسلہ کئی ممالک میں پھیلا ہوا تھا اس لیے میں نے ان سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ میں ٹیلیفون کر دیتا ہوں اور مکہ معظمہ میں آپ کے ٹھہرنے کا بندوبست ہو جائے گا۔ پھر وہاں آپ کے کئی جاننے والے بھی مل جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے بات کی۔

اس کے بعد میں لندن میں پاکستانی سفارت خانے میں گیا اور وہاں اپنے دوستوں سے کہا کہ مجھے سعودی عرب کے ویزا کی ضرورت ہے۔ انہوں نے اسی وقت بیٹھے بیٹھے ویزا بنا دیا اور یوں ایک رات پہلے کی کیفیت نے اپنا راستہ نکالا اور منزل کا رخ بتا دیا۔ چنانچہ میں گلاسگو جہاں پر میرے بچے ہیں وہاں سے ہو کر جہاز کے ذریعے سعودی عرب روانہ ہو گیا۔ جدہ میں قیام ہوا اور وہاں پر میں نے نیشنل بینک والوں کے مہمان خانے میں قیام کیا۔ وہیں پر مجھے احرام بھی مہیا کر دیا گیا جو میں نے باندھ لیا۔ اور اس کے بعد عمرہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس میں تقریباً سبھی مناسک حج والے ہیں صرف یہ ہے کہ میدان عرفات وغیرہ کا طواف نہیں کیا جاتا۔

میں نے وہاں خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ اس زمانے میں وہاں اتنا رش نہیں تھا کیونکہ حج کے زمانے میں جتنا رش ہوتا ہے اس کے بعد عمرے کے دوران اتنا رش نہیں ہوتا۔ چنانچہ

میں نے اطمینان سے عمرہ کیا اور جو جو فرض ضروری تھا وہ پوری دلجمعی سے ادا کیا اور میرے سینے میں ایک روشنی بھر گئی۔ میں نے اپنے اندر ایک نئی قوت محسوس کی جس کو قوت ایمانی کہا جاسکتا ہے۔ لطف اس بات کا آتا رہا کہ وہ آب زمزم جس کے چند قطرے ہم تبرکاً لے کر پورے پورے مٹکوں میں ڈالتے ہیں اور اسے بڑی احتیاط اور ادب سے استعمال کرتے ہیں وہاں اس کی افراط دیکھی۔ جس مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے تھے اس میں جتنا پانی تھا وہ زمزم کا تھا اور وہاں آب زمزم ہی سے غسل بھی کیا۔ اب یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ ہمارے جسموں میں جتنی غلاظتیں ہوتی ہیں وہ آب زمزم سے بھی دھل سکی ہیں یا نہیں۔ لیکن وافر پانی سے میں نہایا اور خدا کا شکر ادا کیا۔

اس کے بعد دوسرے دن فلائنگ کوچ سے مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوا۔ وہاں بھی نیشنل بینک والوں نے میرا بندوبست کیا ہوا تھا۔ وہاں پہنچا تو عربی لباس میں ملبوس ایک شخص کو اپنا منتظر پایا میں تھوڑا سا گھبرایا کہ ان لوگوں نے ایک عرب کو میرے استقبال کے لیے بھیج دیا ہے۔ سوچا کہ چلو جو تھوڑی بہت انگریزی آتی ہے اسی سے اس سے بات کر لوں گا۔ اس شخص نے خالص عربی انداز میں مجھے اہلاً وسہلاً مرحبا کہا۔ جب میں نے اس سے انگریزی میں بات کرنی چاہی تو اس نے خالص اُردو زبان میں کہا کہ آپ کا سفر ٹھیک گزرا۔ میں نے سکھ کا سانس لیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ''زبان رمن عربی ومن عربی نمی دانم'' والا معاملہ نہیں بنا۔ اس نے وہاں سے مجھے ساتھ لیا اور مجھے ایک ایسے گھر میں لے گیا جس کا اندر کا نقشہ مانوس سا تھا۔ پتہ چلا کہ وہ گھر پشاور کے رہنے والے ایک صاحب سیٹھی کا ہے۔ مزید گفتگو سے پتہ چلا کہ میرے دوست یوسف شاد جو پشاور کے رہنے والے ہیں یہ ان کے کزن ہیں۔ اور جب انہوں نے میرا سنا تو مہمان خانے کی بجائے میرے قیام کا بندوبست اپنے گھر میں کیا۔ یوں میں مدینہ منورہ میں اپنے ہی ایک دوسرے گھر میں قیام پذیر ہوا۔

یہ گھر مسجد نبویؐ سے بہت قریب تھا۔ میں نے اس کے بعد کی نماز مسجد نبوی میں جا کر ادا کی۔ مسجد نبوی ہی میں روضہ رسول پر حاضری دی۔ اس طرح میں وہاں پر جو ایک دو دن

قیام پذیر رہا اپنی سب نمازیں جا کر مسجد نبوی ہی میں ادا کیں۔ اس دوران وہاں جمعتہ الوداع بھی آیا۔ وہ بھی میں نے مسجد نبویؐ ہی میں گزارا اور عبادت کی۔

میں نے وہاں یہ بات دیکھی کہ وہاں آنے والے مختلف لوگوں کے مسلک مختلف تھے۔ اور سب مختلف انداز سے نماز پڑھ رہے تھے۔ کسی نے ہاتھ چھوڑے ہوئے تھے اور کسی نے ہاتھ باندھے ہوئے تھے کوئی اونچی آواز سے آمین کہتا اور کوئی نیچی آواز سے۔ اس کے باوجود جب جماعت کے بعد لوگ آمین کہتے تو اس میں ایک ایسی موسیقیت تھی کہ جی چاہتا تھا کہ میں بھی اونچی آواز سے آمین کہوں۔ پہلی مرتبہ جب میں نے نماز ادا کی تھی تو میں نے بھی منہ ہی میں آمین کہا تھا لیکن دوسری بار میں بھی اونچی آواز سے آمین کہنے والوں میں شامل ہوگیا تھا۔ وہ آمین ٹیون کا ایک خوبصورت ٹکڑا بن گیا تھا۔

وہاں پر میں یہ سوچتا رہا کہ اگر دنیا بھر کے یہاں آئے ہوئے مسلمان ایک ہی امام کے پیچھے اپنے اپنے طریقے سے نماز پڑھ سکتے ہیں تو اپنے ممالک میں جا کر ان پر کیا مصیبت آپڑتی ہے کہ یہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور اپنی اپنی چار اینٹ کی مسجد علیحدہ علیحدہ بنا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور لڑائی مار کٹائی اور دنگا فساد بعض اوقات طریق نماز یا یارسول اللہ کہنے پر ہی ہو جاتا ہے۔ جبکہ مسجد نبوی میں کس قدر امن و امان اور اتحادِ اسلامی یا اتحادِ انسانی کی کیفیت ہوتی ہے۔

وہاں پر اتنی نورانی اور پرسکون فضا تھی کہ جی چاہتا تھا کہ نماز ختم نہ ہو لیکن وہاں نماز طویل نہیں تھی۔ اذان سے پہلے ہمارے ہاں جو صلوٰتیں پڑھی جاتی ہیں وہ بھی وہاں پر نہیں تھیں اور آج کی مصروف دنیا کو سامنے رکھ کر یوں لگتا ہے کہ انہوں نے اس حوالے سے سارے انتظامات کر رکھے تھے اور انکی عبادات میں کوئی چیز غیر ضروری نہیں تھی۔ یہ نہیں کہ آپ کی نماز میں تھک کر کھڑے کھڑے ٹانگیں ہی کانپنے لگیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ایسے ہی ہونا چاہئے۔ حالانکہ یہ جمعتہ الوداع تھا لیکن اس کے باوجود جمعہ کی نماز اور دیگر چیزیں صرف آدھ گھنٹے میں ختم ہوگئی تھیں۔

اس سے جب میں یہاں کی مساجد کا موازنہ کرتا ہوں اور بالخصوص اپنے محلے کی مسجد

کا موازنہ کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ ہمارے یہاں جمعہ کے روز بارہ بجے دوپہر سے ہی بچوں کے ہاتھ میں مسجد کا سپیکر دے دیا جاتا ہے جو اپنی بھونڈی آوازوں میں غلط سلط نعتیں پڑھتے رہتے ہیں۔ اور لاؤڈ سپیکر کی آواز پوری چھوڑی ہوتی ہے۔ انہیں یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ قرب و جوار میں کوئی مریض بھی ہوسکتا ہے۔ یا پھر کوئی بچہ سویا ہوسکتا ہے یا کسی کو ذہنی کام کرنا یا امتحان دینا ہوسکتا ہے۔ لیکن انہیں کسی کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔ یہ لاؤڈ سپیکر کا بے دریغ استعمال کرتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد جب مولوی صاحب کے ہاتھ میں سپیکر آتا ہے تو انہیں یہ خیال ہی نہیں ہوتا کہ ان کے سامنے لاؤڈ سپیکر ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کم آواز کو بلند کرنے والا آلہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں نے خود ہی اونچی بولنا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے پھیپھڑوں کا پورا استعمال کر کے تقریر کرتے ہیں اور وہاں غوغے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بارہ بجے دوپہر سے شروع کیا ہوا ان کا شغل اڑھائی بجے کہیں جا کر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ اللہ کا ذکر بھی لاؤڈ سپیکر پر شروع کرتے ہیں جو تقریباً آدھا گھنٹہ جاری رہتا ہے۔ گویا تین گھنٹے اسی معاملے میں یہ لے لیتے ہیں جبکہ مسجد نبوی میں آدھ گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لیا جاتا۔

اگر انہیں کہا جائے کہ بھائی اس کی تقلید کرو جو مسجد نبویؐ اور روضہ رسولؐ پر ہوتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی اس مسجد کی توہین ہو رہی ہے اور وہ اسے مداخلت فی الدین قرار دیتے ہیں۔ اگر میرے جیسا کوئی آدمی یہ بات کرے گا تو اسے سرخا کہا جائے گا اور اگر کوئی آدمی مجھ سے ذرا کم ہوگا تو اسے کم از کم بھی وہابی کہا جائے گا۔

وہاں خانہ کعبہ میں طواف کرتے ہوئے بھی میرے اندر ایک کیفیت تھی مگر وہ خدا تعالیٰ کی عظمتوں اور بلندیوں کی کیفیت تھی۔ مگر یہاں جب کوئی مسجد نبوی اور روضہ رسولؐ پر آتا ہے تو ضرور روتا ہے۔ میں نے اپنے سمیت یہاں آنے والا کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو یہاں آ کر آبدیدہ نہ ہوا ہو۔ یہ آنسو یقیناً خوشی کے ہوتے ہیں لیکن ان کے پس منظر میں وہ مناظر ہوتے ہیں جو تاریخ میں درج ہیں اور قدم قدم پر احساس ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نے یہاں یہ کہا تھا یا یہاں یہ ارشاد فرمایا تھا۔ دوسرے لفظوں میں تمام تاریخ آنکھوں کے سامنے

گھوم جاتی ہے۔ اور محسوس ہوتا ہے کہ اس عظیم قائد نے کتنی جاہل قوم کو ایک لڑی میں پرو کر کتنا مشکل کام سرانجام دیا۔ یہ اتنا بڑا کام ہے کہ ان کے علاوہ کوئی اور شخص یہ کام انجام دے ہی نہیں سکتا تھا۔

مہذب قوموں میں ریفارمر کا آ جانا ایک اچھی بات ہے۔ لیکن باقی مصلحین کو جو قومیں ملیں وہ مہذب تھیں اور ان کے لیے بڑی سہولتیں تھیں۔ مگر رسول اکرم کو جو ملک، قوم اور آب و ہوا ملی وہ بہت اور طرح کی تھیں۔ وہ انتہائی ابتری والی تھیں۔ ان حالات کو بدلنے کے لیے صرف رسول اکرمؐ کی ضرورت تھی۔ ان کے علاوہ کوئی ان حالات کو ٹھیک کر ہی نہیں سکتا تھا۔ آج اس ترقی یافتہ دور میں جب ہم ان واقعات کو سوچتے ہیں تو کم از کم میرے چھوٹے سے ذہن میں تو یہی بات آتی ہے کہ جو کارنامہ محمد عربی نے اس سرزمین پر کر دکھایا اس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اب تو معالات بدل گئے ہیں۔ نہ کوئی نیا مذہب آنا ہے اور نہ ہی کوئی پیغمبر آنا ہے لیکن آج کے دور میں اگر کوئی سیاسی اصلاحات بھی کرنا چاہے تو اسے بہت پُر خار راستے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور کسی بگڑے ہوئے معاشرے کو ٹھیک کرنے کے لیے اسے اتنی اذیتیں سہنی پڑتی ہیں کہ وہ یا تو ہمت ہار کر بیٹھ جاتا ہے اور یا پھر پھانسی پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ جو کام پڑھے لکھے اور مہذب لوگوں میں آج نہیں ہوسکتا وہ کام اس ذات برتر نے اس زمانے میں کر دکھایا جب علم کی روشنی کم تھی اور لوگوں کے ذہنوں پر وحشت سوار تھی اور لہو و لعب اور فسق و فجور تھا۔

رسول خداؐ نے ایک چھوٹے سے شہر سے اپنی تحریک شروع کی اور ان کا پیغام بڑھتے بڑھتے ساری دنیا میں پھیلا۔ اسلام تو عام آدمی کا مذہب ہے۔ یہ چھوٹے لوگوں سے شروع ہو کر بڑے لوگوں تک پہنچا اور اس نے مملکتوں کو اپنے دامن میں سمیٹا۔ اور بادشاہوں کو اپنے قدموں میں جھکایا اور ایک فقیری کا درس دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ عرصے بعد لوگ اسلام اور رسول اکرمؐ کی تعلیمات کو بھلا کر ملوکیت کی طرف چلے گئے۔ اس سے سب خرابیاں پیدا ہوئیں جن کے نتیجے میں ہم لوگ آج تک پس رہے ہیں۔ آج اسلام مختلف فرقوں میں بٹا ہوا ہے اور ایک فرقہ دوسرے فرقے کو اسلام کے مطابق نہیں سمجھتا۔ اس کی

وجہ یہ ہے کہ وہ مرکز جس پر ہمیں رسول اکرمؐ لائے تھے ہم اس پر نہیں رہے۔

کہنا مقصود یہ ہے کہ جس وقت آدمی مسجد نبویؐ پر جاتا ہے یا روضہ رسولؐ کا دیدار کرتا ہے تو اس وقت اگر اسے تاریخ کا تھوڑا سا بھی شعور ہو تو وہ ضرور بہت ہی متاثر ہوتا ہے۔ میں نے وہاں پر دیکھا کہ لوگ دنیا کے مختلف علاقوں کے لباس پہنے ہوئے تھے۔ ایک آدمی کو میں نے خاص طور پر دیکھا اور اس نے بھی مجھے بغور دیکھا۔ وہ صاحب شاید مجھے پہچان نہ سکے ہوں بلکہ صرف اتنا ہی اندازہ کیا ہو کہ میں پاکستانی ہوں لیکن میں انہیں پہچان گیا یہ غلام مصطفیٰ جتوئی تھے۔ جتنی بار میں وہاں نماز ادا کرنے کے لیے گیا یہ بھی وہاں آئے ہوئے تھے اور بڑی رقت سے دعائیں مانگ رہے ہوتے تھے۔ پہلی مرتبہ تو میں ان سے نہیں ملا لیکن جب دوسری نماز کے لیے گیا تو ان سے ملا۔ جب میں نے انہیں اپنا نام بتایا تو وہ مجھے جانتے تھے کیونکہ انہیں علم و ادب سے بھی کچھ شغف تھا۔ پھر جس زمانے میں میری ایک کتاب کا بروشر چھپا تھا وہ سندھ کے وزیر اعلیٰ تھے اور بروشر میں ان کا پیغام بھی چھپا تھا۔

جتوئی صاحب نماز کے بعد مجھے اپنے ہمراہ اس ہوٹل میں لے گئے جس میں انہوں نے قیام کیا ہوا تھا۔ ہوٹل کے نیچے لابی میں بیٹھ کر ہم نے چائے پی اور پھر لمبی چوڑی باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد بھی ہم سنتے رہے کہ یہ ہر سال میں ایک دو بار حاضری دینے کے لیے وہاں ضرور جاتے ہیں۔

وہاں ایک حساس انسان اور شاعر پر جو گزرتی ہے۔ اس کا ایک ردعمل بھی ہونا چاہئے۔ لیکن میں اس کوشش کے باوجود کہ وہاں کے تاثرات شعروں میں قلمبند کروں آج تک کامیاب نہیں ہو سکا۔ جب بھی اس حوالے سے نعت خوانی کی کوشش کی ہے تو میں ناکام رہا ہوں۔ میں نے شعر لکھ لکھ کر پھاڑے ہیں۔ میں اس حوالے سے اس پائے کی کوئی ایسی نظم یا نعت نہیں کہہ پایا جسے میں سمجھوں کہ روضہ رسولؐ کا ردعمل اس میں موجود ہے۔ میں اس بارے میں اپنی ناکامی کا اعتراف کھلے بندوں کرتا ہوں۔ مجھے حیرت ہے کہ بعض شعراء جب وہاں سے واپس آتے ہیں تو اپنی کسی نظم کے ساتھ لکھتے ہیں کہ یہ نظم روضہ رسولؐ

پر جاتے ہوئے یا آتے ہوئے کہی گئی۔ وہ نظم بھی عام سی ہوتی ہے اور ایسی نظمیں کہی بھی جاسکتی ہیں۔ ایسی نظمیں نہ صرف یہ کہ وہاں جاکر کہی جاسکتی ہیں بلکہ یہاں بیٹھ کر بھی کہی جاسکتی ہیں۔ لیکن اس مقام کی حاضری کے بعد جو کچھ کہنا چاہئے اس بارے میں میرے تصور میں بات نہیں آتی کہ کیا کہنا چاہئے۔ اور وہ ممکن بھی ہے یا نہیں۔ پھر بھی میرا دل کہتا ہے کہ کسی روز میں ایسے چند اشعار کہنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا جن میں وہ کیفیت ضرور آئے گی جو اس وقت مجھ پر طاری تھی۔ اللہ مجھے اس کی توفیق دے۔

کلام سنانے کے رسیا

پرائمری تک میری تعلیم راولپنڈی میں ہوئی تھی بلکہ میں چوتھی جماعت بھی وہاں نہیں کر پایا تھا کہ مجھے ہری پور میں داخلہ لینا پڑا۔ ہم لوگ وہاں یعنی پنڈی میں محلہ امام باڑہ میں رہتے تھے اور میرا سکول اسلامیہ پرائمری سکول بنی مائی بھیرو کے قریب تھا۔ جب میں اپنے گھر سے گزر کر دوستوں کے ساتھ سکول جاتا تھا تو راستے میں ایک گھر کی دیوار پر ایک نیم پلیٹ لگی ملتی تھی جس پر لکھا ہوتا تھا عبدالعزیز فطرت۔ ہم لڑکے ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ یہ عبدالعزیز تو کئی لوگوں کا نام ہے لیکن یہ فطرت کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنے سے سمجھدار لڑکوں سے پوچھنے کے بعد معلوم ہوا کہ فطرت ان کا تخلص ہے اور تخلص شاعروں کا ہوا کرتا ہے تو اپنے نام کے ساتھ یہ لکھتے ہیں اور اشعار میں جہاں ضرورت پڑتی ہے وہاں بھی اپنے نام کی بجائے اپنا تخلص استعمال کرتے ہیں گویا سب سے پہلے شاعر اور تخلص سے جو آگاہی ہوئی وہ عبدالعزیز فطرت کے نام سے ہوئی۔ اس کے بعد جب ہوش سنبھالا اور خود شعر کہنے کے قابل ہوا تو عبدالعزیز فطرت کی نظمیں غزلیں ادھر ادھر رسالوں میں پڑھنے کو ملیں۔ اور یوں محسوس ہوا کہ عبدالعزیز فطرت میرے بہت قریب ہیں۔

وقت گزرتا گیا اور جب تھوڑا سا نام میرا بنا اور مجھے ہری پور سے جب پہلی بار راولپنڈی کے مشاعرے میں بلوایا گیا تو میرا پہلا مشاعرہ گارڈن کالج کا تھا۔ اس میں مجھے بلانے والے شوکت واسطی تھے جو اس وقت وہاں سٹوڈنٹ تھے۔ یہ واقعہ میں الگ سے بھی بیان کر چکا ہوں۔ خیر! اسی مشاعرے میں میری ملاقات بہت سے سینئر شعراء سے بھی

ہوئی۔ اور ان میں سے جن لوگوں کے ساتھ دوستی پیدا ہوئی ان میں عبدالعزیز فطرت اور جگن ناتھ آزاد کا نام لیا جاسکتا ہے۔ فطرت صاحب کے دم قدم سے پنڈی کی ادبی بہاریں اور رونقیں تھیں۔ انہیں ادبی سرگرمیوں سے گہرا تعلق تھا۔ چھوٹی نشستیں تو ان کے گھر پر ہوتی رہتی تھیں اور جب بھی باہر سے کوئی شاعر آتا تو وہ کچھ شعراء کو بلا کر اپنے گھر میں ایسی نشستیں کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ درمیانے درجے کے مشاعرے وہ علاقائی حد تک کر لیتے تھے اور کبھی کبھی بڑے درجے کے مشاعرے آل انڈیا حد تک بھی کروا لیتے تھے۔ ان مشاعروں کے انتظامات کا انہیں ملکہ حاصل تھا۔ چنانچہ جب تک ان کی زندگی رہی انہوں نے اپنے آپ کو اُردو ادب کی خدمت کے لیے وقف کیے رکھا۔ اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہت زندہ دل، لطیفہ گو اور جملہ باز آدمی بھی تھے۔ مقامی طور پر جیسے کہ ادبی سیاسیات ہوتی ہیں ان میں اپنے آپ کو کافی حد تک ملوث کر لیتے تھے۔ اور بعض اوقات تو الزامات بھی اپنے اوپر لینا قبول کر لیتے تھے۔ وہ دراصل پوسٹل ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے اور ایک عرصہ وہ ڈاک کے سپروائزر بھی رہے۔ اس عرصہ میں ان پر یہ الزام بھی لگا کہ وہ اپنے مخالفین کے خطوط نکال کر پڑھ لیتے ہیں۔ خدا جانے یہ الزام غلط تھا یا درست۔ ان پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ وہ مخالفین کی ادبی سرگرمیوں میں رخنے پیدا کر دیتے ہیں اور اگر دیکھیں کہ کوئی پروگرام ان کے پروگرام سے ٹکراتا ہے تو اس کے سدباب کے لیے بھی پہلے ہی سے بندوبست کر لیتے ہیں۔ واللہ علم بالصواب۔ لیکن اس سے یہ بات ضرور ظاہر ہوئی کہ وہ ادبی سرگرمیوں کے سلسلے میں کتنے سنجیدہ تھے۔ اس میں کسی کو ذاتی نقصان پہنچانا بھی مقصود نہیں تھا صرف یہ تھا کہ جو کریڈٹ فطرت صاحب کو ملنا چاہیے تھا وہ کسی اور کو نہیں لینے دیتے تھے۔ ان کی ساری باتوں کا مقصد یہی ہوا کرتا تھا۔

ان کے حریفوں میں ایک اور بزرگ دوست اور شاعر انجم رضوانی تھے جو اب بھی بقید حیات ہیں اور بہت پختہ شعر کہتے ہیں۔ دونوں میں ایک چیز قدر مشترک تھی کہ دونوں خوب نپے تلے شعر کہتے تھے اور قوافی کے سلسلے میں شائیگان قافیوں کی طرف کبھی نہیں گئے بلکہ بالکل ایک آواز کے قافیے لاتے تھے۔ جیسے کہ سہارا کا قافیہ نظارا یا کنارا ہی لاتے تھے

تا کہ صوت مجروح نہ ہو۔ دونوں کے کچھ شاگرد اور دوست بھی تھے۔

اس زمانے میں ہمارے دوست فطرت ہی تھے۔ ہمارے دوستوں میں جمیل ملک کے استاد حضرت انجم رضوانی تھے۔ ظاہر ہے کہ اپنے دوستوں کی طرف تھوڑا جھکاؤ اور پاسداری تو ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم لوگوں کا جھکاؤ فطرت صاحب کی طرف تھا۔ انجم رضوانی صاحب گوشہ نشین آدمی تھے اور انہیں یہ شوق تھا کہ ہفتے میں ایک روز پکنک ہو جائے۔ اور اس سے وہ لطف اندوز ہوں۔ چنانچہ ہم لوگ بھی ایک دو بار ان کے ساتھ پکنک پر گئے۔ یہ زمانہ خالص گھی کا تھا۔ لیکن اس زمانے میں انجم صاحب بناسپتی گھی استعمال کرتے تھے اور گھر میں تیر مارکہ بناسپتی کا پورا ایک کنستر لاکر رکھ دیتے تھے جس سے ہر چیز پکتی تھی۔

ہمارے دوست احمد ظفر بہت ہی شگفتہ مزاج تھے اور بعض اوقات ایسا جملہ فٹ کرتے تھے جو ٹھیک نشانے پر بیٹھتا تھا۔ ایک دن کہنے لگے کہ انجم صاحب چونکہ کمزور آدمی ہیں اور کمان میں تیر رکھ کر نہیں چلا سکتے جبکہ چاہتے بھی ہیں کہ عبدالعزیز فطرت کے سینے میں تیر پیوست کیا جائے تو اصلی تیر کی بجائے وہ تیر مارکہ بناسپتی کھا کر ایسا شعر کہتے ہیں جو جا کر فطرت صاحب کے سینے میں پیوست ہو جائے۔

اب عبدالعزیز فطرت صاحب کی زندہ دلی کا اندازہ کیجئے۔ کہا گیا کہ یہ جو چکور ہوتا ہے یہ کیا کہتا ہے۔ مسلمان کہتے تھے کہ یہ کہتا ہے سبحان تیری قدرت۔ اور ہندو کہتے تھے کہ یہ کہتا ہے رام نام دشرت۔ عبدالعزیز فطرت کہنے لگے کہ یہ دونوں فریق غلط کہتے ہیں اور اصل میں چکور کہتا ہے ''عبدالعزیز فطرت''۔

فطرت فیملی میں پہلے تو ان کے برادر نسبتی شعر کہتے تھے جن کا نام ایوب محسن تھا۔ وہ اچھے شاعر تھے اور ان کی فن پر بڑی دسترس تھی۔ لیکن وہ ٹرانسپورٹ میں جا کر ایسے کاروباری بنے کہ شعر پر ان کی توجہ بہت کم ہوگئی اور وہ اضافی وقت کاروبار کی طرف دیتے گئے چنانچہ وہ اب بہت خوشحال لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ لیکن ایک بات مجھے ہمیشہ کھٹکی کہ فطرت صاحب کے مرنے کے بعد ان کا مجموعہ کلام بہت جلدی آنا چاہئے تھا مگر ایوب محسن صاحب نے ان کا مجموعہ چھاپنے میں بڑی کوتاہی کی کیونکہ لوگ تو بہت جلد بھول جاتے

ہیں۔ بالآخر فطرت صاحب کا مجموعہ چھپا اور اس وقت چھپا جب اس کا بہت کم فائدہ مرحوم کی شہرت کو ہوا۔ کیونکہ ان کی وفات اور اس کی اشاعت میں اٹھارہ سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔

فطرت صاحب کے ایک بیٹے کا نام نسیم سحر ہے۔ وہ بہت زرخیز طبیعت رکھتے ہیں۔ یہ ایک مدت سے سروس کے سلسلے میں سعودی عرب میں ہیں لیکن وہاں بھی فطرت صاحب کے مزاج کے مطابق وہ شعر و ادب کی جوت جلائے ہوئے ہیں۔ خود بھی شعر کہتے ہیں اور مشاعروں میں بھی شریک ہوتے ہیں۔ وہ وہاں کی ادبی سرگرمیاں لکھ کر پاکستان اور ہندوستان کے پرچوں میں چھپواتے بھی ہیں۔

فطرت صاحب ہی نے راولپنڈی میں ایک مشاعرہ کروایا تھا جسے ہم آل انڈیا مشاعرہ تو نہیں کہہ سکتے لیکن اس میں پنجاب اور سرحد کے بیشتر شعراء شریک ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قیوم نظر اور یوسف ظفر کا نام ایک ساتھ آتا تھا جیسے دونوں جڑواں بھائی ہوں۔ ان کے نام لازم و ملزوم تھے اور مشاعروں میں بھی جب وہ جاتے تھے تو ایک ساتھ ہی جاتے تھے۔ قیوم نظر صاحب نے ہیئت کے بہت خوبصورت تجربے کئے ہوئے تھے اور یوطف ظفر صاحب نظموں کے علاوہ خوبصورت غزلیں کہہ رہے تھے۔ خرابی یوسف ظفر صاحب میں یہ تھی کہ وہ نروس بریک ڈاؤن کے شکار تھے اور جب مطلع کہنے پر انہیں داد نہیں ملتی تھی تو وہ باقاعدہ بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑتے تھے۔ ان کے سنبھالنے کا دوستوں کو پہلے اہتمام کرنا پڑتا تھا اور دوست مل کر انہیں مطلع پر پہلے خوب داد دیتے تھے جس کے بعد وہ آگے چل نکلتے تھے اور قیوم نظر صاحب کا تھوڑا سا زور تو ہیئت کے لیے تجربوں پر ہوتا تھا اور تھوڑا زور دوسری جدتوں پر ہوتا تھا اس لیے وہ داد لے ہی جایا کرتے تھے۔ نجی محفلوں میں تو ان کا یہ حال تھا کہ وہ پیروڈی اور جملہ بازی خوب کرتے تھے اور محفل کی جان بن جاتے تھے۔

یہیں سے میرے دونوں حضرات سے تعلقات بنے۔ یوسف ظفر صاحب کا تو بعد میں زندگی کا رویہ بدلا اور وہ زندہ دلی سے سنجیدگی کی طرف بھاگ نکلے اور حج کے بعد ان

کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اٹھتے بیٹھتے صرف حج کے آس پاس کی باتیں کرتے تھے۔ انہوں نے ڈاڑھی بھی بڑھالی تھی اور کچھ معجزاتی سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ لیکن قیوم نظر صاحب اب بھی بہت خوش باش ہیں۔ خدا انہیں زندگی دے۔ اب ذرا کمزور سے ہیں۔ لیکن وہ ہمیشہ ہی بہت زندہ دل اور جملہ باز رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے دو جوان بیٹے ان کے سامنے لقمہ اجل بنے۔ خدا ہی جانے کہ انہوں نے غم کے اتنے طوفان اپنے اندر کس طرح چھپائے اور اوپر سے ہنستے رہے۔

جب ان کا بیٹا سلمان سمن آباد لاہور میں حادثے کا شکار ہوا تو میں ان کی طرف گیا۔ وہ ہنس کر کہنے لگے کہ یار قتیل میں تو ڈھیٹ ہو گیا۔ دیکھ لو بیٹے مر رہے ہیں اور میں زندہ ہوں۔ اور ڈھیٹ ہو گیا ہوں۔ یہ سب کچھ کہتے ہوئے وہ رو نہیں رہے تھے لیکن میں ان کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ میرا ایک مصرع ہے۔

؎ جو پلکوں پر نہیں آتا وہ آنسو دل پہ گرتا ہے

میرا خیال ہے کہ آنسوؤں کی ایک برسات ان کے دل پر گر رہی تھی لیکن ان کے چہرے کی وضع داری وہی تھی۔

پیروڈی کہنے میں قیوم نظر کو جو کمال حاصل تھا اس کی ایک مثال سنئے۔ ٹی وی کا ایک مشاعرہ تھا ہم سب وہاں گئے تو شاعروں کو رائلٹی کے سلسلے میں ضیاء جالندھری کا رویہ زیر بحث تھا اور لوگ ان کے بارے میں عجیب عجیب ریمارکس دے رہے تھے۔ قیوم نظر نے کہا۔

؎ خوش آ گئی ہے ضیا کو جالندھری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

انہوں نے علامہ اقبال کے ایک شعر کی پیروڈی کی تھی جس میں ضیاء صاحب کو لے آئے تھے۔ یہ جنرل ضیاء الحق کا زمانہ تھا۔ وہ بھی جالندھر کے تھے اور یہ بھی جالندھر کے تھے۔ اس پس منظر میں ان کی اس پیروڈی نے جو لطف دیا وہ آج تک لوگوں کو یاد ہے۔

قیوم نظر اب کراچی میں ہیں اور سنا ہے کہ بہت مضمحل ہو چکے ہیں اور جسم میں رعشہ

بھی آ چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ پتھر کے نہیں بلکہ گوشت پوست کے انسان تھے اور دو جواں سال بیٹوں کی ناگہانی موت کے جو دو بھونچال ان کے اندر آئے انہوں نے ان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ کہاں تک ان زلزلوں کا مقابلہ کرتے۔ ان کے اندر جو دراڑیں پڑ چکی تھیں ان سے ان کے جسم نے بھی متاثر تو ہونا ہی تھا۔ روح کے زخم تو چھپائے جاسکتے ہیں لیکن جسم پر ہونے والے صدمات کے اثرات کو نہیں چھپایا جاسکتا۔

مجھے قیوم نظر صاحب سے ملے بہت عرصہ ہوگیا ہے۔ ان کی یہ حالت سننے کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ ان کی زندہ دلی میں کوئی فرق نہیں آیا ہوگا اور اگر اب بھی میں ان سے ملنے وہاں جاؤں تو شاید آج بھی وہ اسی طرح کوئی جملہ یا لطیفہ سنائیں اور ان کے چہرے پر اسی طرح کوئی مسکراہٹ ہو۔

جس زمانے میں قیوم نظر اور یوسف ظفر کا نام گونج رہا تھا اس زمانے میں ان کے ایک تیسرے ساتھی عبدالمجید بھٹی تھے جو ان کے سینئر تھے اور جن کی عزت بھی کی جاتی تھی۔ ان سے میری ملاقات بھی فطرت صاحب کے مشاعروں میں ہوئی اور ان سے ایک تعلق خاطر قائم ہوگیا۔ میں نے بھٹی صاحب سے جو کچھ سیکھا وہ محنت، لگن اور جنون تھا۔

بھٹی صاحب بھی میری طرح زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن انہوں نے تمام زندگی بڑی وضعداری سے گزاری۔ قلم کی کمائی کے علاوہ ان کا پیٹ پالنے کا اور کوئی وسیلہ نہیں تھا لیکن کیا مجال کہ ان کے اخراجات کے معیار پر کبھی کوئی آنچ آئے یا کسی نے بھٹی صاحب کو دستِ سوال تو درکنار قرض مانگتے ہوئے بھی دیکھا ہو۔ وہ ٹی ہاؤس میں آئیں، کافی ہاؤس یا عرب ہوٹل میں ہوں ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ بل خود ادا کریں۔ ان کے گھر کوئی چلا جاتا تو کھانے یا چائے میں سے جس چیز کا بھی وقت ہوتا اس سے تواضع کرتے تھے اور انہوں نے اسی طرح تمام زندگی گزار دی۔

میرے ساتھ ان کے مراسم ایک جونیئر کے سے تھے۔ چونکہ وہ سینئر تھے اس لیے انہیں حق پہنچتا تھا کہ وہ اکثر معاملات میں مجھے مشورے دیں۔ میرا ذہن ان سے تھوڑا نیا تھا اور وہ کچھ پرانے رنگ میں رنگے جا چکے تھے۔ لیکن وہ ایسے پیچھے بھی نہیں تھے۔ جب کبھی

تجربات کا شوق اٹھتا تھا تو تجربے بھی کرتے تھے۔ انہوں نے ایک ایسا تجربہ بھی کیا جو برسوں لوگوں کے موضوع بحث رہا۔ یہ ان کی ایک نظم تھی جو انہوں نے سب سے پہلے مجھے سنائی۔ اور کہنے لگے کہ میں نے اس میں بڑا تجربہ کیا ہے۔ انہوں نے جو نظم سنائی، اس کا عنوان تھا ''برہن'' اور چھن چھن چھن کے الفاظ سے شروع ہوتی تھی۔ بلکہ وہ نظم کچھ یوں تھی۔

چھن چھن

چھن چھن چھن

چھن

چھن چھن چھن چھن

چھن

چھن.....چھن.....چھن

کہنے لگے کہ کیسی ہے یہ نظم۔ میں نے کہا کہ بزرگو! یہ تو آپ ہی سمجھ سکتے ہیں کہ کیسی ہے۔ اب آپ جو مطلب مجھے اس کا بتا رہے ہیں وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ لیکن مجھے تو آپ نے مطلب سمجھا دیا مگر کیا آپ ہر پڑھنے والے کو بھی اس طرح مطلب سمجھائیں گے۔ میں نے کہا کہ آپ اسے جانے دیجئے۔ کہنے لگے کہ نہیں نہیں۔

میں نے پھر انہیں ایک لطیفہ سنایا کہ ایک ڈرائنگ ماسٹر نے اپنے شاگرد سے کہا کہ تصویر بناؤ کہ گائے چراگاہ میں چر رہی ہے۔ وہ پانچ منٹ میں تصویر بنا کر لے آیا۔ تصویر کو ٹیچر کے سامنے رکھا تو یہ ایک سادہ کاغذ تھا۔ اس نے کہا کہ یہ کیا ہے۔ تو شاگرد نے کہا کہ تصویر ہے۔ ٹیچر نے کہا کہ گھاس کہاں ہے تو اس نے کہا کہ وہ گھاس کو تو گائے نے چر لیا ہے۔ اس نے کہا کہ پھر گائے کہاں ہے تو شاگرد نے کہا کہ وہ تو گھاس کھا کر چلی گئی ہے۔ چنانچہ میں نے کہا کہ یہ بالکل اسی قسم کی نظم ہے اس لیے آپ اسے نہ چھپوائیے۔ مگر انہوں نے کہا کہ یہ تو طوفانی نظم ہے میں تو چھپواؤں گا۔ چنانچہ انہوں نے وہ نظم چھپوائی۔ نظم کا چھپنا تھا کہ جہاں جہاں ادیبوں کے ٹولے ہوتے تھے وہاں اس پر بحث چلتی رہی اور اس کی

بہت پیروڈی ہوئی۔ حتیٰ کہ عبدالمجید سالک جیسے ثقہ بزرگ نے بھی اس کی پیروڈی کی اور اپنے کالم میں اس کا ذکر کیا۔ اس کے بعد چراغ حسن حسرت جیسے بزرگ نے بھی اس کا خاصا نوٹس لیا۔ غرض یہ نظم کئی سال تک زیر بحث رہی لیکن بھٹی صاحب کا خیال تھا کہ اس نظم کی کامیابی کی یہی دلیل ہے کہ کئی سال تک لوگ اس پر بحث کرتے رہے۔

ایک اور بھی بھٹی صاحب کی خصوصیت تھی۔ انہیں کلام سنانے کی عادت تھی۔ وہ جب تک اپنی لکھی ہوئی کوئی نئی چیز سنا نہیں لیتے تھے انہیں چین نہیں آتا تھا۔ اکثر دوستوں کو معلوم تھا کہ ان کی یہ عادت ہے۔ لہٰذا دوست گریز کرتے تھے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے میں اپنا تجربہ بیان کرلوں۔ وہ اسلامیہ کالج کے سامنے ریلوے روڈ پر ایک چوبارے میں رہتے تھے۔ میں ان سے ملنے کے لیے گیا تو وہ حسب معمول بڑے تپاک سے ملے اور میرے لیے چائے منگوائی۔ پھر کہنے لگے کہ میں نے کچھ افسانے لکھنے شروع کیے ہیں۔ ذرا سنو تو سہی۔ میں مؤدب ہوکر بیٹھ گیا اور کہا کہ میں اس پر رائے تو نہیں دے سکوں گا۔ کہنے لگے کہ نہیں آپ قاری تو ہیں اور میں قاری کی حیثیت سے آپ سے اس پر رائے لینا چاہتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے مجھے دو افسانے سنائے۔ اس میں کوئی ایک گھنٹہ گزر گیا کیونکہ خاصے طویل افسانے تھے۔ اب مجھے واپس بھی جانا تھا۔ افسانے ختم ہوئے تو میں نے اجازت چاہی۔ کہنے لگے کہ نہیں آپ کھانا کھا کر جاؤ۔ کیونکہ تم نے یہاں بہت وقت صرف کیا ہے۔ جب تک گھر پہنچو گے تو کھانے کا وقت گزر جائے گا۔ چنانچہ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد میں جانے کے لیے اٹھا تو کہنے لگے کہ ذرا بیٹھو۔ کچھ تازہ کلام ہے وہ سن لو۔ میں نے ان کے بارے میں سن تو رکھا تھا لیکن ان کی سنانے کی عادت کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ انہوں نے کچھ چیزیں سنائیں کہ اچانک اندر سے آواز آئی۔ یہ اندر گئے تو میں باہر سے چپکے سے کھسک کر وہاں سے بھاگ آیا۔ میں نے ان کے بارے میں جو سنا تھا اس کا اب یقین آنے لگا۔ اس لیے میں واقعی ایک طرح سے بھاگ کر ہی وہاں سے آیا کیونکہ مجھے ڈر یہ تھا کہ اگر میں وہاں بیٹھا رہا تو شام کا کھانا بھی وہیں کھانا پڑے گا۔

بھٹی صاحب کے سنانے کے سلسلے میں ایک اور لطیفہ بھی مشہور ہوا۔ یہاں میں ان

سے معذرت چاہوں گا کیونکہ وہ بہت خوبیوں کے مالک تھے باقی اس طرح کی عادتیں تو سب میں ہی ہو سکتی ہیں۔ ہوا یوں کہ بھٹی صاحب صبح صبح ایک دن جناب احمد ندیم قاسمی کے ہاں پہنچ گئے۔ قاسمی صاحب اس وقت نسبت روڈ پر رہتے تھے۔ ان سے کہنے لگے کہ قاسمی صاحب میں نے ایک ناول لکھا ہے اس کا ایک آدھ باب آپ کو سنانا چاہتا ہوں تا کہ رائے لے سکوں۔ انہوں نے ایک باب سنایا اور پھر دوسرے پر پہنچ گئے اور وہاں سے پھر تیسرے باب پر پہنچ گئے۔ اب دونوں بزرگ سگریٹ پی رہے ہیں۔ ایک بزرگ سنا رہا ہے اور دوسرا سن رہا ہے۔ کہ اتنے میں سعادت حسن منٹو وہاں آ گئے۔ یہ منٹو صاحب کی وارفتگی کا زمانہ تھا اور وہ کبھی کبھی ان دوستوں کے پاس چلے جاتے تھے جہاں انہیں لینے دینے میں عار نہ ہو۔ قاسمی صاحب کے پاس جب وہ پہنچے تو بھٹی صاحب اپنا ناول سنا رہے تھے۔ انہوں نے بھٹی صاحب پر تو توجہ نہ دی لیکن قاسمی صاحب سے کہا کہ مجھے کچھ پیسے دے دیجئے۔ قاسمی صاحب اندر گئے اور منٹو صاحب کو پیسے لا دیئے۔ جب منٹو صاحب جانے لگے تو بھٹی صاحب نے کہا کہ منٹو صاحب ذرا ایک منٹ بات سنئے۔ میں قاسمی صاحب کو اپنے ناول کے کچھ باب سنا چکا ہوں اور اگر آپ مناسب سمجھیں تو تھوڑی دیر آپ بھی بیٹھئے اور ایک باب سن لیجئے کیونکہ آپ کی رائے میرے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ منٹو صاحب نے انہیں دھتکار دیا اور کہا کہ قاسمی تو بیوقوف ہے اور تم نے مجھے بھی بیوقوف سمجھ رکھا ہے۔ سننے میں آتا ہے کہ اس کے باوجود بھٹی صاحب نے بازو سے پکڑ کر منٹو صاحب کو بٹھا لیا اور کہا کہ نہیں صاحب میں تو آپ کو ایسے نہیں جانے دوں گا چاہے آپ کچھ بھی کہتے رہیں میں آپ کو کچھ نہ کچھ حصہ تو ضرور سنا کر بھیجوں گا۔ آخر کار منٹو بیچارے کو بیٹھنا پڑ گیا اور بھٹی صاحب نے انہیں سنا کر ہی وہاں سے جانے دیا۔

سنانے کے ایک اور مریض ہمارے دوست حافظ لدھیانوی بھی تھے۔ میں مصری شاہ میں رہتا تھا اور سائیکل اس زمانے میں میری سواری تھی۔ اس زمانے میں اکثر خوشحال لوگوں کے پاس سائیکل ہی ہوا کرتی تھی یا پھر وہ پیدل یا تانگے پر سفر کرتے تھے۔ میں جب مصری شاہ سے نکلتا تھا تو ریلوے سٹیشن کے قریب ریوالی سینما سے گزر کر "اداکار" کے

دفتر جاتا تھا جس کا میں ایڈیٹر تھا۔ حافظ صاحب ریوالی سینما کے اردگرد کہیں رہتے تھے۔ انہیں میرے آنے جانے کا وقت معلوم تھا۔ اکثر میں دیکھتا تو یہ انگریزی سوٹ پہنے وہاں کھڑے ہوتے۔ خاصے خوش پوش تھے۔ جب میں وہاں سے گزرتا تو میری سائیکل روک کر کہتے کہ یار قتیل سناؤ کچھ کہا ہے۔ میں نے اگر کچھ کہا بھی ہوتا تو سناتا نہیں تھا کیونکہ مجھے سنانے کی بالکل عادت نہیں ہے۔ چنانچہ میں معذرت کر لیتا لیکن یہ کہتے کہ اچھا پھر مجھ سے سنو۔ یہ کوئی نہ کوئی تازہ چیز سنا دیتے تھے۔

ویسے تو شعر سننے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اس طرح شعر سننا بڑا بے موقع سا تھا۔ اور پھر سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر سننا مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ جب کئی بار ایسے ہوا تو میں نے سوچا کہ کس طرح جان چھڑائی جائے۔ حافظ صاحب دوست بھی ہیں اور چاہتا تھا کہ وہ ناراض بھی نہ ہوں لیکن اس کا بندوبست بھی ہونا چاہئے۔ چنانچہ ایک دن پلاننگ کے تحت میں نے پہلے سے کہی ہوئی دس غزلیں جیب میں رکھیں۔ حافظ صاحب نے اسی طرح اس دن مجھے روکا اور پوچھا کہ کوئی تازہ کلام کہا ہے۔ میں نے کہا سنئے۔ میں نے ایک غزل سنائی تو انہوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا کہ شاید میں ختم کر چکا ہوں۔ لیکن میں نے دوسری غزل شروع کر دی۔ اور سناتے سناتے میں نے دس کی دس غزلیں سنا دیں۔ اس کے بعد میں نے ایک غزل حافظ صاحب کی بھی سن لی۔ لیکن جس طرح انہوں نے دس غزلیں مجھ سے سنیں وہ ان کے چہرے سے نظر آ رہا تھا۔ ان کے بس میں نہیں تھا ورنہ وہ میرے ہاتھ سے کاغذ لے کر پھاڑ دیتے اور صرف اپنی غزل سناتے مگر انہیں سننی پڑیں۔ اس کے بعد میں نے مستقل طور پر اپنی جیب میں غزلیں رکھنی شروع کر دیں۔ کچھ دن تو وہ نظر نہیں آئے لیکن ایک دن پھر کھڑے نظر آئے اور کہنے لگے کہ کوئی تازہ کلام ہی سناتے جاؤ۔ میں نے کہا کہ ضرور سنئے اور اس کے ساتھ ہی جیب میں ہاتھ ڈال کر کاغذوں کا ایک پلندہ نکال لیا۔ وہ اتنے سارے کاغذات دیکھ کر ایسے گھبرائے کہ کہنے لگے کہ ذرا ٹھہرو میں گھر میں ایک ضروری بات کہہ کر ابھی آتا ہوں اور اس کے بعد ایسے گئے کہ پھر اس کے بعد اس راستے پر آ کر کبھی کھڑے نہیں ہوئے۔ اس طرح میرا راستہ صاف ہو گیا۔

شعر سنانے کے ایک اور رسیا مرزا خورشید جاہ تھے۔ آپ کا دعویٰ تھا کہ آپ مغلیہ خاندان کے آخری چشم و چراغ ہیں۔ ان کے رہن سہن اور عادات سے اس کی تصدیق بھی ہوتی تھی۔ یہ ماڈل ٹاؤن میں رہتے تھے اور جب دعوتیں کرتے تھے تو وہی مغلوں والے ٹھاٹھ ہوتے تھے اور بیس پچیس کھانے اور چھ سات سویٹ ڈش پکی ہوتی تھیں۔ سنانے کا مرض انہیں بھی تھا۔

مجھ سے ان کے مراسم کچھ ایسے ہو گئے تھے جن کے بارے میں وہ کہا کرتے تھے کہ میرے قتیل سے خصوصی مراسم ہیں۔ اس کے کچھ فائدے بھی تھے کہ وہ اکثر دعوتوں میں مجھے بلاتے تھے لیکن کچھ نقصانات بھی تھے اور وہ یہ کہ وہ اکثر رات کو بارہ ایک بجے مجھے فون کر کے کہتے تھے کہ لیجئے میرا تازہ کلام سنئے اور یہ کلام ان کی اپنی زبان میں نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کی ایک عزیزہ تھیں جو خوش الحان تھیں وہ ان کی آواز میں اپنا کلام ریکارڈ کروا لیتے تھے اور پھر ٹیپ چلا کر فون کے ذریعے اپنا کلام سنواتے تھے اور ایک دوسرا ریسور اپنے کان سے لگا کر میری داد سنتے تھے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ ٹیپ ریکارڈر مجھے پورا ایک ایک گھنٹہ سننا پڑتا اور داد بھی دینی پڑتی۔

خدا انہیں بخشے۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اتنی خوبیوں کے مالک تھے لیکن ان کا یہ پہلو کمزور تھا۔ وہ دوستوں کی قوت سماعت کو آزماتے تھے۔ یہ بات شعر سنانے والے مریضوں میں ہی پائی جاتی ہے۔ ان کا دیا ہوا ایک پاؤنڈ جسے وہ اشرفی کہتے تھے بہت دیر تک میرے پاس رہا لیکن آخر کار وہ چوری ہو گیا۔ انہوں نے ایک پرائیویٹ نشست میں میری شاعری کی تعریف کر کے کہا تھا کہ میں ان کی تعریف میں یہ اشرفی پیش کرتا ہوں۔

خواجہ احمد عباس اور راجندر سنگھ بیدی

۱۹۴۷ء میں جب میں لاہور آیا تو میرا تعارف ایک خاتون چندر کانتا سے ہوا تھا جو فلم میں قسمت آزمانے آئی تھیں۔ ان سے گہرے مراسم ہونے کی وجہ سے میرا زیادہ وقت ان کے ساتھ گزرتا تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب اکثر لوگ ریسٹورنٹ یا بار میں شام گزارتے تھے۔ ان دنوں مال روڈ پر سٹینڈرڈ ریسٹورنٹ ہوتا تھا جس میں کچھ ریزرو قسم کے لوگ آ کر Couples کی شکل میں بیٹھتے تھے۔ میرا بھی وہاں آنے جانے کا اتفاق رہتا تھا۔

وہاں میں نے دیکھا کہ خواجہ احمد عباس کبھی گیتا بالی کے ساتھ نظر آتے تھے اور کبھی ایک کرسچن لڑکی کے ساتھ جو اس وقت کے مشہور مزاحیہ اداکار مجنوں کی بہن تھی۔ اس خاتون کا نام اب مجھے یاد نہیں۔ یہ اکثر ان دو کے ساتھ پائے جاتے تھے۔ پھر دیکھا کہ گیتا بالی تو غائب ہوگئی اور وہ کرسچن خاتون ہی صرف ان کے ساتھ دکھائی دینے لگی۔

خواجہ احمد عباس اصل میں تو سارا کاروبار حیات ممبئی میں کرتے تھے لیکن ایک پروگریسو فلم کی تکمیل کے لیے لاہور میں آئے ہوئے تھے۔ فلم کا نام ''آج اور کل'' تھا۔ یہ فلم لاہور میں بن رہی تھی اور خواجہ صاحب کی ٹیم میں اس وقت کے پڑھے لکھے لوگ موجود تھے۔ مثلاً میوزک ڈائریکٹر خورشید انور تھے اور اپنے زمانے میں ان سے پڑھا لکھا ہوا میوزک ڈائریکٹر اور کوئی نہیں تھا۔ یہ لوگ ''آج اور کل'' بنا رہے تھے۔

سٹینڈرڈ ریسٹورنٹ ہی میں میرا اور خواجہ صاحب کا تعارف ہوا اور انہوں نے مجھے اپنے ساتھ چائے میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ اس کے بعد بھی ان سے کبھی کبھار

ملاقات ہو جاتی تھی لیکن یہ ملاقات رسمی حد تک محدود رہی۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں جب ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب اسمبلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ کیا تو اس سے ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے اور شہر میں افراتفری پھیل گئی۔ اس سے خاص طور پر فلم پروڈکشن بہت متاثر ہوئی۔ خیالستان پروڈکشن جس میں میں کام کرتا تھا اس کا کام بھی رک گیا۔ اور خواجہ صاحب کی پکچر بھی رک گئی۔ اس دوران لوگوں کا ریستورانوں میں جانا بھی بند ہو گیا۔ کیونکہ فسادات کا اندیشہ بھی ہوتا تھا اور سرِ شام کرفیو بھی لگ جاتا تھا۔ پھر لاہور میں خواجہ صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ لیکن جب میں ممبئی گیا تو میرے اعزاز میں منعقد ایک دعوت میں خواجہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ ۱۹۶۰ء کی بات ہے لیکن اس بار بھی خواجہ صاحب سے ملاقات محض سرسری رہی البتہ انہیں میرے ساتھ لاہور میں ہونے والی مختصر سی کچھ ملاقاتیں یاد تھیں۔ اس کے بعد میں اٹھارہ سال کے وقفہ کے بعد جب ۱۹۷۸ء میں انڈیا گیا تو ان سے خوب ملاقاتیں ہوئیں۔

میں ان سے ملنے کے لیے خود ان کے گھر پر گیا۔ دیکھا کہ گھر میں کوئی خاتون نہیں تھی۔ ان کے ایک معتمد اور اسسٹنٹ وحید انور جو خود گانے بھی لکھتے ہیں اور افسانوں کے کچھ مجموعے بھی مرتب کر چکے ہیں، ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ اتنا معلوم تھا کہ خواجہ صاحب جب دوسروں کے لیے کہانی لکھتے ہیں تو وہ کمرشل لحاظ سے بہت ہٹ ہوتی ہے لیکن جب اپنے لیے کوئی کہانی لکھتے ہیں تو فلم اپنا خرچ بھی پورا نہیں کرتی۔

دراصل خواجہ صاحب ایک پیدائشی تخلیق کار تھے اور ان میں یہ لگن تھی کہ لوگوں کو ایسی فلمیں دی جائیں جو سنگ میل ثابت ہوں اور منزل کی نشاندہی کریں اور لوگ انہیں رہنما بنا کر آگے بڑھیں چنانچہ انہوں نے زندگی میں جو کمایا اسی دھن میں لٹا دیا ورنہ انہوں نے راجکپور کی جتنی فلمیں لکھیں جن میں فلم ''آوارہ'' بھی شامل ہے وہ سب کی سب ہٹ گئیں۔ مگر ان کی اپنی کوئی بھی فلم نہ چل سکی۔

نتیجہ یہ کہ ان کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ چنانچہ وہ وہاں سے نکلنے والے ایک پرچے میں اُردو صفحہ زندگی بھر لکھتے رہے اور اپنا خرچ چلاتے رہے۔ اس سے ہونے والی

آمدن معمولی تھی۔ یا پھر وہ افسانے لکھتے تھے جن سے بھی کچھ معاوضہ مل جاتا تھا۔ فلم کی آمدن کا حساب تو یہ تھا کہ کنویں کی مٹی کنویں کی نذر ہو جاتی تھی۔

اس زمانے میں جب میں ان سے ملا تو ان کے معاشی حالات ایسے ہی تھے۔ پتہ چلا کہ مجنوں کی کرسچن بہن سے انہوں نے چوری چھپے شادی کر لی تھی اور اس سے ان کی ایک بچی بھی ہوئی جو ممبئی میں اس وقت بھی رہتی تھی مگر ان سے الگ رہتی تھی کیونکہ خواجہ صاحب کی یہ بیوی فوت ہو چکی تھی۔ وضعداری کا یہ عالم تھا کہ ان کے گھٹنوں میں تکلیف ہوتی تھی اس کے باوجود جہاں بھی میری دعوت ہوتی اس میں وہ اہتمام سے پہنچتے۔ میں نے محسوس کیا کہ ممبئی میں اپنے پہنچنے سے جتنی میری عزت افزائی خواجہ صاحب نے کی وہ میرے لیے بہت تھی کیونکہ میں تو ان کے شاگردوں جیسا بھی نہیں تھا۔ وہ مجھ سے بہت سینئر ہی نہیں بلکہ ہمہ صفت اور ہمہ پہلو تھے۔ وہ ڈرامہ، فلم، ادب اور کالم نگاری میں ہر جگہ ہی بہت آگے تھے۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں خدا انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

ان کے ساتھ جو ملاقاتیں ہوئیں ان میں سے کچھ تصویروں کی شکل میں اب بھی موجود ہیں۔ لاہور کی باتیں بھی ہوتی تھیں اور وہ کہتے تھے کہ میں پھر لاہور آؤں گا۔ عجب بات ہے کہ جو ایک بار لاہور میں آ گیا پھر ہمیشہ لاہور کو یاد کرتا رہا اور یہاں آنے کا سوچتا رہا۔ جو لوگ یہاں پر بچپن یا جوانی گزار چکے تھے وہ تو چاہتے ہی تھے کہ یہاں آ کر اپنا گھر بار دیکھیں۔ لیکن دوسرے لوگ بھی جنہوں نے لاہور میں ایک دو سال گزارے ہوتے تھے وہ بھی یہاں دوبارہ آنے کی تمنا رکھتے تھے۔ یہ قدرتی بات ہے شاید اسی طرح پاکستان میں رہنے والے وہ ہندوستانی جن کا وطن ہندوستان ہے وہ بھی اپنے وطن یا شہر کے بارے میں ایسے ہی جذبات رکھتے ہوں۔ میں نے ۱۹۸۴ء میں خواجہ صاحب سے پروگرام بھی بنایا تھا کہ میں ان کے لیے یہاں لاہور میں ایک خاص تقریب کا اہتمام کروں گا اور انہیں بلواؤں گا۔ یہ تقریب ادیبوں اور فلم والوں کی طرف سے مشترکہ ہوگی۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ ان کی طبیعت روز بروز خراب تر ہوتی چلی گئی۔ ''فن اور شخصیت'' کے ایڈیٹر صابر دت سے وہاں یہ بھی طے پایا تھا کہ خواجہ صاحب کے بارے میں ایک نمبر بھی نکلے گا لیکن ان کی

موت سے یہ سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

خواجہ صاحب نے مرنے سے پہلے کہا تھا کہ وہ جس مکان میں رہتے ہیں اسے ٹرسٹ بنا دیا جائے اور اس کے ایک کمرے میں ان کا سارا کام رکھا جائے تاکہ وہ ادیبوں اور فلم والوں کے کام آسکے۔ لیکن وہاں پر ہوتا یہ ہے کہ بالعموم مکانات پگڑی پر ہوتے ہیں جبکہ مالک مکان کوئی اور ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب کے پاس جو مکان تھا وہ دس لاکھ روپے کی پگڑی کا تھا۔ مگر ان کے کچھ رشتہ داران آئے جو اپنی وراثت کا ثبوت ظاہر کر کے بالا بالا ہی اس مکان کی پگڑی کا چار لاکھ روپے میں سودا کر کے چلے گئے۔ اب اس مکان کا مقدمہ چل رہا ہے۔

غرض خواجہ صاحب کا ٹرسٹ بنانے کا منصوبہ بھی رہ گیا اور ان کا نمبر بھی نہ نکل سکا۔ زمانہ یہی ہے کہ سب آنکھوں دیکھی باتیں ہوتی ہیں۔ جب تک کوئی سامنے ہوتا ہے تو اس کا لحاظ بھی ہوتا ہے اور جب آنکھیں بند ہوگئیں اور پیچھے نرینہ اولاد یا ایسے لوگ موجود نہیں ہیں جن سے لوگوں کو کام نہ پڑے تو کوئی پوچھتا نہیں ہے۔ اب ان کی وہ بیٹی جو مجنوں کی بہن سے تھی وہ جو شروع سے الگ رہ رہی تھی اس کے بارے میں سنا ہے کہ وہ اس معاملے میں داخل ہوگئی ہے۔ اور ان کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہے۔ یہ بہت لائق بیٹی ہے اور خواجہ صاحب کی اس میں بہت سی خوبیاں موجود ہیں۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو اور خواجہ صاحب کی خواہشیں ان کے مرنے کے بعد پوری ہو جائیں۔

ایک دوسری شخصیت جسے فلم اور ادب دونوں کی شخصیت کہا جاسکتا ہے وہ راجندر سنگھ بیدی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ یہ لاہور سے ترک وطن کر کے ممبئی گئے تھے اور جب یہاں تھے تو وہ افسانہ نگاری میں اپنا نام پیدا کر چکے تھے اور ان کا مجموعہ ''دانہ و دام'' کے نام سے چھپ چکا تھا۔ انہوں نے اپنی ملازمت کا آغاز پوسٹل کلرک کی حیثیت سے کیا تھا۔ اسی پیشے میں رہ کر انہوں نے شروع میں جو افسانے لکھے ان میں ان کے پیشے کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔

اس زمانے میں ان کا ایک افسانہ میں نے بھی پڑھا تھا۔ اس میں انہوں نے ایک

میاں بیوی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ پوری فیملی ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھی۔ میاں بیوی کو اپنی باتیں کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ ایک دن ان کی سالی، بچہ اور ایک دوسرا آدمی جو گھر میں رہتے تھے وہاں موجود نہیں تھے تو ان میاں بیوی کو موقع ملا اور اس کی تشبیہ انہوں نے اس طرح دی کہ لکھا کہ اس بابو نے اپنی بیوی کا بوسہ یوں لیا جیسے پوسٹل کلرک نے لفافے پر مہر لگا دی ہو۔ ان کی یہ تشبیہ حقیقت کے بہت قریب تھی اس لیے اس زمانے میں بہت مشہور ہوئی تھی۔

جب تک بیدی صاحب لاہور میں تھے تو ان سے میری ملاقات نہ ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں جب لاہور شفٹ ہوا تھا تو وہ یہاں سے ترک وطن کر کے انڈیا جا چکے تھے۔ بعد میں جب میں ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ انڈیا گیا تو دہلی میں ایفروایشن کانفرنس ہو رہی تھی۔ میں ممبئی کے ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا اور مجھے وہاں سے واپس دہلی آ کر اس کانفرنس میں شریک ہونا تھا۔ اتفاق سے ٹرین میں میری اور بیدی صاحب کی ریزرویشن ایک ہی ڈبے میں ہوئی۔ یہ ہمارا پہلا ساتھ تھا۔

میں نے اس سے پہلے ان کے بارے میں داستانیں سن رکھی تھیں۔ لیکن ایک قول ہے کہ کسی کی دوستی کا معیار پرکھنا ہو تو یا تو اس کے ساتھ جیل میں رہے یا اس کے ساتھ سفر کیجیے۔ یہ ہمارا پہلا سفر تھا میں نے دیکھا کہ وہ بہت متوازن آدمی ہیں، دوسرے کا ذرا ذرا کام اپنے ذمے لے لیتے ہیں۔ اور خوش گفتار، بذلہ سنج، فقرہ باز اور ہنس مکھ ہیں۔ اگر کوئی غم کی بات بھی کرنی ہے تو شگفتہ انداز میں کریں گے لیکن جذباتی بات جب بھی آتی تھی تو باتیں کرتے کرتے ان کی آنکھوں میں لحاتی طور پر آنسو آ جاتے تھے۔ وہ آنسو پونچھ کر پھر بات کو آگے بڑھا دیتے تھے۔ آنکھوں میں آنسو آ جانے والی ان کی کیفیت شروع سے تھی۔

ممبئی سے دہلی تک کا سفر تقریباً چھتیس گھنٹے کا تھا۔ اس دوران ہم کھانے کے لیے ڈائننگ کار میں چلے جاتے تھے۔ اس خرچ سمیت سفر کے دوران کا تمام خرچ انہوں نے برداشت کیا۔ اور افسانہ تو اچھا لکھتے ہی تھے لیکن افسانے پر گفتگو کمال کی کرتے تھے۔ میں

نے ڈائیلاگ نگاری کے بارے میں باکمال امروہی صاحب کی باتیں سنی تھیں یا پھر افسانے پر بیدی صاحب سے باتیں سنی تھیں۔ انہوں نے افسانے کی تکنیک کے ایک ایک پہلو پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ افسانہ کیا ہے۔ اور اچھے اور عام افسانے میں فرق کیا ہے۔ پھر انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ خود کیسے افسانے لکھ رہے ہیں۔ اس میں کوئی بڑائی کی بات نہیں تھی کیونکہ وہ اپنے کمزور اور کامیاب دونوں طرح کے افسانوں کا حوالہ دیتے تھے۔ اس طرح سے ان کے ساتھ میری بے تکلفی ہوئی۔

پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگوں کا سلسلہ نکلا تو اٹھارہ سال تک میرا انڈیا جانا نہ ہوا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں بیدی صاحب نے ادھر سے بنگلہ دیش کے حق میں بات کی۔ ہمیں اس زمانے میں یہاں یہ باور کروا دیا گیا تھا کہ بنگلہ دیش نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ یہ صرف ایک پروپیگنڈا ہے۔ ہمیں تو اپنوں کی بات پر ہی یقین کرنا تھا۔

ادھر ''میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے'' کے نام سے ادیبوں کے لیے ایک پروگرام شروع ہوا۔ میں نے اس میں جو مضمون پڑھا وہ بیدی صاحب کے نام تھا۔ میں نے انہیں کہا تھا کہ آپ تو بہت شریف اور بھلے آدمی ہیں آپ بھی انڈین حکومت کی باتوں میں آ کر بنگلہ دیش کو حقیقت کہہ رہے ہیں اور اپیلیں کر رہے ہیں کہ مفاہمت سے کام لیا جائے اور لڑائی لڑنے کی بجائے مطالبات تسلیم کر لیے جائیں میں نے آخر میں کہا تھا کہ بیدی صاحب! جب یہ جنگ ختم ہوگی تو آپ دیکھیں گے کہ بنگلہ دیش سوائے کاغذ کے ایک نقشے کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے جو مضمون ان کے نام لکھ کر براڈ کاسٹ کروایا وہ اس دعوے کی وجہ سے تھا جو ہمارے درمیان تعلق خاطر تھا۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہ جنگ ختم ہوئی تو ہمارا وہ حصہ واقعی بنگلہ دیش بن چکا تھا۔ اور بیدی صاحب کی باتیں سچی نکلیں۔

پتہ نہیں بیدی صاحب نے میری تقریر سنی یا نہیں سنی کیونکہ میں نے بھی ان کی تقریر براہ راست نہیں سنی تھی بلکہ مجھے ان کی تقریر کا سکرپٹ مہیا کیا گیا تھا۔ اور ریڈیو والوں نے کہا تھا کہ آپ اس کا جواب دیں۔ یہ تو خیر جنگوں میں ہوتا ہے اور ہر شخص اپنے اپنے ملک کی حمایت کرتا ہے۔ مجھے جب کہا گیا کہ ساحر اچھا مسلمان ہے کہ جنگ کے زمانے

میں اس نے پاکستان کے خلاف نظم کہی ہے تو میں نے کہا کہ اگر اس نے ایک نظم کہہ دی ہے۔ تو کیا ہوا میں نے پاکستان میں بیٹھ کر ہندوستان کے خلاف چار نظمیں کہی ہیں۔ دراصل نہ میں نے ہندوستان کے خلاف نظم کہی نہ ساحر نے پاکستان کے خلاف۔ بلکہ ہوا یوں کہ ہم دونوں نے اپنے اپنے ملکوں کے حق میں نظم کہی اور تمام شاعروں نے اس طرح نظمیں کہیں کیونکہ جنگوں میں ہم سب اجتماعی طور پر اپنے اپنے ملکوں کی حمایت کرتے ہیں۔ یہ بالکل فطری بات ہے اور ایسا کرنا بھی چاہئے۔ لیکن جب صلح ہو جاتی ہے تو افراد کی دوستیاں اسی طرح چلتی ہیں۔ بلکہ افراد کی دوستیاں تو اس زمانے میں بھی متاثر نہیں ہوتیں بلکہ اسی طرح ہی چلتی رہتی ہیں۔

جب شملہ معاہدہ ہو چکا تھا تو اس کے بعد مجھے یہاں پتہ چلا کہ بیدی صاحب کو فالج ہو گیا ہے۔ اور ساحر بھی بیمار ہے اور اس کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ ساحر تو خیر میرا جان و جگر تھا اور ہم دونوں ہمراز تھے۔ لیکن بیدی صاحب سے بھی ٹرین کے اس سفر میں میں بہت متاثر ہو چکا تھا اور انہوں نے میرا دل موہ لیا تھا۔ چنانچہ میں نے انڈیا جانے کے لیے یہاں .N.O.C کی درخواست دی اور اس میں لکھا کہ مجھے ساحر اور بیدی صاحب کی عیادت کے لیے انڈیا جانے کی اجازت دیے جائے۔ مجھے بتایا گیا کہ اگر خونی رشتہ ہے تو صرف تب ہی وہاں جانے کی اجازت مل سکتی ہے۔ اس کے جواب میں میں نے حکومت سے اپنی خط و کتابت میں کہا کہ خونی رشتے سے آگے ایک روح کا رشتہ بھی ہوتا ہے۔ میں نے مزید لکھا کہ خونی رشتہ تو بہت سے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے لیکن روح کا رشتہ تو بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے۔ میرا ان دونوں سے روح کا رشتہ ہے۔ اب آپ بتائیے کہ خون کا رشتہ بڑا ہے یا روح کا رشتہ بڑا ہے۔ اگر روح کا رشتہ بڑا ہے تو مجھے این۔ او۔ سی دیا جائے۔ بالآخر مجھے این۔ او۔ سی دے دیا گیا۔ آگے کوئی سمجھدار آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کوئی کلرک نہیں تھا۔

جب میں ممبئی پہنچا تو ساحر اپنے ماموں کے پاس الہ آباد گئے ہوئے تھے اور انہیں سات آٹھ دن گزر چکے تھے۔ جب بیدی صاحب کی طرف گیا تو وہ بھی اس وقت گھر پر

نہیں تھے۔ میں ان کے ہاں رقعہ لکھ کر چھوڑ آیا اور اس میں اپنا ایڈریس اور ٹیلیفون نمبر بھی لکھ آیا۔ سارا دن گھومنے کے بعد جب میں شام کو وہاں پہنچا جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا تو مجھے واپسی پر ایک رقعہ ملا۔ یہ کانپتے ہاتھوں سے لکھا ہوا تھا اور اس میں تحریر تھا کہ مجھے افسوس ہے کہ آپ میرے گھر آئے تو میں موجود نہیں تھا۔ اور اب میں آیا ہوں تو آپ موجود نہیں ہیں۔ جس وقت آئیں مجھے فون کریں میں دوبارہ آؤں گا۔ پھر پتہ چلا کہ وہ فالج کی حالت میں آئے تھے۔

میں ان کا رقعہ پڑھ کر رو پڑا۔ خلوص کی یہ حد دیکھئے کہ وہ کس حالت میں مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ میں پھر اسی وقت ان کی طرف چلا گیا۔ ملے تو ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ اس ملاقات سے پہلے لاہور میں عصمت چغتائی آئی تھیں۔ جب بھی کوئی یہاں آتا تھا تو میں اس سے کرشن چندر، بیدی، خواجہ صاحب اور دوسروں کے بارے میں پوچھتا تھا۔ وہ بڑی کریکٹر کی عورت ہیں۔ ان کے بارے میں کبھی کوئی گری ہوئی بات نہیں سنی بلکہ وہ ایک حد تک مرد عورت ہیں لیکن بہت منہ پھٹ ہیں۔ اور بات بڑی کھلی کرتی ہیں۔ جیسے وہ اپنے افسانوں میں بات کرتی رہیں اسی طرح نجی زندگی میں بھی بات کرتی ہیں۔

میں نے ان سے پوچھا تھا کہ بیدی صاحب کا کیا حال ہے تو انہوں نے جواب میں کہا تھا کہ سالے کو فالج ہو جائے گا۔ میں نے پوچھا کہ کیوں؟ تو کہنے لگیں کہ ایک جوان لڑکی ہے اس کے ساتھ معاشقہ کر رکھا ہے اور کشتے کھاتا رہتا ہے۔ اس لیے فالج ہو جائے گا۔ یہی ہوا اور کچھ عرصے بعد خبر آ گئی تھی کہ انہیں فالج ہو گیا ہے۔ دراصل وہ گھریلو طور پر غیر مطمئن آدمی تھے۔ بیوی سے نہیں بنی تھی اور زندگی میں جب کوئی خلا آتا ہے تو اسے پر کرنے کے لیے آدمی حیلے بہانے تلاش کرتا ہے لیکن یہ ایک عذر لنگ ہی ہوتا ہے کہ آدمی اپنا رومانی خلا پر کرے۔ اور یہ کسی عمر میں بھی اچھا نہیں لگتا البتہ جوانی میں پھر اس کا تھوڑا بہت جواز ہوتا ہے۔ جب بڑھاپے میں آ کر آدمی کسی عشق معاشقے کے چکر میں پڑ جاتا ہے تو اس کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو بیدی صاحب کا ہوا یا جب ہم سکندر ارسطو کی کہانی

پڑھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ارسطو سکندر کو عورت کے بارے میں سمجھاتے سمجھاتے خود عورت کا اتنا گرویدہ ہوگیا کہ عورت نے اس کی پیٹھ پر چڑھ کر بڑھاپے میں سواری کی۔ اس ارسطو کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اور ان کی ایک فیچر ''آنکھیں دیکھی'' بنی بنائی رہ گئی اور وہ لڑکی جو ان کی داشتہ تھی وہ اس فلم کی ہیروئن تھی۔ فلم میں معروف اداکاران ہوں تو فلم بکتی ہے۔ اب یہ ہیروئن نئی تھی پھر رائٹر یعنی بیدی صاحب خود ڈائریکٹر تھے۔ ہر چند کہ جن لوگوں نے فلم دیکھی ہے وہ کہتے ہیں کہ فلم میں ڈائریکشن اعلیٰ درجے کی تھی لیکن باکس آفس میں نام نہ ہونے کی وجہ سے بھی فلم پڑی رہی۔ ان کا کچھ سرمایہ تو فلم میں ہی لگ گیا۔ پھر اس کے بعد ان کی بیوی بھی فوت ہوگئی اور عجیب بات ہے کہ اس کی وفات کے بعد انہیں احساس ہوا کہ وہ بیوی جس کے ساتھ ان کی ساری عمر نہیں بنی وہ ان کے لیے بہت قیمتی سرمایہ تھی۔ اس بیوی کے نہ ہونے سے اب وہ یوں محسوس کرتے تھے جیسے لٹ گئے ہوں۔ ان کی طبیعت میں رقت پہلے سے تھی اور ان کی آبدیدہ ہو جانے کی عادت بھی تھی لیکن اس واقعہ کے بعد یہ عادت تیز ہوگئی اور جب میں ان کے گھر گیا تو وہ آبدیدہ ہو گئے۔

انہیں سگریٹ پینے کی عادت تھی۔ خود چونکہ سلگا نہیں سکتے تھے اس لیے بیٹا سگریٹ سلگا کر دیتا تھا۔ بہو چائے وغیرہ لاتی تھی اور جب بیوی کا ذکر آتا تھا تو رو پڑتے تھے۔ اس طرح ان کی زندگی کا انجام ہوا۔ کیا بتایا جائے وہ اتنے بڑے افسانہ نویس تو تھے ہی گفتگو کے ماہر اور فراخدل بھی تھے۔ ان کا ایک بیٹا نریندر بیدی تھا جو بہت کامیاب فلم ڈائریکٹر تھا۔ افسانے کے سلسلے میں وہ بیدی صاحب سے اختلاف رکھتا تھا حالانکہ بہت فرمانبردار تھا اور جب شوٹنگ نہ ہوتی تو بیدی صاحب کے ساتھ محفلوں میں جایا کرتا تھا۔ کم از کم میرے اعزاز میں جو محفلیں منعقد ہوئیں ان میں نریندر ساتھ تھا۔ فرمانبردار بہت تھا لیکن وہ کہتا تھا کہ بیدی صاحب بہت اونچائیوں میں اڑتے ہیں جبکہ مجھے زمین پر چلتے پھرتے لوگوں کے لیے فلم بنانی ہے۔ اس لیے مجھے اپنے والد کا افسانہ یا کہانی سوٹ نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ وہ ان سے مکالمے بھی نہیں لکھواتا تھا جبکہ بیدی صاحب کے ڈائیلاگ ''داغ'' فلم میں آنے کے بعد فلم کی تاریخ میں ایک انقلاب لائے تھے۔ پھر ''غالب'' فلم جو نستعلیق اُردو میں

لکھی جانی تھی اس کے ڈائیلاگ ایک سکھ یعنی بیدی صاحب نے لکھ کر دا دی۔ لیکن بیٹا اس چیز سے اتفاق نہیں کرتا تھا۔

ایک دن بیدی صاحب مجھے کہنے لگے کہ یار قتیل سنو۔ دیکھو میرا یہ بیٹا نافرمان بھی نہیں ہے مگر مجھ سے اتفاق بھی نہیں رکھتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اس کے کام کا نہیں ہوں۔ لیکن یہ تمہارا بڑا معتقد ہے اور مجھ سے کئی بار کہہ چکا ہے کہ قتیل صاحب سے کہو کہ یہ کچھ عرصے کے لیے ممبئی آ کر میری ایک دو فلموں کے گانے لکھ دیں۔ تمہارے پاکستانی فلموں کے جو گانے آتے ہیں یہ ان کے حوالے دیتا ہے اور کہتا ہے کہ گانے یہ ہوتے ہیں جو قتیل صاحب لکھتے ہیں۔ پھر کہنے لگے کہ اس کے لیے کچھ کرو۔ لیکن تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد یہ دونوں باپ اور بیٹا فوت ہو گئے۔ اور مجھے بہت صدمہ ہوا۔ راجندر سنگھ بیدی صاحب کے انتقال پر تو ایک تعلق خاطر کی وجہ سے صدمہ ہوا لیکن ان کے بیٹے کے انتقال پر اس لیے صدمہ بھی ہوا کہ ایک خود غرضی بھی شامل تھی کہ ایک اچھے ہندوستانی ڈائریکٹر کی فلم میں میرے گانے آتے تو انہیں کچھ میدان ملتا۔ مگر یوں میں باپ اور بیٹا دونوں ہی سے محروم ہو گیا۔

نیکی کر دریا میں ڈال

مجھے اپنے والد سے جو اچھی عادتیں اور اچھے اصول ملے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان لوگوں کی مدد کرو جو مستحق ہیں اور اس مدد کا ڈھنڈورا پیٹنے سے اجتناب کرو۔ تھوڑے تھوڑے پیسے بھکاریوں کو دینے سے گریز کرو تا کہ بھکاریوں کی تعداد نہ بڑھے اور ضرورت مندوں میں بالکل چپ چاپ اپنا عطیہ پہنچا دو۔ تا کہ انہیں کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ چنانچہ میرے گھر کے سامنے کسی نے وہ دیگیں پکتی نہیں دیکھیں جو بعض لوگ محلے کو دکھانے کے لیے یا اپنی طرف سے نیکی کا کام سمجھ کر پکاتے ہیں اور پھر محلے میں بانٹ دیتے ہیں یا دروازے کے آگے کھڑے ہو کر بہت سی ریزگاری لے کر فقیروں کو بلا کر ان میں ایک ایک دو دو آنہ کر کے بانٹ دیتے ہیں۔ یا پھر کسی مزار پر جا کر بیٹھے ہوئے بھکاریوں کی فوج میں کچھ پیسے دے دیتے ہیں۔ میں ایسی کوئی چیز نہیں کرتا اور اپنے گھر والوں سے بھی یہی کہتا ہوں کہ یہ طریقہ غلط ہے۔

میرے والد اپنی آمدن کا ایک حصہ ایسے ضرورت مندوں میں بانٹا کرتے تھے جو سفید پوش ہوتے تھے اور کسی سے کہنے کے قابل نہیں ہوتے تھے۔ کسی کا بچہ پڑھ رہا ہے تو اسے میرے والد فیس یا کتابیں دے دیتے تھے۔ مجھے کچھ بیوائیں معلوم ہیں جن کی وہ مدد کیا کرتے تھے۔ یہ اچھی عادت اور اچھا اصول میں نے اپنے والد سے لیا اور اب میرا طریقہ کار یہ ہے کہ ہر چند کہ میری آمدن زیادہ نہیں ہے لیکن اگر کوئی بھی عادت ڈال لی جائے تو اسے پورا کرنے میں زیادہ وقت نہیں ہوتی۔ اگر ضرورت مندوں کی ضرورت پوری

کرنے کی عادت ڈال لی جائے تو پھر کچھ عرصے کے بعد اس سے تکلیف نہیں ہوتی بلکہ وہ چیز روٹین میں آ جاتی ہے اور آپ بغیر کوئی دقت محسوس کیے وہ فریضہ ادا کرتے چلے جاتے ہیں۔

میں ایک مدت سے ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتا ہوں جو ضرورت مند ہوں۔ اگر وہ میرے غریب رشتہ داروں میں سے ہوں تو زیادہ بہتر ہے۔ ورنہ محلے میں یا جاننے والوں میں سے ہوں۔ ایسی صورت میں میں نے اپنے بیٹے اور بیٹیوں کو بھی یہاں اس راستے پر لگا رکھا ہے۔ چنانچہ جب وہ کسی کی ضرورت دیکھتے ہیں تو ان کی مدد کرتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب مفلوج ہیں اور مکان کا کرایہ نہیں دے سکتے تو بجائے اس کے کہ مالک مکان ہر مہینے آ کر اسے کہے کہ مکان سے باہر نکلو، میں یوں کرتا ہوں کہ اس آدمی کو میں دو سو روپیہ اپنے پلے سے اور سو سو روپیہ اپنے بچوں سے لے کر پانچ سو روپے کرائے کے لیے دے دیتا ہوں۔ اسی طرح ہری پور میں اور سکندر پور میں جو میرے اور میری بیوی کے وطن ہیں وہاں ایک غریب خاتون میری رشتہ دار تھیں۔ اس کے گھر میں بجلی نہیں تھی اور سارا خرچ ہزار بارہ سو کا تھا۔ میں نے اپنی جیب سے کچھ پیسے نکالے اور کچھ اپنی بیٹی سے لیے، اور اس کے گھر میں بجلی لگوا دی۔ یہ صورت اب تک جاری ہے۔ بعض اوقات میں اپنے متمول دوستوں کو بھی اس طرح کے نیکی کے کاموں میں شامل کر لیتا ہوں۔

ایسے دوستوں میں ایک نمایاں نام ''نیرنگ خیال'' کے ایڈیٹر سلطان رشک کا ہے۔ زکوٰۃ کے مہینے میں جب میں نے کسی کی مدد کرنی ہوتی ہے تو میں اپنے ساتھ سلطان رشک کی رقم بھی ملا کر دے دیتا ہوں۔ پچھلے سال ہمارے ایک محلے دار کے مکان کی چھت گری اور اس کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی تو پانچ سو روپے میں نے اور پانچ سو روپے سلطان رشک نے ڈالے اور ایک ایک سو روپیہ میرے بچوں نے دیا۔ اس طرح ہم نے کچھ رقم اکٹھی کر کے ان کو دیدی۔ میرا خیال ہے کہ ہٹے کٹے مشٹنڈوں کو روپیہ دو روپے دے دینے سے یا اپنے گھر کے باہر دیگیں کھڑکانے سے کہ نمائش ہو اور لوگ سمجھیں کہ سخی آدمی ہے یہ کام بہتر ہے۔ دیگیں پکانے سے چاولوں کی بھی بے حرمتی ہے کیونکہ ہر کسی کے گھر میں کھانا

پکا ہوتا ہے اور یہ غریبوں تک بھی نہیں جاتے لیکن انہیں نمائش درکار ہوتی ہے اور محلے کے ہر گھر میں پتہ چل جاتا ہے کہ لن کے گھر میں دیگ پکی تھی۔ اسی طرح گھر کے سامنے ریزگاری لے کر کھڑے ہو جانا اور آوازیں دے کر وہ ریزگاری تقسیم کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں اس کے سخت خلاف ہوں۔ اس کی کوئی افادی حیثیت نہیں ہے بلکہ یہ تو معاشرے کو ایک طرح سے بھکاری بنانے والا کھیل ہے۔ میں کبھی ایسا کرنا گوارا نہیں کرتا اور دعا کرتا ہوں کہ خدا مجھے زیادہ دے تاکہ میں ضرورت مندوں کی زیادہ خدمت کر سکوں۔

اس طرح غریب لوگوں کی مدد کرنے والوں میں ایک اور نام بھی میرے ساتھ آتا ہے جو کہ خورشید راٹھور کا ہے۔ میں تو قسطوں میں لوگوں کی مدد کرتا رہتا ہوں۔ لیکن انہوں نے میری باتوں سے متاثر ہو کر یا اپنے دل میں پہلے سے موجود نیکی کے جذبے کے تحت مسجد میں طالب علموں کے لیے ایک کمرہ بنانے کے لیے تیس ہزار کی رقم یکمشت ادا کر دی۔ وہ خود بھی ملازم ہیں اور کوئی امیر خاتون نہیں ہیں۔ لیکن وہ ضرورت مندوں کی مدد کرتی ہیں۔ وہ بھی اسی اصول پر کاربند ہیں کہ دروازے پر آنے والے بھکاریوں کی حوصلہ شکنی کی جائے اور چپکے سے ضرورت مندوں کی مدد کی جائے۔ ان کا کام بھی میرے جیسا ہے۔ جب انہیں پتہ چلتا ہے کہ فلاں لڑکی کی شادی ہے تو وہ مجھ سے، میرے بیٹے بیٹیوں سے، اور اپنے جاننے والوں سے کچھ رقم اکٹھی کر کے اور کچھ اپنے پاس سے ڈال کر اس لڑکی کی مدد کر دیتی ہیں۔ خدا سب کو توفیق دے کہ ہم غریبوں کی بجا طور پر مدد کریں تاکہ معاشرے میں احتیاج کی صورت نہ رہے۔

یہ تو میں نے ان بھکاریوں کی بات کی جو معاشرے میں گھومتے پھرتے ہیں۔ اور جن بعض لوگوں کا پیشہ پشت در پشت چلا آ رہا ہے۔ لیکن کچھ بھکاری شاعروں اور ادیبوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا بڑا احسان ہے کہ وہ شعر کہتے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ نے انہیں شعر کہنے اور لوگوں سے اس کا ٹیکس لینے پر مامور کر دیا ہے۔

ایسے شاعر عام طور پر غیر ذمہ دار، نکمے اور غلیظ ہوتے ہیں۔ ہر چند کہ ان کی تعداد ایک فیصد بھی نہیں ہے لیکن چونکہ وہ شاعر ہوتے ہیں اس لیے فوراً نظر میں آ جاتے ہیں۔

اس لیے اس طرح کے ایک فیصد شاعر بھی ساٹھ فیصد نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ شادی شدہ ہوتے ہیں اور ہر سال بچہ بھی پیدا کرتے ہیں لیکن بچوں کے لیے روزی پیدا نہیں کرتے اور کسی نہ کسی بہانے سے لوگوں پر بوجھ بنتے ہیں۔ بعض اوقات تو یوں بھی ہوتا ہے کہ ایسے شاعر کو دیکھ کر دور ہی سے کوئی شریف آدمی چھپ جاتا ہے۔ یا پھر جب یہ کسی کے گھر پر جا کر دستک دیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ آدمی دوبارہ دروازے پر آ گیا ہے جو پانچ بار پہلے بھی مدد لے چکا ہے۔ چنانچہ اندر سے جواب دیا جاتا ہے کہ صاحب خانہ گھر پر نہیں ہیں۔ خدا ایسی صورت سے دشمنوں کو بھی محفوظ رکھے چہ جائیکہ شاعر ایسا کام کرے۔ شاعر تو لفظ شعور سے مشتق ہے اور شاعر عام آدمی سے زیادہ ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کی عزت عام آدمیوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ عزت نفس کا خیال شاعروں میں عام آدمی سے زیادہ ہوتا ہے۔ بہرحال ایسے شاعر بہت کم تعداد میں ہیں جبکہ زیادہ تر شعراء خود کماتے ہیں اور ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہیں اور کبھی جھک کر بات نہیں کرتے۔

اس طرح کچھ اور بھکاری بھی ہیں جو حکومت وقت کی کاسہ لیسی کرتے ہیں۔ رئیسوں سے مراسم رکھ کر ان سے کچھ حاصل کرتے ہیں اور جو چڑھتا سورج نظر آتا ہے اسے سلام کر کے اس کے ساتھ ہو لیتے ہیں اور بڑی مراعات حاصل کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مہذب بھیک کی یہ بھی ایک شکل ہے۔ اس طرح یہ بھی ہوتا ہے کہ سچ کہنے کی رفتار کم ہو جاتی ہے اور حاکم وقت کو لکھنے پڑھنے والوں کی صحیح رائے نہیں ملتی۔ اس کے قریب جو لوگ جاتے ہیں وہ خوشامدی ہوتے ہیں جو صرف وہ رائے دیتے ہیں جس کی حاکم وقت کو خواہش ہو۔ اس طرح حاکم وقت کو پبلک کی رائے سے آگاہی نہیں ہوتی اور وہ گمراہ ہو کر سوچتا ہے کہ اس کی تمام پالیسیاں ٹھیک ہیں۔

یہ اکثر حکومتوں میں ہوا ہے۔ بہت سے حاکمان وقت یا چھوٹے درجے کے افسران اس طرح گمراہ ہو جاتے ہیں اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ لوگوں میں پاپولر نہیں رہتے، ان کی پالیسیاں ناکام ہو جاتی ہیں اور وہ بدنام ہو جاتے ہیں۔ اور ایک دن ان کی حکومت کا تختہ الٹ جاتا ہے۔ اور اس کے بعد وہ لوگ جو ان کی خوشامد کرتے تھے انہیں آپ اچانک

دیکھتے ہیں کہ وہ نئے آنے والے حاکم کی چاپلوسی اور خوشامد کی تیاریاں کرنے لگتے ہیں۔ یہ ایک مسلسل بھیک کی شکل ان بھکاریوں میں جاری رہتی ہے۔ خدا اپنے بھکاریوں سے بھی معاشرے کو محفوظ رکھے اور شاعروں سے ایسے لوگوں کو نجات دلائے جو شاعری جیسے مقدس پیشے کو لوگوں کی نظروں میں ذلیل کرتے ہیں۔ اور اس شعور کو رسوا کرتے ہیں جس سے شاعر کو مالا مال ہونا چاہئے۔

بادہ نوشوں کی عادتیں

شراب کا ذکر بہت پہلے سے لٹریچر میں موجود ہے بلکہ تاریخ عالم میں موجود ہے۔ لیکن شاعروں کے حوالے سے شراب کا پینا ایک لازم وملزوم قرار دیا جاتا رہا ہے اور یہ بہت حد تک ٹھیک بھی ہے۔ زمانہ قدیم سے لے کر اس وقت تک جبکہ شراب پر پابندیاں عائد نہیں ہوئی تھیں، ہمیں شاعروں کی محفل میں کثرت سے دور جام چلتا نظر آتا ہے۔

اُردو شاعروں میں ہمیں ایک خوش ظرف اور شگفتہ مزاج بادہ نوش نظر آتا ہے۔ شرابی لفظ میں اس لیے استعمال نہیں کر رہا کہ اس میں بڑی تضحیک کا پہلو ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہر پینے والے کو ہم شرابی نہیں کہہ سکتے اس لیے میں غالب کو بادہ خوار کہتا ہوں۔ انہوں نے خود بھی اپنے لیے یہی لفظ استعمال کیا تھا۔

؎ یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب سے ہمیں شراب کی یہ ایک روایت ملتی ہے لیکن، جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں، شراب کا شعر کی تخلیق سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ شاعروں کی محفل میں کسی طرح شراب در آئی اور شراب کی روایت بن گئی۔ غالب کے خطوط پڑھیے، ان کی عام زندگی دیکھیے یا ان کی شاعری کا مطالعہ کیجیے شراب کا ذکر اور اس کے اثرات ملیں گے۔

؎ مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو

اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

غالب اس کی وجوہ کچھ بھی بتاتے رہے ہوں۔ میں اس وقت آپ کو اپنے ملنے والے ان دوستوں، ان بزرگوں اور ان ثقہ لوگوں کی شراب نوشی کے کچھ واقعات سنانا چاہتا ہوں جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور جن میں میں شریک رہا۔ کچھ قیام پاکستان سے پہلے کے واقعات ہیں اور کچھ بعد کے ہیں۔

قیام پاکستان سے پہلے بزرگوں میں جس شاعر کی شراب نوشی کا سب سے زیادہ چرچا تھا وہ جگر مراد آبادی تھے۔ میں نے انہیں اس حالت میں کبھی نہیں دیکھا لیکن ان کی داستانیں سنتا رہا اور جب ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو وہ ترک بادہ کر چکے تھے اور ایک سیدھے سادے شہری کی حیثیت سے مجھے نظر آئے۔ ان میں اب شراب کی بجائے ایک اور چیز نے جگہ لے لی تھی اور وہ تاش تھی۔ وہ تمام رات اسی میں گزارتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس سے پہلے جو رات وہ نشے میں یا پینے پلانے میں گزارتے تھے، انہوں نے اس کا بدل ڈھونڈ لیا تھا۔

ان کے علاوہ اختر شیرانی کا بہت چرچا تھا۔ پھر مجاز لکھنوی بھی اس کے لیے بہت مشہور تھے۔ ادھر جو لوگ تھے ان میں الطاف مشہدی، مجید لاہوری، حاجی لق لق اور عبدالحمید عدم وغیرہ اس سلسلے میں بہت مشہور تھے۔ ان سے جو ملاقاتیں ہوئیں ان کے چھوٹے چھوٹے واقعات بتاتا ہوں۔

یہ واقعہ پارٹیشن سے پہلے کا ہے کہ پنڈی میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اس میں حاجی لق لق بھی شریک تھے۔ حاجی لق لق ادب کے کوئی باقاعدہ نامور شاعر نہیں تھے بلکہ ان کا تعلق صحافت سے تھا اور ان کی مزاحیہ شاعری نچلے طبقے میں بہت مقبول تھی۔ یہ ''زمیندار'' میں کام کرتے تھے جہاں مولانا ظفر علی جیسے جید آدمی صرف حقے پر گزارا کرتے تھے وہاں ان کے ساتھیوں میں حاجی لق لق اتنی پیتے تھے کہ شراب بھی دہائی دے کر کہتی تھی کہ مجھے حاجی لق لق سے بچاؤ۔ انہیں میں نے وہاں ایسی حالت میں دیکھا کہ واقعی مجھے شراب پر رحم آنے لگا کہ یہ کس آدمی کے پلے پڑ گئی ہے۔ یہ پینے کے بعد سٹیج پر بیٹھ کر جو شاعر آتا تھا

اس پر فقرے کستے تھے۔ پینے کے بعد ان کی یہ عادت نمایاں ہو جاتی تھی۔ ویسے بذلہ سنج آدمی تھے اور شگفتہ باتیں کرتے تھے لیکن پینے کے بعد یہ ہوتا تھا۔ جب لوگ منع کرتے تھے تو چپ ہو جاتے تھے لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان کا پھر یہ سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس عادت کا میں نے حال پارٹیشن کے بعد سرگودھا کے ایک مشاعرے میں دیکھا۔

یہ مشاعرہ الطاف مشہدی نے منعقد کیا تھا۔ اس میں ہندوستان اور پاکستان کے شعراء شریک ہوئے۔ حاجی لق لق پیے ہوئے تھے اور الطاف مشہدی صاحب نے بھی پی رکھی تھی۔ جگر صاحب پڑھنے کے لیے آئے اور وہ اس وقت صوفی تھے اور پینی چھوڑ چکے تھے۔ حاجی لق لق پہلے بھی جملے بازی کر رہے تھے لیکن جب انہوں نے جگر صاحب پر جملے بازی کی تو الطاف مشہدی نے کہا کہ حاجی چھوڑ بھی۔ کیا بک بک لگائی ہوئی ہے۔ اور تو حاجی لق لق نہیں بلکہ حاجی بک بک ہے۔ اسی لیے میں تجھے بلاتا نہیں تھا۔ الطاف مشہدی اور حاجی لق لق آپس میں بے تکلف دوست تھے۔ حاجی لق لق بالکل خاموش ہو گئے۔ لیکن جونہی الطاف مشہدی نے کسی دوسری طرف منہ کیا تو حاجی لق لق نے پھر اپنی کارروائی شروع کر دی۔ اس کے بعد الطاف صاحب پلٹے۔ وہ دیو ہیکل آدمی تھے اور ویسے بھی جب آدمی پیے ہوئے ہو تو کچھ فالتو قوت شراب کی بھی ہوتی ہے۔ مشاعرہ جاری تھا۔ انہوں نے حاجی لق لق کو دونوں بازوؤں سے اٹھایا اور انہیں اس طرح پکڑ لیا جیسے کوئی مردہ بانہوں پر رکھا ہوتا ہے۔ وہ سٹیج سے اترے اور پنڈال کے باہر جا کر انہیں پھینک آئے۔ یہ ایک غیر ذمہ دار آدمی کی فضول عادت کا نتیجہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

راجہ حسن اختر علامہ اقبال کے پرستاروں اور ہم جلیسوں میں سے تھے۔ وہ بہت معزز اور معتبر آدمی تھے۔ اور کسی زمانے میں ڈپٹی کمشنر بھی رہ چکے تھے۔ معاشرے میں ان کا بہت مقام تھا۔ ان کے بیٹے بھی اچھے عہدوں پر تھے۔ کیانی فیملی تھی۔ ان کے ایک بیٹے محمود اختر کیانی تھے۔ یہ شاعر تھے اور ہمارے دوستوں میں سے تھے اور انہیں پینے کی لت تھی۔ ان کی یہ عادت تھی کہ جب پی لیتے تھے تو اس حوالے سے علامہ اقبال کا ذکر کرتے تھے کہ وہ ان کے والد کے دوست تھے۔ وہ پینے کے بعد علامہ اقبال کو تایا کہا کرتے تھے۔ اگر کوئی

بات ہو جائے اور خواہ وہ ادبی سطح پر ہی کیوں نہ ہو لیکن اس میں علامہ اقبال کی مخالفت کا کوئی پہلو نکلے تو وہ لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ ان کی صرف یہی عادت تھی۔ ویسے وہ پینے کے بعد بالکل نارمل ہوتے تھے۔ موٹر سائیکل چلاتے تھے، اور اگر کبھی زیادہ پی ہوتی اور واپس گھر جاتے وقت کہیں بنچ پڑا ہوا دیکھتے تو گھر جانے کی بجائے وہیں سو جاتے تھے۔ صبح جب آنکھ کھلتی تو گھر بھی چلے جاتے تھے۔ لیکن پینے کے بعد علامہ اقبال کو تایا کہنا اور ان کی مخالفت کرنے والے آدمی سے جھگڑا کرنے کی ان کی عادت پختہ تھی اور اکثر لوگوں کو ان کی اس عادت کے بارے میں پتہ بھی تھا چنانچہ بعض اوقات دوست انہیں چھیڑنے کے لیے ذرا علامہ اقبال پر تنقید بھی کر لیتے تھے۔

شاد امرتسری ہمارے دوست تھے۔ وہ دل محمد روڈ پر رہتے تھے اور شام کو ان کے ہاں لوگ جاتے تھے اور پینے پلانے والے اپنا اپنا ساز و سامان اٹھا کر وہاں پہنچ جاتے تھے۔ وہاں محمود اختر کیانی کے علاوہ جو لوگ آتے تھے ان میں حبیب جالب، عدم صاحب اور مرحوم نصیر انور وغیرہ شامل تھے۔ یہ جس دن کی بات کر رہا ہوں اس دن وہاں عدم صاحب، محمود اختر کیانی اور پانچ چھ دوسرے افراد موجود تھے۔ میں بھی وہیں تھا۔ عدم صاحب کو معلوم نہیں تھا کہ محمود اختر کیانی اقبال کے ذکر سے بھڑک اٹھتے ہیں۔ انہیں اس بات کا پس منظر بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ بہت معصوم آدمی تھے اور معصومیت ہی میں انہوں نے اقبال کے کسی شعر پر تنقید کر دی۔ فوراً ہی محمود اختر نے کہا: دیکھئے عدم صاحب میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں کوئی گستاخی کر بیٹھوں۔ آپ میرے تائے کے بارے میں کوئی بات نہیں کر سکتے۔ وہ حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ میں نے تمہارے تایا کے بارے میں کب بات کی ہے۔ محمود کہنے لگے کہ آپ نے علامہ اقبال کی بات نہیں کی ہے۔ عدم صاحب کہنے لگے اچھا تو وہ تمہارے تایا کب سے ہو گئے۔ محمود اختر کہنے لگے آپ کو پتہ نہیں کہ وہ میرے والد کے بھائی اور دوست تھے۔ عدم صاحب کہنے لگے کہ چلو ہم یہ بھی مان لیتے ہیں۔ لیکن شاعر پبلک کا آدمی ہوتا ہے اور جہاں ہم ننانوے فیصد اسے پسند کرتے ہیں وہاں ایک فیصد اس سے اختلاف بھی کر سکتے ہیں۔ محمود اختر کہنے لگے کہ میرے سامنے

آپ ایک فیصد چھوڑ اعشاریہ ایک فیصد بھی ان پر تنقید نہیں کر سکتے۔ عدم صاحب کہنے لگے یار چھوڑو ان باتوں کو میں تم سے بڑا شاعر ہوں۔ محمود اختر کہنے لگے کہ اگر یہ بات ہے تو آپ مجھ سے بڑے شاعر بھی نہیں ہیں۔ اگر آپ اقبال کو نہیں مانتے تو آپ بھی مجھ سے بڑے شاعر نہیں ہیں۔ ان کی تکرار جاری تھی کہ درمیان میں تجمل حسین دل بولا اور کہنے لگا کہ یار چھوڑو عدم صاحب تنقید کر سکتے ہیں کیونکہ علامہ اقبال بھی بڑے شاعر تھے اور عدم صاحب بھی بڑے شاعر ہیں۔ اب محمود اختر کیانی اٹھے اور زور سے تجمل حسین دل کو ایک لات ماری اور وہ دروازے سے باہر گرا۔ ایک اور آدمی انہیں بچانے کے لیے آگے بڑھا تو اسے بھی ایک لات ماری اور وہ بھی دور جا کے گرا۔ عدم صاحب اٹھے اور کہنے لگے کہ لو بھئی اب شیر بھی آ گیا ہے۔ یہ ابھی یہ بات کر ہی رہے تھے کہ اس کے عدم صاحب کو بھی ایک لات ماری اور وہ بھی دروازے سے باہر گرے۔ اب کوئی آگے نہیں بڑھ رہا تھا کہ یہ تو پاگل ہو گیا ہے۔ جو آگے جائے گا اسے مار پڑے گی۔ میں وہاں سے اٹھا نہیں اور میں نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے کہا کہ محمود اختر یہ سارے لوگ پاگل ہو گئے ہیں۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو اور علامہ کی شان میں جو گستاخی کرے گا اس کی یہی حالت ہو گی۔ لیکن اگر یہ پاگل ہو گئے ہیں تو تم کیوں پاگل بنتے ہو۔ جب میں نے اس کی تعریف کی اور دوسروں کی برائی کی تو وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا اور کہنے لگا کہ دیکھئے قتیل صاحب! آپ نے ٹھیک بات کی ہے۔ اب کوئی مائی کا لال ہے جو میرے تایا کے خلاف بات کرے۔ میں نے کہا کہ انہیں کافی سزا مل گئی ہے۔ اس لیے اب تم بیٹھ جاؤ۔ وہ وہاں بیٹھ گیا اور بیٹھے بیٹھے وہیں سو گیا۔ میں نے شاد سے کہا کہ اسے صوفے پر تکیہ رکھ کر لٹاؤ اور صبح ہو گی تو موٹر سائیکل پر بھیج دینا۔

نریش کمار شاد پہلے لاہور ہی میں رہتے تھے۔ ان کا اصل وطن کوٹ رادھا کشن تھا۔ لیکن پارٹیشن سے پہلے لاہور ہی میں تھے اور یہیں سے انہوں نے شاعری شروع کی اور رسالہ ''بیسویں صدی'' جو اس وقت لاہور سے نکلتا تھا میں انہوں نے کلرک کے طور پر کام کیا لیکن ان میں اس زمانے میں بھی چمک تھی۔ ان کے والد کا نام دردنکودری تھا اور اس زمانے میں ان کا نام بھی شادنکودری تھا۔ ان کا نام نریش کمار شاد بعد میں بنا۔ بیٹا شادنکودری

تھا اور باپ دردنکودری تھا۔ ان کے والد کا اصل نام نرویا رام تھا اور پختہ شاعر تھے عروضی قسم کے۔

پارٹیشن کے بعد دونوں باپ بیٹا انڈیا چلے گئے اور ایک مشاعرہ سنیدور میں ہوا۔ انہوں نے وہاں مجھے اپنے باپ سے ملوایا۔ ان کی یہ عادت تھی کہ جب پی لیتے تھے تو ان کے اندر سے ایک دیو باہر نکل آتا تھا جو ان لوگوں کو بڑی حقارت سے دیکھتا تھا جنہیں یہ حقارت سے دیکھنا چاہتے تھے لیکن جن لوگوں کی یہ عزت کرتے تھے ان کی پینے کے بعد بھی ضرورت سے زیادہ عزت کرتے تھے۔ شاد کو قطعاً یہ گوارا نہیں تھا کہ کوئی بیٹے کو باپ کے نام سے پہچانے۔ دونوں باپ بیٹا بیٹھے پی رہے تھے اور ایک دوسرے کو ڈال کر دے رہے تھے۔

شاد صاحب مجھے کہنے لگے کہ قتیل صاحب آیئے میں آپ کو اپنے والد سے متعارف کرواتا ہوں۔ یہ میرے والد ہیں دردنکودری۔ آپ نے ان کا نام سنا ہوگا۔ میں نے کہا کہ بالکل سنا ہوا ہے۔ اچھے شعر کہہ لیتے ہیں اور اپنے علاقے میں بہت مشہور ہیں۔ باپ بولا کہ قتیل صاحب میں جیسا بھی شاعر ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے ایک اچھا شاعر پیدا کیا ہے۔ میرا بیٹا آپ کے سامنے ہے۔ شاد کہنے لگے دیکھو قبلہ والد صاحب! آپ اس کا کریڈٹ نہ لیجئے۔ آپ اپنی شاعری کی بات کیجئے۔ مجھے آپ نے شاعر پیدا نہیں کیا تھا۔ میں پیدا ہوگیا تھا اور شاید آپ ہی نے پیدا کیا ہے لیکن شاعر میں خود بنا ہوں۔ یہ کریڈٹ آپ نہ لیجئے۔ باپ نے کہا کہ تو بہت بدتمیز ہوگیا ہے باپ سے اس طرح بات کی جاتی ہے۔ اس نے کہا کہ آپ بیٹے کے کمائے ہوئے نام میں حصہ دار بننا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس بات پر لڑائی ہوگئی۔ باپ نے بیٹے کو تھپڑ مار دیا اور بیٹے نے باپ کو گریبان سے پکڑ لیا بڑی مشکل سے ہم نے انہیں چھڑایا اور یہ نظارہ بھی دیکھا کہ جب ایک شرابی کی انا ایک غلط راستہ اختیار کر لیتی ہے تو اس کا ہاتھ باپ پر بھی اٹھتا ہے۔ یہ ہاتھ ایک شرابی کا نہیں تھا بلکہ ایک شاعر کی انا کا ہاتھ تھا جو غلط راستے پر چل نکلی تھی۔ اب دردنکودری صاحب اس دنیا میں ہیں اور نہ ہی شاد نکودری۔ دردنکودری صحافی تھے اور جالندھر میں ایک روزنامے کے دفتر میں

کام کرتے تھے۔ ایک دن تنخواہ لے کر دفتر سے نکلے اور اس کے بعد آج تک واپس نہیں آئے۔ اس واقعہ کو کوئی بیس سال ہو گئے ہیں اور آج تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کہاں گئے ہیں۔ نریش کمار شاد جمنا کے کنارے گھوم رہے تھے کسی کو پتہ نہیں۔ کچھ راہگیروں نے دیکھا کہ ایک آدمی کا آدھا دھڑ پانی میں ہے اور آدھا باہر کنارے پر۔ جب انہوں نے قریب جا کر دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ آدمی مرا پڑا ہے۔ شناخت ہوئی تو وہ نریش کمار شاد تھے۔

نریش کمار شاد بے حد ذہین آدمی تھا۔ اس نے اپنی زندگی خود ضائع کی اور اگر وہ زندہ رہتا تو اس کا ادب میں بہت بلند مقام ہوتا۔ اتنی چھوٹی عمر میں بھی اس نے جو کچھ لکھا وہ ایسا نہیں ہے کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ اس نے غزل، نظم، قطعات، خاکے اور لطائف تک مرتب کئے اور ان تمام چیزوں میں اس کا اپنا ایک انداز تھا۔ وہ چھوٹی موٹی ملازمت کرتا تھا اور زیادہ تر مشاعروں پر انحصار تھا۔ دہلی میں کنور مہندر سنگھ بیدی، نریش کی بہت سرپرستی کرتے تھے۔ انہیں اس کی شکایتیں بھی آتی تھیں لیکن وہ جانتے تھے کہ اس کے کچھ COMPLEXES ہیں۔ اس کی بناء پر وہ شراب بھی پیتا تھا اور بے احتیاطیاں بھی کرتا تھا۔ اس لیے وہ اسے بچا لیتے تھے۔ آخر دم تک یہی رہا اور جب وہ مر گیا تو اس کی بیوی اور بچوں کی کفالت کا بھی کنور مہندر سنگھ بیدی نے مناسب انتظام کیا۔ نریش کمار شاد ایک اچھا شاعر ہی نہیں تھا بلکہ وہ حاضر جواب بھی تھا۔ ایسا جملہ کستا تھا کہ اس کی کاٹ دیر تک محسوس ہوتی تھی۔ اگر کوئی اس پر جملہ کستا تھا تو وہ اس کا بہت ٹھاٹھ کا جواب دیتا تھا۔ یہ ۱۹۵۵ء میں لاہور میں آئے اور بہت دنوں تک میرے پاس ٹھہرے۔ پھر ہم ایک ساتھ راولپنڈی بھی گئے۔ اس زمانے میں شراب کا چلن تو تھا ہی اور پھر انڈیا کا شاعر آ جائے تو خصوصی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ اب ان کی حاضر دماغی کا ایک واقعہ بتاتا ہوں۔

ہمارے ایک بہت عزیز دوست راولپنڈی میں رہتے ہیں۔ بہت آزاد خیال، لبرل اور غیر متعصب ہیں۔ اس دن خدا جانے انہیں کیا ہوا کہ نریش کمار شاد بیٹھا ہوا کچھ دوستوں کے ساتھ ایک میز پر کھانا کھا رہا تھا کہ میرے اس دوست کو جانے کیا سوجھی اور کہنے لگا کہ نریش کمار جی! معلوم ہے آپ کیا کھا رہے ہیں۔ سب لوگ پیے ہوئے تھے۔ نریش نے

جواب دیا کہ کھانا کھا رہے ہیں۔ کہنے لگے کہ نہیں تمہاری پلیٹ میں کیا ہے۔ نریش نے کہا کہ تم ہی بتا دو۔ کہنے لگا کہ یہ گائے کا گوشت ہے جو تم کھا رہے ہو۔ نریش نے کہا اچھا۔ یار میں تو اسے سؤر کا گوشت سمجھ کر کھا رہا تھا۔ چلو کوئی حرج نہیں۔ اگر تم میرے ساتھ مل کر سؤر کا گوشت کھا سکتے ہو تو میں بھی تمہارے ساتھ مل کر گائے کا گوشت کھا سکتا ہوں۔ آخر ہم دوست ہیں۔ اس کے بعد ہمارا وہ دوست اتنا چپ ہوا کہ اس سے کوئی جواب نہ بن پایا۔ سب لوگ ہی سناٹے میں آ گئے تھے۔ یہ اتنا حساس معاملہ تھا کہ اس پر ہندو مسلم فسادات ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہاں امن رہا۔ ویسے بھی نریش کمار شاد نے یہ جواب ایک ہندو کے طور پر نہیں دیا تھا بلکہ ایک جواب کے طور پر دیا تھا۔ جیسا سوال تھا ویسا ہی جواب تھا۔ متعصب دونوں ہی نہیں تھے۔ جب کبھی شراب اس طرح بولتی ہے تو لوگوں کا اعتراض بجا دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ اس روز بھی شراب کا CLIMAX لوگوں نے دیکھا۔

جس طرح میں نے بتایا ہے کہ محمود اختر کیانی علامہ اقبال کے خلاف رائے زنی سے چڑتے تھے۔ اسی طرح ہمارے ایک میوزک ڈائریکٹر رشید عطرے تھے۔ ان کی پینے کے بعد یہ عادت تھی کہ وہ ہیر پھر کر اپنے والد کا نام بات میں لے آتے تھے اور یونہی ان کے ساتھ کسی واقعہ کو منسلک کر کے بات کرنے والے سے لڑنے لگتے تھے۔ ایک دن مال روڈ پر ''ونڈر لینڈ'' نامی کھلونوں کی دوکان کے پیچھے منٹو صاحب کے کمرے میں میں، رشید عطرے، منٹو صاحب اور ایک دو اور آدمی موجود تھے۔ شاعروں اور مصوروں کی باتیں چل نکلیں تو بات گویوں تک جا پہنچی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا ذکر آیا کہ وہ جس فن پر نظر ڈالتے تھے تو اسے پی جاتے تھے اور اس کے بارے میں اتنی معلومات حاصل کر لیتے تھے کہ پوری گفتگو کر سکتے تھے۔

روایت یہ ہے کہ کسی بڑے گویے کے پاس بیٹھے ہوئے انہوں نے کسی فنی نقطہ پر گفتگو کرنا چاہی۔ جیسے کہ صاحب فن لوگ غیر صاحب فن لوگ کی بات کو وقعت نہیں دیتے اور یہ بات خاص طور پر اہل موسیقی میں ہے وہ دوسرے کو عطائی سمجھ کر اس کی تحقیر کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ فن موسیقی صرف انہی کی میراث ہے۔ وہاں ہم سب میں مولانا آزاد

کے حوالے سے یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ مولانا نے جب کوئی فنی نقطہ بیان کیا تو اس گویے نے کہا کہ مولانا آپ اس معاملے کو چھوڑیئے۔ آپ عالم دین ہیں آپ کو موسیقی سے کیا تعلق۔ آپ اس میں کیوں ٹانگ اڑا رہے ہیں۔ مولانا کو یہ بات چبھی۔ اس کے بعد انہوں نے علم موسیقی کو پڑھا اور اس کے بارے میں بہت حد تک پریکٹیکل بھی کیا۔ اس کے بعد وہ پھر اس شخص کے پاس گئے اور اس سے اس موضوع پر گفتگو کی اور ثابت کیا کہ تم اس بارے میں کچھ نہیں جانتے ہو۔ یہ بات ہو رہی تھی کہ رشید عطرے اچانک بھڑک اٹھے اور کہنے لگے کہ منٹو صاحب! آپ کو میرے باپ کی توہین کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ منٹو صاحب نے کہا کہ ہم تو ابوالکلام آزاد اور ایک گویے کی بات کر رہے ہیں تمہارا باپ کہاں سے آ گیا۔ کہنے لگے کہ براہ راست تو کوئی تعلق نہیں لیکن جب آپ ابوالکلام آزاد کی تعریف کریں گے تو ظاہر ہے کہ میرے باپ کی بے عزتی ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ ان کی بے عزتی کیسے ہوگی۔ کہنے لگے ایسے ہوگی کہ میرا باپ بھی موسیقی سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر رشید عطرے کہنے لگے کہ میرا باپ فن میں ابوالکلام آزاد سے بڑا تھا۔ منٹو صاحب نے کہا کہ وہ بڑا ہوگا لیکن اب تم ہم سے کیا چاہتے ہو۔ کہو تو لکھ کر دے دیں۔ عطرے صاحب اب پیچھا چھوڑنے میں نہ آئیں۔ منٹو صاحب پہلے تو ٹالتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے ان کے والد صاحب کے بارے میں صرف ایک ہی جملہ ایسا بیان کیا کہ رشید عطرے چپ ہو گئے۔ لیکن اس چپ ہونے کے بعد عطرے صاحب نے کتنے دنوں تک منٹو صاحب سے بات نہیں کی۔ حالانکہ دونوں دوست تھے۔ پھر ایک بار عطرے صاحب کو دیکھا۔ پارٹیشن کے بعد دلیپ کے بھائی ناصر یہاں آئے ہوئے تھے وہ یہاں کچھ دیر رہے اور فلموں میں کام بھی کیا۔ پھر یہاں اپنی ایک فلم بھی بنانے لگے۔ اس کے میوزک ڈائریکٹر رشید عطرے تھے۔ اور میں اس فلم کا نغمہ نگار مقرر ہوا۔ کچھ کام ہوا۔ لیکن بعد میں انہوں نے فلم بنانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ لیکن یہاں ایک ڈیڑھ ماہ خوب محفلیں رہیں۔

یہاں بھی عطرے صاحب کے ساتھ ایک شام اسی طرح کی گزری جس طرح منٹو صاحب کے ساتھ گزری تھی۔ اس شام ناصر خان نے کہیں میوزک ڈائریکٹر سجاد کا ذکر چھیڑ

دیا۔ اور کہا کہ وہ بہت باکمال آدمی ہے اور غزل بناتا ہے تو کمال کر دیتا ہے۔ پھر کہا کہ وہ ایک ساز ''سرود'' اتنا اچھا بجاتا ہے کہ ہندوستان میں اس کے مقابلے کا کوئی آدمی نہیں۔ اس پر رشید عطرے بھڑک اٹھے اور کہنے لگے کہ ناصر خان! ہر چیز کی کوئی حد ہوتی ہے۔ آپ میرے باپ کی بے عزتی کر رہے ہیں۔ ناصر خان نے کہا کہ وہ کیسے۔ کہنے لگے کہ آپ کو معلوم نہیں کہ میرا باپ جو ہارمونیم بھی بجاتا تھا اس جیسا ہارمونیم کوئی ساری دنیا میں نہیں بجا سکتا تھا۔ ناصر نے کہا کہ وہ بجاتے ہوں گے۔ آپ کے باپ ہمارے باپ ہیں لیکن میں سرود کی بات کر رہا ہوں۔ اگر میں کہوں کہ وہ آپ کے والد سے اچھا سرود بجاتے تھے تو آپ کے والد کی بے عزتی ہو۔ رشید عطرے کہنے لگے کہ نہیں آخر ساز کی بات ہے۔ میرے والد سے اچھا ساز کوئی نہیں بجاتا تھا۔ وہ اگر سرود بھی بجاتا تو بہت اچھا بجاتا۔ انہوں نے کہا بھئی اتفاق سے وہ سرود نہیں بجاتے تھے۔ چنانچہ وقتی طور پر ان میں ناراضگی ہوگئی لیکن ممبئی سے جو لوگ آئے تھے ان کے ساتھ ناراضگی بھی جلد ہی صلح میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ چنانچہ رشید عطرے کی یہ عادت تھی کہ جب وہ پی کر آؤٹ ہو جاتے تھے تو انہیں اپنے والد یاد آ جاتے تھے۔ والد کا احترام اچھی بات بھی ہے لیکن ضرورت سے زیادہ احترام بھی کبھی کبھی بدمزگی کا باعث بن جاتا ہے۔

میرے دوست احمد راہی کا ذکر تفصیل سے الگ کروں گا۔ لیکن یہاں ان کی پینے کے بعد کی عادت کا ذکر کروں گا۔ وہ جب پی لیتے تھے تو انہیں امرتسر اور اپنی ماں کی قبر یاد آتی تھی۔ ان کے تحت الشعور میں یہ دونوں چیزیں رچی بسی ہوئی تھیں اور جب زیادہ پی لیتے تھے تو یہی موضوع لے بیٹھتے تھے۔ یہ احساس ان کی نظموں میں بھی نظر آتا ہے۔ جب یہ امرتسر گئے تھے تو انہوں نے ایک نظم کہی تھی جس نے امرتسر والوں کو رلا دیا تھا۔ اس نظم میں انہوں نے امرتسر میں اپنے بچپن اور ماں کی قبر کا ذکر کیا تھا۔ یہ پی کر ماں کی قبر کا ضرور ذکر کرتے تھے۔ یہ ان کی عادت میں شامل تھا۔

میرے یہ بھائی اس زمانے میں مسرت نذیر پر عاشق تھے۔ اب مجھے یہ معلوم نہیں کہ مسرت نذیر پر ان کے عشق کا کیا اثر تھا۔ ایک دن ہم ملکہ سٹوڈیو مسلم ٹاؤن میں شوٹنگ کے

سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔ احمد راہی اسی موڈ میں آ گئے۔ چونکہ مسرت نذیر کی شوٹنگ تھی۔ اس لیے وہ کسی چھوٹے سے واقعہ پر دل برداشتہ ہو کر وہاں سے چلے گئے۔ خیال تھا کہ باہر گئے ہوں گے۔ باہر دیکھا تو وہاں نہیں تھے۔ بہت تلاش کیا لیکن نہیں ملے۔ آخر ان کے ایک دوست ماڈل ٹاؤن کی طرف سے آ رہے تھے انہوں نے بتایا کہ یہ ماڈل ٹاؤن سے آگے کہیں پیدل جا رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ راہی صاحب کدھر جا رہے ہو۔ کہنے لگے کہ اس مسرت نذیر نے مجھے دل شکستہ کر دیا ہے اور اب اس ملک میں رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس لیے امرتسر جا رہا ہوں۔ وہاں ماں کی قبر سے لپٹ کر کہوں گا کہ میرے ساتھ یہ ہوا ہے۔ چنانچہ ان کی یہ عادت یہاں تک پہنچ گئی کہ معاشقے میں بھی ان کا ماں کی قبر سے لپٹ کر رونے کو جی چاہا۔

منیر نیازی اپنے ترک وطن کے بعد منٹگمری میں آ کر آباد ہوئے۔ ان کی فیملی بھی ان کے ساتھ تھی۔ ان کا ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں حصہ تھا لیکن ان کا جی کاروبار میں نہیں لگتا تھا۔ یہ اکثر لاہور آ جایا کرتے تھے۔ انہوں نے منٹگمری سے ایک پرچہ بھی نکالا تھا۔ لاہور میں یہ پتھروں والی کوٹھی میں رہتے تھے جسے اس کے مالکان ہوٹل کے طور پر چلاتے تھے۔ خوبصورت کوٹھی تھی اور کرایہ بھی کم ہی تھا۔ منیر نیازی کا اس زمانے میں پرابلم پبلک ریلیشنگ تھا۔ الگ الگ لوگ وہاں آ کر رہتے تھے۔ یہ آتے تھے اور بہت سی بیئر خرید کر رکھ دیتے تھے۔ اور کار آمد لوگوں کو بلا کر بیئر پلاتے تھے۔ یہ ان کا تعلقات بڑھانے کا ذریعہ تھا۔

اسی پتھروں والی کوٹھی کے اوپر ایک فلم پروڈکشن کا دفتر تھا میں اس میں بیٹھا فلم ''امانت'' کے گانے لکھ رہا تھا تو آتے جاتے منیر نیازی سے ملاقات ہوتی تھی۔ کئی بار انہوں نے کہا کہ آؤ بیٹھ کر بیئر پیتے ہیں۔ میں شروع سے ہی مفت خوری کا عادی نہیں تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ منیر کا ایک مقصد تو پبلک ریلیشنگ ہے۔ دوسرا کچھ مفت خورے جو اس کے کام آ بھی نہیں سکتے وہ بھی یہاں آ کر اس سے کھاتے پیتے ہیں۔ اس لیے میں کیوں ان مفت خوروں میں شامل ہو جاؤں۔ نہ تو میں اس طرح منیر نیازی کے کام آ سکتا ہوں

جس طرح یہ چاہتے ہیں اور نہ میں مفت خورا ہوں۔ چنانچہ میں نے ان کے ساتھ یہ سلسلہ روا نہیں رکھا۔ جب یہ ذرا آگے بڑھے اور عام شاعر کی حیثیت سے آگے آئے تو مجھے فخر ہے کہ ان کے ایک میزبان کی حیثیت سے میرا نام بھی آتا ہے۔ یہ کافی دنوں تک میرے گھر پر رہے اور مجھے انہوں نے عزت بخشی۔

انہیں میں نے دیکھا کہ ویسے تو ان پر وارفتگی طاری رہتی ہے لیکن حساب کتاب میں پینے کے بعد یہ بہت ہوشیار ہو جاتے ہیں اور میں نے کسی کو پینے کے بعد ان سے زیادہ ہوشیار نہیں دیکھا۔ ایک بار ہم کوئٹہ میں ایک مشاعرے میں گئے ہوئے تھے۔ یہ رات سے ہی بہت پی رہے تھے اور جب صبح ہوئی تو بھی پی رہے تھے۔ جب چیک دیئے گئے تو سب نے چپ چاپ جیب میں ڈال لیے۔ جب چلنے لگے تو منیر نیازی کہنے لگے کہ سب لوگ ٹھہرو۔ ان چیکوں پر تو دستخط ہی نہیں ہوئے۔ اس سے پہلے یہ عالم تھا کہ چونکہ یہ NEAT ہی پی رہے تھے اس لیے ہمیں ڈر تھا کہ کہیں انہیں اٹھا کر ہی نہ لے جانا پڑے لیکن چیک دیکھنے کے بعد ان کے سارے حواس مجتمع ہو گئے۔ سب نے چیک نکال کر دیکھے تو واقعی ان پر دستخط نہیں تھے۔ چنانچہ شراب پی کر ان کے شعور اور تحت الشعور دونوں بیدار ہو جاتے ہیں اور یہ اسی بیداری کا نتیجہ ہے کہ ہم اس روز پریشانی سے بچ گئے۔

دوبئی میں چند سال پہلے کا واقعہ ہے کہ یہ اسی طرح پی رہے تھے۔ پیتے پیتے کچھ اراضی کی الاٹمنٹ کا ذکر چلا۔ بھٹو صاحب کے زمانے میں منیر نیازی کو بھی حنیف رامے صاحب نے ایک مربع زرعی اراضی الاٹ کی تھی۔ اس کا ذکر آیا تو نجانے انہیں کیا سوجھی اور شاید یہ بتانا چاہا کہ انہوں نے بھٹو کا کاسہ لیس بن کر یہ مربع نہیں لیا۔ چنانچہ انہوں نے بھٹو صاحب کو ماں کی گالی دی۔ ہم وہاں جس کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے وہ بھٹو صاحب کا حامی تھا۔ وہ کچھ کہہ بھی نہیں پایا۔ اس نے ان کی طرف گھور کر قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا یار منیر نیازی کسی کا خیال کرو اور اس طرح کی بات مت کرو۔ بھٹو کو اب تم گالی دو یا نہ دو اب وہ مربع واپس نہیں جائے گا۔ اب منیر نے مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھا اور پھر اس نے ایک ایسی ہستی کو گالی دی جس پر مجھے غصہ آیا اور میں نے کہا کہ دیکھو اب میرا بھی

پارہ چڑھ سکتا ہے اس لیے اس بات کو چھوڑو۔ دراصل منیر نیازی صاحب نے پہلی بات کو بیلنس کیا اور یہ تاثر دیا کہ جیسے وہ یہ سب کچھ وارفتگی میں کہہ رہے ہیں۔ حالانکہ منیر نیازی صاحب نشے میں ہو کر جتنے ہوشیار ہو جاتے ہیں اتنا ہوشیار میں نے بہت کم لوگوں کو دیکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اول تو خدا کسی کو شراب پینے کی عادت نہ ڈالے لیکن اگر یہ عادت پڑ ہی جائے تو میری دعا ہے کہ خدا اسے نشے کے بعد منیر نیازی جیسی کیفیت دے کیونکہ اس سے نقصان کوئی نہیں ہوتا۔ یہ نشہ کر کے بھی چوکس رہتے ہیں۔

ان کی نشے کی ایک اور عادت بھی دیکھی، کہ اگر کسی جگہ انہیں بلا لیا جائے اور میزبان ان کے سامنے بوتل رکھ دے تو یہ جتنی پی سکیں پی لیتے ہیں اور باقی لوگ تو نشے کی حالت میں وہاں اپنی چیزیں بھول آتے ہیں مگر یہ آتے ہوئے بے خودی و ہشیاری کی کیفیت میں باقی بچی ہوئی بوتل کو اپنے ساتھ گھر لے جانا کبھی نہیں بھولے۔

جب فلم ''قاتل'' بن رہی تھی اور میں انور کمال پاشا صاحب کی ٹیم میں مستقل طور پر کام کر رہا تھا۔ پاشا صاحب نے اپنے ادارے میں اچھے لکھنے والوں کو یکجا کیا ہوا تھا۔ چنانچہ سیف الدین سیف، تنویر نقوی مرحوم اور میں ان کے ہاں شاعر کے طور پر کام کرتے تھے۔ ہم یہ کام مل کر بھی کرتے تھے اور الگ الگ بھی کرتے تھے۔ ہم تینوں اس زمانے میں تھوڑی سی پیتے تھے۔ تنویر نقوی صاحب کا کچھ اور معاملہ تھا اور ان میں شراب سے ہٹ کر بھی کچھ عادتیں تھیں۔ سیف صاحب اور میں بہت کم مقدار میں استعمال کرتے تھے۔

پاشا صاحب بالخصوص مجھے کہتے تھے کہ آپ قوم کا سرمایہ ہیں اور یہ شراب واقعی خانہ خراب ہے اس لیے اس سے بچ کر رہئے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر یہ واقعی لت پڑ گئی تو آپ زیادہ پینے لگیں گے اور پھر شاعری دھری رہ جائے گی۔ میں کہتا تھا کہ پاشا صاحب میں کوئی عادی نہیں ہوں۔ ویسے ہی کبھی کبھی تھوڑی لے لیتا ہوں۔ وہ کہتے تھے کہ تھوڑی سے ہی زیادہ بنتی ہے۔ خیر یہ معاملہ چلتا رہا۔ اس کے کچھ عرصے بعد پاشا صاحب کو کھانسی کی شکایت رہنے لگی۔ وہ بہت شدید کھانستے تھے۔ پنجاب میں جسے کتا کھانسی کہتے ہیں وہ کھانسی انہیں ہو گئی تھی۔ کسی نے انہیں یہ علاج بتایا کہ سوتے وقت تھوڑی سی برانڈی پی لیا کریں۔

چنانچہ انہوں نے برانڈی پینی شروع کی۔ اس سے قدرے افاقہ ہوا۔ آہستہ آہستہ انہوں نے سرور محسوس کر کے برانڈی بڑھانی شروع کی۔ اس کے بعد ان کی زندگی میں جنسی بے راہروی آئی تو ان کی شراب نوشی بڑھتی گئی۔ ان کی زندگی میں جو قابل رشک کامیابیاں آئی تھیں وہ اب ناکامیوں میں تبدیل ہونے لگیں۔ کیونکہ پہلے تو یہ سرتا پا تخلیق میں ڈوبے رہتے تھے۔ ہر چند کہ انہوں نے ایک ٹیم رکھی ہوئی تھی لیکن مرکزی کردار انہی کا ہوتا تھا۔ جب زندگی میں بے راہروی شروع ہوئی تو یہ شراب بھی کثرت سے پینے لگے۔ تب انہوں نے اپنا کام بھی نائبین کے سپرد کیا جس کے بعد پے در پے ان کی فلمیں ناکام ہونے لگیں۔ جبکہ پہلے صورت یہ تھی کہ جب ان کی فلم اناؤنس ہوتی تھی تو ڈسٹری بیوٹر اپنی تجوریوں کے دہانے کھول دیتے تھے۔ اور پیسوں کے ڈھیر لگ جاتے تھے۔ یہ بھی اپنے کارکنوں کو بہت خوش کرتے تھے۔ مگر ناکامیوں کے بعد یہ حال ہوا کہ یہ بھی کارکنوں سے حیلے بہانے کرنے لگے اور انہیں بھی کچھ غلط بیانی کی عادت ہوگئی۔ حالانکہ اس سے پہلے اس معاملے میں ان کی نیک نامی تھی۔ غرضیکہ شراب میں اتنا ڈوبے کہ نیک نامی بھی نہ رہی۔ اگر یہ آؤٹ بھی ہو چکے تھے اور صرف کہانی یا مکالمے لکھتے تو بھی ان کے پاس جو فن تھا اس کے ذریعے کافی کما سکتے تھے۔

میں ایک طرح سے ان کا ممنون احسان تھا۔ وہ یوں کہ اس زمانے میں اچھے شاعروں کا معاوضہ پانچ سو روپے فی گیت ہوتا تھا جو آج پانچ ہزار روپے سے زائد ہے۔ یہ مجھے اس زمانے میں پانچ سو کی بجائے چھ سو روپیہ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ پانچ سو روپے تو گیت کے ہیں اور ایک سو روپیہ شاعر قتیل شفائی کے لیے میرا نذرانہ ہے۔ پھر جب کبھی میری ضرورت آ جاتی تو ناز برداری کرتے تھے۔

جب ان کی شراب سے یہ کیفیت ہوگئی تو مالی حالت خراب ہوگئی۔ لوگ ان سے دور دور رہنے لگے۔ انہی دنوں میں نے ایک فلم شروع کی جس کا نام تھا "اک لڑکی میرے گاؤں کی۔" ہر چند کہ میرے استاد احمد ندیم قاسمی اعلیٰ درجے کے سٹوری رائٹر تھے لیکن میں پاشا صاحب کا احسان چکانا چاہتا تھا۔ کہانی میں نے پاشا صاحب سے لکھوانے کا فیصلہ کیا

پھر میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ یہ فلم کی تکنیک کو بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ میں ان کے پاس گیا اور ان سے پہلے تو یہ بات کی کہ آپ مجھے شراب کے خلاف سمجھایا کرتے تھے تو میں تو آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔ اصل میں کوئی چیز بھی حواس کو اعتدال میں رکھ کر نہ کریں تو خرابی کے پہلو نکل ہی آتے ہیں۔

ان کے ایک منیجر حسین شاہ ہوتے تھے۔ وہ کھاتے بہت تھے اور پیٹ کافی بڑھ گیا تھا۔ اور دل کی تکلیف بھی ہوگئی تھی۔ ان سے میری بے تکلفی تھی۔ میں نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ دیکھئے کھانا زیادہ کھانے کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا پیٹ اتنا بڑھا ہوا ہے۔ اگر یہ حساب سے کھانا کھاتے تو ان کا پیٹ بڑھا ہوا نہ ہوتا۔ اسی طرح اگر آپ میری طرح پیتے تو آپ کا یہ حال نہ ہوتا۔ دیکھئے میں اب بھی ٹھیک ٹھاک ہوں۔ میں گیت نگار سے پروڈیوسر بن گیا ہوں اور آپ پروڈیوسر سے صرف سٹوری رائٹر بن گئے ہیں۔ خیر وہ میری باتیں سن لیتے تھے۔

پوچھنے لگے کہ کیسے آئے ہو۔ میں نے کہا کہ میں اتفاق سے پروڈیوسر بن گیا ہوں اور آپ سے اپنی فلم کی کہانی لکھوانا چاہتا ہوں۔ کہنے لگے کہ ٹھیک ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو کیا نذرانہ پیش کروں۔ کہنے لگے کہ میں آپ سے پیسے نہیں لوں گا۔ میں نے کہا کیوں آپ مجھے پیسے نہیں دیتے تھے۔ بلکہ آپ تو مجھے پانچ سو کی بجائے چھ سو روپے دیتے تھے۔ میں نے پوچھا کیا پیش کروں۔ وہ چونکہ اس وقت آؤٹ آف مارکیٹ تھے اور جب آدمی کی مانگ نہ ہو تو وہ پیسے بتاتا ہوا ہچکچاتا ہے کہ کہیں دوسرا فریق بھاگ نہ جائے یا بوجھ محسوس کر کے انکار نہ کر دے حالانکہ میں ان کا معتقد اور احسان مند بھی تھا۔ انہوں نے ڈر کے کہا کہ سات کا ہندسہ بڑا برکت والا ہوتا ہے۔ اس لیے سات ہزار روپے ٹھیک ہیں۔ میں نے کہا پاشا صاحب یہ طاق ہندسے والا معاملہ ٹھیک نہیں ہوتا۔ راؤنڈ فگر ہی بہتر ہوتا ہے۔ اس لیے آپ یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ میں نے کہا کہ میں آپ کو دس ہزار روپے دوں گا اور یہ پانچ ہزار روپے آپ ایڈوانس رکھ لیجئے۔ اب آپ مجھے کہانی کا آئیڈیا سنا دیں اور جب کہانی مکمل کریں گے تو باقی پیسے بھی لے لیں۔ لوگ تو عام طور پر صرف ایک

ڈیڑھ ہزار روپے ایڈوانس دیتے ہیں اور پھر چکر لگواتے رہتے ہیں لیکن میں تو ان کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک آئیڈیا سنایا جو مجھے پسند آیا کیونکہ وہ بہرحال ایک اعلیٰ درجے کے لکھنے والے تھے۔

اب میں اس بات کو ان کی عادت پر لا کر ختم کرتا ہوں۔ ان کی یہ عادت تھی کہ یوں تو تھوڑا سا مبالغہ کرتے تھے لیکن پینے کے بعد انتہائی طور پر گپ ہانکتے تھے۔ جب میں انہیں اس وقت ملا ہوں جب یہ پیئے ہوتے تو کہتے کہ اچھا آپ کو میرا پیغام نہیں ملا۔ حالانکہ انہوں نے کوئی پیغام نہیں بھیجا ہوتا تھا۔ میں کہتا کہ کیا پیغام بھیجا تھا۔ کہتے کہ میں چار فلمیں شروع کرنے والا ہوں اور ایک ہفتے کے بعد ایک ساتھ ہی چاروں کا افتتاح کرنا ہے اور آپ ان چاروں کا ایک ایک گانا لکھ کر دیں گے۔ پھر کہتے لکھ لیں گے نا۔ میں کہتا کہ میوزک ڈائریکٹر کون ہے۔ کہتے کہ آپ جسے کہیں گے اسے ہی رکھ لیں گے۔ جھوٹ اس بات سے ہی کھل جاتا تھا کہ فلموں کا افتتاح کرنا ہے لیکن ابھی تک میوزک ڈائریکٹر رکھا ہی نہیں۔ لیکن میں چپ ہو جاتا تھا۔

ان کی یہ عادت تھی کہ وہ پی کر ایک ایسی گپ ہانک دیتے تھے جس سے کسی کا کوئی نقصان نہیں ہوتا تھا لیکن بہرحال گپ ان کی اعلیٰ درجے کی ہوتی تھی۔ چونکہ پڑھے لکھے بھی تھے اور اس وقت ایم ایس سی پاس تھے۔ پھر پڑھے لکھے گھرانے سے تعلق تھا اور حکیم احمد شجاع کے بیٹے تھے۔ وراثت میں انہیں گفتگو کا سلیقہ اور علمیت کا پس منظر ملا ہوا تھا۔ اس لیے اگر کبھی محسوس کرتے کہ سننے والے کو اس گپ کا یقین نہیں آ رہا تو دلائل سے اسے منانے کی کوشش کرتے۔

ان کے فوت ہونے سے ایک ماہ پہلے میں ان سے ملا تھا۔ ان کا ایک بیٹا امریکہ گیا ہوا ہے۔ حکیم صاحب جو اثاثہ چھوڑ گئے تھے اس میں مکان وغیرہ شامل تھا۔ اسی مکان میں اب بھی رہتے تھے لیکن اپنے مالی حالات درست نہ تھے۔ میں آخری بار جب ان سے ملا تو کہتے تھے کہ میرا بیٹا امریکہ سے سٹوڈیو کا پورا سامان لے کر آ رہا ہے۔ لیبارٹری کلر ہوگی اور پھر اپنے سٹوڈیو میں اپنی فلمیں بنایا کریں گے۔ مجھے کہنے لگے کہ آپ کا تو میں نے یہ کیا

ہے کہ آپ میوزک کے شعبے کے مکمل انچارج ہوں گے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ یہ وہ خواہشیں ہوتی ہیں کہ جب آدمی بڑے اونچے مقام سے نیچے آ کر گرتا ہے۔ تو اس کی ناتمام حسرتیں اور آرزوئیں سامنے آجاتی ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ یہ مکمل ہو جائیں۔ چنانچہ وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتا ہے۔ اور اپنے آپ کو فریب دینے کے لیے ایسی باتیں کرتا ہے۔ یہی حال کچھ پاشا صاحب کا تھا۔

محبوب اختر میرے ان دوستوں میں سے ہیں جنہیں میں بہت ہی عزیز سمجھتا تھا اور جو میرے بہت ہی قریب تھے۔ فلم لائن میں بھی مجھے وہی لے کر گئے جبکہ میرا فلم کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ پھر بھی انہیں مجھ پر اعتماد تھا کہ یہ اچھا کام کرے گا۔ میں نے پارٹیشن سے پہلے ان کی فلم کے لیے دو گانے لکھے اور ان کی مجھ سے جو توقعات تھیں وہ پوری بھی ہوئیں۔ لوگ پوچھتے تھے کہ یہ گانے لکھے ہوئے کس کے ہیں۔ شاعر کو داد اسی وقت ملتی ہے جب گانا ریکارڈ ہو رہا ہو اور کوئی خاص طور پر پوچھے کہ گانا لکھا ہوا کس کا ہے۔

محبوب اختر کے بڑے بھائی فضل الرحمان اشک اپنے زمانے میں ایک مختصر عرصے تک شاعری بھی کرتے رہے۔ اور ان کا ایک شعر تھا:

؎ وہ لوگ رہ زیست میں یاد آئے ہیں اکثر
جن لوگوں نے دو چار قدم ساتھ دیا ہے

یہ راولپنڈی میں رہتے تھے اور ایشیاٹک آپٹیکل کمپنی کے نام سے ان کا ادارہ تھا۔ باہر سے جو شاعر آتے تھے یہ گھر پر ان کی دعوتیں وغیرہ کرتے تھے۔ یہ محبوب اختر کی بات بہت مانتے تھے بلکہ ایک ایسا وقت بھی آیا جب پورا خاندان ان کی بات بہت مانتا تھا۔ محبوب اختر کو فلم میں لکھنے کا شوق تھا۔ یہ پارٹیشن سے بہت پہلے ممبئی گئے اور وہاں کاردار سٹوڈیو میں ملازم ہوئے۔ جب فلم مغل اعظم کا پہلا ورژن شروع ہوا جو تھوڑا سا فلما کر ضائع ہو گیا تھا۔ اس میں پرتھوی راج ہیرو تھے اور اس فلم کے سنیریو رائٹر (SCENARIO WRITER) محبوب اختر تھے۔ پھر جب بعد میں ''شاہجہاں'' فلم بنی تو اس میں بھی یہ سٹوری ڈیپارٹمنٹ میں تھے اور بالآخر پارٹیشن سے پہلے انہوں نے اپنی فلم پروڈکشن کی

بنیاد ڈالی اور اس پروڈکشن میں امان اللہ نیازی بھی ان کے پارٹنر تھے جو آخر میں سیکرٹری ڈیفنس تھے اور ہارٹ اٹیک ہو جانے کی وجہ سے انتقال کر گئے تھے۔

شاعروں کی قدر و منزلت تو محبوب اختر صاحب کے گھر میں تھی ہی۔ انہیں پینے کی کچھ عادت تھی یہ پنڈی کلب کے ممبر تھے اور جب بھی کوئی دوست پنڈی جاتا تھا تو یہ اسے اپنے ساتھ کلب میں لے جاتے تھے۔ پینے کے بعد ان کی عادت تھی کہ یہ حاتم طائی بن جاتے تھے۔ اور جو نہ مانگو وہ بھی دوسرے کی جھولی میں ڈال دیتے تھے۔ اگر کسی نے کہا کہ مجھے کل دو سو روپے کی ضرورت ہے اور مجھے یہ پیسے ٹیکسلا سے جا کر ہی لانے پڑیں گے تو یہ جیب میں ہاتھ ڈال کر تین سو روپے نکال کر دے دیتے۔ کلب کے ممبر ہونے کی وجہ سے وہاں ان کے دستخط چلتے تھے اور نقد ادائیگی نہیں کرنی پڑتی تھی اس لیے یہ حاتم طائی بن سکتے تھے۔ احمد فراز ان کی بہت اچھی نقل کرتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ ایک بار انہوں نے بیرے کو بلایا اور کہنے لگے کہ دیکھو بھئی یہ احمد فراز ہیں بہت بڑے شاعر ہیں۔ انہیں یاد رکھنا یہ میرے دوست ہیں۔ اس لیے جاؤ اور پہلے تو ہمارے لیے ایک ایک بڑا لے کر آؤ باقی تمہیں پھر بتاؤں گا۔ جب بیرا وہ لے آیا تو اس کے منیجر کو بلا لیا۔ ان کا نام راجہ احسان تھا اور وہ ان کے دوست ہی تھے۔ ان سے کہنے لگے کہ راجہ صاحب احمد فراز کو پہچان رکھئے یہ جب بھی اس کلب میں آئیں میرے اکاؤنٹ میں پی سکتے ہیں اس کے بعد ایک بڑا پیگ اور منگوایا۔ اس طرح باتیں کرتے رہتے اور پیتے رہتے۔ قریب والے میز پر کوئی فارغ بیٹھا ہوتا تو اسے بھی بلوا لیتے اور اپنے اکاؤنٹ میں سے پلاتے۔ اور دستخط کرتے رہتے۔

روزانہ صبح کے وقت دوکان پر بل منگوایا کرتے تھے۔ جب بل آتا تو کہتے کہ اتنا بل کیوں ہے۔ چنانچہ پہلے تو جا کر راجہ صاحب سے لڑتے تھے اور پھر اگلی شام کو دوبارہ وہی سلسلہ شروع کر دیتے تھے۔ چنانچہ ان کی عادت تھی کہ پینے کے بعد یہ شاہ خرچ بن جاتے تھے اور جو جیب میں ہوتا تھا وہ بھی لٹا دیتے تھے اور جو ویسے مل جاتا تھا تو اسے بھی اپنے اکاؤنٹ سے پلا دیتے تھے۔

خورشید انور ہندو پاک میں ایک ایسا نام ہے جس سے پرانے اور نئے سبھی لوگ

واقف ہیں۔ وہ لاہور کے ایک بہت بڑے وکیل خواجہ فیروز دین کے صاحبزادے تھے اور اپنے خاندان کے سب سے زیادہ ہونہار فرد تھے۔ ان کے دادا ڈپٹی کمشنر ریٹائر ہوئے تھے اور باقی خاندان بھی اچھے عہدوں پر تھا۔ ان کے بھائیوں میں سے بھی جو جہاں ہے نامور ہے۔ آگے اولاد بھی ماشاء اللہ لائق نکلی ہے۔ جس وقت مسلمان پرائمری پاس نہیں ہوتے تھے خورشید انور نے اس زمانے میں ایم اے کیا تھا۔ اور گولڈ میڈلسٹ کہلوائے۔ جس دن گولڈ میڈل ملنے والا تھا یہ اپنے استاد سے میوزک کی تعلیم لے رہے تھے۔ اور گولڈ میڈل لینے نہیں گئے۔ اس سے ان کی موسیقی کے جنون کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہ پانچ وقت کے نمازی تھے۔ یہ مجھے معلوم نہیں کہ یہ کب سے نمازیں ادا کر رہے تھے لیکن میرا جب ان سے واسطہ ہوا تو یہ نمازیں ادا کیا کرتے تھے۔ یہ پارٹیشن کے بعد کی بات ہے۔ انہوں نے ''انتظار'' فلم کے لیے مجھے بلایا اور میں نے ان کے ساتھ مل کر کام کیا۔ اس دوران میں نے نوٹ کیا کہ پانچ وقت کی نماز، ایک وقت کی شراب اور صبح کی تلاوت ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔ ڈائریکشن میں انہیں بہت زیادہ ملکہ حاصل تھا لیکن میوزک میں نئے نئے تجربے کرنے کے شائق تھے۔ یہ خود بھی کسی زمانے میں شاعر رہے تھے اور فیض صاحب کے کلاس فیلو رہے تھے۔ اس وقت فیض صاحب کو موسیقی کا شوق ہوتا تھا اور انہیں شاعری کا۔ پتہ چلا کہ فیض صاحب کا جب شروع میں کسی لڑکی پر دل آیا ہوا تھا تو اسے جو خط لکھا کرتے تھے ان میں سے ایک خط میں انہوں نے خورشید انور کا کہا ہوا شعر لکھ کر بھیجا تھا۔ یہ بات مجھے خورشید صاحب نے بتائی تھی اور جب میں نے فیض صاحب سے اس کی تصدیق کی تو انہوں نے بھی کہا کہ یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ اس وقت میں شاعر نہیں تھا۔ یہ شاعر تھے۔

میں نے دو آدمیوں کو ایک جیسی شراب پیتے دیکھا۔ ان میں سے ایک جوش ملیح آبادی تھے اور دوسرے خورشید انور۔ جوش صاحب کا تو پینے کا بڑا اہتمام ہوتا تھا اور وہ عین سورج غروب ہونے کے وقت شراب پینی شروع کرتے تھے اور چاندنی وغیرہ سجا کر بیٹھتے تھے۔ پھر گھڑی سامنے رکھی ہوتی تھی اور نہ ایک منٹ ادھر ہونے دیتے تھے نہ ادھر۔ ان کا

اپنا شعر ہے۔

؎ جب مہرِ مبیں غروب ہوتا ہے
پیمانہ بکف طلوع ہوتا ہوں میں

جوش صاحب دن میں نہیں پیتے تھے اور شام کے وقت گھڑی رکھ کر تین پیگ سوا دو گھنٹے میں ختم کرتے تھے۔ خورشید صاحب بھی تین ہی پیگ پیتے تھے اور ایک کوارٹر منگواتے تھے کیونکہ اگر زیادہ شراب پڑی ہوتی تو ادھر ادھر سے لوگ آ کر جھپٹ پڑتے تھے۔ یہ اپنے دفتر میں بیٹھ کر پیتے تھے۔ ایک کوارٹر میں ساڑھے تین پیگ ہوتے ہیں۔ یہ اس میں سے تین پیگ پی کر آدھا پیگ چھوڑ دیتے تھے اور کوئی کام کرنے والا لڑکا اپنا شوق پورا کر لیتا تھا۔

پینے کے بعد ان کی عادت تھی یہ مذہب پر بات کرتے تھے۔ ان کے دوست مسعود پرویز بلانوش تھے۔ دونوں قرآن کے بہت اچھے قاری تھے اور انہوں نے بڑی گہرائی سے قرآن مجید کا مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ جب یہ پی لیتے تو دونوں مذہب کے بارے میں بڑی تفصیلی گفتگو کرتے۔ اگر مسعود پرویز نہ ہوتے اور کوئی اور بیٹھا ہوتا تو یہ فن پر ایسی ایسی باتیں بتاتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی کہ ایک وہ شخص جسے اہل موسیقی عطائی کہتے ہیں وہ موسیقی کے بارے میں کیا کچھ جانتا ہے۔ یہ اس کا ثبوت بھی دے گے اور انہوں نے ''آہنگ خسروی'' کے نام سے ای ایم آئی کے لیے ریکارڈنگ کی۔ ان کے تقریباً بیس ایل پی ہیں جن میں انہوں نے تقریباً سو راگنیاں تحقیق کر کے اچھے گویوں سے گوائیں اور اصلاح بھی کی۔ جہاں جہاں کوئی غلط گا رہا تھا اس کی اصلاح کی اور انہوں نے مانا کہ یہ اصلاح واقعی ٹھیک ہے۔ انہوں نے ان راگنیوں کے ساتھ ساتھ NARRATION بھی دی۔

ان میں سے جو عادت نکلتی تھی وہ بھی یہی تھی کہ اپنے آپ کو سب سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور بعض اوقات یہ بھی ہوتا تھا کہ یہ مانے ہوئے لوگوں کی تحقیر کرتے تھے۔ نوشاد کا ذکر آتا تو کہتے کہ ٹھیک ہے وہ بھی اچھا میوزک ڈائریکٹر ہے لیکن

اور لیکن کہہ کر دوسری باتیں شروع کر دیتے تھے۔ شاعری کا ذکر آتا تو اقبال کو اس لحاظ سے تھوڑی رعایت دے جاتے تھے کہ اسے اپنا پھوپھا بیان کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بچپن میں علامہ نے مجھے کئی بار گود میں لے کر کھلایا بھی ہے۔ اس رشتے کے اعتبار سے یہ پینے کے دوران صرف علامہ اقبال کا لحاظ کرتے تھے ورنہ کسی شاعر کا ذکر آ جائے تو لیکن کہہ کر اس کے خلاف بات شروع کر دیتے تھے۔

دن میں جب دوست، خاص طور پر میاں اکرم کاردار جو ان کے بے تکلف دوست تھے۔ کہتے کہ رات تمہیں کیا ہو گیا تھا۔ اچھی خاصی بات کرتے ہوئے تم لوگوں کی برائیاں کرنے لگتے ہو۔ تو یہ حیران ہو کر کہتے کہ میں برائی تو نہیں کرتا۔ میں تو صرف اظہار رائے کرتا ہوں۔ چنانچہ وہ دوست کہتا کہ چلو میں اب نوشاد کی بات کرتا ہوں۔ بتاؤ تمہاری نوشاد کے بارے میں کیا رائے ہے؟ تو خورشید انور کہتے کہ اس کے بارے میں میری بڑی اچھی رائے ہے۔ وہ بہت اعلیٰ درجے کا میوزک ڈائریکٹر ہے۔ تو وہ دوست کہتا کہ پھر رات تم نے یہ کیوں نہیں کہا تھا۔ ہنس کر کہتے کہ رات میں نے کیا کہا تھا وہ کہتا کہ تم یہ بات کہہ کر پھر لیکن کہہ کر آگے کچھ شروع کر دیتے تھے۔

چنانچہ یہ ان کی عادت تھی کہ وہ پینے کے بعد لیکن کہہ کر دوسرے کے خلاف باتیں کرنی شروع کر دیتے تھے۔ مگر ان کی یہ عادت بھی تھی کہ صبح اٹھ کر تلاوت ضرور کرتے تھے اور چونکہ قرآن مجید میں ہے کہ تلاوت خوش الحانی سے کرو، اس لیے خوش الحانی سے قرآن مجید پڑھنے کی کوشش کرتے۔ اب یہ تو پڑھنے والے کو سوچنا چاہئے کہ وہ خوش الحان ہے بھی یا نہیں۔ خورشید صاحب کی آواز کسی زمانے میں تو اچھی ہو گی لیکن آخر آخر میں ان کی آواز اچھی نہیں تھی البتہ اس میں EXPRESSION تھا۔ جب ٹیون یاد کرواتے تھے تو ذرا ذرا سی باریکیاں بتاتے تھے لیکن آواز رہ گئی تھی۔

ہوا یوں کہ ہم ایک فلم ''ہمراز'' کے سلسلے میں ان کے ساتھ گئے۔ جب بھی کوئی فلم بنتی تھی تو یہ اپنے سٹاف یا ٹیم کو ساتھ لے کر جاتے تھے۔ فلم ''ہمراز'' کا انہوں نے سب کچھ کیا تھا۔ انہوں نے اس فلم کی کہانی اور ڈائیلاگ خود ہی لکھے تھے۔ مسعود پرویز اس فلم کے

ڈائریکٹر تھے۔ میں مسعود پرویز اور خورشید انور اور چار چھ آدمی ایک ساتھ روانہ ہوئے تھے۔ اس فلم کے پروڈیوسر شیخ رشید تھے جو آج کل ڈپٹی میئر ہیں۔ ہم لوگ ایک ساتھ جا کر امپیریل ہوٹل ایبٹ آباد میں پندرہ دن کے لیے ٹھہرتے تھے۔ میں گانے لکھ لیتا تھا۔ ساتھ ہی میوزک ڈائریکٹریشن بنا لیتا تھا۔ ساتھ ہی کچھ گفتگو ڈائریکشن پر ہو جاتی تھی۔ مسعود پرویز ڈائیلاگ کے بارے میں رائے دیتے تھے۔ اس طرح ہم ایک ٹیم کی شکل میں وہاں کافی کام کر کے آتے تھے۔

ہم سب وہاں لیٹ سوتے تھے۔ باقاعدہ دفتری نظام تھا۔ صبح ناشتے کے بعد پھر کام شروع کر دیتے تھے۔ دوپہر میں کھانے کا وقفہ کر کے اور کچھ دیر آرام کر کے ساڑھے تین بجے پھر کام شروع کر دیتے تھے۔ پھر شام کو پینے کی محفل جم جاتی۔ کھانے کے بعد سیر کرتے اور رات کو دیر تک فلم کے بارے میں بحث کرتے رہتے۔ اس لیے دیر سے سوتے تھے۔ صبح ہوتی تو خورشید صاحب خدا کے حکم کی تعمیل میں خوش الحانی سے تلاوت شروع کر دیتے تھے اور آواز تو خیر ان کی اچھی نہیں تھی۔ پھر بھی یہ بلند آواز سے تلاوت کرتے۔ حالانکہ یہ بہت روشن خیال تھے اور مذہب کے احکام کو جانتے تھے لیکن آواز کے بارے میں شاید سمجھتے تھے کہ وہ بہت خوش الحان ہیں۔ لطیفہ یہ ہوا کہ ایک کمرے میں میں اور مسعود پرویز رہتے تھے اس سے اگلے کمرے میں خورشید انور ٹھہرے ہوئے تھے اور اس سے اگلے کمرے میں ایک غیر ملکی آ کر قیام پذیر ہوا۔ وہ بیچارا ابھی رات کو دیر سے سویا تھا۔ صبح جب تلاوت ہوئی تو وہ بڑا پریشان ہوا۔ اسے نہیں پتہ تھا کہ یہ کیا چیز ہے۔ جب یہ دس پندرہ منٹ تک تلاوت کرتے رہے تو اس نے جا کر ہوٹل کے منیجر سے شکایت کی۔ منیجر آیا اور اس نے کہا کہ کیا معاملہ ہوا ہے۔ خورشید انور کہنے لگے کہ صبح قرآن مجید کی تلاوت ہو رہی تھی۔ منیجر بھی چونکہ مسلمان تھا اس لیے اس نے جا کر اس غیر ملکی سے کہا کہ ساتھ والے کمرے میں شور نہیں تھا بلکہ وہ صاحب PRAYER کر رہے تھے۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے لیکن اس سے کہیں کہ ذرا آواز ہلکی رکھیں۔ دوسرے روز بھی جب اسی طرح آواز آئی تو وہ غیر ملکی ہوٹل چھوڑ کر وہاں سے بھاگ گیا۔ پھر مسعود پرویز نے خورشید صاحب

سے کہا کہ وہ تو غیر مسلم تھا۔ آپ خود کہتے ہیں کہ شور اچھی چیز نہیں ہے۔ آپ تو لاؤڈ سپیکر سن کر اعتراض کرتے ہیں کہ اتنی بلند آواز سے کیوں چل رہا ہے پھر آپ خود کیوں صبح سویرے اتنی بلند آواز سے تلاوت کرتے ہیں۔ آپ ذرا اپنی آواز کا اندازہ تو کیجئے۔ خورشید انور کہنے لگے کہ یہ تو اسی طرح ہوگا اور اسی طرح کرتے رہے۔

مسعود پرویز ہمارے ان فنکاروں میں سے ہیں جن کا سفر ریڈیو سے شروع ہوا تھا۔ پارٹیشن سے پہلے یہ پشاور ریڈیو پر پروگرام اسسٹنٹ تھے اور مشاعروں کے انچارج بھی یہی تھے۔ بہت خوبصورت آدمی تھے۔ مردانہ حسن کا ایسا مجسمہ تھے کہ دیکھتے ہی رہ جاتے۔ شاعر بھی تھے اور گاتے بھی تھے۔ آواز بھی بہت اچھی تھی۔ میرا خیال ہے کہ فنون لطیفہ کی کشش ہی انہیں ریڈیو پر لے گئی تھی۔ میں نے پشاور کا ایک مشاعرہ انہی کے انتظام میں پڑھا تھا۔ یہ خوش گفتار تھے اور بات کر کے دل موہ لیتے تھے۔ اس زمانے میں ان سے صرف علیک سلیک ہی ہوئی تھی اور یہ مجھے پہچانتے تھے۔ اس زمانے میں علاقائی حد تک میرا تھوڑا سا نام ہو چکا تھا اور ان کا بھی یہی عالم تھا۔

بعد میں پتہ چلا کہ یہ پونا چلے گئے ہیں جہاں ڈبلیو زیڈ احمد نے ایک سٹوڈیو قائم کر رکھا تھا جس میں انہوں نے اچھے اچھے لوگوں کو جمع کر رکھا تھا۔ پونا جانے سے پہلے انہوں نے یہاں ایک پنجابی فلم میں بھی کام کیا تھا جس نے جوبلی منائی تھی۔ جب پونا گئے تو وہاں بھی انہوں نے فلم ''غلامی'' میں ہیرو کا کردار ادا کیا۔ پھر انہیں وہاں ڈبلیو زیڈ احمد صاحب نے ڈائریکشن کا چانس بھی دیا۔

پارٹیشن ہوگئی تو یہ یہاں آ گئے۔ امیر گھر کے آدمی تھے اور رشتہ داران بھی امیر تھے۔ اس لیے انہیں فنڈز اکٹھا کرنے میں مشکل نہ ہوئی اور انہوں نے فلم ''بیلی'' شروع کی۔ اس زمانے میں سٹوڈیو بھی بری حالت میں تھے۔ ساز و سامان بھی نہیں تھا اور ایکٹر بھی اچھے نہیں تھے۔ پھر ماحول بھی سازگار نہیں تھا۔ انہوں نے عزیزوں رشتہ داروں سے سرمایہ لے کر یہ فلم بنائی تو یہ فلاپ ہوگئی۔

اس کے بعد یہ کافی عرصہ فلم سے دور رہے۔ اور پھر انہوں نے خورشید انور کے ساتھ

مل کر فلم ''انتظار'' بنائی۔ دونوں اچھے ذہن تھے۔ دونوں کی محنت اور کوششوں سے فلم ہٹ ہوئی۔ اس میں گیت نگار میں تھا۔ میرا بھی نام وہاں سے خاصا چڑھا۔ نور جہاں نے اس سے پہلے فلم ''پردیسن'' بنائی تھی جس میں گیارہ گانے تھے۔ فلم فیل ہوگئی اور گانے بھی چلے گئے۔ خورشید انور آواز شناس آدمی تھے۔ انہوں نے اس فلم میں نور جہاں سے گانے گوائے۔ پھر انہوں نے جس محنت سے ان کی دھنیں بنائیں اور جس محنت سے ہم نے اس کے گانے لکھے اور دس دس بارہ بارہ بار ریہرسل کروا کے جب انہوں نے نور جہاں سے ریہرسل کروائی تو اس فلم کا ہر گانا آج تک ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور آج بھی نور جہاں کی پہچان ہے۔ یہاں سے مسعود پرویز بھی آگے آئے۔

فلم ''انتظار'' ہی کی بات ہے کہ ہم لوگ آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے مانسہرہ اور اس سے آگے جنگلات تک گئے۔ ہم آؤٹ ڈور شوٹنگ پر بھی ساتھ ہی چلے جاتے تھے۔ کیونکہ مل کر کام کرتے تھے۔ حتیٰ کہ کہانی لکھنے والا بھی ساتھ چلے جاتا تھا۔ اس طرح نہیں جیسے آج کے کہانی نگار کرتے ہیں کہ وی سی آر پر دو چار فلمیں دیکھیں اور ایک فلم نکال کر پروڈیوسر کو دیدی۔ ہم سوچکر اور بڑی محنت کر کے کام کرتے تھے اس لیے باہر بھی ساتھ ہی چلے جاتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ فلم ''انتظار'' میں ہیرو کے بچپن کا رول میرے بیٹے پرویز نے کیا تھا جو آج کل گلاسگو میں ہے اور بچوں کا باپ ہے۔ اس وقت وہ بچہ تھا۔

ہم نے دو جگہ پڑاؤ رکھے ہوئے تھے۔ ایک مانسہرہ کے ڈاک بنگلہ میں اور دوسرا گڑھی حبیب اللہ کے ڈاک بنگلہ میں۔ گڑھی میں میں سنتوش کمار، مسعود پرویز، خورشید احمد اور پروڈیوسر جیلانی ٹھہرے تھے۔ باقی تمام سٹاف مانسہرہ میں رہتا تھا۔ اس سفر میں مسعود پرویز کو سٹڈی کرنے کا بہت موقع ملا۔ یہ بڑے پڑھے لکھے ہوئے آدمی تھے۔ انہیں بھی موسیقی اور ادب سے گہرا شغف تھا۔ تھیوری کے علاوہ عملی طور پر بھی موسیقی کو سمجھتے تھے۔

پینے کے سلسلے میں جتنا بلانوش میں نے مسعود پرویز کو دیکھا کم لوگوں کو دیکھا ہے۔ وہ پیتے ہی چلے جاتے تھے۔ اور اپنی جگہ پر قائم رہتے تھے۔ آؤٹ ہونے کی ان کی ایک ہی علامت تھی اور کہتے تھے کہ غالب کا شعر آپ نے سنا ہے:

ے ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

پھر غالب کی تعریف کرتے ہوئے کہتے کہ واہ واہ غالب انسان کی کیا نفسیات جانتا تھا۔ باتیں کرتے کرتے درمیان میں غالب کے اشعار کا ذکر شروع کر دیتے تھے اور بار بار اسی شعر کا حوالہ دیتے رہتے تھے۔ بات کوئی بھی ہوتی وہ تھوڑی دیر کے بعد کہتے کہ آپ نے شاید غالب کا وہ شعر نہیں سنا۔ پھر یہ شعر سناتے اور کہتے کہ واہ واہ غالب نے کیا نفسیات بیان کی ہے۔ یہ بھول جاتے تھے کہ پہلے بھی یہ شعر سنا چکا ہوں۔ یہ چار چار پانچ پانچ بار ایک ہی شعر سناتے رہتے تھے۔ ان کے آؤٹ ہونے کا یہی ثبوت تھا۔ وہ لڑائی جھگڑا نہیں کرتے تھے بلکہ جب آؤٹ ہوتے تو یا تو کوئی کوٹیشن لے لیتے اور یا پھر کوئی شعر اور بار بار وہی سناتے رہتے اور اس کی تعریف کرتے رہتے۔ اب تو کئی اور لوگوں کی طرح وہ بھی وہسکی سے دور ہٹ گئے ہیں اور سنا ہے کہ اب وہ علمی کام کر رہے ہیں۔ وہ آج کل امریکہ میں اپنی بیٹی کے پاس ہوتے ہیں۔

جن میوزک ڈائریکٹروں کے ساتھ مجھے کام کرنے کا موقع ملا ان کی فہرست بہت لمبی ہے۔ میرے پہلے میوزک ڈائریکٹر شام سندر تھے۔ جو پارٹیشن سے پہلے شروع ہونے والی ایک فلم میں میرے ساتھ تھے۔ یہ فلم مکمل نہیں ہو پائی تھی۔ شام سندر بھی خوب پینے والے تھے اور دن میں بھی پیتے تھے لیکن ان کے فن کے عروج کا یہ معاملہ تھا کہ جہاں کسی کی سوچ دنوں میں پہنچتی تھی وہ وہاں گھنٹوں میں پہنچ جاتے تھے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ فلم انڈسٹری میں شاعر کی اچھی خاصی گت بنتی ہے اور میوزک ڈائریکٹر اسے اچھی طرح ستاتا ہے۔ اور جو شاعر لکھ کر دے میوزک ڈائریکٹر کہتا ہے کہ اسے یہاں سے تبدیل کر دو یا وہاں سے تبدیل کر دو۔ اس لیے میں سہما ہوا تھا۔

ہر چند کہ فلم کے ڈائریکٹر ایک پڑھے لکھے نوجوان محبوب اختر تھے اور میرا واسطہ انہی سے تھا لیکن میوزک ڈائریکٹر کا خوف میرے ذہن میں تھا۔ یہاں لاہور میں ہال روڈ، میکلوڈ روڈ لنک پر کونے والی سرخ بلڈنگ میں جہاں کبھی راشٹنگ کا دفتر بھی رہا ہے۔ وہاں فلم کا دفتر تھا اور وہیں میرا شام سندر سے تعارف کروایا گیا۔ محبوب اختر نے میرا لکھا ہوا پہلا گیت پسند کیا تھا۔ ڈائریکٹر گیت کو او کے کر دے تو معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس زمانے

میں بھی کچھ ایسے میوزک ڈائریکٹر ہوتے تھے کہ اگر ان سے ٹیون نہ بن پاتی تو شاعر سے کہتے کہ ایک گیت اور لکھ دیجئے۔

ملاقات ہو چکی تھی۔ بیسمنٹ میں میوزک روم تھا۔ میں وہاں گیا اور شام سندر کو جا کر گیت دیتے ہوئے کہا کہ ڈائریکٹر صاحب نے یہ گیت او کے کر دیا ہے۔ اب اگر آپ کو اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہو تو مجھے بے تکلفی سے بتایئے میں حاضر ہوں۔ پہلے تو وہ میرے منہ کو دیکھتے رہے۔ کیونکہ بہت پئے ہوئے تھے۔ اور پھر کہنے لگے کہ دیکھو شاعر صاحب! میں وہ نہیں ہوں (خود کو گالی دی) بلکہ میں تو میوزک ڈائریکٹر ہوں۔ آپ نے تو یہ گیت کسی قاعدے میں لکھا ہوگا آپ مجھے اخبار کی کٹنگ لا دیجئے اور ایک ایک کٹنگ کی پندرہ پندرہ ٹیونیں بنوالیجئے۔ وہ کوئی میوزک ڈائریکٹر ہوتا ہے جو شاعر سے کہے کہ ذرا تبدیل کر دو۔ آپ نے جو بھی لکھا ہے اس کی ٹیون بنے گی۔ اب آپ یہیں بیٹھے رہئے اور سنئے۔

انہوں نے گیت پڑھا۔ اس گیت کے پس منظر میں قحط بنگال کا واقعہ تھا۔ میں نے اسی پس منظر میں لکھا تھا کہ

ماتا دیکھ اپنی سنتان
تیری بیٹی لاج لٹائے تجھ کو لاج نہ آئے
ان جل دے کر جیون چھینے دھن والوں کے دان
ماتا دیکھ اپنی سنتان

اس قحط کے دوران عورتوں کی عزتیں بکی تھیں اس لیے میں نے اس گیت میں سرمایہ داری اور غربت کا ذکر کیا تھا۔ کہنے لگے کہ شاعر صاحب! گیت تو بڑا زوردار لکھا ہے مجھے اس پر ذرا سوچنا پڑے گا۔ میں نے کہا کہ آپ سوچئے میں پھر آجاتا ہوں۔ کہنے لگے نہیں آپ یہیں بیٹھئے میں ابھی سوچتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے پہلی ٹیون بنائی میں نے کہا کہ بہت اچھی ہے۔ کہنے لگے کہ مجھے خوش کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں یا واقعی اچھی ہے میں نے کہا اچھی ہے۔ کہنے لگے کہ شاعر صاحب! پہلی بار آپ نے کہا کہ بہت اچھی ہے اب کہہ رہے ہیں اچھی ہے۔ مجھے شروع میں وہ شاعر صاحب ہی کہتے تھے کیونکہ پہلی دو تین

ملاقاتوں میں ان کی زبان پر میرا نام قتیل شفائی نہیں چڑھ رہا تھا۔

انہوں نے اس ٹیون کو رہنے دیا۔ اور ایک اور ٹیون بنائی۔ اس کے بعد ایک اور ٹیون بنائی۔ یوں انہوں نے آدھے گھنٹے میں تین ٹیونیں بنادیں اور سب ایک دوسرے سے بہتر تھیں۔ زندگی میں کسی بھی شعبے میں جو پہلا شخص آتا ہے وہ یاد رہتا ہے۔ ان سے میری دوستی ہوگئی۔

شام سندر کی پینے کے بعد کی عادتیں بہت بری تھیں۔ جب وہ زیادہ پی لیتا تھا تو اسے ایک عورت کی تلاش ہوتی تھی۔ اور وہ اسے ڈھونڈنے نکل جاتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عورتوں کو زیادہ ڈھونڈنا نہیں پڑتا تھا اور کچھ آوارہ عورتیں ہوٹلوں میں مل جاتی تھیں۔ سڑکوں پر بھی مل جاتی تھیں۔ شام سندر کہیں نہ کہیں سے کوئی اپ ٹو ڈیٹ سی عورت لے آتے تھے۔ مجھے اس بات کا شروع میں علم نہیں تھا۔ اصل میں میں رتن سینما کے بالکل سامنے یونیورسل ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا جس کا نام بعد میں بیت القیام ہوگیا تھا اور یہ سرائے سی بن گئی تھی۔ اس میں فلم کے درمیانے درجے کے لوگ رہتے تھے۔

میرے کمرے کی دو چابیاں تھیں۔ شام سندر نے ایک چابی مجھ سے اس بہانے سے لے لی ہوئی تھی کہ میں یہاں کبھی سوچنے یا آرام کرنے کے لیے بیٹھ جاؤں گا۔ میرا سلسلہ ایک خاتون چندر کانتا سے تھا میں اس کے پاس چلا جاتا تھا۔ یہ میرے بعد کسی عورت کو لے کر وہاں پہنچے ہوتے تھے۔ ایک دن ہوٹل والوں نے مجھے بتایا کہ شام سندر صاحب کو آپ نے کمرہ منتقل کردیا ہے اور وہ تو روز یہاں عورت لے کر آتے ہیں۔ ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں لیکن پڑوس کے کمرے والوں کو اعتراض ہے۔ تب مجھے پتہ چلا کہ شام سندر وہاں کیا کرتے ہیں۔

میں نے ان سے کہا کہ مجھے یہ شکایت ملی ہے تو کہنے لگے کہ کیا آپ کمرے کے پیسے نہیں دیتے میں نے کہا کہ پیسے تو دیتا ہوں لیکن اس کام کے لیے نہیں دیتا۔ خیر انہوں نے چابی تو واپس دیدی لیکن برا مانا۔ بعد میں جب انہیں احساس ہوا کہ میری بات درست تھی، تب کہیں جاکر وہ بات بھولے۔ مگر ان کی یہ عادت تھی کہ جب ذرا زیادہ پی لیتے تو عورت کی تلاش میں نکل پڑتے تھے۔

کچھ اور بادہ نوش

ماسٹر غلام حیدر ایک بہت پرانا اور جانا مانا نام ہے۔ وہ ربابی خاندان سے تھے اور ان کا تعلق امرتسر سے تھا۔ شروع میں جیسا کہ تھیٹریکل کمپنی میں دستور تھا کہ اچھے سازندوں کو لیا جاتا تھا، یہ بھی تھیٹریکل کمپنی سے وابستہ رہے تھے۔ یہ ہارمونیم کے بہت اچھے بجانے والے تھے۔ سیٹھ حبیب اس زمانے میں مشہور تھیٹر کے مالک تھے جن کی ماسٹر غلام حیدر خود بھی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ ان کی کمپنی کے ساتھ وہ ہندوستان بھر میں گھومے اور ہارمونیم بجانے میں بڑا نام پیدا کیا۔ یہاں سے وہ ایک ریکارڈنگ کمپنی میں لاہور آئے جس کا نام چائنا فون تھا۔ انہوں نے یہاں کچھ ایسی دھنیں دیں جن سے ان کا نام پیدا ہوا۔ اس زمانے میں شمشاد بیگم اور امراؤ ضیاء بیگم کے نام ریڈیو پر اور ریکارڈوں میں بہت نمایاں تھے۔ یہ دونوں ہی ماسٹر غلام حیدر کی دریافتیں تھیں۔

۔میرا سلام لے جا

امراؤ بیگم کا یہ گانا بہت مشہور ہوا۔ پھر امتیاز علی تاج نے ایک فلم شروع کی جس کا نام تھا ''سورگ کی سیڑھی''۔ اس میں ماسٹر غلام حیدر کو میوزک ڈائریکٹر لیا گیا اور غالباً یہ ماسٹر غلام حیدر کی پہلی فلم تھی۔ اس کے بعد انہوں نے کچھ اور فلموں میں میوزک کا جادو جگایا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ پنچولی اور دیگر پروڈکشنز کی فلموں میں لوگ ان کا نام تلاش کرتے تھے اور جس فلم پر ان کا نام ہوتا تھا اسے کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ ان کی فلم ''خزانچی'' کے گانے بہت مشہور ہوئے۔ بہرحال پنچولی کی فلموں میں ان کا نام بہت گونجا۔ اس زمانے

میں ایک گانا تھا:

ے ساون کے نظارے ہیں، لا، للا، لا

ساتھ مہمل لفظ لگا کر گانے کو سنوارنے کا اولیں سہرا بھی انہی کے سر تھا۔ اس کے بعد ہر گانے کے ساتھ مہمل لفظ لگا کر لوگ گانوں کو سنوارنے لگے تھے۔ یہ بھی ان کی ذہنی کوشش تھی۔ یہاں سے ان کا نام بڑھا اور پھر ممبئی میں ان کی مانگ ہوئی۔ یہ وہاں چلے گئے اور وہاں کے بڑے بڑے ڈائریکٹروں کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے جن میں سہراب مودی، محبوب اور دیگر شامل تھے۔ ان کی آخری فلم وہاں پرفلمستان والوں کی طرف سے تھی جس میں انہوں نے لتا منگیشکر جیسی آرٹسٹ کو چانس دیا۔ اور آج تک لتا کی آواز گونج رہی ہے۔ یہ بھی ماسٹر غلام حیدر کی دریافت تھی۔

پارٹیشن کے ساتھ ہی یہ لاہور میں آ گئے اور یہاں انہوں نے سندھ کے ایک وڈیرے خاندان کے چشم و چراغ کو اپنے ساتھ ملایا۔ ان کا نام فضل علی شاہ تھا لیکن انہوں نے ایس گل کے نام سے فلم میں کام کیا۔ سرمایہ ایس گل کا تھا جبکہ ماسٹر غلام حیدر ایک طرح کے مینجنگ پارٹنر تھے۔ انہوں نے پہلی فلم 'بے قرار' بنائی۔ یہ فلم تو نہ چل سکی لیکن اس کے گانے برسوں چلے۔ حالانکہ آواز منور سلطانہ کی تھی۔ لیکن ماسٹر غلام حیدر نے منور سلطانہ کی آواز کو اس سلیقے سے استعمال کیا تھا کہ منور سلطانہ بھی بہت عرصے تک پاکستانی فلم انڈسٹری کی ضرورت رہیں۔

میرا ان سے واسطہ فلم ''اکیلی'' سے شروع ہوا۔ یہ سید عطاء اللہ شاہ ہاشمی کی فلم تھی جو ''اداکار'' کے مالک تھے جبکہ میں ان دنوں اس پرچے کا ایڈیٹر تھا۔ میرا مزاج تھوڑا سا معیار کی طرف تھا۔ میں فلمی گانوں میں بھی ایک معیار رکھنا چاہتا تھا۔ جبکہ ماسٹر غلام حیدر جس ماحول سے آئے تھے وہاں صرف کمرشل ازم چلتا تھا۔ وہ اس میں کامیاب بھی تھے اور اپنی جگہ ٹھیک تھے۔ لیکن میں یہ سمجھتا تھا کہ صرف کامیابی نہ ہو بلکہ معیار بھی ہو اور لوگ شعر سن کر کہیں کہ گیت لکھا ہوا بھی اچھا ہے اس وجہ سے میری ان کے ساتھ کچھ ٹسل بھی ہوئی۔ اس ان بن کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ میری ان کے ساتھ قربتیں نہیں تھیں اور دوسرے

یہ کہ ان کی ٹیم میں شاعر طفیل ہوشیار پوری پہلے سے موجود تھے اور طے تھا کہ یہ گانے ان سے ہی لکھوائیں گے۔ لیکن مجھے فلمساز عطاء اللہ شاہ ہاشمی کی طرف سے آگے کر دیا گیا تھا۔ اس لیے میں انہیں ذہنی طور پر قبول نہیں تھا اور وہ میرے راستے میں روڑے اٹکانے لگے۔

یہ پارٹیشن کے بعد کی بات ہے۔ عطاء اللہ شاہ ہاشمی کے ساتھی کرشن کمار ایم ایس سی تھے۔ وہ پہلے تو ہندوستان چلے گئے تھے لیکن بعد میں ویزا لے کر یہاں آئے تھے۔ انہیں ایک فلم بنانی تھی جس کی ڈائریکشن ان کی تھی۔ اس دوران وہ دوبارہ ہندوستان گئے تو عطاء اللہ شاہ ہاشمی بھی ان کے ساتھ انڈیا چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ماسٹر غلام حیدر کے کولہو کے آگے میں جتا رہا۔ میں نے انہیں ایک سچوئیشن پر گیت لکھ کر دیا۔ انہوں نے دو دن اسے اپنے پاس رکھے رکھا اور پھر کہا کہ کچھ اور لکھئے۔ میں نے اسی ایک سچوئیشن پر اس طرح ان کے کہنے پر چھ گیت لکھے۔ اسی اثناء میں کرشن کمار انڈیا سے واپس آ گئے اور مجھ سے پوچھا کہ گانا کوئی بنا ہے۔ میں نے بتایا کہ میں تو چھ گیت لکھ کر دے چکا ہوں۔ یہ گیت ماسٹر جی کی نظر میں نہیں جچے۔ وہ مسکرائے اور کہا کہ ٹھیک ہے۔ پھر پوچھا کہ ماسٹر جی کا کوئی دوست شاعر ہے میں نے کہا جی ہاں طفیل ہوشیار پوری ہیں۔ کہنے لگے کہ ٹھیک ہے۔ کل میٹنگ رکھیں گے اور پھر اس معاملے کو دیکھیں گے۔

اگلے روز میٹنگ ہوئی۔ اس میں انہوں نے انجان بن کر مجھ سے پوچھا کہ قتیل صاحب کچھ لکھا ہے آپ نے؟ میں نے کہا جی ہاں میں نے ایک سچوئیشن پر چھ گانے لکھے ہیں۔ حیران ہو کر کہنے لگے کہ چھ گانے کیوں لکھے ہیں۔ میں نے کہا کہ ماسٹر جی کا خیال تھا کہ زیادہ گانے لکھنے چاہئیں۔ کہنے لگے کہ سنایئے۔ ہم نے پہلے سے جو پلاننگ کر رکھی تھی اس کے مطابق میں نے انہیں ایک گانا سنایا۔ انہوں نے گانا سن کر کہا کہ یہ گانا بس ٹھیک ہے لیکن آپ نے کوئی اور گانا بھی لکھا ہے۔ میں نے دوسرا گانا سنایا تو وہ کہنے لگے کہ واہ واہ یہ بہت اچھا گانا ہے۔ آپ ماسٹر جی کو یہ گانا دیتے۔ انہوں نے یہ بات انجان بن کر کہی میں نے کہا کہ ٹھیک ہے جی یہی دے دیتا ہوں۔ وہ کہنے لگے کہ آپ باقی کے گانے چھوڑیئے۔ مجھے اور کوئی گانا نہیں سننا۔ یہ گانا ٹھیک ہے اور مجھے بالکل سوٹ کرتا ہے۔

چنانچہ میں نے وہ گانا ماسٹر جی کو پکڑا دیا اور انہوں نے کچھ کہے بغیر وہ گانا رکھ لیا۔ اس طرح ماسٹر جی کے ساتھ کام کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن اندرونی طور پر کچھ کشمکش چلتی رہی۔ انہوں نے اس فلم میں ایک آدھ گانا طفیل ہوشیار پوری کا بھی رکھا اور اپنی ضد پوری کی۔

آگے چل کر فلم "گلنار" بننے لگی تو اس کی ٹیم میرے مطلب کی تھی۔ سید امتیاز علی تاج اس فلم کے ڈائریکٹر تھے۔ شوکت تھانوی اس کے مکالمہ نگار تھے جبکہ وہ اس فلم میں ایک کیریکٹر بھی کر رہے تھے۔ اس فلم کے پروڈیوسر شوکت رضوی تھے۔ یہ سب، خاص طور پر تاج صاحب میرے قدردان تھے اور مجھ پر کرم بھی کرتے تھے۔ اس فلم میں میوزک ڈائریکٹر ماسٹر غلام حیدر تھے اور گیت نگار مجھے لیا گیا۔ وہاں ماسٹر جی سے جب پہلی بار ٹکراؤ ہوا تو انہوں نے مجھے دیکھا اور میں نے انہیں دیکھا۔ انہوں نے تھوڑا سا محسوس بھی کیا پھر خود ہی مجھے کہا کہ قتیل صاحب! ہم اگر مل کر کچھ کام کرلیں تو فلم کے مفاد میں بہتر ہے۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے جیسے آپ کہتے ہیں کرلیں گے۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن آپ ڈائریکٹر صاحب سے بھی یہ بات کہہ لیں کیونکہ سارا پلان تو ان کے ذہن میں ہے۔

میں نے پہلا گیت لکھا تو ماسٹر جی نے کہا کہ آپ اسے چھوڑیئے۔ میں آپ کو ٹیون دیتا ہوں آپ اس پر گیت لکھئے۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے آپ ٹیون دیجئے۔ اگر ٹیون اچھی ہوئی تو میں گیت لکھوں گا۔ چنانچہ انہوں نے ٹیون دی اور میں نے پانچ منٹ میں گیت لکھ کر ان کے حوالے کیا۔ ماسٹر صاحب ہکے بکے رہ گئے۔ عام طور پر ادب سے گیا ہوا شاعر ٹیون پر لکھنے سے گھبراتا ہے۔ اور گھبرانا بھی ٹھیک ہے کیونکہ عام طور پر میوزک ڈائریکٹر اوٹ پٹانگ سی ٹیون دے دیتا ہے جس کا کوئی وزن وغیرہ بھی نہیں ہوتا۔ اتفاق سے ماسٹر غلام حیدر نے جو وزن دیا وہ قاعدے میں تھا۔ وہ ایک پرانی ٹھمری یا دادرا تھا۔ میرے لیے آسان تھا اس لیے میں نے کر دیا۔ یہ گیت لکھنے سے پہلے یہ بھی ہوا کہ میں نے ان سے کہا تھا کہ یہ ٹیون پہلی سچوئیشن پر ٹھیک نہیں ہے بلکہ دوسری سچوئیشن پر ٹھیک ہے اس لیے اگر آپ کہیں تو میں اس سچوئیشن پر اس ٹیون میں گانا لکھ دوں۔ کہنے لگے کہ ٹھیک

ہے۔ چنانچہ میں نے وہ گانا لکھ کر دے دیا اور وہ گانا ہو گیا۔

اب میں نے پہلی سچوئیشن کے لیے جو گانا لکھا تھا وہ میں نے امتیاز علی تاج صاحب کو دکھایا اور کہا کہ میری نظر میں یہ گانا بہت اچھا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ میری نظر میں یہ بہت اچھا ہے۔ میں نے کہا کہ پھر آپ یہ گانا ماسٹر صاحب سے approve کروائیں۔ اور اس طرح کروائیں کہ وہ ناراض بھی نہ ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ انہیں سامنے بٹھا کر مجھ سے یہ گانا سنیں اور اپروو کر دیں۔ وہ کہنے لگے کہ ٹھیک ہے۔ چنانچہ ہم ایک ساتھ بیٹھے اور انہوں نے ماسٹر صاحب کے سامنے مجھ سے پوچھا کہ قتیل صاحب! سنائیے کیا لکھا ہے میں نے گانا سنایا تو وہ کہنے لگے واہ واہ..... واہ واہ..... کیا خوبصورت گانا لکھا ہے۔ اور انہوں نے اس طرح کہا جیسے ان پر وجد طاری ہو گیا ہو۔ پھر کہنے لگے کہ یہ گانا ماسٹر صاحب کو دیجئے۔ ماسٹر صاحب کہنے لگے کہ تاج صاحب! یہ گانا تھوڑا سا مشکل نہیں ہے۔ تاج صاحب کہنے لگے کیا مشکل ہے؟ وہ غزل تھی

؎ لو چل دیئے وہ ہم کو تسلی دیئے گئے
اک چاند چھپ گیا ہے اُجالا کیے بغیر
اے ضبطِ عشق اور نہ لے امتحانِ غم
ہم رو رہے ہیں نام کسی کا لیے بغیر

اب ماسٹر صاحب لفظ امتحان غم پر انگلی رکھ کر کہنے لگے کہ یہ ذرا مشکل ہے۔ تاج صاحب کہنے لگے کہ ماسٹر جی آپ ان معاملات پر کیوں کڑھتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے۔ آپ بس ٹیون بنائیے ان معاملات کے لیے میں جو بیٹھا ہوں۔ اور آپ لفظوں کو مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ اس طرح تاج صاحب نے ایک طرح سے ان کی فہمائش کر دی۔ پھر ماسٹر جی نہیں بولے۔ اس واقعہ کے بعد بھی میں ماسٹر صاحب سے مل کر کام کرتا رہا اور بالآخر ہم دونوں میں اتنی انڈرسٹینڈنگ ہو گئی کہ آئندہ کے لیے لمبے چوڑے پروگرام بننے لگے۔ ایک دن وہ مجھے کہنے لگے کہ قتیل صاحب ویسے تو یہاں بھی ٹھیک ہے کیونکہ یہ اپنا وطن ہے لیکن میں کاروباری طور پر یہاں آ کر پچھتایا ہوں۔ کیونکہ یہاں فن کی قدر نہیں ہے۔ پھر کہنے لگے

کہ میں وہاں پر ایک لاکھ روپے لیتا تھا لیکن یہاں پر صرف دس ہزار روپے لیتا ہوں۔ پھر مجھے کہنے لگے کہ آپ بھی میرے ساتھ چلئے۔ ہم ادھر جا کر ایک دو سال لگا کر واپس آئیں گے اور یہاں آ کر بزازی کی دوکان کھول لیں گے لیکن یہ کام یہاں نہیں کریں گے۔ غرضیکہ پھر ہمارے درمیان انڈرسٹینڈنگ اتنی بڑھ گئی تھی کہ اس طرح کے پروگرام بھی بننے لگے اور کھانا پینا بھی اکثر ایک ساتھ ہوتا۔

وہ پیتے بھی تھے اور ان کی عادت تھی کہ پینے کے بعد انہیں وہ لوگ یاد آتے تھے جن سے کبھی انہوں نے پیار کیا تھا۔ ان کا نام میں یہاں نہیں لیتا کیونکہ مجھے کسی کی رسوائی مقصود نہیں۔ یہ ان کا نام لیتے تھے اور روتے تھے اور یا پھر یہ کہتے تھے کہ اس ملک میں فن کی کوئی قدر نہیں ہے آپ میرا ساتھ دیں۔ انڈیا جائیں گے دو سال لگا کر واپس آئیں گے۔ میرے پاس کوئی دس لاکھ روپے ہوں گے۔ اور آپ کے پاس بھی دو لاکھ روپیہ تو ہو ہی جائے گا۔ دونوں مل کر بزازی کی دوکان کھولیں گے اور آپ میرے پارٹنر ہوں گے۔ پینے کے بعد پھر اور پیگ لیتے تھے اور پھر انہی چیزوں کو دہراتے تھے۔ پھر کہتے تھے کہ آہ اس کی کیا آواز تھی اور کیا حسن تھا۔ افسوس کہ اس کا ساتھ نہ ہو سکا۔

اس دوران میں انہیں گلے کا کینسر ہو گیا۔ انہوں نے دو شادیاں کی ہوئی تھیں۔ ایک تو فیملی ہی میں کی ہوئی شادی تھی۔ جس وقت ان کی یہ شادی ہوئی تھی اس وقت وہ اتنے بڑے میوزک ڈائریکٹر نہیں بنے تھے۔ اس لیے وہ شادی اسی برادری سے اسی معیار کے مطابق ہوئی تھی۔ ویسے وہ ذہنی طور پر بہت بڑے آدمی تھے۔ ان کا گھریلو ماحول تو اسی سطح پر رہا لیکن وہ خود بہت اوپر پہنچ گئے۔ ان کے اندر ایک بڑا آدمی بھی تھا۔ ان سے بات کرتے ہوئے پتہ چلتا تھا کہ ہم کسی معزز آدمی سے بات کر رہے ہیں۔

ان کی دوسری شادی امراؤ ضیاء بیگم سے ہوئی تھی۔ ان کی ان کے ساتھ انڈرسٹینڈنگ چائنا فون سے وابستگی کے زمانے میں ہو گئی تھی کیونکہ یہ گھر سے اکتائے ہوئے تھے۔ جس وقت یہ گلے کے کینسر کی بیماری میں میو ہسپتال میں پڑے ہوئے تھے ''گلنار'' فلم کا میوزک مکمل کر چکے تھے لیکن ابھی بیک گراؤنڈ میوزک باقی تھا۔ جو انہی کے رشتہ دار رشید عطرے

نے مکمل کیا۔ جب یہ ہسپتال میں پڑے تھے تو دونوں بیویوں کی طرف سے سازشیں جاری تھیں۔ ایک طرف کی فیملی جاتی اور کہتی کہ ماسٹر جی ہمارا کیا بنے گا۔ دوسری طرف کی فیملی جاتی تو کہتی کہ یہ مکان ہمارے نام کردیں۔ یہ ان سازشوں سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ میرے اس زمانے میں ان کے ساتھ تعلقات عروج پر پہنچ گئے ہوئے تھے اور شروع میں جتنی ناچاقی تھی اب اتنی ہی قربت تھی۔

میں ایک دن ہسپتال گیا تو کہنے لگے کہ قتیل صاحب! آپ زندگی میں دوسری شادی کبھی نہ کریں۔ مر جائیں لیکن دوسری شادی نہ کریں۔ ان سے بولا نہیں جاتا تھا اور انہوں نے بڑی مشکل سے اور بڑی آہستہ آواز میں یہ بات کہی تھی۔ وہ اپنی دو بیویوں سے کم اور ان کے رشتہ داروں سے زیادہ تنگ آئے ہوئے تھے جو یہ نہیں دیکھ رہے تھے کہ وہ مر رہے ہیں بلکہ یہ سوچ رہے تھے کہ کسی طرح جائیداد میں سے حصہ مل جائے۔

پہلے بھی دو شادیوں کے بارے میں میرا تصور ایسا ہی تھا کیونکہ کچھ گھریلو معاملات بھی میرے سامنے تھے۔ لیکن اس دن سے میں نے یہ بات پلے باندھ لی اور ماسٹر غلام حیدر کے ان الفاظ سے دو شادیوں کے خلاف میرے دل میں ایک جذبہ مرتسم ہو کر رہ گیا۔ اس کے بعد زندگی میں ہزار انقلاب آئے لیکن میں دو شادیوں والے پل صراط سے آسانی سے گزر گیا۔

ماسٹر غلام حیدر کے علاوہ یہاں موسیقی میں جو ماسٹر پیدا ہوئے ان میں ماسٹر عنایت حسین کا نام کافی شہرت رکھتا ہے۔ ماسٹر کا لفظ غالباً غلام حیدر ہی سے شروع ہوا تھا اور اس کے بعد جو اپنے آپ کو اچھا موسیقار سمجھتا تھا وہ اپنے نام کے ساتھ ماسٹر لکھتا تھا۔ اسی طرح ہی ماسٹر عنایت حسین نے بھی اپنا نام رکھا۔

ماسٹر عنایت حسین سے میرا سمبندھ خاصا زیادہ رہا۔ ہوا یوں کہ ماسٹر عنایت حسین کی آواز بہت اچھی تھی اور خوبصورت آدمی تھے۔ بچپن میں ان کے والد انہیں لے کر کلکتہ گئے تھے۔ امپیریل فلم کمپنی اس زمانے میں بہت مشہور ہوتی تھی۔ اس میں انہوں نے بعض فلموں میں بچپن کے رول بھی کئے تھے اور ان کا نام اس زمانے میں ماسٹر انداز ہوتا تھا۔

اس کے بعد وہاں سے چلے آئے اور ان کا تعلق دربار رامپور سے ہوگیا۔ وہاں ایک محفل ارباب نشاط تھا جس میں گانے بجانے والے لوگ شامل تھے۔ نواب کی وجہ سے ان لوگوں کی اچھی پذیرائی ہوتی تھی۔ وہاں یہ بہت عرصہ ملازم رہے۔ اس کے بعد لاہور آئے تو ہز ماسٹر وائس کمپنی میں میوزک کمپوزر کی حیثیت سے ملازم ہوگئے۔ یہ پارٹیشن سے پہلے کی بات ہے۔

اسی زمانے میں میں نے H.M.V. کو پنجابی کے کچھ گیت بھیجے تھے جو ماسٹر عنایت حسین نے کمپوز کئے۔ ان میں سے دو گیت بہت چلے۔ ایک گیت یہ تھا:

؎ چاندی وانگن چمکدیاں راوی دیاں چھلاں

دوسرا گیت یہ تھا۔

؎ ساڈا ماہی دیس پنجاب دا

یہ دونوں گیت پارٹیشن کے بعد بھی بہت دیر تک چلے۔ یہ دونوں گیت منور سلطانہ نے گائے تھے۔ جب تقسیم ہوگئی تو اس کے بعد ہمارا ساتھ فلم ''آغوش'' کے سلسلے میں ہوا۔ مرتضیٰ جیلانی جو ایم اے ایل ایل بی تھے اور ہماری فلم انڈسٹری میں واحد پڑھے لکھے ہوئے تھے جو یہ فلم ڈائریکٹ کر رہے تھے۔ اس فلم میں میں نے گانے لکھے۔ ایک گانا تھا۔

؎ محبت مسکرائی جھوم اٹھی میں جوانی میں
کسی کا نام شامل ہوگیا میری کہانی میں

یہ گانا اس زمانے میں ہٹ ہوا اور پھر ہم چل نکلے۔

ماسٹر صاحب میں خرابی یہ تھی کہ انہیں کچھ وہم تھا۔ جس طرح غزل کا مطلع ہوتا ہے اسی طرح گیت کی پہلی لائن مکھڑا کہلاتی ہے۔ ان کا وہم یہ تھا کہ ایک دو مکھڑوں سے ان کی تسلی نہیں ہوتی تھی بلکہ تین چار مکھڑے لکھ کر دو تو وہ کچھ کام کرتے تھے اور ایک دو ہفتے کے بعد پھر آجاتے تھے کہ کوئی اور مکھڑا لکھ کر دو۔

اصل میں شراب کا نشہ آدمی کو بدحال کر دیتا ہے۔ شراب کا تخلیق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح اور بھی کسی نشے کا تخلیق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ماسٹر صاحب کو چرس کی

عادت تھی جیسے کہ اس طبقے کے بہت سے لوگ چرس پیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ چرس سے ان کی تخلیقی قوتیں بیدار ہوتی ہیں حالانکہ انہی کو سامنے رکھتے ہوئے میں دیکھتا تھا کہ بہت جلدی کام ہو رہا ہے جبکہ کام جلدی نہیں ہو رہا ہوتا تھا۔ صبح وہ آتے اور چرس کا سگریٹ سلگاتے۔ انور کمال پاشا کے ہاں اہتمام یہ تھا کہ ہم دن وہیں گزارتے تھے کیونکہ وہ بہت عزت افزائی کرتے تھے۔ بہت عمدہ کھانا، چائے اور سگریٹ وغیرہ کا بندوبست ہوتا تھا۔ اور ایک گھریلو ماحول ہوتا تھا۔ ہم دیکھتے کہ ماسٹر صاحب صبح سے وہاں لگے ہوئے شام تک ٹیون بناتے رہتے۔ کبھی اٹھ کر باہر چلے جاتے اور اپنے سینے پر انگلیوں سے RHYTHM بنانے لگتے اور سمجھ رہے ہوتے کہ کام ہو رہا ہے حالانکہ صبح سے لے کر شام تک وہ مکھڑے کا سواں حصہ بھی نہیں سوچ پاتے تھے۔ اور دس دس دن میں کہیں جا کر ایک ایک گیت ہوتا تھا۔ لطیفہ یہ تھا کہ وہ شاعروں کے پیچھے پیچھے گھومتے تھے۔ شاعر چھپتے تھے کہ ماسٹر جی آ رہے ہیں اور پہلے انہیں بیس مکھڑے لکھ کر دیئے ہیں اور اب اور مکھڑے لکھوائیں گے۔ ایک بار طفیل ہوشیار پوری کو دیکھا ان کا دفتر رائل پارک میں تیسری منزل پر تھا۔ ماسٹر صاحب ان کے گھر گئے تھے تو وہ وہاں سے چھپ کر اپنے دفتر آ گئے تھے۔ ماسٹر عنایت حسین وہاں آ کر ان کے دفتر کے باہر نیچے ہی گھومنے لگے کہ وہ کسی وقت تو دفتر آئے گا ہی۔ جبکہ طفیل ہوشیار پوری پہلے ہی دفتر آئے ہوئے تھے۔ اور نیچے نہیں اتر رہے تھے کیونکہ انہوں نے نیچے ماسٹر جی کو گھومتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اتفاق سے میں رائل پارک گیا تو میں نے ماسٹر جی کو وہاں گھومتے دیکھا اور پوچھا کہ کیا بات ہے۔ وہ کہنے لگے کہ طفیل صاحب کو تلاش کر رہا ہوں اور ہاتھ ہی نہیں آ رہے گانا پہلے ہی لیٹ ہوا ہے۔ پندرہ بیس دن گزر چکے ہیں۔ مجھے پتہ تھا۔ میں نے پوچھا کہ ماسٹر جی ان سے پہلے کتنے مکھڑے لکھوا چکے ہیں تو انہوں نے ایک لمبا سا کاغذ نکال کر مجھے دکھایا۔ یہ کاغذ ایسا ہی تھا جیسے ہندو بنئے اپنے پاس کھاتوں کا لمبا کاغذ رکھا کرتے تھے۔ طفیل ہوشیار پوری بھی بادشاہ آدمی تھے انہوں نے ایک مکھڑا لکھ کر اس کے الفاظ کو تھوڑا بدل کر نیچے ایک اور مکھڑا لکھا تھا۔ اس طرح اس کاغذ پر بہت سے مکھڑے تھے اور ہر مکھڑے کے درمیان میں یا لکھا ہوا تھا۔ ماسٹر صاحب نے

مجھے وہ کاغذ دکھایا اور کہا کہ طفیل صاحب نے یہ مکھڑے لکھ کر دیئے ہیں اور ان سے تو میرا کام نہیں چلتا۔ میں نے کہا کہ ماسٹر جی آپ کسی ایک مکھڑے کو پکڑ کر اسی پر توجہ دیں۔ اور لکھوانے سے کام نہیں چلے گا۔ کیونکہ سب پر نظر رکھیں گے تو توجہ بٹ جائے گی۔ کہنے لگے کہ اچھا ٹھیک ہے اور پھر چلے گئے۔

میں ایک بار شاہ نور سٹوڈیو میں گیا تو وہاں سیف الدین سیف کی پکچر ''رات کی بات'' بن رہی تھی۔ سیف صاحب سے میرے اچھے خاصے مراسم تھے۔ میں نے انہیں دیکھا کہ وہ کچھ غصے میں تھے۔ میں نے سلام کیا تو جواب دینے کی بجائے وہ کہنے لگے کہ قتیل صاحب! میری مشکل آسان کردیں اور ماسٹر عنایت حسین کو دو گالیاں دے کر کہنے لگے کہ اسے آج میں ماروں گا۔ میں نے پوچھا کہ بات کیا ہے۔ کہنے لگے کہ سیٹ لگا ہوا ہے اور میں پچھلے کئی دنوں سے انہیں مکھڑے دے رہا ہوں اور انہیں کوئی مکھڑا جچتا ہی نہیں۔ کہنے لگے کیا میں شاعر نہیں ہوں اور میں جو مکھڑے لکھوں گا کیا وہ ٹھیک نہیں ہوں گے۔ کہنے لگے کہ فلم کا پروڈیوسر بھی میں ہوں اور کیا میں اپنی فلم کے لیے برا مکھڑا لکھوں گا۔ اور پھر شاعری میں یہاں کسی کا مجھ سے مقابلہ نہیں۔ وہ بھی ذرا اونچی جگہ سے بات کرنے والے تھے۔ کہنے لگے کہ میں تو اس سے تنگ آچکا ہوں۔ آپ میری مشکل حل کیجئے۔ اور اسے سمجھایئے اب اگر یہ مجھ سے مکھڑے مانگے گا تو میں اسے ماروں گا۔ بہتر ہے کہ میری بجائے آپ اسے لے کر بیٹھ جائیں اور ایک گیت لکھ دیں۔ میں ماسٹر عنایت حسین کے پاس گیا اور پوچھا کہ کیا بات ہے سیف صاحب آپ سے کچھ ناراض ہیں۔ کہنے لگے کہ میں کیا کروں۔ جو انہوں نے مجھے دیا وہ مجھ سے نہیں بنا۔ فرض کرلو کہ میں ہی نالائق ہوں لیکن میں کیا کروں۔ میں نے کہا: آیئے میرے ساتھ بیٹھئے اور مجھے بتایئے کہ آپ کے ساتھ مصیبت کیا ہے کیونکہ سیف صاحب نے ظاہر ہے جو کچھ لکھا ہوگا بڑے پائے کا لکھا ہوگا۔ کہنے لگے کہ جتنے مکھڑے بھی انہوں نے دیئے ہیں وہ پرانی زمینیں ہیں اور مجھے کوئی نیا میٹر چاہئے۔ میں نے کہا کہ ماسٹر جی جب غزل آئیگی تو اس کی تو وہی پرانی بحریں ہیں اور انہی میں ٹیونیں بھی بنتی ہیں۔ اس طرح تو جیسے انسان پیدا ہوتا رہتا ہے اور

ہزاروں انسانوں کی مشابہت ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے وہ الگ ہوتے ہیں اسی طرح آپ بھی انہیں سات سروں میں ٹیونیں بناتے رہیں گے۔ کہنے لگے کہ نہیں مجھے کوئی نئی بحر چاہیے۔ میں نے کہا کہ اچھا میں کوشش کرتا ہوں۔ میں نے وہیں بیٹھ کر انہیں دو چار مکھڑے لکھ دیئے۔ میں دراصل ایک QUICK THINKER ہوں۔ کہنے لگے کہ ایک دو اور بھی لکھ دیجئے۔ میں نے ایک نئی بحر تلاش کی اور لکھا:

؎ میرا انگ انگ بنے جلے ترنگ
میرے سنگ سنگ جیا گائے رے
میں کروں سنگھار ہنسوں بار بار
کروں انتظار پیا آئے رے

میں نے جلدی جلدی یہ مکھڑا لکھ کر دیا تو کہنے لگے کہ اس میں ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے اس کی ٹیون ایک دن میں بنائی لیکن افسوس کی بات ہے کہ اس کی ٹیون اچھی نہیں بنی تھی۔ خیر بن گئی اور سیف صاحب نے خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ فلم کا سیٹ لگا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کو یہ ٹیون پسند ہے میں نے کہا کہ مجھے تو پسند نہیں ہے۔ کہنے لگے کہ مجھے بھی پسند نہیں ہے لیکن میرا سیٹ لگا ہوا ہے۔ اگرچہ آپ کا اچھا گیت ضائع بھی ہو رہا ہے لیکن میں اب اسے اس طرح کرنے پر مجبور ہوں۔ چنانچہ یہ گیت اسی طرح ریکارڈ ہوا۔

ماسٹر صاحب کا معاملہ یہ تھا کہ زیادہ پینے کی وجہ سے چرس نے انہیں مستقل طور پر وہمی بنا دیا تھا۔ لیکن جب کوئی انہیں چرس پلا دیتا تھا تو میں انہیں کہتا تھا کہ ماسٹر جی اول تو ہر نشہ برا ہے لیکن اگر آپ نے نشہ کرنا ہی ہے تو بہتر ہے کہ وسکی کے دو پیگ لیجئے۔ اس سے ایک تو آپ کی سارے دن کی تھکن دور ہوگی اور آپ ٹھیک ٹھاک کام کر لیا کریں گے۔ بیچ میں کاروبار کا کچھ بحران آ گیا تو مجھ سے شکوہ کرنے لگے کہ اگر میں نے آپ کی نصیحت پر اس وقت عمل کیا ہوتا اور میں چرس کی بجائے شراب پینے لگا ہوتا تو میں آج کل کہاں سے شراب پیتا کیونکہ آج کل تو مجھ سے گھر کا خرچ بھی نہیں چلتا۔ میں نے کہا کہ چھوڑ دیتے

شراب چھوڑنا کوئی مشکل کام تو نہیں ہے۔

خیر جب شراب پی لیتے تھے تو وہ بھی اپنے پرانے رومانس کو بیٹھ کر رویا کرتے تھے۔ انڈیا میں آج کل ایک لوک گیت گانے والی خاتون ہے۔ اب تو وہ جیسے ماسٹر عنایت حسین بوڑھے ہو گئے ہیں اس طرح وہ بھی بوڑھی ہو چکی ہے لیکن اب بھی جب ٹیلیویژن پر دیکھتے ہیں تو اس کی آواز وہی لطف دینے والی موجود ہے۔ ماسٹر جی ایک تو اسے یاد کرتے تھے۔ ایک رامپور کے دربار کو یاد کرتے تھے اور کچھ امپریل فلم کمپنی کی باتیں یاد کرتے تھے اور کہتے تھے کہ کاش میں تھوڑا سا پڑھا ہوتا تو آج ڈی بلی موریا کی بجائے میں ہیرو ہوتا۔

وہ پینے کے بعد کوئی گڑبڑ نہیں کرتے تھے اور بڑے بے ضرر آدمی تھے لیکن ماضی کو کریدتے رہتے تھے اور ماضی کی باتیں کرتے کرتے سو جایا کرتے تھے۔

یہاں کے میوزک ڈائریکٹروں میں سے ایک چشتی تھے۔ میرا ان کے ساتھ فلموں کا تعلق کم رہا ہے۔ لیکن اکثر ان سے میل ملاپ رہتا تھا۔ میرے دوست احمد راہی اور وہ ایک ساتھ رہتے تھے اور کام بھی ایک ساتھ کرتے تھے۔ میں احمد راہی کو تلاش کرتے ہوئے کبھی وہاں چلا جاتا تو ان سے مڈبھیڑ ہو جاتی تھی۔ جب میں رائل پارک میں رہتا تھا تو سامنے ایک فلم پروڈکشن تھی۔ جس کے مالک رفیع اختر تھے۔ یہ سب لوگ وہاں بیٹھتے تھے جن میں ایک فلم ڈائریکٹر ایم جے رانا بھی شامل تھے۔ اگرچہ اس محفل میں احمد راہی کم کم آتے تھے لیکن آتے تھے۔ یہ سب حضرات بڑے دوستانہ انداز میں بیٹھتے تھے اور چندا ڈال کر وسکی پیتے تھے اور میوزک ڈائریکٹر چشتی صاحب اگر باہر سے پی کر آتے مگر اور پینے کو جی چاہتا تو یہاں چلے آتے۔ وہ گلاس سامنے رکھ دیتے اور کہتے کہ اس میں پانی ڈالو۔ پانی ڈال کر اسے سامنے رکھ لیتے اور خاموشی سے بیٹھ جاتے۔ پہلے سے پینے کی وجہ سے ایک کیفیت طاری ہوتی تھی۔ اب سب کو پتہ ہوتا تھا کہ یہ آگے کیا کرنے والے ہیں۔ پانی کو غور سے کچھ دیر دیکھنے کے بعد کہتے کہ اس کا رنگ نہیں بدل رہا اور یہ ابھی تک سفید ہے۔ اس پانی کا رنگ بدلو۔ چنانچہ محفل میں سے کوئی صاحب بوتل اٹھا کر اس میں شراب ڈالتے تھے اور یہ خوش ہو کر کہتے تھے کہ ٹھیک ہے اب اس پانی کا رنگ بدل گیا ہے۔ پھر سب کو مخاطب کر

کے کہتے تھے کہ خدا حافظ اور پینا شروع کر دیتے تھے۔ یہیں سے ان کا جھگڑا چلتا تھا اور یہ جب بھی وہاں بیٹھتے تھے تو کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا کہ ان کا آپس میں جھگڑا نہ ہو۔ چنانچہ ہر ایسی نشست کے بعد میں دیکھتا تھا کہ اگلی صبح ان کے دفتر کے باہر بہت سی ٹوٹی ہوئی کراکری پڑی ہوتی تھی اور مجھے خیال آتا تھا کہ اب یہ محفل اجڑ جائے گی لیکن یہ محفل کبھی نہیں اجڑی۔ سب ایک دوسرے کو منا لیتے تھے اور اکثر اوقات منانیوالے چشتی صاحب ہی ہوتے تھے۔ وہ کہیں سے پیسے لے آتے تھے اور سب کو منا لیتے تھے۔ انہوں نے زندگی میں اپنی فلم کا معاوضہ کبھی ایک ساتھ نہیں لیا۔ اگر دس ہزار روپے معاوضہ ہے اور ایک ہزار روپے کی قسط مقرر ہوئی ہے تو یہ قسطیں لے کر کام چلاتے تھے۔ ویسے دس ہزار روپے تو انہیں کبھی زندگی میں معاوضہ نہیں ملا۔ وہ بہت کم معاوضہ لیتے تھے اور بہت زیادہ فلمیں کرتے تھے۔ اب بہت مدت ہوئی ہے کہ وہ شراب پینا چھوڑ چکے ہیں اور نمازی ہو گئے ہیں۔ نیک دل پہلے بھی تھے اور اچھے فن کار تھے۔ پتہ نہیں کیوں فلم سے آؤٹ ہو گئے۔ انہوں نے جتنی دیر تک فلم میں میوزک دیا آخری فلم تک ان کے گانے ہٹ رہے۔ ان کی ٹیونوں کی کاپیاں ہوئیں۔ آج بھی پاکستان میں ہو رہی ہیں اور انڈیا میں بھی ہوئیں۔ انہوں نے پارٹیشن سے پہلے فلم "شکریہ" سے میوزک دینا شروع کیا تھا اور غالباً ۱۹۶۰ء تک ان کا طوطی بولتا رہا جس کے بعد اچانک ہی ان کا کاروبار ختم ہو گیا۔

کامیابی کی صورت میں لوگ جتنی داد دیتے ہیں، ناکامی کی صورت میں لوگ اس سے بڑھ کر تضحیک کرتے ہیں اور بعض اوقات تو لطیفے بھی گھڑ لیتے ہیں۔ ظہیر کاشمیری صاحب ہمارے ان لکھنے والوں میں سے ہیں جن کا قلم ہمہ گیر تحریروں کے لیے مشہور ہے۔ وہ باشعور آدمی ہیں اور ایک نظریہ رکھنے والے اور ادب و سیاست دونوں پر یکساں نظر رکھنے والے ادیبوں میں سے ہیں۔ تقسیم سے پہلے یہ بھی فلم میں آئے تھے۔ اب فلم میں آنے والوں کی خوش قسمتی اور بدقسمتی ساتھ آتی ہے۔ اگر پہلی فلم ہٹ ہو گئی تو اس آدمی کے وارے نیارے ہو گئے اور اسے لکی قرار دے کر دس فلمیں اور عطا کر دی گئیں لیکن اگر پہلی فلم ناکام ہو گئی تو لوگ مذاق اڑاتے ہیں۔

ظہیر کاشمیری صاحب کو چھوٹے چھوٹے چانس تو پہلے بھی ملے تھے لیکن فلم ''کہاں گئے'' میں ان کو بڑا چانس ملا۔ اس کے ڈائریکٹر نرنجن تھے جو کانوں سے بہرے تھے اور چاند بائی اس کی ہیروئن تھی جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس کے نرنجن سے مراسم ہیں۔ یہ فلم جس زمانے میں بن رہی تھی اس زمانے میں اس ٹیم کا ہر آدمی پرامید تھا کہ یہ فلم ہٹ ہوگی۔ خاص طور پر ظہیر صاحب جب ادبی محفلوں میں ہوتے تھے تو اس فلم کا ذکر کرتے تھے اور بتاتے تھے کہ انہوں نے اس میں کیا کیا لکھا ہے۔ کہتے تھے کہ یہ ایک قیامت خیز فلم ہے اور جب آئیگی تو میرا نام سب سے اوپر ہوگا۔ ہمیں ان کی باتوں کا یقین بھی تھا کیونکہ وہ جو دعوے کر رہے تھے ان کے مستحق تھے۔ لیکن فلم کا معاملہ تو لاٹری کا ہوتا ہے۔ اگر نکل آئے تو پانچ لاکھ روپے مل جاتے ہیں۔ نہ نکلے تو پانچ روپے بھی گئے۔

چنانچہ ہم بھی انتظار کرنے لگے۔ یہ فلم ۱۹۴۷ء کے فروری میں رٹز سینما میں لگی پہلا شو چلا تو فلم کی پوری ٹیم بھی گیلری میں موجود ہے۔ یہ روایت اس زمانے میں بھی تھی اور اب بھی ہے اور فلم کی ٹیم لوگوں کا ردعمل دیکھنے کے لیے وہاں جاتی ہے۔ ظہیر کاشمیری صاحب سے میرے مراسم تھے مگر ہم اس ٹیم میں نہیں تھے۔ میں اور میری پروڈکشن والے دوسری کلاس میں بیٹھے ہوئے یہ فلم دیکھ رہے تھے۔ پکچر شروع ہوئی تو چار ریلیں تو لوگوں نے برداشت کیں اور پانچویں ریل پر ہوٹنگ شروع ہوگئی۔ پھر کچھ پکچر جمی اور اس کے بعد انٹرول ہوگیا۔ جب اگلا ہاف شروع ہوا تو پھر وہی بوریت کی کیفیت آ گئی۔ جب فلم ختم ہوئی تو لوگوں نے کرسیاں توڑنی شروع کر دیں اور کرسیوں کے ٹکڑے گیلری میں پھینکنے شروع کر دیتے کیونکہ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ ٹیم اوپر بیٹھی ہوئی ہے۔ لوگوں کو چوٹیں آئیں۔ چاند بائی کے ماتھے پر کرسی لگی اور وہ لہولہان ہوئی۔ یہ سب بیچارے وہاں سے بھاگے اور بڑی مشکل سے جان بچائی۔

لطیفہ یہ ہوا کہ ظہیر صاحب یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے کہ پکچر معیاری نہیں ہے۔ شاید ایسا ہی ہو کیونکہ اپنا اپنا نظریہ ہوتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ پکچر کچھ ایسے بن گئی ہے جس کے خیالات وقت سے پہلے آ گئے ہیں۔ خواجہ احمد عباس ان دنوں اپنی فلم ''آج اور کل'' بنانے

کے لیے آئے ہوئے تھے۔ وہ بھی پروگریسو آدمی تھے اور ظہیر کاشمیری بھی پروگریسو آدمی تھے۔ دونوں ہم مشرب اور ہم مسلک بھی تھے۔ تو لوگوں نے ان کے بارے میں لطیفہ بنالیا کیونکہ جب آدمی ناکام ہو جائے تو لطیفے بھی بن جاتے ہیں۔

چنانچہ لطیفہ کچھ یوں ہے کہ ظہیر کاشمیری صاحب خواجہ احمد عباس کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ آپ نے میری فلم دیکھی ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ہاں دیکھی ہے۔ پوچھنے لگے کیسی ہے۔ خواجہ صاحب کہنے لگے کہ سبحان اللہ بہت اچھی پکچر ہے مجھے اس میں کوئی کمی نظر نہیں آئی صرف دو باتوں کی تھوڑی سی کمی ضرور نظر آئی اور وہ یہ کہ ایک تو پکچر سنائی نہیں دیتی اور دوسرے دکھائی نہیں دیتی۔

یہ لطیفہ بہت عرصہ چلتا رہا اور یوں ظہیر کاشمیری بہت عرصہ فلم میں پیچھے رہے۔ پھر انہیں فلم ''تین پھول'' میں چانس ملا۔ یہ فلم انہوں نے ڈائریکٹ کی اور یہ بھی ناکام ہوگئی۔ یہ ان کی بدقسمتی تھی۔ یہ نہیں کہ یہ نااہل تھے بلکہ فلم کا معاملہ لاٹری والا ہے۔ جب یہ فلم نہ چلی تو لوگوں نے یہاں بھی لطیفے بنائے۔ ایک مشہور لطیفہ یہ ہوا کہ کچھ لوگ ''تین پھول'' فلم دیکھنے کے لیے گئے ہوتے تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ ایک آدمی جو پہلی قطار میں بیٹھا تھا سو گیا۔ پچھلے آدمی نے اسے تھوڑا سا ہلا کر کہا کہ جناب آپ فلم دیکھتے دیکھتے سو گئے ہیں اور خراٹے لے رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ اگر میں سو گیا ہوں تو آپ کو کیا ہے۔ تو اس آدمی نے کہا کہ آپ کے خراٹے مجھے سونے نہیں دے رہے۔ آپ میری نیند میں کیوں خلل ڈال رہے ہیں۔ چنانچہ اس فلم پر یہ لطیفہ مشہور ہوا۔

ظہیر کاشمیری اس کے بعد فلم سے الگ ہو گئے اور اس کے بعد ان کا اپنا جو میدان تھا یعنی ادب اور سیاست اس میں بہت آگے بڑھے۔ کئی کتابیں لکھیں اور ان کی تصانیف سے لوگوں نے رہنمائی حاصل کی۔

پینے کے بعد میں نے ان کی جو کیفیت دیکھی وہ یہ تھی کہ وہ پینے کے بعد مخاطب کو سٹوڈنٹ سمجھ کر سوشلزم پر تقریر کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ یہاں یہ ذکر کرتا چلوں کہ آج سے دس پندرہ سال پہلے انہیں فالج ہو گیا تھا اور ہسپتال میں زیر علاج رہے۔ اس وقت سے

انہوں نے پینی چھوڑ دی اور اب اتنے تندرست ہوگئے ہیں کہ ستر سال کے ہونے کے باوجود وہ پچاس سال کے نظر آتے ہیں۔ میں ان کی عادت کا ذکر کر رہا تھا۔ پینے کے بعد وہ سوشلزم پر تقریر کرتے تھے۔ یہ تقریر بوگس نہیں ہوتی تھی بلکہ جینوئن ہوتی تھی۔ اور ایسا لگتا تھا کہ پوری کی پوری تقریر ان پر نازل ہو رہی ہے۔ دوسرا انہیں چونکہ گانے سے مس رہا ہے اور وہ گانے کی باریکیوں کو بھی جانتے ہیں اس لیے وہ کوئی ٹھمری دادرا یا کوئی پکا راگ ضرور سناتے تھے۔ تیسرا یہ ہے کہ وہ اپنا تازہ کلام ضرور سناتے تھے۔ یہ سب کچھ سنا کر ہی انہیں چین آتا تھا۔

یہ سب ان کی پینے کے بعد کی عادتیں ہیں اور یہ ساری چیزیں صحت مند ہیں۔ میں نے ان کی اس عادت سے کافی سیکھا۔ اگرچہ میں ان کے ساتھ اس طرح کی محفلوں میں زیادہ نہیں بیٹھا لیکن ان کے جو خیالات مجھ تک پہنچتے تھے میں انہیں توجہ سے سنتا تھا۔ ظہیر صاحب کی آواز بھی اچھی تھی اور اگر وہ راگنی سناتے تو واقعی مزہ آتا۔ اس طرح اگر ایک اچھے شاعر کا تازہ کلام سن لیا جائے تو اس سے بھی خود کہنے کی تحریک ہوتی ہے۔

چنانچہ پینے کے بعد میرے تجربے میں جو بہتر آدمی آیا ہے وہ ظہیر کاشمیری ہیں۔

کثرت بادہ نوشی

صوفی تبسم ہمہ گیر صفات کے مالک انسان تھے۔ استاد کی حیثیت سے وہ ہزاروں شاگردوں کے دلوں میں موجود تھے۔ ان کے شاگردوں میں بڑے بڑے آفیسر، تاجر، سرمایہ کار، لیڈر، علماء اور متعدد دیگر حیثیتوں کے لوگ شامل تھے اور جب وہ صوفی صاحب سے ملتے تھے تو اسی احترام سے ملتے تھے جیسے کبھی کلاس میں ان سے ملتے رہے تھے۔ صوفی صاحب اپنے شاگردوں سے اتنا احترام وصول کرنے کے باوجود انہیں اپنا دوست ہی سمجھتے تھے۔ سنا ہے کہ جب وہ ہاسٹل کے انچارج تھے تو اس زمانے میں بھی ان کا بعض شاگردوں سے رویہ بے تکلف دوستوں جیسا تھا۔ اور وہ زندگی کے کچھ رنگیں معمولات میں بھی انہیں حصہ دار بناتے تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ تعلیمی سرگرمیوں یا اپنے فرائض منصبی سے ہٹ جاتے ہوں بلکہ صوفی صاحب کا طریق کار یہ تھا کہ وہ جس طالب علم کو دیکھتے کہ وہ تعلیم کے راستے سے ہٹ رہا ہے اسے اپنے حلقے میں لے آتے تھے اور اسے دوست بن کر سیدھی راہ پر چلاتے تھے۔ اس طرح بعض طلبہ ان کے اس رویے کی وجہ سے دوبارہ تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور زندگی کی دوڑ میں بہت آگے نکلے۔ آج بھی ان میں سے جو موجود ہیں وہ بڑے بڑے مناصب پر تعینات ہیں۔

صوفی صاحب کے گھر بدلتے رہے۔ پہلے تو وہ ہوسٹل ہی کی رہائش گاہ میں ٹھہرے ہوئے تھے جہاں ان کے دوست احباب کا جمگھٹا رہتا تھا۔ پھر وہ بہت عرصہ کرشن نگر میں رہے۔ یہاں بھی یہی صورت تھی کہ لوگ ان کے ہاں شام کو پہنچ جاتے تھے اور شام کو وہاں

پہنچنے کا مطلب یہ تھا کہ کچھ رنگیں لمحات صوفی صاحب کے ساتھ گزارے جائیں۔ چنانچہ اگر نام لیا جائے تو صوفی صاحب کے حلقے میں ایسے ایسے لوگ نظر آتے ہیں جو بہت ثقہ، پارسا اور دیندار نظر آتے ہیں۔ لیکن صوفی صاحب کی محفل میں یہ لوگ صوفی صاحب جیسے ہی بن جاتے تھے اور صوفی صاحب ایک یار باش، رنگین مزاج دوست اور انجمن آرا ادیب اور خوش گو شاعر تھے۔ صرف یہی ایک معاملہ تھا جب وہ شام کو اپنے ایک دوسرے روپ میں سامنے آتے تھے۔ اور ساتھیوں سمیت وہ تھوڑا سا وقت خوش گپیوں میں گزار کر اگلے دن کی تیاری میں مصروف ہو جاتے تھے۔

صوفی صاحب کا گھر جب سمن آباد میں منتقل ہوا تو اس وقت ان کے گھر میں خاص رونق ہوتی تھی۔ ان کی محفل میں جو لوگ شامل ہوتے تھے وہ اپنا اپنا سامان ساتھ لے کر آتے تھے۔ اور مل کر امریکن سسٹم کی طرز پر چیزیں مہیا کرتے تھے۔ صوفی صاحب وہاں اپنے ہاتھوں سے سب کے لیے پکوڑے بناتے تھے اور کبھی کشمیری کھانے بھی ان کے گھر سے بن کر آتے تھے اور یہ سلسلہ صوفی صاحب کی وفات تک چلتا رہا۔

صوفی صاحب میں پینے کے بعد اور تو کوئی خاص تبدیلی نہیں آتی تھی صرف یہ کہ وہ ماضی سے لے کر حال تک کی کچھ باتیں بڑے دلچسپ پیرائے میں سناتے تھے اور اگر ذرا زیادہ موڈ میں ہوتے تو ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کو گاؤ تکیہ سمجھ کر اور اس پر کہنی ٹیک کر عشقیہ شاعری شروع کر دیتے تھے۔ اس سے ذرا آگے بڑھتے تھے تو اس گاؤ تکیے پر سر ٹکا کر سو بھی جاتے تھے۔

صوفی صاحب زندگی میں بہت نڈر تھے اور مخاطب کو ڈانٹ بھی دیا کرتے تھے۔ اگر کوئی ان پر جملہ کستا تو جواب بھی دیتے تھے لیکن حیرت کی بات ہے کہ حفیظ جالندھری کے ہاتھوں بہت نالاں تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی ایسی بات ہے جس کی وجہ سے وہ حفیظ صاحب سے دبتے ہیں اور ان کے شدید حملوں کے جواب میں بھی کچھ بول نہیں پاتے۔ مشاعروں میں حفیظ صاحب خاص طور پر صوفی صاحب کی تضحیک کرتے تھے اور کھلے عام کہتے تھے کہ صوفی دیکھو اس شعر میں میں نے ایک لفظ استعمال کیا ہے اور تم تو نہیں

جانتے لفظ کا ایک معنی ہوتا ہے۔ اس معنی کو سمجھ کر اس شعر پر غور کرو۔ صوفی صاحب یہ بات سن کر سوائے اس کے کہ چپ ہو جاتے تھے اور کچھ نہیں کرتے تھے لیکن ان سے تنگ بہت تھے۔

ایک دن اس طرح محفل جمی ہوئی تھی تو صوفی صاحب کہنے لگے کہ یار میں اس حفیظ کا کیا کروں۔ اس نے بہت تنگ کر رکھا ہے۔ سب نے کہا کہ آپ جواب دیا کریں۔ آپ بولتے کیوں نہیں۔ کہنے لگے کہ اس طرح بدمزگی ہوگی اور لڑائی جھگڑے کا اندیشہ ہے۔ میں نے کہا کہ نہ تو حفیظ صاحب کو ہم نے کبھی لڑتے دیکھا ہے اور نہ ہی کبھی آپ لڑے ہیں اس لیے لڑائی نہیں ہوگی بلکہ بس جملہ بازی ہوگی۔ کہنے لگے اچھا۔ لیکن اس کے بعد بھی اسی طرح ہوتا رہا کہ حفیظ صاحب ان پر طنز کرتے تھے اور یہ خاموش رہ جاتے تھے۔

ایک بار سب نے کہا کہ صوفی صاحب! حفیظ صاحب سے آپ کا بدلہ آج لیتے ہیں۔ شاید اس سے کچھ علاج ہو جائے۔ ہوا یہ کہ ریڈیو کا ایک مشاعرہ تھا۔ اس میں حفیظ صاحب، صوفی صاحب، احمد ندیم قاسمی، ناصر کاظمی اور دوسرے بہت سے لوگ بھی شامل تھے۔ میں بھی موجود تھا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ جب حفیظ صاحب کلام پڑھیں تو انہیں داد نہ دی جائے اور بعد میں جتایا جائے کہ آپ صوفی صاحب سے جو زیادتیاں کرتے ہیں یہ ان کا بدلہ ہے۔ صوفی صاحب نے حفیظ صاحب سے پہلے پڑھنا تھا۔ انہیں سب نے خوب داد دی بلکہ ضرورت سے زیادہ داد دی۔ حفیظ صاحب چپ بیٹھے رہے۔ حفیظ صاحب کی باری آئی تو سب نے داد تو دی لیکن منہ سے بولے بغیر۔ حفیظ صاحب کی طرف دیکھتے تھے وہ ہاتھ ہلا کر یا سر ہلا کر داد دے دیتا تھا اب ریڈیو کا مشاعرہ ہو تو یہ ایکشن تو کوئی دیکھ نہیں پاتا جب تک منہ سے آواز نہ نکلے سامعین کو پتہ نہیں چلتا حفیظ صاحب کی پوری غزل کے دوران کسی نے منہ سے داد نہ دی۔ مشاعرہ انہی پر ختم ہونا تھا۔ چنانچہ مشاعرہ ختم ہوا تو حفیظ صاحب سب سے پہلے آمی تھے جو براڈ کاسٹنگ کے کمرے سے باہر نکلے اور اس طرح نکلے جیسے کوئی بھاگ کر جاتا ہے۔ ان کا رویہ ایسا تھا جیسے کوئی احتجاج کرتا ہے۔ بعد میں ان تک یہ پیغام پہنچا دیا گیا تھا کہ یوں داد نہ دینا دراصل صوفی صاحب کے لیے سب

شاعروں کا بدلہ تھا۔ اور اگر آپ آئندہ بھی اسی طرح کرتے رہیں گے تو آپ سے اسی طرح کے سلوک ہوں گے۔ اس پیغام کے بعد حفیظ صاحب کے حملے اعتدال پر آ گئے۔ اب وہ جارحانہ انداز سے نہیں بلکہ شاعرانہ انداز سے نوک جھونک کی حد تک رہتے تھے۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ صوفی صاحب جب زیادہ موڈ میں ہوتے تھے تو انہیں نیند آ جاتی تھی اور وہ سو جاتے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ صوفی صاحب کے ایک دوست کے گھر میں کچھ اسی قسم کا انتظام تھا۔ صوفی صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ جب محفل ختم ہوئی تو ایک اور دوست کے حوالہ یہ دو چار آدمی کر دیئے گئے اور اسے کہا گیا کہ صوفی صاحب اور ان دوسرے آدمیوں کو ان کے گھروں تک پہنچا دو۔ پہلے دو آدمیوں کو اس شخص نے ان کے گھروں پر پہنچا دیا۔ اور اس کے بعد وہ یہ سمجھ بیٹھا کہ سب آدمی اتر گئے ہیں اور اب وہ اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ گھر جا کر اس نے گاڑی گیراج میں کھڑی کر دی اور اسے تالا لگا کر سو گیا۔ بستر میں لیٹے لیٹے اسے خیال آیا کہ اس کی کوئی چیز گاڑی میں رہ گئی ہے۔ یہ بات اسے اس وقت یاد آئی تھی جب وہ دو تین گھنٹے سونے کے بعد پانی پینے کے لیے جاگا تھا۔ چنانچہ اس نے جب آ کر گاڑی کھولی تو دیکھا کہ صوفی صاحب پچھلی سیٹ پر سوئے خراٹے لے رہے تھے۔

اسی زمانے میں ہمارے ساتھیوں میں جو اور دوست شریک تھے ان میں مظفر وارثی صاحب بھی شامل تھے۔ انہوں نے بہت مدت تک ہمارا ساتھ دیا۔ یہ بہت سلجھے ہوئے بادہ کش تھے۔ سوائے اس کے کہ کئی بار ان سے کہا جاتا تھا کہ آپ اعتدال میں رہ کر شغل کیجئے۔ لیکن وہ کوارٹر سے نیچے تو کبھی آئے نہیں۔ اس کے بعد بھی اگر ایک آدھ جرعہ اور مل جائے تو انہیں انکار نہیں ہوتا تھا۔

اچھا ہوا کہ یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ کیونکہ انہیں معدے کی انتڑیوں کی تکلیف تھی۔ اور ہم جانتے تھے کہ اس چیز سے وہ تکلیف بڑھ سکتی ہے۔ انہیں بھی احساس تھا لیکن ہوتا یوں ہی ہے کہ جب تک کوئی بیماری سامنے نہ آ جائے پینے والا اس سے کنارہ کش نہیں ہوتا بلکہ کچھ ضدی لوگ تو اسے اپنے اوپر سوار کر لیتے ہیں لیکن جو سمجھدار لوگ ہوتے ہیں وہ

بروقت اس سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جب مظفر وارثی صاحب کو السر کی شکایت ہوئی تو وہ اس سے تائب ہو گئے اور میرا خیال ہے کہ اب انہیں تائب ہوئے بھی دس سال ہو گئے ہوں گے اور اب ان کے خون سے الکحل کے آخری اثرات بھی زائل ہو چکے ہوں گے۔ اور الحمد للہ کہ وہ اب ایک نیک اور پارسا زندگی گزار رہے ہیں۔

ان کی باقی سب لوگوں سے پینے کے بعد کی عادات بالکل مختلف ہوتی تھیں۔ جیسے کہ میں نے عرض کیا کہ کچھ لوگ زیادہ باتیں کرنے لگتے ہیں، کچھ شعر و شاعری کرتے ہیں، کچھ غل غپاڑہ کرتے ہیں اور کچھ شکوے شکایت کرتے ہیں لیکن مظفر صاحب کی یہ عادت سب سے اچھی تھی اور وہ جتنا پیتے جاتے تھے اتنا خاموش ہوتے چلے جاتے تھے اور جب پیتے پیتے بالکل خاموش ہو جاتے تو اس کا مطلب ہوتا تھا کہ وہ اب پوری کیفیت میں ہیں۔ اور اس کے بعد اگر وہ مانگتے بھی تو دوست ان کا ہاتھ کھینچ لیا کرتے تھے۔ یہ عادت ان میں دیکھی اور یا پھر فیض احمد فیض میں دیکھی۔

فیض صاحب کا بھی یہی حال تھا کہ شام کو بیٹھے ہیں اور چاہے صبح تک محفل جمی رہے وہ اپنا شغل جاری رکھتے تھے اور کیا مجال کہ ان کے منہ سے کوئی فالتو بات نکلے۔ ہم نے انہیں ایک ایک بوتل تک پیتے دیکھا ہے لیکن انہیں کبھی آؤٹ ہوتے یا فالتو بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی انہیں نیند آتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ ہمیشہ نارمل رہتے تھے اور ان کی یہ کیفیت اس وقت تک رہی جب وہ بیمار پڑ گئے اور پرہیز کے طور پر بادہ کشی ترک کر دی۔ یہ ان کی وفات سے سات آٹھ ماہ پہلے کی بات ہے۔ لیکن جب تک وہ پیتے رہے ان سے زیادہ سلجھا ہوا رند خرابا تی میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔

سید عابد علی عابد کا نام بھی ایسے ہی چند سلجھے ہوئے پینے والوں میں آتا ہے۔ البتہ مظفر وارثی، فیض احمد فیض اور سید عابد علی عابد میں فرق یہ تھا کہ مظفر وارثی تو بالکل خاموش ہو جایا کرتے تھے۔ فیض صاحب کہیں کہیں بات چیت بھی کرتے تھے لیکن عابد صاحب کبھی بہکے نہیں اور نہ ہی کبھی کوئی فالتو بات کی لیکن اگر اس وقت انہیں کبھی چھیڑ دیا جائے اور کوئی ادبی یا فنی مسئلہ شروع کر دیا جائے تو ان کے پاس اس بارے میں جتنا بھی علم ہوتا تھا وہ

فرض سمجھتے تھے کہ آپ پر انڈیل دیں اور جب تک وہ اپنی پوری بات کہہ نہ پاتے سننے والے کو اٹھنے نہیں دیتے تھے۔ یہ چیز بظاہر ایک ناگواری صورت بھی پیدا کر سکتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر عابد علی عابد جیسا شخص آپ پر یہ کرم کرے اور خواہ یہ نشے کی حالت ہی میں کیوں نہ ہو، یہ بہت مفید ہے۔ میں نے ایسی کیفیت میں ان سے مختلف اوقات میں ادب، موسیقی اور ڈرامے پر جو باتیں سنیں ان سے میرے علم میں بہت اضافہ ہوا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس شخص کی خوش قسمتی ہوتی تھی جسے عابد علی عابد پئے ہوئے مل جائیں۔

ان سلجھے ہوئے لوگوں کے بعد ایک نام اس بدنصیب شاعر کا بھی آتا ہے جس نے شراب نہیں پی بلکہ جسے شراب پی گئی۔ یہ نام اقبال ساجد کا ہے۔ اقبال ساجد شروع میں ایک نارمل آدمی تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسے شراب کی لت لگ گئی۔ خیر ٹھیک ہے اور لوگ بھی پیتے تھے۔ یہ بھی کوئی ایسے تعجب کی بات نہیں تھی۔ جہاں تک شعروں کا معاملہ ہے اقبال ساجد کا انداز بالکل نیا تھا۔ اس کا کلام چونکا دینے والا تھا۔ پھر ہم نے سنا کہ اس نے پینے میں کچھ زیادتی شروع کر دی ہے اور جو تھوڑا بہت کام کرتا تھا اس سے بھی ہاتھ اٹھا لیا ہے۔

اس سلسلے میں بہت سے دوستوں نے اس کی مدد بھی کی۔ جب وہ بیکار ہو گیا تو اسے بہت سی نوکریاں دلوائیں۔ چونکہ اس کی تعلیم تو کوئی تھی نہیں اور پانچ جماعت پاس تھا۔ اگرچہ شاعری کا مرتبہ بلند تھا لیکن نوکریوں کے لیے تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے باوجود احمد ندیم قاسمی صاحب نے اسے کم از کم تین ملازمتیں دلوائیں لیکن وہ کچھ عرصہ تک نوکری کرنے کے بعد چھوڑ دیتے تھے۔ اور یہاں سے ان کا غیر ذمہ داری کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اور وہ کام کی بجائے دوستوں پر بوجھ بننے لگے۔

جب وہ مشاعروں میں جاتے بلکہ لوگ انہیں مشاعروں کے لیے Recommend کرتے تھے تاکہ ان کی مدد ہو جائے لیکن وہاں بھی کثرت بادہ نوشی کی وجہ سے یہ ماحول کو خراب کر کے رہتے تھے۔ کبھی اس سے الجھتے کبھی اس سے۔ ادھر معاملات کم ہو گئے اور اس کے بعد وہی جو بے اعتدال شرابیوں کا انجام ہوتا ہے انہوں نے دوستوں پر بوجھ بننا شروع کر دیا۔ کبھی کسی بہانے سے کسی سے پیسے لیتے اور کبھی کسی بہانے

سے۔ شروع میں تو لوگ سو پچاس روپے دے بھی دیتے تھے۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ یہ تو جان بوجھ کر بیکار رہنے والے آدمی ہیں تو یہ معاملہ دس بیس پر آ گیا اور پھر یہ بھی ہوا کہ دوست انہیں دیکھ کر راستہ بدل جاتے تھے۔ اور اگر یہ کسی گھر پہ جا کر دستک دیتے اور صاحب خانہ کو پتہ چلتا کہ اقبال ساجد آئے ہیں تو یہ ناگوار صورت بھی پیدا ہوتی کہ وہ اندر ہی سے کہلوا بھیجتے کہ وہ صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ ان کی بہت تکلیف دہ شکل تھی۔

اقبال ساجد کبھی کبھار میرے پاس بھی آتے تھے۔ میں بھی جو خدمت کر سکتا تھا کر دیتا تھا اور انہیں دوستوں کی طرح سمجھاتا تھا کہ وہ کوئی کام کریں۔ لیکن وہ کہتے تھے کہ قتیل صاحب ایسی بات نہیں ہے اور میرے بچے بھی ہیں۔ بچے بھی وہ چھ سات پیدا کیے ہوئے تھے۔ بیوی بھی تھی۔ کچھ ادیبوں نے مل کر انہیں ایک فلیٹ بھی لے دیا تھا۔ یہ مفت کا فلیٹ بھی انہیں ملا ہوا تھا لیکن انہیں جھوٹ بولنے کی عادت بھی ہو گئی اور وہ لوگوں کے پاس جا کر تقاضا کرتے تھے کہ مجھے بیس روپے دے دیں۔ میرے پاس بھی آ کر کہتے کہ کچھ پیسے دے دیں۔ میں کہتا تھا کہ اگر آپ کو کچھ چیزوں کی ضرورت ہے تو مجھے بتائیں میں آپ کو ادھار لے دیتا ہوں۔ اس پر وہ میرے ساتھ بھی ناراض ہونے لگتے تھے اور کہتے تھے کہ میں ایسے لینے پر لعنت بھیجتا ہوں جس میں کوئی دوست مجھ پر اعتبار نہ کرے۔ اور جھگڑنے پر آ جاتے تھے۔

دوسرے دوستوں کے ساتھ بھی اس طرح ہوتا ہوگا۔ سب دوست ان کی مدد کرتے رہے۔ اب شراب بھی پیسے خرچ کراتی ہے اور اگر باقاعدہ کسی ڈسٹلری کی شراب لی جائے تو وہ پاکستان میں خاصی مہنگی ملتی ہے اور جب سے ممنوع قرار دیدی گئی ہے یہ بلیک میں ملتی ہے۔ یہ شراب کوئی ایسا شرابی afford نہیں کر سکتا جو ہمہ وقت پیتا رہے۔ اس کے لیے تو مصنوعی شرابیں ہی ہو سکتی ہیں یا کچھ ایسی دوائیاں ہیں جو شراب کی جگہ لی جاتی ہیں۔ ان کی جیب میں بھی ہر وقت ایسی ہی ایک شراب رہتی تھی جو دس روپے کی ایک بوتل یا کپی آتی تھی۔ گھر کے اخراجات پر وہ پیسہ کم خرچ کرتے تھے اور انہی کیپوں پر زیادہ پیسے خرچ کرتے تھے اور ان کے منہ سے ہر وقت بدبو آتی رہتی تھی۔ وہ بہت بدبودار چیز پیتے تھے۔

پھر پتہ چلا کہ انہوں نے اشعار بھی لکھ کر بیچنے شروع کر دیئے ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کیونکہ یہ تو ان کی اپنی ملکیت ہے۔ کیونکہ میں نے بھی اپنی ابتدائی زندگی میں اشعار بیچے ہیں اور کچھ اور لوگوں نے بھی ایسا کیا ہوگا لیکن ایک شاعر سے ایک مانگنے والا بن جانا جس کو لوگ نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ ان کی زندگی کا یہ پہلو بہت کراہت آمیز اور مکروہ سا سامنے آ گیا۔ اسی سلسلے میں ان کے گھر میں بھی جھگڑے رہنے لگے۔ پھر انہیں اس قسم کی گھٹیا شراب پینے کے لیے عجیب عجیب پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔ کبھی وہ تھوڑی سی تکلیف کے بعد ہسپتال میں داخل ہو جاتے تھے اور وہاں سے صاحب استطاعت لوگوں کو خط لکھتے تھے اور سو دو سو خط ہسپتال سے لکھ کر اور ان میں اپنے گھر کا ایڈریس لکھ کر آ جاتے تھے۔ ان میں سے جو لوگ انہیں نہیں جانتے تھے وہ ان کی کچھ مدد کر دیتے تھے۔ شراب کی وجہ سے ان میں ایسی ایسی گراوٹیں آ گئی تھیں۔

ایک دن ایسا بھی آیا کہ وہ اپنے گھر کی دہلیز پر گر کر ملک عدم کو سدھار گئے اور اپنے پیچھے بہت سے بچوں کو اور ایک بیوی کو روتا ہوا چھوڑ گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی زندگی ہی میں اکیڈمی آف لیٹرز کی طرف سے ان کا وظیفہ لگ گیا تھا جس سے ان کے بچوں کا گزر بسر ہو جاتا تھا۔ ان کی وفات کے بعد بھی یہ وظیفہ جاری ہے۔ اور یہ اچھی بات ہے کہ ایک ایسا سرکاری ادارہ موجود ہے جس سے مستحق ادیبوں کی مدد ہو جاتی ہے۔

فلیٹ تو ان کے دوستوں نے ان کی زندگی ہی میں لے دیا تھا اور وظیفہ بھی بچوں کو مل رہا ہے اس سے ان کی بیوہ اور بچوں کا کچھ خرچ چل جاتا ہوگا۔ اس کے علاوہ بھی ان کی بیوہ محنت مزدوری کر کے بچوں کا پیٹ پالتی ہوگی۔ بہرحال ایک غیر ذمہ دار شاعر کی وجہ سے ایک پوری فیملی مبتلائے عذاب ہوئی۔ زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی ان کے بچوں کا برا حال ہے۔ یہ شراب شاید ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے دور اسلام میں ممنوع قرار دی گئی ہوگی۔

شراب خواہ کچھ بھی ہو کہ کیسی بھی ہو جب اس کا استعمال اقبال ساجد کی طرح کیا جائے تو اس کا انجام موت کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اقبال ساجد سماجی طور پر کوئی بڑا آدمی نہیں تھا۔ وہ ایک غریب فیملی سے تعلق رکھتا تھا اور کوئی فیملی بیک گراؤنڈ بھی بڑی نہیں تھی لیکن سعادت حسن منٹو ایک بڑی فیملی کا آدمی تھا اور تعلیم یافتہ بھی تھا۔ باپ کی طرف سے بھی ایک بلند مرتبت عہدہ وابستہ تھا اور ان کی پوری فیملی پڑھی لکھی تھی۔

سعادت حسن منٹو افسانہ نگاری میں بہت بڑا نام حاصل کرنے کے علاوہ فلم کے میدان میں بھی ایک بڑی شخصیت تھے۔ یہ جب ممبئی میں تھے تو بہت خوشحال زندگی تھی انہوں نے مختلف فلمی اداروں میں کام کیا اور بعض مالکان ادارہ کی آنکھوں کا تارا بنے رہے اور وہاں جو بعض اداروں میں رائٹرز کی جو ٹیمیں بنی ہوتی تھیں یہ ایک طرح سے ہمیشہ ان کے سربراہ ہی رہے۔

خاص طور پر جب ایس مکرجی نے فلمستان کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تو منٹو اس میں آگے آگے تھے اور بہت معقول معاوضہ لیتے تھے۔ اشوک کمار سے ان کے ایسے تعلقات تھے کہ اشوک کمار ان سے بڑھ کر کسی کو اپنا دوست نہیں مانتے تھے۔ پچھلے دنوں اشوک کمار کا ایک مضمون بھی شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے بڑی دردمندی کے ساتھ منٹو کا ذکر کیا تھا۔ اور منٹو نے اپنی زندگی میں اشوک کمار پر جو مضمون دادامنی کے نام سے لکھا تھا اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں کے مراسم کیا تھے۔

منٹو صاحب جب تک ممبئی میں رہے فلم اور صحافت میں ان کا نام رہا۔ یہ ''مصور'' رسالے کے بھی ایڈیٹر تھے اور اچھی خاصی آمدن تھی۔ چنانچہ ان کی زندگی میں ان کی نظر میں جو رنگینیاں ضروری تھیں وہ ان کی دسترس میں تھیں اور بآسانی موجود تھیں۔ وہاں یہ جو چاہتے تھے وہی کچھ ہوتا تھا۔

انہوں نے فلموں میں کچھ تجربے کئے۔ انہوں نے فلمستان والوں کو ایک فلم لکھ کر دی جس کا نام ''آٹھ دن'' تھا۔ اس فلم کی کہانی آٹھ دن کے اندر اندر ختم ہوتی ہے۔ اس فلم کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں بہت سے ادیبوں نے کام کیا۔ خود سعادت حسن منٹو نے اس میں ایک پاگل لیفٹیننٹ کرپارام کا کردار ادا کیا جو جنگ کے دوران پاگل ہو جاتا ہے۔ ان

کے علاوہ راجہ مہدی علی خان نے بھی اس میں کام کیا۔ منٹو کے ایک اور ساتھی نے پنڈت طوطا رام کا کردار ادا کیا۔ اس طرح منٹو صاحب نے یہ تجرباتی فلم بنائی۔

یہ فلم خاص طبقوں میں پسند کی گئی لیکن یہ فارمولا فلموں کی طرح نہ چل سکا لیکن یہ فلم آج بھی فلموں کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل ہے۔ پنڈت طوطا رام کا کردار اپندر ناتھ اشک نے کیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتنے اچھے لکھنے والوں نے اس فلم میں کام کیا تھا۔

یہاں کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سعادت حسن منٹو اپنے اداروں پر کمانڈ رکھتے تھے۔ اس کے بعد ان کی شادی بھی ہوئی۔ ان کی بیوی ممبئی میں ان کے ساتھ تھیں۔ بچی پیدا ہوئی۔ ٹھیک ٹھاک زندگی گزر رہی تھی۔ پیتے پلاتے سبھی تھے۔ ممبئی جیسی سوسائٹی میں یہ بات خلاف معمول نہیں تھی اور بہت شریف گھرانوں کے لوگ جن میں ہندو، عیسائی، سکھ، مسلمان بھی شامل تھے، سب کی تقریبات میں یہ دور چلتا تھا۔

جب تک منٹو صاحب ممبئی میں رہے اعتدال سے پیتے رہے۔ پارٹیشن کے بعد یہ یہاں لاہور میں آ گئے تب بھی ان کے بارے میں ایسی خبریں نہیں آ رہی تھیں بلکہ انہوں نے یہاں آ کر بعض شاہکار افسانے لکھے۔ پھر جب فلم میں آئے اور ان کے بھانجے مسعود پرویز نے فلم ''بیلی'' کے لیے ان کی خدمات حاصل کیں۔ یہ فلم فیل ہوگئی اور ایک فلم فیل ہو جائے تو بہت سے لوگ فیل ہو جاتے ہیں چنانچہ منٹو صاحب کا بھی یہی حال ہوا اور اس کے بعد بیروزگاری کا مسئلہ بڑھ گیا۔ اس طرح ان کی شراب نوشی بڑھتی گئی۔

مختصراً یہ کہ منٹو صاحب بھی بالآخر اس منزل پر پہنچ گئے جہاں شراب کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ روز ایک افسانہ لکھتے اور لے جا کر پبلشر کے حوالے کر کے تیس روپے معاوضہ لیتے۔ اس وقت دیسی شراب کی بوتل دس پندرہ روپے کی آتی تھی۔ یہ بوتل خریدتے تھے اور جس وقت تک سو نہیں جاتے تھے پیتے رہتے تھے۔ بہت صاف ستھرے آدمی تھے۔

ان کا معمول یہ تھا کہ صبح اٹھ کر شیو کر کے، نہا دھو کر اور بہت خوبصورت سفید براق

دھلے ہوئے کپڑے پہنتے۔ گرمیوں میں زیادہ تر کرتہ پاجامہ اور سردیوں میں سوٹ پہنتے تھے۔ اس کے بعد ناشتہ کر کے ادبی کام پر بیٹھ جاتے تھے۔ اس کے بعد ایک آدھ افسانہ لکھ کر نو بجے گھر سے نکل جاتے تھے۔ مکتبہ جدید والوں کو اکثر افسانہ پہنچاتے تھے۔ ان سے تیس روپے لیتے اور پھر رات تک شراب کا سلسلہ چلتا رہتا۔

میں نے منٹو صاحب سے پوچھا تھا کہ آپ اتنی پیتے ہیں تو پی کر لکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں جو کچھ ادب کے لیے لکھتا ہوں وہ صبح لکھتا ہوں جبکہ میں نارمل ہوتا ہوں۔ چنانچہ منٹو صاحب نے بھی یہی کہا تھا کہ شراب سے ادب کی تخلیق کا کوئی تعلق نہیں بلکہ آدمی نے اگر پی ہو تو ڈسٹرب ہوتا ہے۔

اس شراب کی وجہ سے وہ منٹو جو اپنی جیب سے خرچ کیا کرتا تھا۔ خود لوگوں پر بوجھ بننے لگا۔ حالانکہ اگر یہ کثرت شراب نوشی نہ ہوتی تو منٹو صاحب کو بوجھ بننے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ان کی فیملی بہت بڑی تھی اور اگر ان کی ضرورت جائز ہوتی تو ان کی فیملی ان کی مدد کرتی لیکن چونکہ سب کو ان کی شراب نوشی کا پتہ تھا اس لیے وہ مدد نہیں کرتے تھے۔ ایسے بھی ہوتا تھا کہ لوگ انہیں کہتے تھے کہ منٹو صاحب فلم تو آپ کے لیے موجود ہے لیکن شرط یہ ہے کہ فلم کے دفتر میں پئیں گے نہیں۔ یہ کہتے تھے کہ میں کب پیتا ہوں۔ وعدہ کر لیتے کہ نہیں پئوں گا لیکن اچانک پتہ چلتا تھا کہ ان کے منہ سے شراب کی بو آ رہی ہے۔ یہ پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ انہوں نے فلم کے دفتر میں بیٹھے ہوئے کب پی لی۔ چنانچہ وہ موقع پا کر یا غسل خانے میں جا کر پی آتے تھے۔

میرے ساتھ منٹو صاحب کے پینے کے مراسم نہیں تھے لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں میں باقاعدہ پینے والوں میں سے نہیں تھا اور انہیں باقاعدہ پینے والوں کی صحبت درکار تھی۔ ان لوگوں میں رشید عطرے، نصیر انور مرحوم اور شاد امرتسری شامل تھے۔ کبھی کبھی ظہیر صاحب بھی ساتھ ہوتے تھے۔ مجھ سے ان کے تعلقات یہ تھے کہ اگر مجھے ان سے ملنا ہوتا تھا تو میں صبح صبح اس وقت جاتا تھا جب وہ گھر پر ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ شام یا دن کے پینے پلانے سے میرا ان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ کسی حلقے میں انہوں نے

پڑھنا ہوتا تو وہاں انہیں سننے کے لیے چلے جاتے تھے یا کسی باہر کے پرچے نے مجھ سے کہا کہ منٹو صاحب کا افسانہ چاہیے تو میں افسانہ لینے چلا جاتا تھا۔ وہ مجھ سے پیار کرتے تھے۔ ان کا تکیہ کلام میری جان تھا یا پھر خواجہ کہہ کر دوستوں کو پکارتے تھے۔ اس وقت تک میری ان سے بے تکلفی نہیں تھی۔

لیکن ان پر جب ایک ایسا وقت آیا جب ان کی کیفیت ٹھیک نہیں تھی تو وہ دیوانوں جیسی باتیں کرنے لگے۔ میں صبح صبح ان کے گھر گیا تو کہنے لگے کہ قتیل میری جان۔ تم نے مجھے فون تو نہیں کیا تھا نا۔ اور مجھے پتہ نہیں تھا کہ تم آ رہے ہو لیکن جب تم بیڈن روڈ پر پہنچے تو مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تم بیڈن روڈ پر پہنچ گئے ہو اور جب تم اس موڑ سے مڑے ہو تو مجھے پتہ چل گیا کہ قتیل لکشمی بلڈنگ کی طرف سے آ رہا ہے۔ تم سامنے آئے ہو تو مجھے بالکل یقین ہو گیا۔ پھر کہنے لگے کہ میرے کان میں ہر وقت ایک آواز آتی ہے اور تم میرے کان کے ساتھ کان لگا کر سنو تمہیں ایک آواز آئے گی۔ پھر انہوں نے اپنے کان کے ساتھ میرا کان لگایا اور پوچھا کہ کوئی آواز آ رہی ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے تو آواز نہیں آ رہی۔ کہنے لگے کہ پھر اس وقت رک گئی ہو گی۔ اچھا ابھی بیٹھو۔ تھوڑی دیر بعد پھر آواز آئے گی۔ اس طرح کے واقعات متعدد بار ہوئے۔

منٹو صاحب ایک انار کھتے تھے۔ ان کی عجیب شان تھی اور چاہتے تھے کہ وہ اپنی شان کے ساتھ سب سے الگ تھلگ نظر آئیں۔ چنانچہ اگر کسی محفل میں بیٹھے ہیں تو وہ تھوڑی دیر انتظار کریں گے کہ آپ ان سے باتیں کریں۔ لیکن اگر آپ بات نہ کریں تو انہیں ناگوار گزرتا تھا اور پھر وہ ایسی حرکتیں کرتے تھے کہ آپ کی توجہ مبذول ہو۔ مثلاً کرسی سے اٹھ کر فرش پر اس انداز سے آ بیٹھتے تھے۔ کہ دوسرے شخص کو کہنا پڑے کہ منٹو صاحب! آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ کرسی پر کیوں نہیں بیٹھتے۔ غرض وہ اپنی طرف توجہ مبذول کروانے کے لیے یوں بھی کر لیا کرتے تھے۔

اسی طرح ان کے منہ سے کبھی غلط بات نکل جاتی تو ایسا بھی کرتے تھے کہ اس غلط بات پر اڑ جاتے تھے۔ اور اسے سچ قرار دے کر چھوڑتے تھے۔ ایک بار کچھ امریکن لابی

کے لوگ ان کے پاس آئے۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ انہوں نے ان سے کہا کہ ہمیں آپ کے دو افسانوں کے ترجمے کے حقوق چاہئیں۔ آپ ہمیں اجازت دیدیں۔ منٹو صاحب نے سوچا کہ میں اصل افسانے کے تیس روپے لیتا ہوں تو ترجمے کے تو اس سے بھی کم ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ امریکہ کا معاملہ ہے اور یہ زیادہ پیسے دیدیں گے اس لیے انہوں نے سوچا کہ ترجمے کے پچاس روپے مانگ لیں تو ٹھیک رہیں گے۔ چنانچہ منٹو صاحب نے ان سے کہا کہ آپ ترجمے کر لیجئے۔ انہوں نے پوچھا کہ ہدیہ کیا پیش کیا جائے تو کہنے لگے کہ پچاس روپے فی افسانہ ہوگا۔ وہ لوگ زیر لب مسکرائے اور کہنے لگے کہ ہم تو آپ کے لیے پانچ سو روپے فی افسانہ کے حساب سے ہزار روپے طے کر کے آئے تھے۔ اب منٹو صاحب کو کوفت ہوگئی کہ میں ان سے مانگ کیا رہا ہوں اور یہ دے کیا رہے ہیں۔ کہنے لگے کہ نہیں میں تو پچاس روپے فی افسانہ ہی لوں گا۔ میں نے جو کہہ دیا ہے سو کہہ دیا ہے۔ نہ ان سے کم لوں گا نہ ان سے زیادہ پیسے لوں گا۔ چنانچہ انہوں نے ایک ہزار روپے کا چیک کاٹا اور میرے سپرد کر دیا اور مجھے کہا کہ آپ بعد میں انہیں دیدیں۔

منٹو صاحب کا وہ زمانہ جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ اصل منٹو سے ہٹ کر منٹو کا سایہ رہ گئے تھے۔ خوش پوش اور خوش رو تو وہ آخر تک رہے لیکن کھوکھلے ہو چکے تھے۔ انہیں ہسپتال میں بھی داخل کروایا گیا تا کہ ان کے اندر سے الکحل کے مادے نکال دیئے جائیں لیکن پتہ چلا کہ وہ ہسپتال میں بھی گھر والوں سے چھپ کر وسکی پیتے رہے اور یہ وسکی وہاں پر شاد امرتسری مہیا کرتے تھے۔ یہ دونوں آپس میں بہت ہی بے تکلف دوست تھے اور شاد کا کہنا تھا کہ اگر ہم منٹو کو وسکی نہیں دیں گے تو یہ موت سے پہلے ہی مر جائے گا۔ خدا جانے وہ ٹھیک کہتے تھے یا غلط لیکن ہم نے شاد سے کہا کہ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے۔

شاد امرتسری مجھ سے بھی بہت بے تکلف تھے۔ انہوں نے مجھے ایک بات بتائی۔ انہوں نے کہا کہ دراصل منٹو صاحب رفتہ رفتہ خودکشی کر رہے ہیں اور اگر ان سے یہ انداز چھین لیا گیا تو مجھے ڈر ہے کہ وہ کہیں واقعی خودکشی نہ کر لیں۔ تو میں نے کہا کہ بات کیا ہے۔ کہنے لگے کہ منٹو جو کہ ہمیشہ رجائی باتیں کرتا تھا اور بہت کم اداس ہوتا تھا ایک دن آبدیدہ ہو

کراس نے مجھ سے کہا کہ شاد میں مر جانا چاہتا ہوں اور جتنی جلدی مر جاؤں بہتر ہے کیونکہ میں جینے کے قابل نہیں رہا۔ شاد کہنے لگے کہ میں نے پوچھا کہ آپ اتنے مایوس کیوں ہیں۔ میں نے سمجھا کہ شاید یہ اپنی شراب نوشی کے بارے میں بات کریں گے اور کہیں گے کہ میں برے کاموں میں پڑ گیا ہوں اور لوگوں کی نظروں میں گرنے لگا ہوں۔ لیکن شاد نے کہا کہ انہوں نے یہ بات نہیں بتائی بلکہ کہنے لگے کہ کثرت شراب نوشی سے میں مردانہ اوصاف سے تقریباً محروم ہو چکا ہوں۔ اور دیکھو میری عمر کیا ہے۔ پینتالیس سے بھی عمر کم ہے۔ اب جب کبھی کسی رات کو مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں شاید وظیفہ زوجیت ادا کرنے کے قابل ہوں تو اٹھ کر اپنی بیوی کے پلنگ کے پاس جاتا ہوں اور جب وہاں پہنچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ میں ناکام رہوں گا۔ اور کبھی بیوی جاگ بھی پڑے تو وہ میری مزاج دان ہے، تھوڑی دیر بیٹھتا ہوں اور جب مجھ پر مایوسی کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو بیوی مجھے تسلی دیتی ہے اور کہتی ہے کہ آپ جا کر سو جایئے۔، تھکے ہوئے ہیں اس وقت آپ کا جاگنا مناسب نہیں۔ وہ بات کا رخ بدل کر مجھے واپس بھیج دیتی ہے لیکن اس کے بعد مجھ پر جو قیامت گزرتی ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ انہوں نے بتایا کہ منٹو صاحب نے کہا کہ انہیں اس چیز سے محروم ہوئے اب کئی مہینے ہو چکے ہیں۔ اس لیے وہ کہتے تھے کہ مجھے مر ہی جانا چاہئے۔

شاد نے کہا کہ اصل میں منٹو اب صبح سے شام تک جو زیادہ پینے لگا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مر جانا چاہتا ہے۔ اس میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ اپنے آپ کو گولی مارے لیکن اگر اس سے شراب چھین لی جائے تو شاید وہ ادھر ہی کا رخ کرے گا۔ یہ انکشاف میرے لیے بہت عجیب تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ چیز جس کے لیے شروع میں بعض مذہبی کتابوں میں آیا تھا کہ اس میں خوبیاں کم اور خرابیاں زیادہ ہیں تو منٹو کا معاملہ دیکھ کر اس کی تصدیق ہوئی کہ اس میں خرابیاں ہی خرابیاں ہیں۔ خوبیاں شاید اس شکل میں ہوں کہ اس زمانے کے لوگ پرہیز، علاج کے طور پر اسے استعمال کرتے ہوں۔

اس واقعہ کے کچھ ہی دن بعد میں نے منٹو صاحب کو ایک کالج کے فنکشن میں دیکھا۔

انہوں نے زندگی کا جو آخری افسانہ لکھا تھا اور وہاں پڑھا تھا اس کا عنوان ''کبوتری'' تھا۔ ان کا سٹائل وہی پرانا تھا اور موضوع بھی وہی تھا جو ان کا پسندیدہ تھا۔ لیکن جب وہ افسانہ پڑھ رہے تھے تو ان کی آواز سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ چند دن کے مہمان ہیں اور میرا خیال ہے کہ وہ اس افسانہ پڑھنے کے چند روز بعد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ دوست تو ان کی موت پر ایک حد تک ملول ہوئے ہوں گے لیکن وہ اپنے بہت ہی اچھے بیوی بچوں کو تنہا چھوڑ کر دنیا کے دکھوں سے نجات پا گئے۔

منٹو صاحب کے ذکر سے پہلے ایک اور شخصیت کا ذکر کرنا بھی ضروری تھا۔ وہ اس وقت کے نامور سیاسی لیڈر خان غلام محمد خان لنڈ خوار تھے۔ ان کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا اور بڑے جواں مرد آدمی تھے۔ انہوں نے بہت سی تحریکوں میں حصہ لیا اور نام بھی پایا لیکن اپنے راستے سے بھٹکے تو اس راستے پر چل نکلے جس پر ہمارے رؤسا، جاگیردار یا متمول لوگ چل نکلتے ہیں۔ انہوں نے لاہور میں اس بازار کی ایک خاتون سے شادی کر لی اور لاہور ہی میں اسے ایک الگ مکان لے کر دے دیا۔ اس کے بعد ان کا زیادہ تر وقت لاہور ہی میں گزرنے لگا۔ بہت اچھے اور پیارے آدمی تھے۔ ان کا بھی شراب کا معاملہ تھا لیکن ان کی محفلیں شام کو جمتی تھیں۔

ان کے بارے میں احمد ندیم قاسمی صاحب داستان سناتے ہیں کہ منٹو صاحب نے ایک افسانہ لکھا جس کا عنوان تھا ''نطفہ''۔ کسی شخص نے خان غلام محمد خان لنڈ خوار سے کہہ دیا کہ منٹو نے آپ کے خلاف افسانہ لکھا ہے۔ پھر کیا تھا۔ وہ خالص پٹھان تھے اور یہ کیسے برداشت کرتے کہ ان کے خلاف کوئی افسانہ لکھا جائے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ منٹو کہاں رہتا ہے۔ حالانکہ خان صاحب بھی اس زمانے میں بیڈن روڈ پر ہی رہتے تھے اور منٹو صاحب بھی بیڈن روڈ پر ہی رہتے تھے۔ خان صاحب کے تعلقات میاں افتخار الدین سے تھے اور اسی حوالے سے ''پاکستان ٹائمز'' اور ''امروز'' میں کام کرنے والوں سے ان کے تعلقات بھی تھے۔ انہوں نے سوچا کہ چل کر قاسمی صاحب سے منٹو کا ایڈریس لیتا ہوں اور پھر ان سے دو دو ہاتھ کرتا ہوں۔ چنانچہ یہ قاسمی صاحب کے پاس پہنچے۔ کہنے لگے کہ تمہارا

دوست منٹو کہاں رہتا ہے۔ قاسمی صاحب نے کہا کہ وہ ادھر کہیں بیڈن روڈ پر رہتا ہے لیکن معاملہ کیا ہے۔ کہنے لگے کہ اس نے میرے خلاف افسانہ لکھا ہے۔ قاسمی صاحب نے افسانہ نہیں پڑھا تھا لیکن وہ خان صاحب کے تیور بھانپ گئے اور کہنے لگے کہ میں نے وہ افسانہ پڑھا تھا اور وہ آپ کے خلاف تو نہیں لکھا ہوا تھا۔ کہنے لگے کہ نہیں میرے خلاف ہی لکھا تھا اور سب لوگ یہی کہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ بیڈن روڈ پر چلے گئے اور منٹو صاحب کا اتہ پتہ پوچھا۔ منٹو صاحب مشہور آدمی تھے پتہ بھی چل گیا۔ ان کے گھر کی طرف جا رہے تھے تو دیکھا کہ آگے سے منٹو صاحب آ رہے ہیں۔ کہنے لگے کہ اوئے منٹو ٹھہرو۔ تم نے میرے خلاف افسانہ کیوں لکھا ہے۔ منٹو صاحب نے حیرت سے کہا کہ آپ کے خلاف افسانہ لکھا ہے۔ اور پھر کہنے لگے کہ آپ کے خلاف میں نے افسانہ نہیں لکھا بلکہ آپ کے بارے میں لکھا ہے اور آپ کے متعلق لکھا ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا لکھا ہے۔ کہنے لگے کہ بس یہی لکھا ہے کہ شراب پیتے ہیں اور عورت بازی کا شوق ہے۔ کہنے لگے کہ اچھا اچھا پھر تو کوئی بات نہیں اس کے علاوہ اور تو کچھ نہیں لکھا۔ منٹو صاحب نے کہا کہ بالکل نہیں۔ چنانچہ انہوں نے منٹو صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگے کہ ٹھیک ہے تم میرے ساتھ چلو۔ انہیں وہاں سے اپنے گھر لے گئے اور دونوں بیٹھ کر پینے لگے۔

رفیق غزنوی

رفیق غزنوی کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ ہم لوگ زندگی کے سفر میں چند قدم ساتھ چلے اور مجھے رفیق غزنوی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ رفیق غزنوی کا آبائی طور پر تعلق غزنی سے تھا۔ ان کا محمود غزنوی سے کوئی تعلق نہیں تھا صرف یہ کہ ان کے والد غزنی سے آئے تھے اور یہ لوگ آ کر پنڈی میں آباد ہوئے تھے۔ ان کی ماں بھی پٹھان تھی اور والد بھی۔ اس زمانے میں ان کی بڑی متمول فیملی تھی۔ اصل میں ان کا کباڑ کا کام تھا اور راجہ بازار راولپنڈی میں یہ ۱۹۶۰ء سے یہ کام کر رہے تھے۔ رفیق اکلوتی اولاد تھے اور بڑے ناز و نعم سے پلے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں میں عام طور پر بچے ان پڑھ رہتے تھے اور اگر سو میں سے کوئی ایک بچہ میٹرک کر لیتا تھا تو وہ پڑھا لکھا کہلاتا تھا اور بڑے فخر سے اس کا ذکر کرتا تھا۔ باپ نے اس زمانے میں رفیق غزنوی کو گریجویشن کروائی۔ رفیق مردانہ حسن کا ایک نمونہ تھے۔ میں نے دو آدمیوں کے جسم پر لباس سجتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک تو قائداعظم محمد علی جناح کے جسم پر اور دوسرے رفیق غزنوی کے جسم پر۔ اس زمانے میں گانے کا شوق نہ تو مسلمان گھرانوں میں اچھا سمجھا جاتا تھا اور نہ ہندو گھرانوں میں۔ حالانکہ ہندوؤں میں گانا جزو مذہب بھی ہے۔ لیکن وہ بھجنوں کی حد تک اور مندروں کی حد تک ہے۔ باہر کوئی فلم میں کام کرنے کی کوشش کرتا تھا تو ہندوؤں میں بھی اسے برا سمجھا جاتا تھا اور گانے کے سلسلے میں بھی یہی رویہ تھا۔ اور ہمارے ہاں جو ایک لفظ حرام ہے تو مسلمانوں میں یہ ایک

طرح سے حرام ہی سمجھا جاتا تھا۔ اور اگر کسی کا بیٹا گانے لگے تو لوگ کہتے تھے کہ وہ میراثی یا کنجر ہو گیا ہے۔ لیکن رفیق شاید پیدائشی طور پر فنکار تھے۔

وہ ایک تو خوبصورت تھا اور دوسرے اس کا گلا بہت اچھا تھا۔ چنانچہ جب گاتا تھا تو ایک سماں باندھ دیتا تھا۔ چونکہ گھر سے بھی ٹھیک ٹھاک تھا اور کوئی مالی پریشانیاں نہیں تھیں۔ اس لیے اس زمانے کے استاد زماں عاشق علی خان کی شاگردی اختیار کی۔ اور باقاعدہ گانا سیکھا اور اس حد تک سیکھا کہ لوگوں کو خود اصلاحیں دینے لگے۔ ظاہر ہے کہ راولپنڈی میں رہ کر اس شوق کی تکمیل نہیں ہو سکتی تھی۔ فلم انڈسٹری اس وقت خاموش فلموں سے ٹاکی کی فلموں کی طرف سفر کر رہی تھی۔ اور پہلی متکلم فلم انڈین سکرین پر ''عالم آراء'' کے نام سے آ چکی تھی۔ چنانچہ اس زمانے میں ان لوگوں کی مانگ بڑھی جو گا بھی سکتے تھے۔ رفیق غزنوی تو چونکہ خوبصورت تھے۔ اس زمانے میں اشرف خان، بھائی دیسا، اور ماسٹر نثار وغیرہ ہیرو ہوا کرتے تھے۔ ماسٹر نثار کو تو وہ شہرت ملی جو آج کے زمانے میں دلیپ کمار کو بھی حاصل نہیں ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ گاتے بھی تھے کیونکہ وہ پلے بیک کا زمانہ نہیں تھا۔ اور فلموں میں گانوں کی بھرمار ہوتی تھی۔ ہر فلم میں بیس پچیس گانے ہوتے تھے۔ فلم ''اندر سبھا'' تو پوری کی پوری منظوم تھی۔ اس کے ڈائیلاگ بھی گا کر ادا کیے جاتے تھے۔ لیکن عام فلموں میں بھی دس بیس گانے زیادہ نہیں سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ وہ لوگ ہیرو لیے جاتے تھے جو گا بھی سکتے تھے اور کچھ شکل وصورت بھی ہوتی تھی۔ لیکن رفیق غزنوی کا معاملہ دوسرا تھا۔ وہ انتہائی خوبصورت تھے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں حسن اور خوبصورتی سے پوری طرح نوازا ہوا تھا اور ''ہیر وارث شاہ'' میں جو رانجھے کا سراپا ہے یہ بالکل اسی کی تصویر تھے۔

یہ لاہور پہنچے تو کاردار نے جو پہلی فلم ''ہیر رانجھا'' بنائی اس میں انہوں نے رانجھے کا کردار ادا کیا۔ ساتھ ہی ہز ماسٹر وائس کمپنی میں ان کے ریکارڈ بنے۔ پھر چونکہ پڑھے لکھے تھے اور شعر و ادب سے بھی دلچسپی تھی اس لیے اس زمانے میں جبکہ علامہ اقبال شہرت کی معراج پر پہنچے ہوئے تھے اور ان کی نظم ''شکوہ'' پڑھے لکھے مسلمانوں میں ازبر تھی۔ رفیق غزنوی نے یہ نظم اپنی آواز میں ریکارڈ کروائی تھی۔ چنانچہ انہوں نے لاہور سے اپنے فلمی

سفر کا آغاز کیا اور اس کے بعد وہ ممبئی چلے گئے۔

شروع میں انہیں لاہور میں ایک فلم ''پرواز'' ملی اور لاہور میں مال روڈ کے ایک ہوٹل میں ان کا قیام ہوا اور وہاں ان سے محفلیں جمیں۔ دوستی کا پس منظر یہ بھی تھا کہ یہ بھی راولپنڈی کے مکین رہے تھے اور میرے ایک کزن ان کے بچپن کے دوست تھے۔ محلہ بھی تقریباً ایک ہی تھا جہاں ہم رہتے تھے۔ پھر انہیں شعر و ادب سے بھی شوق تھا اور میری شاعری کو پسند کرتے تھے اس لیے ان سے ملاقاتیں بڑھیں۔ ان کی بڑائیوں کا تو ذکر ہی نہیں۔ ان کے قریب بیٹھ کر فخر محسوس ہوتا تھا۔ اس لیے ان سے مراسم ہو گئے۔ اس کے بعد جب یہ کراچی منتقل ہو گئے تو جب کبھی میرا وہاں آنا جانا ہوتا تو ان سے ملاقات ہوتی تھی اور کراچی میں قیام کے دوران ایک شام میری ان کے گھر میں بھی ہوتی تھی۔ ان کی باقی کی شامیں تو ہم لے لیتے تھے لیکن چونکہ خود بھی بہت اچھا کھانا پکاتے تھے اور کھانے کا بھی اعلیٰ ذوق تھا اس لیے وہاں جا کر خوشی ہوتی تھی۔

ان کے بارے میں مشہور تھا کہ جب یہ گانا سننے کسی کوٹھے پر جاتے تھے تو گانے والیوں کو پہلے سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ خود کس پائے کے گانے والے ہیں۔ اس لیے وہ الٹا ان سے گانے کی فرمائش کرتی تھیں۔ اور جہاں ان کی طبیعت جم جاتی تھی اس کوٹھے کے دروازے اور لوگوں کے لیے بند ہو جاتے تھے۔ اور رفیق غزنوی وہاں سے اتنے دنوں بعد نکلتے تھے جب نائیکہ کو یہ پتہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ اس کی بیٹی رفیق غزنوی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ پھر یہیں تک نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک آدھ گھر ایسا بھی تھا کہ بڑی بہن کے بعد چھوٹی بہن کو رشک ہوا کہ رفیق غزنوی کی زوجیت میں آ جائے تو وہ داخل ہوئی اور پہلی بہن ان کی زوجیت سے نکل گئی۔ اس لیے مذاق سے دوست کہا کرتے تھے کہ رفیق غزنوی سے کوٹھوں کو بچاؤ یہ تو پوری پوری فیملی کو ساتھ لے جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کئی عورتیں ان کی زندگی میں آئیں اور ان سے اولادیں بھی ہوئیں لیکن زیادہ تر لڑکیاں ہی ہوئیں اور جیسے خود خوبصورت تھے اسی طرح وہ بھی بہت خوبصورت تھیں۔ لیکن وہ ان عورتوں سے ہونی والی بچیوں کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیتے تھے۔ چونکہ ان عورتوں کا تعلق زیادہ تر کوٹھوں سے ہوتا

تھا۔ اور وہاں پر اولاد ماں ہی کی تصور ہوتی ہے اور ماں ہی اولاد کو اپنے پاس رکھتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان چیزوں کے کچھ اثرات ہوتے ہیں وہ ان باتوں کا برا نہیں مانتے تھے۔

کراچی میں ان کی آخری بیوی کا نام شاید انورادھا تھا۔ کچھ عرصہ تو وہ بیوی کے بغیر رہے اس کے بعد ایک کرنل کی بیٹی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر پچاس برس سے زائد تھی اور وہ لڑکی سترہ اٹھارہ سال کی تھی۔ معلوم ہوا کہ ان کی نئی شادی اس سے ہوگئی ہے۔ ہم گئے تو دیکھا کہ وہ نہایت خوش گفتار، باذوق، زندہ دل اور خوش پوش تھی۔ وہ رفیق صاحب کا ساتھ دینے والی لڑکی تھی اور اتنی خوش تھی کہ عمروں کا فرق بھی نہیں لگتا تھا۔ وہ مطمئن بھی نظر آتی تھی۔ کھانا وہ بھی پکاتی ہوگی لیکن جس دن میں وہاں گیا تو اس دن رفیق صاحب نے کھانا اپنے ہاتھ سے پکایا۔ ان کے ہاتھ کی میں نے ایک بار جو نہاری کھائی وہ بہت لذیذ تھی۔ عام طور پر نہاری میں لوگ مرچ مصالحہ زیادہ ڈالتے ہیں لیکن ان کے ہاں مرچ مصالحہ کم ہوتا تھا اس لیے یہ نہاری زیادہ لذت والی تھی اور چیزیں بھی میں نے ان کے ہاں کھائی لیکن بکرے کے پائے کا پلاؤ میں نے پہلی اور آخری بار ان کے ہاں ہی کھایا۔ سب جانتے ہیں کہ پائے پکنے کے بعد اس کا شوربہ انتہائی چپکنے والا ہو جاتا ہے اور اگر شوربہ زیادہ گاڑھا ہو تو انگلیاں آپس میں چپک جاتی ہیں لیکن اس پلاؤ کی خاصیت یہ تھی کہ دانہ دانہ الگ الگ تھا اور کچھ جڑا ہوا نہیں تھا۔ یہ رفیق غزنوی کی ایسی صناعی تھی کہ جیسے وہ بعض راگوں میں ایسے سر استعمال کرتے تھے کہ دو راگ ایک ساتھ ہونے کی باوجود الگ الگ نظر آتے تھے مگر سماں بھی ایک ہوتا تھا اسی طرح یہ پلاؤ تھا۔ اس کے بعد کچھ لوگوں سے سنا کہ وہ بھی ایسا پلاؤ پکا سکتے ہیں لیکن یہ زبانی دعوے ہی ثابت ہوئے۔ میں نے ان کے بعد ایسا پلاؤ کبھی نہیں کھایا۔

رفیق غزنوی کو ایک اور شوق ریس کا تھا۔ ریس میں جو بھی جاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ وہ اس فن پر عبور رکھتا ہے۔ اور اس زعم میں مارا جاتا ہے۔ رفیق نے اپنی زندگی کی بہت سی کمائی ریس میں ضائع کی۔ اور دعویٰ یہ تھا کہ وہ اسے بہت سمجھتے ہیں۔ ریس کھیلنے والے اپنی

ہار کو کبھی لوگوں پر ظاہر نہیں کرتے کیونکہ اس میں تضحیک بھی ہوتی ہے اور لوگوں کی باتیں بھی سننی پڑتی ہیں۔ اور کوئی جوئے والا بھی نصیحت سننا پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ انہوں نے بہت کچھ ریس میں ہارا۔ آخری وقت میں جب یہ ریڈیو سے ریٹائر ہوئے تو انہیں جو پراویڈنٹ فنڈ ملا وہ یہ پورے کا پورا ریس میں ہار گئے۔ اس سے بیوی کو بھی صدمہ ہوا۔ اور خود بھی ملول ہوئے۔ اور جو رقم ان کا آخری وقت کا سہارا بن سکتی تھی وہ نہ بن سکی۔ اور انہیں دوبارہ کنٹریکٹ پر کام کرنا پڑا۔ پہلے وہ اپنے آرٹ کے بارے میں اور اپنے آرٹسٹ ہونے کے بارے میں فخر سے جو بات کیا کرتے تھے وہ اب ذہن سے نکل گئی۔ میں نے ایک بار فون کیا تو کہنے لگے کہ شام کو آپ میری طرف ذرا لیٹ آیئے۔ پہلے تو یہ کہا کرتے تھے کہ میں ریکارڈنگ کے لیے جا رہا ہوں یا کسی کو ریہرسل کروانی ہے لیکن اس دن کہا کہ کام پر جا رہا ہوں اور ان کا لہجہ بہت بجھا ہوا تھا۔ اب رفیق غزنوی کے ان الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے بجھ چکے تھے۔

ان کی زندگی میں ایک صدمہ اور تھا اور وہ یہ کہ ان کی ایک چہیتی بیٹی تھی جو بہت خوبصورت تھی اور اس کی شادی ضیا سرحدی سے ہوئی تھی۔ جب یہ ممبئی میں تھے تو ضیا سرحدی بھی وہیں تھے۔ دونوں پٹھان تھے اور دونوں کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا۔ ضیا سرحدی Intellectuals میں شمار ہوتے تھے اور ان کا کافی نام بھی تھا۔ اس سطح پر رفیق غزنوی کی بیٹی کی شادی ضیا سرحدی سے ہوئی لیکن بعد میں خدا جانے کیا ہوا کہ دونوں کی علیحدگی ہوگئی۔

پارٹیشن کے بعد رفیق صاحب اور ان کی بیٹی یہاں آ گئے۔ بہت بعد میں یہاں ضیا صاحب بھی آ گئے اور انہوں نے ایک کرسچن خاتون سے شادی کر لی مگر بعد میں ان سے بھی علیحدگی ہوگئی۔ خیر ایک دن میں کراچی میں رفیق غزنوی صاحب کے گھر میں گیا تو دیکھا کہ ایک خاتون وہاں بیٹھی ہیں جن کی آنکھوں پر عینک تھی اور سر کے بال بالکل سفید تھے۔ رفیق صاحب مجھے اپنے ساتھ وہاں سے گزار کر اپنے کمرے میں لے گئے۔ میں نے پوچھا کہ یہ خاتون کون ہیں تو وہ بڑے دکھ سے کہنے لگے کہ اب تو یہ میری ماں ہیں۔ کبھی یہ

میری بیٹی ہوا کرتی تھی اور وہ جو یہاں کے بہت بڑے دانشور ہیں حضرت ضیا سرحدی یہ ان کی بیوی ہیں۔ ان کے یہ جملے طنز اور دکھ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ چنانچہ رفیق صاحب کی زندگی میں جو دکھ آئے انہوں نے انہیں توڑ کے رکھ دیا اور وہ اپنے جسم کو گھسیٹتے رہے۔ بظاہر مرتے دم تک تنومند تھے اور چہرے پر بشاشت تھی اور اپنی عمر سے پندرہ سال کم نظر آتے تھے لیکن اندر سے ٹوٹ چکے تھے اور بالآخر ایک دن ان کا ہارٹ فیل ہو گیا اور اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

فیض احمد فیض اور حفیظ صاحب

فیض احمد فیض بڑے سادہ انسان تھے لیکن پراسرار بھی اتنے تھے کہ زندگی بھر کوئی ان کی یہ ادا سمجھ نہیں سکا کہ بعض اداروں نے اور بعض اشخاص نے ان کی مخالفت کرتے ہوئے ساری ساری عمر گزار دی لیکن انہوں نے اس کے ردعمل میں ایک لفظ تک نہیں کہا۔ پیغمبروں کے بارے میں تو سنا تھا کہ وہ گالیاں سن کر دعائیں دیتے تھے لیکن شاعروں کے بارے میں ایسا نہیں سنا تھا۔ فیض احمد فیض پیغمبر نہیں تھے صرف شاعر تھے۔ یہ کسی کو دعا بھی نہیں دیتے تھے لیکن بددعا بھی نہیں دیتے تھے۔ اکثر چپ ہی رہتے تھے اور اگر کوئی اس بارے میں پوچھتا تھا تو زیادہ سے زیادہ ہنس دیتے تھے

اب ہم سب جانتے ہیں کہ ''نوائے وقت'' میں ایک مدت تک ان کے خلاف کہا جاتا رہا۔ دوست کہتے بھی تھے کہ یہ سراسر زیادتی ہو رہی ہے۔ آپ اس کی تردید کریں لیکن وہ صرف مسکرا دیا کرتے تھے اور زیادہ سے زیادہ یہ کہہ دیتے تھے کہ یہ ان کا نقطہ نظر ہے اس لیے انہیں کہنے دیں۔ انہیں حق پہنچتا ہے۔ جنگ والوں نے ایک دن مجھ سے کہا کہ فیض صاحب کا انٹرویو چاہئے اور وہ آپ کے گھر میں ہی ہونا چاہئے۔ کیونکہ ہم ان کے ساتھیوں کی فہرست ٹھیک سے نہیں بنا سکتے۔ آپ بنائیے اور باقی آپ جانیں اور آپ کا کام۔ اس کے علاوہ باقی جو لوگ بھی آئیں گے وہ بھی آپ ہی کے قبیلے سے ہوں گے۔ مجھے تو فیض صاحب کو بلانے کا بہانہ چاہئے تھا۔ وہ پہلے بھی میرے ہاں آتے رہتے تھے۔ لیکن اس شکل میں انہیں بلانے کی مجھے خوشی ہوئی۔ میں نے اس موقع پر ان کے لیفٹ کے دوستوں

کے علاوہ رائٹ کے کچھ لوگوں کو بھی بلالیا۔ تاکہ دونوں طرف کے سوالات آئیں اور فیض صاحب ان کا جواب دیں۔ چنانچہ یہ انٹرویو ہوا اور بڑے ٹھاٹھ کا ہوا۔ اس میں عبداللہ ملک، صفدر میر، حمید اختر، اور دوسرے لوگ موجود تھے۔ اس زمانے میں ایران عراق کی جنگ ہورہی تھی۔ شہنشاہ ایران کو وہاں سے نکالنا تو ان لوگوں کا کارنامہ تھا ہی مگر اب ایران چونکہ عراق کے خلاف بھی اپنے موقف پر جما ہوا تھا اور امریکہ کو بھی اپنے یرغمالی چھڑانے کے سلسلے میں ایران کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانی پڑ چکی تھی۔ اب فیض صاحب مذہبی آدمی قطعاً نہیں تھے انکا تعلق تو سیاست سے تھا یا ادب سے تھا۔ جنگ کے حسن رضوی بھی وہاں موجود تھے۔ وہ صحافی تھے اور اس کے علاوہ ان کا تعلق اہل تشیع سے ہے اور وہ اس زاویے سے بھی فیض صاحب سے بات کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ فیض صاحب! انقلاب ایران کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ لوگوں نے سوچا کہ چونکہ ایران میں مذہبی حکومت قائم ہوچکی ہے اس لیے فیض صاحب دوسری طرح بات کریں گے۔ لیکن فیض صاحب نے کہا کہ انقلاب فرانس کے بعد سب سے بڑا انقلاب یہی ہے۔ اور اگر اس کا رخ غلط طرف نہ موڑ دیا گیا تو یہ بہت بڑا انقلاب ثابت ہوگا۔ اس جواب نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔

یہ انٹرویو چھپا تو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، لوگ یہ شمارہ ایک دوسرے سے مانگ کر پڑھتے رہے۔ جنگ اور نوائے وقت میں مسابقت تو تھی۔ اس لیے ایک اور محفل میں عطاء الحق قاسمی صاحب نے مجھے کہا کہ آپ فیض صاحب سے کہئے کہ وہ نوائے وقت کے لیے انٹرویو دیں۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ نوائے وقت ہمیشہ ان کی مخالفت کرتا رہا ہے اس لیے فیض صاحب کو انٹرویو کے لیے آمادہ کرنے کے لیے بہت محنت اور منت کرنی پڑے گی۔ لیکن میرا خیال اس کے برعکس تھا کیونکہ فیض صاحب کے منہ سے نہ تو ہوتی ہی نہیں ہے۔ اس لیے میں نے عطاء صاحب سے کہا کہ فیض صاحب اس محفل میں وہ سامنے بیٹھے ہیں آپ جاکر خود ان سے بات کریں وہ مان جائیں گے۔ اگر وہ نہ مانے تو آپ مجھے بتائیں۔ میں دونوں کو دیکھتا رہا اور میں نے اندازہ کرلیا کہ فیض صاحب نے ہاں کردی ہے۔ یہ واپس

آئے اور کہنے لگے کہ فیض صاحب مان گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ فیض صاحب کو جانتے ہی نہیں ہیں۔ ان میں بہت بڑے لوگوں والی خصلت ہے۔

خیر وہاں انٹرویو ہوا اور فیض صاحب کو بہت گھیرے میں لیا گیا۔ لیکن فیض آخر فیض ہے۔ وہاں پر فیض صاحب کو پچھاڑنے کی بہت کوشش کی گئی لیکن انہوں نے بہت متوازن اور معتدل جواب دیئے اور وہ جوابات دیئے جو ان کے مسلک سے ہٹ کر نہیں تھے۔ ان کا مسلک کبھی بھی متشدد نہیں تھا۔ دیکھا جائے تو ایک شکل میں فلسطین مسلمانوں کی تحریک ہے مگر وہ اس کی بہت حمایت کرتے تھے۔ اب فیض صاحب پر الزام آتا ہے کہ وہ کیمونسٹ ہیں مگر اس سے قطع نظر انہوں نے ہمیشہ حق و انصاف کی بات کی۔ انہوں نے جتنی خدمت فلسطین کی کی، پاکستان کا کوئی بڑے سے بڑا مولوی بھی اتنی خدمت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

فیض صاحب باقاعدہ بیروت میں رہے۔ وہاں یہ ''لوٹس'' پرچے کے ایڈیٹر بنے اور یاسر عرفات کے دوست اور دست راست کے طور پر انہوں نے سالہا سال کام کیا۔ انہوں نے اپنے پرچہ کے ذریعے اسرائیل کی دھجیاں بکھیریں اور مختلف کانفرنسوں میں فلسطین کی نمائندگی کی۔ ایک ایسا آدمی ظاہر ہے کہ انصاف پسند ہی کہلا سکتا ہے۔ اور ''دل بدست آور کہ حجِ اکبر است'' والی بات دیکھیں تو وہ کبھی دل آزاری کسی کی نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے دل میں اترنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ بھی سب لوگ جانتے ہیں کہ وہ وفات سے پہلے اپنے گاؤں گئے اور ان کے والد نے وہاں پر جو مسجد بنائی تھی اسے دیکھا اور جب نماز کا وقت ہوا تو لوگوں نے کہا کہ فیض صاحب ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس کی امامت کریں چنانچہ انہوں نے جماعت کی امامت کر کے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا اور تبصرے ہونے لگے کہ یہ منافقت ہے۔ کچھ اور لوگ کہنے لگے کہ وہ صوفی ہیں۔ حالانکہ وہ طبقاتی معاملہ ہے۔ وہ ایک پسے ہوئے طبقے کے حامی اور ظالم طبقے کے مخالف تھے۔ انہیں کسی مذہب سے کوئی بیر نہیں تھا۔ وہ مسلمان تھے اور قدم قدم پر مسلمان تھے۔ بلکہ ایک بار تو اشفاق احمد صاحب سے میری ملاقات ہوئی اور انہوں نے کہا کہ جتنا فیض مجھے مسلمان نظر آتا ہے اتنا کوئی اور مجھے یہاں مسلمان نظر نہیں آتا۔ کہنے لگے کہ میں نے اندر جھانک کر

اور قریب سے اسے دیکھا ہے وہ کمیونسٹ تو ہوگا لیکن مجھے تو وہ مسلمان ہی نظر آیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ انہیں ان معنوں میں مسلمان نہ لیں جن معنوں میں مولوی سمجھتے ہیں کہ جب کوئی شخص تعصب میں ڈوب کر بات کرے تو ہی وہ سچا مسلمان ہے وہ کہنے لگے کہ میرا بھی یہ مطلب نہیں ہے۔ میرے نزدیک تو مسلمان ایک سونا اور پارس ہوتا ہے اور وہ سب کا احترام کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ بالکل ٹھیک ہے۔

فیض صاحب میں یہ سب خصوصیات تھیں۔ ساری زندگی نوائے وقت کی تنقید کا نشانہ بننے کے بعد بھی انہوں نے اسے کھلے دل سے انٹرویو دیا اور جو لوگ اکثر انہیں گالیاں دیتے تھے ان کے بارے میں انہوں نے کبھی کچھ نہیں کہا۔ حفیظ صاحب جوانی کے زمانے میں بڑے شگفتہ تھے لیکن کچھ عرصے سے سٹھیا گئے تھے اور جن لوگوں کو انہوں نے اپنا مخالف تصور کر لیا تھا ان میں جوش ملیح آبادی کو ہمیشہ شرابی کہہ کر بات کرتے تھے اور جوش صاحب، کے شعر کے بارے میں تو کچھ کہہ نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ ان سے بڑے شاعر تھے اور ظاہر ہے کہ اگر ان کے شعر کو برا کہتے تو لوگ نہ مانتے۔ اس لیے انہیں شرابی کہتے تھے۔ کیونکہ شرابی تو وہ تھے۔ اس طرح وہ فیض صاحب کی شاعری کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ فیض صاحب کی شاعری کا جادو سر پر چڑھ کر بول چکا تھا اور ان کی شاعری دنیا بھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس لیے انہیں بھی شاعری کے حوالے سے جب کچھ برا نہیں کہہ سکتے تھے تو انہیں سرخا کہتے تھے۔ اور ان کے بارے میں کئی اور باتیں بھی مشہور کر رکھی تھیں۔

فیض صاحب سے کسی نے آ کر کہا کہ یہ حفیظ صاحب ہمیشہ آپ کے بارے میں برائی ہی کرتے ہیں اور برا بھلا کہتے ہیں۔ آپ اس کا نوٹس لیں۔ فیض صاحب نے جواب دیا کہ اگر ہمیں برا کہنے سے حفیظ صاحب کا کوئی کام نکلتا ہے یا ہماری برائی کرنے سے انہیں کوئی فائدہ ہوتا تو ہمیں اس کا کیا نقصان ہے۔ کہنے لگے کہ مجھے تو خوشی ہے کہ میری برائی کر کے ان کا گھر بھرتا ہے۔

حفیظ صاحب نے فیض صاحب کے سلسلے میں بعض عجیب عجیب چیزیں کیں۔ انہوں

نے ایک انٹرویو میں اُردو ڈائجسٹ میں ان کے خلاف بہت کچھ کہا۔ ایک بار سوویت یونین میں ایک وفد گیا تھا جس میں فیض صاحب اور حفیظ صاحب دونوں ہی شامل تھے۔ چونکہ حفیظ صاحب عمر میں بڑے تھے اس لیے وفد کے قائد وہی مقرر ہوئے تھے۔ سنا ہے کہ فیض صاحب نے خود کہا تھا کہ قائد حفیظ صاحب ہوں گے۔ واپس آ کر حفیظ صاحب نے اپنے اس انٹرویو میں بہت سی ایسی باتیں کیں جو کہ ایک ثقہ آدمی کے لیے مناسب نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے انٹرویو میں یہ کہا تھا کہ جب میں سوویت یونین گیا تو رُوسی صدر خروشیف نے مجھے الگ بلایا اور وہ مجھے اپنے ساتھ جہاز میں بٹھا کر سائبیریا میں لے گئے اور انہوں نے مجھے تنہائی میں کہا کہ ہم تمہیں بہت سے فنڈ دیتے ہیں اور تم پاکستان میں جا کر ہمارے لیے کام کرو۔ فیض وہاں تمہارا نائب ہوگا۔ اور میں نے یہ تجویز پائے حقارت سے ٹھکرا دی۔ لوگ تو یہ انٹرویو پڑھ کر ہنسے کہ روس کے سربراہ نے خود یہ بات حفیظ صاحب سے کہی جبکہ وہاں تو لوگ اپنے سربراہ کی جھلک دیکھنے کے لیے ترستے ہیں۔ چنانچہ لوگوں نے کہا کہ وہاں پر تو ایک انڈر سیکرٹری کے لیے بھی کافی تھا کہ وہ وفد کی سطح پر آنے والے لوگوں سے بات چیت کرے۔ چنانچہ لوگ ان کے بیانات کے مزے تو لیتے رہے کیونکہ نظر آ رہا تھا کہ یہ سب بات غلط ہے لیکن بہت سے لطیفے مشہور ہوئے۔

کسی نے حفیظ صاحب سے پوچھا کہ آپ کی ملاقات خروشیف سے ہوئی تو کیا ماسکو میں کوئی ایسا کمرہ نہیں تھا جہاں بیٹھ کر وہ آپ سے بات کر سکتے۔ کہنے لگے کہ نہیں بات ہی ایسی تھی کہ وہ راز میں رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے وہ مجھے ماسکو سے اڑا کر سائبیریا کے ایک بنگلے میں لے گئے۔ اس شخص نے پوچھا کہ کیا اتنے ہی راز کی بات تھی تو کہنے لگے کہ انہوں نے تو اپنے سٹاف کو بھی الگ کر دیا اور مجھ سے تنہائی میں بات کی۔ تو کسی نے پوچھا کہ کیا آپ روسی زبان جانتے تھے کہنے لگے نہیں۔ اس نے پھر پوچھا تو کیا وہ اُردو زبان جانتے تھے کہنے لگے نہیں۔ اس نے پوچھا کہ پھر یہ ساری گفتگو جو ہوئی یہ کس زبان میں ہوئی۔ اب ان کے پاس اس ساری بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ایسے موقعوں پر ان کا رویہ اس دیہاتی مولوی جیسا بن جاتا تھا جس کے پاس علم تو ہوتا نہیں اور وہ جواب میں یا تو گالیاں دیتا ہے

یا کافر قرار دے دیتا ہے۔

حفیظ صاحب کا ذکر چل نکلا ہے تو کچھ باتیں ان کے بارے میں بھی ہو جائیں۔ میں حفیظ صاحب کا شروع ہی سے قدردان ہوں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اپنے گیتوں کا پہلے مجموعہ ''ہریالی'' میں نے حفیظ صاحب کے نام انتساب کیا تھا۔ اب کتاب اسی کے نام انتساب کی جاتی ہے جس کی انسان عزت کرتا ہو۔ مجھے عزت کرنی بھی چاہئے کیونکہ اُردو میں گیت کے بانی حفیظ جالندھری ہیں۔ ہندی گیت تو کئی لوگوں نے لکھے ان میں فلم کے حوالے سے سرفہرست آرزو لکھنوی کا نام آتا ہے۔ لیکن اُردو گیت کو لٹریچر میں متعارف کروانے والے حفیظ جالندھری تھے۔ اس کے علاوہ نظموں کے ہیئت کے جو تجربے حفیظ صاحب نے اپنی وفات سے کچھ نصف صدی پہلے کئے تھے وہ اب تک بہت سے لوگوں کو میسر نہیں آ پائے۔ انہوں نے ایسے ایسے تجربے کئے کہ دو دو بحروں کو ملا کر انہوں نے ایک ایک نظم کہی اور وہ موسیقت پیدا کی جس کا کوئی جواب نہیں۔ تیسری چیز یہ ہے کہ سہل الممتنع غزل اور وہ بھی ایک خاص ڈھب کی حفیظ صاحب ہی کی ایجاد تھی اور وہ یہ تھی کہ پہلا مصرع کہتا کہ قاری کا ذہن کسی اور سمت لگا دینا۔ لیکن دوسرا مصرع کہہ کر قاری کو چونکا دینا اور وہ کہے کہ میرا خیال کدھر جا رہا تھا اور انہوں نے مجھے کدھر پہنچا دیا۔ مثال کے طور پر ان کا ایک مصرع لیجئے:

؎ احباب کا شکوہ کیا کیجئے خود ظاہر و باطن ایک نہیں

یہ مصرع پڑھ کر ذہن میں خیال آتا ہے کہ اپنی منافقت کا آگے ذکر آئے گا لیکن انہوں نے یہ مصرع کہا:

؎ لب اوپر اوپر ہنستے ہیں دل اندر اندر روتا ہے

انہوں نے ظاہر و باطن کا فرق بھی بتا دیا لیکن ایک نئی بات بھی کہہ دی چنانچہ ایسی غزلیں اور سادہ الفاظ کی شاعری جس کا میں خود دلدادہ ہوں اس میں حفیظ صاحب کا جواب نہیں۔ بہت سادہ الفاظ میں بہت گہری باتیں کہہ جانے میں ان کا جواب نہیں۔ شراب بندی ہوئی تو اس پر حفیظ صاحب نے کہا

؎ کیسے بند ہوا مے خانہ اب معلوم ہوا
پی نہ سکا کم ظرف زمانہ اب معلوم ہوا

اس شعر میں انہوں نے کتنی آسانی سے ان شرابیوں کے بارے میں بات کہہ دی جن کے بارے میں باتیں مشہور ہوتی ہیں۔

ان کا چوتھا کارنامہ ''شاہنامہ اسلام'' ہے۔ ہر چند کہ اس بارے میں ایک لطیفہ بھی مشہور ہے۔ حفیظ صاحب بیمار ہو گئے اور حکیم فقیر محمد چشتی لاہور کے ان بزرگوں میں سے تھے جو طب میں مشہور ہونے کے علاوہ صاحب علم و ادب لوگوں کے ساتھ محفلیں بھی رکھتے تھے۔ آغا حشر ہوں یا حکیم احمد شجاع۔ ان کا سب کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ حفیظ صاحب ان کے پاس گئے اور کہا کہ مجھے تکلیف ہے۔ آپ میرا علاج کیجئے۔ انہوں نے حفیظ صاحب کو دوائیں دیں اور کہا کہ آپ دو مہینے تک دماغی کام نہ کریں۔ حفیظ صاحب نے کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے میں تو آجکل ''شاہنامہ اسلام'' لکھ رہا ہوں۔ حکیم صاحب کہنے لگے کہ آپ وہ بے شک لکھتے رہئے میں نے آپ سے صرف دماغی کام نہ کرنے کا کہا ہے۔

دیکھا جائے تو ''شاہنامہ اسلام'' بھی ان کا ایسا کارنامہ ہے جو رہتی دنیا تک یاد رہے گا۔ اور ناقابل فراموش ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ان کی دینی خدمت بھی شامل ہے۔ اس سے انہیں دین و دنیا دونوں میں سرخروئی حاصل ہوئی۔ اس لیے کہ ''شاہنامہ اسلام'' طبع ہونے کے بعد فروخت بھی اتنا ہوا کہ حفیظ صاحب پارٹیشن سے پہلے ہندوؤں کی ماڈل بستی ماڈل ٹاؤن میں دو کوٹھیوں کے مالک ہو گئے۔ چنانچہ اس تصنیف نے انہیں دین کے ساتھ دنیا کی سرخروئی بھی دی۔

اس کے بعد ان کا پانچواں بڑا کارنامہ ترانہ پاکستان ہے۔ جب پاکستان کا یہ قومی ترانہ منظور ہوا تو لوگوں نے اس کے بہت مذاق اڑائے اور مجھے اس بات پر غصہ آتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگ یہ بھول جاتے تھے کہ اس وقت کی حکومت پاکستان نے پہلے اس ترانے کی ٹیون منظور کر لی تھی۔ اور کہا تھا کہ اس پر ترانہ لکھا جائے۔ یہ اس طرح ہے جیسے فلم میں کوئی میوزک ڈائریکٹر پہلے ٹیون بنا کر شاعر کے ذمے لگا دیتا ہے کہ اس میں اب الفاظ

بھرو گویا پہلے قمیص بنا کر اس جسم کے آدمی کو تلاش کیا جائے جسے یہ قمیص پوری آ سکے۔

یہ ٹیون مشرقی پاکستان کے ایک شوقیہ موسیقار چھاگلہ نے بنائی تھی۔ اس زمانے میں ٹیون کے لیے دس ہزار روپے مقرر تھے اور شاعری کے لیے بھی دس ہزار روپے کا انعام مقرر تھا۔ وہ ٹیون بنا کر اور انعام لے کر الگ ہو گئے۔ اس ٹیون کے بہت سے ریکارڈ بنے اور تمام نمایاں شاعروں کو دیئے گئے کہ اس ٹیون کو سن کر اس پر ترانہ لکھیے۔ میرا تعلق چونکہ فلم سے ہے اور اس زمانے میں میں فلم میں عروج پر تھا۔ میں نے بھی وہ ریکارڈ سنا اور کئی بار تو مجھے سمجھ ہی نہیں آتی تھی کہ یہ ٹیون کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں جاتی ہے۔ اس زمانے میں میں انور کمال پاشا صاحب کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ ان کے والد حکیم احمد شجاع بھی اس پر کچھ لکھنا چاہ رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے میوزک ڈائریکٹر چشتی کو باقاعدہ معاوضے پر اپنے پاس رکھا ہوا تھا کہ وہ اس ٹیون کو سناتے جائیں اور وہ ساتھ شاعری کریں۔ وہاں مجھے پتہ چلا کہ یہ ٹیون یہاں سے شروع ہوتی ہے اور یہاں تک جاتی ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس میں ایک بحر نہیں ہے اور بیچ میں جا کر ٹوٹتی بھی ہے۔ مجھے اس پر بہت غصہ آیا اور میں نے غصے میں لکھ کر بھیج دیا کہ میں اس پر احتجاجاً کام کرنے کو تیار نہیں ہوں کیونکہ یہ ٹیون قاعدے میں نہیں ہے۔ کیونکہ مجھے بھی ریکارڈ آیا ہوا تھا۔ لیکن باقیوں نے یہ ردعمل ظاہر نہیں کیا اور قسمت آزمائی کی۔ چنانچہ سینکڑوں کی تعداد میں ترانے لکھے گئے اور وزارت اطلاعات کو بھیجے گئے۔ اس ٹیون کو غور سے سنا جائے تو ہر ایک ذہن میں پہلا مصرع ''پاکستان زندہ باد'' آتا ہے اور حکیم صاحب سمیت اکثر شعراء نے اس سے ترانے کا آغاز کیا تھا۔ حفیظ صاحب کا یہ کام تھا کہ انہوں نے اس ٹیون کی ایک ایک بیٹ محسوس کی اور پاک سرزمین شاد باد، کشور حسین شاد باد سے ترانے کا آغاز کیا اور جہاں ٹیون میں بیٹ ٹوٹ گئی۔ وہاں انہوں نے بڑی خوبصورتی سے اسے سنبھالا اور اسے ایک ترانے کی شکل دی اور اگرچہ سینکڑوں شعراء اس ترانے پر کام کرتے رہے لیکن جہاں تک حفیظ صاحب پہنچے وہاں تک اور کوئی نہ پہنچ پایا۔ فلم کا رائٹر ہونے کے ناتے بھی میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت مشکل کام تھا۔ اور حفیظ صاحب یہ جو کارنامہ کر گئے شاید وہ ہندوستان اور پاکستان کے فلمی

شاعر نہ کر پاتے۔

میں نے اس زمانے میں حفیظ جالندھری صاحب کا دفاع کیا تھا۔ ان پر اعتراض کیا گیا کہ انہوں نے لفظ سلطنت کیوں استعمال کیا ہے جبکہ جمہوریت میں سلطنت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ انہوں نے یہ لفظ سلطان کی ریاست کے معنوں میں استعمال نہیں کیا بلکہ اسے اصطلاحاً ملک کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اتنی باریکیوں میں نہ پڑیں اور حفیظ صاحب نے جو کارنامہ انجام دیا ہے اسے تسلیم کریں۔ ہر چند کہ ادب کے محاذ پر یو پی اور پنجاب والوں میں جو محاذ آرائیاں ہوئیں اس کی یادیں خوشگوار نہیں ہیں مگر حفیظ صاحب نے اس میں بھی خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس میں زیادتیاں بھی ہوئیں اور لطیفے بھی بنے لیکن یہ سب کچھ اس لیے نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ یہ سب اُردو ادب کے لیے ہوا تھا۔ اس زمانے میں پنجابیوں نے یو پی والوں کے سلسلے میں اور یو پی والوں نے پنجابیوں کے سلسلے میں بڑے بڑے دلچسپ لطیفے مشہور کیے۔

ایک بار پطرس بخاری صاحب حفیظ صاحب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ جب بھی یو۔ این۔ او سے آتے تھے تو اپنے سینئر اور جونیئر دوستوں کو بلا کر محفلیں برپا کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک محفل میں یہ دونوں ایک ساتھ تھے ان کی ایک تحریک زندہ دلان پنجاب تھی جس میں حفیظ صاحب، امتیاز علی تاج اور دوسرے ادیب شامل تھے۔ دوسری طرف اُردو سپیکنگ ادیب تھے۔ بخاری صاحب حفیظ صاحب سے کہنے لگے کہ حفیظ صاحب اس زمانے میں پنجابیت کا جو چکر تھا اس میں کیا ہوا تھا۔ حفیظ صاحب نے سنایا کہ جب ہم پنجابی شاعر کسی اُردو والے کو اپنا کلام سناتے تھے تو وہ داد بہت دیتے تھے اور بار بار کہتے تھے سبحان اللہ لیکن کہتے تھے کہ اس میں تھوڑی سی پنجابیت ہے۔ اب ہم اس کا کیا جواب دیتے۔ کہنے لگے کہ ہم بہت زچ ہوئے اور ہم نے سوچا کہ اس کا توڑ ڈھونڈا جائے۔ ہم بھی انہیں کچھ کہیں۔ حفیظ صاحب نے کہا کہ بخاری صاحب نے کہا تھا کہ یہ جواب دینا۔ اب جب کوئی اُردو والا ہمیں کوئی چیز سناتا تو ہم بھی خوب داد دیتے اور کہتے کہ سبحان اللہ بہت اچھا کلام ہے لیکن اس میں تھوڑا سا یو پیا پا ہے۔ اس طرح ہم نے پنجابیت کے طعنے کو

نکالا۔

اس قسم کی باتیں بھی ہوتی تھیں اور حفیظ صاحب ان معاملوں میں بھی بہت آگے رہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے کہا کہ:

؎ حفیظ اہل زباں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

انہوں نے یہ سارے معرکے سر کیے لیکن افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ عمر کے ایک خاص حصے سے آگے آ کر حفیظ صاحب اپنا توازن کھو چکے تھے۔ وہ نہ کسی کو اپنا دوست سمجھتے تھے اور نہ وہ خود کسی کے دوست تھے۔ اس کی وجہ بھی ہے اور وہ یہ کہ ان کے ہاں اولاد نرینہ نہیں تھی اور وہ اس کے لیے ترستے تھے۔ ان کی پہلی شادی سے بھی بیٹیاں ہوئیں اور اس کے بعد دوسری شادی سے بھی جو انہوں نے ایک انگریز عورت سے کی تھی صرف بیٹی ہی ہوئی۔ اس عرصے میں انگریز بیوی نے اس آخری عمر میں علیحدگی کر لی کیونکہ ان کی جس عمر کا آغاز ہو چکا تھا اس میں ان کے ساتھ گزارہ کرنا بہت ہی مشکل بات تھی۔ وہ بہت اچھی عورت تھی لیکن چونکہ باہر کی تھی اس لیے گزارہ نہ کر سکی اور واپس چلی گئی۔ اس دوران ان کی پہلی بیوی بھی انتقال کر گئی۔ دونوں بیویاں ان کے لیے لڑکیاں چھوڑ گئیں۔

حفیظ صاحب نے اس کے بعد تیسری شادی اس وقت کی جب یہ نہیں کرنی چاہئے تھی۔ انہیں بیٹیوں پر ہی صابر و شاکر ہو جانا چاہئے تھا لیکن انہوں نے تیسری شادی کی اس سے بھی بیٹیاں ہی پیدا ہوئیں۔ اس سے وہ بہت آزردہ تھے اور اندر اندر اس بات کو محسوس کرتے تھے۔ بعض اوقات یہ رنج ان کی زبان پر بھی آ جاتا تھا۔ ایک دن کسی دوست نے انہیں مذاق سے کہا کہ آیئے ابولاثر صاحب! یہ سن کر حفیظ صاحب اپنے آپ کو کرسی میں گرا کر کہنے لگے کہ مجھے ابولاثر کیوں کہتے ہو۔ مجھے ابوالبنات کہو بیٹیوں کا باپ۔ ان کے اندر کا پورا کرب اس ایک جملے میں نظر آ رہا تھا۔ غرض اس چیز نے انہیں چڑچڑا بنا دیا تھا۔ وہ بات بات پر جھگڑا کرتے تھے اور گالی گلوچ پر آ جاتے تھے۔ اور کچھ ضرورتوں کے تحت انہوں نے ہمیشہ یہ وتیرہ بھی اختیار کیے رکھا کہ حکومت وقت کا ساتھ دے کر نوکریاں وغیرہ بھی حاصل

کیں۔ چنانچہ انگریز کے زمانے میں اسی سلسلے میں انہیں خان بہادر کا اعزاز ملا۔ اور وہ سانگ پبلسٹی آرگنائزیشن کے ڈائریکٹر بھی رہے جس میں انہوں نے ایسے گیت بھی لکھے:

؎ میں تو چھورے کو بھرتی کرائی آئی رے

اس طرح انہوں نے یہ بھرتی کے موضوع پر ایک لوک گیت کے طرز پر گیت لکھا۔ اس آرگنائزیشن کی برانچیں پورے ہندوستان میں تھیں اور ان کے ماتحت اچھے اچھے لوگ تھے جن میں شوکت تھانوی، ہری چند اختر اور دوسرے لوگ شامل تھے۔ یہ شاعروں سے گیت لکھواتے تھے اور کچھ گانے والوں کو تیار کر کے دیہات میں بھیجتے تھے یوں انہوں نے انگریز کی خدمت کی۔ انہیں اس پر خطاب بھی ملا۔ تنخواہ بھی بڑھی اور پیسہ بھی حاصل ہوا۔ غرض اس طرح پیسے کمانے کی انہیں کچھ عادت سی ہوگئی تھی۔ اور پیسہ کمانے کے سلسلے میں جو شاعری کی جاتی ہے اس میں فنی طور پر گراوٹ ضروری آتی ہے۔

ان کے مقابلے میں جوش صاحب اور فیض صاحب جنہیں یہ اپنا مدمقابل بھی سمجھتے تھے۔ انہوں نے انگریز کی مخالفت کی۔ جوش صاحب نے تو انگریز کے خلاف زبردست نظمیں کہیں۔ فیض صاحب بھی بائیں بازو کے آدمی تھے۔ حفیظ صاحب کی مجبوری پیسہ تھی اور یہ سرکاری حیثیت سے کام کرتے تھے بلکہ پی آئی اے نے کہا کہ جہازوں پر شعر ہو جائے تو انہوں نے جہازوں پر نظم لکھ دی اور پیسے لے لیے۔ ان سے خواہ کچھ بھی لکھوالو اور پیسے دیدو۔ انہیں یہ بھی چڑ ہوتی تھی کہ میں جوش اور فیض کے مقابلے میں کچھ کم تر نظر آتا ہوں۔ اس لیے جھلا کر انہیں بھی برا بھلا کہتے تھے۔ جس سے انکے مرتبے میں فرق آیا۔

جوش صاحب فوت ہوگئے۔ مرنے کے بعد سب کے دعائے فاتحہ ہی کہی جاتی ہے۔ لیکن انہوں نے ان کی وفات کے بعد بھی یہ غلطی کی کہ ان کے خلاف بیان دے دیا۔ چنانچہ ان کی آخری عمر قابل رشک نہیں تھی۔ ورنہ جتنا کام حفیظ نے ادب میں کیا وہ کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے اور حفیظ ایک ایسا نام ہے جو ادب کی تاریخ میں زندہ رہے گا اور رہنمائی کرتا رہے گا۔

جوش ملیح آبادی

پنجاب اور یو۔ پی کا تعصبات کی بنا پر جو جھگڑا تھا، ہر چند کہ وہ ادبی تھا مگر اس سے بعض ناخوشگوار چیزیں بھی سامنے آئیں اور اس طرح کے شعر بھی کہے گئے

؎ اک صوبہ ہے پنجاب یہ معلوم نہیں کیوں

اس طرح کے مصرعے اور اشعار جمنا پار سے آتے رہے۔ ادھر سے بھی ایسے شعر کہے گئے کہ وہ وقت آیا جب اس طرح کے شعر بھی آئے:

؎ وہ وقت آیا ہے جب دلی کے مادر زاد گونگوں کو
بفیض مصلحت اہل زباں کہنا ہی پڑتا ہے

ایک دوسرے کے خلاف اس قسم کے اشعار کہے جانے لگے۔ اس طرح کی بازگشت دیر تک سنائی دیتی رہی۔ تقسیم ہوگئی تو اس کے بعد میں نے دو بڑے شاعروں کو اس قسم کی باتیں کرتے سنا۔ ایک تو معلوم ہوا کہ خالص نظریاتی اور علمی سطح پر بات کر رہے ہیں لیکن دوسرے کی زبان سے جو سنا اس کا بھی افسوس ہوا کیونکہ وہ آدمی بڑے تھے۔ ایک تو فراق گورکھپوری ہیں۔ اُردو کے کلچر میں رنگے ہوئے اور عالم ہیں۔ اور انگلش کے استاد تھے پھر انہوں نے انگلش اور سنسکرت کا سارا ادب گھول کر پی رکھا تھا۔ وہ کسی سطح پر بھی تعصب کی بات کرنے والے نہیں تھے۔ میرا ان سے دہلی کے مشاعروں میں اور اس کے بعد جب وہ لائل پور تشریف لاتے تھے تو بہت قرب رہا۔

ایک دن ہم دہلی میں بیٹھے تھے، بہت سے اور بھی شاعر بیٹھے تھے۔ اچانک اقبال کی

بات چل نکلی۔ انہوں نے پہلے تو ہنسی مذاق میں وہ اشعار سنائے جو یگانہ نے اقبال کے بارے میں کہے تھے۔ میں وہ اشعار یہاں بیان نہیں کرسکتا کیونکہ ان میں ذرا سا ذم کا پہلو بھی ہے۔ یہ مذاق چلتا رہا اور جب کسی نے تھوڑی سی اقبال کی تعریف کی تو فراق چمکے اور کوئی آدھ گھنٹے تک اقبال کے فلسفے کی تکذیب کرتے رہے۔ اور اپنے زور بیان سے انہوں نے اقبال کی پوری دھجیاں بکھیریں۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں۔ ذرا جب تھمنے لگے تو میں چونکہ جونیئر تھا اور ان کے شاگردوں کی طرح تھا اس لیے فاصلہ رکھ کر بات کرتا تھا اس کے علاوہ کچھ بے تکلفی بھی تھی لیکن وہ محض لطیفوں کی حد تک تھی۔ علمی معاملوں میں بات کرتے ہوئے میں ہچکچاتا تھا۔ اس لیے میں نے پوچھا کہ جناب ہم سب نے آپ کی یہ ساری باتیں سنی ہیں، آپ یہ بتائیں کہ آپ علامہ اقبال کو بطور شاعر کیا کہتے ہیں۔ وہ تو آپ نے ان کے فلسفہ، نظریات اور خیالات پر گفتگو کی لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ بطور شاعر کیا مقام رکھتے ہیں۔ اس پر انہوں نے اٹھ کر زمین کو ہاتھ لگایا اور کہنے لگے کہ یار میں اس بات سے توبہ کرتا ہوں کہ میرے ذہن سے یہ تو نکل ہی گیا تھا کہ اقبال بطور شاعر کتنا بڑا تھا۔ وہ جتنا بڑا شاعر ہے اس کا تو کوئی جواب نہیں اور اس کی میں مثال ہی نہیں دے سکتا مجھے تو صرف اس کے نظریات سے اختلاف ہے اس میں تضاد نظر آتا ہے اس لیے میں نے یہ باتیں کی ہیں لیکن وہ اتنا بڑا شاعر ہے کہ اگر اس میں کچھ نظریاتی تضاد ہو بھی تو مجھے نہیں چاہئے تھا کہ میں اس طرح اس کو زیر بحث لاتا۔ فراق صاحب کی بات سن کر معاملہ صاف ہوگیا کہ وہ کسی اور سطح سے بات کر رہے تھے۔

لیکن جوش صاحب نے علامہ اقبال کی تضحیک میں باقاعدہ ایک قوالی لکھی ہوئی تھی اور انہوں نے یہ دہلی میں ترک وطن کر کے یہاں آنے سے پہلے سنائی تھی اور اس کی ردیف آہ واہ تھی جو قوال یعنی قوالی میں تکرار کے ساتھ دہراتے ہیں۔

؎ قلندر نے کیا اس راز سے آگاہ آہ واہ

جوش صاحب نے اقبال کی تضحیک میں جو اشعار کہے تھے اس کی وجہ بھی سمجھ میں آرہی تھی۔ ان کا معاملہ حفیظ صاحب جیسا تو نہیں تھا کیونکہ ان کی بھی بے پناہ شہرت تھی اور

شاعر بھی بہت بڑے تھے لیکن بین الاقوامی طور پر جو مقام اقبال کو مل چکا تھا وہ شاید انہیں کھٹک رہا تھا اور آخر تک کھٹکتا رہا۔ پاکستان میں آ کر اگر انہیں یہ محرومی حاصل ہوتی تو ایک وجہ سمجھ آ بھی سکتی تھی کہ جوش صاحب کی شاعری دینی شاعری نہیں تھی اور اقبال کی شاعری میں بین الاقوامی اور کائناتی عنصر ہوتے ہوئے بھی دینی شاعری تھی جس میں وہ جب مرد مومن کا تصور لاتے ہیں تو اس میں دین شامل ہو جاتا ہے۔ اس سطح پر بلکہ کسی سطح پر بھی اقبال اور جوش کا مقابلہ نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن جوش صاحب نے یہ شاعری پاکستان آنے سے پہلے انڈیا میں کی تھی۔

آدمی ایک نظم کہنے کا تکلف یوں ہی نہیں کرتا۔ شاعر جب کچھ کہتا ہے تو اس کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے اس کی پسند، ناپسند، صدمہ، خوشی یا اضطراب کے عوامل ہوتے ہیں تب جا کر نظم ہوتی ہے۔ یہ نظم سننے کے بعد ہم تو خاموش رہے کیونکہ ہمارے سامنے یہ بات تھی کہ

؎ خطائے بزرگاں گرفتن خطا است

بزرگوں کی خطا پکڑنا بھی خطا ہے اور ہمیں تو شروع سے یہی تعلیم ملی تھی کہ اپنے بزرگوں کا احترام کرو۔ اور اگر ایک بزرگ دوسرے بزرگ کے سلسلے میں کچھ کہہ رہا ہے تو اسے سن لو لیکن مداخلت مت کرو۔ تجزیہ کرنے کے بعد پتہ چلا کہ جوش صاحب کو بھی اسی محرومی کا احساس تھا جس قسم کی محرومی کا احساس حفیظ صاحب کو فیض اور جوش سے تھا۔

یہاں آنے کے بعد تو خیر جوش صاحب کے سلسلے کچھ اور ہو گئے۔ جوش صاحب جب یہاں آ گئے تو پنجابیت اور یو پیا پے کا سلسلہ تو اپنی جگہ رہ گیا۔ ہم یہاں سبھی مشاعروں میں ان کے ساتھ ہوتے تھے اور جہاں جہاں نشستیں ہوتی تھیں جوش صاحب کرم کرتے تھے اور اگر کہیں میرا نام نہ ہوتا تو لکھوا دیتے تھے۔ وہ مجھ سے پیار کرتے تھے۔ مجھ سے بے تکلف بھی تھے اور ان کی لفظوں کی اصلاح کی جو عادت تھی اس میں بھی میں ان کی تنقید کا نشانہ بنا اور خوشی ہوئی کہ کچھ اصلاح بھی انہوں نے دی۔

جوش صاحب ہندوستان سے پاکستان کیوں آئے؟ کیا انہیں یہاں آنا چاہئے تھا یہ

اور اس طرح کے بہت سے سوالات اٹھتے رہے اور مختلف گوشوں سے ان کے جوابات بھی آتے رہے۔ دراصل ان کی بدقسمتی یہ تھی کہ ان کے آگے کی نسل کا جو سلسلہ چلا وہ ان کے معیاروں کی نفی کرتا تھا۔ ان کا ایک بیٹا ہی تھا البتہ بیٹیاں ایک سے زیادہ تھیں۔ یہ سب ابھی زندہ ہیں۔ ان بچوں کی تربیت صرف پیار میں ہوئی اور انہیں لاڈ ہی لاڈ ملا۔ باقی جوش صاحب تو معروف شاعر تھے اور گھر میں رہتے ہی نہیں تھے۔ اگر گھر پر ہوتے بھی تو ان کا وقت انجمن آرائیوں میں گزرتا۔ ان کے بیٹے تعلیمی طور پر بھی پیچھے رہ گئے اور کاروبار بھی نہ کر سکے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے صاحبزادے ایک نارمل آدمی سے بھی کچھ اعشاریہ نیچے ہیں۔ ان کے والد تو بڑے سلیقے کے پینے والے تھے مگر انہوں نے سمجھا کہ شاید شراب پینے سے آدمی شاعر بن جاتا ہے اس لیے انہوں نے دن میں بھی یہ شغل جاری رکھا اور ساتھ ستار بجانے کا کا شغل پال لیا اور بزعم خود وہ ستار کے بہت بڑے فنکار کہلانے کی کوشش کرنے لگے۔ اس ساری ادھیڑ بُن میں یہ ہوا کہ ایک پیسے کی آمدنی بھی جوش صاحب کو ان کے ذریعے نہ ملتی بلکہ شادی کے بعد جوش صاحب تو قلت نرینہ اولاد کے شاکی تھے اور ان کے ہاں ماشاء اللہ بہت سے بچے ہو گئے اور یہ سارا بوجھ جوش صاحب کے سر پر تھا جبکہ بیٹے کی بالکل کوئی آمدن نہیں تھی اور معاملہ یہ تھا کہ باپ کماتا اور بیٹا کھاتا اور دادا کماتا تو پوتیاں پوتے کھاتے۔ وہاں ان کی اولاد کو بتایا گیا کہ اگر تم پاکستان چلے جاؤ تو وہاں تمہارے وارے نیارے ہوں گے۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں کراچی کے میئر نے ان سے کہا تھا کہ آپ کراچی آ جایئے۔ اور پاکستان میں آپ کو بہت نوازا جائے گا۔ چنانچہ جوش صاحب نے اولاد کی ضد اور ان صاحب کی باتوں میں آ کر ترک وطن کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے یہ بالکل نہیں سوچا کہ آزادی ہند کے لیے جوش نے شاعروں میں سب سے زیادہ کام کیا ہوا تھا۔ ان کی شاعری کی جڑیں ہندوستان کی زمین میں تھیں اور ایک قومی شاعر کی حیثیت سے ان کی جتنی عزت ہندوستان میں تھی کیونکہ انہوں نے ایک سیکولر ذہن رکھتے ہوئے ساری زندگی آزادی ہند نہ کہ قیام پاکستان کے لیے کام کیا تھا۔ پاکستان میں ان کی اس وقت کی شاعری کا سوائے ان کی رومانوی شاعری سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ظاہر

ہے کہ یہاں آ کر وہ ایسی شاعری بھی نہیں کر سکتے تھے جو انہوں نے ساری زندگی کی تھی۔ یہاں آ کر انہیں تھوڑی بہت الاٹمنٹس ہوئیں۔ کچھ کام بھی انہیں مہیا کر دیا گیا تھا لیکن جب وہ آفیسر نہ رہے جنہوں نے انہیں بلایا تھا تو انہیں تکلیفیں آنے لگیں اور کچھ مشاعروں کی قلت بھی ہوگئی۔ لیکن اس سب کے باوجود ہر حکومت پاکستان نے انہیں روزگار مہیا کیے رکھا لیکن پھر یہاں پر شراب کی بندش ہوگئی اور روز بروز ان ایسے لوگوں کے لیے گھٹن بھی پیدا ہوتی رہی جس سے وہ دل برداشتہ ہوتے رہے۔

ان کی آخری عمر کے بہت سے سال اسلام آباد میں گزرے، ہر چند کہ حکومت انہیں تنخواہ یا وظیفہ دیتی تھی لیکن یہ سرزمین انہیں نظریاتی طور پر راس نہیں آ رہی تھی کیونکہ وہ بہت آزاد خیال تھے اور ان کے مخالفین بہت تنگ نظر تھے اور کوئی درمیانی راستہ نہیں تھا۔ ان کی زندگی میں ایک یہ حادثہ ہوا کہ ریڈیو کچھ قابل ذکر شاعروں کے تفصیلی انٹرویو مستقبل کے لیے محفوظ کر رہا تھا۔ جوش صاحب نے کہا میرا انٹرویو نہ کیجئے۔ لیکن ریڈیو والوں نے کہا کہ یہ انٹرویو اب تو نشر ہونا نہیں ہے بلکہ یہ تو آپ کی وفات بعد کبھی ضرورت پڑنے پر نشر کیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ میرے انٹرویو سے شاید اس طرح کوئی فائدہ نہ ہو سکے۔ کیونکہ میں بعض چیزوں میں اختلاف رکھتا ہوں اس لیے میرا انٹرویو رہنے دیجئے۔ مگر ریڈیو پاکستان نے اصرار کر کے ان کا انٹرویو لے لیا۔

جب مارشل لاء حکومت آئی اور اس میں، زیادہ تر جماعت اسلامی کے لوگ شامل تھے تو کہا جاتا ہے کہ انہوں نے جوش صاحب کا انٹرویو نکلوایا اور اس کے بعض حصے چھپوا دیئے۔ اس کے بعد فضا جوش صاحب کے خلاف ہوگئی اور ان کے خلاف اس طرح کے بیانات آنے لگے کہ یہ غدار ہے اور دشمن کا آدمی ہے۔ اس قسم کی باتیں ان کے بارے میں کہی گئیں اور مطالبہ کیا گیا کہ ان کی تنخواہ بند کی جائے اور انہیں جو مراعات دی جا رہی ہیں وہ چھین لی جائیں۔ اب اس قسم کی باتیں جس سے منسوب ہو جائیں عام آدمی اس کے بارے میں متعصب ہو جاتا ہے۔

اس دوران چند ایک آوازیں بمشکل ہی جوش صاحب کے حق میں اٹھیں۔ ان میں

سے ایک آواز احمد ندیم قاسمی کی تھی اور غالباً یہ ان کے حق میں اٹھنے والی پہلی آواز بھی تھی۔ قاسمی صاحب نے کہا کہ اختلاف رائے کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی آدمی گردن زدنی قرار دیا جائے۔ جینے کا حق سب کو دو۔ جس سے اختلاف رکھتے ہو اسے زندہ رکھو اور اس کا روزگار بند نہ کرو کیونکہ روزگار اور زندگی خدا کے ہاتھ میں ہیں۔

ایک بار دہلی میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ پنڈت نہرو اس میں مہمان خصوصی تھے۔ ''ماتم آزادی ہند'' کے نام سے جوش نے وہاں نظم پڑھی اور اس میں انہوں نے بیان کیا تھا کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد انہیں اس میں کیا کیا برائیاں نظر آئیں۔ پنڈت نہرو یہ نظم سامنے بیٹھے سن رہے تھے اور داد بھی دے رہے تھے۔ اس نظم کا شعر ہے:

؎ نے بوئے گل نہ باد صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

دیکھئے وہ یہ نظم اس ملک کے بارے میں کہہ رہے تھے جس کا وزیراعظم سامنے بیٹھا ہوا یہ نظم سن رہا تھا۔ لیکن پنڈت جی نے پوری طرح داد دی۔ یہ جوش صاحب کی شخصیت کا اثر تھا۔ اس کے برعکس پاکستان میں ان کے ساتھ جو ہوا وہ سب پر عیاں ہے۔

مارشل لاء دور میں جب جماعت اسلامی نے ان کے خلاف مہم شروع کی تو لوگوں نے ان کے پاس آنا جانا کم کر دیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ اس زمانے میں بھی کچھ فوج کے آدمی، کچھ افسران اور کچھ وزراء جو اہل ذوق تھے چھپ کر جوش صاحب کی ضرورتیں پوری کرتے تھے۔ ضرورت سے میری یہاں مراد یہ ہے کہ جوش صاحب پیتے تھے جبکہ اس وقت پینے پر سخت پابندی تھی۔ اس وقت ان کے پیچھے بعض افراد لگا دیئے گئے تھے تاکہ جوش صاحب کو پیے ہوئے پکڑ لیا جائے اور انہیں ذلیل کیا جائے اس لیے چھپ کر ان کی مدد کی جاتی تھی۔ جوش صاحب اس عمر میں اگر بادہ نوشی ترک کر دیتے تو کیا صورت بنتی۔

میرے جیسے آدمی تو اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ ان کی اس قسم کی مدد کر سکیں لیکن افسوس تھا کہ ان کے ساتھ اتنی زیادتی ہو رہی ہے کہ ان سے جینے کا حق چھینا جا رہا ہے۔ حالانکہ وہ بلند مرتبت شاعر تھے اور ان سے بہت سے لوگوں نے سیکھا تھا۔ میں تو جب لاہور

سے راولپنڈی جاتا تھا تو انہیں اہتمام سے اسلام آباد میں سلام کرنے جاتا تھا اور وہ مجھے دعائیں دیتے تھے۔ ایک بار میں اور سلطان رشک ان کے پاس گئے تو انہوں نے ایک عجیب بات کہی جو میں اب بھی ہچکچاتے ہوئے یہاں بیان کرتا ہوں کیونکہ دوسرے لوگ گلے پڑ جاتے ہیں۔ بہرحال یہ جوش صاحب کی رائے ہے۔

سلطان رشک اور میں بیٹھے تھے تو جوش صاحب کہنے لگے کہ قتیل صاحب یہ بتایئے کہ لاہور میں احمد ندیم قاسمی اور آپ کے علاوہ بھی کوئی شاعر ہے۔ میں تو خوشی سے پھولا نہ سمایا مگر ڈرا بھی کیونکہ اس وقت وہاں لاہور ہی کے دو اور شاعر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن یہ تو جوش صاحب کی رائے تھی۔ وہ اگر احمد ندیم قاسمی اور قتیل شفائی کو پسند کرتے ہیں تو ان کی مرضی ہے۔ لیکن ہم شاعروں میں ایسی باتیں آگے چل نکلتی ہیں۔

جوش صاحب سے یہ باتیں اسلام آباد میں اور ادھر ادھر مشاعروں میں ہوتی رہیں لیکن افسوس ہے کہ جب وہ فوت ہوئے تو میں ملک میں موجود نہیں تھا۔ یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ ان کے جنازے میں بہت ہی کم لوگ شریک ہوئے۔ اسلام آباد تو بیورو کریٹس سے بھرا ہوا ہے۔ انہیں تو جس سے کام ہوتا ہے اسی کے پاس جاتے ہیں انہیں کیا کہ یہاں کوئی جوش بھی ہے جو مر گیا ہے اور جس نے زندگی میں کہا تھا

؎ ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوش کہتے ہیں
کہ وہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی

تو وہ حافظ و خیام اسلام آباد میں جس طرح دفن ہوا اس پر افسوس ہی کیا جا سکتا ہے لیکن بار بار خیال آتا ہے کہ اگر ان کے پیچھے ان کی اولاد لائق ہوتی تو نہ تو جنازے پر یہ صورت ہوتی اور نہ ان کے بعد میں ایسا ہوتا۔ اب تو ان کے بارے میں جلسہ ہوتا ہے تو کوئی جاتا نہیں ہے۔ اس کے برعکس فیض صاحب کا یہ عالم ہے کہ ان کی پڑھی لکھی اولاد ہے اور پڑھے لکھے داماد ہیں اور ان کا ایک حلقہ احباب ایسا ہے کہ ہر سال ان کا جشن منایا جاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ فیض صاحب اس کے مستحق ہیں لیکن مستحق تو جوش صاحب بھی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ادھر لائق پسماندگان ہیں اور ادھر میں نالائق تو نہیں کہوں گا

لیکن پسماندگان لائق نہیں ہیں۔ کم از کم اتنا ضرور میں کہوں گا۔ اب جوش صاحب اسلام آباد میں ایک کچی مٹی کی ڈھیری تلے پڑے ہیں اور ان کے لیے کچھ بھی نہیں کیا جا رہا جبکہ ادھر فیض صاحب کے لیے ہر سال ان کے شایان شان فیض میلہ ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں فیض کے پرستار ہیں جبکہ جوش صاحب کے بارے میں یہ ہے کہ

؎ برمزار ما غریباں نے چراغے نے گلے

شاعری میں تجربے

ابتدائی زندگی میں شاعری اور افسانے سے بھی پہلے مجھے گانے کا شوق تھا اور یہ شوق راولپنڈی کی دین تھی۔ میرا زندگی کا بیشتر حصہ خصوصاً بچپن کا نصف حصہ راولپنڈی میں ہی گزرا جہاں ہمارے رشتہ دار تھے، جائیداد تھی اور کاروبار تھا۔ راولپنڈی میں ۱۹۳۰ء کے عشرے کے بعد ۱۹۴۰ء کے عشرے میں بھی موسیقی کا دور تھا۔ ہندو ہو یا مسلمان، سکھ ہو یا عیسائی سبھی اس شوق میں برابر کے شریک تھے اور اکثر گلی کوچوں سے گانے کی آواز آتی تھی۔ اس ماحول سے اپنے وقت کے بہت بڑے شوقیہ گائیک رفیق غزنوی پیدا ہوئے۔

یہاں صورت یہ تھی کہ جس لڑکے کا گلا ذرا اچھا ہوتا تھا وہ کلاسیکل میوزک کی طرف راغب ہوتا تھا اور اسے موسیقی کی ابتدائی شدبد تو کم از کم ضرور ہوتی تھی۔ میں نے بھی باقاعدہ تو نہیں لیکن میوزک کی محفلوں میں بیٹھ بیٹھ کر دس بیس راگوں کی پہچان کر لی تھی۔ اور کلاسیکل تو نہیں گایا لیکن غزلیں اور گیت گانے لگا۔ میں پیشہ ورانہ طور پر نہیں بلکہ یوں ہی شوقیہ طور پر گاتا تھا اور جب میں نے شاعری شروع کی تو یہی موسیقی میرے ترنم کا باعث بنی اور میں اپنے شعر ترنم سے پڑھنے لگا۔

ترنم اور موسیقی میں جو فرق ہوتا ہے اس سے ہمارے شاعر بالعموم واقف ہوتے ہیں اور جو نہیں ہوتے وہ شاعر سے زیادہ گائیک نظر آتے ہیں۔ میں ان شاعروں میں سے تھا جو ترنم اور موسیقی میں فرق کرنا جانتا تھا بلکہ میں نے ترنم میں کچھ ایسی ٹیونیں بھی بنائی تھیں جو کلیتہً میری تھیں۔ اور اب بھی کہیں کہیں ان کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ہر چند کہ پاکستان

کی حد تک ترنم اب ایک متروک چیز ہے۔ اور جب کوئی ترنم سے پڑھتا ہے تو بالعموم اسے پسند نہیں کیا جاتا۔ اب یہاں خالص شعر کی پرکھ کا زمانہ ہے لیکن اس وقت لوگ ترنم سے سننا پسند کرتے تھے اور مشاعروں میں بلائے جانے سے پہلے دیکھ لیا جاتا تھا کہ کس شاعر کا ترنم کتنا اچھا ہے۔ ترنم مشاعروں میں جانے کے لیے بہت مدد دیتا تھا اور ابتداء میں ترنم نے مجھے بھی بہت فائدہ دیا اور میں اکثر مشاعروں میں جا کر کامیابیاں حاصل کرتا تھا۔ ایک وقت تو ایسا بھی آیا کہ بعض اوقات مجھ سے کئی کئی بار مشاعروں میں پڑھایا جاتا تھا اور اگر ریڈیو کا مشاعرہ ہوتا تو اس میں کبھی وقت بچ جاتا تھا تو ان پانچ دس منٹوں میں موجود تمام شاعروں میں سے مجھے انتخاب کر کے دوسری غزل پڑھوا کر وہ وقت پورا کیا جاتا تھا۔

باقی مشاعروں میں جو کیفیت ہوتی تھی اس کی ایک مثال ضمیر جعفری صاحب کے ایک مضمون کے حوالے سے اب دیکھ لیجئے۔ فرماتے ہیں:

"..... قتیل سے میری دوسری ملاقات گارڈن کالج راولپنڈی کے پٹھوہار کے باہائے اُردو جناب عبدالعزیز فطرت کے مشاعرے میں ہوئی جسے قتیل کی چھاپ نے اچھوتا بنا دیا تھا۔ ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر کی حیثیت سے قتیل کے قاتل شعروں نے ادب کے نئے افق پر سحر کر رکھا تھا۔ مشاعرے میں اس وقت کے بعض استاد شعراء بھی موجود تھے مگر مشاعرہ نوجوان قتیل ہی نے لوٹا۔ وہ یوں کہ جب مشاعرہ ختم ہوا تو بارش شروع ہوگئی۔ بارش میں ایک انگریزی محاورے کے مطابق گویا کتے اور بلیاں برس رہے تھے۔ پائے رفتن کو نہ پا کر سامعین نے جائے ماندن کو غنیمت جانا۔ فطرت صاحب کی ایک مجبوری یہ تھی کہ وہ مشاعرے کو ختم نہیں کر سکتے تھے اور دوسری مجبوری یہ کہ سامعین قتیل شفائی کے سوا کسی دوسرے شاعر کو سننا نہیں چاہتے تھے لہٰذا جب تک جل برستا رہا قتیل صاحب مشتاق سامعین کی پرجوش تحسین و آفرین کے ڈونگروں میں کلام سناتے رہے.....؟"

ضمیر صاحب آگے چل کر فرماتے ہیں کہ

"..... تجسس اور دریافت قتیل کی طبیعت کے دو بنیادی خواص ہیں۔ اور اپنی ذات پر اعتماد کی خوبی جو ان کی کٹھن زندگی کی ریاضت کی دین ہے۔ انہوں نے علم مدرسے کی

کتاب سے نہیں زندگی کی کتاب سے حاصل کیا۔ اعتماد کی ایک مثال یہ دیکھئے کہ انہوں نے مشاعروں میں ترنم سے شعر پڑھنا ترک کر دیا۔"

ترک ترنم سے بھی سب کو حیرت ہوئی اور احباب خصوصیت سے پوچھتے تھے کہ میں نے ترنم کیوں ترک کر دیا۔ اصل بات یہ تھی کہ میں اپنی دانست میں یہی نہیں اوروں کی رائے میں بھی بلکہ اچھے لوگوں کی رائے میں بھی اچھی اور نئے لہجے کی شاعری کر رہا تھا۔ اور اس کے بل بوتے پر مجھے داد بھی ملتی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب آدمی رسائل میں چھپتا ہے تو وہاں ساتھ ترنم نہیں ہوتا۔ اگر کاغذ پر چھپ کر آپ کی شاعری جان لے رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی شاعری میں جان ہے۔

اب اتفاق کی بات یہ ہے کہ میں مشاعروں میں بھی بہت کامیاب تھا اور داد لیتا تھا لیکن میرے بدخواہ جو ہمیشہ اچھی چیز کو بھی برے پہلو سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں وہ باتیں کیا کرتے تھے کہ قتیل کا کیا ہے وہ تو گلے کے زور سے مشاعرہ لوٹ لیتا ہے اور شعر پر داد لیتا ہے۔ حالانکہ مجھے اس چیز کا پہلے بھی احساس تھا کہ میں جو داد شعر پر لے سکتا ہوں اس میں خواہ بخواہ ترنم کو حصے دار بنا دیتا ہوں۔ میں نے اس سلسلے میں اس زمانے میں ایک نظم بھی کہی تھی۔ اس نظم کی کاپی میرے پاس موجود نہیں۔ میں وہ کھو بیٹھا ہوں۔ احمد ندیم قاسمی صاحب اس نظم پر داد دینے والوں میں پیش پیش تھے۔ یہ میں نے ترنم کے خلاف لکھی تھی جبکہ اس زمانے میں ترنم سے اپنا کلام سناتا تھا۔ اس نظم کا خلاصہ یہی تھا کہ ترنم مجھے ناپسند ہے خاص طور پر جب شاعری کی داد میں ترنم بھی شامل ہو جائے۔ یہ نظم کچھ یوں شروع ہوتی تھی:

؎ مشاعرے میں ترنم سے پڑھ رہا ہوں غزل
مرے گلے میں نہاں ہے وہ نور موسیقی
کہ جس کہ ضو میں جھلکتا ہے طور موسیقی

آگے بہت سے شعر آئے اور اس کے بعد میں خود ہی سوال اٹھاتا ہوں کہ یہ داد کلام پر ہے یا ترنم پر۔ چنانچہ ایک دن میں نے فیصلہ کیا کہ اگر میرے شعر میں دم ہے تو میں تحت

اللفظ پڑھ کر بھی داد لوں گا اور اگر ترنم ہی وسیلہ شہرت ہے تو لعنت ہے اس داد پر جو صرف ترنم ہی سے ملے۔ چنانچہ میں نے ترنم چھوڑ دیا اور کوئی چار پانچ سال تک میں سامعین کا اس طرح مقابلہ کرتا رہا کہ جب میں شعر پڑھنے شروع کرتا تو آوازیں آتی تھیں "ترنم سے، ترنم سے۔" چنانچہ شروع میں میں نے سامعین سے کہا کہ آپ ایک غزل تحت اللفظ سن لیجئے۔ اس کے بعد ایک غزل ترنم سے عرض کروں گا۔ اس طرح میں نے نصف کلام ترنم کے ساتھ سنا کر سال ڈیڑھ سال گزارا۔ پھر دو تین برس اس طرح گزرے کہ کبھی سامعین جیت جاتے تھے اور کبھی میں جیت جاتا تھا۔ اس کے بعد میں نے لوگوں کو اپنا ترنم بھلا دیا اور اب تک تحت اللفظ پڑھ رہا ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ مشاعرہ بھی اچھائی یا برائی کا کوئی معیار نہیں ہے۔ اصل چیز تو وہ ہے جو کاغذ پر آئے اور نگاہیں اس کا فیصلہ کریں اور قاری کا ذہن بتائے کہ شعر کس پائے کا ہے۔ اب اللہ کا فضل ہے کہ میں وقت سے پیچھے نہیں رہا۔ میں نے ہمیشہ وقت کا ساتھ دیا ہے اور بعض اوقات کوشش بھی کی ہے کہ وہ کچھ نئی باتیں شعر و ادب میں شامل کروں۔ اس میں لہجے کا بھی دخل ہوتا ہے اور ہیئت کے تجربوں اور اصناف سخن میں اضافے کا بھی دخل ہوتا ہے۔

اصناف سخن کے سلسلے میں میری حالیہ جو کوشش ہے وہ یہ ہے کہ دوہے کے وزن کو راستے پر لایا جائے۔ ہمارے اکثر شعراء دوہے کے نام سے جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ دوہا نہیں ہے بلکہ اسے آپ مطلع کہہ سکتے ہیں اور مطلع بھی ایک ہی بحر میں جو میر کی مشہور لمبی بحر ہے۔ یہ لوگ اسے دوہے کا نام دیتے ہیں۔ یہ اسی طرح ہے کہ چار مصرعے رباعی کے لکھ لیے جائیں اور اُسے قطعہ کا نام دیا جائے یا قطعہ کے چار مصرعوں کو رباعی کا نام دیا جائے۔ اگر ایک نام ایک صنف سخن کا اساتذہ نے مقرر کیا ہے تو اس کے لوازمات، اصول، قواعد اور ہیئت سب کچھ اس کے ساتھ ہے۔ میرے نزدیک یہ بہت غیر مناسب ہے کہ ایک مطلع لکھ کر اس پر دوہے کا عنوان لکھ دیا جائے۔ چنانچہ میں نے تواتر سے دوہے لکھنے کا ایک عزم کیا ہے تاکہ اُردو میں دوہا لکھنے والوں کو معلوم ہو کہ دوہے کا وزن یہ ہے۔ ویسے تو شعراء کو یہ

معلوم ہونا چاہئے اور اگر کوئی جان بوجھ کر اسے تجربے کے طور پر مطلع کا نام دوہا رکھنا چاہتا ہے تو یہ زیادتی ہے۔ اور اگر ایسا نادانستہ طور پر کیا جا رہا ہے تو اس جہالت کا سدباب ہونا چاہئے۔

دوسرا تجربہ جو میں نے کیا ہے وہ اُردو میں خالصتاً میرا تجربہ ہے۔ یہ خماسی کا تجربہ ہے۔ عنوان سے ظاہر ہے اس میں پانچ مصرعے ہونے چاہئیں۔ رباعی کا ایک مخصوص وزن ہے اور یہ تجربہ میں نے رباعی ہی کا وزن لے کر پانچ مصرعوں میں اُردو میں ایک نئی صنف سخن کا آغاز کیا ہے میں نے اس کا نام خماسی تجویز کیا ہے۔ یہ ابتدائی خماسیاں جب ''افکار'' میں چھپیں تو میں نے نوٹ دے کر اس کے بارے میں احباب سے رائے مانگی تھی اور اس کا نام ''بے نام سخن پارے'' رکھا تھا۔ اکثر احباب نے اس کا نام خماسی تجویز کیا اور پسندیدگی کا اظہار کیا۔

ڈاکٹر الیاس عشقی میرے دیرینہ احباب میں سے ہیں۔ ریڈیو کے سٹیشن ڈائریکٹر رہے ہیں اور تحقیق میں ان کا مرتبہ و مقام ہے۔ انہوں نے جو خط مجھے لکھا اس کا ایک اقتباس یوں ہے:

> ''افکار'' کے تازہ شمارے میں تازہ تر خماسیاں نظر سے گزریں۔ واقعی آپ کا حق ہے، رباعی میں ایک بامعنی اور فنی طور پر چستا اور مناسب مصرع کا اضافہ اور اس طرح کہ وہ فن پارے کا جزو، لاینفک بن جائے آسان کام نہیں ہے۔ درآں جائے کہ اکثر شعراء کے لیے تو رباعی کے چاروں مصرعے بامعنی اور مربوط فراہم کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ چوتھا مصرع اکثر لوگ بہم نہیں پہنچا سکتے اور اگر یہ بھی ہو گیا تو تیسرا مصرع کھسک جاتا ہے آپ نے اس صنف کو کچھ اس طرح اپنایا ہے کہ اس میں کچھ اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ جو ہر تجربے میں ابتدائی دور میں محسوس ہوتی ہے۔ اُردو میں اس سے قبل یہ صنف کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہاں اولیت کا شرف آپ ہی کو حاصل ہے۔

چنانچہ اصناف سخن میں یہ کام میں نے کیا ہے۔ اب انڈیا میں آزاد غزل کی ایک

تحریک چلی ہے۔ آزاد غزل ہر چند کہ اس طرح اناڑیوں کے ہاتھ میں آ چکی ہے جس طرح نثری شاعری۔ نثری شاعری کا تجربہ ایک تجربہ ہے اور تجربے کا خیر مقدم کرنا ہی ضروری ہوتا ہے لیکن جب کوئی نیا تجربہ اناڑیوں کے ہاتھ میں آ جاتا ہے تو اس کی ریڑھ مار دی جاتی ہے۔ چنانچہ نثری شاعری کی غیر مقبولیت میں انہی لوگوں کا ہاتھ ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ تجربہ کامیاب ہونے سے پہلے ہی ممکن ہے اناڑیوں کے ہاتھوں راہی ملک عدم ہو جائے۔ یہی حال آزاد غزل کا ہو رہا ہے کہ جو شخص باقاعدہ غزل کہنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ وہ آزاد غزل کہنے چلا آ رہا ہے۔ اور اس طرح آزاد غزل کو بھی بہت بدنام کیا جا رہا ہے۔ میں نے دیکھا کہ آزاد غزل کو اگر سلیقے سے برتا جائے تو وہ مزید موسیقت پیدا کرتی ہے اور اسے نئے نئے میدانوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے اور موسیقیت کے سلسلے میں یہ گیت کے زیادہ تر قریب ہو جاتی ہے۔ چنانچہ پچھلے دنوں میں نے آزاد غزلیں بھی کہیں اور اب بھی یہ کہنے کا ارادہ ہے۔ اور اس میں روایت سے ہٹ کر نئے زاویے سے اضافے کرنے کا ارادہ ہے تاکہ جو کچھ پہلے نئی غزل کہی جا رہی ہے اس سے ذرا ہٹ یہ ثابت کیا جا سکے کہ اس سے کوئی بغض اور عناد کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ غزل کے اوزان باقاعدہ غزل میں ہوتے ہیں، آزاد غزل میں بھی شامل رہیں اور اس کی ہیئت تبدیلیاں کر کے اسے گیت کے قریب لے آیا جائے تو اُردو نے گیت جو ہندی زبان کی صنف تھی سے لئے! دراب تو یہ اُردو ہی کی صنف بن گئی ہے لیکن آزاد غزل بھی ایک ایسی صنف کی صورت میں اُردو میں رائج ہو سکتی ہے جو کلیتاً اس کی اپنی ملکیت ہوگی۔ اور جس پر ہم کہہ سکیں گے کہ صنف ہم نے کہیں سے لی نہیں ہے بلکہ خود ایجاد کی ہے۔

یہ صنف ایجاد ہو چکی ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ یہ اچھے ہاتھوں میں پہنچے اور اچھے شعراء اس پر مشق سخن کریں۔ چنانچہ جو کچھ میں نے کہا ہے ان میں سے کچھ چھپ چکا ہے اور کچھ چھپ رہا ہے اور میرا خیال ہے کہ چند مہینوں میں میرا آزاد غزلوں کا ایک مجموعہ بھی آئے گا جس کے دیباچے میں میں اس کی وضاحت کروں گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ انسان کو تجربے کرتے رہنا چاہئے۔ تجربہ نہ ہو تو کسی بھی فن میں

ایک جمود کی شکل پیدا ہوسکتی ہے۔ اور جو لوگ تجربے کے آغاز ہی میں شور مچانے لگتے ہیں اور انسے مطعون کرنے لگتے ہیں میں ان کے حق میں نہیں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تجربہ کرنے والوں کو کھلی آزادی ملنی چاہئے۔ اگر تجربے میں جان ہوگی تو تجربہ زندہ رہ جائے گا ورنہ وہ اپنی ایک ہلکی سی روشنی چھوڑ کر ختم ہو جائے گا اور ممکن ہے کہ وہ جو ہلکی سی روشنی چھوڑ گیا ہے یا وہ اپنے قدموں کے جو نشان چھوڑ گیا ہے انہی پر چل کر کوئی نیا تجربہ آگے بڑھے اور کسی نئے امکان کی نشاندہی کر جائے۔

چھوٹے چھوٹے تجربے میں نے بحروں میں بھی کئے ہیں۔ کچھ تو یہ ہے کہ پرانی بحر میں کچھ کمی یا کچھ اضافہ کیا ہے یا کچھ کلیتہً نئی ایسی بحریں جو ہندی الاصل بھی ہیں لیکن کچھ ایسی بحریں بھی ہیں جو ہندی میں بھی رائج ہیں اور میں نے انہیں اُردو میں رائج کیا ہے اور تلاش کرنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ بالکل نئی بحریں ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مثال ابھی دیتا ہوں اور باقی چھوڑ دیتا ہوں:

سب دنیا نے کہا تجھے مت اعتبار کر اس کا
بیٹھا ساری عمر میاں انتظار کر اس کا

اب یہ مطلع کاغذ پر لکھا جائے تو اُردو کا ایک عام شاعر الجھن میں پڑ جاتا ہے کیونکہ اس کی تقطیع مروجہ اصولوں کے تحت مشکل ہے۔ ماتروں سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے یا کوئی پڑھنے اور سننے والا پھر اندازہ کرے گا کہ اس میں ایک RHYTHM ہے اور یہ ایک باقاعدہ بحر ہے۔ میں نے اُردو میں اور بھی ایسی کئی بحریں شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ موسیقیت کے پیمانوں پر یہ بہت پوری اترتی ہے بلکہ عام غزل سے اس کی ٹیون اچھی بن سکتی ہے۔ میں نے کبھی موسیقی یا غنائیت کو غزل سے علیحدہ نہیں سمجھا۔

یہاں یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہئے کہ میں غزل کو صرف گانے کی چیز نہیں سمجھتا' میں تو سمجھتا ہوں کہ اس میں پوری طرح اپنا اثر ہونا چاہئے، مسائل ہونے چاہئیں اور تغزل کا حسن ہونا چاہیے میں اس غزل کا بالکل قائل نہیں جو کھردری ہو، بدنما ہو اور بدآواز ہو۔

ایسی غزلیں بالکل سپاٹ ہوتیں۔ غزل میں حسن ہو اور ساری چیزیں ہوں جو اس کا حاضر اس سے طلب کرتا ہے اس میں موسیقیت ہو اور غنائیت سے ہم آہنگ ہوں۔

تجربوں کے سلسلے میں بات چلی تو مجھے اپنے بہت عزیز دوست احمد راہی کی یاد آتی ہے۔ میرے ساتھ گزشتہ دنوں ایک اخبار کی طرف سے ایک تقریب منعقد کی گئی جس میں مختلف لوگوں نے مجھ پر اظہار خیال کیا اور جو اوصاف انہیں میرے کلام میں یا میری ذات میں نظر آئے وہ انہوں نے بیان کئے۔ لیکن احمد راہی نے لوگوں پر جو انکشاف کیا وہ ایک ایسی چیز کا انکشاف تھا جس کا دعویٰ میں نے زندگی بھر نہیں کیا۔ ویسے بھی دعوے کرنا میری عادت بھی نہیں اور دعوے کر کے کوئی چیز منوانا بھی کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہوتی۔ چیز تو وہی ہے جسے لوگ تسلیم کر لیں لیکن انہوں نے ایک بات کی نشاندہی کی۔

احمد راہی نے کہا کہ جب قتیل اپنے وطن سے چل کے لاہور آیا تو نظم کا نیا لہجہ ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس وقت نظم کے جتنے رجحان، انداز اور سٹائل چل رہے تھے، وہ ان میں ایک الگ پہچان کی نظم بھی ساتھ لایا تھا۔ غالباً احمد راہی کو میری سب سے پہلی وہ نظم یاد ہوگی جو احمد راہی ہی کے رسالہ ''محور'' میں تقسیم سے پہلے امرتسر سے چھپی تھی۔ اور اس کے بعد بھی پھر جو میری نظمیں چھپتی رہیں وہ احمد راہی کے ذہن میں تھیں۔

ہوا یوں کہ قیام پاکستان کے بعد پھر ایک ایسی رو چلی کہ ادب یک موضوعی کا شکار ہوا۔ تمام لوگ تقسیم کے موضوع کو لے کر طبع آزمائی کرنے لگے۔ ان میں دو گروپ تھے۔ ایک تو وہی جو ایک چیز کو سطحی طور پر دیکھتے ہیں۔ یہ گروپ تو آزادی کے گن گانے لگا۔ دوسرا گروپ وہ تھا جو ذرا گہرائی میں بھی دیکھتا تھا اور آزادی میں جو خامیاں رہ گئی تھیں اس گروپ کے لوگ ان کے ناقد بھی بن گئے۔ اسی طرح پہلا گروپ جو تھا وہ ہندوستان اور پاکستان میں دونوں طرف اپنے مذہب کا دفاع کرنے کے لیے دوسرے مذہب کو مطعون قرار دینے لگا جبکہ دوسرا گروپ توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتا تھا اور دونوں سمتوں سے انسانیت کے لیے جو بھلائیاں ہوئیں ان کو اجاگر کرتا تھا۔

یوں موضوع تقریباً ایک ہی تھا یا اس موضوع کے دو رخ تھے یا یوں سمجھ لیجئے کہ ایک

موضوع کے دورخ بن گئے تھے اور لوگ اس پر طبع آزمائی کر رہے تھے۔ ادھر فیض صاحب نے کہا:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

ترقی پسند دھڑا اسی انداز کو لے کر چل نکلا اور سحر کا یہ استعارہ خوب چلا۔ یوں نظر آتا تھا کہ ایک ٹھپا ہے جو کاغذ پر لگتا چلا جا رہا ہے اور ایک تحریک چلی جا رہی ہیں۔

دوسری طرف جو لوگ تھے جس کو ترقی پسند زبان میں رجعت پسند کہا جاتا تھا' اُن کا اپنا ایک ٹھپا تھا اور وہ یہ کہ آزادی کی تعریف کرتے چلے جائیں لیکن ان کے پاس جذبہ نہیں تھا۔ وہ فن میں کچے تھے۔ جہاں محض تعریف ہی کرنی ہو وہاں آپ شعر کے کیا پہلو نکال سکتے ہیں۔ اختلافی یا تنقیدی صورت میں تو بڑے بڑے نکتے پیدا کئے جا سکتے ہیں لیکن محض تعریف کے لیے صرف استاد ذوق چاہیے۔ وہ قصیدہ لکھتے چلے جاتے تھے اور نئی نئی باتیں پیدا کرتے چلے جاتے تھے لیکن جس دور کا میں ذکر کر رہا ہوں اس میں غالب زیادہ تھے اور ذوق کم تھے۔

ایسے حالات میں بھی ترقی پسند نظم کہنا ضروری تھا اور عام روش سے ہٹ کر کہنا بھی ضروری تھا۔ میں نے کوشش کی کہ موضوعات چنے جائیں اور تقسیم ہی سے موضوعات لیے جائیں لیکن اب اس سحر کی رٹ کو چھوڑ دیا جائے یا پھر وہ جو کہتے ہیں کہ تیری ذات ہے فلاں والی بات چھوڑ کر میں نے کچھ کیریکٹر چنے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہاں آ کر میں تھوڑا سا منٹو صاحب سے متاثر ہوا۔ انہوں نے افسانہ ''کھول دو'' فسادات کے موضوع پر تحریر کیا تھا جو کہ ایک شاہکار افسانہ تھا۔ میں نے اس طرح ''مغویہ'' نظم کہی۔

یہ نظم بھی اس موضوع پر تنہا نظم تھی اور اسی طرح میں نے وہ مظلوم عورت لے لی جس کا تعلق بظاہر تقسیم سے نہیں تھا لیکن جس کے تمام حالات اور تمام مشکلات اور دشواریاں تمام تر ترک وطن سے پیدا کی ہوئی تھیں۔ اس طرح مجھے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ میں اس پورے ہجوم میں علیحدہ نظر آتا تھا اور موضوع کے طور پر بھی جن کرداروں پر میں نے طبع

آزمائی کی وہ اوروں سے مختلف تھے اور اس طرح میں ان سب چیزوں سے اپنا دامن بچا گیا۔

چنانچہ اسی بات کی نشاندہی احمد راہی نے کی تھی اور کہا کہ میں جب اپنے وطن سے یہاں لاہور میں آیا تو ایک نیا انداز ساتھ لے کر آیا تھا جس سے میں پہچانا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں میں نے نظم ''بانجھ'' کہی اور اس موضوع پر میرا خیال ہے کہ آج بھی میری تنہا نظم ہے کوئی اور نظم اس موضوع پر میری نظر سے نہیں گزری۔ ممکن ہے کہ کہیں آئی ہو۔ پھر میں چونکہ سٹوڈیو کے ماحول میں رہا وہاں جو جگمگاتا ہوا ایک اندھیرا ہے کسی نے اس کے اندر جھانک کر نہیں دیکھا۔ اس کی بظاہر جو شان و شوکت دکھائی دیتی ہے اس پر سب کی نظر رہی۔ میں نے اس کے پس منظر میں جھانک کر نظمیں کہیں۔

میں نے اس عورت پر نظم کہی جسے اب تک رومانی انداز میں ہی پیش کیا جاتا رہا اور معاشرے کو اور سماج کو اس کا تخلیق کار کہا جاتا رہا اور اسی سلسلے میں قاضی عبدالغفار کے ''لیلیٰ کے خطوط'' پڑھیے یا اس کے بعد اس سے متاثر ہونے والے افسانہ نگاروں کے افسانے اور شاعروں کی نظمیں دیکھیے ان میں یہی پہلو نظر آئے گا کہ طوائف معاشرے کی پیداوار ہے اور مظلوم ہے۔

میں نے یہ نقطہ نظر قریب سے دیکھنے کے بعد پیش کیا کہ وہ پہلی عورت جو مظلوم تھی جسے دیوداسی سے رام جنی بنا دیا گیا تھا اور رام جنی سے اسے کوٹھے پر بٹھا دیا گیا تھا اور اس قبیلے کی اور عورتیں جو زندگی میں پہلی بار اس حادثے سے دوچار ہوئی تھیں، وہ مظلوم تھیں لیکن دس دس پشتیں گزرنے کے بعد جو پشتینی طوائفیں چلی آ رہی ہیں اور اب کچھ برسوں سے تو ان میں گریجویٹس بھی ہیں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہیں اور وہ پھر بھی یہی پیشہ اختیار کرتی ہیں تو میری نظر میں بلکہ حقیقت میں وہ عورتیں مظلوم نہیں ہیں۔ اس لیے کہ وہ باشعور ہیں اور اگر انہیں یہ رستہ ناپسند ہے تو وہ اسے چھوڑ کر کچھ اور بھی کر سکتی ہیں۔

میں نے اس عورت کو اس تناظر میں نہیں دیکھا جس میں لوگ دیکھتے چلے آئے ہیں۔ میں نے پس منظر کو پیش منظر میں لا کر ''مطربہ'' کے عنوان سے ایک موضوعی نظموں کا مجموعہ

دیا جس پر مجھے آدم جی پرائز بھی ملا اور جو کچھ عرصے بعد انگلش میں بھی ترجمہ ہو رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ موضوع ہندوستان اور پاکستان ہی سے مخصوص ہے اور اگر یہ مغرب میں روشناس کرایا جائے تو یہ ان کی دلچسپی کا باعث بن سکتا ہے۔

چنانچہ احمد راہی کی جو بات اس تقریب میں ہوئی تھی وہ میرے لہجے کے حوالے سے تھی۔ ہاں اگر میں احمد راہی کی بھی بات کر دوں تو مناسب ہوگا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں۔ میں پارٹیشن سے پہلے دو بار لاہور میں آیا۔ ایک تو میں یہاں ''ادب لطیف'' کی ادارت کے سلسلے میں آیا جو غالباً ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔ دوسری بار میں یہاں فلم کے سلسلے میں جنوری ۱۹۴۷ء میں آیا۔ لیکن احمد راہی سے میری ملاقات پارٹیشن سے پہلے کی ہے۔ کسی ادبی یا دوسری محفل میں میری احمد راہی سے ملاقات ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ ہم دونوں مزاج کے اعتبار سے قدرے قریب ہیں۔ وہ اس لیے کہ میں بھی بڑے تحمل سے بات سننے کا حوصلہ رکھتا ہوں اور وہ بھی رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی میرے مطلب کی بات نہیں کر رہا اور پھر بھی میں اسے سن لوں تو اسے حوصلہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے ایک مشترکہ دوست اس تقریب میں اسے ایک لمبی نظم سنا رہے تھے اور نظم بھی کوئی خاص نہیں تھی مگر احمد راہی اسے بڑے تحمل سے سن رہا تھا اور اس کے چہرے پر ناگواری کے بھی کوئی اثرات نہیں تھے اور وہ صابر و شاکر بن کر سن رہا تھا۔ میرا بھی یہی حال ہے کہ میرے پاس بھی کچھ لوگ شاعری کا پلندا لے کر آ جاتے ہیں اور سنانے بیٹھ جاتے ہیں۔ اس زمانے میں بھی مجھے معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے مصرعے وزن سے بھی خارج ہیں لیکن وہ مجھے سنائے جایا کرتے تھے۔ میں یہ سب سن کر کچھ رائے دینے سے بھی نہیں ہچکچاتا تھا۔

اس صبر و شکر کے معاملے میں ہم مزاج ہونا اس وقت مجھے اور احمد راہی دونوں کو محسوس ہوا اس کے بعد ایک دو ملاقاتیں ہوئیں تو پتہ چلا کہ احمد راہی امرتسر میں کمیونسٹ پارٹی کے رکن ہے۔ اور ''محور'' کے نام سے ایک رسالہ نکال رہا ہے۔ اس زمانے میں یہی نہیں اب بھی ادبی رسالہ نکالنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ اور اسے تو کہا گیا ہے:

؎ شوق فضول جرأت رندانہ چاہئے

اس کے لیے پیسہ خرچ کرنے اور لوگوں کے طعنے سننے کا حوصلہ بھی چاہئے۔ انہوں نے پیسے کا کہیں سے بندوبست کیا ہوگا لیکن یہ پیسے دو پرچوں میں ہی اڑ گئے ہوں گے لیکن اس پرچے کو نظم بھیجنے کے وسیلے سے احمد راہی کی اور میری دوستی ہوگئی۔

تھوڑی سی دوستی یوں بڑھی کہ ایک بار احمد راہی نے کھدر کا کرتا پہنا ہوا تھا۔ مجھے شروع ہی سے کھدر پسند ہے۔ یہاں مجھے سردار جی کا ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے کہ وہ پھٹے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور بیر کھا رہے تھے کسی نے پوچھا کہ سردار جی کیا ہو رہا ہے تو سردار جی نے جواب دیا کہ میرے بس دو ہی شوق ہیں ایک اچھا کھانا اور دوسرا اچھا پہننا۔ ایسی بات نہیں تھی۔ مجھے پہننے کا شوق تھا اس لیے مجھے وہ کپڑا پسند آیا اور میں نے کہا کہ راہی صاحب! ''کھدر'' کہاں سے لیا ہے تو وہ کہنے لگے کہ یہ امرتسر میں بنتا ہے۔ اور کئی رنگوں میں ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ میرے لیے وہاں سے بھیجئے۔ میں نے انہیں پیسے دینے کی کوشش کی تو انہوں نے نہ لیے اور چار کرتے انہوں نے مجھے وہاں سے بھیج دیئے۔

اس کے بعد راہی صاحب کا یہاں آنا جانا رہا لیکن وہ مستقل طور پر لاہور میں پارٹیشن کے بعد آئے۔ میں تو پارٹیشن کے دوران لاہور ہی میں تھا اور میرا یہ زمانہ تھا کہ میں اس وقت دو حصوں میں تقسیم تھا۔ میں ان دنوں ذہنی طور پر ہری پور میں ہوتا تھا جہاں میرے بیوی بچے تھے اور جسمانی طور پر لاہور میں ہوتا تھا جہاں میری ایک خاتون دوست چندر کانتا میرے ساتھ تھی۔

صورت حال یہ تھی کہ ٹمپل روڈ پر جہاں میں اور چندر کانتا رہتے تھے۔ اس مکان کو تو مومنین نے چندر کانتا کے ہندو ہونے کی وجہ سے آگ لگا دی تھی۔ ہم ایک محلے سے دوسرے محلے میں مہاجر ہو کر اس زمانے کے مشہور ایکٹر نذر کا میڈین کے گھر منتقل ہو گئے۔ اور وہاں تین چار مہینے انہوں نے بہت ہمدردی سے رکھا۔ احمد راہی، عارف عبدالمتین اور دوسرے دوست جو اس وقت امرتسر سے لاہور آ چکے تھے، پتہ چلا کہ پیسہ اخبار بازار میں

عارف عبدالمتین نے ایک بڑی بلڈنگ الاٹ کروائی ہے۔ جس میں احمد راہی بھی ایک انیکسی میں رہ رہے ہیں۔ احمد راہی نے ہیں کہا کہ تم یہاں آ جاؤ کیونکہ میں بس اکیلا ہوں۔ ساتھ ہی فکر تونسوی اپنے محلے میں غیر آباد ہو چکا تھا وہ سنت نگر میں رہتا تھا اس کے بیوی بچے واپس انڈیا میں جا چکے تھے لیکن یہ اکیلا وہاں رہتا تھا۔ وہاں سے باقی غیر مسلم آبادی جا چکی تھی۔ وہ ڈرتا تھا کہ وہ اکیلا سنت نگر میں رہ رہا ہے۔ چنانچہ ہم سب نے طے کیا کہ ہم اکٹھے احمد راہی کے پاس آ جاتے ہیں چنانچہ ہم سب وہاں آباد ہو گئے۔

وہاں صورت یہ تھی کہ میں مسلمان تھا، چندر کانتا ہندو تھی۔ اسی طرح احمد راہی مسلمان اور فکر تونسوی ہندو گویا اس انیکسی میں ہندو مسلم اتحاد کا مظاہرہ ہونے لگا۔ اس وقت بیروزگاری تھی البتہ فکر تونسوی کو ''ادب لطیف'' کے ادارے کی طرف سے باقاعدہ تنخواہ مل رہی تھی۔ باقی لوگوں کو کبھی کہیں سے آمدن ہو جاتی تھی تو بہت خوش ہوتے تھے اور ایک دوسرے پر خرچ کر دیتے تھے۔ احمد راہی کو میں نے دیکھا کہ وہ دوستوں کے لیے ایثار مجسم تھے۔ فکر تونسوی کا یہ عالم تھا کہ وہ ہمارے ساتھ مسجد میں نہانے جاتا تھا اور ہمارا آپس میں مذاق چلتا تھا۔ احمد راہی اسے کہتا تھا کہ فکر آدھے مسلمان تو تم مسجد میں نہا کر ہو گئے۔ سمجھ لو کہ تم نے گنگا اشنان نہیں کیا بلکہ مسجد اشنان کیا اور آدھے مسلمان ہو گئے۔ فکر نے کہا کہ یوں کیوں نہیں کہتے کہ گنگا میں نہا کر میرے سارے پاپ دھل جاتے ہیں یہاں نہا کر میرے آدھے پاپ دھلے ہیں۔ اس لیے تم یہ گھاٹے کی بات کر رہے ہو اور اسلام کی توہین کر رہے ہو۔ اگر تم یوں کہو کہ گنگا میں نہانے سے تمہارے پاپ نہ اترتے اور یہاں نہا کر اتر گئے تو ٹھیک ہے۔

اس قسم کی دلچسپ باتیں آپس میں ہوتی رہتی تھیں اور اس کے بعد ایسا وقت آیا کہ فکر تونسوی کو ڈرا دھمکا کر انڈیا بھیج دیا گیا۔ اور میرا ایک سلسلہ ایسا بنا کہ مجھے اپنے عشق و عاشقی سمیت راولپنڈی جانا پڑ گیا اور وہاں میں نے ہندوؤں کا چھوڑا ہوا ایک دواخانہ اسی سکھ دوست سے خرید لیا جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔

اس کاروبار سے ناکام ہونے کے بعد جب میں پھر لاہور واپس آیا تو احمد راہی پھر

میرے کام آیا۔ اس وقت اس کے پاس رائل پارک میں ایک بہت اچھا متروکہ فلیٹ تھا۔ راہی نے کہا کہ تم یہیں آ جاؤ بلکہ پنڈی ہی سے اس نے ہمیں یہ پروگرام بنا کر دے دیا تھا چنانچہ ہم یہاں آ گئے۔ ایک کمرے میں احمد راہی کا پلنگ بچھا ہوا تھا جبکہ باقی دو کمرے ہمارے استعمال میں آئے۔ اس زمانے میں مجھے تھوڑا سا کام یہ مل گیا کہ ''اداکار'' میں مجھے ڈیڑھ سو روپے ماہوار کی نوکری مل گئی۔ اگرچہ اس وقت ایک نارمل فیملی کے لیے ڈیڑھ سو روپے ماہوار زیادہ ہوتے تھے لیکن میں دو جگہ بٹا ہوا تھا اس لیے مجھے ساتھ ساتھ اور کام بھی کرنے پڑتے تھے۔ کہیں تو میں پروف ریڈنگ کرتا تھا اور کہیں قطعہ نویسی۔ اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے کام میں نے کیے۔ جبکہ احمد راہی مزے میں تھا۔ یہاں اس کے بھائی بھی تھے اور والدین بھی جبکہ وہ اکیلا آدمی تھا۔ اس کی تھوڑے سے پیسوں میں گزر بسر ہو جاتی تھی۔

اس زمانے میں احمد راہی ''سویرا'' کے ایڈیٹر اور نیا ادارہ کے مالک چودھری نذیر کے ساتھ بھی مل کر کچھ کام کرتے تھے جہاں سے بھی انہیں تھوڑے بہت پیسے مل جاتے تھے اور انہیں معاش کا کوئی غم نہیں تھا اور نہ ہی کوئی ذمہ داری تھی۔ اس طرح وقت گزر رہا تھا۔

احمد راہی کے اور میرے تعلقات ہمیشہ بہت خوشگوار چلے لیکن پھر ایسا وقت آیا کہ میرے اور راہی کے درمیان ناچاقی ہوگئی۔ ناچاقی کا مطلب صرف اتنا ہی تھا کہ ہم ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے تھے۔ یہ سلسلہ کوئی چار پانچ سال تک رہا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے اور اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ ہم جب بھی کبھی لاہور سے باہر کسی مشاعرے یا کانفرنس میں جاتے تو ریلوے سٹیشن پر پہنچ کر ہم سفر بن جاتے تھے۔ اگر دس آدمی جا رہے ہوتے تو آٹھ ایک طرف ہوتے اور ہم دونوں ریلوے سٹیشن سے اکٹھے ہو کر روانہ ہوتے اور اس شہر میں بھی جہاں ہم گئے ہوتے ایک ساتھ رہتے اور واپسی پر بھی ایک ساتھ ہی آتے لیکن جب لاہور ریلوے سٹیشن پر اترتے تھے تو وہ اپنے گھر چلا جاتا تھا اور میں اپنے گھر اور پھر سے ہماری ناراضگی شروع ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد بول چال بند ہو جاتی تھی اور یہ سلسلہ کوئی پانچ سال تک رہا۔

اس کے بعد کچھ اسے عقل آئی اور کچھ مجھے عقل آئی اور ہم پھر سے قریب آئے۔ آج کل پھر وہی صورت ہے کہ ہم بہت اچھے دوست ہیں۔ احمد راہی بھی میرے ان دوستوں میں سے ہے جسے میں تو کہہ کر بلاتا ہوں اور جو مجھے تو کہہ کر بلاتا ہے۔ خدا کرے کہ احمد راہی سدا خوش وخرم رہے۔ وہ بہت نیک دل اور اچھی طبیعت کا مالک ہے۔ اچھا شاعر ہے اور دوستوں کے کام آنے والا ہے۔

میرزا ادیب

میرزا ادیب ہمارے سینئر دوستوں میں سے ہیں۔ وہ بہت سادہ طبیعت کے مالک ہیں سادہ طبیعت کے یوں رہ گئے کہ شروع ہی سے انہیں وسیع محفلیں نہیں مل پائیں اور وہ گھر سے گھر اور گھر سے دفتر تک کے معمول میں رہے۔ ہر چند کہ ان کی بڑے معرکے کی تصانیف آئیں جنہوں نے انہیں شہرت دوام دی۔ میرزا صاحب کے ''صحرا نورد کے خطوط'' خاص طور پر ان کی شہرت کا باعث بنے لیکن سماجی طور پر وہ ہمیشہ پیچھے ہی رہے اور محفلوں میں وہ پیچھے بنچوں پر بیٹھنے والے لوگوں میں سے تھے۔ ایک تو یہ کہ انہیں جو اچھی محفلیں نصیب نہ ہوئیں اس کی وجہ سے انہیں اوروں پر خرچ کرنا اور خود پر خرچ کروانا نہیں آیا۔ حتیٰ کہ جب میری اور ان کی ''ادب لطیف'' کی ادارت کے زمانے میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے اس وقت تک چائے نہیں پی ہوئی تھی۔

چائے کی سب سے پہلی پیالی میں نے میرزا صاحب کو غالباً نظام ہوٹل میں پیش کی اور یہ چائے ایسی تھی کہ دودھ کی بھری ہوئی پیالی میں انہیں چائے کے چند قطرے ڈال کر میں نے چائے پیش کی اور یہ چائے انہوں نے نوش کی۔ لیکن اس کے بعد بھی اب تک ان کی چائے کے ساتھ رغبت نہیں ہو سکی کیونکہ ان کے گھر میں چائے کا چلن تھا ہی نہیں۔

میرزا صاحب کی زندگی میں شریف آدمیوں کی طرح نہ تو تحریریں اور نہ ہی عملی طور پر بیوی کے علاوہ کسی دوسری عورت کا سراغ ملتا ہے۔ اور نہ ہی وہ ایسے دوستوں میں اٹھے بیٹھے جن کی دنیا رومان کی دنیا ہو۔ اس لیے میرزا صاحب اس معاملے میں بہت ہی سادہ رہے۔

اور بعض دوست ان کی اس سادگی سے کبھی کبھی فائدہ بھی اٹھاتے رہے۔ اور دوستوں کو چھوڑیئے میں اپنا ہی ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

میری ایک خاتون سے دوستی تھی۔ گفتگو کے لیے اس دن اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو کوئی جگہ ذہن میں نہ آئی۔ اس خاتون کے ساتھ مدت کے بعد میری ملاقات ہورہی تھی۔ میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے اس خاتون سے کہا کہ ہم جس جگہ اب جائیں گے ان صاحب کا نام میرزا ادیب ہے اور وہ ''ادب لطیف'' کے ایڈیٹر ہیں۔ اور ان کی کتاب ''صحرانورد کے خطوط'' بہت مشہور رہی ہے۔ وہاں جاکر تم نے بس اس کتاب کی تعریف کرنی ہے اور کہنا ہے کہ میں نے یہ کتاب پڑھی ہے اور بہت خوبصورت کتاب ہے۔ اور تعریف کے ساتھ میرزا صاحب سے پوچھنا ہے کہ اب آپ کا تازہ مضامین یا افسانوں کا مجموعہ کب آرہا ہے۔ میں نے اس خاتون سے کہا کہ تمہیں بس اتنا ہی بولنا ہے باقی باتیں میں خود کرلوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

میں نے میرزا صاحب کو پہلے فون کیا اور کہا کہ آپ کی ایک مداح خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں اور وہ اس وقت میرے ساتھ آپ کے پاس آرہی ہیں۔ میرزا صاحب نے بڑی بے چینی سے پوچھا کہ خاتون کون ہیں۔ میرزا صاحب عورت کا نام سن کر ہمیشہ اس طرح بے چینی سے بات کرتے تھے میں نے کہا کہ وہیں آکر آپ کو بتاتا ہوں۔ ہم وہاں پہنچے تو اس خاتون نے جیسے میں نے اسے پٹی پڑھائی تھی باتیں کیں اور کہا کہ میں آپ کی مداح ہوں پھر میرزا ادیب کے مجموعوں کے بارے میں بات کی تو میرزا صاحب کہنے لگے کہ بیٹھئے میں آپ کو ابھی اپنے نئے مجموعے لاکر دیتا ہوں۔ چنانچہ وہ ''ادب لطیف'' کے دفتر سے اٹھ کر ساتھ ہی مکتبہ اُردو سے جاکر کوئی پانچ منٹ میں دو کتابیں لے آئے اور ان پر خاتون کا نام لکھ کر انہیں بڑے ادب سے پیش کیں۔ اس کے علاوہ وہ حسب معمول میرے لیے اس خاتون کے لیے اور اپنے لیے دودھ لائے اور ہم نے مل کر وہ دودھ پیا۔

پھر میں نے کہا کہ میرزا صاحب آپ کام کیجئے۔ ان کا قلم سے تعلق ہے میں اس ساتھ والے کمرے میں بیٹھ کر انہیں کچھ ڈائیلاگ یاد کرواتا ہوں۔ ہمیں کوئی ایک دو گھنٹے

لگیں گے۔ میرزا صاحب کہنے لگے کہ ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ اطمینان سے ڈائیلاگ یاد کیجئے۔ چنانچہ ہم دوسرے کمرے میں جا کر ڈائیلاگ یاد کرتے رہے اور میرزا صاحب اپنے کام میں لگے رہے۔ اور میرزا صاحب کو آج تک شاید اصل بات معلوم نہ ہوئی ہو بلکہ اب تو وہ یہ بات بھول بھی چکے ہوں گے کہ ان کی سادگی سے میں نے فائدہ اٹھایا۔ اس طرح کچھ اور لوگوں کی بھی میرزا صاحب کے بارے میں ایسی داستانیں ہیں جن کے داستان گو شاید کبھی خود یہ داستانیں سنائیں۔

جس زمانے میں' میں اور میرزا صاحب ''ادب لطیف'' کے ایڈیٹر تھے تو ہم نے سالنامہ نمبر نکالنے کا سوچا۔ یہ غالباً ۱۹۴۹ء کی بات ہے۔ اس زمانے میں سیدھے سادے رسالے چھپتے تھے اور تصویریں بہت کم ہوتی تھیں اور پھر جو تصویریں چھپتی بھی تھیں وہ سولو سائز کی ہوتی تھیں۔ میں نے تجویز پیش کی کہ ہم تصویروں کے گروپس لارنس گارڈن میں جا کر بنوائیں اور وہ چھاپیں تو ذرا جدت پیدا ہو جائے گی۔ چنانچہ پرچے کے مالک چودھری برکت علی صاحب سے ہم نے بات کی۔ وہ پانچ وقت کے نمازی تھے لیکن بہت پروگریسو تھے۔ اور جدید ذہن رکھنے والے تھے اور جب بھی انہیں کوئی نئی بات کہی جاتی تو وہ مان لیتے تھے۔ اسی وجہ سے ''ادب لطیف'' کی پالیسی بھی پروگریسو تھی۔ وہ ہمیشہ پروگریسو لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور ان کی خدمت بھی کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے یہ تجویز سن کر کہا کہ یہ تو بڑی اچھی تجویز ہے اور اس سے پرچہ بڑا دلکش بن جائے گا۔ چنانچہ لاہور میں جتنے ادیب موجود تھے انہیں ہم نے اطلاع دی کہ فلاں دن اور فلاں وقت لارنس گارڈن میں اکٹھے ہو جائیں جہاں سب کا گروپ فوٹو ہوگا۔

اس زمانے میں پرچے کا ٹائٹل آذر ذوبی لاہور میں ہوتے تھے انہوں نے بنایا۔ انہوں نے ایسا عمدہ ٹائٹل بنایا کہ اگر آج بھی ''ادب لطیف'' کی پرانی فائلیں دیکھی جائیں تو وہ ٹائٹل سب سے اچھا رہے گا۔ سالنامے کے بعد وہ ٹائٹل رنگ بدل بدل کر مستقل چھپتا رہا تصویریں کھنچوانے والوں میں اس وقت سب نوجوان تھے اور ان میں سے ایک تصویر میں ایوب سرور دلیپ کمار کے بڑے بھائی تھے۔ یہ جتنے بھائی تھے انہیں ایوب سرور کنٹرول

کرتے تھے والد کا سارا کاروبار اور کاروبار کا سارا انتظام انہی کے ہاتھ میں تھا۔ ایوب سرور اس طرف آ گئے تھے اور ان کے بھائی ناصر خان بھی پاکستان میں آ گئے تھے اور ان کا یہیں اپنا کاروبار کرنے کا ارادہ تھا لیکن یہ دونوں کسی وجہ سے یہاں نہیں رہ سکے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ یہاں کا ماحول انہیں سوٹ نہیں کرتا تو وہ واپس انڈیا چلے گئے تھے۔

وہ تصویر ادیبوں کے ساتھ ایوب سرور کی ''ادب لطیف'' میں چھپی۔ پچھلے دنوں جب دلیپ کمار یہاں آئے تو کسی نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ ان کے بھائی ایوب سرور کی تصویریں یہاں موجود ہیں۔ میں نے دلیپ کمار کو فیض صاحب کی بیٹی کے گھر بتایا کہ ایوب سرور صاحب کا ایک گروپ فوٹو ہے۔ دلیپ صاحب ایوب سرور سے بے پناہ پیار کرتے تھے کیونکہ وہ بڑے شفیق تھے۔ لیکن دلیپ صاحب سے جس دن بات ہوئی وہ ان کا لاہور سے رخصت ہونے کا آخری دن تھا۔

میں دلیپ صاحب سے اس گروپ فوٹو کا تذکرہ تو کر بیٹھا اور وہ گروپ فوٹو میرے پاس تھا بھی لیکن گھر آ کر دیکھا تو ساری کتابیں بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھیں کیونکہ ان دنوں گھر میں سفیدی ہو رہی تھی۔ میں نے بہت کوشش کی اور آخر ادب لطیف کا وہ سالنامہ نکل آیا جس میں وہ تصویر چھپی تھی۔ اس میں دو گروپوں میں ایوب سرور کی تصویر تھی۔

میری دلیپ صاحب سے اس روز ملاقات نہ ہو سکی لیکن میں نے پارسل بنا کر ان کے ہوٹل میں یہ سالنامہ چھوڑا۔ میرا خیال ہے کہ یہ سالنامہ اور اس میں چھپی ہوئی تصویر ان کے لیے اپنے بھائی کی طرف سے ایک یادگار تحفہ ہوگا۔

اب یہاں ایوب سرور کے فن کے بارے میں بھی کچھ بات ہو جائے۔

ایوب سرور کا ایک افسانہ تھا جس کا عنوان تھا ''اللہ اکبر''۔ وہ طنزیہ افسانے لکھتے تھے۔ اس افسانے کی کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک کلرک اپنی تھوڑی تنخواہ اور زیادہ اخراجات سے بہت ستایا ہوا ہے۔ مہینے کے آخری دن وہ دفتر سے گھر آ رہا تھا تو راستے میں اذان ہوئی اور اللہ اکبر کی آواز آئی۔ وہ مغموم تو پہلے ہی تھا اس لیے اس نے سوچا کہ میں جا کر اللہ کے حضور سجدہ کروں اور دعا مانگوں تاکہ میری مشکلیں آسان ہوں۔ چنانچہ اس نے سائیکل

باہر کھڑی کی اور خود بڑے خلوص سے مسجد کے اندر داخل ہوا۔ وضو کر کے اس نے نماز ادا کی اور نماز کے بعد اللہ سے دعا کی کہ یا اللہ میری مشکلیں آسان کر اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے دل پر جو غم کا بوجھ تھا وہ اتر گیا ہے اور اس کی دعائیں قبول ہوگئی ہیں۔ وہ بڑا خوش خوش باہر نکلا تو دیکھا کہ سائیکل غائب تھی۔

ایوب سرور اس طرح کے افسانے لکھتے تھے اور افسانے کے آخری جملے میں آ کر سسپنس کھولتے تھے۔ میرے ان سے یہاں اس لیے سب سے زیادہ تعلقات تھے کہ وہ تنہائی پسند تھے اور ان میں قنوطیت نہیں تھی۔ جو باقیوں میں ہوا کرتی ہے۔ لوگ عام طور پر ایسے لوگوں سے ملنا جلنا پسند کرتے ہیں۔ جو کھل کر رومانس کی باتیں کرتے ہیں یا خوش گپیاں کرتے ہیں جبکہ ایوب سرور میں ایسی بات نہیں تھی اس کی خوبی ہی یہ تھی کہ وہ شخص فنکار ہے اور اس کی خاموشی میں ایک دلربائی تھی۔ اس لیے میری اکثر اوقات ملاقات رہتی تھی۔ لکھنے لکھانے والوں کو یہ بھی شوق ہوتا ہے کہ کوئی انہیں آگے بڑھائے اور ان کی اہمیت کو اجاگر کرے۔ میں نے یہ کام تھوڑا بہت ان کے لیے کیا تھا۔ اور ایسے گروپ میں جہاں چراغ حسن حسرت، صوفی تبسم، عابد علی عابد اور ابراہیم جلیس وغیرہ شامل تھے میں نے انہیں وہاں متعارف کروایا۔ ایوب سرور کو احساس تھا کہ میں اس سلسلے میں ان کے ساتھ تعاون کر رہا ہوں۔ اس لیے ان کے مجھ سے زیادہ مراسم تھے۔ جب وہ یہاں سے جانے لگے تو مجھے کہنے لگے کہ یہ ٹھیک ہے کہ وطن وطن ہوتا ہے لیکن یہاں کے حالات فن اور قلم دونوں کے لیے ہی ٹھیک نہیں ہیں۔ اس لیے اگر ہو سکے تو آپ بھی وہاں چلے آیئے۔

یہی چیزیں ساحر بھی پہلے مجھے کہہ چکا تھا۔ اس لیے ان سے میرا پروگرام یہ بنا کہ میں وہاں کچھ دیر کے لیے آؤں گا اور سال چھ مہینے ممبئی میں رہ کر کام کروں گا اور اگر دل لگا تو وہاں رک جاؤں گا ورنہ آپ کی طرح میں بھی واپسی اختیار کروں گا۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔ کیونکہ ایوب سرور وہاں جا کر قبل از وقت ہی فوت ہو گئے۔ شاید انہیں کچھ بیماریاں بھی تھیں جن کا انہوں نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔

دو بڑے صدمے

زندگی میں ایک مرحلہ مجھ پر ایک بار پھر پوری شدت سے حملہ آور ہوا لیکن قدرت نے مجھے حسب دستور بچا لیا۔ میں اس خاتون کی ایک لمبی داستان بیان کر چکا ہوں جس کا نام چندر کانتا تھا۔ وہ پارٹیشن سے قبل مجھ سے وابستہ ہوئیں اور پارٹیشن کے بعد میری اور ان کی علیحدگی ہوگئی۔ علیحدگی کی یوں تو کئی وجوہات تھیں۔ ان میں چندر کانتا کے خواب امارت کا چکنا چور ہو جانا بھی شامل تھا جو میری اس زمانے کی بیروزگاری کی وجہ سے تھا۔ لیکن اس کی مجھ سے علیحدگی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کا مطالبہ تھا کہ میں اپنی پہلی بیوی سے علیحدگی اختیار کرلوں جو مجھے منظور نہیں تھا۔ اگر آپ یہ بنیادی بات ذہن میں رکھیں گے تو آپ کو میرے اگلے امتحان کا پتہ چل جائے گا۔

یہ واقعہ ۱۹۴۸ء کے آخر کا ہے جبکہ ہماری علیحدگی ہو چکی تھی اور اس کے بعد اس خاتون نے ایک اور صاحب سے شادی کرلی جو اس سے عمر میں زیادہ بڑے تھے لیکن امیر تھے۔ مجھ سے علیحدگی کے تقریباً دس سال بعد مجھے اس خاتون کا پیغام آیا کہ بہت ضروری کام ہے اور میں ملنا چاہتی ہوں۔ علیحدگی کے بعد سرِ راہے ہماری کبھی ملاقات ہو جاتی تھی لیکن ہم راستہ بدل جاتے تھے۔ اس پیغام کے آنے کے بعد ہم ملے۔ یہ ملاقات ان کی ایک سہیلی کی معرفت ہوئی۔

انہوں نے اپنے آپ کو بہت ہی مظلوم اور غمزدہ ظاہر کر کے کہا کہ وہاں میرا گزر نہیں ہے۔ اور پہلے تو مجھے معاف کریں کہ مجھ سے غلطی ہوئی اور ہم علیحدہ ہوئے۔ مجھے تو اب

صبر آ چکا تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کا ایک بار پھر مجھے ملنا مجھے اپنی جگہ سے ہلا گیا۔ چندر کانتا نے تجویز یہ پیش کی کہ ہم ممبئی چلے چلتے ہیں۔ اس نے کہا کہ میرے پاس لاکھوں روپے کے زیورات ہیں اور نقدی بھی بہت ہے۔ ہم وہاں چلے چلتے ہیں۔ وہاں فلم انڈسٹری میں آپ کا نام بھی ہے اور آپ بھی وہاں ٹھیک رہیں گے اور میں بھی۔ اور اس طرح میں اس بوڑھے آدمی سے بھی جان چھڑا لوں گی وہ ایک خوبصورت آدمی تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آئی کہ کیوں وہ اس سے جان چھڑانا چاہتی ہے۔

ایک بار تو میں چکرایا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا اور میں نے اسے کہا کہ کانتا بات یہ ہے کہ ہماری علیحدگی پہلے بھی اسی بنا پر ہوئی تھی کہ میں اپنی بیوی سے علیحدہ نہیں ہو سکتا اور اب جبکہ اس نیک بخت نے تمام برے دن اور یہ سوتن کے دکھ والے تمام دن بھی میرے ساتھ گزار لئے ہیں اور میری بہت سی کمزوریوں کا ساتھ بھی دیا ہے اب یہ کہاں واجب ہے کہ میں پھر تمہارا مطالبہ مان کر اسے راستے میں چھوڑ کر تمہارے ساتھ ممبئی چلا چلوں اور وہ بھی محض اس لیے کہ وہاں میرے لیے پیسہ ہے اور تمہارا ساتھ ہے۔ اور تمہارے پاس جو پیسہ ہے وہ مجھے مل جائیگا چنانچہ میں نے اس کی پیشکش ٹھکرا دی۔ وہ روئی دھوئی بھی لیکن قدرت نے مجھے اس امتحان سے بچا لیا۔

۱۹۸۳ء میں چندر کانتا کا لاہور میں ہی میں انتقال ہوا تو میں نے اپنی بیوی کو اس کی موت کا بتایا اور کہا کہ دیکھتا ہوں اب اس کا ردعمل کیا ہے۔ میری بیوی نے یہ خبر سنتے ہی کہا کہ چلو اب اس کا جھگڑا بھی ختم ہوا۔ لیکن ساتھ ہی کہنے لگی کہ آہ بیچاری، اس کا یہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ پہلے تو میری بیوی میں ایک سوت جاگی جس نے موت کی خبر سن کر سکھ کا سانس لیا لیکن اس کے بعد اس کے اندر کی عورت جاگی اور دکھ کیا کہ یہاں اس کا کوئی بھی نہیں تھا اور بیچاری مر گئی۔ میں نے چند لمحوں کے اندر اپنی بیوی میں عورت کے جو روپ دیکھے اس میں میں نے دیکھا کہ سوت سے ایک عورت کا مرتبہ بلند ہے۔

صدمے انسان کی زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں اسی طرح خوشیاں بھی آتی ہی رہتی ہیں انسان خوشیاں بھی بھول جاتا ہے اور صدمے بھی بھول جاتا ہے۔ ان میں سے دو

صدمے ایسے ہیں جو آج تک اس طرح تر و تازہ ہیں جس طرح روز اول ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وقت کا گرد و غبار اس کے چہرے کو تھوڑا بہت بدل دیتا ہے لیکن وہ دھول ذرا سی اترے تو غموں کا چہرہ پھر سے سامنے آ جاتا ہے۔

ان میں پہلا دکھ جو میرے لیے انتہائی اذیت ناک تھا وہ میری بیٹی مسرت کا سماعت سے محروم ہونا تھا اور دوسرا دکھ میری بہن کا اچانک انتقال کر جانا تھا۔

میری بیٹی مسرت اس وقت دسویں جماعت میں پڑھ رہی تھی اور رسالہ ''ہدایت'' وغیرہ میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی لکھتی تھی اور مجھے یوں نظر آ رہا تھا کہ یہ بڑی ہو کر ایک اچھی افسانہ نگار بنے گی۔ وہ بہت زندہ دل اور بڑی اچھی باتیں کرنے والی تھی۔ پھر سکول میں بھی ایک اچھی طالبہ کے طور پر مشہور تھی ہم اس وقت مصری شاہ میں رہتے تھے۔ میں کسی مشاعرے کے سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا واپس آیا تو پتہ چلا کہ میری بیٹی کو بخار ہوا ہے اور ڈاکٹر صلاح الدین اکبر جو ہمارے فیملی ڈاکٹر ہونے کے علاوہ افسانہ نویس بھی تھے اور میرے دوست بھی تھے وہ گھر پر ہی ان کے زیر علاج تھی۔

میں جب پہنچا تو بیٹی نے مجھے بتایا کہ ابا میں سن نہیں سکتی۔ مجھے فوراً تشویش ہوئی۔ میں نے فوراً ڈاکٹر کو بلایا اور کہا کہ آپ تو بخار کا علاج کر رہے ہیں لیکن یہ تو سن نہیں سکتی۔ وہ کہنے لگے کہ اسے تو گردن توڑ بخار ہو گیا ہے۔ اس لیے فوراً اسے ہسپتال پہنچانے کی کوشش کریں۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں نے فوراً اسے ہسپتال پہنچایا۔

ان دنوں انڈیا سے شاعروں کی ایک ٹیم آئی ہوئی تھی اور دوسرے دن میرے گھر پر ان کی دعوت تھی۔ وہ تقریباً بیس آدمی تھے۔ بیٹی کو ہسپتال میں داخل کروا دیا تھا اور گھر پر کوئی بھی نہیں تھا۔ ہسپتال میں میری بیٹی کی ریڑھ کی ہڈی سے پانی نکالا گیا لیکن اس کی سماعت واپس نہیں آئی بلکہ ابھی تک نہیں آئی۔ ادھر مہمانوں کا معاملہ یہ تھا کہ دعوت اسی طرح دیں۔ اگرچہ میری بیوی ہسپتال میں تھی لیکن میں نے بازار سے کچھ چیزیں لا کر وہ دعوت کی۔

میری بیٹی کئی دنوں تک ہسپتال میں رہی۔ اس کی جان تو بچ گئی لیکن اس کی سماعت نہ

لوٹ سکی۔ ہم اسے واپس گھر میں لے آئے اور اپنے آپ کو جھوٹی تسلیاں دے کر علاج کرواتے رہے۔ اس کے بعد وہ ذرا سنبھلی۔ اسے پڑھنے کا شوق تھا لیکن سن نہیں سکتی تھی۔ اس کے باوجود اس نے فرسٹ ایئر کا امتحان دیا اور امتحان پاس کرلیا۔ پھر سیکنڈ ایئر میں داخل ہوئی لیکن آدمی اتنی ذہانت کہاں سے لائے کہ سن بھی نہ سکے اور امتحان پاس کرتا چلا جائے۔ وہ سیکنڈ ایئر میں فیل ہوگئی۔ اور ہمارے سامنے اس کے علاج ہی کا مسئلہ تھا۔ میں اس کے لیے مارا مارا پھرا اور جہاں کا پتہ چلتا وہاں علاج کروایا۔ ممبئی میں بھی گئے۔ اور وہاں کے سب سے بڑے ہومیو پیتھک ڈاکٹر کے پاس بھی گئے۔ کہتے سبھی تھے کہ ہومیوپیتھی میں اس کا علاج ہے لیکن وہ ٹھیک نہ ہوئی۔ جمیل الدین عالی اس کی بیماری کا کیس لے کر ہاورڈ یونیورسٹی بھی گئے، وہاں بورڈ بیٹھا لیکن انہوں نے بتایا کہ جہاں آواز بنتی ہے ان خلیوں کو پھر سے زندہ کرنے کا ابھی تک کوئی طریقہ دریافت نہیں ہوا۔ اور ہر تیسرے سال وہاں میٹنگ ہوتی تھی جس میں نئے تجربات پر بحث ہوتی تھی لیکن اس سال بھی وہاں پر جو میٹنگ ہوئی اس میٹنگ تک اس قسم کی بیماری کا کوئی علاج نہیں تھا۔

اس کے بعد اس کی شادی کا مرحلہ آ گیا۔ اب اچھی خاصی لڑکیوں کو بھی مناسب رشتے نہیں ملتے۔ اس لیے میں سوچتا تھا کہ یہ ایک معذور لڑکی ہے اس کا کیا بنے گا۔ اس ضمن میں ایک باپ کو جو پریشانی ہوسکتی ہے وہ مجھے تھی۔ اگر وہ پیدائشی طور پر ہی نہ سن سکتی تو اسے صبر آجاتا لیکن جس نے سولہ یا سترہ سال کی عمر تک سنا ہو اس کے لیے اچانک سماعت کھو بیٹھنا کتنا عذاب ناک تھا۔ وہ شاعری سنتی تھی اور اسے موسیقی سے بھی گہرا شغف تھا۔ لطیفے بازی بھی گھر میں کرتی تھی لیکن جب یہ سب کچھ ہوگیا تو جو اس پر بیتی تھی اس سے زیادہ ہم پر بیت رہی تھی۔

شادی کا مسئلہ درپیش ہوا تو کچھ رشتے آئے بھی لیکن وہ ناپسندیدہ رشتے تھے۔ میری اس بیٹی کا موجودہ شوہر اور میرا بیٹا آپس میں قریبی دوست تھے۔ گھروں میں آنا جانا تھا اور جب میری بیٹی آٹھویں یا نویں جماعت میں پڑھتی تھی تو میرے اس داماد کی ماں نے اس وقت میری بیوی سے اس کے رشتے کی بات چلائی تھی۔ اور ان کی آپس میں کچھ ابتدائی

بات ہو بھی گئی تھی۔ اب میرا بیٹا اور داماد دونوں گلاسگو جا چکے تھے۔ اور میرے ذہن میں بھی نہیں تھا کہ وہ پرانی بات دوبارہ کس طرح چلے گی۔ اسی لیے ہم بھی نئے رشتوں پر توجہ دیتے رہے۔

اس دوران میرے سمدھی گھر پر آئے اور کہا کہ ہم نے اس وقت شادی کی بات کی تھی جو کسی حد تک چلی بھی تھی۔ کہنے لگے کہ آپ اس بات کو آگے بڑھائیے۔ اندر سے خوشی بھی ہوئی لیکن وسوسے بھی بڑھے کہ اس شادی کا کیا بنے گا۔ ممکن ہے کہ یہ چاہتے ہوں لیکن لڑکا نہ چاہتا ہو۔ چنانچہ میں نے کہا کہ آپ لڑکے سے پہلے پوچھیں۔ لڑکے نے خط لکھا کہ وہ بھی یہیں شادی چاہتا ہے۔ میں نے پھر اسے خط لکھا اور کہا کہ بیٹے ہوسکتا ہے کہ تم نے جذباتی ہو کر یہ فیصلہ کیا ہو اور اس امید پر کیا ہو کہ یہ پھر سے سننے لگے گی تو یہ میں بتادوں کہ ہم دنیا بھر میں اس کے علاج کی کوشش کر چکے ہیں اور کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر تم بھی انگلینڈ میں بیٹھے ہو۔ ڈاکٹروں سے پوچھ لو بظاہر اس کا علاج ممکن نہیں۔ یہ اب زندگی میں کبھی نہیں سنے گی اس کے باوجود چاہتے ہو تو سو بار سوچ لو۔ چونکہ پہلے سے بات ہو چکی ہے اور اگر تم نے چاہا تو ہم اس مسئلے کو فوقیت دیں گے کیونکہ میری بیوی نے پہلے کچھ ہاں بھی کہی ہوئی ہے۔

اس کے بعد ہم نے یہ شادی طے کی۔ اللہ کا فضل ہے کہ اب اس کا ایک جوان بیٹا اور ایک جوان بیٹی ہے۔ اور ان کا گلاسگو میں اچھا خاصا سٹور ہے۔ دونوں بچے مل کر وہ دوکان چلاتے ہیں۔ ان کے اور ورکر بھی وہاں کام کرتے ہیں۔ اور میری بیٹی کی زندگی ایک نارمل انسان کی طرح ہے لیکن جب بھی مجھے وہ وقت یاد آتا ہے جب اس نے کہا تھا کہ ابا میں سن نہیں سکتی تو میں اداس ہو جاتا ہوں۔ اب اس میں تھوڑی سی تبدیلی آئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ تھوڑی سی چڑچڑی ہوگئی ہے اور اسے غلط یا صحیح کسی بات کا پتہ چلے تو وہ مشتعل ہو جاتی ہے۔ باقی کی سب خوبیاں اس میں اب بھی وہی ہیں جو بیماری سے پہلے کی تھیں۔ وہ بہت محنتی اور لحاظ والی ہے۔ ہمارے رشتہ داروں، دوستوں اور ملنے جلنے والوں کی عزت کرنے والی ہے۔ اپنے شوہر کی ہمدرد ہے اور اتنا ہے کہ شوہر کو جائیداد بنانے میں زیادہ

دلچسپی نہیں لیکن میری بیٹی نے کوشش کر کے لاہور میں تین مکان بنائے اور یہ اس کی کوشش سے بنے۔ جو کچھ بھی پس انداز کیا اس نے کیا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ وہ اپنے گھر کی طرف توجہ دیتی ہے۔ بعض لڑکیاں اپنے ماں باپ کی بھلائی سوچتی ہیں لیکن اس نے ساری توجہ اپنے گھر پر دی ہے اور خدا کا شکر ہے کہ یہ الزام ہم پر نہیں آیا۔ وہ جب بھی سوچتی ہے اپنے گھر اور شوہر کا سوچتی ہے۔ وہ خوشحال زندگی گزار رہی ہے۔ لیکن اس کی سماعت کھو جانے کا صدمہ اب بھی اپنی جگہ ہے۔

جب وہ تصویر میرے سامنے آتی ہے تو میں چکرا جاتا ہوں اور اس دن سے آج تک میری دعا میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اب بھی میں ہر رات سونے سے پہلے اللہ سے دعا مانگتا ہوں کہ یا اللہ اسے سماعت دے۔ وہ بے نیاز ہے۔ خیال آتا ہے کہ ممکن ہے کہ وہ کسی وقت میری دعا سن لے۔ اور اس بیماری کا کسی وقت کوئی علاج آ جائے۔

دوسرا صدمہ میری بہن کے سلسلے میں ہے۔ ہم دو بھائی ہیں اور ایک بہن تھی۔ جو مجھ سے چھوٹی تھی اور بھائی اس سے چھوٹا ہے۔ بہنیں تو سب کو پیاری ہوتی ہیں اور ویسے بھی بہنیں بھائیوں پر جان دیتی ہیں۔ لیکن میری یہ بہن اتنی اچھی تھی کہ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا میں کسی بہن نے اپنے بھائی کو اتنا پیار نہیں دیا ہوگا جتنا پیار میری بہن نے مجھ پر نچھاور کیا ہر چند کہ اس کے جواب میں میں نے بھی اس پر محبتیں نچھاور کیں لیکن ان کا موازنہ اس کے پیار سے نہیں کیا جا سکتا۔

وہ مانسہرہ میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کا شوہر کچھ میرے مزاج کے خلاف تھا اور اس کی عادتیں بھی کچھ الگ سی تھیں۔ لیکن میری بہن کوشش کرتی تھی کہ وہ میرے اور شوہر کے درمیان میں پل بنی رہی اور اگر کوئی بوجھ آنے لگتا تو وہ اسے بڑے سلیقے سے دور کر دیتی تھی اور مجھے پتہ ہے کہ اسے خود بھی اپنے شوہر سے شکایتیں تھیں لیکن اس نے کبھی اپنی شکایتوں سے پردہ نہیں اٹھایا تھا۔ اور بظاہر وہ شوہر کی طرف سے مطمئن زندگی گزار رہی تھی۔ ویسے مانسہرہ میں اس کے جو سسرال تھے ان سب میں اس نے جتنی عزت پائی وہ کم عورتوں نے ہی پائی ہوگی۔ اس سے بڑی عمر کی عورتیں بھی اسے ماں کہتی تھیں۔ اس کی اتنی

عزت تھی۔ وہ سب کے کام آتی تھی اور میاں کی آمدن کو اتنے سلیقے سے خرچ کرتی تھی کہ دور بیٹھے ہوئے لوگوں کو اس کے شوہر کی آمدن چار گنا زیادہ نظر آتی تھی۔ اس کا خرچ اور تواضع کا انداز ہی کچھ ایسا تھا۔

مدت سے اسے ایک مرض چلا آ رہا تھا۔ اس کے پہلو میں درد ہوتا تھا اور اسے بلڈ پریشر بھی تھا۔ پھر پتہ چلا کہ اسے گردے کی تکلیف ہے۔ میں نے اپنے بہنوئی سے پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ علاج کروا رہے ہیں۔ بہن بھی کہتی تھی کہ علاج ہو رہا ہے۔ اصل میں اس کا علاج ناکافی ہو رہا تھا اور یہ علاج بھی مضافات کے ان ڈاکٹروں سے ہو رہا تھا جنہیں زیادہ علم نہیں تھا وہ درد کم کرنے کی دوا دے دیتے تھے جس سے عارضی طور پر درد کم ہو جاتا تھا۔ لیکن اس طرح کی درد ختم کرنے والی دوائیں گردے ہی کو زیادہ نقصان پہنچاتی ہیں۔

پچھلے ہی دنوں ڈاکٹر فتح مجھے کہہ رہے تھے کہ آپ بروفین یا انڈوسین زیادہ نہ کھائیں کیونکہ یہ گردے میں ہلکی سی خرابی پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ ایک طرف تو کچھ آرام آتا ہے لیکن دوسری طرف ایک اور بیماری بننی شروع ہو جاتی ہے۔ میری بہن کا علاج بھی اسی طرح کا ہو رہا تھا۔ اور آخر پتہ چلا کہ اس کی تکلیف بہت بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ اسے لاہور میں لایا گیا اور اس کا علاج شروع ہوا۔

امریکہ سے واپسی پر میں انگلینڈ ٹھہرا ہوا تھا جہاں مجھے پتہ چلا کہ بہن کو تکلیف زیادہ ہے اور وہ آپریشن کروانا چاہتی ہے۔ اور میرے انتظار میں بیٹھی ہے کہ بھائی واپس آئے گا تو پھر آپریشن کرواؤں گی۔ چنانچہ میں انگلینڈ سے فوراً واپس آیا اور آپریشن کی تیاری شروع ہوئی۔ ڈاکٹر گردیزی اعلیٰ درجے کے سرجن ہیں اور ان کی قابلیت میں کوئی شبہ نہیں۔ وہ میرے دوست بھی ہیں اور ان سے بہت قریبی تعلقات بھی ہیں۔ انہوں نے میری بہن کو داخل کیا۔ اس وقت اسے گردے کے درد کے علاوہ کوئی خرابی نہیں تھی اور وہ بالکل تندرست تھی اور گردے کا آپریشن بھی ڈاکٹر گردیزی جیسے آدمی کے سامنے کوئی چیز نہیں تھی۔

بہن بھی خوشی خوشی داخل ہوئی اور اسے کوئی ڈر نہیں تھا۔ جب وہ آپریشن تھیٹر گئی تو ایک بار پھر واپس آئی اور کچھ اور چیزیں لے کر گئی۔ لیکن آپریشن میں جتنا وقت لگتا ہے

جب اس سے زیادہ وقت گزر گیا تو مجھے تشویش ہوگئی۔ جب وقت دوگنا گزر گیا تو گردیزی صاحب تھوڑی دیر کے لیے باہر آئے اور کہا کہ گھبرائیے نہیں تھوڑی سی الجھن ہے۔ ہم اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد آپریشن ختم ہوا اور اسے سٹریچر پر ڈال کر باہر لایا گیا اس وقت وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھی۔ جب وہ کمرے میں لائی گئی اور اسے بستر پر سیدھا لٹا دیا گیا تو اس کے باوجود وہ کہہ رہی تھی کہ مجھے سیدھا لٹا دو۔ اس سے ہم نے اندازہ کیا کہ اس کے جسم کے نچلے آدھے حصے میں فالج ہو چکا ہے۔ ایسے موقعوں پر دعائیں ہی کی جاسکتی ہیں۔

میں گردیزی صاحب کے پاس گیا تو وہ کہنے لگے کہ جہاں پیار ہوتا ہے قدرت وہیں ستم ظریفی کرتی ہے۔ کیس بگڑ چکا ہے ہمیں پتہ نہیں تھا کہ اس کے آپریشن کے دوران اس کا بلڈ پریشر اتنا بلند ہو جائے گا۔ جب ہم نے گردے کو چھیڑا تو بلڈ پریشر اتنا اونچا چلا گیا کہ مشکل ہوئی اور اب ہماری یہ بیٹی خطرے میں ہے۔ میں نے سمجھا کہ خطرہ ایسا بھی ہوسکتا ہے جس سے نکلا بھی جاسکتا ہے۔ چنانچہ میں نے پوچھا کہ اسے کس حد تک خطرہ ہے تو وہ کہنے لگے کہ موت بھی واقع ہوسکتی ہے۔

ڈاکٹر گردیزی کے یہ الفاظ سن کر مجھے اتنا دکھ ہوا کہ میں سوچتا ہوں کہ وہ ناگہانی جملہ سن کر میں کیسے بچ گیا کہ مجھے فالج کیوں نہیں ہوگیا۔ میں ان کا یہ جملہ سن کر بری طرح چکرا گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ وہ اچھی خاصی تندرست تھی اور ہم اس کی اچھائی کے لیے اسے یہاں لے کر آئے اور اس کے ساتھ ہی نہیں بلکہ ہمارے ساتھ بھی کیا ہوگیا۔

میری یہ بہن پڑھی لکھی ہوئی نہیں تھی۔ بس گھریلو شدبد تھی لیکن معاملہ فہم، مہمان نواز تھی اور اس میں وہ سب خوبیاں تھیں جو کہ ایک اچھی خاتون میں ہوسکتی ہیں۔ ایک بار جو بھی اسے مل لیتا تھا وہ اس کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ میرا یہ عالم تھا کہ اگر کبھی گھریلو معاملات میں میں غصے پر آجاتا تھا تو وہی صرف ایک ایسی شخصیت تھی جو مجھے راہ راست پر لاسکتی تھی۔ کوئی معاملہ بھی ہوتا جب وہ کوئی رائے دے دیتی تو میں سمجھتا تھا کہ یہ رائے بالکل ٹھیک ہے اور وہ رائے ہوتی بھی ٹھیک تھی اور اس کی رائے سننے کے بعد میں اپنے لیے یہ

فرض سمجھتا تھا کہ اسے مان لوں۔ چنانچہ مجھ سے چھوٹی ہونے کے باوجود وہ یوں تھی جیسے گھر کا ایک بزرگ ہو۔

نیم بے ہوشی میں بھی وہ مجھے قریب بلاتی تھی اور میرا ہاتھ چومتی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کا پوچھا جس کو میں نے گھر بھیج دیا تھا۔ کیونکہ وہ رات کا جاگا ہوا تھا۔ جب اس نے اس کے بارے میں پوچھا تو میں نے کہا کہ میں نے اسے آرام کرنے کے لیے بھیج دیا ہے۔ یہ سن کر اسے بہت اطمینان ہوا۔ اسے پتہ تھا کہ میں اس سے تھوڑا سا کھچا ہوا رہتا ہوں اور اس نے کہا کہ کہیں اس کی دل آزاری نہیں ہو میں نے کہا کہ نہیں اسے میں نے آرام کے لیے بھیجا ہے۔ یعنی اسے اس وقت بھی شوہر کا اتنا خیال تھا۔

اس وقت اس کے آپریشن کو بائیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں نے کہا کہ میں گھر سے ہو کر پھر آتا ہوں۔ میں جب گھر پہنچا تو اس وقت ہی فون آیا کہ آپ فوراً آجایئے میں نے پوچھا کہ خیریت ہے تو کوئی جواب نہ ملا۔ ہسپتال پہنچا تو آگے اس کی نعش پڑی ہوئی تھی۔ یہ ایک جیتی جاگتی نعش تھی۔ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ قدرت ایسی ستم ظریفیاں کیوں کرتی ہے۔

یہ صدمہ ایسا تھا کہ اب اسے تقریباً دو سال گزر گئے ہیں لیکن یہ اب بھی اسی طرح تازہ ہے۔ میں نے اپنی بیٹی اور بہن کے لیے جو نظمیں کہی ہیں میں خود وہ نہیں پڑھ سکتا۔ عام قاری تو وہ نظمیں پڑھ لیتا ہے لیکن جب وہ نظمیں میں پڑھتا ہوں تو میرے سامنے ان نظموں کے پورے پس منظر آجاتے ہیں اور یہ پڑھتے ہوئے میں اپنے آپ پر کنٹرول نہیں کرسکتا اور رو دیتا ہوں۔

بہن کی محبت کا یہ عالم ہے کہ جب میں بیمار ہوا کرتا تھا تو اپنی بہن کو یاد کیا کرتا تھا۔ ایک بار مجھے سخت بخار ہوا۔ بخار کوئی ایک سو چار درجے تھا اور میں حسب معمول رو کر اسے یاد کر رہا تھا۔ میری بیوی نے فوراً نسمرہ فون کیا۔ رات کو میری بہن وہاں سے چلی۔ اور اگلی صبح وہ یہاں پہنچی۔ میں اس وقت باتھ روم میں شیو کر رہا تھا۔ اس نے باہر ہی سے رونا شروع کر دیا وہ اندر آئی تو میں باتھ روم سے باہر نکلا اور ہنسنے لگا۔

حالانکہ میں اس وقت ٹھیک ہو چکا تھا لیکن اس نے اگلے روز صدقہ دیا۔

عالمی لیڈروں سے ملاقاتیں

زندگی میں انسان لوگوں سے ملتا رہتا ہے۔ ملاقاتوں کو بھلا دیتا ہے اور کچھ ملاقاتیں یاد بھی رہ جاتی ہیں۔ یاد رہنے کا معاملہ یہ ہے کہ یہ کوئی شعوری کوشش نہیں ہوتی بلکہ بعض یادگاروں کے نقوش اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ وہ ذہن میں اپنی جگہ خود بنا لیتے ہیں۔ بعض ملاقاتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ جنہیں یاد رکھنے کی کوشش بھی کی جائے تو وہ کچھ عرصے کے بعد ذہن سے نکل جاتی ہیں۔ گویا یہ اختیاری فعل نہیں ہے۔ یہ ملاقات کی نوعیت پر منحصر ہے کہ وہ ملاقات دائمی یادگار کی حیثیت لے لیتی ہے یا چند روز کے بعد بھول جاتی ہے۔

کچھ ملاقاتیں جو بڑے لوگوں سے ہوئیں پہلے میں ان کا ذکر کروں گا۔ ان میں سے ایک ملاقات چواین لائی سے ہوئی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اتنے بڑے ملک کا سربراہ لاہور آیا تو دوسرے کئی لوگوں سے ہٹ کر مجھے ان مخصوص لوگوں میں کھڑا کیا گیا جن سے چواین لائی نے ہاتھ ملایا۔ میں نے اس پر ایک نظم بھی کہی تھی جس کا مفہوم یہی تھا کہ وزیراعظم چواین لائی نے میرے ساتھ جو ہاتھ ملایا اس سے ان کی قوم، ملک اور نظریے کی خوشبو جو میرے ہاتھ تک پہنچی وہ میرے مسامات میں رچ گئی۔ اور میں اب تک اس خوشبو کو اپنے جسم میں محسوس کرتا ہوں۔

اس ملاقات کا معاملہ مختصراً یہ ہے کہ ہم لوگوں نے یہاں ایک نغمہ چینی زبان میں تیار کیا تاکہ ہم اپنے مہمان کو چینی زبان ہی میں خوش آمدید کہہ سکیں۔ چنانچہ ہم نے ایک اُردو نغمے کا چینی زبان میں ترجمہ کروایا۔ یہ لاہور میں مقیم کچھ چینی افراد کو بلا کر یہ ترجمہ کروایا تھا۔

میوزک ڈائریکٹر چشتی کی سرکردگی میں یہاں کی گانے والی عورتوں کو پوری طرح ریہرسل کروائی گئی اور ریہرسل کروانے کے بعد پھر ان چینی حضرات کو یہ گیت کئی بار سنایا گیا۔ انہوں نے اطمینان کا اظہار کیا اور آخر وہ گھڑیاں آئیں جب ہم نے اس گیت کو سٹیج کیا۔

پہلی قطار میں مہمان بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ حکومت کے لوگ بیٹھے تھے جبکہ ہم اپنی مناسب جگہوں پر بیٹھے تھے۔ یہ نظم جب گائی گئی تو سب نے سن کر پرزور تالیاں بجائیں۔ اور چواین لائی نے بھی تالیاں بجائیں۔ ہم بہت خوش تھے کہ ہم ان تک جو بات پہنچانا چاہتے تھے وہ پہنچ گئی اور انہوں نے خوشنودی کا اظہار کیا۔ پروگرام ختم ہوا تو ہم ان کے سامنے گئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ بہت خوبصورت گانا تھا یہ کس زبان میں تھا؟ ہمارے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے کہ ہوا کیا ہے۔ ہم نے تو چینی زبان میں یہ گیت ترجمہ کروایا تھا اور انہیں زبان کی سمجھ بھی نہ آئی اور انہوں نے داد بھی دی۔

اس روز ایک بار پھر یہ چیز میرے ذہن میں راسخ ہوگئی کہ کسی زبان کا لہجہ اختیار کرنا بہت مشکل کام ہے۔ جن لوگوں نے یہ گانا پاس کیا تھا وہ دراصل کسی دوسری نسل کے چینی تھے اور پھر مدتوں سے لاہور میں رہ رہے تھے۔ چنانچہ چینی زبان کے بارے میں ان کا فرمایا ہوا مستند نہیں تھا۔ تاہم یہ ملاقات ایک یادگار ملاقات تھی جسے میں اب تک زندگی کا ایک خوشگوار واقعہ تصور کرتا ہوں اور اس پر فخر کرتا ہوں کہ اتنے بڑے ملک کے سربراہ سے میں نے ہاتھ ملایا اور گویا ہاتھ ملا کر ان جذبات کا اظہار خاموشی کی زبان میں اور مداح ہونے کی زبان میں کیا جو میں اس ملک کے لیے رکھتا ہوں۔

ادب اور تاریخ میں ایران کا ذکر جس خوبصورت طریقے سے آیا ہوا ہے۔ اور اس کے زعماء اور ان کا کردار جس خوبصورت اور درخشاں طریقے سے بیان کیا گیا ہے کہ آج تک فارسی ادب سے اُردو ادب پوری طرح متاثر ہے۔ ہم جب شیخ سعدی کو لیتے ہیں تو ہمارا پورا معاشرہ کئی سو سال سے اب تک اس رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا ہے۔ اور اب تک حوالوں کے طور پر سعدی کی حکایات اور اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ شیخ سعدی کی نعت کے چار مصرعے تو لافانی ہیں کہ:

ہ بَلَغَ الْعُلٰی بِکَمَالِہٖ
کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِہٖ

سعدی کی دوسری چیزیں بھی ہم لیتے ہیں۔ اسی طرح فردوسی کا شاہنامہ اور اس کے کردار بھی بہت نمایاں ہیں۔ پھر جب محمود غزنوی کے قصہ سے لے کر دوسرے بادشاہوں کی داستانیں سنتے سنتے شاہ ایران تک پہنچتے ہیں تو اس وقت بھی ہمیں شاہ کی مخصوص مصلحتوں کے تحت اڑھائی ہزار سالہ پرانی شہنشائیت دکھائی دیتی ہے جو کہ زرِ کثیر صرف کر کے دنیا بھر کے سامنے لائی گئی۔ اور اس پر فخر کیا گیا۔ ہمیں اب بھی یاد ہے کہ جب شاہ ایران نے اپنی تقریر میں اپنے جدامجد کو شاہ شاہان کے نام سے مخاطب کیا اور اس پر فخر کیا تو کچھ حیرت ہوئی۔ ماضی میں چلے جائیں تو یہ قابل فخر بات معلوم ہوتی ہے لیکن اس زمانے میں یہ کوئی قابل فخر بات نہیں ہے۔ جیسا کہ شاہ فاروق نے کہا تھا کہ دنیا میں پانچ بادشاہ باقی رہ جائیں گے ان میں سے چار تاش کے بادشاہ ہوں گے اور پانچواں برطانیہ کا بادشاہ ہوگا۔ چنانچہ حریت پسند اور جمہوریت پسند لوگوں نے شہنشاہ ایران کے اس فعل کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا تھا لیکن پروٹوکول کے طور پر دنیا بھر کی حکومتوں نے شاہ ایران کا ساتھ دیا۔ اور ایران کی بے پناہ دولت میں سے یہ دولت تقسیم کی گئی اور یہ تقریبات دنیا بھر میں منائی گئیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ شاید شہنشاہ ایران کے تحت الشعور کی کوئی آواز ہو کہ بادشاہت اب تھوڑے ہی دنوں کی مہمان ہے اس لیے جتنے جشن ہو سکتے ہیں منالو یا پھر اسلاف کا رعب دے کر لوگوں کو یہ باور کرایا جائے کہ بادشاہوں نے ان کے لیے سب کچھ کیا اور یہ سلطنت تمہارے لیے حاصل کر کے دی جسے لے کر ہم یہاں تک آئے ہیں اور اب میں ظل الٰہی ہوں اور تم پر خدا کا سایہ ہوں۔ جس طرح ہمارے بزرگوں نے تمہارے لیے یہ وطن حاصل کیا اور تمہیں اتنی بڑی سلطنت دی۔ اب ان کا وارث میں ہوں۔ اس لیے میرا احترام کرو۔ گویا اڑھائی ہزار سالہ شہنشاہیت کا دنیا بھر میں جو جشن منایا گیا اس میں شاہ ایران کی اپنی بقا کے سامان تھے۔ یہی ایران کی مختصر سی داستان ہے جس کے پس منظر میں شاہ ایران نے

اس وقت پاکستان سے اچھے تعلقات پیدا کئے جب جنرل ایوب خان یہاں کے صدر تھے۔ وہ ایوب کو اپنے بڑے بھائیوں کی طرح مانتے تھے۔

جب شہنشاہ ایران یہاں آئے تو یونیورسٹی کے بڑے ہال میں ان کے استقبال کا انتظام کیا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کرسی پر بیٹھتے وقت شہنشاہ ایران نے صدر ایوب کو تعظیم دی۔ ان کے مشرقی آداب یا ذاتی اوصاف تھے جس نے مجھے متاثر کیا۔ ہال میں داخل ہونے سے پہلے جو لوگ ان سے ہاتھ ملانے کے لئے V.I.P کے طور پر کھڑے تھے ان میں سے ایک میں بھی تھا۔

صدر ایوب سے اس سے پہلے میری دو ملاقاتیں ہو چکی تھیں اور وہ مجھے پہچانتے تھے۔ جب شہنشاہ ایران ہاتھ ملا رہے تھے تو ان کے ساتھ ساتھ صدر ایوب بھی تھے۔ جب شہنشاہ ایران مجھ تک پہنچے تو صدر ایوب ایک منٹ کے لیے میرے پاس رکے اور کہا کہ کیوں بھئی غزلیں وغیرہ ہو رہی ہیں۔ ان کا لہجہ وہی فوجی تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے شہنشاہ ایران سے انگریزی زبان میں کہا کہ یہ یہاں کا شاعر ہے۔ شہنشاہ ایران نے میرے ساتھ گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور پھر کہا:

How do you do?

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے۔ ان سے میری ملاقات ہاتھ ملانے اور اس ایک جملہ کے تبادلے سے آگے نہیں بڑھی لیکن میں نے دیکھا کہ شہنشاہ کا چہرا کھلا ہوا تھا۔ وہ ایک دراز قد آدمی تھے، خوبصورت، خوش پوش اور خوش آواز تھے اور یوں لگ رہا تھا کہ وہ پاکستان میں لوگوں سے ایسے مل رہے ہیں جیسے وہ اپنے ملک کے لوگوں سے مل رہے ہوں۔ ان کی شخصیت متاثر کرنے والی تھی۔ میں نے اس کے بعد ہال میں ان کی تقریر بھی سنی۔

اس کے تھوڑے برسوں بعد ہی ایسی باتیں سننے میں آئیں کہ تیل کے معاملے میں پاکستان کے ساتھ گھپلا ہو رہا ہے اور شاہ ایران دوستی اس لیے بڑھا رہے ہیں کہ پاکستان کے تیل کے ذخائر کی سودے بازی کر لیں۔ اس کے بعد ان کے خلاف انقلابی سلسلہ بھی چلا اور وہ شاہ ایران جو بہت مضبوط نظر آ رہے تھے اور جو مشرق میں امریکی مفادات کے

نگہدار بھی تھے اور لگتا تھا کہ وہ اپنی بے پناہ دولت اور امریکی قوت کے بل بوتے پر ہر طوفان پر قابو پالیں گے لیکن ہوا یہ کہ ایک جلاوطن مولوی جو بعد میں امام خمینی کے نام سے مشہور ہوئے انہوں نے ایران سے باہر رہ کر شاہ کے خلاف انقلاب برپا کیا۔ اور ہم نے نیوز کی فلموں میں دیکھا کہ لوگ بازار میں نصب کئے ہوئے خیابانِ پہلوی کے بت کو گرا رہے تھے۔

کہاں وہ اڑھائی ہزار سالہ شہنشاہیت کا غلغلہ جو شاہ ایران نے دنیا میں مچایا اور کہاں یہ کہ ان کے اپنے ہی ملک میں ان کے مجسمے گرائے گئے۔ ان کے خاندان کی تذلیل کی گئی اور ان کے جرنیلوں کو دار پر چڑھایا گیا۔ اس بادشاہ کا انجام یہ ہوا کہ وہ امریکہ جس کے لیے شہنشاہ ایران نے بدنامیاں لیں، جب اس بادشاہ پر زوال آیا تو امریکہ نے اتنا بھی نہیں کہا کہ اس کو اپنے ملک کی شہریت ہی دے دے۔ شہریت تو درکنار امریکہ نے اسے پناہ بھی نہ دی۔ اور آخر مصریوں کی مہربانی سے انہوں نے زندگی کے کچھ دن گزارے اور وہیں دفن ہوئے۔

اللہ بس باقی ہوس۔

شہنشاہ ایران کے زوال کے بعد امام خمینی کی اور بھی بہت سی فتوحات ہیں۔ ان سب سے بڑی فتح تو بلاشبہ یہی تھی کہ انہوں نے ایک ناقابل شکست بادشاہ کو اس کی سرزمین پر شکست دی اور اسے وہاں سے باہر نکال دیا۔ اس کے بعد امریکہ کو اس ملک نے جو اخلاقی شکستیں دیں ان کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ امریکی یرغمالیوں کا واقعہ ہمارے سامنے ہے۔ امریکہ سے جب گزارشات اور دھمکیوں سے کچھ نہ بنا تو امریکہ نے اپنے کمانڈو بھیجے تاکہ یرغمالیوں کو رہا کرا سکیں۔ ظاہر ہے کہ امریکہ کے کمانڈو دنیا کے دوسرے ممالک کی نسبت زیادہ تربیت یافتہ تھے لیکن ایران کے ریتلے ماحول نے ان کے جہازوں میں خرابیاں پیدا کردیں اور کمانڈوز اپنے یرغمالیوں کو رہا نہ کرا سکے۔ اور دنیا بھر میں امریکہ کو ایران کے مقابلے میں ذلیل ہونا پڑا۔

دوسری طرف امام خمینی کے ماننے والوں کا ایمان اور پختہ ہوگیا۔ امریکہ کے سلسلے

میں حالات کی ستم ظریفی پر ان میں سے کسی کی نظر نہ پہنچی اور لوگوں نے اسے بھی امام خمینی کا ایک معجزہ قرار دیا اور اس کا اثر یہ پڑا کہ ان کی قوم کا یہ عقیدہ ہو گیا کہ امام خمینی میں غیبی اور روحانی قوتیں ہیں اور ان کا ملک ان کی وجہ سے ہی ناقابل شکست بنا ہوا ہے۔ جس طرح امریکہ کے جہازوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اسی طرح سب کچھ معجزاتی طور پر ہوتا چلا جائے گا۔

اس یقین نے ایران کے لوگوں میں ایک نئی قوت پیدا کر دی۔ عقیدہ ہمیشہ ہی انسان میں قوت پیدا کرتا ہے۔ یہ غلط ہو یا صحیح بہرحال بڑے کام کی چیز ہے۔ اور بلاشبہ عقیدہ انسان کو بھیڑ یئے سے شیر بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ایرانی قوم امریکہ سے لڑتی رہی۔ اگر روس درمیان میں آیا تو اس کے آگے بھی نہ جھکی اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ ایران کی عراق کے ساتھ جنگ چھڑ گئی اور جنگ انتہائی طویل ہوتی گئی۔

اس دوران ایران صلح کی ہر کوشش اور اقوام متحدہ کی ہر قرارداد کو مسترد کرتا رہا اور کہا کہ ہم آخری فتح تک لڑیں گے۔ ایران کی طرف سے یہ اعلان اسی معجزاتی تصور کا نتیجہ تھا لیکن آخر کب تک وہ لڑتے رہتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ معجزے پیغمبروں کے ساتھ ختم ہو چکے ہیں۔ اور اب تو یہ ہے کہ قوت ایمان ضرور ایک چیز ہے لیکن وہ بھی اس صورت میں زیادہ کام آتی ہے جب اسلحہ ساتھ ہو۔ ایران اور عراق کی جنگ میں دونوں طرف ہی مسلمان تھے۔ ایران والوں کی طرح عراق والے بھی دعویٰ کر سکتے تھے کہ ہمارے پاس بھی قوت ایمانی ہے۔ اسلحہ بھی ان کے پاس تھا نتیجہ یہ نکلا کہ سات آٹھ سال کی جنگ میں دونوں ملک تباہ ہوئے اور عالم اسلام کو اتنا نقصان دشمنوں نے نہیں پہنچایا تھا جتنا اس جنگ نے پہنچایا۔ بالآخر جو بھی ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔

اس دوران ایران کے صدر خامنہ ای لاہور آئے اور شالامار باغ میں انہیں استقبالیہ دیا گیا۔ میری ہمیشہ یہ خوش قسمتی رہی ہے کہ ہر بڑے آدمی کے آنے پر مجھے وہ مقام مل جاتا تھا جو نمایاں شہریوں کو V.I.P کے طور پر حاصل ہوتا ہے۔ میں بھی شالیمار میں اس قطار میں کھڑا تھا جس میں کھڑے شہریوں سے ایران کے صدر ہاتھ ملا رہے تھے۔ مجھے بھی ان

کے ساتھ ہاتھ ملانے کا موقع ملا اور حقیقت یہ ہے کہ ان سے ہاتھ ملا کر بھی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں ایک بڑے آدمی سے ہاتھ ملا رہا ہوں۔

میں نے دیکھا کہ ان کا ایک بازو بیکار تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہی حال چینی وزیراعظم چواین لائی کا بھی تھا۔ ان کا بھی ایک ہاتھ بیکار تھا۔ لیکن جو جذبہ کمیونزم کے لیے چواین لائی کا تھا وہی جذبہ اسلام کے لیے خامنہ ای کا تھا۔ میں نے دل سے ان کی عزت کی اور فخر کیا کہ ان سے ہاتھ ملایا۔

جنگ نہ بند کرنے کی ایرانی ہٹ دھرمی کا اندر ہی اندر سے مجھے ملال تھا۔ میں بھی مانتا ہوں کہ اس جنگ میں جارح عراق ہے لیکن اگر وہ اڑا ہوا ہے کہ میں اپنے آپ کو جارح نہیں مانتا تو اس کا حل یہ نہیں ہے کہ آپس میں لڑتے ہی رہیں۔ فتح اور شکست تو قدرت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ہم نے اس کا احتمال سامنے کیوں نہیں رکھا کہ اس لڑائی میں ایران بھی ہار سکتا ہے۔ یہ بھی اللہ کا شکر ہے کہ دونوں مسلم ممالک میں سے ہارا بھی کوئی نہیں اور جیت بھی کسی کی نہیں ہوئی۔ اور ایک مرحلے پر آ کر ایران اپنے اس مطالبے سے ہٹ گیا کہ عراق اپنے آپ کو جارح مانے۔ حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ اب جنگ بند ہو چکی ہے اور ایک دوسرے کے قیدیوں کے بارے میں بات چیت ہو چکی ہے اور امید ہے کہ باقی مسائل بھی جلد حل ہو جائیں گے۔ خدا کرے کہ ان دو اسلامی قوتوں میں جو اقتصادی، عسکری اور دیگر خلا پیدا ہو چکے ہیں وہ پر ہوں اور جو طاقت ایک دوسرے کے خلاف لڑنے پر صرف ہو رہی ہے وہ کسی ایسی طاقت کے خلاف استعمال ہو جس سے عالم اسلام کی بہتری ہو۔

افغانستان کا نام جب آتا ہے تو سب سے پہلے پرانے لوگوں یا تاریخ جاننے والے کے ذہن میں غازی امان اللہ خان کا نام آتا ہے۔ یہ وہ بدنصیب ملک ہے کہ جہاں ملائیت کا زور عروج پر تھا اور جب کوئی نئی بات ہوئی ملا سامنے آ گئے اور انہوں نے امن و امان کو تہ و بالا کر دیا۔ امان اللہ خان اور ان کی ملکہ ثریا نئے خیالات کے لوگ تھے اور چاہتے تھے کہ کابل کو ترقی کے راستے پر ڈالیں اور دقیانوسی نظام کو ختم کریں لیکن چونکہ امان اللہ خان

برطانیہ کے مخالف تھے اور برطانیہ انہیں پسند نہیں کرتا تھا اس لیے اسی ایک نکتہ پر ملائیت نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ اس زمانے کے وہاں کے ایک نامور عالم دین ملا شور بازار نے لوگوں کے جذبات کو بھڑکایا۔ انہوں نے ملکہ ثریا کی کچھ ننگی تصویریں بنوا کر چھپوا دیں۔ مسلمان ایسی چیزوں سے فوراً بھڑ کتے ہیں۔ اگر اصلیت ہو تو بھڑک جانا درست بھی ہے۔ لیکن ملکہ ثریا کے خلاف یہ سب کچھ برطانیہ کے کہنے پر فوٹو ٹرک سے کام لے کر کیا گیا۔ اس طرح امان اللہ خان کا تختہ الٹ دیا گیا اور بچہ سقہ کے نام سے ایک عام سا آدمی جو غالباً ماشکی تھا برسر اقتدار آ گیا۔

افغانستان جب لٹ رہا تھا تو جیسے طالع آزما آ کر قبضہ کر لیتے ہیں اس طرح اس نے آ کر حکومت پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور اس نے لوگوں پر بہت ظلم و ستم جاری کیا اور نادر شاہ نے آ کر لوگوں کو اس کے ظلم و ستم سے نجات دلوائی۔ تاریخ آگے چلی اور بالآخر ظاہر شاہ کا زمانہ آیا۔ افغانستان کے عوام میں قدامت پرستی کے باوجود وہاں کے حکمرانوں میں یہ خوبی تھی کہ وہ فنون لطیفہ، اور خاص طور پر موسیقی کے بڑے رسیا تھے بلکہ سرپرست تھے۔ ہر سال وہاں جو جشن استقلال منایا جاتا تھا اس میں پاکستان اور ہندوستان سے کلاسیکل اور غزل گانے والے اچھے گویے بلوائے جاتے تھے اور ہر چند کہ وہاں کی زبان ہندی یا اُردو نہیں تھی، وہ ان کی آواز سے لطف اندوز ہوتے تھے اور حکمران طبقہ یہ زبانیں جانتا تھا بلکہ وہ موسیقی کی تھیوری سے بھی واقف تھے اور ممکن ہے کہ انہیں عملی طور پر بھی اس سے کچھ واقفیت ہو۔

اس اعتبار سے میرا بہت جی چاہتا تھا کہ میں بھی افغانستان جاؤں۔ میاں سید رسول میرے دوستوں میں سے ہیں۔ وہ پشتو کے نامور لکھاری ہیں۔ وہ اب ریٹائر ہو چکے ہیں لیکن میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں اس زمانے میں وہ وہاں پریس اٹیچی تھے۔ انہوں نے کئی بار مجھے کابل لے جانے کے لیے کہا بھی لیکن شاید قدرت کو منظور نہیں تھا۔ میں نے کئی بار تیاری بھی کی لیکن کابل نہ جا سکا۔ انہوں نے وہاں سے میرے لیے قراقلی ٹوپی بنوا کر بھیجی اور ساتھ یہ پیغام بھی بھیجا کہ یہ ٹوپی جس کابل کی بنی ہوئی ہے میں آپ کو وہاں

کے لیے بلوا رہا ہوں۔ ایک بار آپ وہاں آ جائیں۔ میں اگر یہاں نہ رہا تو پھر مجھے بھی افسوس ہوگا اور آپ کو بھی۔

میں وہاں نہ جا سکا۔ لیکن وہاں کے حکمران اور عوام سے مجھے ایک گونہ دلچسپی اس لیے پیدا ہوئی کہ وہ موسیقی سے شغف رکھتے تھے۔ اور جو موسیقی سے شغف رکھتا ہے وہ عام طور پر شعر سے بھی ضرور شغف رکھتا ہے۔ میں تو ہر اس شخص کی عزت کرتا ہوں جو کسی بھی فن لطیف کی سرپرستی کرے یا اسے اپنائے یا اس کے فن کاروں کے سر پر ہاتھ رکھے۔ چنانچہ افغانستان میں وہاں کے بادشاہ سے ملنے کی خلش دل میں تھی کہ اچانک شاہ ظاہر شاہ لاہور کے دورے پر آئے۔

شالیمار باغ ایک خوش نصیب باغ ہے جس میں مغلیہ خاندان کے شہزادوں اور شہزادیوں کے بعد جب بھی کوئی بیرونی حکمران لاہور آتا ہے تو اس کے قدم اس باغ تک پہنچتے ہیں۔ چنانچہ ظاہر شاہ کو بھی اس باغ میں استقبالیہ دیا گیا۔ اور حسب معمول میں بھی ان لوگوں میں شامل تھا جنہیں ان سے ہاتھ ملانے کا موقع ملا۔ ظاہر شاہ کے ساتھ ایک تو لاہور کے میئر تھے دوسرے صوبائی حکومت کے کچھ عہدیداران تھے۔

جب انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا تو میں نے یہ جملہ کہا کہ مجھے آپ سے افغانستان میں ملنے کا شوق تھا لیکن یہاں پر ملاقات ہوئی، چلیے یہ بھی میری خوش قسمتی ہے۔ مترجم نے جب ظاہر شاہ کو یہ بات بتائی تو تھوڑا مسکرائے اور پھر آگے چل دیئے۔

مجھے بادشاہوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کیونکہ بادشاہ بادشاہ ہی ہوتا ہے اور اس کے بعد کے حالات نے بھی مجھے بتایا کہ میں بادشاہت کو قبول نہیں کرتا لیکن اس بادشاہ سے مل کر مجھے اس لیے خوشی ہوئی کہ یہ موسیقی کا رسیا تھا۔ اگر دیکھا جائے تو تاریخ میں ہمیں ایسے بادشاہ بھی نظر آتے ہیں کہ اگر ان کا نام لیا جائے تو مسلمان لاٹھی لے کر پیچھے پڑ جاتے ہیں لیکن ان بادشاہوں نے موسیقی کا قتل عام کیا۔ ان بادشاہوں کی اور بھی خوبیاں ہوں گی لیکن مجھے یہ بات پسند نہیں کہ کسی آرٹ پر حملہ کیا جائے اور اسے ملیامیٹ کیا جائے۔

ظاہر شاہ اب بادشاہ نہیں ہے۔ لیکن میرے منہ سے اب بھی ان کے لیے دعا نکلتی

ہے کیونکہ بادشاہ تو اب چلا گیا ہے لیکن وہ آدمی اب بھی زندہ ہے جو موسیقی کی سرپرستی کرتا ہے۔ خدا انہیں اس حال میں زیادہ خوش رکھے۔

پنڈت نہرو سے ملاقات کے تاثرات تو میں پہلے عرض کر چکا ہوں لیکن ان کے بعد جو وزیراعظم ہوئے وہ لال بہادر شاستری تھے ان کے ساتھ میری ملاقات اس وقت نہیں ہوئی جب یہ وزیراعظم تھے بلکہ اس سے پہلے ہوئی جب یہ مرکزی وزیر تھے۔ دہلی میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ انڈیا میں عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ مشاعرے کی صدارت سربراہ حکومت یا کسی وزیر یا کسی بڑے صاحب ذوق شخص کو دی جاتی ہے۔ چنانچہ اس انڈو پاک مشاعرے کی صدارت کے لیے لال بہادر شاستری کو بلوایا گیا تھا۔

مشاعرہ شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے ان سے ہماری فرداً فرداً ملاقات کروائی گئی۔ وہ چھوٹے سے جسم کے مالک تھے اور نازک سی آواز تھی۔ مگر ان کی بات چیت سے میرا یہ تاثر ہے کہ وہ فارسی سے شناسا ہیں۔ انہوں نے اس وقت جو ایک آدھ شعر پڑھا اس سے میرا یہی اندازہ ہے کہ وہ فارسی پڑھے ہوئے تھے۔ انہوں نے تعارف کے وقت سب شعراء سے دو دو منٹ گفتگو بھی کی۔ پھر جب مشاعرے میں آئے تو انہوں نے سنجیدہ رہ کر داد دی۔ وہ سر کی ہلکی سی جنبش سے داد دیتے تھے اور منہ سے نہیں بولتے تھے۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ بھی نہیں آتی تھی۔ حتیٰ کہ جب مزاحیہ شاعروں نے اپنا کلام سنایا اور سارا پنڈال قہقہوں سے گونج رہا تھا اس وقت بھی ان کے چہرے پر محض بشاشت آتی تھی اور وہ ہنستے نہیں تھے۔ وہ اسی طرح آخر تک بیٹھے رہے۔ یہ پتہ چل رہا تھا کہ وہ مشاعرے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

ہمارے مزاحیہ شاعروں میں سید محمد جعفری اور ظریف جبل پوری تھے۔ ادھر سے بھی کچھ مزاحیہ شاعر شریک تھے۔ انہوں نے ان سب شاعروں کو بھی ہنس کر نہیں بلکہ سر کی جنبش سے داد دی۔

اس مشاعرے کا ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔ حفیظ جالندھری جو ہمارے بزرگ شاعر تھے وہ ایک طرح سے مشاعرے میں شاعروں کے صدر بھی تھے۔ ان کی عادت تھی

کہ وہ کلام سنانے کے ساتھ ساتھ تقریر بھی کر جاتے تھے۔ اور جملہ بازی بھی کر جاتے تھے اسی طرح وہ صاحب صدر یا ہال میں موجود کسی بھی شخص کو مخاطب کر کے بھی بات کہہ لیتے تھے۔ انہوں نے مناسب سمجھا کہ مشاعرے کے صدر لال بہادر شاستری سے تھوڑی سی بے تکلفی کریں۔ چنانچہ باتیں کرتے کرتے وہ کہنے لگے کہ یار شاستری! سنو یہاں ایسے شعر نصیب نہیں ہوئے ہوں گے۔

اس جملے پر شاستری صاحب نے صرف آنکھیں حفیظ صاحب کی طرف کر کے دیکھا اور کوئی ردعمل نہیں دیا۔ لیکن حفیظ صاحب نے دیکھ لیا کہ ان کی آنکھوں میں کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے تو پبلک کی طرف مخاطب ہو کر شعر سنایا اور پھر صاحب صدر کی طرف منہ کر کے انہیں جناب شاستری صاحب کہہ کر مخاطب کیا۔ اس وقت شاستری صاحب کے چہرے پر بشاشت آئی اور انہوں نے سر ہلا کر کہا کہ ارشاد فرمائیے۔

میں نے اتنا بلیغ خاموشی والا آدمی زندگی میں نہیں دیکھا۔ خاموش رہ کر باتیں کرنے والا چہرہ شاستری کا تھا۔

حفیظ صاحب کا واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے پہلے جملے میں گستاخانہ انداز اختیار کیا تھا اور وہاں کے ایک معزز شخص کو یار شاستری کہہ کر مخاطب کیا جس سے کہ ان کی بے تکلفی بھی نہیں تھی۔ کوئی اور شخص ہوتا تو اس کے چہرے پر ناگواری کی شکنیں آتیں لیکن شاستری صاحب نے اپنی خاموشی سے اور صرف حفیظ صاحب کی طرف دیکھ کر ہی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا۔ اور جب اگلی بار حفیظ صاحب نے کہا کہ جناب شاستری صاحب! شعر ملاحظہ فرمائیے تو انہوں نے اپنے چہرے کے تاثر دیتے ہی پچھلے غصے کو بھلا دینے کا اظہار کر دیا۔

چنانچہ شاستری صاحب سے میری صرف اتنی سی ملاقات ہے لیکن اس ملاقات کے دوران میں ان کی غصے اور راضی ہونے کے تاثرات کو آج تک نہیں بھلا سکا۔

بڑی پاکستانی شخصیات سے ملاقاتیں

میں جب انڈیا جاتا ہوں تو عام طور پر میرا پروگرام پندرہ دن کا ہوتا ہے لیکن یہ پندرہ دن اکثر دو تین مہینوں پر پھیل جاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہاں میرا حلقہ احباب پاکستان سے کچھ کم نہیں ہے۔ پھر وہاں یہ بھی ہے کہ مشاعروں کی بہتات ہے۔ پاکستان میں تو مارشل لاء کی مہربانی سے فنون لطیفہ پر جو زوال آیا ہے اس کا کیا بیان کیا جائے۔ جبکہ انڈیا میں جمہوریت کی وجہ سے فنون لطیفہ کو جتنا فروغ حاصل ہوا ہے اس کا ہم اپنے ملک سے موازنہ نہیں کر سکتے۔ البتہ اس پر افسوس کر سکتے ہیں۔ یہ اپنا ملک ہے اور اس کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے بھی دل کٹتا ہے۔ آنسو آنکھوں سے جھانکتے ہیں لیکن کیا کیا جائے۔ یہ حقیقت ہے۔ اب الیکشن ہوئے ہیں اور جمہوریت کا دور دورہ ہے اور میں امید کر سکتا ہوں کہ ہمارا کھویا ہوا جمالیاتی وقار ہمیں ملے گا۔ اور فنون لطیفہ کو یہاں بھی فروغ حاصل ہوگا۔ اور ہمارے فنون اپنا کھویا ہوا تشخص دوبارہ حاصل کر لیں گے۔ لیکن پچھلے گیارہ برس میں جو حالت فنون لطیفہ کی ہوئی ہے وہ قابل رحم ہے۔

اس دوران رقص پر مکمل پابندی لگا دی گئی۔ سر پر دوپٹہ اوڑھ کر گانا گانے کا حکم دیا گیا اور مشاعرے صرف مسالمہ، نعت اور چودہ اگست کی حد تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ انہیں ہم مشاعرہ نہیں کہہ سکتے۔ یہ زیادہ سے زیادہ ثواب کی چیز ہے۔ ہم پہلے بھی ثواب حاصل کرتے تھے لیکن اس کا خانہ الگ ہوتا تھا۔ جبکہ مشاعرہ ایک الگ چیز ہے جس میں ہم زندگی کے دوسرے مسائل پر بھی بات کر سکتے تھے۔ ان گیارہ برسوں میں ٹیلیویژن پر کوئی

کھلا مشاعرہ نہیں ہوا۔ اگر کوئی ایک آدھ مشاعرہ ہوا بھی ہو تو میرے علم میں نہیں ہے۔ ٹی۔ وی پر صرف مذہبی تقریبات کے حوالے سے مشاعرے ہوئے۔

اس کے برعکس انڈیا میں مشاعرے ہوتے ہیں اور جب کبھی بھی میں انڈیا گیا ہوں تو مدراس، لکھنؤ، احمد آباد، غرضیکہ ہر طرف مشاعرے ہوتے رہتے ہیں اور مجھے بلوایا بھی جاتا ہے۔ حالانکہ مجھے ویزے کا پرابلم ہوتا ہے۔ پھر میرا چونکہ فلم سے بھی تعلق ہے اس لیے بھی فلمساز مجھے گانے لکھوانے کے لیے روکے رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں مختلف تقاریب بھی ہوتی رہتی ہیں۔ غرضیکہ میں جب بھی انڈیا جاتا ہوں، پندرہ دن کا پروگرام ہونے کے باوجود وہاں تین چار مہینے لگ ہی جاتے ہیں۔

پچھلی بار جب میں انڈیا گیا تو اچانک پتہ چلا کہ ہماری ملکہ ترنم نور جہاں بھی وہاں آئی ہوئی ہیں۔ میں دہلی میں تھا وہاں میرے دوست ساقی صاحب نے مجھے کسی سلسلے میں مدعو کیا۔ میں ان کے ہاں کسی نجی تقریب میں تحفہ ساتھ لے کر پہنچا تو وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر قریب ہی ایک اور تقریب میں چلے گئے جو کسی مرکزی وزیر کے ہاں منعقد ہوئی تھی جو کہ مسلمان تھا۔ مجھے یہ چل گیا تھا کہ ملکہ ترنم بھی یہاں آ رہی ہیں۔

نور جہاں وہاں آئیں تو انہوں نے اپنا گلا باندھا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ انہیں نزلہ ہو گیا ہے اور اس وجہ سے ان کا گلا بند ہے۔ اور وہ بہت تکلیف سے بات کرتی تھیں۔ اس تقریب میں راجیو گاندھی بھی آئے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت وزیراعظم نہیں تھے۔ لیکن بہرحال اندرا گاندھی کے بیٹے تھے اور ان کا اپنا مقام تھا۔ لوگ ان کیلئے نگاہیں فرشِ راہ کئے۔ وہ انتہائی خوبصورت ہیں اور اس زمانے میں ان کے سر پر پورے بال بھی تھے۔

ان مرکزی وزیر نے راجیو گاندھی سے میری ملاقات کروائی اور بتایا کہ یہ پاکستان سے آئے ہوئے شاعر ہیں۔ راجیو صاحب کو کیا معلوم۔ انہیں شعر سے شغف نہیں ہے۔ اور یہ اپنے نانا پنڈت نہرو کے برعکس تھے جن کے گھر میں اُردو بولی جاتی تھی اور جنہیں شعر و ادب سے رغبت تھی اور جن کے جوش سے بھی قریبی تعلقات تھے۔ لیکن راجیو کو سیاست کے سوا اور کسی چیز سے دلچسپی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور

آگے بڑھ گئے۔

وہ نور جہاں سے مل کر جب آگے بڑھے تو نور جہاں نے سرگوشی کے انداز میں کہا کہ مجھے راجیو سے ملوایئے۔ اس کے بعد اس محفل میں انہیں راجیو سے ملوانے کا خصوصی انتظام کیا گیا اور یہ دونوں پاس پاس بیٹھے اور تصاویر اتریں۔ اور ہم وہاں سے کھانا کھا کر چلے آئے۔

خواجہ ناظم الدین اور صدر ایوب کے بارے میں تو میں بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔ بھٹو صاحب کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

ہم نے سنا کہ بھٹو صاحب کو وزارت خارجہ سے معزول کیا گیا ہے۔ اس کے بعد لاہور کے شہریوں نے کارپوریشن کے جناح ہال میں ان کے ساتھ ایک تقریب رکھی۔ یہ ایک محدود سی تقریب تھی اور [illegible] پہلے سے ڈھنڈورا بھی نہیں پیٹا گیا۔ جناح ہال میں گنجائش کے مطابق تقریباً ایک ہزار آدمی موجود تھے۔ وہاں میں نے پہلی بار ان کی تقریر سنی۔ تقریر انگریزی میں تھی اور یہ بڑی روانی سے بول رہے تھے۔

میرا تعلق فلم سے بھی ہے۔ میں ان کے چہرے کے تاثرات اور ان کے ایکشن دیکھ رہا تھا۔ یہ گفتگو تو کر رہے تھے اور گفتگو تو اور لوگ بھی کرتے ہیں لیکن یہ بہت زیادہ متاثر کر رہے تھے اور ان کا انداز بالکل اداکارانہ تھا۔ کچھ لوگوں نے کہا بھی کہ اگر بھٹو صاحب فلم کے ہیرو ہوتے تو بہت اچھی اداکاری کرتے۔

یہ محفل ختم ہوگئی۔ اس کے بعد میری ان سے ملاقات کراچی میں ہوئی۔ اس وقت چینی سفارتخانے میں کوئی تقریب تھی۔ وہاں شفیع عقیل، ابراہیم جلیس، محمود شام اور کچھ دوسرے دوست موجود تھے۔ انہوں نے وہاں میرے لیے بھی دعوت نامہ لے لیا اور اس کے علاوہ سفارت خانے کی طرف سے مجھے فون بھی کروایا کہ میں اس تقریب میں شرکت کروں۔ میں ان دوستوں کے ساتھ گیا۔ وہاں بھٹو صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان کی تقریر پہلے سے ہی سنی ہوئی تھی اور ان سے متاثر بھی تھا اور یہ بھی ذہن میں تھا کہ چین اور پاکستان کو قریب لانے میں بھٹو صاحب کا رول تھا۔ اس لیے میری نظر میں ان کی عزت

تھی کہ یہ نیک کام بھٹو صاحب نے کیا ہوا ہے۔

گارڈن پارٹی میں اپنی پلیٹ ہاتھ میں لیے میں اس موقع کی تلاش میں تھا کہ یہ باقی لوگوں سے الگ ہوں تو میں بھی ان سے بات کروں۔ انہیں لوگوں نے گھیرا ہوا تھا۔ جونہی موقع ملا تو میں ان کے سامنے آیا اور سلام کیا۔ انہوں نے میری طرف دیکھا تو میں نے اپنا تعارف کروایا۔ کہنے لگے کہ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو تو رسمی الفاظ کہنے ہی چاہئیں لیکن آپ سے مل کر دراصل مجھے خوشی ہوئی ہے اور اس لیے خوشی ہوئی کہ آپ پاکستان اور چین کو قریب لائے ہیں۔ پاکستان اور چین دونوں کو ہی ایک اچھا دوست ملا ہے اور ہمیں چین سے بے غرض مدد ملی ہے۔ اس لیے میری نظر میں آپ کی عزت ہے اور میں آپ کے لیے دعا گو ہوں۔

انہوں نے شکریہ ادا کیا اور پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں شاعری کرتا ہوں کہنے لگے نہیں کام کیا کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے اس سوال کی توقع تھی کیونکہ اس ملک میں شاعری کرنے والا ساتھ کوئی اور کام بھی کرتا ہے۔ لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں صرف شاعری کرتا ہوں اور قلم سے کماتا ہوں اور عزت سے زندگی گزار رہا ہوں اور مجھ پر شاعروں والی غریبی بھی نہیں ہے۔

انہوں نے مجھ سے تفصیل پوچھی تو میں نے بتایا کہ میرا قلم سے بھی تعلق ہے تو کہنے لگے کہ اچھا چونکہ آپ کا قلم سے بھی تعلق ہے اس لیے آپ کچھ کما لیتے ہیں ورنہ مجھے معلوم ہے کہ یہاں کتابوں سے کچھ نہیں ملتا۔

ان سے بس اتنی ہی گفتگو ہوئی اور اس کے بعد وہ ''See You'' کہہ کر مجھ سے الگ ہو گئے۔ میں نے ان کے بارے میں یہ بھی سن رکھا تھا کہ وہ ایک بار جس کا نام سن لیں اور جس سے گفتگو کر لیں اس کا نام اور تصویر ان کے ذہن میں نقش ہو جاتی ہے۔ لیکن میں کچھ دوسرے ذہن کا آدمی تھا جب بھٹو صاحب برسر اقتدار آئے تو ان کے تمام دور حکومت میں میں نے کبھی کوشش نہیں کی کہ ان سے ملوں۔ ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ سربراہ مملکت سے جو ملتا ہے اس کے پیچھے کوئی غرض بھی ہوتی ہے۔ غرض نہ بھی ہو تو

ضرورت ہی ہوتی ہے اور اگر ضرورت بھی نہ ہو تو کسی کے ساتھ بے انصافی ہوئی ہوتی ہے اور وہ انصاف مانگنے ہی چلا جاتا ہے۔ لیکن میں نے کہا کہ مجھے اس شخص سے یوں نہیں ملنا ہے۔ خدا کرے کہ کبھی کوئی ادبی یا ثقافتی موقع آ جائے تو ملوں گا۔ لیکن ایسا وقت کبھی نہیں آیا اور وقت آیا بھی تو ایسا کہ بھٹو صاحب مبتلائے عذاب ہوئے۔

اصل معاملہ توری پراسیسنگ پلانٹ کا تھا اور امریکہ نہیں چاہتا تھا کہ ہم فرانس سے یہ پلانٹ حاصل کریں۔ اس سلسلے میں پاکستان کو دھمکیاں بھی دی گئیں اور پھر بھٹو صاحب کو خط بھی لکھا گیا جو بھٹو صاحب نے لے کر راجہ بازار راولپنڈی میں نمائش کی تھی اور انہیں پتہ بھی تھا کہ امریکہ نے جو دھمکی دی ہے اس پر عمل بھی ہوگا لیکن ذوالفقار علی بھٹو ایک جیالا شخص تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ایک دن مرنا تو ہے اور اسے جو عزت حاصل کرنی تھی وہ عزت حاصل کر چکا تھا۔ اس ملک میں وزیراعظم سے بڑا کوئی عہدہ نہیں تھا اور یہ عہدہ اس کے پاس تھا۔ قائد عوام کہلانے سے بڑی بات کوئی اور نہیں تھی اور وہ قائد عوام بھی تھا۔ جہاں تک ملاؤں کے دعوے ہیں کہ وہ اسلام کی خدمت کرتے ہیں میرے خیال میں بھٹو صاحب نے یہاں اسلامی کانفرنس منعقد کروا کے اسلام کی خدمت بھی کی اور عربوں کی مدد کرنے کے سلسلے میں جو کچھ بھٹو نے کیا وہ بھی ہمارے سامنے ہے۔

چنانچہ بھٹو نے سوچا ہوگا کہ یہ سب کچھ حاصل کرنے کے بعد اگر دب کے جئے یا مشروط طور پر جئے تو اس سے تو سارا کریڈٹ چلا جائے گا۔ اب جبکہ یہ سب کچھ حاصل ہے اگر اس حالت میں مر جایا جائے تو یہ چیزیں زندہ جاوید بنا دیں گی۔ اس لیے بھٹو صاحب نے جھکنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے اپنی گردن کٹوا دی اور جس دن بھٹو صاحب کو پھانسی ہوئی اس دن کروڑوں آدمی روئے تھے۔

میرا پیپلز پارٹی سے کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا۔ میں بنیادی طور پر مسلم لیگی رہا ہوں اور میں نے فرنٹیئر کے ریفرنڈم میں کام کیا ہے اور اب بھی میں قائداعظم کو اپنا رہبر مانتا ہوں لیکن بھٹو کے ساتھ جو سلوک ہوا اس پر میں بھی رویا۔ اور میں نے بھٹو صاحب کی پھانسی کے بعد ان کے بارے میں اپنے کہنے کے انداز میں جو غزلیں اور نظمیں کہیں اگر میں انہیں ایک

جگہ اکٹھا کروں تو ان کا ایک پمفلٹ تو بن جائے گا۔

وہ شخص جو مر کر بھی زندہ ہے اور جسے گیارہ سال کا مارشل لاء بھی نہیں مار سکا۔ اور جو اتنی کردار کشی کے باوجود آج بھی ایک بڑے آدمی کی حیثیت سے لوگوں کے دلوں میں موجود ہے۔ مجھے اس سے اپنے دوست ملک چین کے سفارتخانے میں ملنے کا جو شرف حاصل ہوا وہ بھی میری زندگی کے چند خوشگوار واقعات میں سے ایک ہے۔

استاد امام دین اور ناطق دہلوی

بین الاقوامی اہمیت کے حامل لوگوں کا ذکر تو میں نے کر دیا جو سیاست اور بین الاقوامیت میں اپنا نام رکھتے ہیں۔ لیکن کچھ نام ایسے بھی ہوتے ہیں جو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی ذات کے اندر ایک انجمن ہوتے ہیں۔ اور ان کی کچھ غیر معمولی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے صفحۂ قرطاس پر ان کا نام تادیر باقی رہتا ہے اور وقتاً فوقتاً شہروں شہروں اور محفل محفل ان کا ذکر ماحول کو خوشگوار بنانے کا موجب بنتا ہے۔ ایسے ناموں میں پنجاب کی ایک شخصیت استاد امام دین کا نام سرفہرست ہے۔

استاد امام دین ایک ایسے شاعر تھے کہ جنہیں اگر آپ فن کے پیمانوں سے ناپیں تو شاید آپ کو مایوسی ہو لیکن جس بے ہنگم انداز سے وہ شعر کہتے تھے وہ سن کے کوئی ہی ایسا شخص ہوگا جو اپنی ہنسی ضبط کر سکے۔ اسی طرح ان کی زندگی کے واقعات کچھ ایسے تھے کہ وہ بس انہی کی زندگی میں رونما ہو سکتے تھے۔ استاد امام دین کا تعلق سرزمین گجرات پنجاب سے تھا۔ وہ ایک کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ شکل وصورت بہت عمدہ تھی۔ سرخ وسفید رنگ تھا اور اونچا قد۔ شرفائے پنجاب کی طرح ان کا لباس ہوتا تھا اور جب تک وہ خاموش بیٹھے رہیں یا شاعری پر بات نہ کریں تو یوں نظر آتا تھا کہ بہت سمجھدار اور زیرک آدمی ہیں لیکن جس وقت وہ شاعری کی طرف رخ کرتے تھے تو پھر نام بتائے بغیر معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ استاد امام دین ہیں۔

ان سے میری بڑی ملاقاتیں دو ہوئیں۔ ایک تو راولپنڈی میں ہوئی۔ ایک بار یہ

وہاں آئے اور ہمیں ان کی آمد کا پتہ چلا تو ہم نے سوچا کہ ہم کتنے ہی بڑے بڑے شاعروں کا سواگت کر چکے ہیں کیوں نہ انہیں بھی مدعو کیا جائے۔ کیونکہ یہ بھی ایک شہرت یافتہ شاعر ہیں اور پورے ہندوستان میں ان کا طوطی بولتا ہے۔ چنانچہ ہم سب دوستوں نے مل کر جامع مسجد کے قریب ایک مکان کی چھت پر گیس کی روشنی میں ایک مجلس شعروسخن کا اہتمام کیا جس کے چیف گیسٹ استاد امام دین تھے۔

ہم نے کہا کہ شعر تو سنیں گے لیکن پہلے ان سے شاعری پر ایک لیکچر کیوں نہ کروا دیا جائے اور دیکھیں کہ شاعری کے سلسلے میں یہ کیسے خیالات رکھتے ہیں۔ اس محفل میں انہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں جن خیالات کا اظہار کیا ان میں کام کی باتیں دو تھیں۔ ویسے تو وہ ان کے علاوہ بھی جو جی میں آیا کہتے گئے۔ ان دو باتوں میں سے ایک یہ تھی کہ شاعری ایک ٹارچ ہے اور جہاں اندھیرا ہو وہاں کوئی چیز تلاش کرنی ہو تو ٹارچ اس پر روشنی ڈالتی ہے۔ چنانچہ شعر بھی زندگی کے مختلف مسئلوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس لیے میری نظر میں شعر ایک ٹارچ ہے۔ ان کا یہ مقولہ اس کے بعد مدتوں گونجتا اور اور کالم نگار مقامی اخبارات میں یہ مقولہ استعمال کرتے رہے۔ ہمارے دوستوں میں بھی جب کوئی ایسا شعر کہتا تھا جس سے مسائل حاضر پر روشنی پڑتی ہو تو ہم مذاق سے اسے کہتے تھے کہ واقعی آپ کا شعر ٹارچ شعر ہے۔ ٹارچ شعر کا یہ سلسلہ بہت دیر تک چلا۔

پھر انہوں نے ہمیں ایک نظم سنائی جس کا عنوان تھا ''استاد امام دین دنیا کے ہر رنگ میں'' یہ نظم کچھ یوں تھی:

؎ موٹر نہیں رہا کہ میں سائیکل نہیں رہا
پیڈل نہیں رہا کہ میں ہینڈل نہیں رہا
مجنوں نہیں رہا کہ میں لیلیٰ نہیں رہا

میں نے سوال کیا کہ آپ نے اس مصرع میں لیلیٰ کو لیلل کیسے بنا دیا۔ تو کہنے لگے کہ برخوردار آپ شاعر کو ایک معمار یا ایک بڑھئی سمجھ لیں۔ جس طرح معمار جب دیوار بنا رہا ہوتا ہے اور کوئی اینٹ اٹھا کر دیوار میں لگاتا ہے اور وہ پوری نہیں آتی تو وہ تیشی لے کے

ایک چوتھائی اینٹ کو کاٹ دیتا ہے اور پوری اینٹ کی بجائے تین چوتھائی اینٹ کو لگا کے دیوار کو ٹھیک کر لیتا ہے۔ اسی طرح شاعر کا کام یہ ہے کہ جہاں لفظ فٹ نہ آئے اس لفظ میں سے کوئی حرف نکال دے اور باقی جو لفظ بچے اس سے قافیے کو پورا کرے۔ چنانچہ اس شعر میں لیلیٰ نہیں آتا تھا تو میں نے اسے حسب ضرورت لیلل کر لیا ہے اس طرح شعر کا وزن بھی پورا ہو گیا ہے اور قافیہ بھی ٹھیک آ گیا ہے۔

یہ بات مدتوں ہمارے ذہن میں رہی کہ شاعر معمار یا بڑھئی ہوتا ہے اور اسے بڑھئی کی طرح کے اختیارات بھی ہوتے ہیں۔ اس کے بہت بعد جب بھائی ظفر اقبال کا مجموعہ "گل آفتاب" آیا تو انہوں نے لسانی تشکیلات کے نام سے وہی کا کیا جو استاد امام دین نے کیا تھا۔ اس لیے ہمیں یقین آیا کہ استاد امام دین ٹھیک کہتے تھے۔ وہ کم پڑھے لکھے تھے اس لیے انہوں نے اپنے آپ کو بڑھئی کہہ لیا لیکن ظفر اقبال زیادہ پڑھے لکھے تھے انہوں نے امام دین کے کام کو آگے بڑھا کے پوری ایک کتاب چھاپی اور دیباچے میں بحث کی کہ نئی لسانی تشکیلات آنی چاہئیں۔ پھر انہوں نے اپنی کتاب میں جو جو کمالات دکھائے وہ بھی دیدنی تھے۔ لیکن کہاں استاد امام دین اور کہاں ظفر اقبال۔ استاد امام دین میں بے ساختگی تھی جبکہ ظفر اقبال میں ساری تقلید تھی اور "گل آفتاب" گل ہو کے رہ گیا۔ اور یہ تجربہ آگے نہ بڑھ سکا اور وہ ظفر اقبال جو "گل آفتاب" سے پہلے "آبِ رواں" جیسی خوبصورت کتاب دے چکا تھا ایک بار پھر "آب رواں" کی طرف مڑا لیکن وہ آج تک پھر "آب رواں" کو پا نہیں سکا۔ ہاں استاد امام دین کے مزاج کا کہیں کہیں اس میں ہلکا ہلکا اثر نظر آتا ہے۔

استاد امام دین سے میری دوسری مقالات مظفر گڑھ کے مشاعرے میں ہوئی۔ یہ مشاعرہ آل پاکستان مشاعرہ تھا۔ اس میں اور بھی مزاحیہ شاعر شریک تھے جن میں مجید لاہوری، سید محمد جعفری، ظریف جبل پوری اور ضمیر جعفری نمایاں تھے۔ اس کے علاوہ تمام سنجیدہ شعراء بشمول جناب احمد ندیم قاسمی موجود تھے۔

جب اس مشاعرے میں میں نے استاد امام دین کو دیکھا تو وہ مجھے بہت ہی سنجیدہ نظر

آئے۔ حیرت اس بات سے ہوئی کہ انہوں نے قاسمی صاحب کے ایک دو اشعار انہیں سنائے اور کہا کہ مجھے آپ کے یہ اشعار پسند ہیں۔ قریب بیٹھے ہوئے سب شاعروں کو استاد صاحب کی یہ بات سن کر حیرانی ہوئی کہ کیا واقعی وہ مطالعہ کے خوگر ہیں۔ اور کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ اوپر سے جو کچھ بنے ہوئے ہیں یہ اندر سے اس کے برعکس ہوں اور ہم انہیں بیوقوف سمجھ رہے ہیں اور یہ ہمیں بیوقوف بنا رہے ہوں۔ چنانچہ اس معاملہ پر استاد صاحب کا کافی دیر ٹیسٹ ہوا اور یہ پتہ چلا کہ وہ باقاعدہ پڑھتے ہیں لیکن عالم یہ تھا کہ جب شعر سناتے تھے تو اس سے یہ تاثر نہیں ملتا تھا۔ مثال کے طور پر انہوں نے مولانا ظفر علی خان کے ایک مصرع پر تضمین کی۔ ظفر علی خان نے کسی زمانے میں کانگرس اور مسلم لیگ کے اخبارات کے باہمی جھگڑے کے دنوں میں کہا تھا۔

؎ تو گاندھی جی کی بکری کے لیے بکرا مہیا کر

استاد صاحب نے اس کے ساتھ تین مصرع لگائے:

؎ کچھ تو تو ظاہر کر اور کچھ چھپ چھپا کر
جو بھی تیرے دل میں آئے تو بھیا کر
وہ کھلے پر کھڑی ممیاتی اور چلاتی ہے
تو گاندھی جی کی بکری کے لیے بکرا مہیا کر

یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی ان کے یہ شعر سن کر نہ ہنسے۔ وہ جس وثوق اور خود اعتمادی سے اپنا کلام سناتے تھے اس کی وجہ سے انہیں خوب داد ملتی تھی اور اس مشاعرے میں بھی سب سے زیادہ داد انہوں نے ہی لی۔ ان سے پہلے جتنے بھی مزاحیہ شاعر پڑھ چکے تھے وہ ان کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ پھر حاضرین کی طرف سے جو فرمائشیں آئیں وہ استاد امام دین کے کلام کے بارے میں ہی تھیں۔ چنانچہ بار بار ان سے کلام سنا گیا۔ وہاں کسی نے کوئی فرمائش کی تو استاد نے کہا کہ یہ میرے اشعار نہیں ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ اظہر امرتسری کبھی کبھی اپنے مزاحیہ کالم میں لکھا کرتے تھے کہ استاد امام دین ایم اے پی ایچ ڈی کی طرف سے کچھ تازہ کلام آیا ہے جس میں سے یہ اشعار مجھے یاد ہیں۔

؎ تو جنگل کو چھوڑ اور گھر کو چلا آ
تیری ماں نے پکائے مٹر امام دینا
نہ چھیڑو میری پنڈلیوں کو نہ چھیڑو
ان میں ہے درد جگر امام دینا

اس طرح یہ سب ایک طرح سے الحاقی اشعار تھے جو کہ درحقیقت ان کے مجموعہ کلام ''بانگ دہل'' میں نہیں ہیں۔ چنانچہ آپ کو جو شعر وزن میں نظر آئے تو سمجھ لیجئے کہ کسی اور نے وہ شعر کہہ کے استاد صاحب کے نام میں ڈال دیا ہے۔ ویسے کبھی کبھی استاد امام دین سے بھی شعر وزن میں سرزد ہو جایا کرتے تھے۔

ان کے مجموعہ کلام کا معاملہ یہ ہے کہ لوگ انہیں بیوقوف بناتے تھے۔ استاد امام دین ایک چونگی محرر تھے اور گجرات ہی میں کام کرتے تھے۔ اس مجموعے میں انہوں نے زیادہ تر تضمین کی ہے۔ جس طرح استاد صاحب نے مولانا ظفر علی خان کی تضمین کی اسی طرح غالب کی غزل

؎ کوئی صورت نظر نہیں آتی

کی انہوں نے تضمین کی۔ اور لکھا

؎ ہو سکے استاد انسپکٹر چونگی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

گجرات میں ایک وکیل تھے جن کے نام میں خادم آتا تھا۔ اس زمانے میں گجرات میں راجہ حسن اختر مجسٹریٹ تھے۔ استاد امام دین ان کی دل بستگی کا سامان ہوا کرتے تھے چنانچہ انہوں نے استاد کو مجموعہ شائع کرنے کا مشورہ دیا اور امام دین کی تصویر علامہ اقبال جیسی چھپوائی گئی۔ پھر کتاب کا سائز بھی بانگ درا جیسا رکھا گیا اور اس میں باقاعدہ دیباچہ لکھا گیا۔ پھر اس میں ایک قطعہ بھی لکھا گیا جس سے تاریخ اشاعت نکلتی تھی۔ اس کے دو مصرعے یوں تھے۔

طبع دیوان خاص و عام ہوا
کام استاد کا تمام ہوا

اس سے مجموعے کی تاریخ اشاعت نکلتی ہے۔ استاد صاحب کو یہ سمجھ نہ آ سکی کہ اس کے آخری مصرعے کا مطلب کیا نکلتا ہے اور انہوں نے اسے بڑے اہتمام سے چھاپا اور پھر اس کتاب کا افتتاح ہوا اور استاد صاحب کو گرمیوں کے موسم میں ایک ٹرک کی چھت پر بٹھایا گیا جبکہ باقی سب افراد ٹرک کے اندر بیٹھے۔ ان کے گلے میں گنڈیریوں اور پھلوں کے ہار پہنائے گئے اور اہتمام یہ کیا گیا کہ ان کے سر میں کچھ رنگ ڈال دیئے گئے اور جب انہیں پسینہ آتا تھا تو وہ رنگ میں مل کر ان کے چہرے پر گرتا تھا اور ان کا چہرہ رنگین ہوتا جاتا تھا۔ لوگ اِدھر اُدھر کھڑے استاد امام دین کو اس حالت میں دیکھ کر تالیاں بجاتے تھے اور استاد داد لیتے تھے۔

وہاں پر کوئی صاحب محمد حسین تھے۔ سنا ہے کہ وہ کافی نام والے آدمی تھے اور بعد تک گجرات میں رہے۔ ان سے استاد امام دین کی چپقلش ہوگئی اور استاد نے ان پر ایک نظم لکھ ڈالی۔ جس میں کچھ اس طرح کے مصرعے تھے:

؎ تیرا نک اے یا پکوڑا محمد حسین
مار کے مکہ میں اسے کر دوں گا چوڑا محمد حسین
پھرے گا پھر تو دوڑا دوڑا محمد حسین

اس قسم کی نظم تھی۔ ان صاحب محمد حسین نے راجہ حسن اختر مجسٹریٹ کی عدالت میں استاد امام دین کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ استاد تو ایسے تھے ہی۔ اس لیے اب یہ کم احمق نظر آئے اور مقدمہ دائر کرنے والا آدمی زیادہ احمق نظر آیا۔ انہوں نے ایک مجذوب آدمی کے پیچھے پڑ کے کیس کر دیا۔ وہاں ان کی دل لگی کا سامان ہوا۔ انگریز کا زمانہ تھا۔ یونہی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ چنانچہ راجہ حسن اختر نے استاد سے کہا کہ اب محمد حسین نام کا کوئی اور شخص پیدا کرو جس کا ناک بھی پکوڑے جیسا ہو پھر ہم مان جائیں گے کہ آپ نے نظم مدعی کے بارے میں نہیں کہی بلکہ اس محمد حسین کے بارے میں کہی۔ راجہ حسن اختر اس مقدمے کو طول دیتے گئے۔ ہر تاریخ پر پورا گجرات ان کی عدالت میں اُمڈا چلا آتا تھا اور وہاں راجہ صاحب ان سے شعر سنتے تھے اور بہت مدت کے بعد کہیں جا کر انہوں [illegible]

کیا۔

استاد امام دین سے ملاقاتوں کے واقعات میں نے بیان کئے ہیں۔اس قسم کے ایک اور صاحب لاہور میں بھی موجود تھے۔ یہ دہلی سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ اچھی فیملی سے تعلق رکھتے تھے۔ان کا نام نواب ناطق دہلوی تھا۔ بہت پڑھے لکھے تھے لیکن تھوڑے سے امام دین بھی تھے۔ کسی انگلش اخبار میں کام بھی کرتے تھے اور سنا ہے کہ وہاں اچھے ورکر تھے۔ غالباً سب ایڈیٹر تھے اور کافی ہاؤس میں ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔

یہ یہاں پر دل لگی کا سامان تھے۔ان کا ایک شعر اس زمانے میں بہت مشہور ہوا جو یہ تھا:

؎ ناطق ترا یہ شعر ہے تریاق تری ہا
زنباق تری ہا لاکا زنباق تری ہا

لوگ اس کا مطلب جب ان سے پوچھتے تھے تو وہ کہتے تھے کہ میرا کام شعر کہنا ہے مطلب بتانا نہیں مطلب آپ خود ڈھونڈیں۔

ان صاحب کی بیچ میں نوکری چلی گئی۔ ہمارے ایک بہت مشفق دوست سبطین فضلی مرحوم کے کچھ راہ ورسم ہوتے تھے۔ ان کے کچھ تعلقات ادیبوں، آرٹسٹوں وغیرہ سے بھی تھے۔ فلم ڈائریکٹر تھے اور ان کا فنون لطیفہ سے تعلق بھی تھا۔ وہ کبھی کبھی مجھے ساتھ لے کر کافی ہاؤس میں چلے جایا کرتے تھے۔ وہاں انہوں نے نواب ناطق دہلوی کا تذکرہ سنا تو ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ ان سے ملے اور لطف لیا۔ بعد میں انہوں نے جب سنا کہ ناطق دہلوی سروس سے نکل چکے ہیں اور آج کل ضرورت مند ہیں تو وہ کہنے لگے کہ میں ان کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ وہ ایک کریک آدمی ہیں۔ اگر آپ نے مدد کا لفظ استعمال کیا تو وہ آپ سے لڑ پڑیں گے۔ اور پیسے بھی نہیں لیں گے۔ اگر ان کی امداد کرنی ہے تو ہم دوسرے طریقے سے کر دیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے سوچا اور اس کے بعد ناطق صاحب سے بات کی۔

میں نے ان سے کہا کہ نواب ناطق صاحب! فضلی صاحب ایک بہت بڑے

ڈائریکٹر ہیں۔ وہ ایک فلم بنا رہے ہیں۔ انہوں نے اس کے گانے مجھ سے لکھوائے ہیں۔ باقی گانے تو میں نے لکھ لیے ہیں لیکن ایک جگہ آ کر میں رک گیا ہوں۔ مجھ سے آگے بڑھا نہیں جا رہا۔ سب دوستوں کا خیال ہے کہ اس طرح کی سچوئیشن پر آپ بہتر لکھ سکتے ہیں۔ اب فضلی صاحب خود اس معاملے پر آپ سے بات نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ ڈرتے ہیں کہ یہ بہت چھوٹا کام ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تو ہم جیسے فلمی شاعروں کا کام ہے جبکہ آپ کا تو ادب میں بڑا مقام ہے۔ اور وہ آپ کی سطح پر نہیں آتے۔ لیکن میں نے فضلی صاحب سے کہا ہے کہ جب ایک بڑا شاعر فلم کے لیے لکھے گا تو وہ یہاں بھی بڑی شاعری کرے گا۔ چنانچہ میں نے ان سے کہا کہ فضلی صاحب تو میری باتوں سے قائل ہو گئے ہیں۔ اور اگر آپ کہیں تو میں ان سے آپ کی بات کروا دوں۔

ناطق دہلوی کہنے لگے کہ صاحب وہ ہم سے کیا لکھوائیں گے۔ وہ ہمارا معاوضہ دے سکتے ہیں؟ میں نے کہا کہ کیا ہے آپ کا معاوضہ؟ تو کہنے لگے کہ ایک لاکھ روپے فی گانا۔ میں نے کہا کہ ایک لاکھ روپے میں تو پوری فلم بنتی ہے جس میں اداکاروں کے پیسے اور سٹوڈیو وغیرہ کے اخراجات بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کیجئے۔ کہنے لگے کہ اچھا وہ پچاس ہزار روپے دے دیں گے۔ میں نے کہا کہ یہ بھی زیادہ ہیں۔ آپ کم سے کم کتنا لے سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم دس ہزار روپے فی گانا سے کم نہیں لیں گے۔ میں نے کہا کہ ہم دس ہزار روپے دو گانوں کے دیتے ہیں۔ کہنے لگے ٹھیک ہے۔ میں نے کہا کہ میں جا کر فضلی صاحب کو یہ خوشخبری سناتا ہوں کہ آپ مان گئے ہیں۔

فضلی صاحب اس وقت دوسرے ٹیبل پر بیٹھے تھے۔ میں نے کہا کہ فضلی صاحب! آ جایئے۔ آپ کو مبارک ہو۔ آپ کا کام ہو گیا ہے اور نواب صاحب مان گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ دس ہزار روپے میں دو گانے لکھ کر دیں گے آپ فی الفور پانچ سو روپے نکال کر انہیں ٹوکن منی کے طور پر دے دیجئے ورنہ شاعروں کا تو موڈ ہوتا ہے۔ نجانے بعد میں ان کا موڈ کیا ہو جائے۔ چنانچہ فضلی صاحب نے پانچ سو روپے نکال کر نواب صاحب کو دیئے اور اس طرح ان کی مدد کی۔

نواب ناطق دہلوی کو کبھی کبھی کسی مشاعرے میں بھی دل لگی کے لیے بلایا جاتا تھا ایک بار ہم گوجرانوالہ گئے تو نواب صاحب ساتھ تھے۔ احمد ندیم قاسمی، ناصر کاظمی، صوفی تبسم، علامہ لطیف انور اور بہت سے دوسرے شعراء بھی ہمارے ساتھ گئے۔ ہم لاہور ریلوے سٹیشن سے گوجرانوالہ کے لیے ٹرین میں بیٹھے تو گاڑی کے چلتے ہی ہم نے نواب صاحب سے کہا کہ کچھ ارشاد فرمایئے۔ وہ بڑے تن کر اشعار سنایا کرتے تھے۔ انہوں نے اس طرح بڑے تن کر غزل سنانی شروع کی جو یہ تھی:

؎ طعنہ اغیار کا نہ طعینے کہ

یہ غزل کا پہلا مصرع تھا۔ جب وہ غزل سنا چکے تو میں نے بڑے ادب سے کہا کہ نواب صاحب باقی تو شاید لفظ ''طعینے بھی'' ہوگا لیکن یہ آخر میں ''کہ'' کا کیا مطلب ہے۔ وہ مجھے کہنے لگے کہ آپ خاموش رہیں۔ ہم اہل زبان ہیں اور یہ زبان کا مسئلہ۔ آپ اسے چھوڑ دیجئے اور اس کا مزا لیجئے۔ ہم نے سوچا کہ چلو اس بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔ میں نے ٹرین ہی میں سب شاعروں کو کہہ دیا کہ چندا ڈالو اور ایک ایک شعر کہو۔ باقی میں بندوبست کرلوں گا۔

چنانچہ ہم وہاں مشاعرے میں گئے تو وہاں ان سے پہلے یہ غزل سنی گئی جو انہوں نے خوب تن کر سنائی۔ اس کے بعد پروگرام کے مطابق مجھے بلالیا گیا۔ میں نے سٹیج پر جا کر کہا کہ صاحب! میں نواب صاحب کی غزل سن کر بہت متاثر ہوا ہوں اور انہوں نے کیا زمین نکالی ہے۔ ایسی زمین تو غالب اور میر بھی نہیں دے سکے۔ اس لیے ارتجالاً یہ اشعار ہو گئے ہیں۔ چنانچہ میں نے انہی کی زمین میں غزل سنائی جس میں سے ایک مصرع تھا:

؎ پان حاضر ہے پانئے کہ

غزل کے آخر میں کہ آتا تھا۔ میں نے ان پر خوب طنز کیا اور جس جس طرح میں شعر پڑھتا جارہا تھا ان کا رنگ سرخ ہوتا جارہا تھا اور ان کے کان اور بال کھڑے ہوتے جارہے تھے مگر وہ غصہ پی گئے اور اس وقت مجھے کچھ نہیں کہا۔

جب ہم اگلی صبح واپس آئے تو کسی نے ان سے پوچھا کہ قتیل شفائی نے آپ کی

زمین میں غزل کہی تھی اور آپ نے اسے بہت متاثر کیا۔ تو کہنے لگے کہ تم قتیل شفائی کی بات کرتے ہو یا تو وہ پاگل ہے یا دشمن کا جاسوس ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ شعر کہنے کے سلسلے میں میں دشمن کا جاسوس کیسے ہوگیا۔ بہرحال خدا بخشے وہ بھی خدا کو پیارے ہوگئے۔ ایسے لوگ اب کہاں۔ اب تو کافی ہاؤس کی نہ وہ بہار رہی اور نہ ہی نواب ناطق دہلوی یا فضلی صاحب رہے۔ اب صرف یادیں ہی یادیں ہیں۔ خدا ان سب کو بخشے جن کے دم سے یہ محفلیں تھیں۔

ملک ٹنڈا

لاہور کے ایک ملک صاحب تھے جن سے میرا تعارف فارغ بخاری نے کروایا تھا اور فارغ بخاری سے ان کا تعارف ان حالات نے کروایا تھا جو انہیں بیکاری کی وجہ سے درپیش تھے۔ فارغ بخاری اور رضا ہمدانی یک جان و دو قالب کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور اب تک یہی سلسلہ ہے۔ خدا ان دونوں کو لمبی عمر دے اور اس جسم اور سائے کو ایک ساتھ ہی چلتا رکھے۔ یہ روزگار کے سلسلے میں جب پشاور سے نکلے تو لاہور میں بھی ان کا قیام ہوا۔ اس بارے میں ان کی ایک الگ داستان ہے۔ اس عرصے میں ان کی ملاقات ملک صاحب سے بھی ہوئی۔ اور یہاں انہوں نے ان سے ایک پرچہ بھی نکلوایا جسے بعد کے تلخ تجربات کی بنا پر چھوڑ کر فارغ اور رضا میں کراچی کی جانب بڑھ گئے۔ اور ملک صاحب نے یہیں قیام ضروری سمجھا اور پھر یہاں سے ایک پرچہ ''جذبات'' نکالنا شروع کیا۔ یہ ایک ہفت روزہ تھا اور ہفتہ وار نہیں چھپتا تھا بلکہ منشاوار چھپتا تھا۔ وہ جب اس کی ضرورت سمجھتے تھے تو اسے چھاپ لیتے تھے اور تازہ پرچہ اور پچھلی فائل لے کر دوسرے شہروں میں ٹور پر نکل جاتے تھے۔

یہ عجیب و غریب شخص لاہور کے ککے زئی برادری سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے باقی عزیز بہت معزز اور دیانتدار لوگ تھے۔ لیکن یہ ملک صاحب عجیب عجیب شہرتوں کے مالک بنے گھوما پھرا کرتے تھے جہاں بھی انہیں اپنے مطلب کا آدمی نظر آتا تھا یہ اسے گھیر لیتے تھے۔ اشخاص کے علاوہ بھی اداروں پر بھی ان کی نظر کرم خاصی رہتی تھی۔ چنانچہ یہ اس

زمانے میں سرحد کے دورے پر نکلے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلم لیگ کی تحریک زوروں پر تھی اور ہر طرف قائداعظم کے نام کا غلغلہ تھا۔ جب یہ ہری پور پہنچے تو وہاں یہ قاضی عزیزالرحمان صاحب سے ملے۔

قاضی عزیز الرحمان ہمارے بزرگ تھے اور اخبار نویس تھے۔ وہ ہری پور سے ایک مقامی پرچہ ''پیغام سرحد'' کے نام سے نکالتے تھے۔ وہ سادہ آدمی تھے۔ ملک صاحب نے جا کر قاضی صاحب کو آئینے میں اتارا اور ان سے کہا کہ میں ''جذبات'' کا مشاہیر نمبر نکال رہا ہوں۔ آپ بھی اس کے ساتھ ہی ''پیغام سرحد'' کا پاکستان نمبر نکال لیں۔ اور میں آپ کے ایک نمائندے کو ساتھ لے لیتا ہوں اور صوبہ سرحد کا دورہ کرتا ہوں۔ اس زمانے میں اشتہارات نہیں تھے اور جیسے آج کل قیمتی اشتہارات ہوتے ہیں اس طرح کا سلسلہ نہیں تھا البتہ وہ لوگ جو اپنی تشہیر چاہتے تھے یا جو اپنے مسائل پریس میں لانا چاہتے تھے ان کی سرپرستی حاصل کی جاتی تھی۔

''پیغام سرحد'' شرافت کے اندر رہ کر نکلتا تھا اور اس کے ذرائع آمدن جائز تھے لیکن ''جذبات'' کے مالک و مدیر کا میدان کچھ اور تھا۔ اس میں خوشامد بھی شامل ہوتی تھی اور حد سے بڑھی ہوئی خوشامد ایک طرح کی بلیک میلنگ ہوتی ہے۔

میں نے اپنی ابتداء ''پیغام سرحد'' ہی سے کی تھی اور میں شروع میں اس میں چھوٹی چھوٹی نظمیں اور غزلیں لکھا کرتا تھا۔ جیسے کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میری زندگی کا رویہ یہ رہا ہے کہ اپنے سے زیادہ قابل آدمیوں کے ساتھ بیٹھوں۔ ان کی باتیں سنوں اور ان سے کچھ سیکھوں۔ چنانچہ جن لوگوں کی محفل میں میں بیٹھتا تھا ان میں سے ایک قاضی عزیز الرحمان بھی تھے۔ وہ بہت شفیق اور سیدھے سادے آدمی تھے۔ اور اپنے علاقائی صحافیوں میں معزز سمجھے جاتے تھے۔

جب ملک صاحب نے قاضی صاحب سے اپنا نمائندہ ساتھ کرنے کے لیے کہا تو قاضی صاحب کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں اس زمانے میں بیروزگار تھا۔ قاضی صاحب نے مجھے کہا کہ تم ان کے ساتھ چلے جاؤ۔ صحافت کی یہ ڈیوٹی میرے مزاج کے مطابق لگتی تھی پھر

مجھے یہ خیال بھی تھا کہ کچھ پیسے بھی مل جائیں گے چنانچہ میں نے ساتھ جانے کی ہامی بھرلی۔ ملک صاحب نے قاضی صاحب سے میرے اخراجات بھی خود وصول کئے اور میں اور ملک صاحب پشاور اور کوہاٹ کی طرف نکل پڑے۔ ہمارے قیام کے دو بڑے مقامات یہی تھے۔

پہلے ہم پشاور گئے جہاں ہم شاہی مہمان خانے میں ٹھہرے۔ یہاں لوگ تھوڑے سے پیسے دے کر ٹھہرا کرتے تھے اور یہ ایک طرح کا V.I.P ہاؤس تھا۔ ملک صاحب نے پشاور میں مسلم لیگ والوں سے کہہ کر وہاں ایک کمرہ لیا۔ اس کے بعد میں ان کے پیچھے پیچھے تھا اور یہ میرے آگے آگے۔ ہم جہاں بھی جاتے گفتگو ہی کرتے تھے اور ان کی تمام گفتگو جذباتی ہوتی تھی۔ یہ لوگوں کو مشاہیر نمبر کے ایسے ایسے سبز باغ دکھاتے تھے کہ ہر کوئی انہیں سو دو سو روپے دے دیتا تھا۔ اس زمانے میں سو دو سو روپیہ آج کے دس پندرہ ہزار روپے کے برابر شمار کیا جاسکتا ہے۔ یہ پیسے لینے کے بعد لوگوں کی تصویریں لیتے تھے اور صرف تصویروں پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ لوگوں کے راز بھی لیتے تھے۔

فرنٹیئر میں یہ خوانین سے بہت ملے وہاں نسل در نسل مخالفانہ ماحول چلتا ہے۔ جو خان ان سے ملتا تھا وہ ملک صاحب کی نیت جانے بغیر اپنے مخالف کی تمام برائیاں اور خامیاں غلیظ باتوں سمیت نوٹ کروا دیتے تھے۔ اور بعض اوقات اپنے مخالف کے تمام ثبوت بھی انہیں مہیا کر دیتا تھا۔ اس کے بعد وہ یہ توقع کرتا تھا کہ یہ سب کچھ پرچے میں چھپ جائے گا اور اس کا مخالف اب جہنم رسید ہو جائے گا۔ وہ کچھ پیسے دے کر ملک صاحب کو رخصت کرتا تھا۔ ملک صاحب نے اس قسم کے کئی راز وہاں اکٹھے کئے۔

اس کے بعد ملک صاحب اپنے طریقہ واردات کے عین مطابق اس مخالف کے پاس جاتے تھے اور اسے کہتے تھے کہ ہمارے پاس آپ کے سلسلے میں بہت سی چیزیں آئی ہوئی ہیں اور ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ چھاپنے سے پہلے آپ سے دریافت کرلیا جائے کیونکہ ہم بہت دیانتدار آدمی ہیں اور کبھی بھی یکطرفہ کارروائی نہیں کرتے۔ پھر ان کے پاس جتنی بھی ڈراؤنی معلومات ہوتی تھیں وہ اس طرح بیان کرتے تھے کہ سننے والے کے پسینے

چھوٹ جاتے تھے۔ اور اگر معلومات فراہم کرنے والے نے ایک سو روپیہ دیا ہوتا تو یہ انہیں دو سو روپے فراہم کرتا اور کہتا کہ یہ سب غلط بات ہے اور اسے کسی طرح رو کیے۔ ملک صاحب اس طرح دو طرفہ پیسے وصول کر رہے تھے۔

ایک واقعہ یوں ہوا کہ ضلع ہزارہ میں ایک ریاست امب کے نام سے تھی۔ نواب فرید خان اس ریاست کے والی تھے جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں جنہوں نے مجھ سے کبھی شاعری بھی کروائی تھی اور مجھے انعامات بھی دیئے تھے۔ نواب فرید خان قانونی طور پر اس ریاست کے حقدار بھی تھے لیکن ان کے ایک قریبی رشتہ دار کو اعتراض تھا اور اس کا کہنا تھا کہ وہ ناجائز طور پر گدی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ رشتہ دار مسلسل نواب صاحب کے خلاف مہم چلائے ہوئے تھا۔ اس کا ایک اور ساتھی اور عزیز پشاور میں رہتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ملک صاحب نے ان سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے انہیں شام کی چائے پر بلایا۔ میں نے پہلی بار ان نوابزادہ صاحب کے گھر بہت اچھی چائے پی۔ میں نے اس چائے کے ساتھ کئی ایسی چیزیں دیکھیں جو پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی چائے کے ساتھ بھی ایسا اہتمام ہوسکتا ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ کھانے کے ساتھ بھی اتنی اشیاء کا اہتمام نہیں ہوسکتا۔ بہرحال نوابزادہ صاحب نے ہمارے لیے بہت پرتکلف چائے کا اہتمام کیا۔

ملک صاحب کا اتفاق سے بایاں بازو کٹا ہوا تھا اور ان کا صرف ایک ہی ہاتھ تھا۔ لیکن کھانے پینے اور ہاتھ کی صفائی کے معاملات میں ان کا ایک ہاتھ بھی دو ہاتھ والوں سے زیادہ صفائی کرتا تھا۔ وہ کھاتے بھی جاتے تھے اور باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ اس موقع پر ان نوابزادہ صاحب نے نواب امب کے سلسلے میں جو باتیں کہیں ان میں ایسے بھیانک الزامات تھے کہ میں سن کر کانپ گیا۔ اس زمانے میں فوٹو سٹیٹ نہیں تھی لیکن انہوں نے ہاتھ سے کی ہوئی نقلوں کی شکل میں ملک صاحب کو کچھ ثبوت بھی فراہم کیے۔

ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو وہاں کے بڑے بڑے مسلم لیگی افراد سے ملے اور انہیں بتایا کہ ہم مشاہیر نمبر نکال رہے ہیں۔ انہیں بھی آرزو تھی کہ پاکستان کے قیام کے بعد

ان کا نام آنا چاہئے اور وہ بھی اپنے نام کی تشہیر چاہتے تھے۔ اس لیے ملک صاحب نے ان سے پیسے بٹورے۔ ملک صاحب ان لوگوں کے ساتھ مل کر جلسے میں تقریر بھی کرتے تھے اور تقریر اچھی ہوتی تھی۔ ایک تقریر میں انہوں نے انڈیا کے ہندوؤں کے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے اپنا کٹا ہوا بازو بلند کر کے کہا کہ ہندوؤں کے مظالم کا یہ جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ انہوں نے میرا بازو کاٹ دیا۔ حالانکہ ان کا بازو کسی آپریشن میں کٹا تھا کسی فرقہ ورانہ فساد میں نہیں کٹا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بازو سے بہت فائدہ اٹھایا اور کہتے تھے کہ مسلمانو! کیا تم بھی اپنا یہ حال دیکھنا چاہتے ہو۔ کیا تم بھی اپنے بازو کٹوانا چاہتے ہو؟ بہتر ہے کہ تم لوگ مسلم لیگ میں شامل رہو اور پاکستان کی جدوجہد کرو۔

ویسے تو پاکستان کی جدوجہد میں اس وقت سبھی مسلمان شریک تھے جو مسلم لیگ میں بھی شامل تھے۔ لیکن عام مسلمان تو اپنے خلوص نیت کی وجہ سے مسلم لیگ میں شامل تھے جبکہ ملک صاحب اپنے کٹے ہوئے بازو سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے چنانچہ جب وہ اپنا کٹا ہوا بازو لہرا کر کہتے تھے کہ میرے ساتھ ظلم ہوا ہے تو ان کے الفاظ میں کوئی خلوص نہیں ہوتا تھا۔ لیکن بہرحال اس کاروبار میں وہ خاصے کامیاب رہے۔

یہاں سے انہوں نے درمیانے درجے کے مسلمان لیڈروں سے بھی بہت سا روپیہ بٹورا جو بڑے درجے کے لیڈر بننا چاہتے تھے۔ پھر انہوں نے کوہاٹ کے مسلم لیگی لوگوں کی ایک فہرست بنائی اور ہم لوگ وہاں چلے گئے۔ اب صورت یہ تھی کہ ہم جہاں جاتے تھے ہمیں کھانا مفت مل جاتا تھا جبکہ کرایہ ملک صاحب لگاتے تھے۔ میرے پاس تو ایک کوڑی بھی نہیں تھی اور اس تمام عرصے میں ''پیغام سرحد'' کے لیے کوئی کام نہیں ہوا تھا۔ ملک صاحب صرف اپنے پرچے کا ذکر کرتے تھے اور ساتھ صرف اتنا کہہ دیتے تھے کہ ایک اور پرچہ بھی ہے جس کا نام ''پیغام سرحد'' ہے، اس میں بھی آپ کی مدد کی جائے گی۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنے کھاتے میں ہی دو پرچے ڈال کر پیسے بٹورتے رہے۔

اس کے بعد کوہاٹ والوں کی فہرست بنا کر وہاں چلے گئے۔ وہاں کے دو تین بڑے آدمیوں سے ان کی ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ جب ہمیں وہاں ٹھہرے ہوئے تیسرا دن تھا تو یہ

مجھے کہنے لگے کہ تم یہاں بازار میں بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔ اس کے بعد یہ شام تک نہیں آئے میں ان کی راہ ہی تکتا رہا۔ اس شہر میں میرا کوئی واقف نہیں تھا اور میرے پاس کھانے کے لیے بھی کوئی پیسہ نہیں تھا۔

اچانک ذہن میں آیا کہ وہاں ہری پور کے ایک صاحب ایس ڈی او ہیں۔ میں ان کا پتہ پوچھ کر وہاں گیا اور وہاں جا کر ڈیرا جمایا۔ لیکن شرمیلا اتنا تھا کہ ان سے یہ کہہ نہیں پایا کہ میرے پاس واپسی کا کرایہ نہیں ہے۔ میں وہاں کئی دن ٹھہرا رہا اور کھانا انہی سے کھاتا رہا۔ اس دوران گھر میں دو تین خط بھی لکھے لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ اس طرح دس پندرہ دن گزر گئے۔ وہاں سے میں نے کسی طرح خود ہی اپنی واپسی کا بندوبست کیا۔

یہاں قیام کے دوران جب میں نے ملک صاحب کے بارے میں پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا وہ نواب امب کے خلاف جمع شدہ مواد لے کر ریاست امب روانہ ہو گئے ہیں۔ بعد میں اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ جب میں ہری پور آیا تو پتہ چلا کہ ان دنوں میرے اہل خانہ ہی ہری پور گئے ہوئے تھے اس لیے ان کی طرف سے کوئی جواب نہ مل سکا تھا۔

اس طرح ملک محمد عمر کے ساتھ بھی دن گزرے جنہیں عرف عام میں ''ملک ٹنڈا'' کہا جاتا ہے۔

دو عظیم سربراہانِ شعبہ

ادبی صحافت میں میرا آغاز ''ادب لطیف'' سے ہوا۔ لیکن اس کے بعد ایک ایسا دور آیا کہ میں فلمی صحافت سے منسلک ہوا۔ اور اس وقت کے سب سے بڑے پرچے ہفتہ وار ''اداکار'' میں میں ایڈیٹر مقرر ہوا جو سید عطاء اللہ شاہ ہاشمی کی ملکیت میں چل رہا تھا۔ یہ پرچہ قیام پاکستان سے پہلے دو مقامات سے نکلتا تھا۔ ایک لاہور سے اور دوسرا ممبئی سے۔ قیام پاکستان سے پہلے سب سے بڑا فلمی پرچہ ''چترا ویکلی'' تھا۔ اس کے ایڈیٹر دھرم ویر تھے۔ یہ پرچہ بڑی تعداد میں بکتا تھا۔ اس میں لیٹر بکس کے عنوان سے ایک کالم ہوتا تھا۔ جس میں لوگ سوالات بھیجتے تھے۔ اور اس کالم میں ان سوالات کے جوابات دیئے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ انگریزی صحافت میں ''فلم انڈیا ممبئی'' میں بھی بہت مقبول تھا۔ اس کا معیار ''چترا'' سے بہت اونچا تھا اور اس کے جوابات بہت بامعنی ہوا کرتے تھے لیکن ''چترا'' کی سطح نیچی ہونے کے باوجود یہاں بھی یہ سلسلہ بہت پاپولر تھا۔ چنانچہ ''چترا'' اس زمانے میں فلمی پرچوں میں اول نمبر پر شمار ہوتا تھا جبکہ دوسرے نمبر پر ''اداکار'' آتا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد چترا ممبئی میں منتقل ہوگیا تو ''اداکار'' پاکستان میں فلمی پرچوں میں سرفہرست آ گیا۔ کسی زمانے میں میں اس پرچے میں افسانے لکھا کرتا تھا۔ اور حالات اور اتفاقات دیکھئے کہ میں اسی پرچے میں ایڈیٹر بھی مقرر ہوا۔ اتفاقات کا سلسلہ عجیب ہوتا ہے۔ جب میں فلمی نغمہ نگاری کے سلسلے میں لاہور بلایا گیا تو جس فلم کے لیے مجھے یہاں بلایا گیا تھا وہ قیام پاکستان کے بعد رک گئی۔ اور مکمل نہ ہوسکی۔ اس کے بعد پاکستان بننے

کے بعد کی پہلی فلم ''تیری یاد'' مجھے ملی جس کے پروڈیوسر دیوان سرداری لال تھے۔ یہ پکچر بھی درمیان میں ہی رہ گئی۔

اس کے بعد مجھے جو باقاعدہ فلم ملی وہ بھی سید عطاء اللہ شاہ ہاشمی کی تھی جس کا نام ''اکیلی'' تھا۔ گویا ''اداکار'' میں میں نے لکھنا شروع کیا، ''اداکار'' ہی میں ایڈیٹر مقرر ہوا اور ''اداکار'' میں رہتے ہوئے ہی نغمہ نگاری کی باقاعدہ ابتداء ''اداکار'' کے مالک عطاء اللہ شاہ ہاشمی کی فلم سے ہوئی۔ ''اکیلی'' کی نغمہ نگاری کے سلسلے میں میں الگ بات کر چکا ہوں۔ یہاں میں آپ کو فلمی صحافت کے کچھ تجربات بتانا چاہتا ہوں۔

فلم ''اکیلی'' بننی شروع ہوئی تو اس کا یونٹ الگ تھا اور اخبار ''اداکار'' کا عملہ الگ تھا۔ دونوں کا آپس میں انتظامی طور پر کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہر چند کہ دونوں کے مالک شاہ صاحب ہی تھے اور شاہ صاحب نے ''اداکار'' کا باقی کام کلیتہً میرے سپرد کر رکھا تھا۔ میں جو لکھتا تھا اس کی مجھے آزادی تھی۔ شاہ صاحب کی طرف سے کچھ عمومی ہدایات ہوتی تھیں جن کے تحت ہم کام کرتے تھے۔ ان کی پکچر کی کاسٹ میں راگنی ہیروئن تھیں۔ بے بی اختری پارٹیشن سے پہلے اس نام سے بہت مشہور ہوئی تھیں۔ اس فلم میں وہ سائیڈ ہیروئن تھیں۔ ان کا تعلق ہیرا منڈی سے تھا لیکن شادی ایک بڑے ادارے کے منیجر سے ہو جانے کے بعد انہوں نے اپنے رکھ رکھاؤ میں اضافہ کر لیا تھا اور ذرا ذرا سی بات پر Touchy ہو جاتی تھیں۔ ''فلم انڈیا'' اور ''چترا'' کی طرز پر ہم نے ''اداکار'' میں بھی سوال و جواب کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ اس میں کسی نے سوال کیا کہ بے بی اختری کا ایڈریس کیا ہے تو جو اس کا آبائی ایڈریس تھا وہ میں نے لکھ دیا یعنی ہیرا منڈی لاہور۔

یہ سوال و جواب کہیں اختری کے خاوند نے پڑھ لیا اور اسے محسوس کیا۔ حالانکہ اس میں کوئی بد دیانتی نہیں تھی۔ اس وقت تک بے بی اختری کا وہی ایڈریس تھا۔ اسی رات ایک دعوت میں عطاء اللہ شاہ ہاشمی، ان کے ساتھی کرشن کمار، جو اب کے خورشید ہیں اور جو اس فلم کے ڈائریکٹر تھے، اور فلم کا دوسرا سٹاف بھی موجود تھا۔ اس دعوت میں بے بی اختری اور ان کے خاوند نے شاہ صاحب سے بہت احتجاج کیا اور کہا کہ آپ کے پرچے میں ہمارے

ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ اور آپ اس کے ایڈیٹر کو نکال دیں۔ شاہ صاحب بڑے بہادر اور بااصول آدمی تھے۔ انہوں نے کہا کہ پرچے کا معاملہ الگ ہے اور پرچے کے ایڈیٹر کو ہم نے کلی اختیارات دے رکھے ہیں۔ اور اگر آپ کو ایڈریس پر اعتراض ہے تو آپ نیا ایڈریس دیدیں ہم وہ چھاپ دیں گے۔ وہ کہنے لگے کہ نہیں صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ایڈیٹر ساتھ معافی بھی مانگے۔ شاہ صاحب نے کہا کہ اس میں معافی کا کیا سوال ہے۔ جو کچھ ہوا ہے غلط فہمی سے ہوا ہے اور بدنیتی پر مبنی نہیں ہے۔ اس لیے معافی کی ضرورت نہیں ہے۔ بے بی اختری اور ان کے خاوند مصر ہو گئے کہ پرچے کے ایڈیٹر ہم سے معافی مانگیں ورنہ ہم فلم میں کام نہیں کریں گے۔ فلم کی دو ریلیں بن چکی تھیں۔ شاہ صاحب نے کہا کہ پرچے اور فلم کے معاملات الگ الگ ہیں اس لیے آپ فلم میں کام کو پرچے کے ساتھ منسوب نہ کریں۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ جن کے ساتھ ان کا واسطہ پڑا ہے۔ وہ عطاء اللہ شاہ ہاشمی ہیں۔ شاہ صاحب ان دنوں آگ تھے۔ اور بڑی بڑی اصولی لڑائیاں لڑ چکے تھے۔ اور ساری فلم انڈسٹری ان سے گھبراتی تھی اور اب بھی جو باقیات وصالحات تھے یہی کچھ تھے۔ چنانچہ شاہ صاحب نے کہا کہ آپ اچھی طرح سوچ لیں۔ کیونکہ ''اداکار'' اور ''اکیلی'' دونوں الگ الگ ادارے ہیں۔ ہم یہ تو کر سکتے ہیں کہ آپ پرچے پر کیس کر دیں۔ میں مداخلت نہیں کروں گا اور اگر آپ کی واقعی توہین ہوئی ہے تو ایڈیٹر کو عدالت سے سزا مل جائیگی۔ وہ کہنے لگے کہ میں فلم کا آپ کو معاوضہ دے رہا ہوں جس میں آپ کام کر رہی ہیں۔ اگر آپ فلم میں کام نہیں کریں گیے تو یہ آپ کی مرضی ہے اور پھر ہمیں یہ حق ہوگا کہ آپ ہمیں بلاوجہ جو نقصان دیں گی اس کے ازالے کے لیے ہم عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ غرض بات بڑھ گئی اور بے بی اختری نے کہہ دیا کہ ہم فلم میں کام نہیں کریں گے۔

ہوا یوں کہ اگلے دن شاہ صاحب نے یہ کہا کہ فلم میں بے بی اختری کا جتنا کام ہو چکا تھا۔ قینچی رکھوا کر اسے کاٹا اور اس کام کا ایک رول بنا کر شاہ صاحب نے بے بی اختری اور ان کے شوہر کو بھیج دیا اور کہا کہ یہ رول اپنے پاس رکھیں اور انشاء اللہ یہ آپ کی آخری فلم کی

شوٹنگ ثابت ہوگی۔ اس کے رول کو اچھے وقتوں کی یادگار سمجھ کر دونوں میاں بیوی دیکھتے رہیے۔ اس کے ساتھ ہی شاہ صاحب نے بے بی اختری کو اپنی فلم سے الگ کرنے کی نیوز چار کالمی چھاپی۔ اور عطاء اللہ شاہ ہاشمی صاحب کی زبان ایسی سچی ثابت ہوئی کہ وہ فلم واقعی بے بی اختری کی آخری فلم ثابت ہوئی اور اس کے بعد کسی نے اسے اپنی فلم میں کاسٹ نہیں کیا۔ اور اچھا ہی ہوا کہ اس طرح وہ اپنی گھریلو زندگی میں آباد ہوگئی۔

اصول کی بات ہے۔ کوئی اور ہوتا تو اپنا نقصان نہ کرتا کیونکہ اس جھگڑے میں شاہ صاحب کا بھی نقصان ہوا اور انہیں بے بی اختری کی جگہ دوسری اداکارہ ڈال کر ازسرنو جن مناظر کی شوٹنگ کرنی پڑی ان سے خرچ بڑھا۔ لیکن شاہ صاحب یہ خرچ برداشت کر گئے۔ مگر انہوں نے اپنے پرچے کے ایڈیٹر کی توہین برداشت نہیں کی۔

میں اب بھی اس واقعہ پر فخر کرتا ہوں کہ مجھے پرچے کا مالک ایسا ملا جس نے مجھے کسی کے سامنے LEAD DOWN نہیں کیا۔

اس طرح صبیحہ خانم فلم انڈسٹری میں نئی نئی آئی تھیں۔ ان کے سرپرست ہمارے ایک دوست اداکار تھے۔ انہوں نے پہلے سٹیج اور تھیٹر سے کام شروع کیا تھا۔ یہ درست ہے کہ شروع میں ہر آدمی اسی طرح آغاز کرتا ہے اور شروع میں کچھ بھی نہیں ہوتا اور اس وجہ سے پبلسٹی کے ذرائع بھی تلاش کرتا ہے۔ لیکن ان کے سرپرست نے یوں کیا کہ صبیحہ کے نام کے بعد ایم اے لگانا شروع کیا۔ میں نے ''اداکار'' میں اپنے طنزیہ کالم میں اس بات پر تبصرہ کیا۔ یہ انہیں برا لگا اور وہ صاحب ناراض ہوئے۔

انہوں نے پہلے تو مجھے پیغام بھیجا کہ آپ نے جو کچھ کیا ہے اس سے صبیحہ کی بے عزتی ہوئی ہے اور ہم آپ کی ٹانگیں توڑ دیں گے۔ اخبار نویسی میں یہی کچھ ہوتا ہے اور سب سے پہلے ٹانگیں توڑنے کی ہی دھمکی آتی ہے۔ پھر اگر ایڈیٹر اپنے قدموں پر مضبوط ہے تو دوسرا پیغام یہ آیا کرتا ہے کہ ہم آپ پر کیس کر دیں گے۔ اس پر بھی اگر ایڈیٹر ثابت قدم رہے تو پھر درمیان میں صلح کے لیے آدمی پڑ جاتے ہیں۔ اور اگر پارٹی تھوڑی سی مالدار ہے اور اخبار والا تھوڑا سا بلیک میلر ہے تو معاملہ پیسوں پر طے ہوتا ہے۔ یہ بات میں اپنی فلمی اخبار

نویسی کے حوالے سے کر رہا ہوں۔

چنانچہ جب مجھے دھمکی ملی کہ ٹانگیں توڑ دیں گے تو میں نے اور لکھا۔ اس کے بعد مجھے کیس کی دھمکی آئی تو میں نے پھر اور لکھا۔ اس کے بعد ہمارے ایک دوست آغا سلیم رضا مرحوم کو بیچ میں ڈالا گیا۔ وہ میرے پاس آئے اور مجھے کہنے لگے کہ قتیل صاحب ان کا پیچھا چھوڑیئے۔ میں نے کہا کہ میں تو ان کا پیچھا چھوڑتا ہوں لیکن یہ میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہے۔ ہر روز ہی کوئی نہ کوئی دھمکی آ جاتی ہے۔ کہنے لگے کہ میں جانتا ہوں کہ وہ کوئی عقلمند آدمی نہیں ہے۔ پھر کہنے لگے کہ میں اس کو کسی دن یہاں لے آؤں۔ میں نے کہا لے آیئے میرا ان سے کوئی ذاتی جھگڑا نہیں ہے۔ آغا سلیم رضا جب ان صاحب کو لے کر آئے تو انہوں نے آ کر ہاتھ ملایا اور جب دیکھا کہ میں پیار سے بات کر رہا ہوں تو انہوں نے وہی سرالا پنا شروع کیا اور کہا کہ جناب آپ نے عورت سمجھ کر صبیحہ کے ساتھ کیا ہے۔ کسی مرد کے بارے میں لکھتے تو اور بات ہوتی۔ میں نے ان کے منہ کی طرف دیکھا اور کہا کہ بھائی میں نے آغا سلیم رضا کی وجہ سے آپ کو یہاں آنے دیا ہے۔ اور بات ختم کرنے لگا ہوں۔ لیکن آپ بات بڑھا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ سمجھ لیجئے کہ میں نے یہ سب عورت کے بارے میں نہیں لکھا بلکہ آپ کے بارے میں لکھا ہے۔ اب آپ بتایئے۔ چنانچہ میں گرم ہو گیا تو آغا سلیم رضا نے مجھے ٹھنڈا کیا۔

بات آخر مالک تک بھی جاتی ہے اور یہ دعویٰ بھی ہوتا ہے کہ یہ ایڈیٹر کیا چیز ہے۔ یہ بات ہے بھی درست کیونکہ مالک جسے چاہے نکال دے اور جسے چاہے رکھ لے۔ لیکن انہیں یہ نہیں پتہ تھا کہ اس پرچہ کے مالک عطاء اللہ شاہ ہاشمی ہیں۔ وہ صاحب میرے پاس سے تو ٹھیک ٹھاک اٹھے لیکن بعد میں شاہ صاحب کے پاس چلے گئے اور ان سے کہا کہ آپ کے پرچے کے ایڈیٹر نے بہت زیادتی کی ہے اس کی تلافی ہونی چاہئے۔ کیونکہ انہوں نے اخبار کے دفتر میں بھی ہماری بڑی بے عزتی کی ہے۔ یہ صاحب ابھی زندہ ہیں اور میں عمداً ان کا نام نہیں لینا چاہتا۔ اس زمانے میں بڑے تلخ لہجے کے ہوتے تھے اب کچھ مختلف ہیں۔ خیر شاہ صاحب نے ان سے تفصیل پوچھی تو آغا سلیم رضا نے کہا کہ یار آپ نے بھی

تو کچھ زیادتی کی تھی اور آپ نے بھی تو کہا تھا کہ میرے بارے میں لکھتے تو میں یہ کر دیتا۔ شاہ صاحب فوراً بات کی تہہ تک پہنچ گئے انہوں نے پوچھا کہ انہوں نے قتیل صاحب سے کہا تھا کہ اگر آپ میرے بارے میں لکھ دیتے تو میں یہ کر دیتا۔ آغا صاحب کہنے لگے کہ ہاں اتنا کہا تھا۔ شاہ صاحب کہنے لگے کہ اگر میں قتیل صاحب کی جگہ ہوتا تو آپ کو دھکے دے کر سیڑھی سے نیچے گرا دیتا۔ شکر کریں میں نہیں تھا اور آپ بچ گئے۔ اور انہیں کہنے لگے کہ آپ آئندہ ایسی بات مت کریں اور اب آپ کے بارے میں بھی سب کچھ لکھا جائے گا۔ وہ صاحب بالکل گھبرا گئے اور اس کے بعد ان صاحب نے شاہ صاحب کے پاؤں پکڑ لیے۔

یہ عطاء اللہ شاہ ہاشمی اور ایک مالک اخبار کا کردار تھا جو کہ کبھی اور کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ اور میں نے ان کی وجہ سے اتنے ٹھاٹھ سے فلمی اخبار نویسی بھی کی۔ اب کسی کا درد محسوس کر کے حق و انصاف کی بنیاد پر ساتھ دینے والے لوگ بہت کم نظر آتے ہیں۔ نغمہ نگاری میں بھی یہ مشکل پیش ہوتی ہے۔

فلم میں پروڈیوسر کی طرف سب کی نظریں ہوتی ہیں کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اگر وہ کسی فنکار سے آنکھیں بدل لے تو سارے آنکھیں پھیر لیتے ہیں اور فن کار کی کوئی سائیڈ نہیں لیتا۔ فلم میں ایکٹر کا تو کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ خواہ وہ کتنی بھی زیادتیاں کرے نہ تو پروڈیوسر اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے اور نہ ہی ڈائریکٹر اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ پس پردہ کام کرتے ہیں ان کی سروسز ہمیشہ خطرے میں پڑی رہتی ہیں اور ڈائریکٹر یا پروڈیوسر چاہے تو ان کو نکال کر ان کی جگہ کسی اور آدمی کو کھڑا کر سکتا ہے۔

۱۹۴۹ء کا واقعہ ہے کہ ایک فلم بن رہی تھی جس کے ڈائریکٹر سبطین فضلی تھے۔ جو بڑے مشفق دوست بھی تھے اور اپنے وقت کے نامور آدمی بھی تھے۔ اس فلم کے میوزک ڈائریکٹر ماسٹر غلام حیدر تھے۔ خدا انہیں جنت نصیب کرے۔ بڑے پائے کے میوزک ڈائریکٹر تھے اور اعلیٰ درجے کے انسان تھے۔ اس فلم میں میں اور طفیل ہوشیار پوری شاعری کر رہے تھے۔ فلم کمپنی کے پروڈیوسر، انچارج یا پروڈیوسر کے منیجر ایک وکیل صاحب تھے۔

اب وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ خدا ان پر رحمت کرے۔ اس فلم کے پروڈیوسر فرید سنز والے تھے۔ جنہوں نے فضلی صاحب کو پکچر کے لیے فنانس کیا تھا۔ انہیں یہ فلم بنوانے کی ضرورت شاید اس لیے محسوس ہوئی کہ انہیں فضلی صاحب کے بڑے بھائی جو غالباً سیکرٹری صنعت تھے سے کوئی کام آپڑا تھا۔ چنانچہ فرید سنز والے اس فلم کے پروڈیوسر تھے اور وہ ایڈووکیٹ ان کے منیجر تھے۔ کیونکہ وہ ویسے بھی ان کے ادارے کی طرف سے وکالت کرتے تھے۔ یہ صاحب ویسے بھی کچھ گڑبڑ تھے۔ وہ ادائیگی کے سلسلے میں اکثر وعدہ خلافیاں کرتے تھے۔

ایک بار میں اپنے دوگانوں کی ادائیگی کے لیے ان کے پاس گیا۔ یہ دونوں گانے مکمل ہو چکے تھے۔ انہوں نے کہا کہ کل پیسے دیں گے۔ زمانہ ایسا تھا کہ تلی میں آیا گلی میں کھایا والی بات تھی۔ ادھر سے پیسے ملتے تھے اور ادھر پہلے سے کچھ بل سر پر ہوتے تھے۔ ورنہ تو کوئی بات نہیں ہوتی اگر پیسے ایک دو دن لیٹ بھی ہو جائیں تو کوئی بات نہیں لیکن اس زمانے میں ہاتھ بہت تنگ ہوتا تھا۔ میں نے ان کے پاس اگلے دن گیا تو پیسے نہ ملے۔ میں نے کہا کہ آج تو کوئی بات نہیں ہے لیکن آپ اگلا وعدہ ٹھیک ٹھاک کریں۔ کہنے لگے کہ میں پرسوں ادائیگی کردوں گا۔ پرسوں آئی تو انہوں نے پھر عذر کیا تو میں نے کہا کہ ادائیگی کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ کہنے لگے کہ ہمیں بس آپ ہی کے پیسے نہیں دینے ہیں۔ دنیا میں اور بھی کئی مجبوریاں ہیں۔

اس زمانے میں میں بہت تیز ہوتا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ کی مجبوریوں کی ایسی تیسی، میں آپ کی مجبوریوں کا پابند نہیں ہوں۔ میں نے کہا کہ لائیے میرے کاغذ۔ بھاڑ میں جائیں آپ کے پیسے۔ میں آپ کے گانے لکھتا ہی نہیں۔ انہوں نے سوچا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ گانے کسی دوسرے شاعر سے لکھوالیں گے۔ چنانچہ وہ کہنے لگے کہ آپ اپنے گانے واپس لے لیں اور انہیں پھاڑ دیں ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے۔ میں وہاں سے اٹھ کر .H.M.V کے دفتر میں آ گیا۔ ماسٹر غلام حیدر ابھی نہیں آئے ہوئے تھے البتہ ان کے ایک اسسٹنٹ موجود تھے میں انہیں سارا واقعہ بتا کر کام چھوڑ کر واپس گھر چلا آیا۔

بعد میں ماسٹر غلام حیدر آئے تو انہوں نے اپنے اسسٹنٹ سے پوچھا کہ آج قتیل صاحب نہیں آئے تو انہوں نے بتایا کہ ان کے ساتھ یہ واقعہ ہوا ہے۔ اور پروڈکشن منیجر نے ان کے ساتھ وعدہ خلافی کی تھی جس سے تلخی پیدا ہوئی اور وہ چلے گئے ہیں اور جاتے ہوئے یہ کہہ کر گئے ہیں کہ میں کام نہیں کروں گا۔ ماسٹر صاحب نے فضلی صاحب کو بلایا۔ ماسٹر غلام حیدر ایک عظیم انسان تھے۔ انہوں نے میرے لیے جو قدم اٹھایا میں نے ان سے بڑا کسی اور میوزک ڈائریکٹر کو قدم اٹھاتے نہیں دیکھا۔ انہوں نے فضلی صاحب کو سارا واقعہ سنایا اور کہا کہ اس میں قصور کس کا ہے؟ فضلی صاحب نے کہا کہ پروڈکشن منیجر کا قصور ہے۔ کہنے لگے کہ کیا آپ گوارا کریں گے کہ قتیل صاحب یوں ناراض ہو کر چلے جائیں۔ کہنے لگے کہ وہ ہمارے دوست بھی ہیں لیکن آپ یہ بتائیں کہ اصولی طور پر کیا ہونا چاہئے۔

فضلی صاحب نے کہا کہ پروڈکشن منیجر کی ایسی تیسی۔ اسے قتیل صاحب سے وہاں جا کر معافی مانگنا چاہئے اور پیسے بھی وہاں جا کر ادا کرنے چاہئیں۔ چنانچہ فریدسنز میں ایک مسئلہ بن گیا۔ فضلی صاحب نے ان سے کہا کہ گیت قتیل صاحب ہی کے ہوں گے اور آپ کا آدمی انہیں پیسے بھی پہنچائے گا اور جا کر ان سے معافی بھی مانگے گا۔ پروڈکشن منیجر کہیں دوسرے شہر میں جا چکا تھا۔ فریدسنز والوں نے فضلی صاحب سے کہا کہ آپ ہم سے پیسے لے لیں اور قتیل صاحب کو پہنچا دیں۔ چنانچہ ماسٹر غلام حیدر اور فضلی صاحب پیسے لے کر خود میرے گھر پر پہنچے۔ مجھے پیسے دیئے اور کہا کہ آپ نے جو کیا ایسے ہی کرنا چاہئے تھا اور وہ آ کر آپ سے معافی بھی مانگے گا۔ چنانچہ بعد میں پروڈکشن منیجر نے خود آ کر مجھ سے معافی بھی مانگی اور میں عزت سے وہاں جانے لگا۔

ایسے سربراہان شعبہ بہت کم ملتے ہیں جو اپنے ساتھیوں کی عزت رکھیں اور ان کی خاطر لڑیں میں نے اس طرح کے لوگوں میں عطاء اللہ شاہ ہاشمی، ماسٹر غلام حیدر اور سبطین فضلی کو دیکھا ہے۔ یہ لوگ آج بھی میرے ذہن میں دیوتا کی طرح کھڑے ہیں۔ جنہوں نے یہ پروا کئے بغیر کہ جھگڑا بڑھ کے ان کی علیحدگی کا باعث بن سکتا ہے میری پاسداری کی۔

کچھ احسان فراموش دوست

بعض لوگ اصول کی خاطر اپنے مفادات سے بھی کھیل جاتے ہیں اور اپنے اصولوں پر آنچ نہیں آنے دیتے۔ مگر بیشتر لوگ ایسے ہیں جو اپنے مفاد پر تھوڑی سی زد پڑنے کے ڈر سے بھی پرانی دوستی کو بھول جاتے ہیں۔ اور احسانات کو نظر انداز کر کے وہ کچھ بھی کر گزرتے ہیں جو انہیں نہیں کرنا چاہئے۔ بڑی سطح پر سیاسیات میں آپ کو اس طرح کی کئی مثالیں مل جائیں گی کہ ایک شخص نے آپ کے ساتھ مروت کا سلوک کیا اور دوسروں کو نظر انداز کر کے آپ کو ترقی کی اعلیٰ سیڑھی پر پہنچا دیا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے آپ اتنے بدل گئے کہ اپنے محسن کو ڈس لیا اور یہ بھی پروا نہیں کی کہ دنیا آپ کو کیا کہے گی۔ سیاست میں اس کی زندہ مثال ہمارے اپنے ہی زمانے میں میں موجود ہے۔ لیکن چھوٹے پیمانے پر دیکھیں تو کئی معاملات ایسے ہیں کہ آپ کو اپنے ہی دوستوں میں اس کی مثالیں مل جائیں گی۔

ایوب خان کے مارشل لاء کا زمانہ تھا۔ جب پہلی بار اخبارات کی آزادی پر زد پڑی تو پروگریسو پیپرز کے اخبارات پاکستان ٹائمز، امروز اور لیل ونہار قومیا لیے گئے اور ردعمل میں بعض اصول پرست لوگوں نے وہاں سے مستعفی ہونا مناسب سمجھا۔ ان مستعفی ہونے والوں میں سے ایک حضرت احمد ندیم قاسمی تھے جو اس وقت ''امروز'' کے ایڈیٹر تھے۔ جب ان کا استعفیٰ گیا تو قدرت اللہ شہاب بار بار ان کے پاس آئے انہیں اپنے ساتھ لے کر گئے اور لمبی چوڑی محفلوں میں انہیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنا استعفیٰ واپس لے لیں کیونکہ

آپ کا امروز کا ایڈیٹر رہنا آپ کی اصول پرستی کے خلاف نہیں ہے۔ اگر آپ سرکار کی ملازمت میں بھی ہوتے تو بھی ڈیوٹی کرتے۔ یہ شہاب صاحب کی نیک دلی تھی کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ قاسمی صاحب بیروزگار ہو جائیں لیکن قاسمی صاحب نہیں مانے اور انہوں نے بیروزگار ہونا مناسب سمجھا۔

قاسمی صاحب اس زمانے میں نسبت روڈ پر دیال سنگھ لائبریری کے پیچھے ایک مکان میں رہتے تھے۔ ان کے پاس قرب و جوار میں ان کے وہ دوست بھی رہتے تھے جن پر قاسمی صاحب کے احسانات بھی تھے اور ان کے ساتھ دوستی کے رشتے بھی بڑے استوار تھے۔ قاسمی صاحب کو بیروزگار ہوئے چار مہینے گزر گئے لیکن ان کا کوئی دوست ان سے یہ پوچھنے بھی نہیں آیا کہ آپ کس حال میں ہیں۔ اور یوں بھی ہوا کہ اگر قاسمی صاحب کے راستے سے کوئی اور آشنا آ رہا ہوتا تو وہ راستہ بدل کر گزر جاتا۔

ایک صاحب قاسمی صاحب کے پڑوس میں رہتے تھے۔ ایک دن مجھ سے ملے اور قاسمی صاحب کا ذکر آیا تو میں نے کہا کہ قاسمی صاحب سے آپ کی ملاقات نہیں ہوئی۔ کہنے لگے کہ نہیں قتیل میں تو یہ سوچتا ہوں کہ میں انہیں اس حال میں دیکھوں گا تو میرا کیا حال ہوگا۔ میں نے کہا کہ ان کا کیا حال ہے۔ انہوں نے بڑے ہونے کا ثبوت دیا ہے اور اصول پرستی کی ہے۔ یہ حال دیکھ کر تمہیں غش پڑ جائے گا۔ میں نے کہا کہ کونسی ان کی ایسی حالت ہے؟ کہنے لگے کہ دراصل وہ چار مہینے سے بیکار ہیں۔ میں نے کہا کہ شاید اس واسطے ہی آپ کو غش پڑ جائے گا کہ کہیں وہ آپ سے کچھ مانگ نہ بیٹھیں۔ میں نے کہا کہ قاسمی صاحب کے چاہنے والے بے انتہا ہیں اور پھر وہ گھر سے بھی اتنے گئے گزرے نہیں ہیں کہ ان پر فاقوں کی نوبت آ جائے۔ تم ان کے پاس جاؤ۔ تمہیں یہ دیکھ کر خوشی ہوگی کہ وہ آج کل بھی پہلے سے زیادہ گھر بیٹھے کما رہے ہیں اور اگر نہ بھی کماتے ہوتے تو وہ پہلے بھی تم سے مروت کرتے تھے اور اب بھی مروت کرتے اور پوچھتے کہ بھائی تمہیں کوئی ضرورت ہے تو لے جاؤ۔ ان صاحب کی طرف سے نہ ملنے کا دراصل یہ ایک عذر لنگ تھا۔ درحقیقت لوگ ڈرتے تھے کہ مارشل لاء کو قاسمی صاحب نے آنکھیں دکھائی ہیں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ ان سے ملنے جلنے سے سی آئی ڈی والے ہمارے پیچھے پڑ جائیں۔ چنانچہ ایسے افراد کے

دلوں میں بزدلی بھی تھی اور مصلحت اندیشی بھی تھی۔

ایسے حالات میں کچھ لوگ کس طرح کام آتے ہیں؟ یہ بھی دیکھئے۔ میں نے قاسمی صاحب کو مشورہ دیا کہ آپ فلموں کے لیے مکالمے لکھئے اور میرا خیال ہے کہ آپ اس کام کے لیے بہت ہی مناسب ہیں۔ ان سے یہ بات کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں فلم لائن میں سانگ رائیٹر کے طور پر موجود تھا اور میں اس زمانے میں فلم لائن میں سب سے زیادہ مصروف آدمی تھا اور میری اس زمانے میں سنی بھی جاتی تھی۔ اور قاسمی صاحب کا اپنا بھی بہت زیادہ نام تھا۔ میں اگر ان کا نام پیش کرتا تو کسی کو اس پر اعتراض کی گنجائش نہ ہوتی بلکہ لوگ خوش ہوتے۔ چنانچہ میں نے قاسمی صاحب کو راغب کیا کہ فلم کے لیے لکھیں۔ میں نے جس شخص سے بھی بات کی اس نے یہی کہا کہ اس سے بہتر کیا ہوسکتا ہے کہ قاسمی صاحب ہمارے لیے لکھیں۔

اس موقع پر فضلی صاحب ایک بار پھر کام آئے۔ میں نے جب ان سے بات کی تو کہنے لگے کہ صاحب ہماری ایسی قسمت کہاں کہ وہ ہمارے لیے ڈائیلاگ لکھیں۔ فضلی صاحب نستعلیق آدمی تھے۔ اور ان کا بات کہنے کا یہ ایک انداز تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ قاسمی صاحب آپ کے لیے لکھیں گے۔ میں نے فضلی صاحب کو بتایا کہ تین چار اور پروڈیوسر بھی قاسمی صاحب سے لکھوانے کی ہامی بھر چکے ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ قاسمی صاحب کے سٹینڈرڈ کا پروڈیوسر ہو جس کی بات قاسمی صاحب سمجھ سکیں اور جو خود بھی قاسمی صاحب کی بات سمجھ سکے جس سے قاسمی صاحب آغاز کریں۔ میں نے کہا کہ میری نظر میں آپ قاسمی صاحب کے لیے بہترین پروڈیوسر ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس سے بہتر کوئی بات نہیں ہے۔ آپ معاملہ طے کروا دیجئے اور قاسمی صاحب جو کہیں میں اس کے لیے حاضر ہوں۔ چنانچہ قاسمی صاحب کا سلسلہ بڑے معقول پیسوں سے طے ہوگیا۔ اس زمانے میں ڈائیلاگ رائٹر جتنے پیسے لیتا تھا اس سے کم و بیش ڈیڑھ گناہ معاوضہ پر قاسمی صاحب سے معاملہ طے کیا گیا۔ اور فلم کا آغاز کر دیا گیا۔ لیکن فضلی صاحب کا مزاج دھیما سا تھا۔ وہ کام جلدی نمٹانے کی یا تو اہمیت نہیں رکھتے تھے اور یا پھر سوچتے بہت تھے۔ کچھ وہمی تھے اور بعض چیزیں بنا بنا کر توڑتے رہتے تھے۔ اس طرح معاملہ آگے نہیں بڑھ پاتا تھا۔ تاہم

قاسمی صاحب نے اس زمانے میں اپنے ڈائیلاگ مکمل کر لیے تھے اور انہیں معاوضہ بھی پورا مل چکا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ کچھ اور پروڈیوسروں سے بھی ہماری وساطت ہے قاسمی صاحب کا معاملہ طے ہوا اور بیروزگاری کے زمانہ میں عزت آبرو سے قاسمی صاحب کا کام چلتا رہا۔

میں موازنہ کر کے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بیشتر لوگ ایسے ہیں جو مشکل وقت میں کام نہیں آتے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی مل جاتے ہیں جو مشکل وقت میں کام بھی آتے ہیں اور اس میں خوشی بھی محسوس کرتے ہیں۔ میرا معاملہ تو یہ تھا کہ میں تو قاسمی صاحب کا شاگرد تھا اور میرا تو فرض تھا کہ میں ان کے کام آؤں۔ لیکن اس سلسلے میں کچھ اور لوگوں نے بھی میرے ساتھ شمولیت کی جنہیں میں آج بھی داد دیتا ہوں کہ انہوں نے جوہر شناسی کا ثبوت دینے کے علاوہ ایک ایسے بڑے ادیب کا ہاتھ بٹایا جو بظاہر فلم کے لیے کام نہیں کرتا تھا لیکن فضلی صاحب کے اس زمانے کے ریمارکس میں آپ کو بتاتا ہوں۔ انہوں نے جب قاسمی صاحب کا سکرپٹ دیکھا تو کہا کہ قاسمی صاحب نے میرا تو مسئلہ ہی حل کر دیا ہے کیونکہ مجھے یہاں سکرین پلے لکھنے والا کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے جو ڈائیلاگ لکھے ہیں ان کے ساتھ سکرین پلے اتنا مکمل ہے کہ مجھے آدھی ڈائریکشن تو اس میں سے ہی ملتی نظر آتی ہے۔ فضلی صاحب نے مجھے کہا کہ قاسمی صاحب سے کہیے کہ وہ اس کام کو جاری رکھیں کیونکہ ان سے زیادہ مناسب آدمی مجھے نظر نہیں آتا۔

لیکن حقیقت یہ تھی کہ خدا جانے کیوں قاسمی صاحب اپنی نسبت فلمی ڈائیلاگ سے مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ یہ نہیں کہ وہ فلمی کام کو برا سمجھتے تھے۔ ان کے سامنے راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر جیسے ان کے پیشرو بھی موجود تھے جو فلم میں کام کر چکے تھے اور اپنی قابلیت کا لوہا منوا چکے تھے۔ چنانچہ قاسمی صاحب اس بات کے قائل بھی تھے لیکن کہتے تھے کہ میرا دل اندر سے اس کام کے لیے مائل نہیں ہو پاتا۔ بہرحال ان کا وہ زمانہ خیریت سے گزر گیا اور آگے حالات بدلے تو انہوں نے فلم سے کبھی اپنی رغبت کا اظہار نہیں کیا۔

احمد راہی

فلم لائن ایک ایسی لائن ہے جب مقبولیت کا ہما کسی کے سر پر بیٹھتا ہے تو اس کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ ہم معقول آدمی اس کو سمجھتے ہیں جو اس عرصے سے فائدہ اٹھائے اور کمائے بھی اور بچائے بھی۔ میری نظر میں کمانا ایک الگ فن ہے اور بچانا ایک الگ فن ہے جو کمانے کے فن سے زیادہ مشکل ہے۔

احمد راہی کا فلم میں بھرپور زمانہ فلم ''ہیر رانجھا'' سے شروع ہوا۔ اس فلم کی کامیابی احمد راہی کے لیے داد اور دولت کے انبار لے کر آئی۔ لیکن راہی اسے سنبھال نہ سکا۔ وجہ یہ ہوئی کہ اس عرصے میں اسے دن میں بادہ نوشی کرنے کی لت لگ گئی۔ جب تک وہ شام کو پیتا تھا اس وقت تک کام بھی چل رہے تھے اور کسی کو اس سے شکایت بھی نہیں تھی اور نہ ہی اس کی زندگی کسی طرح متاثر ہو رہی تھی۔ لیکن دن کا پینا اس کے زوال کا آغاز ثابت ہوا۔

احمد راہی نے رائل پارک میں ایک مکان لے رکھا تھا جسے دوست احمد راہی کا کلب بھی کہتے تھے۔ کلب یوں کہ احمد راہی اس زمانے میں غیر شادی شدہ تھا اور اکیلا تھا۔ اس نے ایک نوکر رکھا ہوا تھا جو دوستوں کی خدمت کرتا رہتا تھا۔ شروع شروع میں تو لوگ شام کو وہاں آتے تھے اور احمد راہی ان کی تواضع کرتا تھا۔ لیکن کچھ دوست ایسے بھی تھے جو اپنا مال مسالہ ساتھ لے آتے تھے۔ احمد راہی کے گھر میں اس کی ہنڈیاں پک رہی ہوتی تھیں جو کبھی تو اس کا نوکر پکاتا تھا اور کبھی وہ خود پکاتا تھا۔

احمد راہی ایک اچھا شاعر ہی نہیں بلکہ ایک اچھا باورچی بھی ہے اور جب ترنگ میں

آتا ہے تو اپنے ہاتھ سے دوستوں کو کھانے پکا کر کھلاتا ہے۔ اس زمانے میں احمد راہی فلم لائن میں عروج پر تھا۔ پیسے خوب آ رہے تھے۔ نجانے کس طرف سے اسے انگیخت ہوئی کہ وہ کثرت بادہ نوشی کا شکار ہو گیا اور جس وقت بھی اسے دیکھو وہ پی رہا ہوتا تھا۔ اس کے وہ دوست جنہیں مفت خورا کہا جائے تو مناسب ہے وہ احمد راہی کے پاس بیٹھے ہوتے تھے۔ اور احمد راہی کبھی خوش دلی سے اور کبھی بادل نخواستہ ان کی تواضع کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ پنجابی فلموں کے پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں کا یہ حال تھا کہ وہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگتے تھے اور وہ انکار کئے چلا جاتا تھا۔ بلکہ بعض جگہوں سے اس نے ایڈوانس کی رقم لے لی اور کام کی ہامی بھی بھری لیکن وقت پر کام کر کے نہ دے سکا۔

بیچ میں کچھ ایسا بھی ہوا کہ جیسے کوئی آرٹسٹ ذہنی آسودگی کے لیے حسن و جمال کے جھمیلوں میں پڑ جاتا ہے احمد راہی بھی اختر شیرانی کی شاعری سے ایک نام عذرا کے نام والی ایک طوائف سے دل لگا بیٹھا۔ کچھ اس کی توجہ اس کی طرف ہو گئی اور کچھ بادہ نوشی کی طرف اور یہ دونوں چیزیں اس کے حق میں اچھی نہ رہیں۔ اور تو اور دوستوں کو بھی گلہ ہونے لگا کہ احمد راہی کام نہیں کرتا۔

خواجہ خورشید انور مرحوم خود کسی زمانے میں شاعر تھے۔ ان کی صلاحیتوں کا یہ عالم تھا کہ وہ نہ صرف ایک بہت اچھے میوزک ڈائریکٹر تھے بلکہ فلم کے اچھے ڈائریکٹر بھی تھے۔ انہوں نے بعد میں جو فلمیں ڈائریکٹ کیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنے بڑے ڈائریکٹر بھی تھے۔ پھر ڈائیلاگ میں بھی ان کا ہاتھ ہوتا تھا۔ فلم میں مکالمہ نگاری میں نام بالعموم کسی اور کا ہوتا تھا لیکن کافی کام ان کا اپنا ہوتا تھا کیونکہ یہ ابتدائی طور پر کسی سے ڈائیلاگ لکھوا لیتے تھے لیکن جب ڈائیلاگ کسی حد تک پسند نہ آتے تو خود بھی لکھنے بیٹھ جاتے تھے۔ مگر نام اسی کا دیتے تھے جس سے مکالمہ نگاری کا معاہدہ ہوتا تھا۔

گانوں کے سلسلے میں ان کا قاعدہ یہ تھا کہ اُردو فلموں میں وہ اولیت مجھے دیتے تھے اور پنجابی فلموں میں صرف احمد راہی سے گانے لکھواتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ پنجابی فلموں میں میں احمد راہی کے علاوہ کسی کے ساتھ کام کر ہی نہیں سکتا کیونکہ مجھے مزا ہی نہیں آتا۔ میرا

جہاں تک تعلق تھا مجھ سے جب خواجہ صاحب کی ایک بار کسی مسئلے پر ان بن ہوگئی تو انہوں نے اس دوران دو تین فلموں کے گانے تنویر نقوی سے لکھوائے۔ کیونکہ اس دوران ہماری بول چال بند رہی۔ جب آمنا سامنا ہوتا تھا تو میں نظر بچا کر گزر جاتا تھا لیکن میں محسوس کرتا تھا کہ خواجہ صاحب چاہتے ہیں کہ میری ان کے ساتھ نظریں ملیں اور سلام دعا ہو جائے۔

مجھے خواجہ صاحب کی کمزوریاں بھی معلوم تھیں اور خوبیاں بھی۔ میں چاہتا تھا کہ یہ تھوڑا سا اور ترس لیں۔ چنانچہ میں انہیں ترساتا رہا۔ ایک بار وہ رہ نہ سکے۔ رائل پارک کے ایک دفتر میں یہ اوپر بالکنی میں کھڑے تھے۔ میں نیچے سے گزر رہا تھا اور دیکھ چکا تھا کہ یہ اوپر کھڑے ہیں۔ میں کن آنکھوں سے دیکھ کر نیچے سے گزرنے لگا تو انہوں نے اوپر سے ایک کنکری میرے سامنے پھینکی تاکہ میں اوپر دیکھوں۔ میں سمجھ گیا اور میں نے اوپر نہیں دیکھا پھر خواجہ صاحب نے مجھے آواز دی۔ میں نے اوپر دیکھا اور چپکے سے دیکھتا رہا۔ کہنے لگے کہ آپ ذرا اوپر تشریف لائیں گے۔ میں اوپر چلا گیا۔ لے جا کر مجھے اندر دفتر میں بٹھا لیا۔ اس کے بعد بالکل خاموشی رہی۔ نہ وہ کچھ بولے اور نہ میں۔ پھر نوکر سے کہا کہ چائے لے کر آؤ۔ نوکر چائے لے کر آیا اس دوران کوئی بات نہ ہوئی۔ لیکن چائے آنے کے بعد انہوں نے مجھے سچوئیشن سنانی شروع کر دی۔ میں نے کہا کہ اچھی سچوئیشن ہے۔ کہنے لگے کہ پھر اس پر گیت لکھیں گے۔ میں نے کہا کہ میں آپ کے ساتھ کام کرنا تو بند کر چکا ہوں۔ مجھے پتہ تھا کہ یہ گیت آخر مجھے ہی لکھنا ہے۔ اس لیے میں ذرا انہیں تنگ کر رہا تھا۔

تنویر نقوی صاحب کا معاملہ یہ تھا کہ وہ بہت تیز لکھنے والے نہیں تھے۔ وہ بعض اوقات سچوئیشن لیتے اور غائب ہو جاتے۔ ویسے میرا ایمان ہے کہ گیت لکھنے میں ہم سے پہلے بھی اور ہمارے ہمعصروں میں بھی ان کے مقابلے کے گیت لکھنے والے کم شاعر ہوں گے۔ مگر ان میں وہی سست لکھنے والی خرابی ہوتی تھی۔ خواجہ صاحب تیز لکھوانا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ میں خواجہ صاحب کے ساتھ مل کر پھر سے لکھنے لگا۔

مگر احمد راہی نے جب اپنی توجہ فلم کی طرف کم کی تو خواجہ صاحب کے لیے مسئلہ بن

گیا احمد راہی کو تو خورشید انور چاہتے تھے لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ خورشید انور کو بھی کچھ چاہیے۔ یہاں ایک اخبار نویس شاعر تھے جو اپنا پورا نام یوں لکھتے تھے۔ شہنشاہ الفاظ چودھری اصغر علی کوثر وڑائچ۔ یہ شاعر کا پورا نام تھا۔ چونکہ احمد راہی ہاتھ نہیں آتے تھے اس لیے خورشید انور نے ان سے لکھوانا شروع کیا۔ اب خورشید انور کا معیار کہاں اور ان شاعر کا معیار کہاں۔

ایک دن خورشید انور مجھے کہنے لگے کہ قتیل صاحب! آپ پنجابی لکھتے نہیں ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اب آپ کو پنجابی لکھنی شروع کر دینی چاہئے۔ میں نے کہا کہ میں پنجابی لکھ سکتا ہوں لیکن کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم دونوں مل کر احمد راہی کو تلاش کریں کیونکہ وہ آپ کا مزاج دان بھی ہے۔ کہنے لگے کہ وہی تو نہیں مل رہا ہے ورنہ مجھے آپ کو زحمت نہ دینی پڑتی۔ کہنے لگے کہ مجھے ایک اخبار نویس شاعر کے پلے ڈال دیا گیا ہے۔ اور یہ دیکھئے جو اس نے لکھا ہے میں اس پر کیا ٹیون بناؤں۔ کہنے لگے کہ ان شعروں پر میں دھن بناؤں تو میرا سارا بیڑا غرق ہو جائے گا اور ان شعروں پر میں دھن بنا ہی نہیں سکتا۔

میں نے کہا کہ میں اس لیے پنجابی میں گیت نہیں لکھوں گا کیونکہ احمد راہی ہی کو یہ لکھنا چاہئے اور دوسرا یہ ہے کہ میں بھی آپ کے لیے دردِ سر بن جاؤں گا۔ میرا اور آپ کا معاملہ اُردو شاعری کا ہے اس میں آپ مجھے سمجھتے ہیں اور میں آپ کو سمجھتا ہوں لیکن اگر میں آپ کے لیے پنجابی کا کام شروع کروں تو ممکن ہے کہ اس میں اتنی انڈر سٹینڈنگ نہ ہو سکے۔ اس لیے میں احمد راہی کے پاس جاتا ہوں۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ احمد راہی سے کہو کہ وہ واپس آ جائے اور اس کے اپنے مفاد میں بھی یہی ہے کہ وہ واپس آ جائے کیونکہ وہ فلم انڈسٹری سے نکلتا جا رہا ہے۔ کہنے لگے کہ اس کے بغیر میرا نقصان بہت ہو رہا ہے کیونکہ میں اس کے بغیر پنجابی شاعری میں ٹیون بنا ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ میں نے احمد راہی کو تلاش کیا۔ بھائی ایک جگہ بیٹھے ہوئے پی رہے تھے۔ دن کا وقت تھا۔ میرے احمد راہی سے ہمیشہ اچھے تعلقات رہے ہیں سوائے اس عرصے کے جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں اور اس عرصہ کے دوران چار سال تک ہم اندرون شہر ناراض رہتے تھے لیکن جب شہر سے باہر جاتے تھے تو

ہماری دوستی ہو جاتی تھی مگر جب واپس ریلوے سٹیشن پر اترتے تھے تو دوبارہ بول چال بند کر دیتے تھے۔

میں احمد راہی کے پاس گیا تو کہنے لگا کہ کیا پیو گے۔ میں نے کہا کہ چائے منگوالو۔ کہنے لگے کہ یہ تو بڑی غیر شاعرانہ سی چیز ہے۔ گلاس لو اور میرے ساتھ پیو۔ میں نے کہا کہ تمہیں پتہ ہے کہ اول تو میں اس طرح پیتا ہی نہیں ہوں۔ دوسرے یہ کہ دن میں پینا کوئی شریف آدمیوں کا کام ہے۔ کہنے لگا کہ میں کوئی بدمعاش ہوں۔ میں نے کہا ہاں تم بدمعاش ہو گئے ہو۔ اس قسم کی دوستانہ بات ہو چکی تو وہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ کیسے آئے ہو۔ میں نے کہا کہ خورشید انور تمہاری جان کو رو رہا ہے اور تم اب میرے ساتھ چلو اور چل کر اس کے گانے لکھ کر دو۔ کہنے لگا کہ اصل میں بات یہ ہے کہ میں اس سبجکٹ پر پہلے گانے لکھ چکا ہوں اور وہ گانے ہٹ بھی ہو چکے ہیں۔ کہنے لگا اب میں جب اس سچوئیشن پر لکھنے بیٹھتا ہوں تو میرے سامنے میرا ہی گانا آ جاتا ہے اور مجھے ڈراتا ہے۔ میں اس سے آگے نہیں نکل پاتا۔ کہنے لگا کہ میری یہی مجبوری ہے۔ خورشید صاحب سمجھتے ہیں کہ میں بھاگ رہا ہوں۔ حالانکہ میں بھاگ نہیں رہا بلکہ ناکامی سے ڈرتا ہوں۔ میں نے کہا کہ تم اور فلموں میں ناکام نہیں ہوتے ہو۔ میں اب بھی تمہیں دس فلمیں بتا سکتا ہوں جس میں اب بھی تم ناکام ہو رہے ہو۔ ناکامی اور کامیابی تو ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ میری اپنی کئی فلمیں ناکام ہوئی ہیں اور کئی کامیاب ہوئی ہیں۔ اس لیے تم اس معاملے کو چھوڑو۔ میں نے کہا کہ وہ شریف آدمی تمہیں اتنا Honour دے رہا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ میں احمد راہی کے بغیر لکھ ہی نہیں سکتا۔

لیکن اس شخص پر بھی آفرین ہے کہ یہ راہ پر نہیں آیا۔ دراصل یہ بے عمل ہو چکا تھا اور بہانے تلاش کرتا تھا۔ چوبیس گھنٹے کا پینا اسے لے ڈوبا تھا۔ اس کی کلب تو اب بھی قائم رہی لیکن کلب میں میں واحد آدمی تھا جس نے کبھی احمد راہی کے ان کاموں میں دن میں حصہ نہیں لیا۔ شام کا میں نہیں کہہ سکتا۔ شام میں شاید میں نے کبھی حصہ لیا ہو۔ چنانچہ میں دن میں جب بھی اس کی طرف جاتا تھا تو وہ دور ہی سے مجھے دیکھ کر کہتا تھا کہ آ گئے ہو نصیحت کرنے۔ آؤ بیٹھو اور بتاؤ کہ آج کتنی نصیحتیں ساتھ لے کر آئے ہو۔ میں کہتا تھا کہ میں

نصیحتیں لے کر نہیں آیا بلکہ تمہیں دیکھ دیکھ کر اداس اور دکھی ہونے آیا ہوں۔ تم مزے سے اپنے کام پر لگے رہو۔

رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ پنجابی میں احمد راہی سے بہتر لکھنے والا کوئی نہیں ہے۔ لوگوں نے اس کے پاس آنا بند کر دیا اور صورت دگرگوں ہوتی چلی گئی۔ اور ایک بہت اچھا شاعر فلم کے ہاتھوں سے نکل گیا اور پنجابی فلمی شاعری تک بندوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ماضی میں ایک مفروضے نے بہت رواج پایا تھا کہ شاعر کے لیے شراب پینا بہت لازمی اور جو نئے شاعر اٹھتے تھے وہ یہی خیال لے کر آتے تھے کہ غالب سے لے کر جوش ملیح آبادی اور اختر شیرانی اور مجاز لکھنوی سے بعد تک سارے شاعر پیتے چلے آئے ہیں۔ سارے شاعر یہی سوچ کر شراب پینی شروع کر دیتے تھے کہ اس سے شاعری اچھی ہو سکے گی اور جب وہ شراب پی کر شعر سنائیں گے تو زیادہ اچھے شاعر نظر آئیں گے۔

ان لوگوں میں سے ایک شخص اب تک یہاں موجود ہے اور اس سے متعلق واقعہ بھی میرے ذہن میں جوں کا توں موجود ہے۔ یہ واقعہ آج سے کوئی بیس پچیس سال پہلے کا ہے۔ ملتان میں مشاعرہ تھا۔ مشاعرے کے بعد ایک نوجوان آیا اور اس نے پہلے تو جونیئر کی حیثیت سے میرے ساتھ اظہار عقیدت کیا۔ اس کے بعد میرے ساتھ بیٹھنے کی اجازت چاہی۔ اس زمانے میں ابھی تک مسلمانوں کے لیے شراب کا پرمٹ سسٹم موجود تھا اور وہ لوگ جو پیچھے سے پیتے چلے آئے تھے۔ انہیں چونکہ جلدی چھوڑنے میں دقت پیش آ رہی تھی اس لیے انہوں نے شراب کے پرمٹ بنوا رکھے تھے اور پرمٹ کے ساتھ پینا خلاف قانون نہیں تھا۔ چنانچہ ملتان کے کچھ لوگ وہاں پیتے پلاتے رہے اور ایک بوتل کی طرف وہ نوجوان للچا کر دیکھتا رہا۔

اس نے ایک دو پیگ کی حد تک تو صبر کیا لیکن بعد میں اس نے اپنا گلاس خود اٹھایا اور سامنے رکھ دیا۔ پھر ان نظروں سے دیکھنے لگا کہ۔

؎ اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

چنانچہ اس کے گلاس میں بھی وسکی ڈالی گئی جو اس نے پی اور وہ پھر ساتھ دیتا رہا۔ باقی لوگ تو پی کر چلے گئے لیکن وہ بیٹھا رہا اور کہنے لگا کہ میں رات بھی یہیں بسر کروں گا۔ وہ رات وہیں رہ گیا۔ شراب کی بوتل میں کوئی ایک چوتھائی بوتل رہ گئی تھی۔ صبح اٹھا تو کہنے لگا کہ وہ بوتل کہاں ہے۔ اس وقت اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے حیرت سے کہا کہ بوتل کو کیا کرنا ہے تو کہنے لگا کہ مجھے صبوحی چاہئے۔

صبوحی افسانوں یا روایتی طور پر اس شراب کو کہتے ہیں جو بلانوش رات بھر پیتے رہے ہیں اور کچھ گھنٹے سونے کے بعد اٹھ کر جو چھوٹا سا پیگ لیتے ہیں اسے صبوحی کہا جاتا ہے۔ لیکن عملی زندگی میں میں نے صبوحی کہیں دیکھی نہیں۔ صرف داستانوں یا افسانوں میں اس کا ذکر پڑھا ہے۔ چنانچہ میں نے اس نوجوان سے کہا کہ صبوحی نام کی کوئی چیز سوائے افسانوں اور شاعری کے کہیں موجود نہیں۔ اس لیے تم اس سے باز آجاؤ اور آئندہ کے لیے یاد رکھو کہ جو کچھ رات کو ہو گیا تو ہو گیا۔ رات گئی بات گئی کے مصداق صبح اٹھ کر ٹھیک طرح ناشتہ کیا کرو تاکہ رات کو جو مضر اثرات اس چیز کے ہوئے ہیں وہ اچھے ناشتے سے دور ہو جائیں اور میں نے اس سے کہا کہ اس بوتل میں جو وسکی پڑی ہے اسے اپنے ساتھ لے جاؤ اور جب شام پڑے اور زیادہ جی چاہئے تو اسے پی لینا۔

چنانچہ اس نے میری بات پلے باندھی اور اس کے بعد جب کبھی بھی وہ ملا وہ پیتا تو تھا لیکن بے قاعدہ نہیں بلکہ کچھ ضابطے میں آ گیا تھا۔ اس شخص کا نام ریاض الرحمان ساغر ہے جو بعد میں فلم کا ایک اچھا رائٹر بنا۔ اس کی لکھی ہوئی فلمیں بہت کامیاب گئیں۔ اب وہ نوائے وقت کے سٹاف میں کام کر رہا ہے اور عزت کی روٹی کما رہا ہے۔ اس کے ذہن سے صبوحی والا معاملہ دور ہو چکا ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ وہ اب صبوحی کے علاوہ شبینہ سے بھی ذرا دور ہی رہتا ہے کیونکہ اب اس ملک میں شراب نام کی چیز گردن زدنی ہے اور اس ملک کے لوگ اب صرف ہیروئن پی کر ہی گزارہ کرتے ہیں کیونکہ یہ خلاف شرع نہیں ہے۔

پینے والوں کی عادتوں کا میں نے ذکر کیا تھا کہ یہ پی کر کیا کیا کرتے ہیں تو ریاض الرحمان ساغر کی بات بھی سن لیجئے۔ بھائی جب پیتے تھے تو دو پیگ تک ٹھیک رہا کرتے

تھے۔ اور ہم نے انہیں مشورہ بھی دیا تھا کہ آپ اس سے زیادہ نہ پیا کریں کیونکہ دو پیگ تک آپ اپنی کھال کے اندر رہتے ہیں۔ اس کے بعد آپ میں بھس بھرنا شروع ہوتا ہے اور آپ پھول جاتے ہیں۔ یہ تسلیم بھی کرتے ہیں لیکن خدا کا کرنا کچھ ایسا ہوتا ہے کہ دو کے بعد بھی ان کی حرص بیدار ہوتی ہے اور تیسرے پر آ کر انہیں چابی لگتی ہے اور یہ صوفے پر بیٹھے بیٹھے کچھ کرنے لگتے ہیں۔ اور جب چوتھے پر آ جائیں تو پھر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ یہ کج بحثی میں مبتلا ہو جائیں یا ان کے خلاف مزاج اگر کوئی چھوٹی سی بات بھی ہو جائے تو یہ لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اور ان لوگوں کے سلسلے میں کوئی بات نہیں سن سکتے جن کی یہ عزت کرتے ہیں۔ جن میں سے ایک میں بھی ہوں۔

بعض لوگوں نے تو ایسا بھی کر لیا کہ ان کا تماشہ دیکھنے کے لیے ڈرامہ کیا اور گفتگو کرتے کرتے کہہ دیا کہ قتیل صاحب شاعر تو اچھے ہیں لیکن وہ ہندی کے الفاظ ذرا کثرت سے استعمال کرتے ہیں اور اس سے کچھ مزا نہیں آتا۔ اس کے بعد ان کی حالت دیکھنے والی ہوتی ہے۔ لوگ ان کا تماشہ دیکھنے کے لیے اس طرح کا کوئی مخالفت کا پہلو نکال لیتے تھے۔ اور ریاض الرحمان ساغر مخالفت کی اتنی سی بات سن کر آپے سے باہر اور لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ اس کے بعد انہیں چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔

لیکن اس طرح کا ایکشن شروع کرنے سے پہلے یہ ہمیشہ وارننگ دیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھ اس قسم کی مخالفانہ باتیں بند کر دو ورنہ میں اس کمرے کی ڈیکوریشن خراب کر دوں گا اور کبھی کبھی ڈیکوریشن خراب بھی ہو جاتی ہے۔

ان کا ایک اور واقعہ سناتا ہوں۔ ہمارے ملک کے ایک گویے ہیں منیر حسن۔ یہ صاحب ربابی فیملی سے تعلق رکھتے ہیں جس فیملی سے ماسٹر غلام حیدر نے بڑا نام پایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ میوزک ڈائریکٹر نہ ہوتے اور کسی اور شعبے میں ہوتے تو بھی وہ نام پاتے اور وہ میوزک ڈائریکٹر کی حیثیت سے جتنے معزز انسان تھے وہ کسی بھی حیثیت میں اتنے ہی معزز ہوتے۔ ہر شخص ان کی عزت کرتا تھا۔ لیکن ماسٹر غلام حیدر کی روح کی بدقسمتی کی وجہ سے یہ منیر حسن ان کے داماد کہلائے۔ ان کا مسئلہ یہ ہے کہ اچھا گاتے ہیں اور نام

بھی ہے لیکن پینے کے بعد یہ ہو جاتا ہے کہ یہ بھی کج بحثی پر اتریں اور لڑیں۔ اور جب میوزک ڈائریکٹروں کا معاملہ آجائے تو ان کا فرض ہو جاتا ہے کہ یہ اپنے نامور سر کی مخالفت اور برائی کریں۔

معاملہ یوں ہوا کہ میوزک ڈائریکٹر اے حمید کے گھر میں ایک محفل جمی ہوئی تھی۔ ریاض الرحمان ساغر اور منیر حسن دونوں وہاں موجود تھے۔ منیر حسن جو گفتگو کر رہے تھے اس کے پیچھے ان کا مطلب بھی تھا۔ اے حمید کے گھر میں وہ اس لیے ماسٹر غلام حیدر کی برائی کر رہے تھے کہ اس سے حمید صاحب کی خوشامد کا پہلو نکلے۔ بلکہ یہاں تک بھی کہہ گئے کہ اے حمید کی موسیقی کا مقابلہ ماسٹر غلام حیدر کیا کر سکتے تھے۔ اس کے بعد وہ ماسٹر غلام حیدر کی ٹیونوں کی نقلیں بھی اتارنے لگے۔

میں نے کہا کہ دیکھو برخوردار تم اور تمہاری ربابیوں کی پوری فیملی ماسٹر غلام حیدر کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔ تم فخر کرو کہ بدقسمتی سے ان کی بیٹی تمہارے گھر ہے۔ کہنے لگے کہ وہ کیا تھے۔ اب ریاض الرحمان ساغر بھی چوتھے پیگ پر تھے۔ انہوں نے کہا کہ منیر حسن باز آجا۔ سب کو بدمزہ نہ کر اور چھوڑ اس بحث کو۔ میں جانتا ہوں کہ تو کس مقام سے بول رہا ہے۔ اس کے بعد ریاض الرحمان ساغر اے حمید سے بھی مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ آپ کو بھی شرم آنی چاہئے آپ اپنے سامنے بزرگوں کی توہین کروا رہے ہیں۔ اور وہ بھی اپنی خوشامد کے لیے۔ آپ منیر حسن کو روکیے۔

حمید صاحب کہنے لگے کہ میں تو اسے کچھ نہیں کہہ رہا یہ خود ہی ماسٹر غلام حیدر کو برا بھلا کہہ رہا ہے۔ منیر حسن نے کہا کہ یہ میری اپنی رائے ہے کہ میں اسے جو مرضی کہوں۔ ریاض الرحمان ساغر کہنے لگے کہ اچھا اب تو ماسٹر غلام حیدر کی برائی کر اور پھر دیکھو۔ منیر حسن نے کہا کہ ماسٹر غلام حیدر میوزک ڈائریکٹر اے حمید سے بڑے نہیں تھے۔ ریاض الرحمان ساغر اٹھا اور اس کو نیچے گرا لیا۔ اتفاق سے دونوں ایک ہی قد کاٹھ کے تھے۔ ریاض اب منیر حسن کے اوپر سوار ہو گئے اور اسے اتنا مارا کہ اس کے ناک سے خون بہنے لگا اور اس کے کپڑے گندے ہو گئے۔ اور وہ جو کچھ دیر پہلے بڑی دلیری سے باتیں کر رہا تھا اب چیخیں مار مار کر

بچاؤ بچاؤ کہنے لگا اور رونے لگا۔ میں نے مار کھاتے ہوئے جتنا بزدل منیر حسن کو دیکھا اتنا کسی اور شخص کو نہیں دیکھا۔

شراب پینے والوں کی یہ صورتیں بھی ہوتی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اول تو پینی ہی نہیں چاہئے لیکن جب یہ پینے ہی لگیں تو ان کے اوپر ایک ایک پولیس کا آدمی متعین ہو جو خود انہیں وسکی بنا کر دے اور جب یہ دو پیگ پورے کر لیں تو ان سے کہے کہ اگر تیسرا پیگ پیو گے تو ڈنڈا تمہارے سر میں ماروں گا۔ پھر تو یہ لوگ ٹھیک ہیں۔

میری فیملی

میری شادی ۱۹۳۶ء میں ہوئی جبکہ میری عمر ساڑھے سترہ برس تھی اور اس اعتبار سے میری بیوی کی عمر مجھ سے دو تین سال کم تھی۔ زمانہ ہی ایسا تھا کہ کم عمری میں شادیاں ہوا کرتی تھیں اور پھر خاص طور پر وہ فیملی جہاں تعلیم کا چرچا نہیں ہوتا وہاں ماں باپ کے سامنے ایک ہی مسئلہ ہوتا ہے کہ بیٹے بیٹیوں کی شادیاں کردی جائیں۔ اور جب بیٹا جوان ہو جائے بلکہ لڑکپن ہی کی حد کو پہنچے تو خاص طور پر مائیں اس فکر میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ بیٹے کی شادی کسی طرح ہو جائے۔ بلکہ پیچھے پڑ جاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ میں اپنے بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنا چاہتی ہوں۔ حالانکہ وہ اس کے بعد بھی پچاس پچاس برس زندہ رہتی ہیں۔ لیکن وہ بیٹے کے سر پر سہرا باندھ کر خوش ہوتی ہیں چاہے بیٹا بے چارا لڑکپن ہی میں ایسی پابندیوں میں جکڑا جائے اور ایسے فرائض کے بوجھ تلے دب جائے جن کا ابھی وہ اہل نہیں ہوتا۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔

میرا خاندان، خاص طور پر میرا گھرانہ تعلیم کے معاملے میں بہت پسماندہ تھا۔ والد کی وفات کے بعد کسی نے یہ ضرورت بھی محسوس نہ کی تھی کہ مجھے آگے پڑھائے۔ بلکہ والد کی آنکھیں بند ہونے کے بعد کسی طرف سے بھی تعلیم کا نام ہی نہیں آیا۔ اور ہر طرف سے یہی کہا گیا کہ اب اس کی شادی ہونی چاہئے۔ چنانچہ میری شادی بھی ہوگئی۔ لیکن یہ بھی ایک لمبی داستان ہے۔

ہم راولپنڈی سے ہری پور اپنے رشتہ داروں میں گئے۔ ہم وہاں جس گھر میں ٹھہرے تھے وہیں ایک لڑکی میرے لیے چنی گئی تھی لیکن آٹھ دس دن میں Development ایسی ہوئی کہ برادری سے باہر تیسری جگہ میری شادی طے پا گئی۔ اور وہیں میں دولہا بن کر گیا اور ہم دلہن کو لے کر واپس آ گئے۔

شادی کے بعد والدین کو اور ان سے بھی زیادہ رشتہ داروں کو جو فکر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بچے کی پیدائش جلدی سے جلدی ہو جائے۔ اور جب کوئی قسمت کی ماری بیوی ایک سال کے اندر اندر حاملہ ہونے کے آثار نہ بتا سکے تو اس کے لیے ایک چھوٹی قیامت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ ہائے ہائے ابھی تک اس کے ہاں کچھ نہیں ہوا۔ اللہ کرے یہ ٹھیک ٹھاک ہو۔ پھر کہا جاتا ہے کہ اگر بچہ نہ ہوا تو بڑوں کا نام کیسے آگے بڑھے گا۔

میری بیوی کے ہاں بھی جب کوئی ایک سال تک بچے کے آثار پیدا نہ ہوئے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اگر چار چھ مہینے اور اس طرح بات رہی تو معاملہ بگڑ جائے گا۔ میری شادی پہلے ہی دو لڑکیوں کو مسترد کرنے کے بعد تیسری لڑکی کے ساتھ کی گئی تھی۔ اس لیے مجھے خوف یہ آنے لگا کہ اگر دو چار مہینے اور میری بیوی نے اپنے عورت ہونے کا ثبوت نہ دیا تو میرے گھر والے ایک اور بیوی تلاش کرنی شروع کر دیں گے۔ لیکن خوش قسمتی سے شادی کے ٹھیک دو سال کے بعد ہمارے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی۔ اس کا نام سعیدہ رکھا گیا۔ یہ میری پہلی بچی تھی لیکن جب یہ دو سال کی ہوئی تو کسی عجیب سی بیماری سے فوت ہو گئی۔ ہم اس وقت ہری پور میں تھے اور وہاں کوئی سپیشلسٹ تو ہوتا نہیں تھا۔ کمپاؤنڈر سے بنے ہوئے ڈاکٹر ہی زیادہ ہوتے تھے جنہیں جنگ عظیم میں کام کرنے کے سلسلے میں کچھ سندیں ملی ہوئی تھیں۔ وہاں پر سول ہسپتال میں جو بڑا ڈاکٹر کہلاتا تھا صرف وہ ہی ایم بی بی ایس ہوتا تھا۔ پھر ہسپتال میں بھی کوئی خاص سہولتیں نہیں ہوتی تھیں۔ لوگ زیادہ تر حکیموں کے پاس جاتے تھے۔ وہ ایک چٹکی دے دیتے تھے، مریض ٹھیک ہو گیا تو ٹھیک، نہ ہوا تو نہ سہی۔ اس طرح یہ پہلی بچی فوت ہو گئی۔

اس کے ٹھیک دو سال بعد ایک بیٹا پیدا ہوا اور وہ بھی دو سال کا ہو کر فوت ہو گیا۔ اس کا نام جاوید تھا۔ اس بچے کو بھی وہی بیماری تھی جو پہلی بچی کو تھی۔ عجیب پریشانی ہوئی۔ اس کے دو سال بعد ایک اور بچہ ہوا جس کا نام پرویز رکھا گیا۔ یہ اور اس کے بعد جتنے بچے پیدا ہوئے وہ زندہ رہے۔ ترتیب یوں رہی کہ پرویز کے دو سال بعد بیٹی مسرت۔ اس کے تین سال بعد ثمینہ اور اس کے بعد تنویر اور نوید پیدا ہوئے۔ یوں میری اولادیں کل سات ہوئیں۔ جن میں سے دو تو فوت ہو گئیں اور اب تین بیٹے، دو بیٹیاں بقید حیات ہیں۔ اللہ انہیں زندگی دے۔

بیٹوں میں تو خیر اتنی سکت ہوتی ہے کہ خود بھی پڑھ لکھ کر اور کمائی کر کے اپنے معاملات سنبھال لیں۔ لیکن بیٹیاں کلیتاً والدین کی ذمہ داری ہوتی ہیں اور جس دن گھر میں بیٹی پیدا ہوتی ہے اسی دن سے غیر شعوری طور پر دل میں خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ ذمہ داری آ پڑی ہے اور ہمیں یہ نبھانی پڑے گی۔ اخراجات کے سلسلے میں بھی اور سماجی درجے کے سلسلے میں بھی۔ چنانچہ میرے ہاں تو یہ معاملہ تھا کہ میں لکھ پتی باپ کی دولت تو پہلے ہی اڑا چکا تھا اس کے بعد جو جائیداد مکانات کی شکل میں یا زیورات کی شکل میں تھی وہ بھی گئی۔ گھر کا ساز و سامان بھی رفتہ رفتہ گیا۔ کچھ جائیداد راولپنڈی اور ہری پور میں مکانات کی شکل میں رہ گئی تھی۔ جب یہ بیٹیاں جوان ہوئیں تو ان کے سلسلے میں ایک بیٹی کے لیے میں نے پنڈی کا مکان بیچا اور دوسری بیٹی کے سلسلے میں میں نے ہری پور کا مکان بیچا۔ اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ ہمارے پاس کچھ تھا وہ بیٹیوں کے کام آیا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ پیسہ کہاں سے آیا اور کدھر گیا۔ اس کے بعد مالی حالات اور ٹھیک ہوتے چلے گئے، اور جب بیٹوں کی شادی کی تو یہ مشکلات نہیں تھیں۔ تاہم بیٹیوں کی جو شادی ہوئی وہ دیکھنے کے قابل تھی۔

میری بیٹی مسرت کانوں سے معذور ہو چکی تھی لیکن اس پر اللہ کا یہ کرم ہوا کہ اس کے لیے بہت اچھا رشتہ ملا۔ میرا داماد بہت نیک بچہ ہے اور اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ وہ اپنی بیوی کے حق میں اور ہمارے لیے بہت اچھا ثابت ہوا اور سب کے ساتھ اچھا

رہا۔اس شادی میں سب نے کہا کہ یہ شادی ٹھاٹھ سے ہونی چاہئے۔ کیونکہ میرے کسی بچے کی یہ پہلی شادی تھی۔ اور ٹھاٹھ کا مطلب یہ تھا کہ شامل ہونے والے لوگ نامور ہوں، زیادہ ہوں اور اچھے ہوں۔ میں نے اپنے دوستوں کی مدد سے شادی کا سارا پروگرام طے کیا۔ یہ وہ یونٹ کا زمانہ تھا اور مغربی پاکستان کا دارالحکومت لاہور تھا۔ تمام وزراء لاہور ہی میں ہوتے تھے چنانچہ شاید ہی کوئی وزیر ہو جس نے اس تقریب میں شرکت نہ کی ہو۔ سرکاری افسران بھی کثرت سے موجود تھے ان میں ڈپٹی کمشنر لاہور مصطفیٰ زیدی کے علاوہ مختار مسعود جو کمشنر تھے۔ وہ بھی شریک تھے۔ شاعروں اور لکھنے والوں میں سے بھی شاید ہی کوئی شخص ہوگا جو بچا ہوگا۔

اب جب تصویر سامنے رکھتا ہوں تو ان میں سے کئی لوگ اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں لیکن ان سب کی یادیں تصویروں میں موجود ہیں۔

اس طرح دوسری بیٹی کی شادی میں ہم نے پہلی شادی جیسا اہتمام تو نہیں کیا تھا لیکن ضروری لوگ سبھی موجود تھے مجھے دوسرا بھی جو داماد ملا۔ وہ پہلے داماد سے بھی اچھا رہا۔ وہ بہت محنتی، سب کا احترام کرنے والا اور اپنی ذات میں سمٹا ہوا ہے۔ مجھ پر اللہ کا یہ کرم رہا کہ بیٹیوں کے سلسلے میں میں بہت خوش نصیب رہا۔ بیٹیاں جتنی اچھی تھیں داماد ان سے بھی اچھے ملے اور دامادوں کی طرف سے مجھے کبھی ایک لمحے کے لئے بھی یہ شکایت نہیں ہوئی کہ ان کا میری بیٹیوں سے سلوک برا ہو۔ بلکہ دونوں بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں بہت خوش ہیں اور ان کے اپنے شوہروں کے ساتھ تعلقات دوستوں جیسے ہیں اور میاں بیوی مل جل کر زندگی کی گاڑی کے دو پہیے بنے ہوئے ہیں۔

اسی طرح میں اپنے بیٹوں کے سلسلے میں بھی خوش نصیب ہوں۔ اور وہ یوں کہ انہیں جو بیویاں ملیں وہ بہت اچھی ہیں۔ میرا ایک بیٹا نوید تو میرے ساتھ رہتا ہے اس کی بیگم کے آنے سے میری بیوی نے گھر کا سارا نظام اپنی اس بہو کے سپرد کر دیا۔ جو بیٹے ملک سے باہر ہیں ان کی بیویاں بھی بہت اچھی ہیں اور گھریلو طور پر میں باقیوں سے زیادہ خوش قسمت آدمی ہوں کہ مجھے اس قسم کا کوئی تلخ تجربہ نہیں ہوا کہ کوئی بہو یا داماد خلاف مزاج ملا ہو۔

اس طرح اب تک میرے بیٹے اور بیٹیاں اچھے رہے ہیں اور اب تو آگے ان کے بچے بھی جوان ہو گئے ہیں اور ان کی شادیوں کے مسئلے درپیش ہیں بلکہ ان میں سے کچھ بچے تو بیاہے بھی جا چکے ہیں۔ اب تو اولاد کی اولاد کا مسئلہ آگے چل رہا ہے ان میں سے بھی دو پوتیاں اور ایک نواسہ شادی کے بندھن میں بندھ چکے ہیں۔ میں نے تو سوچا تھا کہ اپنی اولاد سے فراغت پانے کے بعد آخری عمر آرام سے گزرے گی لیکن ایسا نظر نہیں آتا۔ اب اصل رقم کے ساتھ بیاج کا معاملہ آ گیا ہے اور کہتے ہیں کہ بیاج پیارا ہوتا ہے۔ پیارا تو ہوتا ہے لیکن اس بیاج کے ساتھ اور بھی بہت کچھ دینا پڑ جاتا ہے۔ پھر بیاج تو لیا جاتا ہے لیکن اس معاملے میں کچھ دینا بھی پڑ جاتا ہے اور یہ ذمہ داریاں اس عمر میں ایک خوشگوار بوجھ نظر آتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر قدرت مدد کرے تو یہ کام اپنے بچوں کے لیے ان کے والدین ہی کریں تو زیادہ بہتر ہے۔

ازدواجی زندگی کچھ تو بچپن میں گزری اور وہ خوشحالی کا زمانہ تھا لیکن جب ذرا آگے بڑھے تو جائیداد اور زیورات بکنے شروع ہوئے۔ اور تکلیفوں کا زمانہ آ گیا۔ پھر کچھ جدوجہد شروع ہوئی اور ہری پور میں معمولی نوکری کی۔ اس کے بعد راولپنڈی میں ٹرانسپورٹ کمپنی میں نوکری کی۔ پھر جب میں لاہور پہنچا تو اس وقت میں فلم کمپنی کا سانگ رائٹر بن کر آیا تھا اور دن پھرتے نظر آئے۔ اور یوں نظر آیا کہ اب بیوی بچوں کے ساتھ دوبارہ اچھا وقت گزرے گا لیکن اس دوران میرا چندر کانتا سے رومانس شروع ہو گیا۔

اس کا یہ اثر ہوا کہ میں بہت حد تک اس میں ڈوب گیا۔ ابھی تین مہینے گزرے تھے کہ مارچ ۱۹۴۷ء میں ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب اسمبلی کے باہر اپنی کرپان لہرا کر اعلان کر دیا کہ ہم پاکستان نہیں بننے دیں گے۔ اس سے فرقہ ورانہ فسادات شروع ہو گئے۔ اب میں جس کمپنی میں آیا تھا وہ کوئی دو مہینے کے بعد اس قابل بھی نہ رہی کہ مجھے تنخواہ بھی دے سکے۔ چنانچہ فلم پروڈکشن میں آ کر سنہرے مستقبل کے جو خواب دیکھے تھے وہ ایک بار پھر سے چکنا چور ہوتے نظر آئے۔

اس زمانے میں مجھے فلم کمپنی سے پانچ سو روپے تنخواہ مل رہی تھی جو کہ کافی تھی جبکہ

کلرک کو ایک سو روپیہ بھی نہیں ملتا تھا۔ پھر میرے جو گانے ریکارڈ ہوئے وہ پسند بھی کئے گئے اور میرے گانوں کی اِدھر اُدھر سے مانگ بھی ہونے لگی لیکن ایک تو ہری پور میں بیوی بچوں کا خرچ اور دوسرا چندر کانتا کے سلسلے میں اخراجات الگ تھے۔ پھر آمدن محدود ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ ایک ذہنی خلفشار ایسا آیا جس نے مجھے تھوڑا سا چڑچڑا بھی کر دیا۔ اور مجھے پہلے کی نسبت تھوڑا سا زیادہ محنتی بھی بنا دیا۔ اس سلسلے میں مجھے اس زمانے میں جو جو کام کرنا پڑے وہ ایک الگ داستان ہے۔

بیوی کے ساتھ بھی میرا Misbehave کرنے کا سلسلہ وہیں سے شروع ہوا۔ چنانچہ چندر کانتا کے ساتھ مل کر بیوی کے سلسلے میں میں غافل ہوتا چلا گیا اور اس وقت تک سوائے اس بات کے کہ میں ہری پور میں پیسے بھیج دیتا تھا میں نے اور کچھ نہیں کیا۔ پھر یہ کہ میں پیسے بھیج کر سمجھتا تھا کہ اپنی بیوی کے ساتھ بہت انصاف کر رہا ہوں اور آدھا خرچ ادھر دے رہا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیوی کے ساتھ میرا بیوفائی کا سلسلہ یہیں سے شروع ہوا۔ پھر یہ سلسلہ اس وقت تک بڑھتا ہی چلا گیا جب تک چندر کانتا سے میری علیحدگی نہیں ہوگئی۔ یہ میری بیوی کے ساتھ پہلی بیوفائی تھی۔ یہ میری بیوی کی عظمت ہے کہ اس نے ہمیشہ میرے ساتھ نباہ کیا۔ اس وقت اس کے پاس تین بچے تھے۔ اس نے انہیں پالا اور میرے نام پر کوئی آنچ نہیں آنے دی۔ وہ سارا زمانہ جو میری آوارگی کا زمانہ تھا اس زمانے میں میری بیوی نے میرے گھر کو سمیٹ لیا۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور بیوی ہوتی تو وہ اتنی وفا نہ کر پاتی۔

یہ اسی بیوی کے صبر کا نتیجہ تھا کہ چندر کانتا سے میرا رومانس کا سلسلہ ڈیڑھ سال سے زیادہ نہ چل سکا۔ اصل میں چندر کانتا ایک ایسی عورت تھی جو یہ چاہتی تھی کہ میرے اور اس کے درمیان ہوا کا کوئی جھونکا بھی موجود نہ ہو۔ اسے وہ دوست بھی اچھے نہیں لگتے تھے جن پر میں زیادہ توجہ دیتا تھا۔ اس زمانے میں ساحر لدھیانوی لاہور میں تھے۔ میں رائل پارک میں رہتا تھا اور وہ ایبٹ روڈ پر مقیم تھا۔ بیچ میں فاصلہ زیادہ سے زیادہ ایک فرلانگ کا تھا۔ میرا اور ساحر کا ملنا جلنا بھی زیادہ تھا۔

یہ مانتے ہوئے کہ ساحر میرا دوست ہے، نامور آدمی ہے اور شاعر بھی ہے، چندر کانتا کو ساحر اس لیے کھلنے لگا کہ میری اور اس کی دوستی اس کے اندازے سے کچھ زیادہ کیوں بڑھ گئی ہے۔ حالانکہ بعض معاملات میں ساحر چندر کانتا کی پاسداری کرتا تھا اور وہ یوں کہ ساحر کا کانتا کے لیے تقاضا یہ تھا کہ میں اس سے جلدی شادی کرلوں لیکن ادھر چندر کانتا کا تقاضا یہ تھا کہ میں اپنی پہلی بیوی کو طلاق دیدوں اور بیوی بچوں سے دور ہو جاؤں اور اس کے بعد ہی اس سے شادی ہو۔ ظاہر ہے کہ مجھے یہ شرط کسی طرح منظور نہیں تھی۔ اس لیے کہ میں نے شروع ہی میں چندر کانتا سے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ اور اسے بتا دیا تھا کہ میرے تین بچے ہیں اور ایک بیوی ہے جس سے مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اور اس نے کہا تھا کہ مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں ہے مجھے صرف آپ کا ساتھ چاہئے۔ لیکن بعد میں آ کر اس کا مطالبہ بڑھتے بڑھتے اس حد تک بڑھ گیا کہ ساحر کو بھی اس پر قدرے اعتراض ہونے لگا۔ اور اس نے بھی کہا کہ اگر پہلے سے چندر کانتا کو سب باتوں کا علم ہے تو اس کا یہ مطالبہ جائز نہیں۔

کچھ تو ساحر کی اور میری باہمی دوستی اور کچھ کانتا کے خیالات سے اختلاف ساحر کو کانتا کے نزدیک برا بنا گئے۔ اور چندر کانتا نے اسے ناپسندیدہ ٹھہرایا۔ ایک جھگڑا یوں بھی ہونے لگا کہ ساحر اور میں آپس میں زیادہ کیوں ملتے ہیں۔ ساحر کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بہت ہنسا اور کہنے لگا کہ میں تو چاہتا تھا کہ یہ خاتون جو بہت سلجھی ہوئی نظر آتی ہے شاعری سے بھی دلچسپی رکھتی ہے اور شاعر سے بھی اور پھر شاعر کے ساتھ بجتی بھی ہے اس کا بھلا ہو جائے لیکن اب اس کا کیا کیا جائے کہ وہ ناجائز مطالبہ کر رہی ہے۔ چنانچہ جب کانتا کا مطالبہ ساحر نے سنا تو اس نے بھی کہا کہ اس کا مطالبہ ناروا ہے۔ اگر اسے ہمارے پس منظر سے لاعملی ہوتی اور تم نے اس سے کوئی فریب کیا ہوتا تو بات اور تھی۔ لیکن تم نے تو اسے سب کچھ بتا رکھا ہے اس کے باوجود اب اس کا یہ مطالبہ میری نظر میں غلط ہے۔ اگر وہ دوسری بیوی بننا پسند کرے تو ٹھیک ہے ورنہ میں اگر تم دونوں کو اس شادی کی اور بھابھی کو طلاق کی اجازت دیدوں تو میں بھابھی کی نظروں میں مجرم ہوں گا اور وہ مجھے کیا کہیں گی۔

اقبال بانو

چندر کانتا سے علیحدگی کے بعد میں اپنی بیوی کی نظر میں سرخرو تو ہوا لیکن جو داغ اس کے دل پر رہ گیا وہ کبھی بھی نہ مٹ سکا اور جو بے اعتمادی کی فضا تھی وہ کبھی نہ دور ہو سکی۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ کچھ ناکردہ گناہ بھی میرے گناہوں میں شامل ہونے لگی اور اگر کسی بھی خاتون سے میرا ملنا جلنا ہوتا تو میری بیوی کو شک گزرتا۔ کچھ ایسے ایسے اندوہناک معاملات اس سلسلے میں آ گئے کہ مجھے بہت شرمندگی اٹھانا پڑتی ان خواتین سے جو ایک شاعر کے طور پر مجھ سے ملتی تھیں اور میری عزت کرتی تھیں۔ میری بیوی کو ان پر بھی شبہ ہوتا تھا۔

ایسی چیزوں کا ہونا شاید نفسیاتی طور پر ممکن بھی ہو لیکن یہ معاملہ کچھ حد سے بڑھ گیا اور میں اس بات سے بہت پریشان رہنے لگا اور گھریلو ماحول کی تلخی کو مٹانے کے لیے گھر سے زیادہ مجھے باہر کی فضا پسند آنے لگی۔ اور میں دیر دیر تک سٹوڈیو میں رہنے لگا۔ میرا یہ وہ زمانہ تھا کہ میں فلم انڈسٹری میں سب سے زیادہ مصروف تھا۔ فلم میں ہر تیسرا گانا میرا ہی ریکارڈ ہوتا تھا۔ ایک موقع ایسا بھی آیا کہ عید کے موقع پر پاکستان میں جو چار فلمیں ریلیز ہوئیں ان میں سے تین میری تھیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہم تین شاعروں کو طوطی بول رہا تھا۔ ایک سیف الدین سیف تھے، ایک تنویر نقوی تھے اور ایک میں تھا۔ ہم تینوں میں ایک صحت مند مسابقت چل رہی تھی اور اس میں کسی سے کسی کو حسد کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ ہم ایک دوسرے کی کامیابیوں سے خوش

ہوتے تھے لیکن ساتھ ہی ایک رشک کی فضا ضرور تھی۔ اگر تنویر نقوی کا کوئی گانا ہٹ ہو جاتا تو میں سوچتا تھا کہ کوئی میرا گانا ایسا آجائے جو اس سے آگے بڑھ جائے۔ غالباً سیف صاحب کا بھی یہی حال ہوتا ہوگا۔

سیف صاحب کا ایک گیت اس زمانے میں بہت مقبول ہوا۔ یہ گیت تھا۔

۔ پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے

اس گیت کو اقبال بانو نے گایا تھا۔ میں بے چین تھا کہ اس گانے نے اپنے سے پہلے گانوں کو بالکل ہی دبا کر رکھ دیا ہے۔ کچھ ایسا ہو کہ اس سے اچھا گانا آئے جو اسے بھی پیچھے چھوڑ جائے۔ انور کمال پاشا صاحب کی فلم ''قاتل'' بن رہی تھی۔ اس کے لیے مجھے جب گانے لکھنے کی دعوت دی گئی تو ایک سچوئیشن ایسی آئی جس کے لیے میرے ذہن میں منصوبہ یہ بنا کہ اس گانے کو اقبال بانو گائے۔ کیونکہ میوزک ڈائریکٹر وہی تھے۔ سیف صاحب والے گانے کے میوزک ڈائریکٹر ماسٹر عنایت حسین تھے جبکہ اس فلم کے میوزک ڈائریکٹر بھی وہی تھے۔ چنانچہ میں نے گانا لکھا اور ماسٹر صاحب سے پہلے ہی کہہ دیا کہ میں نے یہ گانا اقبال بانو کو ذہن میں رکھ کر لکھا ہے۔ ماسٹر صاحب نے اس گانے کی بہت اچھی ٹیون بنائی۔

اب اس گانے کے ساتھ ریکارڈنگ تک جو سلوک ہوا وہ ایک الگ داستان ہے۔ بہرحال یہ گانا ریکارڈ ہوا، فلم چلی اور اس گانے کی خصوصیت یہ تھی کہ ہر شو میں جب یہ گانا آتا تھا تو ہال میں تماشائی زوردار تالیاں بجاتے تھے اور سٹیج پر پیسے پھینکتے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب کرکٹ کا ایک میچ ہوا اور انڈیا کے لوگ پاکستان آئے تو انہوں نے خاص طور پر اس گانے کو پسند کیا اور انڈیا کے تماشائی جوق در جوق اس گانے کو دیکھنے کے لیے سینما میں جاتے تھے۔ بعض لوگوں سے سنا کہ انہوں نے محض یہ گانا سننے کے لیے دس دس بار یہ فلم دیکھی بلکہ جب تک یہ انڈین تماشائی لاہور میں مقیم رہے ہر روز یہ گانا دیکھنے کے لیے سینما میں چلے جاتے۔

چنانچہ ''پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے'' چونکہ اپنا عرصہ گزار بھی چکا تھا۔ اس لیے

جب یہ گیت آیا تو اس نے اس کی جگہ لے لی اور یہ گانا آگے بڑھنے لگا۔ اس گانے کے ساتھ ہی اقبال بانو کا نام ایک بار پھر آگے بڑھا۔ اور میرا یہ عالم تھا کہ میری وہ جو تمنا تھی کہ سیف صاحب کے گیت سے میرا گیت آگے نکل جائے وہ پوری ہو چکی تھی اور مجھے چین کی نیند آنے لگی۔

فلم قاتل کی ریلز کے بعد اور اس گانے کی مقبولیت کے بعد بیچ میں کچھ عرصہ اور گزرا تو ایک فلم جگدیش آنند نے شروع کی جس کا نام تھا، ''عشق لیلیٰ''۔ اس فلم کے ڈائریکٹر منشی دل تھے۔ اس فلم کے مقابلے میں انور کمال پاشا نے لیلیٰ مجنوں کے نام سے ایک فلم شروع کی۔ جس کے میوزک ڈائریکٹر رشید عطرے تھے۔ انور کمال پاشا کی فلم میں چھ گانے تھے۔ جبکہ ''عشق لیلیٰ'' میں ہم نے جو سچوئیشن نکالیں ان کے مطابق چودہ گانے بنتے تھے۔

ادھر پاشا صاحب کے پاس ''لیلیٰ مجنوں'' کے چھ گانوں کے لیے تین چار شاعر تھے جبکہ ادھر ''عشق لیلیٰ'' کے چودہ گانوں کے لیے میں اکیلا تھا۔ چودہ دنوں میں گانے لکھے بھی گئے۔ ٹیونیں بھی بن گئیں اور گانوں کی ریکارڈنگ بھی ہوگئی اور یہ فلم کوئی ایک مہینہ چار دنوں میں مکمل ہو کر ریلیز بھی ہوگئی اور اس کے سارے گانے ہٹ ہوئے۔ ان میں ایک گانا ایسا تھا جو منشی دل صاحب کی پہلی فلم ''حمیدہ'' کے لیے میں نے دیا تھا۔ دراصل وہ ایک میری پرانی غزل تھی:

؎ پریشاں رات ساری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

یہ غزل اس فلم میں نہیں آسکی تھی اس لیے اس بار میں نے منشی دل صاحب سے کہا کہ میری بات مانئے اور اس غزل کو اس فلم کے لیے لے لیتے ہیں اور اسے اقبال بانو کی آواز میں ریکارڈ کرواتے ہیں اور آپ اس پر اعتراض نہ کیجئے۔ چونکہ منشی صاحب نے ہم پر اعتماد کیا ہوا تھا اس لیے انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔

اب اقبال بانو کو پیغام بھیجا جائے تو ان کی طرف سے کوئی جواب نہ آئے۔ دراصل اقبال بانو ان دنوں ملتان میں حرم گیٹ میں گایا کرتی تھیں۔ یہاں تو کبھی کبھی کوئی گانا ملتا تھا جس کے لیے وقت بھی دینا پڑتا تھا جبکہ وہاں روز کی آمدن روز کی روز ہو جاتی تھی۔ اس

لیے وہ آنے سے گریز کرتی تھیں۔ چونکہ میرا مفاد یہ تھا کہ گانا اقبال بانو ہی کی آواز میں ہو اور ہم نے ٹیون بھی بنالی تھی اس لیے میں نے کہا کہ میں خود ان سے بات کرنے جاتا ہوں۔

میرے دوست شہزاد احمد شہزاد ان دنوں میرے زیادہ قریب تھے۔ میں نے انہیں تیار کیا کہ دونوں مل کر ملتان جاتے ہیں۔ آپ کی سیر ہو جائے گی اور میں اقبال بانو سے گانے کی بات کرلوں گا۔ چنانچہ ہم وہاں پہنچے تو اقبال بانو نے ہماری دعوت کی۔ میں، شہزاد صاحب اور اقبال بانو تینوں نے مل کر کھانا کھایا۔ اقبال بانو نے ہامی بھری کہ وہ دو تین روز میں گانا گانے کے لیے لاہور آ جائیں گی۔ چنانچہ وہ یہاں آئیں اور یہ گانا ریکارڈ ہوا۔ فلم چلی تو ایک بار پھر اقبال بانو کی آواز میں یہ گانا اوپر آ گیا۔

اس گانے کی ریکارڈنگ کے دوران میں میں نے محسوس کیا کہ اقبال بانو اپنے ملتان کے ماحول سے خوش نہیں ہیں اور وہ لاہور آنا چاہتی ہیں۔ پہلے تو مجھے حیرت ہوئی کہ وہاں تو ان کا لگا لگایا اڈہ ہے اور یہاں آ کر فلم کے لیے خاصی جدوجہد کی ضرورت ہوگی۔ بہرحال میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ وقت گزرتا گیا اور وہ ملتان ہی میں رہیں۔ اس کے بعد جانے کیا مسئلہ ہوا کہ اقبال بانو کا مجھے خط آیا جس میں انداز مخاطب کچھ تحرک پیدا کرنے والا تھا جو عام حالات میں ایک خاتون کسی مرد کو نہیں لکھا کرتی۔ اس سے میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس خط کے آخر میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ اگر آپ ملتان کے آس پاس سے کسی وقت گزریں تو مجھ سے ملے بغیر نہ جائیں ورنہ شکایت ہوگی۔ آخر میں لکھا تھا آپ کی اقبال بانو۔

یہ ساری چیزیں پڑھ کر مجھے کچھ حیرت ہوئی لیکن میں نے کہا ٹھیک ہے۔ آزاد خیال لوگ اس قسم کی باتیں اور اندازِ تخاطب اختیار کرتے ہوں گے اور انگریزی کے لفظ Yours کا ترجمہ آپ کی ہی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ بات آئی گئی ہوگئی۔ اس کے بعد ایک اور معاملہ آ گیا۔ ڈائریکٹر سبطین فضلی کی فلم ''آنکھ کا نشہ'' بننے لگی تو میوزک ڈائریکٹر عنایت حسین اور سانگ رائٹر مجھے لیا گیا۔

فضلی صاحب نے کہا کہ دو آدمی تو آپ ہیں، اس تیسری کو بھی جمع کرتے ہیں اور

اسی طرح کا ایک اور گانا بناتے ہیں جیسا یہ گانا تھا۔

دل توڑنے والے دیکھ کے چل
ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

ہم نے کہا کہ بات ٹھیک ہے لیکن ہم اس بار اقبال بانو کا سٹائل وہ نہیں رکھیں گے۔ کیونکہ جب ایک ہی جیسے گانے آتے ہیں تو پچھلے گانے یاد آنے لگتے ہیں لیکن وہ کہنے لگے کہ نہیں وہی سٹائل بھی ہوگا۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ چنانچہ میں نے غزل لکھی اور اقبال بانو کو بلایا گیا۔ اقبال بانو نے اس بار مجھے کہا کہ آپ خود مجھے گھر سے لے کر جایا کیجئے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ چنانچہ میں انہیں لینے کے لیے جانے لگا اور انہیں چھوڑنے کے لیے بھی خود جانے لگا۔

اس آنے جانے میں کچھ ایسا لگا کہ اقبال بانو میرے قریب آتی چلی جارہی ہیں۔ میں اپنے آپ کو ریزرو رکھے ہوئے تھا۔ اس لیے کہ اس سے دس سال پہلے چندر کانتا سے رومانس کے جو نتائج نکل چکے تھے ان سے میں خوفزدہ تھا اور میں ایک بار پھر عشق کی چکی میں پسنے سے باز ہی رہنا چاہتا تھا۔ چنانچہ یہ معاملہ یہیں تک تھا کہ بیٹھے چائے پی اور چلے آئے۔ لیکن پھر ایسا وقت بھی آیا کہ اقبال بانو نے کہا کہ مجھے آپ کی ذات سے ایک ایسی دلچسپی ہے جس میں سبھی کچھ شامل ہے اور خصوصاً آپ کی شاعری، آپ کا حسن اخلاق اور آپ کا انداز گفتگو ایسا ہے جو مجھے سکون دیتا ہے اس لیے آپ شام کو روزانہ مہربانی کر کے چائے پینے میرے پاس ایک بار آجایا کریں۔ اس زمانے میں میں نے اپنے بھائی کو کیفے نشاط کے نام سے رائل پارک میں ایک ریسٹورنٹ کھول کر دیا ہوا تھا۔ شام کو وہاں دوست جمع ہوتے تھے۔ اور ان دوستوں میں وقت گزارنا بھی ضروری ہوتا تھا اور طے یہ پایا کہ جب دوستوں سے مجھے فراغت ہو تو میں رات کے آغاز میں اقبال بانو کے ہاں جاؤں۔ جس دن میں لیٹ ہوتا تھا میں نے محسوس کیا کہ اقبال بانو انتظار کی کیفیت میں ہیں اور میں نے کبھی انہیں دروازے کے قریب بھی پایا۔ میں ان سے بہت متاثر ہوا۔ اور آئندہ وقت پر آنے لگا۔

اس طرح ہوتے ہوتے تین مہینے گزر گئے اور میں محسوس بھی کر رہا تھا کہ میرے فریق مخالف کا مدعا کیا ہے لیکن میں اس دھندے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن ایک دن یوں ہوا کہ میں نو بجے وہاں پہنچا۔ بیٹھے تھے کہ دس بجے گئے اور اس کے بعد بادل گرج اور بارش شروع ہوگئی۔ یہ مکان انارکلی کے ساتھ نسبت روڈ کی بنگالی گلی میں تھا اور گلی نشیب میں تھی۔ باہر پانی بھر گیا اور ایک بجے تک میں نے بارش رکنے کا انتظار کیا اور جب بارش نہیں رکی تو مجبوراً مجھے اقبال بانو کی یہ دعوت منظور کرنی پڑی کہ میں بھی رات وہیں سو جاؤں۔

وہاں کمرے دو تھے۔ ایک میں اقبال بانو کی ماں سوئی ہوئی تھیں اور دوسرے کمرے میں ایک چارپائی اور ایک صوفہ تھا، چنانچہ اقبال بانو نے چارپائی پر مجھے بستر ڈال دیا اور خود صوفے پر لیٹ گئیں۔ اب میں جب تھوڑی دیر وہاں لیٹا تو اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں چارپائی پر اکیلا نہیں ہوں۔ یہ میری زندگی کی پہلی رات تھی جب میں گھر سے باہر رہا اور اس شکنجے میں کسا گیا جس سے میں دور رہنا چاہتا تھا۔

صبح پانچ بجے میری آنکھ کھلی تو بارش تھم چکی تھی۔ گلی میں پانی بھی نہیں تھا۔ میں وہاں سے اٹھ کر اپنے آرٹسٹ دوست موجد کے گھر چلا گیا اور ان سے واقعہ بیان کر دیا اور کہا کہ اب میں گھر میں یہ کہوں گا کہ رات میں موجد صاحب کے گھر تھا۔ آپ ذرا پہلے ہی سے اپنا دفتر کھول کر وہاں سے میرے گھر فون کر دیں۔

یہاں سے اس داستان کا آغاز ہوا جو بعد میں کتنی ہی چھوٹی چھوٹی داستانوں کا باعث بنی اور جس نے مجھے زندگی کے بہت سے تجربے دیئے اور جس نے مجھے ایک ایسی تصنیف دی جس کا نام ''مطربہ'' ہے۔ اور جس نے اُس سال کا پاکستان کا سب سے بڑا انعام آدم جی پرائز حاصل کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ کامیابیاں، کچھ ناکامیاں، کچھ شہرتیں، کچھ رسوائیاں اور گوناگوں قسم کے حادثات مجھے دیئے۔

برسات کی اس رات کے بعد میرے اور اقبال بانو کے تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ میں جتنا اس سے دور رہا تھا اب اس سے اتنا ہی قریب ہوتا چلا جا رہا ہوں۔ اس کی وجہ اقبال بانو کا بے پناہ اظہار محبت، اس کی سلجھی ہوئی گفتگو، اس کی

آواز کا رس اور اپنے پیشے سے دور ہو جانے کی تمنا تھی۔ میں نے سوچا کہ الزامات تو گھر سے آ ہی رہے ہیں۔ بیوی میری دس سالہ نیک پاک زندگی پر بھی الزامات کے چھینٹے دے رہی ہے تو چلو اگر ایک الزام سچ بھی ہو گیا تو کیا ہے۔ پھر میں نے یہ بھی سوچا کہ ایک اچھی آواز والی خاتون جو برے پیشے میں پڑی ہوئی ہے اگر وہ میری وجہ سے اس پیشے سے نکل کر اچھی زندگی گزارنے لگے گی تو یہ بھی کریڈٹ مجھے ہی جائے گا۔

پھر ایسا ہونے لگا کہ اگر اقبال بانو دس دن ملتان میں رہ رہی ہیں تو بیس دن لاہور میں۔ اس کی بنیادی وجہ بقول اقبال بانو کے میں تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ گانے بھی تھے جو میں اپنی لکھی ہوئی فلموں میں اقبال بانو کے لیے CREATE کیا کرتا تھا اور اس زمانے میں میری لکھی ہوئی فلموں میں کوئی نہ کوئی گانا اقبال بانو کا ہوا کرتا تھا۔ اس میں اہتمام یہ تھا کہ اقبال بانو کے انگ میں گانا تیار ہوا کرتا تھا۔ انہی سروں میں جن سروں تک اقبال بانو کی آواز چمکتی تھی اور پھر ریکارڈنگ کے بعد ایڈیٹنگ کی ذمہ داری بھی ہمارے سر تھی۔

یہ تجربے بہت کامیاب رہے۔ اس میں سب کا کمال شامل تھا لیکن اب میں جو کچھ کر رہا تھا اپنا فرض سمجھ کر کر رہا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اقبال بانو کی پوری زندگی میں جو ضرورتیں ہیں انہیں پورا کرنا میرا فرض ہو چکا ہے اور ان کے جتنے کام ہیں وہ مجھی کو کرنے چاہئیں۔ چنانچہ گانوں کے علاوہ ان کی زندگی میں جو جو مسائل تھے ان کا حل بھی میرے حصے میں آیا۔

کسی زمانے میں ان کے ہاں ملتان میں چوری ہو گئی تھی۔ اور ان کی ماں اور نانی کے زمانے کے زیورات چرا لئے گئے۔ انہوں نے نواب صادق خاکوانی نام کے ملتان کے ایک رئیس کے خلاف مقدمہ درج کروایا ہوا تھا۔ اور بتایا تھا کہ یہ ان کی داشتہ تھیں لیکن جب تعلقات خراب ہوئے تو نواب صادق خاکوانی نے ان کے زیورات چوری کروا لئے۔ مقدمہ رپورٹ کی حد سے آگے نہیں نکل رہا تھا۔

ہم نے جوش عشق میں کیس کو تازہ کروایا اور اپنے دوست نامور قانون دان

اعجاز بٹالوی کی مدد حاصل کی۔ انہیں ہائی کورٹ تک پہنچایا اور نواب صادق خاکوانی کی گرفتاری کے وارنٹ ہائی کورٹ سے جاری کروائے اور پولیس کو پابند کروایا کہ وہ مقدمہ کی تفتیش کرے۔ چنانچہ اپنے علاقے کا اتنا بااثر آدمی گرفتار کر کے حوالات میں دے دیا گیا جس کا اقبال بانو کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے مجھی کو بھیجا کہ آپ دیکھ کر آئیں کہ وہ واقعی حوالات میں بند ہے یا نہیں۔ جس پر میں خود گیا اور دیکھا کہ خاکوانی صاحب حوالات ہی میں تھے۔

اب میں سوچتا ہوں کہ جو کام میں نے کر دیا تھا اور جس کے کرنے کے بعد میں ملتان ہی میں گھوم رہا تھا یہ کیونکر ہوا۔ چونکہ وہ لوگ ملتان کے مقامی تھے اور بااثر تھے اور بدلہ لینے کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے لیکن میرے ذہن میں کہیں بھی کوئی خوف نہیں تھا۔ شاید یہ جذبہ عشق کی کارکردگی تھی یا مجھے یہ زعم تھا کہ وہاں ملتان میں اتنی پائے کے بااثر لوگ میرے بھی دوست ہیں جن کے ہاں میں ٹھہرا کرتا تھا۔ ہمارے اس وقت کے دوستوں میں قسور گردیزی صاحب سرفہرست تھے کیونکہ وہ سخن فہم، ادب نواز اور ادیب نواز شخص تھے۔ پھر سوشل آدمی تھے اور لیڈر بھی تھے۔ ہم جب بھی کبھی مشاعروں میں ملتان جاتے تھے تو انہی کے پاس ہمارا قیام ہوتا تھا۔ یہ زعم بھی تھا کہ اس قسم کے لوگ ہمارے دوستوں میں سے ہیں لیکن اب سوچتا ہوں تو جو کام میں نے کر دیا تھا اس کے نتائج کچھ بھی ہو سکتے تھے۔ بہرحال ایک یہ کام بھی میں نے کر دکھایا۔

اس طرح اقبال بانو نے ری ہیبلیٹیشن کلیم (REHABILITATION CLAIM) داخل کر رکھا تھا۔ وہاں بھی دستاویزات نہ ہونے کی وجہ سے ان کا کلیم منظور نہیں ہو رہا تھا۔ جو ثبوت درکار تھے وہ ان کے گاؤں روہتک ہی سے مل سکتے تھے۔ چنانچہ:

؎ بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

یہی بات ہوئی۔ میں روہتک (انڈیا) تک پہنچا اور دہلی بھی گیا اور جائز و ناجائز طریقے سے جیسے بھی ہو سکا ان کے کلیم کے لیے دستاویزات مہیا کیں اور خود اس کیس کو آگے بڑھایا۔ ملتان جو ری ہیبلیٹیشن کمشنر تھے وہ میرے نام سے واقف تھے۔ ان سے یہ کلیم

منظور کروایا۔ پھر میرے ذمے یہ ڈیوٹی آئی کہ الاٹمنٹ بھی کرواؤں۔

اس سلسلے میں میں نے کچھ کام اپنے دوستوں کے سپرد کیا۔ اس زمانے میں میرے قریبی دوستوں میں عالم علی سید، سید سکندر بخت ایڈووکیٹ تھے۔ ان سے میرے بہت قریبی تعلقات تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ جہاں بھی کسی مکان کی قرعہ اندازی ہوتی تھی، یہ میرے دوست بالخصوص عالم علی سید پہنچ جاتے تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ٹیمپل روڈ کی وہ کوٹھی جس میں مرحوم حمید نظامی کرایہ دار کی حیثیت سے رہتے تھے وہ اقبال بانو کے نام نکل آئی۔

میں اور اقبال بانو اس وقت EMI کمپنی میں، جو اس وقت ہز ماسٹر وائس کمپنی کہلواتا تھا، اس میں ایک گانے کی ریہرسل میں مصروف تھے کہ عالم علی سید بھاگتے ہوئے آئے اور کہا کہ اقبال بانو کے نام کوٹھی نکل آئی ہے۔ یہ آٹھ کنال کی کوٹھی تھی اور ایک کارنر پلاٹ تھا۔ اقبال بانو نے سنا تو مجھ سے لپٹ گئی اور کہنے لگی کہ اب آپ مجھ سے شادی کرلیں۔ یہ میرا دوسرا کارنامہ تھا۔

بعد میں جب اقبال بانو نے اس کوٹھی کے پلاٹ بنا کر بیچے تو ان کی قیمت اٹھائیس لاکھ روپے پڑی۔ خیر کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ساڑھے چار سال کا عرصہ جو میری اور اقبال بانو کی دوستی کا گزرا وہ بہت خوشگوار اور پُرخلوص تھا۔ لیکن ہوا ایسا کہ اقبال بانو کی شہرت تو فلمی گانوں کی وجہ سے اوپر اوپر جاتی رہی لیکن ساتھ ساتھ میری ساکھ بگڑتی رہی اور میں اتنا ملوث ہوتا چلا گیا کہ اپنے کام سے غافل ہوگیا۔

گھریلو طور پر بھی اب بات کھل چکی تھی کہ میرے اقبال بانو سے مراسم ہیں۔ ان حالات میں گھر میں کیسے سکون ہوسکتا تھا۔ آئے دن گھر میں لڑائی ہوتی اور بے سکونی ہوتی۔ پھر میں نے فلم کا کام بھی محدود کردیا۔ اس لیے کہ میں صرف اس وقت ضرورت محسوس کرتا تھا جب میری جیب خالی ہوجاتی تھی اور مجھے دونوں طرف کے اخراجات کے لیے کمانے کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس طرح میرا کاروبار متاثر ہوا لیکن رومانس کا اپنا ایک Charm اور ذہنی اڑان ہوتی ہے۔ چاہے وہ اڑان خلاء میں لے جا کر معلق کردے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رومانس کا ایک الگ ہی مزا ہوتا ہے۔

اقبال بانو کے جب مجھ سے تعلقات شروع ہوئے تھے اس وقت گانے والوں کا مارکیٹ ریٹ کچھ زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ اگر کسی کو مقامی طور پر رات بھر گانے کے پانچ سو روپے مل جائیں تو بہت سمجھے جاتے تھے۔ حالانکہ میری نظر میں غزل کی گائیگی میں اب بھی اقبال بانو اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ اس زمانے میں گاہے گاہے انہیں مجروں میں جانا پڑتا تھا اور کبھی مشرقی پاکستان میں یا پھر یہاں بھی دوسرے شہروں میں وہ شادی بیاہ کی تقریبات کے سلسلے میں بھی جاتی تھیں۔ رفتہ رفتہ فلمی گانوں سے انہیں مزید شہرت ملی اور ان کا معاوضہ بڑھتا چلا گیا۔ پھر ایسا ہوا کہ شادی بیاہوں کے علاوہ لاہور کے کلبوں میں ان کی مانگ بڑھی اور کچھ سلجھے ہوئے لوگوں کی محفلوں میں بھی ان کو بلایا جانے لگا۔ اس قسم کے بلاووں کے لیے وہ لوگ اقبال بانو کی رہائش پر آتے تھے۔

میری عجیب پوزیشن تھی کہ میں فلم سٹوڈیو میں تو اقبال بانو کے ساتھ رہ سکتا تھا لیکن جب کسی فنکشن کے سلسلے میں کوئی ان سے بات کرنے ان کے گھر پر آتا تھا تو میں دوسرے کمرے میں جا کر اس وقت تک بیٹھا رہتا تھا جب تک ان کی کاروباری باتیں مکمل نہ ہو جائیں۔ اس عرصے میں جو لوگ وہاں پر آتے تھے ان میں لیڈر، علمائے کرام اور شہر کے رئیس اور ایسے ایسے لوگ شامل ہوتے تھے جن کے بارے میں یقین نہیں آ سکتا کہ وہ گانے کا شوق رکھتے ہوں گے۔ گانے کا شوق رکھنا کوئی جرم نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ گانے کا شوق انسان پیدائشی طور پر لے کر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس گانے کے شوق کی تکمیل کے لیے کسی گانے والی کے گھر میں بیٹھ کر، چائے پینے اور مزے مزے کی باتیں کرنے کے بہانے ہوتے ہیں۔ میں اس قسم کے مواقع پر جو باتیں سنتا تھا وہ گانے کے شوق کے برعکس بہت بامعنی اور قریب ہو جانے والی ہوتی تھیں۔ میں اور اقبال بانو دونوں ایسے لوگوں کے چلے جانے کے بعد جی کھول کر ہنسا کرتے تھے۔ یہ ۱۹۵۷ء سے لے کر ۱۹۸۰ء تک کے درمیان کی باتیں ہیں۔ اس زمانے میں جو لوگ اقبال بانو کے گھر آیا کرتے تھے وہ اب جب کبھی نظر آ جاتے ہیں تو میں دل ہی دل میں مسکرایا کرتا ہوں۔ ان میں سے کسی شخص نے اب ڈاڑھی بڑھائی ہے، کسی کے بال سفید ہیں اور کسی نے بہت بھونڈے رنگ کا خضاب سر میں

لگا رکھا ہے۔ کسی کے دانت اب جب بہت سفید نظر آتے ہیں تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ اس کے مصنوعی دانت لگے ہوئے ہیں۔ ایک صاحب کو دیکھا وہ آجکل تبلیغی جماعت میں شامل ہیں۔ اللہ ایسے لوگوں کو اور نیکی کی توفیق دے لیکن جس جس روپ میں میں نے اقبال بانو کے حوالے سے ان بڑے آدمیوں اور مصلحین کو دیکھا ہے اس کا پس منظر اگر آپ کے ذہن تک پہنچ سکے تو آپ بھی اللہ کو یاد کریں گے۔

میری کتاب ''مطربہ'' میں جو نظمیں ہیں وہ اقبال بانو سے رفاقت کے ساڑھے چار سال کے دوران کی ہیں۔ اس عرصے میں مجھے جو تجربے حاصل ہوئے ان کی یہ نظمیں عکاس ہیں۔ ایک دو نظموں میں آپ کو یہ لوگ بھی نظر آئیں گے جن کا میں نے ابھی ذکر کیا۔ خصوصاً ایک نظم میں جن پیر صاحب کا میں نے ذکر کیا ہے وہ ایک گدی نشین ہیں۔ اقبال بانو کبھی ان کے دربار میں بلوائی گئی تھیں۔ جب واپس آگئیں تو پیر صاحب کے علاوہ ان کے بیٹے کے خطوط بھی انہیں آتے تھے جو بڑے مزے کے ہوتے تھے۔ یوں نظر آتا ہے کہ جیسے بعض پیر ان پارسا اسی انتظار میں بیٹھے ہوتے ہیں کہ کوئی عورت انہیں نظر آجائے اور اس کی قربت انہیں نصیب ہو تو وہ اپنے دل میں چھپے ہوئے قیس اور فرہاد کو اور مجنوں کو خطوط میں لے آئے اور اس کے بعد کے جتنے مراحل ہوتے ہیں ان تک ان کی رسائی ہو جائے۔ اللہ ہمیں توفیق دے کہ ہمارا ظاہر و باطن ایک ہو جائے اور یہ لوگ جو اپنے علاوہ ساری دنیا کو گنہگار سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو ہم سے بظاہر افضل و برتر سمجھتے ہیں انہیں خدا نیک راستہ دکھائے اور ان کے ظاہر و باطن کو ایک کر دے تاکہ ان کے مرید بیچارے جو عام طور پر غریب طبقوں سے ہوتے ہیں اور جو اپنی محنت کی کمائی ان کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں وہ کمائی کم از کم طوائفوں کی نذر ہونے سے بچ جائے۔

اقبال بانو سے میری شادی کی افواہیں اکثر مشہور ہوئیں۔ ایسی افواہیں ایک بار نہیں بلکہ کئی بار پھیلیں۔ ظاہر ہے کہ یہ افواہیں میری گھریلو زندگی پر پوری طرح اثر انداز ہو رہی تھیں۔ ایک مرتبہ تو ایسا بھی ہوا کہ اپنی ماں کو رنجیدہ دیکھ کر میرے بڑے بیٹے نے جو اس وقت سولہ سترہ برس کا تھا ایک پستول حاصل کیا۔ وہ ایبٹ آباد چلا گیا اور وہاں کے ڈپٹی

کمشنر سے ملا۔ بتایا کہ میں قتیل شفائی کا بیٹا ہوں اور مجھے پستول کا لائسنس چاہئے۔ وہاں کا ڈی سی بھلا آدمی تھا اس نے کچھ میرے نام کی وجہ سے اور کچھ اس کی ضرورتیں سن کر اسے پستول کا لائسنس دے دیا۔ وہ یہ پستول لے کر لاہور پہنچ گیا۔

اس نے نسبت روڈ کی بنگالی گلی کا طواف شروع کر دیا۔ پہلے تو اس کی ماں نے مجھ سے یہ بات چھپائے رکھی لیکن دو تین دن طواف کرنے کے بعد میری بیوی نے اپنے لہجے میں مجھ سے کہا کہ آپ تو اپنے مشاغل میں مصروف ہیں لیکن آپ کے اس جوان بیٹے کے پاس ایک پستول ہے یہ جا کر اقبال بانو کو قتل کر دے گا اور خود پھانسی چڑھ جائے گا۔ آپ یہی چاہتے ہیں؟ اس نے مجھ سے کہا کہ آپ باز آ جائیں ورنہ کچھ ہو جائے گا۔

جس وقت بیوی نے مجھے بتایا اس وقت دن کا وقت تھا۔ میرے بیٹے نے اس وقت یہ پستول بستروں کے ایک ڈھیر میں چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ میں نے وہ پستول وہاں سے اپنے قبضے میں کیا اور میں اس واقعہ سے کانپ گیا۔ اگر پہلے دو چار دن میں کہیں اقبال بانو کا اور اس کا آمنا سامنا ہو گیا ہوتا تو یہ واقعہ رونما ہو چکا ہوتا۔ اور ایک قتل اور پھانسی یہ دونوں میرے ہی کھاتے میں پڑتے۔ اللہ نے اس حادثے سے مجھے بچا لیا۔

اس کے بعد ایک واقعہ اور ہوا۔ ایک دن میں ابھی گھر میں جاگا نہیں تھا کہ اخبار والے نے بیل دی اور مجھے باہر بلایا۔ اخبار تو وہ دے کر جاتا ہی تھا لیکن اس نے باہر بلا کر مجھے کراچی کا اخبار ''کردار'' دکھایا جس میں پہلے صفحے پر میری اور اقبال بانو کی تصویر چھپی ہوئی تھیں اور نیچے اخبار والوں نے اپنی طرف سے ہمیں شادی کی مبارک دی ہوئی تھی۔ گویا ان کے بقول ہماری شادی ہو چکی تھی۔

میں اخبار فروش کے ساتھ باتیں کر رہا تھا اور وہ اونچے لہجے میں مجھے اس خبر کے بارے میں بتا رہا تھا کہ پتہ چلا کہ میری بیوی یہ سب باتیں سن رہی تھی۔ وہ شادی کی بات سن کر باہر آ گئی اور اس نے اخبار فروش کے ہاتھ سے پرچہ لے لیا۔ اور جب اس کی نظر اس خبر پر پڑی تو اس نے اپنا منہ پیٹنا شروع کر دیا۔ اور اس چیز کا جو ردعمل ہو سکتا تھا وہ بھی کیا۔ اس کے بعد اس نے پہلا کام یہ کیا کہ ہاتھ میں ایک چھری لی اور اس وقت گھر میں

میرے جو عزیز آئے ہوئے تھے انہیں ساتھ لیا، تانگہ پکڑا اور بنگالی گلی کا رخ کیا۔

میں اس لیے مطمئن تھا کہ اقبال بانو وہاں موجود ہی نہیں تھیں۔ وہ ان دنوں ملتان میں تھیں۔ پھر بھی میں نے اپنی بیوی کو جانے سے پہلے بہت روکا اور کہا کہ اس بات کو جانے دو۔ کیونکہ اگر ہماری شادی ہوئی ہوتی تو میں یہاں بیٹھا ہوتا۔ بلکہ میں اس کے ساتھ ہوتا لیکن وہ نہ مانی اور کہنے لگی کہ میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔ خیر جب یہ وہاں گئے تو پتہ چلا کہ اقبال بانو کے گھر پر تالا لگا ہوا ہے۔ میرے اس عزیز نے میری بیوی سے چھری تو چھین لی۔ جب یہ واپس گھر میں پہنچی تو اور چھری تلاش کرنے لگی اور کہنے لگی کہ میں اپنے آپ کو قتل کر ڈالوں گی۔

یہ ساری چیزیں جب میرے ساتھ ہونے لگیں تو مجھے زندگی ایک عذاب سی بنی ہوئی نظر آنے لگی اور اس میں سراسر قصور میرا اپنا تھا۔ بیوی اپنی جگہ ٹھیک تھی کیونکہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اگر معاشقہ کیا تو وہ میں نے کیا۔ اقبال بانو کا قصور بھی نہیں تھا کیونکہ اس کے طبقے میں شادی کے بغیر زندگی میں متعدد دوست پیدا کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس لیے اگر انہوں نے مجھ سے مراسم بنائے تو اس میں ان کا مقصد حیات شامل تھا۔ چنانچہ قصور تو میرا تھا جس نے نہ تو بیوی کا خیال کیا اور نہ بچوں کا اور اپنی زندگی داؤ پر لگا دی اور اس معاشقے میں آگے بڑھتا ہی چلا گیا۔

چنانچہ پہلے بیٹے کے پستول والا معاملہ اور اس کے بعد بیوی کا چھری والا واقعہ ہوا جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ اس دوران میں نے کراچی کے اس پرچے کو غلط خبر دینے کا نوٹس بھی بھیج دیا۔ اور گھر میں اس نوٹس کی نقل دکھائی اور کہا کہ اگر میری شادی ہوئی ہوتی تو میں یہ نوٹس نہ بھیجتا۔ پھر میں نے اس خبر کی تردید بھی چھپوائی۔ لیکن یہ خبر انڈیا کے پرچوں میں کثرت سے چھپی۔

میں چیمسفورڈ کلب کے سالانہ مشاعرے میں جب انڈیا گیا تو وہاں میں نے دیکھا کہ کمال امروہوی اور مینا کماری آ رہے تھے انہوں نے دور ہی سے میری طرف اشارہ کیا اور آتے ہی کہنے لگے کہ مبارک ہو۔ میں سمجھ گیا کہ ان تک بھی یہ خبر پہنچ چکی ہے۔ اب میں

اس کی تردید کہاں کہاں کرتا۔ وہ کہنے لگے کہ ایسی اچھی شاعری اور ایسی اچھی آواز کا امتزاج ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ میں مسکرایا اور کہا کہ اچھا آپ بیٹھیں۔

مجھے جب اس طرح مبارکبادیں ملتی تھیں تو میری تشویش اور بڑھتی چلی جاتی تھی اگر شادی ہوئی ہوتی تو اور بات تھی۔ لیکن مفت میں ایک کریڈٹ یا ایک الزام مل رہا تھا جس نے مجھے عجیب پوزیشن میں ڈالے رکھا۔

ایک بار مجھے مدراس سے ایک خط آیا کہ ہمارا مشاعرہ ہے اس میں آپ خود ضرور تشریف لائیں اور اگر ہو سکے تو اپنی اہلیہ اقبال بانو کو بھی ساتھ لے کر آئیں۔ اگرچہ وہ شاعرہ نہیں ہیں لیکن ہم دونوں کا خیر مقدم کریں گے اور ان کا آنا ہی ہمارے لیے خوشی کا باعث ہوگا۔

یہ وہ وقت تھا جب میری اقبال بانو سے علیحدگی بھی ہو چکی تھی۔ میں جب مدراس پہنچا تو منتظمین کو مایوسی ہوئی کہ میں اکیلا ہوں۔ لیکن مشاعرے میں انہوں نے کہا کہ ہمیں اپنی وہ غزل سنائیے:

ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

میں نے کہا کہ وہ غزل تو ایک ٹیون میں ہے جبکہ میں تو آپ کو تحت اللفظ سناؤں گا۔ اس لیے آپ کو کیا مزا آئے گا۔ وہ کہنے لگے کہ جیسے بھی چاہیں سنائیں مگر ہمیں وہ غزل سننی ہے۔ میں نے جب یہ غزل تحت اللفظ پڑھی تو یقین جانئے کہ لوگوں نے ایک ایک شعر چار چار بار سنا۔ میری یہ غزل تحت اللفظ میں بھی حاصل مشاعرہ رہی۔ میں سوچتا ہوں کہ شعر کا اثر زیادہ ہے۔ مجھے اس کا جواب یقیناً یہی ملتا ہے کہ ان سب چیزوں کا مجموعی اثر زیادہ ہے۔ لیکن چونکہ وہ ایک سخن فہم لوگوں کی محفل تھی اس لیے ان کے نزدیک شعر کا وزن زیادہ تھا۔ اس لیے مجھے آواز، ساز اور ٹیون کے بغیر اتنی لمبی چوڑی داد ملی۔

اقبال بانو سے مراسم کے دوران مجھے گانے والے گھرانوں کی کچھ عجیب و غریب رسوم سے بھی آگاہی ہوئی۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ان کے ہاں رشتوں کو چھپانا عام ہے۔ شاید یہ ان کے پیشے کی وجہ سے ہے۔ میں نے دیکھا کہ اقبال بانو اپنی نانی کو اپنی

ماں ظاہر کرتی تھیں اور اپنی ماں کو اپنی بہن ظاہر کرتی تھیں اور ان کے جو دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی یہ انہیں بھی اپنے بھانجے بھانجی ظاہر کرتی تھیں۔ جبکہ تھوڑا سا قریب آنے کے بعد میں نے اندازہ کرلیا کہ یہ رشتے اسی رسم کے تحت تبدیل کیے گئے ہیں جو کہ گانے والے گھرانوں میں رائج ہے۔

اسی مشاہدے کے بعد میں نے ''مطربہ'' کی وہ نظم کہی تھی جس کا عنوان ہے۔ ''عمر پوشی'' اس میں میں نے لکھا تھا:

منے! تم کیوں اپنی امی جان کو باجی کہتے ہو

منا بولا

باجی بھی تو نانی جی کو آپا آپا کہتی ہیں۔

میں نے سوچا

اس بازار کا جو کوٹھا ہے اس کی ریت نرالی ہے

یہاں تو ماں کو ماں کہہ دینا سب سے گندی گالی ہے۔

پھر ایک ڈرامہ مسلسل چلتا رہتا ہے کہ جو آپ کی محبوبہ ہے وہ ایک وِمپ کو ہمیشہ آپ کے لیے مستعد اور ڈراؤنی شکل میں تیار رکھتی ہے۔ اور وہ اس گھر کی بڑی ہوتی ہے یعنی اس کی ماں یا اس کی نانی جس کا ڈراوا ہمیشہ آپ کو دیا جاتا رہتا ہے۔ اور بار بار کہا جاتا ہے کہ نانی یہ کہتی ہیں یا اماں یہ کہتی ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آپ پر ایک طرف سے بوجھ بڑا ہے۔ دوسری طرف سے آپ کی محبوبہ یہ کہے گی کہ جو بھی ہو آپ نانی یا اماں کی فکر زیادہ نہ کریں کیونکہ آپ تو میری پسند ہیں۔ اماں کی پسند تو بہت دیکھ چکی ہوں۔ آخر میں بھی تو دل رکھتی ہوں اور میں آپ کا دامن زندگی بھر نہیں چھوڑوں گا۔ اور یہ جو کچھ ہے یہ ایک گھر میں نہیں بلکہ سبھی گھروں میں یہی رٹے رٹائے جملے ہوتے ہیں۔

پھر خطوط نویسی کا ایک معاملہ آتا ہے اور وہ صاحبہ اگر باہر کہیں گئی ہے یا آپ کہیں باہر چلے گئے ہیں تو خطوط میں آپ کو ایک ہی مضمون ملے گا جس میں آپ کی جدائی سوہانِ روح بنتی نظر آئے گی اور تمنا ہوگی کہ اگر میرا بس چلے تو میں اڑ کر آپ کے پاس

پہنچوں ۔ایک بار اقبال بانو اپنے ایک سابق دوست کا حال بتا رہی تھیں جسے وہ مجھ سے پہلے ہی چھوڑ چکی تھیں۔

کہنے لگیں کہ میں نے لاہور سے اسے خط لکھا تھا کہ جی بھر گیا ہے ایک پل لاہور میں نہ رہوں اور جلدی آپ سے آ کر ملوں اور میں آئی کہ آئی۔ کہنے لگیں کہ اس کے کوئی بیس دن کے بعد میں ملتان پہنچا تو وہ میرا خط لے کر آئے اور خط میرے سامنے رکھ دیا۔ کہنے لگے کہ یہ خط پڑھیے۔ آپ کو اڑ کر آنے میں اتنی دیر لگی ہے۔ اگر آپ ٹرین سے آتیں تو کتنے سال میں آتیں۔ اقبال بانو اس شخص کا مذاق اڑا رہی تھی۔

اس وقت اتفاق سے میرے بیگ میں اقبال بانو کے کچھ خطوط پڑے ہوئے تھے۔ تو مجھے یاد آیا کہ یہ بات تو مجھے بھی لکھی تھی چنانچہ میں نے وہ خط نکال کر اسے دکھایا کہ اس میں مجھے بھی یہی بات لکھی ہوئی ہے۔ کہنے لگی کہ یہ خط لکھنے کے بعد تو میں پہنچ گئی تھی میں نے کہا کہ ہاں یہ بات ٹھیک ہے کہ آپ دوسرے تیسرے دن پہنچ گئی تھیں لیکن مضمون ایک ہی ہے۔

چنانچہ ''مطربہ'' کی وہ نظم ''تیرے خطوں کی خوشبو'' اسی مشاہدے کے بعد کی نظم ہے اور میں عرض کروں کہ ''مطربہ'' میں میری کوئی نظم ایسی نہیں جو مشاہدے اور تجربے سے خالی ہو۔ اس لیے اس میں آپ کو شدتِ تاثر ملے گی۔ اور اس کتاب پر جو آدم جی پرائز دیا گیا وہ بھی اسی وجہ سے دیا گیا۔

اس تصنیف میں زندگی کی بہت سی حقیقتیں ہیں اور میرا خیال ہے کہ نظم کی وہ پہلی کتاب ہے جو خیالی باتوں سے خالی ہے۔ میں نے اس کے مختصر دیباچے میں لکھا تھا کہ ہمارے لکھنے والوں نے بشمول قاضی عبدالستار جنہوں نے ''لیلیٰ کے خطوط'' لکھی ایک مفروضے کا سہارا لیا اور رومانوی انداز میں طوائف کو سماج کی پیداوار بیان کیا۔ اس طرح سب لوگ بغیر تجربے کے طوائف کو مظلوم بتاتے چلے جاتے ہیں۔ میری نظر میں وہ عورت تو مظلوم ہے جسے کسی شریف ماحول سے اٹھا کر پہلی بار طوائف بنا دیا جاتا ہے۔ لیکن ساتویں آٹھویں پشت تک پشت در پشت جو عورت چلی گئی ہے اور جو پڑھ لکھ بھی چکی ہے اور اسے

معلوم بھی ہے کہ سماجی شعور کیا چیز ہے تو اسے ہم سماج کی پیداوار نہیں کہیں گے۔ وہ مظلوم نہیں ہے بلکہ ہم سمجھیں گے کہ اس نے یہ پیشہ اصولی و ذہنی طور پر خود قبول کرلیا ہے۔ ورنہ وہ یہ بھی کرسکتی ہے کہ اس کے پاس چونکہ بہت سی دولت موجود ہے اس لیے وہ یہ پیشہ چھوڑ بھی سکتی ہے اور اپنی اگلی نسلوں کو سیدھے راستے پر ڈال سکتی ہے۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ طوائفیت کا آج کا ادارہ جو پشتوں سے سلسلہ در سلسلہ چلا آرہا ہے اس میں مظلومیت کا کوئی پہلو نہیں ہے بلکہ یہ طوائفیں تو خود استحصال کرنے والی شخصیت ہیں۔ چنانچہ میں نے پہلی بار نظم کی کسی تصنیف میں اس ماحول کی سچی عکاسی کی۔

اگرچہ میرے سامنے اس تصنیف کے وقت ایک شخصیت تھی لیکن میں نے اسی ایک شخصیت کو ہی نہیں لیا بلکہ اس کے سارے طبقے کو اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ اور یہ کتاب تصنیف کی ہے۔

طوائفیت کا سلسلہ ہزاروں سال پہلے سے شروع ہوتا ہے۔ مندروں میں چڑھاوا چڑھانے کے لیے پرانا ہندو سماج اپنی بیٹیوں کو مندروں میں چھوڑ دیتا تھا۔ اور وہ مندر کی ملکیت ہوتی تھیں اور انہیں دیوداسیاں کہا جاتا تھا۔ اور ان کی پوری زندگیاں مندروں کی خدمت کے لیے وقف ہوتی تھیں اور انہیں تمام زندگی کنوارا رہنا پڑتا تھا۔ وہ ایک مقدس فریضے کے طور پر اپنی زندگیاں وہاں گزارتی تھیں لیکن شیطان کہاں کہاں نہیں پہنچتا۔ وہاں بھی کچھ شیطان مہنتوں کی وجہ سے بعض لڑکیاں اپنے راستے سے بھٹک جاتی تھیں یا انہیں بھٹکا لیا جاتا تھا اور جب ان پر بدنامی کا داغ لگتا تھا اور ان کے بطن سے کوئی بچہ پیدا ہو جاتا تھا تو ان بے چاری دیوداسیوں پر ایک مذہبی اور سماجی عتاب نازل ہوتا تھا۔ اور انہیں مندروں سے نکال کر باہر پھینک دیا جاتا تھا۔

یہی دیوداسیاں وہاں سے دھتکاری ہوئی باہر جاتی تھیں تو ان کی بچیوں کو رام جنی کہا جاتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے مہاتما گاندھی اچھوتوں کو ہریجن کہا کرتے تھے۔ چنانچہ یہ رام جنیاں باقاعدہ گانے بجانے کے پیشے سے منسلک ہو جاتی تھیں۔ اور اس طرح ویشیا کا جو ادارہ بنا وہ انہی رام جنیوں کا ایک شاخسانہ تھا۔ یہ رام جنیاں بظاہر گانے بجانے کے پیشے

سے منسلک ہوتی تھیں لیکن ساتھ ہی اس وقت کا سماج انہیں جسم فروشی کی طرف لے جاتا تھا اور ہوتے ہوتے یہ طوائفیت کا ایک باقاعدہ سلسلہ وہاں سے چلا۔

اس سلسلے میں ہزاروں سال پہلے ایک ہندی رائٹر دمودر گپت نے ایک کتاب لکھی تھی جس میں طوائف کے لیے جو کچھ کہا گیا اس میں اور آج کی طوائف میں مطلقاً کوئی فرق نہیں۔ جو کچھ ہتھکنڈے اس وقت ایک نائیکہ طوائف کو سکھاتی تھی وہی ہتھکنڈے آج کی نائیکہ بھی اپنی بیٹیوں کو سکھاتی ہے۔ ایک تماشبین لفظ اس پیشے سے منسلک ہے۔ جو شخص گانا سننے کے لیے جاتا ہے یا اس سے آگے کے مراحل طے کرنے کی تمنا رکھتا ہے اسے تماشبین کہا جاتا ہے۔ اور اس شخصیت کے لیے طوائفیت کے ادارے میں ایک اور لفظ بھی ہے اور اسے شریف بھی کہا جاتا ہے۔

جب طوائفیں یا ارباب نشاط آپس میں بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ رات دو شریف آئے تھے اور انہوں نے اتنے روپے بیلوں میں دیئے۔ چنانچہ دمودر گپت کی تصنیف میں جو طوائف نظر آتی ہے اور جو نائیکہ یا شریف نظر آتے ہیں وہی آج کے طوائفیت کے معاشرے میں بھی موجود ہیں۔ اب تھوڑا سا فرق یہ پڑا ہے کہ بعض سمجھدار طوائفیں کوٹھوں سے اٹھ کر کوٹھیوں میں چلی گئی ہیں۔ اور مجرے کی بجائے اب وہ فنکشن کی اصطلاح استعمال کرتی ہیں۔ اگر انہوں نے کسی شادی میں مجرے کے لیے جانا ہے تو پہلے کہا جاتا تھا کہ انہیں مجرے کی سائی ملی ہے لیکن اب کہا جاتا ہے کہ شادی کا ایک فنکشن ہے وہ اس میں شامل ہونے گئی ہے۔

یہ طوائفیں اب بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہتی ہیں۔ وہاں کوٹھے کی طرح کی اب محفل نہیں سجتی بلکہ براہ راست بکنگ ہو جاتی ہے اور دوسروں کی شادیوں یا خوشیوں کی تقاریب میں وہ گانے والی جاتی ہے۔

دمودر گپت کی اس کتاب کا ترجمہ اُردو میں میرا جی نے کیا۔ جو ہمارے شاعر بھائی ہیں۔ یہ ترجمہ اب مارکیٹ میں ناپید ہے اور اس کا ''نگار خانہ'' نام ہے۔ یہ ''نگار خانہ'' آپ کبھی پڑھ لیں تو آپ اس کے تناظر اور پس منظر دونوں سے واقف ہو جائیں گے۔

اب میں لوٹ کر اپنی کہانی کے کردار کی طرف آتا ہوں۔ اس کردار میں یقیناً ایک کشش میرے لیے پیدا ہو چکی تھی اور میں نے اپنی زندگی اس اس کردار کے لیے وقف کر دی تھی اب میرے اپنے کام پس پشت رکھے تھے اور اس خاتون کے کاموں کی سرانجام دہی میرا فرض بن گیا تھا۔ دنیا بھر کا کوئی کام جو اقبال بانو کا ہوتا اس کی انجام دہی میرے ذمہ تھی۔ بڑے بڑے کام تو خیر ہوتے ہی ہیں اس کے چھوٹے چھوٹے کام بھی میں بخوشی اپنے ذمہ لے لیتا تھا۔ وہ اس لیے کہ مجھے باور کروا دیا گیا تھا کہ یہ چیز میرے فرائض میں شامل ہے چونکہ اقبال بانو کی پسند میں ہوں اور اب اس کی پوری زندگی مجھ سے وابستہ ہے۔

اس سلسلے میں ایسا بھی ہوا کہ چوری کے سلسلے میں اگر کبھی بڑی سفارش کی ضرورت پڑی ہے اور وہ سفارش کراچی سے تعلق رکھتی ہے۔ تو مجھے وہاں تک مار کرنی پڑتی تھی یہ وہ زمانہ تھا جب جلال بابا صدر سکندر مرزا کے زمانے میں مرکزی وزیر مملکت برائے داخلہ امور بنا دیئے گئے تھے۔ جلال بابا سے میرے تعلقات اس زمانے کے تھے جب میں ایبٹ آباد میں مقیم تھا اور سیاسی کاموں میں ان کی نگرانی میں ہم نوجوان کام کیا کرتے تھے۔ چنانچہ میں نے اقبال بانو کے چوری کے کیس کے سلسلے میں جلال بابا کو لکھا کہ وہ اس کیس کی دوبارہ تفتیش کروائیں۔ چنانچہ جیسے کہ دستور ہوتا ہے کچھ فائلیں نکلیں لیکن اب کسی جگہ سے کوئی سراغ ملے تو کام چلے وہ تفتیش بھی ناکامی پر منتج ہوئی۔ اور اس کے بعد ہم نے اعجاز بٹالوی صاحب کی وساطت سے لاہور ہائی کورٹ میں رٹ کر کے ایک خاص آدمی کے وارنٹ گرفتاری جاری کروائے۔

یہ بات کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں مکمل یقین کر چکا تھا کہ اقبال بانو اب پوری طرح میری زندگی میں شامل ہے اور ہماری باقی زندگی پوری طرح ایک ساتھ گزر جائے گی۔ لیکن درمیان میں مجھے کچھ جھلکیاں ایسی نظر آئیں جن سے مجھے کچھ شبہات پیدا ہونے لگے اور میں یوں محسوس کرنے لگا جیسے دمودر گپت کی کتاب ''نگارخانہ'' میں طوائف اور نائیکہ کی ملی بھگت سے جو ڈرامہ کھیلا جاتا ہے اسی طرح کا ڈرامہ میرے ساتھ بھی کھیلا

جارہا ہے۔ کبھی ملتان سے ایک خط آجاتا جس میں اقبال بانو کو لکھا ہوتا کہ تمہیں بیگم بننے کا بہت شوق ہے لیکن تم دیکھنا کہ بہت پچھتاؤ گی۔ وہ خط مجھے دکھایا جاتا اور اس کے بعد اقبال بانو یہ کہتی کہ دیکھئے میری نانی درمیان میں حائل ہیں لیکن میں کسی دیوار کو حائل نہیں ہونے دوں گی۔ چنانچہ اس سلسلے میں ہمارے کچھ راز دار تھے۔ ان میں بہت مشہور فلمساز اور ڈائریکٹر سید سبطین فضلی سرفہرست تھے۔

فضلی صاحب نے کہا کہ آپ لوگ یہ چیزیں درمیان میں لاکر بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ دونوں ان معاملات کو چھوڑیں اور آپس میں شادی کرلیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ ادھر اقبال بانو نے بھی ہاں کردی۔ پتہ نہیں دونوں میں سے کس کے دل میں کتنی سچائی اور کتنی بناوٹ تھی لیکن ایک چیز ضرور تھی کہ میں اپنی حد تک یہ ضرور چاہتا تھا کہ معاملات بالکل صاف ہو جائیں اور ڈرامہ بازی کی جھلکیاں کبھی کبھار نظر آتی ہیں وہ دور ہو جائیں۔ اس کا علاج شادی ہی ہوسکتی تھی۔

فضلی صاحب نے اصرار کر کے کہا کہ شادی کی تاریخ مقرر کرلو اور اس آئے دن کی بک بک سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ چنانچہ ایک دن طے پا گیا اور نکاح کا اہتمام فضلی صاحب کے گھر ہی ہوا۔ ان کے گھر میں دس بارہ آدمیوں کے لیے ضیافت کا انتظام ہوا اور مولوی صاحب بھی بلا لیے گئے۔ اقبال بانو کی اس دن ریڈیو میں ریکارڈنگ تھی۔ میں جب ریڈیو سٹیشن پر گیا تو وہ سرخ جوڑے میں ملبوس تھیں اور دلہن بننے کے لیے تیار تھیں۔

میں نے انہیں وہاں سے اپنے ساتھ لیا اور ہم فضلی صاحب کے ہاں چلے آئے۔ یہاں پہنچ کر دن میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس سے میرے شبہات میں اضافہ ہوگیا اور اس واقعہ کا تعلق اقبال بانو کی تھوڑی سی دورخی سے تھا۔ چنانچہ وہ بات میرے ذہن میں بیٹھی ہوئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ بات درست ہے تو شادی کے بعد کیا ہوگا۔ بظاہر گفتگو سے ایسی کوئی بات نظر نہیں آرہی تھی۔

خیر ہم فضلی صاحب کے ہاں بیٹھے اور ابتدائی گفتگو ہوئی تو فضلی صاحب نے کہا دیکھئے بھئی نکاح سے پہلے آپ کی کوئی شرائط ہیں تو طے کرلیجئے۔ میں نے کہا کہ میری طرف سے

جو بھی بات ہے آپ ہی کر لیں۔ انہوں نے کہا کہ اقبال بانو آپ بتائیے۔ اقبال بانو نے کہا کہ میری تو ایک چھوٹی سی شرط ہے اور اس توقع سے بات کر رہی ہوں کہ فضلی صاحب! آپ قتیل صاحب کو منوا لیں گے۔ بات یہ ہے کہ شادی کے دو سال بعد تک مجھے گانے کی اجازت ہوگی۔ میں نے کہا کہ آپ کو گانے سے کس نے روکا ہے۔ آپ فلموں میں گا رہی ہیں۔ ریڈیو پر بھی آپ گاتی رہیے کیونکہ میں خود اس کا حامی ہوں۔

اقبال بانو کہنے لگیں کہ نہیں۔ فنکشز میں میری بکنگ ہوتی ہے آئندہ دو سال تک مجھے اس سے نہ روکا جائے۔ میں نے کہا کہ اقبال بانو! سیدھی بات یہ ہے کہ شادی کے بعد ایک تبدیلی ہونی چاہیے۔ اب تو خیر ہم میاں بیوی نہیں ہیں اس لیے مجروں وغیرہ میں جانا کوئی ایسی بات نہیں ہے لیکن شادی کے بعد جب آپ مجروں میں جائیں گی تو لوگ کہیں گے کہ یہ قتیل شفائی کی بیوی مجرے کر رہی ہے۔ تو میں کہاں کا رہوں گا۔ کہنے لگیں کہ نہیں۔ میرے بچوں اور فیملی کا کیا بنے گا۔ میں نے کہا کہ یہ شرط مجھے منظور نہیں۔

میں دن میں جو باتیں سن چکا تھا اقبال بانو کی اس شرط سے ان کی تصدیق ہونے لگی اور میں دل میں دعا مانگنے لگا کہ یہ معاملہ رہ ہی جائے تو اچھا ہے۔ تاکہ کچھ دیر اور دیکھ لیں۔ فضلی صاحب نے جب میری باتیں سنیں تو انہوں نے اقبال بانو کے منہ پر ہی مجھے کہا کہ قتیل صاحب اگر آپ اقبال بانو کی یہ گانے والی شرط مان لیتے تو میں سمجھتا کہ آپ جیسا بے غیرت کوئی نہیں۔ لیکن آپ میں رمق موجود ہے۔ پھر وہ اقبال بانو سے کہنے لگے کہ آپ قتیل صاحب سے مخلص نہیں ہیں۔ اگر آپ مخلص ہوتیں تو یہ شرط نہ رکھتیں۔ آپ کے پاس جائیداد بہت ہے آپ وہ جائیداد اپنے لواحقین کے سپرد کر دیتیں اور آپ کا اپنا خرچ ظاہر ہے کہ شادی کے بعد قتیل صاحب کے ذمہ ہو جاتا اور پھر فلم اور ریڈیو آپ کے لئے موجود ہے۔

بہرحال اقبال بانو نے کہا کہ میری بہت سی مجبوریاں ہیں۔ اور مجھے آپ دو مہینے کی مہلت دے دیجئے۔ شاید میں اس دوران اپنے حالات ٹھیک کر سکوں۔ چنانچہ مولوی صاحب کو رخصت کر دیا گیا اور میری جان میں جان آئی۔ کیونکہ جس ماحول میں اور جن

شبہات کے دوران یہ فریضہ ادا ہو رہا تھا وہ بہت تشویشناک تھے۔ اگر یہ شادی ہو گئی ہوتی تو خدا جانے اس کا انجام کیا ہوتا۔ بہرحال وہ دو مہینے جو مہلت ملی ان دو مہینوں میں میرے خدشات بالکل درست ثابت ہوئے۔ اور دو مہینے کے اندر کے اندر اندر ہماری مستقل طور پر علیحدگی ہو گئی۔

علیحدگی ہوئے اب کوئی پچیس برس سے زیادہ گزر چکے ہیں لیکن کبھی کسی مشترکہ دعوت میں ملاقات ہو تو سلام دعا ہوتی رہتی ہے۔ میری شامت اعمال کہ اقبال بانو نے مجھ سے فرمائش کر دی کہ میں چہرے کی جھریاں دور کرنے کا ایک لوشن انہیں منگوا دوں جو انگلینڈ ہی سے ملتا ہے۔ ظاہر ہے بہت قریبی تعلقات رہ چکے تھے اور یہ صرف پانچ سات سو روپے کی فرمائش تھی۔ اس کی تکمیل میں دقت تو کوئی نہیں تھی صرف یہ تھا کہ یہ چیز انگلینڈ سے منگوانی پڑتی تھی۔ میں نے یہ لوشن انگلینڈ سے منگوا کر اقبال بانو کو اطلاع دی کہ لوشن آ گیا ہے کہاں پہنچاؤں۔ اقبال بانو نے ازراہِ تکلف کہا کہ نہیں میں خود یہ لینے کے لئے آؤں گی کیونکہ آپ کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے۔ میں نے پس و پیش کی لیکن انہوں نے ضد کی۔

چنانچہ میں نے انہیں اپنی ایک محترم دوست کے گھر کا پتہ دے دیا۔ وہ پتہ آسان بھی تھا۔ میں نے یہ سب کچھ بغیر کسی غرض یا مطلب کے کیا۔ تعلقات پہلے سے ٹوٹے ہوئے تھے اور ایسا کرنے میں تجدید تعلقات کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ اقبال بانو اس پتہ پر آئیں۔ یہ جس جگہ کا ذکر ہے ان محترم دوست سے ہمارے پرانے گھریلو تعلقات بھی چلے آ رہے ہیں۔ ہم نے یہاں بیٹھ کر چائے وغیرہ پی۔ ہم ابھی وہاں بیٹھے باتیں ہی کر رہے تھے کہ میرا بیٹا اور بہو بھی اسی سلسلے میں اتفاقاً وہاں آ گئے۔

میرا بیٹا تو پہلے بھی اقبال بانو سے مل چکا تھا کیونکہ اسے بھی گانے کا شوق ہے۔ یہاں ان کی پھر ملاقات ہو گئی۔ یہ بات کسی طرح گھر تک پہنچی۔ میری بیوی کا اس سلسلے میں ردِعمل ظاہر ہے کہ شدید ہونا تھا۔ چنانچہ میرے گھر میں ایک بار پھر سخت ہنگامہ ہوا۔ جس طرح کہ پچیس تیس سال پہلے ہوا کرتا تھا۔ لیکن وہ ہنگامے بجا ہوا کرتے تھے جبکہ یہ ہنگامہ

بے جا تھا۔

میں اِس بے جا ہنگامے پر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کہ ایک ایسا گناہ پھر میرے کھاتے میں آ پڑا ہے جو مجھ سے سرزد نہیں ہوا۔ یہ ایک مروّت کا معاملہ تھا جسے دوسرا رنگ میرے گھر میں دے دیا گیا اور کافی دن گھر میں بے سکونی کا سماں رہا۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ ہماری بیویاں اور کر بھی کیا سکتی ہیں۔ وہ اپنے مردوں کی اِن زیادتیوں کو دیکھ کر سوائے رونے دھونے کے یا خاوند سے لڑائی جھگڑا کرنے کے اور بیچاری کرتی بھی کیا ہیں۔

اگر میرا ماضی بے داغ ہوتا تو شاید یہ واقعہ کوئی اہمیت نہ رکھتا لیکن کہانی' اور وہی کردار جو دوبارہ سٹیج ہونے لگے تو لامحالہ ایک شبہ کی فضا پیدا ہوتی ہے اور وہ ہو کر رہی۔ اور وہ زخم جو بھر چکے تھے دوبارہ ہرے ہو گئے۔ اور وہ بے سکونی جو پچیس تیس برس پہلے تھی' وہ دوبارہ گھر میں ہو گئی۔ ایسے معاملوں میں قسمیں اور قرآن مددگار ثابت ہوتے ہیں' چنانچہ میں نے قسمیں بھی کھائیں۔ چونکہ اس بار میری قسمیں اور قرآن اٹھانا سچا تھا اس لیے مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں۔ افسوس تو ماضی کی ان قسموں کا ہے جو میں نے کئی بار جھوٹ کو چھپانے کے لیے کھائی تھیں۔

اللہ مجھے معاف کرے اور اللہ اقبال بانو کو بھی معاف کرے جس نے میرے سامنے وہ وہ قسمیں کھائیں اور ایسے ایسے وعدے کیے کہ جو اَب یاد آتے ہیں تو میں سوچتا ہوں کہ شاعر لوگ تو اپنی شاعری کے مبالغے میں بہت بدنام ہیں لیکن اس قسم کے وعدے کرنے والی حسینائیں جس چرب زبانی کا سہارا لیتی ہیں وہ بھی کسی شاعری سے کم نہیں۔

ہماری مطبوعات ایک نظر میں

۱۔	پھول جیسے لوگ (ناول)	انور خان	80.00
۲۔	قند وزقند (طنز ومزاح / نیا ایڈیشن)	فیاض احمد فیضی	150.00
۳۔	گھٹتے بڑھتے سائے (افسانے)	علی امام نقوی	60.00
۴۔	اردو تنقید حالی سے کلیم تک (تحقیق)	سید محمد نواب کریم	125.00
۵۔	کاغذ کی دیوار (افسانے)	محافظ حیدر	60.00
۶۔	اردو مثنویوں میں جنسی تلذذ (تنقید)	ڈاکٹر محبوب اعلیٰ قریشی	125.00
۷۔	ڈار سے بچھڑے (افسانے)	سید محمد اشرف	100.00
۸۔	غالبیات اور ہم (تحقیق)	ڈاکٹر ابو محمد سحر	50.00
۹۔	رشید احمد صدیقی کے اُسلوب کا تجزیاتی مطالعہ (تنقید)	خواجہ محمد اکرام الدین	80.00
۱۰۔	ہم مسافر جہاں جہاں پہنچے (سفرنامہ)	پروفیسر علیم اللہ حالی	50.00
۱۱۔	ساغر نظامی: حیات اور ادبی خدمات (تحقیق)	ڈاکٹر سلمیٰ شاہین	100.00
۱۲۔	مرزا رسوا کے ناولوں کے نسوانی کردار (تحقیق)	ڈاکٹر توحید خاں	80.00
۱۳۔	فلسطین کے چار ممتاز شعراء (تنقید)	عبدالحق حقانی القاسمی	60.00
۱۴۔	سخنورانِ شاہجہاں پور (تذکرہ)	مبارک شمیم	125.00
۱۵۔	راہ میں اجل ہے (افسانے)	زاہدہ حنا	100.00
۱۶۔	مطالعہ مثنویات مصحفی (تنقید)	ڈاکٹر سعیدہ وارثی	100.00
۱۷۔	حجاب امتیاز علی: حیات اور ادبی کارنامے (شخصیت)	مجیب احمد خاں	80.00
۱۸۔	اسرار غالب (تنقید)	سید قدرت نقوی	60.00
۱۹۔	اردو فکشن کی تنقید (تنقید)	ڈاکٹر ارتضیٰ کریم	250.00
۲۰۔	سنگ اُٹھانے کا حوصلہ (افسانے)	رضاء الجبار	80.00
۲۱۔	جوگندر پال کے افسانوں کا انتخاب (افسانے)	مرتب: انیس امروہوی	90.00
۲۲۔	ازبکستان: انقلاب سے انقلاب تک (سفرنامہ)	ڈاکٹر قمر رئیس	100.00

۲۳۔ رابطہ (تنقید)	جوگندر پال	90.00
۲۴۔ قمر رئیس: ایک زندگی (شخصیت)	مرتب: ڈاکٹر سلمٰی شاہین	250.00
۲۵۔ بے اصطلاح (مضامین)	جوگندر پال	90.00
۲۶۔ اردو افسانے کا پس منظر (تنقید)	فیاض رفعت	60.00
۲۷۔ بے ارادہ (افسانے)	رفیع حیدر انجم	80.00
۲۸۔ سب رس: جدید اردو میں (تنقید)	قاضی انیس الحق	150.00
۲۹۔ غلام بخش اور دیگر کہانیاں (افسانے)	مشرف عالم ذوقی	120.00
۳۰۔ وہ دن (افسانے)	غیاث الرحمٰن	80.00
۳۱۔ مرائی شاد کا فکری پہلو (تنقید)	پروفیسر اظہار احمد	100.00
۳۲۔ اردو کے نثری اسالیب (تنقید)	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	150.00
۳۳۔ کلیم الدین احمد کی تنقید کا تنقیدی جائزہ (تنقید)	ڈاکٹر ابرار رحمانی	150.00
۳۴۔ اردو افسانے پر مغربی ادب کے اثرات (تنقید)	ڈاکٹر شہناز شاہین	120.00
۳۵۔ پرندے (افسانچے)	جوگندر پال	90.00
۳۶۔ ہوئے ہم دوست جس کے (شخصی خاکے)	مجتبیٰ حسین	80.00
۳۷۔ معاصر اسلامی تحریکات اور فکرِ اقبال (تنقید)	ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی	150.00
۳۸۔ ساختیات: تاریخ، نظریہ اور تنقید (تنقید)	احمد سہیل	200.00
۳۹۔ ذبح (ناول)	مشرف عالم ذوقی	90.00
۴۰۔ زندہ اپنی باتوں میں: بیدی، عصمت اور عباس (انٹرویوز)	فیاض رفعت	90.00
۴۱۔ مضامین نو (مضامین)	نرگس سلطانہ	100.00
۴۲۔ اردو میں قصیدہ نگاری (تنقید)	ڈاکٹر ابو محمد سحر	150.00
۴۳۔ مٹی کے حرم (ناول)	ساجدہ زیدی	250.00
۴۴۔ مکالمہ (آجکل کے اداریے)	محبوب الرحمٰن فاروقی	200.00
۴۵۔ اردو شاعری کے روشن چراغ (تذکرہ)	طارق متین پانچھتی	100.00
۴۶۔ مشرقی ہند میں اردو نکڑ ناٹک (تحقیق)	ڈاکٹر محمد کاظم	100.00
۴۷۔ صوبہ سرحد میں جنگِ آزادی (سوانح)	جگت رام ساہنی	100.00

۴۸۔ اصطلاحاتِ نفسیات: تشریح و تفہیم	سید اقبال امروہوی	200.00
۴۹۔ حاضر حال جاری (افسانے)	سریندر پرکاش	250.00
۵۰۔ واپسی سے پہلے (افسانے)	صغیر رحمانی	150.00
۵۱۔ نادید (ناول)	جوگندر پال	150.00
۵۲۔ ہرچرن چاؤلہ: فن اور شخصیت (مضامین)	مرتب: ڈاکٹر نگار عظیم	150.00
۵۳۔ جدید نفسیات (نفسیاتی مضامین)	سید اقبال امروہوی	150.00
۵۴۔ غمِ دل وحشتِ دل (ناول)	ڈاکٹر محمد حسن	250.00
۵۵۔ بلونت سنگھ: فن اور شخصیت (تحقیق)	ڈاکٹر ممتاز آراء	200.00
۵۶۔ بھگت سنگھ کی واپسی (ڈرامے)	ساگر سرحدی	150.00
۵۷۔ مسیحا کی موت (افسانے)	قاضی انیس الحق	200.00
۵۸۔ شہر نگاراں (ناول)	رفعت سروش	200.00
۵۹۔ گلدستۂ بیت بازی (شاعری)	مرتب: ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی	200.00
۶۰۔ انتخاب کلیات ن۔م۔راشد (شاعری)	مرتب: مرغوب علی	180.00
۶۱۔ تنقیحات (تنقیدی مضامین)	ڈاکٹر نیر جہاں	120.00
۶۲۔ مضامین ہفت رنگ (تنقیدی مضامین)	محبوب الرحمٰن فاروقی	200.00
۶۳۔ جوگندر پال کی کہانیاں (افسانے)	جوگندر پال	180.00
۶۴۔ جوشؔ ملیح آبادی: خصوصی مطالعہ	مرتب: ڈاکٹر قمر رئیس	200.00
۶۵۔ لندن کے رات دن (افسانے)	علی باقر	350.00
۶۶۔ تپش (افسانے)	ولی محمد چودھری	150.00
۶۷۔ نثری بیانیہ (تنقید)	ڈاکٹر مجید بیدار	150.00
۶۸۔ گزرگاہِ خیال (مضامین)	پروفیسر ساجدہ زیدی	200.00
۶۹۔ رودادِ انجمن (ریپورتاژ)	حمید اختر	200.00
۷۰۔ عورت: زندگی کا زنداں (مضامین)	زاہدہ حنا	250.00
۷۱۔ اُردو ناول کے اسالیب (تنقید)	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	250.00
۷۲۔ ایک کتاب اور..... (طنز و مزاح)	یوسف ناظم	150.00

۷۳۔ روزمرہ کی نفسیات (نفسیاتی مضامین)	سید اقبال امروہوی	180.00
۷۴۔ مولانا شبلی: ایک تنقیدی مطالعہ (تنقید)	ڈاکٹر قمر جہاں	250.00
۷۵۔ قمر رئیس: ادبی و علمی شناخت (شخصیت)	مرتب: خوشنودہ نیلوفر	200.00
۷۶۔ پریم چند: نئے تناظر میں (تنقید)	ڈاکٹر علی احمد فاطمی	200.00
۷۷۔ ہندستان کا سرخ سفر (سیاسی تاریخ)	نریش ندیم	300.00
۷۸۔ وہ بھی ایک زمانہ تھا (فلمی شخصیات)	انیس امروہوی	250.00
۷۹۔ خیال کی مسافت (مضامین)	شمیم حنفی	300.00
۸۰۔ سفر کہانی (پاکستانی سفرنامہ)	مرغوب علی	120.00
۸۱۔ ناکام محبت: ساحر لدھیانوی (شخصیت)	اظہر جاوید	180.00
۸۲۔ پردہ ہے ساز کا (شعری مجموعہ)	ساجدہ زیدی	150.00
۸۳۔ صحرائی شب و روز (ناول)	سُنیل گنگوپادھیائے (مترجم: ٹوٹن مکھرجی، اے۔آر۔منظر)	120.00
۸۴۔ جاتے جاتے (طنز و مزاح)	یوسف ناظم	120.00
۸۵۔ رات، شہر اور زندگی (مضامین)	شمیم حنفی	250.00
۸۶۔ چاہت کے رنگ (ناول)	طاہر تنویری	250.00
۸۷۔ راستہ بند ہے (ناول)	مصطفیٰ کریم	220.00
۸۸۔ نقوشِ جاوداں (سوانح)	ڈاکٹر شمس کمال انجم	200.00
۸۹۔ دکنی نثر پر ایک نظر (تنقید)	ڈاکٹر مجید بیدار	200.00
۹۰۔ قند مکرر (طنز و مزاح)	فیاض احمد فیضی	150.00
۹۱۔ شالسلی (ناول)	ناصرہ شرما	150.00
۹۲۔ ڈور نہیں منزل (ناول)	دلشاد امروہوی	150.00
۹۳۔ اُردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات (تحقیق)	سید تنویر حسین	180.00
۹۴۔ سخنوران عہد پہلوی (تذکرہ)	ڈاکٹر غلام اشرف قادری	150.00

TAKHLEEQKAR PUBLISHERS

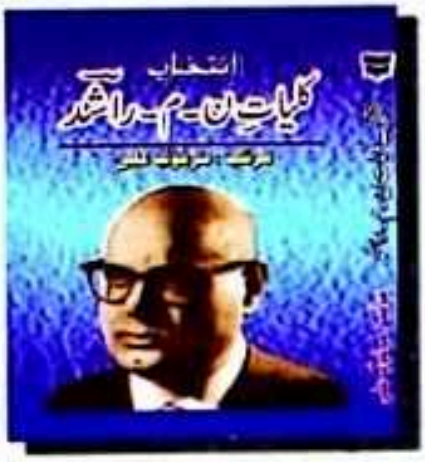
104/B, Yawar Manzil, I-Block, Laxmi Nagar, Delhi-110092

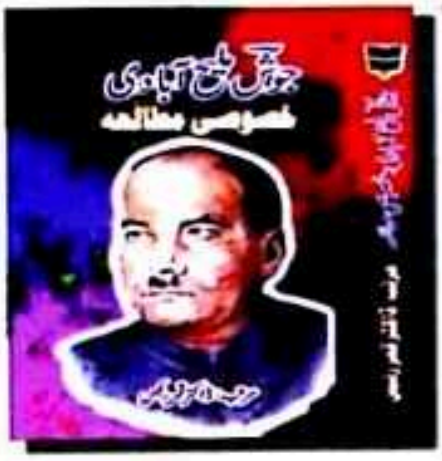
Ph: 011-22442572, 9811612373, Email: qissey@rediffmail.com



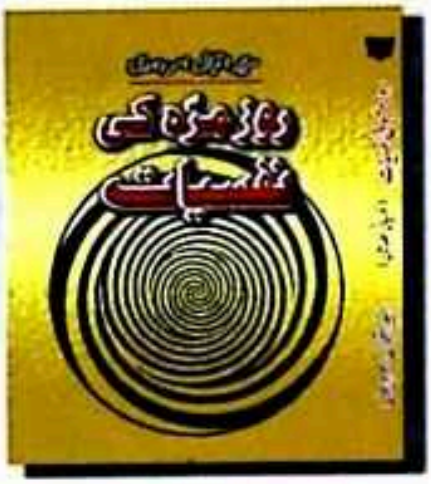




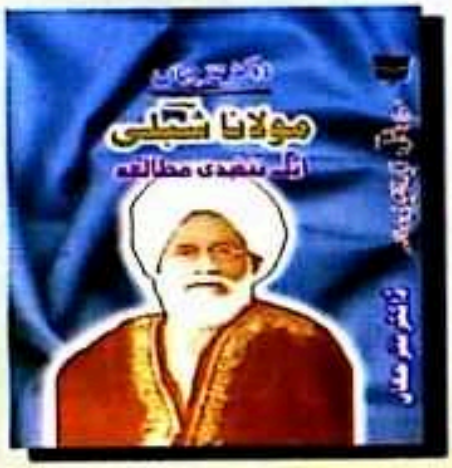
















TAKHLEEQKAR PUBLISHERS

104/B, Yawar Manzil, I-Block, Laxmi Nagar, Delhi-110092

Ph : 011-22442572, 9811612373 E-mail : qissey@rediffmail.com

تمام کتابیں بغیر مالی فائدے کے پی ڈی ایف

میں تبدیل کی جاتی ہیں۔

مصنف کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

سید حسین احسن۔ فیس بک گروپ



کتابیں پڑھئے

03145951212

03448183736